
جشن سیمیں ۱۹۵۵ء - ۱۹۸۰ء

ورفعنا لك ذكرك

١٤٠٧

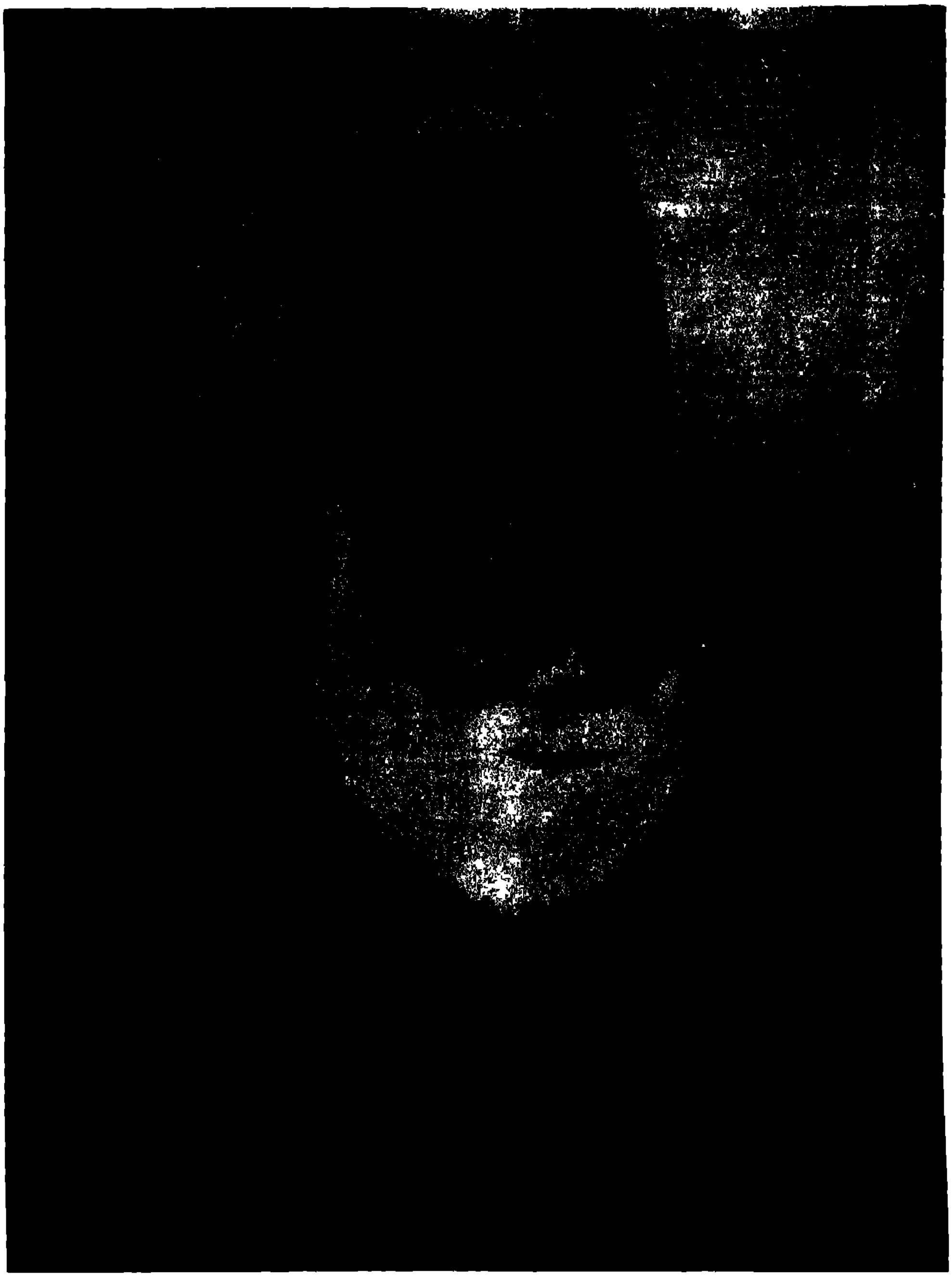
اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کے ذکر کو رفعت بخشی ۔ (الانشراح)

بابائے قوم



قائداعظم محمد علی جناح ؒ

بابائے اُردو



مولوی عبدالحق مرحوم

صدرِ مملکت



عزت مآب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب

وزیر تعلیم پاکستان



جناب محمد علی خان صاحب

شیخ الجامعہ کراچی



ڈاکٹر سید معصوم علی ترمذی صاحب

پرنسپل

سیکریٹری بورڈ آف گورنرز

وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج



جناب محمد اکرام الرحمٰن صاحب



نگرانِ تدریسی امور

پروفیسر اے کے آفتاب زبیری

نگرانِ انتظامی امور

پروفیسر ہارون رشید نجمی





اساتذہ کرام صدر پاکستان فضیلت مآب جنرل محمد ضیاء الحق کے ہمراہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

GOVERNOR, SIND

پیغام

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی ہے کہ وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کے طالب علم اور اساتذہ کالج کے پچیس سال مکمل ہونے پر جشنِ سیمیں (سلور جوبلی) کی تقریبات منعقد کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں اور اس موقع پر اپنے سالانہ مجلّہ "کائنات" کا جشنِ سیمیں نمبر بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ ۲۵ سال کے اس عرصے میں وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج نے جو ترقی اور کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ کسی بھی ملک کے لوگ علم و فن خصوصاً سائنس کے شعبے میں اس وقت تک خاطر خواہ ترقی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ ان کا ذریعہ تعلیم ان کی اپنی قومی زبان نہ ہو۔ بد قسمتی سے ماضی میں ہمارے ملک میں قومی زبان اردو کی ترویج و ترقی کیلئے حکومت کی سطح پر مناسب عملی اقدامات نہیں کئے گئے۔ اب اس ضمن میں بہت کچھ کیا جا رہا ہے۔ سائنس اور تکنیکی اصطلاحات کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا اس سلسلے میں اردو سائنس کالج کی کامیابی واقعی قابلِ تحسین ہے۔ آج اس کالج میں ۲۵۰۰ سے زیادہ طالبعلم ایم ایس سی درجہ تک کلیتاً اردو زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

میری دعا ہے کہ یہ کالج دِن دُونی اور رات چوگنی ترقی کرے اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کا خواب جلد شرمندۂ تعبیر ہو۔ آمین

لیفٹیننٹ جنرل ایس۔ ایم عباسی

گورنر سندھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

GOVERNOR'S HOUSE
PESHAWAR

پیغام

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج، کراچی کے قیام کے پچیس برس مکمل ہونے پر جشن سیمیں کی تقریبات منائی جارہی ہیں۔ اردو سائنس کالج نے قومی زبان کے فروغ کیلئے جو گراں قدر خدمات سر انجام دی ہیں ان کے پیش نظر جشن سیمیں کی خوشیوں میں ہر پاکستانی بلکہ اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والا ہر شخص برابر کا شریک ہے۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے جس کام کا آغاز کیا تھا اردو سائنس کالج کے طلباء اور اساتذہ اسے عملی جامہ پہنانے میں دن رات کوشاں ہیں۔ کالج کے اڑھائی ہزار سے زائد طلباء جو اس وقت اپنی قومی زبان میں تعلیم اور خصوصاً سائنس کی تعلیم حاصل کررہے ہیں اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کا دامن بے حد وسیع ہے اور وہ ہر قسم کے مضامین کی ادائیگی اور ابلاغ کی بھی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ انشاء اللہ وہ وقت دور نہیں جبکہ وطن عزیز کے تمام شعبوں میں اردو مکمل طور پر کارفرما ہوگی۔

مجھے امید ہے کہ کالج کے اساتذہ اور طلبا اسی جوش و خروش کے ساتھ اپنے مشن کی تکمیل کیلئے جدوجہد کرتے رہیں گے۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار کرے۔ آمین

(لیفٹیننٹ جنرل فضل حق)
گورنر،
صوبہ سرحد، پشاور

۵

انجمن ترقی اردو پاکستان

قائم شدہ ۱۹۰۳ء

اردو روڈ۔ کراچی ۱

شمار ....

تاریخ ۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء

جناب محمد اکرام الرحمن صاحب ۔ السلام علیکم

اس خوش آیند اطلاع سے کہ آپ اردو سائنس کالج کے جشن سیمیں کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور اس موقع کی مناسبت سے "کائنات" کا جوبلی نمبر بھی شائع کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں ، دل کو بے اندازہ مسرت ہوئی ۔

انجمن ترقی اردو ، حکومت پاکستان اور آپ کے اساتذہ کے مخلصانہ تعاون سے قومی زبان اردو کو پاکستان میں یہ درجہ نصیب ہوا ہے کہ سائنس کے جدید مضامین اردو کے ذریعہ پڑھائے جاتے ہیں ۔ آپ کی علمی و تدریسی کاوشوں سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اردو ہر سطح پر انگریزی کی جگہ لینے کے لئے تیار ہے ۔ آپ نے بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے اس تخیل کو کہ اردو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ، دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح ذریعہ تعلیم بننے کی اہلیت رکھتی ہے ایک مسلمہ حقیقت بنادیا ہے ۔

میری اور بہی خواہان اردو کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں ۔

اختر حسین

(اختر حسین)

صدر

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ ۔ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقتدرہ قومی زبان

NATIONAL LANGUAGE AUTHORITY

الکریم ۳۴۔ڈی، بلاک نمبر ۷، گلشن اقبال کراچی ۴۷ - تار کا پتہ : اپنی زبان ۔ فون :
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بے زبان قومیں دنیا میں زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکتیں یہ نا ممکن ہے کہ وہ زبان تو کسی اور قوم کی اختیار کریں اور اپنا تشخص بھی برقرار رکھ سکیں یہ بات ہمیشہ مسلمانان ہند و پاک کے پیش نظر رہی ہے لیکن افسوس کہ بعض خود غرض عناصر کی وجہ سے ان کے یہ جذبات آرزو بن کر ان کے دل میں ٹیسیں اٹھاتے رہے مگر کبھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئے چنانچہ وفاقی اردو سائنس کالج بھی اسی آرزو دیرینہ کی ایک علامت ہے ۔

اب جب کہ حکومت کی سطح پر قومی تشخص کی اہمیت کو تسلیم کیا جارہا ہے اور جناب صدر مملکت کی توجہ سے اردو ہر سطح پر اپنا مقام حاصل کررہی ہے تو تمام ایسے لوگوں کو جنہیں اسلام اور پاکستان عزیز ہیں خوش ہونا چاہیے کہ اب موقعہ آگیا ہے کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ

" حق بہ حق دار رسید "

شیخ الجامعہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیغام

مجھے یہ سن کر دلی مسرت ہوئی کہ وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج جشن سیمیں منا رہا ہے۔ اس موقع پر کالج کے سالانہ مجلہ "کائنات" کا ایک خصوصی شمارہ ترتیب دیا جارہا ہے۔ کالج کی تعلیمی، علمی اور قومی خدمات لائق تحسین ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ کالج کا ہر فرد اس موقع پر اپنے قومی اور تعلیمی فرائض کی انجام دہی کیلئے تجدید عہد کرے گا۔ "کائنات" کی یہ اشاعت خاص اس موقع کی مناسبت سے اہم ہوگی۔ کائنات کے مختلف شمارے سائنس کی دنیا میں اردو زبان کی اہمیت اجاگر کرنے میں اپنا فرض بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ یہ اشاعت بھی گزشتہ روایات میں ایک خوشگوار اضافہ ثابت ہوگی۔

(سید معصوم علی ترمذی)
شیخ الجامعہ، جامعہ کراچی

PHONES 21 89 79
21 09 61

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

KARACHI METROPOLITAN CORPORATION

MAYOR

ص/981/90
KARACHI DATED THE 11.11.90

پیغام

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی ہے کہ وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کے شعبہ سائنس کے قیام کو ۲۵ سال مکمل ہوگئے اور اس موقع پر سالانہ مجلہ "کائنات" کا جشن سیمیں نمبر شائع ہورہا ہے۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور اردو کالج نے قومی زبان اردو کی ترقی میں جو کردار ادا کیا ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اساتذہ اور طالبہ کی لگن و محنت سے اس ادارے کا نام ملک کے ممتاز ترین تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے

پروفیسر محمد خلیل اللہ اور پروفیسر محمد اکرام الرحمن کی رہنمائی میں اردو کالج نے ایم اے، ایم ایس سی اور ایل ایل ایم کی کلاسیں اردو میں کا آغاز کرکے جامعہ اردو کی جانب قدم بڑھایا ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ادارے کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے ——

آپ کا مخلص

عبدالستار افغانی

۸ - ۱۱ - ۹۰

(عبدالستار افغانی)

میئر شہر کراچی

کائنات

سرپرست

محمد اکرام الرحمٰن

• نائب نگران:

امین فاروق

• نگران:

ڈاکٹر وقار احمد زبیری

• مدیرہ:

آنسہ ادیبہ اقبال
سالِ چہارم

• معاونین:

آنسہ مہر افشاں عثمانی

جناب وسیم احمد

جناب حسن وقار گل

• اراکینِ مجلسِ ادارت

جناب سید سردار علی سالِ سوم

جناب یوسف زمان سالِ چہارم

جناب تسنیم محمود سالِ سوم

جناب نیاز احمد سالِ دوم

جناب ندیم واسطی سالِ اوّل

مطبوعہ: ڈان پرنٹنگ

بابِ کائنات

۱

۲

۳

۴

۸

زیرِ نگرانی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج

"کائنات" کا پانچواں شمارہ حاضر ہے۔ یہ شمارہ ایسے وقت پر شائع ہو رہا ہے۔ جب اردو کالج میں شعبۂ سائنس کے قیام کو پچیس سال ہوتے ہیں اس طرح یہ کائنات کا جوبلی نمبر ہے۔ جی چاہتا تھا کہ پچیس سال کی کامرانیوں اور کامیابیوں کی پوری داستان لفظ لفظ دہرا دی جائے۔ ان اساتذہ کا تذکرہ بھی تفصیل سے ہو جنہوں نے خونِ جگر سے اس پودے کی آبیاری کی جو آج ماشاءاللہ ایک شجر سایہ دار ہے۔ ان طلبہ کا ذکر بھی تفصیل سے ہو جو بے سروسامانی کے دور میں ہم سفر تھے اور آج ملک کے مایہ ناز فرزندوں میں شامل ہیں۔ مولوی محی الدین صاحب اور میجر آفتاب حسن صاحب، کرنل عطاء الرحیم کی خدمات کا تذکرہ بھی وضاحت سے ہو اور جناب اختر حسین صاحب اور جناب جمیل الدین عالی صاحب کی کاوشوں کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا جائے۔ یا پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن صاحب کی ان کاوشوں کا تذکرہ کیا جائے جس کا نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔ مگر کوتاہ دامنی ہر قدم پر آڑے آتی رہی اور وہ کچھ ممکن نہ ہوا جو دل چاہتا تھا۔

اس ادارے نے ان پچیس سالوں میں کیا کیا نشیب و فراز نہ دیکھے۔ اپنوں اور غیروں کے کیا کیا چرکے نہ سہے مگر آخرکار وہ وقت بھی آیا کہ کالج جو ہر شخص کے طعنوں کی زد میں تھا آج قابلِ رشک ہے۔ آج ملک کا سب سے بڑا سائنس کالج ہے، تجربہ خانے ہوں، یا کتب خانہ، اساتذہ ہوں یا غیر تدریسی عملہ، طلبہ ہوں یا طالبات، ہر جگہ فخر و مباہات کا احساس کارفرما ہے۔ اب نہ طلبہ خود کو اردو کالج کا طالبعلم کہتے شرماتے ہیں نہ اساتذہ ہی شرمندہ ہیں۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ تصاویر کے ذریعہ، مضامین کے ذریعہ ہر دور کا احاطہ ہو جائے۔ خاص طور پر قومی زبان کے بارے میں موقع کی مناسبت سے کئی وقیع مضامین شامل کئے گئے جن میں مکرمی جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان صاحب، پروفیسر ابواللیث صدیقی صاحب، جناب بدر شکیب، ڈاکٹر فرمان فتحپوری وغیرہ کے مضامین کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ کالج کی تعمیر شروع ہونے کے بعد جب اس کی تکمیل کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی تو اس وقت کے پرنسپل کرنل عطاءالرحیم صاحب سے گفتگو کی گئی تھی۔ یہ انٹرویو کی شکل

سائنس کے جریدے "سائنس" میں شائع کی گئی تھی ان کے کچھ حصّے دوبارہ پیش خدمت ہے۔
موجودہ کیفیت میں کرنل صاحب کی گفتگو بہت دلچسپ محسوس ہوگی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب اور میجر آفتاب حسن صاحب سے بھی کالج کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ جو بہت اہم ہے موجودہ پرنسپل پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن صاحب سے بھی گفتگو کی گئی ہے وہ موجودہ حالات کی مناسبت سے اور آئندہ کے فیصلوں کی روشنی میں بہتر ہے۔

ہم پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن صاحب کے انتہائی مشکر گزار ہیں کہ موصوف نے اتنا بڑا کام کرنے کے لئے تمام مراعات عطا کیں اور ہر قدم پر ہماری معاونت کی، سچ تو یہ ہے کہ ان کے مشوروں اور نوازشوں کے بغیر یہ کام ممکن ہی نہ تھا۔

ہم پروفیسر ضیاء الدین محمود صاحب سابق نگران شعبہ تصنیف و تالیف کے بھی بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنی نگرانی میں خاصا کام مکمل کرالیا تھا۔ نیز ہم محترمہ مہر افشاں عثمانی، جناب وسیم احمد صاحب کا اور جناب حسن وقار گل صاحب کے بھی ممنون ہیں جنہوں نے مضامین جمع کئے، ترتیب دیئے اور قابل اشاعت بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

ہم تمام مصنفین، کالج کے اساتذہ اور ان طلبہ کے بھی ممنون ہیں جنہوں نے اپنی نگارشات ہمیں عطا کیں۔ ہم بارگاہِ ربّ العزت میں دعاگو ہیں کہ اس کاوشِ ناچیز کو شرفِ قبولیت عطا ہو۔

[illegible]

[illegible]

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

حمد

نئی مستی نیا عالم وہ صبح شام لیتے ہیں
جو تیرے ہاتھ سے جامِ مئے گلفام لیتے ہیں

جو تجھ سے آشنا ہیں دیکھتے ہیں تجھکو پھولوں میں
مہ و خورشید و انجم سے تیرا پیغام لیتے ہیں

سمجھتے ہیں اسے بھی ایک گردش جام الفت کی
ترے میخوار لطفِ گردشِ ایام لیتے ہیں

بہت محبوب ہیں مجھکو جنہیں تجھ سے محبت ہے
میں ان پر جان دیتا ہوں جو تیرا نام لیتے ہیں

وہ گردابوں میں رقصاں ہیں وہ طوفانوں میں خنداں ہیں
جو کشتی کو ڈبو کر تیرا دامن تھام لیتے ہیں

گزر جاتے ہیں وہ ہنستے ہوئے تاریک راہوں سے
تیری شمعِ محبت سے جو رہبر کا کام لیتے ہیں

بھروسا ہے جنہیں اپنے خدا کی کارسازی پر
اثرؔ آغوشِ طوفاں میں بھی وہ آرام لیتے ہیں۔

اثرؔ صہبائی

محمد الرسول اللہ ﷺ

نعت

قاصد عزیز

حمدِ خدائے پاک کے گوہر، نعتِ رسولؐ پاک کے موتی

آنسو ہیں مٹی کی دولت، تارے ہیں افلاک کے موتی
اہلِ دل کا سرمایہ ہیں ذکرِ شہِ لولاک کے موتی

نقشِ کفِ پائے احمد کو جس کے ذروں نے چوما ہے
میں اپنی پلکوں سے چنوں گا ان راہوں کی خاک کے موتی

کتنا خوش قسمت وہ قلم ہے جس کی آنکھ سے ٹپکے ہیں
حمدِ خدائے پاک کے گوہر، نعتِ رسولؐ پاک کے موتی

اُس کے غلاموں کی ٹھوکر میں تاجِ قیصر و کسریٰ ہے
اُس کے فقیروں کی جھولی میں ہیں فہم و ادراک کے موتی

جس کے سائے میں آسودہ روحِ غزالِ نبوت ہے
اُس کالی کملی پہ نچھاور شاہوں کی پوشاک کے موتی

ہم سے فقیروں کی جھولی میں اُے قاصد مل سکتے ہیں
قلبِ گداز کے لعل و جواہر اور چشمِ نمناک کے موتی


دیکھنے میں خوبصورت چلنے میں لاجواب
توشیبا
Toshiba
TOSHIBA
پلین پیپر کاپیئر
ڈپلیکیٹر BD-8101

نعت

انورؔ دہلوی

ستارے نصیبوں کے چمکانے والا
دلوں کی وہ تالیف فرمانے والا
امام الرسل سب کے بعد آنے والا
وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

دلوں کو محبت سے گرمانے والا
راہِ راست پر خلق کو لانے والا
عدو پر بھی انعام فرمانے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

شہنشاہ شاہوں کا، سخیوں کا داتا
غریبوں کی دولت، امیروں کا آقا
وہ خیر البشر، محسنِ انسانیت کا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماوا
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولا

وہ سرکوئی فوجِ شر کرنے والا
بہائم کی طاقت کو سر کرنے والا
سمِ کفر کو بے اثر کرنے والا
مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

دعائے ہدایت اثر کرنے والا
محبت سے تسخیر سر کرتے والا
عداوت سے صرفِ نظر کرنے والا
خطاکار سے درگزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا

ضلالت میں ہر اہلِ مکہ کو پایا
بہت ان کی جب گمرہی نے کڑھایا
تو اصلاح کا ان کی بیڑا اٹھایا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

ترانۂ اردو

اسدؔ ہمایوں ملتانی

حق نے بنائی اردو قومی زباں ہماری
یہ رازداں ہماری یہ ترجماں ہماری

ہر لفظ ہے خزانہ قومی روایتوں کا
اردو زبان ہے گویا داستاں ہماری

ہم نے اسے ہمیشہ خونِ جگر سے سینچا
اسمیں رواں دواں ہے روح و رواں ہماری

ہو فارسی کہ ہندی، ترکی ہو یا کہ تازی،
گلدستہ ہے سبھی کا اردو زبان ہماری

شامل ہے ہر زباں میں مقبول ہے جہاں میں
پہنچی ہے ہر دکان میں جنسِ گراں ہماری

دنیا کی نشر گاہیں اردو کو کیوں نہ چاہیں
کرتی ہے دل میں راہیں میٹھی زباں ہماری

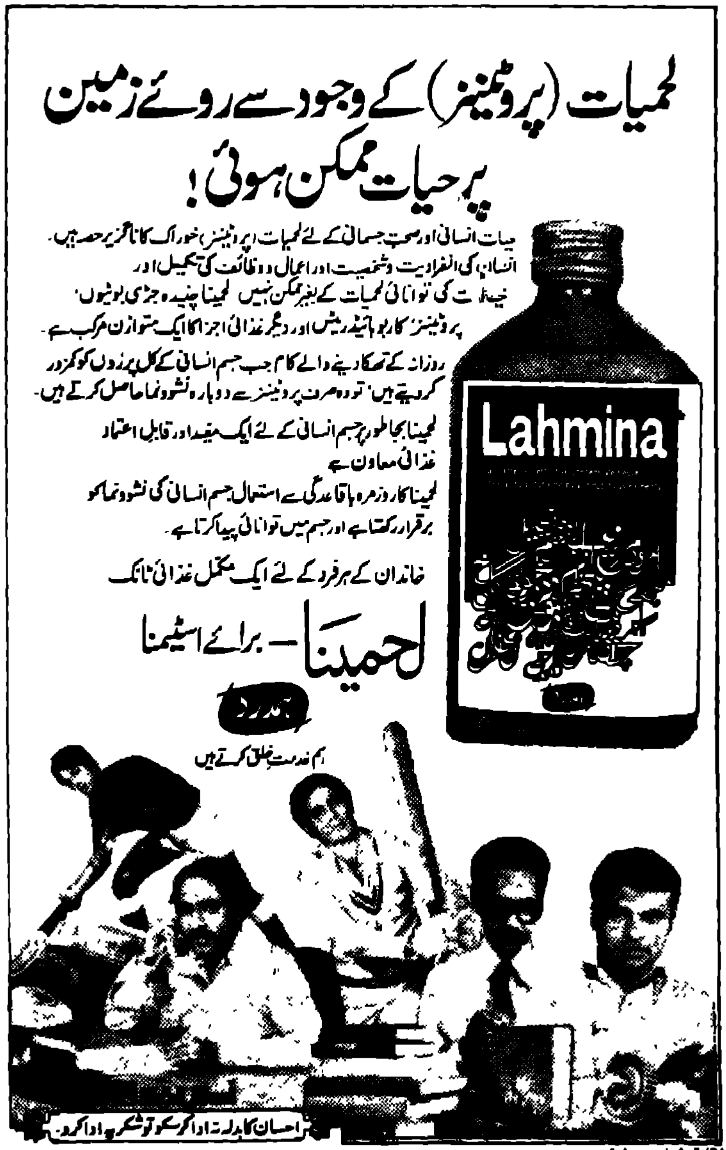
ملّت کا ایک ہونا موقوف ہے اسی پر
دل ایک ہے ہمارا، اک ہے زباں ہماری

قومی زباں نے مرتبہ انکا بھی ہے بڑھایا
ہیں اس کے زیرِ سایہ سب بولیاں ہماری

اپنی زباں میں پاکر علم و ہنر کے جوہر
دل ہے قوی ہمارا، ہمّت جواں ہماری

قومی عروج اپنا وابستہ ہے اسی سے
اس کے فروغ سے ہے تسکینِ جاں ہماری

ہم نے اسدؔ بہ دل سے اب عہد کرلیا ہے
اردو میں سب سے رقم ہوں سرگرمیاں ہماری


لحمیات (پروٹینز) کے وجود سے روئے زمین
پر حیات ممکن ہوئی!
حیات انسانی اور صحت جسمانی کے لئے لحمیات (پروٹینز) خوراک کا ناگزیر حصہ ہیں۔
انسان کی انفرادیت و شخصیت اور اعمال و وظائف کی تکمیل اور
حیات کی توانائی لحمیات کے بغیر ممکن نہیں لحمینا چیدہ جڑی بوٹیوں،
پروٹینز، کاربوہائیڈریٹس اور دیگر غذائی اجزا کا ایک متوازن مرکب ہے۔
روزانہ کے تھکا دینے والے کام جب جسم انسانی کے کل پرزوں کو کمزور
کر دیتے ہیں، تو وہ صرف پروٹینز سے دوبارہ نشوونما حاصل کرتے ہیں۔
لحمینا بجا طور پر جسم انسانی کے لئے ایک مفید اور قابل اعتماد
غذائی معاون ہے
لحمینا کا روزمرہ باقاعدگی سے استعمال جسم انسانی کی نشوونما کو
برقرار رکھتا ہے اور جسم میں توانائی پیدا کرتا ہے۔
خاندان کے ہر فرد کے لئے ایک مکمل غذائی ٹانک
لحمینا — برائے اسٹیمنا
ہمدرد
ہم خدمت خلق کرتے ہیں
Lahmina
احسان کا بدلہ ادا کرسکو تو شکریہ ادا کرو۔
Adarts LA-1/81

سیرت النبیؐ

جناب نعیم صدیقی

ماہ ربیع الاول میں یوم میلاد کے لئے اپنے قریبی ماحول میں اپنے کچھ بھائیوں کو آرائشی محراب بناتے اور جھنڈیاں لگاتے دیکھا تو جہاں یہ خوشی محسوس ہوئی کہ گلی گلی اور کوچے کوچے میں یوم میلاد کے خیر مقدم کا جذبہ کام کر رہا ہے۔ وہاں ایک احساس یہ بھی ابھرا کہ آرائش کرنے والے بھائی ہر سال اسی طرح میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد پر خراج عقیدت پیش کرتے ہیں مگر ان کی زندگیوں کا ڈھانچہ آج بھی وہی ہے جیسا دس سال پہلے تھا انہیں جیسے یہ معلوم ہی نہ ہو کہ میلاد کا مقصد کیا ہے۔ اور جس مقدس ہستی کی یاد منائی جا رہی ہے اس سے ہمارا تعلق کیا ہونا چاہیئے۔ اور اس ہستی کی محبت کا تقاضا کیا ہے۔ جھنڈیاں اور دروازے، پھول اور روشنیاں عطر اور اگر بتیاں، دیگیں اور ضیافتیں، نعتیہ مشاعرے اور قوالیاں، مجلسیں اور مذاکرے، وعظ اور لیکچر، اخباروں کے خاص نمبر اور ریڈیو، ٹیلی ویژن کے خاص پروگرام جب یکجا ہو کر زیرِ نظر آتے ہیں۔ تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ محبت و عقیدتِ رسولؐ کے جذبات کا ایک عظیم الشان کارواں گزر رہا ہے۔ توقع ہوتی ہے کہ جب شہروں اور قصبوں اور دیہات سے یوم میلاد کو پر زور طور پر کرنے اور ربیع الاول کے پہلے بارہ دنوں میں خصوصاً اور سارے مہینے میں عموماً یہ کارواں محبت و عقیدت گزرے گا تو صد ہا دلوں کی دنیا بدل جائے گی۔ کرداروں کے نقشے بدل جائینگے۔ اخلاق میں نیا نکھار آجائے گا۔ تلاوتِ قرآن کی وجد آفریں آوازیں گھر گھر سے بلند ہونے لگیں گی۔ مسجدوں میں نمازیوں کی صفوں میں مستقل اضافہ ہو جائے گا۔

مگر ایسا نہیں ہوتا اور ایسا نہیں ہوتا تو کیوں نہیں ہوتا۔

میں نے اس پر غور کیا ہے۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اہلِ علم، اہلِ قلم اور اہلِ زبان کی جو ذمہ داری سیرت پاک کا پیغام اور محبت رسولؐ کا تقاضا عوام تک پہنچانے کی ہے۔ اسے ادا کرنے کے لئے اگرچہ بڑے خوبصورت پیرائے اختیار کیئے گئے مگر کسی وجہ سے یہی خوبصورت پیرائے اصل مقصد میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔

واعظوں اور شاعروں اور مقرروں اور مقالہ نگاروں کی جو قیمتی باتیں سامنے آئیں ان میں زیادہ زور اس بات پر رہا ہے کہ ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان بڑی بلند ہے، مقام بے مثال ہے۔ کردار بے داغ ہے۔ تمام انبیاء کے درمیان افضلیت کا مرتبہ حاصل ہے۔ تمام انسانوں میں اکملیت عطا ہوئی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ حضورؐ کا بدن حسنِ انسانی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا، چہرے، پیشانی،

آنکھیں، لب و دندان، اندازِ گفتگو اور طرزِ تبسم میں صدہا کرشمہ ہائے نازِ پنہاں تھے۔ یہ سب کچھ نبی ﷺ کا نا کافی تعارف برحق بلکہ اس سے زیادہ باتیں کہنے کی ہیں۔ پھر زور اس بات پر کہ حضور ﷺ کی ساری زندگی پیدائش سے تادم آخر معجزات ہی معجزات سے آراستہ ہے۔ اس میں بھی بحث کی کوئی بات نہیں کمی جس چیز کی رہ جاتی ہے۔ وہ لوگوں پر حضور ﷺ کے واجب الاتباع ہونے کی حیثیت راسخ ہونے کی ہے۔ حضور ﷺ پاک کو واعظین عرش کی بلندیوں پر دکھاتے ہوئے مخاطبوں کو اس طرف توجہ دلانا بھول جاتے ہیں کہ ہم اور تم سب کن پستیوں میں پڑے ہیں۔ یہ پستیاں حضور ﷺ پر ایمان لانے والوں کے لئے نہیں ہیں۔

حضور ﷺ کے صدق و امانت کے واقعات بیان کرتے ہوئے کوئی نہیں کہتا کہ ایسی سچائی اور ایسی امانت کو اختیار کرنا ہمارے لئے لازم ہے۔ کیونکہ ہم حضور ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور حضور ﷺ کے اتباع کے پابند ہیں۔

حضور ﷺ ہمارے لئے داعی، معلم، مربی، اور مزکی مقرر کئے گئے ہیں وہ قرآن کے سنانے کے ساتھ قرآن کو واضح کرنے اور اس کے عملی تقاضوں کو پیش کرنے پر مامور ہیں، وہ خدا کی طرف سے "مطاع" ہیں حضور ﷺ سے انحراف کرکے جو قدم بھی اٹھایا جاتا ہے، وہ عند اللہ مقبول نہیں ہے۔ وہ ہمارے لئے اسوہ ہیں اور اسوہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس عملی نمونے کو ہمیں ہر کام میں سامنے رکھنا ہوگا۔

ان کے لئے خدا کا مطالبہ یہ ہے کہ آپس میں تمام معاملات میں جب تک یہ لوگ (تم پر ایمان لانے والے لوگ) خوش دلی سے یہ فیصلہ کن اتھارٹی طے نہ مان لیں۔ ان کو ایمان کا مقام نہیں مل سکتا۔ حضور ﷺ نے پکار کر فرمایا کہ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو پھر اس کا راستہ یہ ہے کہ میری پیروی کرو۔ تبھی اللہ تم سے محبت کرے گا۔) یعنی اللہ کی محبت کا دعویٰ اسی کا درست ہے اور جواباً اللہ کی محبت اسی کو ملے گی جو اللہ کے رسول ﷺ کی پیروی کرے گا۔ ورنہ قیامت کے دن منظر یہ ہوگا کہ بہت سے لوگ یہ دعویٰ لے کر پیش ہونگے کہ ہم خدا پرست اور محبانِ رسالت ہیں۔ اس پر حضور ﷺ کے سامنے ان کے اعمال کے دفتر رکھ کر گواہی طلب کی جائے گی کہ آیا یہ سب آپ ﷺ کے آدمی ہیں۔ اور ہمیں ان سے آپ ﷺ کی امت ہونے کا سلوک کرنا ہے۔ اس کا جواب وہ عظیم راست باز یہ دے گا کہ یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً۔ (اے میرے رب مجھ سے نسبت رکھنے والے اس گروہ نے قرآن کی روگردانی کرلی تھی) وہ لوگ جو آج دنیا میں عید میلاد منا کر اور جشن محبت رسول ﷺ کی گھڑیاں درود و سلام سے الاپتے ہوئے کردینا بلکہ ہمارے جرائم اس امید پر کرتے ہیں کہ آخرت تو اپنی ہی ہے۔ وہاں اپنا آدمی شفاعت کے لئے موجود ہے پس گناہوں سے کیا پرہیز۔ ان کو وہاں جا کر معلوم ہوگا کہ وہاں اندھی سفارش نہیں ہوتی جو شخص دنیا میں انتہا درجہ کا صادق و امین تھا۔ وہ آخرت میں بھی صادق و امین ہوگا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا ہی میں بہت سے معاملات میں وضاحت فرما گئے ہیں کہ ایسے اور ایسے لوگوں کے لئے میں سفارش نہیں کرونگا یا ایسے اور ایسے افعال کرنے والوں کے لیے میری شفاعت نہیں ہوگی۔

میں نے ربیع الاول یا کسی دوسرے کی تقاریر سیرت میں بالعموم عالموں اور لیکچروں اور شاعروں اور صحافیوں کو یہ بات عوام سے صاف صاف کہتے نہیں پایا۔ کہ محبت کی دو قسمیں ہیں۔

ایک اس ملازم کی محبت ہے جو آقا کی ہر پکار پر دوڑتا

آتا ہے۔ اور جو حکم دیا جاتا ہے بسر و چشم قبول کر کے تعمیل کرتا ہے۔ دوسرا ملازم وہ ہے جو آقا کی کسی پکار پر لبیک نہیں کہتا، کوئی کام کر کے نہیں دیتا۔ کوئی امر بھی تسلیم نہیں کرتا مگر زیادہ سے زیادہ کوشش یہ کرتا ہے کہ آگے بڑھ کر سلام پیش کرے اور قصیدے پڑھے اور اشعار گائے اور جھنڈیاں لگائے اور روشنیاں آراستہ کرے۔

کیا دونوں کا کردار ایک جیسا ہے؟ کیا دونوں کا انجام ایک جیسا ہوگا؟ کوئی دوست ایسے ہمنشیں دوست کو نہیں مانتا جو تعریفوں کے پل باندھتا ہو اور اپنے جذبات وفا کا بڑا اظہار کرتا ہو مگر دوست جس کام میں اس سے تعاون چاہے اس سے روگردانی کر جائے۔

تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ منافقت کہاں تک چلے گا کہ تعریفوں کے پل باندھے جائیں، گلیوں بازاروں کی آرائش کر دی جائے اور زندگی اس طرح گزاری جائے جس طرح گزر رہی ہے کبھی بھولے سے اس رسول معظم سے پوچھتے ہی نہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا فرماتے ہیں؟

میں ترس گیا ہوں ایسی مثالوں کے لئے کہ عمر بھر کا معاملہ تو چھوڑیئے ہمارے کچھ پیارے بھائی ربیع الاول کی برکات اور سیرت مطہرہ کی زیر اثر ایک دن ہی کے لئے یہ طے کر لیں کہ آج ہم کوئی جھوٹ نہیں بولیں گے۔ آج ہم کسی سے فریب نہ کریں گے۔ آج کوئی غلط ناپ تول نہ کریں گے۔ آج رشوت کا لین دین نہ ہوگا۔ آج حرام خوری کسی شکل میں نہ ہوگی۔ آج غیبت، بہتان اور تمسخر سے پرہیز کیا جائے گا۔ آج نگاہ کسی ممنوعہ منظر سے آلودہ نہ ہوگی۔

ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ یہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ دعویٰ ایسا بنا ہیں؟ مجھے تو اپنے ارد گرد ایسے لوگ کم نظر آتے

جو ایک دن کا انقلاب اپنے اوپر اس رسول اقدس کی خاطر طاری کر لیں جو زمانے بھر میں بہترین قسم کا انقلاب برپا کرنے اٹھا تھا۔

کاش کہ کوئی دن ہماری زندگیوں میں ایسا آتا کہ قوم کے تمام بالغ افراد محبت رسالت سے سرشار ہو کر مساجد کے صفوف نماز میں کھڑے ہو جاتے۔ ہم لوگ رسول پاک کے مراتب عالیہ اور سیرت کے واقعات زریں بہت بیان کرتے ہیں مگر ایک چیز ہم نے گم کر دی ہے جسے قرآن نے نبأ عظیم کہا تھا قرآن ہی نے نہیں سرداران قریش نے بھی یہ بات پالی تھی کہ وہ امر عظیم ہے دین جس امر عظیم پر مشتمل ہے وہ ہماری تقریروں اور وعظوں میں گم ہے۔

وہ امر عظیم جس کے لئے چاہا گیا تھا کہ کونوا انصار اللہ ساری دنیا کی اصلاح (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) کا وہ مقصد جس کے لئے خدا پرستوں کو ایک حزب اللہ کی شکل دی گئی تھی تمام اہل ایمان کلمۂ حق کے سپاہی بن گئے تھے۔

کلمۂ حق کے ان سپاہیوں کی شان یہ تھی کہ خدا کو خدا اور رسول کو رسول ماننے کے بعد پھر انہوں نے ہمہ تن سر تسلیم خم کر دیا بغیر کسی جبریت اور قانونی مطالبے کے اپنے باطنی رضاکارانہ جذبے سے وہ ہر اس چیز کو اپنے اوپر طاری کرنے کے منتظر رہتے تھے جو خدا اور رسول کی طرف سے آتی تھی۔

آج وہ محمدی سپاہی شاذ و نادر ہی کوئی دیکھنے میں آتا ہے کہ جس کو انضباط میں رکھنے کے لئے اندرونی رضاکارانہ جذبہ ہی کافی ہو اور آج وہ نبأ عظیم غائب ہو کر اس کی جگہ مذہب رہ گیا ہے۔ اور مذہب بھی ایسی جاگیر ہے۔ جسے مختلف فرقوں نے آپس میں بانٹ رکھا ہے اور اس کے لئے مسلسل لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔

آج ایک خراب شدہ معاشرے میں ہمارے اندر طرح

طرح کی برائیاں فروغ پا گئی ہیں۔ شراب اور قمار سے لے کر اسمگلنگ اور نفع اندوزی تک جھوٹ اور فریب سے لے کر رشوت اور غبن تک، کام چوری سے لے کر ڈاکے اور قتل تک ہر قسم کی برائیوں کا ایک وسیع جال سا گھر چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ تشدد، کینہ اور نفرت وہ زہر ہیں جنہوں نے ہماری وحدت اور اخوت کو تباہ کر دیا ہے پھر دولت اور معیار زندگی اور سٹیٹس کے بتوں کی پوجا ایسی عام ہوئی کہ اب کسی بھی گھر کے حرم جا کے دیکھو تو یہ لات وہبل دلوں اور دماغوں پر چھائے ہوئے ملیں گے۔

حد یہ ہے کہ رسول کریم ؐ کے لائے ہوئے دین پر اعتراض کرنے والے حضور ؐ کی تعلیمات اور معمولات کا مذاق اڑانے والے، اس دین سے انحراف کر کے دوسرے دین قبول کرنے والے اور دین کے اندر دوسرے ادیان کا پیوند لگانے والے بھی ہمارے اندر بکثرت موجود ہیں اور یہ سب بھی عید میلاد اور اس کی جھنڈیوں اور خوشبوؤں سے دلچسپی لیتے ہیں۔ بلکہ تقریریں بھی کرتے ہیں اور نعت رسول ؐ بھی لکھتے ہیں۔

اور جو جس خرابی، جس بداخلاقی اور جس جرم میں مبتلا ہے۔ وہ اس میں محرم گزار کر بھی اسی طرح مگن رہتا ہے اور ماہ ربیع الاول گزار کر بھی کسی تبدیلی کا خیال تک نہیں کرتا ہماری اجتماعی ساخت کا ٹیڑھ اتنا پکا ہو گیا ہے کہ پہلے رمضان گزرتا ہے، پھر حج کا مبارک مہینہ گزرتا ہے پھر محرم میں لوگ یاد حسین ؓ میں آنسوؤں کے دریا بہاتے ہیں۔ اور مرثیوں کا طوفان اٹھا دیتے ہیں پھر ربیع الاول رحمتوں کی گھٹاؤں کے ساتھ دلوں کی آبیاری کرنے آتا ہے۔ مگر ہم جہاں تھے وہاں رہتے ہیں۔ ہر ایک اپنی اپنی عادات اور اپنے اپنے رویوں کو نہایت سختی سے محفوظ رکھتا ہے۔

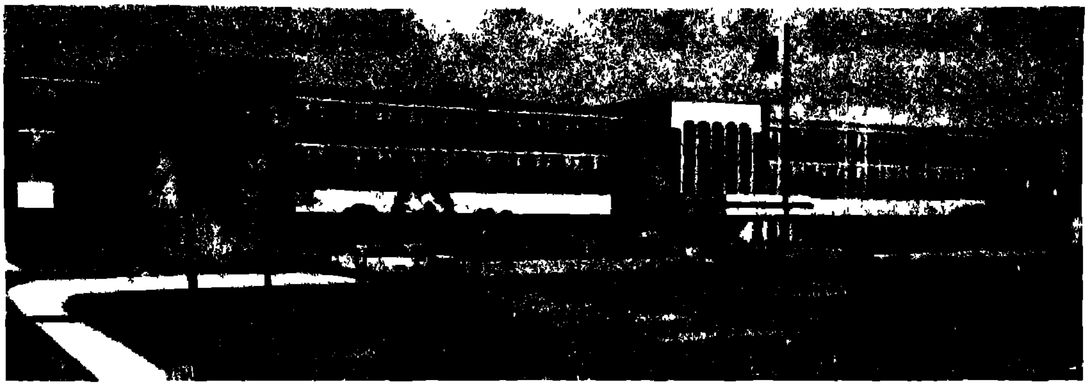
ان گزارشات سے مقصد یہ ہے کہ ذہین دینی عناصر اس مسئلے پر غور کریں اور اپنے طریق کار میں ایسی تبدیلیاں پیدا کریں کہ ہمارے متحجر نظام فکر و عمل میں وہ متغیرات رونما ہوں جس کو پیدا کرنے کیلئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔

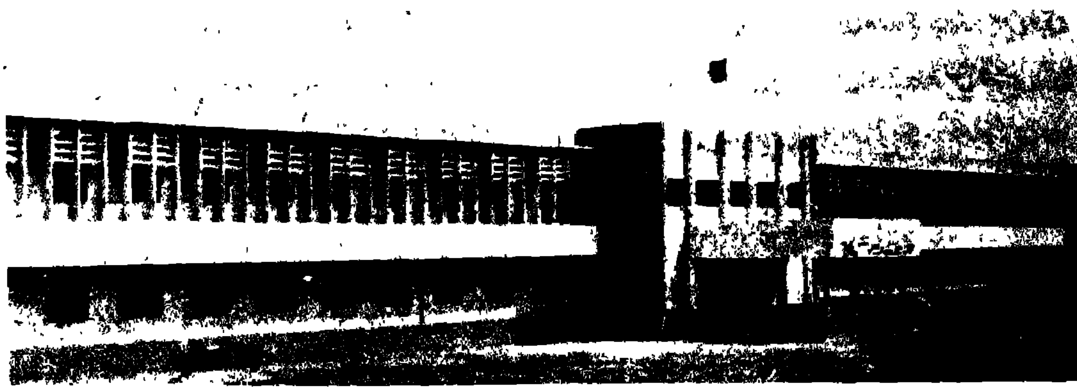
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

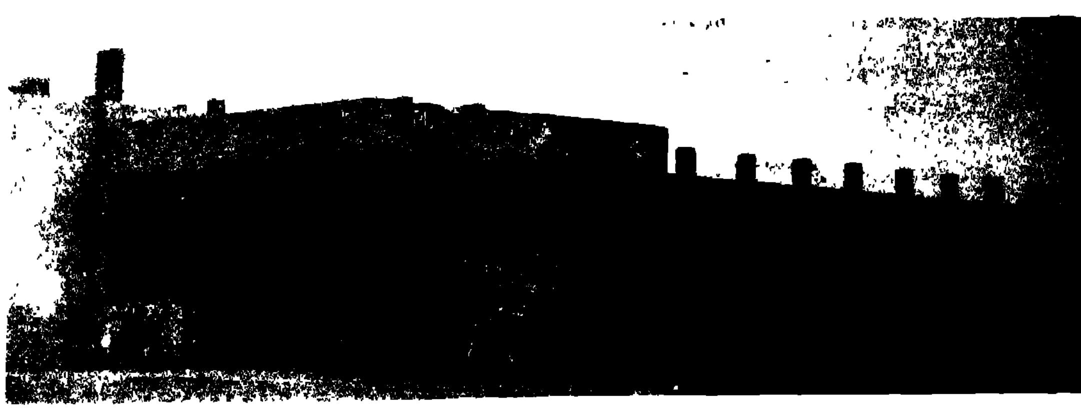
بصد شکریہ

ترجمان القرآن









وفاقی گورنمنٹ
اردو سائنس کالج
ماضی ـــــ حال ـــــ مستقبل

تمہید

وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کی وسیع و عریض عمارت شاہراہ جامعہ پر کراچی سرکلر ریلوے کے قریب واقع ہے۔ کالج ہذا کو ادارۂ ترقیات کی اسکیم نمبر ۲۴ گلشن اقبال میں اہم مقام حاصل ہے جہاں اساتذہ اور طلباء کے لئے نہایت موزوں اور پرسکون تعلیمی ماحول میسر ہے۔ کالج کے کیمپس کا رقبہ ۶ر۱۹ ایکڑ ہے۔ کالج کی عمارت سے متصل بابائے اردو مولوی عبدالحق یادگاری کتب خانہ کی سہ منزلہ عمارت زیر تعمیر ہے۔ اقامتی اردو سائنس کالج (موجودہ وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج) کی بڑی عمارت اور اس کا کیمپس اردو سائنس کالج کے اس ترقیاتی منصوبے کا ایک حصہ ہے جس کی ابتدار جناب اختر حسین صاحب سابق صدر مجلس منتظمہ اردو کالج نے کی تھی۔ یہ صاحب موصوف ہی کی کاوشوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اردو سائنس کالج کو ایک پرفضا علاقہ میں اتنی بڑی زمین مل گئی۔

پاکستان کا قیام برصغیر کے مسلمانوں کی ملی زندگی کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ مسلمانوں نے یہ قطعہ زمین اس لئے حاصل کیا تھا کہ یہاں اپنی ملی، تہذیبی اور تمدنی روایات کو پھر سے زندہ کریں۔ لہٰذا نئے ملک کے حصول کے ساتھ ملت اسلامیہ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اردو سائنس کالج کا قیام انہی ذمہ داریوں کو اپنے وسائل کے مطابق قبول کرنے کی ایک درخشاں مثال ہے۔ یہ کالج پاکستان کا واحد ادارہ ہے جہاں اعلیٰ جماعتوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہے اس طرح ہمارے طلبہ کو اپنی صلاحیت اور شخصیت کے اظہار کا موقعہ ملتا ہے۔ اس درسگاہ میں سائنس کی

اعلیٰ تعلیم نہایت کامیابی سے دی جاتی ہے۔ اس نظام کی ستائش مرکزی حکومت کے تحقیقاتی کمیشن نے بھی کی ہے۔

۱ وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج، کراچی ملک کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے جہاں قومی زبان میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس ادارہ میں اس وقت ۲۶۰۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں جن میں ۳۸۵ طالبات بھی شامل ہیں۔ اس قومی درسگاہ میں دور جدید کے تمام بنیادی و اطلاقی سائنس مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے اور ایم ایس سی کی سطح تک تدریس کا انتظام ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قومی زبان اردو میں سائنس و فنیات کے تمام مضامین کی تدریس کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اردو سائنس کالج ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسی فعال تحریک کا نام ہے جس کا بنیادی مقصد سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک گیر راہیں استوار کرنا ہے تاکہ ہم دیگر ترقی یافتہ ممالک سے قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں اپنی قومی زبان کو ترجیح دیتی ہے۔ قومی زبان سائنس کی تفہیم و تعلیم کی علم بردار ہوتی ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے بدیسی زبان کے ذریعہ ترقی حاصل کی ہو۔ ہر قوم کی ترقی خود اپنی زبان کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ پاکستانی قوم اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل ہے لیکن ہم سائنس کے میدان میں اسی صورت میں ترقی کر سکتے ہیں جب ہم حقیقی معنوں میں بدیسی زبان کو ترک کر دیں اور اپنی قومی زبان کو تعلیمی و سرکاری دائرہ کار میں اس کا جائز مقام متعین کریں۔ اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے ہمارا ملک ہر امکانی خفیہ ذخائر و وسائل سے مالا مال ہے۔ دنیا کی زرخیز ترین زمینوں کے ہم مالک ہیں۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ان وسائل کو بروئے کار لاکر ملک و قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں۔ عزم و ہمت، عمل پیہم، جد و جہد ہماری قوم کا طرۂ امتیاز رہا ہے، ہمارے ملک میں افرادی قوت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہمارا قومی جذبہ ان کاوشوں میں معاون ہے۔ محدود وسائل کے باوجود ہماری ملکی معیشت ترقی کی راہ پر گامزن ہے لیکن ہمارا ترقی پذیر ملک اس وقت تک ترقی یافتہ ملک کی صف میں شامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ سائنس و ٹیکنالوجی میں بھی ترقی نہ کرے اور اس ترقی کا راز قومی زبان ہی کو ذریعہ تعلیم بنانے میں مضمر ہے۔

حصول پاکستان کی تحریک میں دو ہی جذبے کارفرما تھے ایک اسلام کی سربلندی اور دوسرے اردو کا فروغ۔ وقت کا اہم تقاضہ یہ ہے کہ ملّی وحدت فکر و نظر کو بیدار کیا جائے اور قومی زبان اردو کو پورے ملک میں ہر سطح پر اپنایا جائے۔ پاکستان میں اردو سائنس کالج بحیثیت ایک قومی ادارہ، اسی مقصد کا علم بردار ہے۔

تاریخی پس منظر

برصغیر پاک و ہند مسلمانوں کے علم و حکمت اور تہذیب و ثقافت کا وہ عظیم گہوارہ رہا ہے کہ جس کے نقش آج بھی پاک و ہند کی تاریخ میں نمایاں ہیں۔ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب، مغلوں سے انگریزوں کے عہد تک اگر وسعتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو کوئی علاقہ اور کوئی دَور ایسا نظر نہیں آئے گا جہاں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے نقش ثبت نہ ہوں۔ دُور جانے کی بات نہیں انیسویں صدی کو سامنے رکھیں تو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے نقش پورے برصغیر پر واضح نظر آئیں گے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد سر سید احمد خانؒ کا نام تاریخ کے اوراق پر بحرفِ جلی نظر آتا ہے اور یہی وہ مقدس و محترم ہستیاں ہیں جنہوں نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی نگہبانی کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ خوابیدہ مسلم قوم کی بیداری کے لئے اپنی قیمتی عمریں نثار کر دیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کی زندگی پر مایوسی کے بادل چھا گئے تھے اور قوم بلندی سے پستی کے غاروں میں گرتی جا رہی تھی ایسے میں ایک مردِ مجاہد سر سید احمد خان سامنے آئے اور انہوں نے مسلمانوں کو ایک نیا رخ دیا۔ ان میں زندگی کی حرارت پیدا کی اور اپنے رفقائے کار کے ساتھ ملکر علم و عمل کا ایک ایسا عظیم پیکر بن گئے جس نے زندگی کے ہر شعبے کو منور کر دیا اور وہ مسلمان جو اپنی تباہی و بربادی پر ماتم کناں تھے۔ دوبارہ اس قابل ہو سکے کہ اپنی جدوجہد سے اپنی کھوئی ہوئی منزل کی مراد پا سکیں اور یہ سب کچھ سر سید کی حکمتِ عملی کی بدولت ہی ممکن ہو سکا۔

یوں تو سر سید احمد خان نے بہت سے اہم کارنامے انجام دئے مگر ہم یہاں ان کے تعلیمی کارناموں پر طائرانہ نظر ڈالیں گے جس کی بدولت سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد پڑی کیونکہ قومی مرض کی تشخیص میں سر سید نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس بیمار قوم کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ علاج یہ ہے کہ قوم میں علم کی روح پھونک دی جائے اور اس میں تعلیم سے رغبت پیدا کی جائے اور یہ تعلیم محض رسمی نہ ہو بلکہ ایسی تعلیم ہو جو دل پر اثر کر کے روح کی گہرائیوں میں اُتر جانے کی قوت رکھتی ہو۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ انگریزی زبان بھی سیکھی جائے تاکہ وہ علوم جو مغرب سے مشرق میں لائے جائیں اور ان سے استفادہ کیا جا سکے اور انہیں
۱ اپنی زبان میں منتقل کر کے اپنی قوم کو نئی معروضات سے واقفیت بہم پہنچانے کا موقعہ فراہم کیا جائے خصوصاً وہ سائنسی علوم، جو

مغرب کی ترقی کی بنیاد تھے۔ چناں چہ اس سلسلہ میں ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ مغربی علوم کا اردو میں ترجمہ کرکے اسے مقبول بنایا جائے کیونکہ سرسید اور ان کے رفقارِ کار کو یہ یقین تھا کہ جب تک مغربی علوم لوگوں کو اپنی قومی زبان میں حاصل نہ ہوں گے اس وقت تک ملک و قوم کی ترقی ممکن نہیں چنانچہ سوسائٹی نے تصنیف و تالیف و ترجمہ کے ذریعہ مسلمانوں کی جو خدمت انجام دی ہیں وہ ڈھکی چھپی نہیں اور اس کی بدولت مسلمان قوم احساسِ کمتری کے حصار کو توڑنے میں کامیاب ہوسکی جو اس دور میں مسلمانوں کی ناکامی کا ایک اہم سبب تھی۔ اس اعتبار سے سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی نے مسلمانان پاک و ہند کی جو عظیم خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہیں جس کے اثرات آج بھی نمایاں ہیں

سرسید نے جس کام کا آغاز ہندوستان میں کیا تھا اس مشن کو پاکستان میں سرسید کے تعلیمی ادارہ ہی کے فارغ التحصیل چند ہونہار فرزندوں نے اپنی ذاتی کاوشوں سے بڑے شوق و ولولہ کے ساتھ ' حیاتِ نو' بخشی۔

اس جذبے کی تکمیل کا متحرک مظہر اردو سائنس کالج، کراچی ہے جہاں سائنسی علوم کے فروغ کے لئے بھرپور کوششیں کی جارہی ہیں اور یہ قومی ادارہ اس ضمن میں ایک مرکزی کردار ادا کر رہا ہے۔



ولیعہد بزم سائنس میجر آفتاب حسن ۱۹۵۸ء اور سید سبط نبی نقوی کے ہمراہ

ابتدائی دور

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم و مغفور نے انجمن ترقی اردو کی عمارت میں قومی زبان کے فروغ کی خاطر ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی اردو کالج کی ابتدا کی۔ صاحب موصوف کا مقصد تھا کہ پاکستان میں ایک ایسا قومی ادارہ قائم کیا جائے جس میں پاکستان کے ہر خطہ اور علاقہ کے طلبہ اپنی قومی زبان اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں اس ادارہ میں درس و تدریس کے علاوہ طلبہ میں قومی شعور، بلند کرداری، اخوت، یگانگت اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوسکے۔ بابائے اردو نئی مملکت میں ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کے طالب تھے جو صحیح معنوں میں دلی کالج، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور جامعہ عثمانیہ کی جانشین ہو جس میں مختلف علوم، فنون، سائنس وفنیات، تجارت و قانون، طب و حکمت کے مختلف ادارے قائم ہوں اور جو نئے دور کے تقاضوں کی تکمیل کرسکے لیکن افسوس ہے کہ بابائے اردو کی زندگی میں ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

۱۹۴۹ء میں جب اردو کالج کی ابتدا کی گئی تو دس اساتذہ کے ساتھ ۹۵ طلبہ زیرِ تعلیم تھے۔ الحاج محی الدین صاحب، سابق ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن کالج کے پہلے اعزازی پرنسپل مقرر کئے گئے۔ ۱۹۵۱ء میں مجلسِ نظار اردو کالج نے جناب میجر آفتاب حسن صاحب کی خدمات ملٹری اکیڈمی کاکول سے حاصل کیں۔ صاحب موصوف نے ایم ایس سی کی تعلیم مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے حاصل کی تھی اور تقسیم سے قبل حیدرآباد دکن کے محکمۂ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے اور تعلیمی و انتظامی امور میں وسیع تجربہ کے حامل تھے انہوں نے اردو کالج کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جناب میجر آفتاب حسن صاحب ۸ سال تک اردو کالج کے پرنسپل رہے۔ ۱۹۵۹ء میں مجلسِ نظار کی تشکیلِ نو کے بعد علیگڑھ ہی کے ایک فارغ التحصیل وسیع تعلیمی تجربہ کے حامل استاد جناب کرنل عطار الرحیم صاحب کالج کے سربراہ مقرر کئے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں اردو سائنس کالج کے موجودہ پرنسپل جناب پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن صاحب کو اردو کالج (ڈگری سیکشن) کے وائس پرنسپل کی ذمہ داری سونپی گئی۔

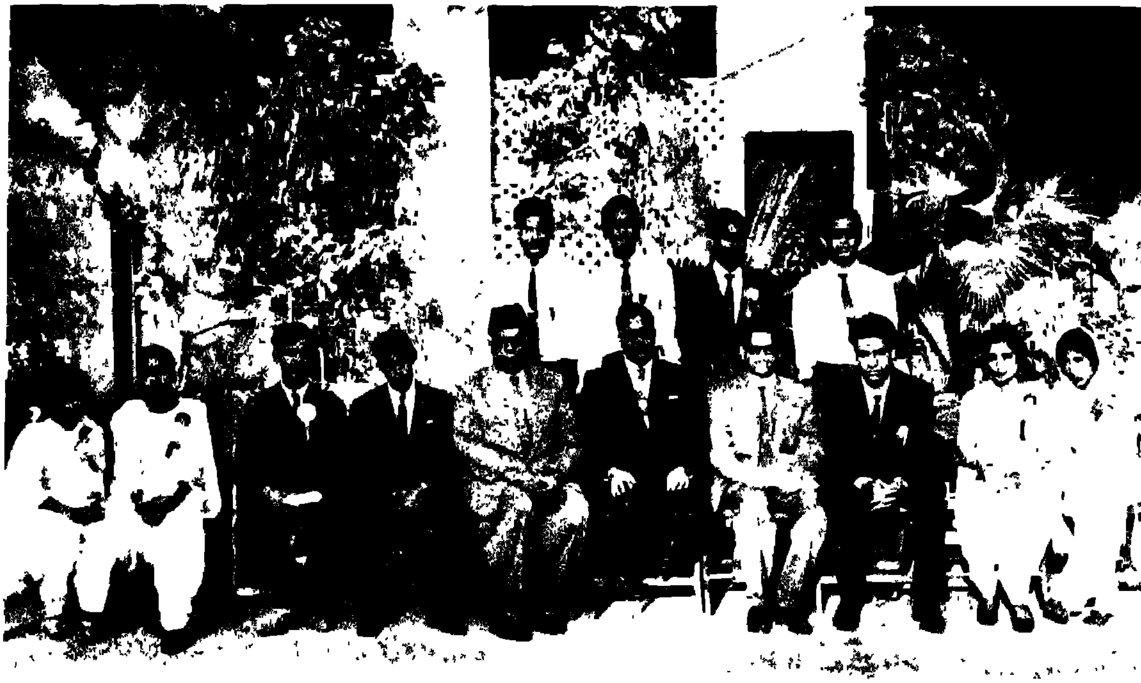
۱۹۵۰ء میں تجارت کی بھی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ کالج کا الحاق کسی یونیورسٹی سے نہیں تھا۔ لیکن ایک سال کے بعد کالج کے معیارِ تعلیم کا جائزہ لینے کے بعد سندھ یونیورسٹی نے قومی زبان کی اہمیت کے پیشِ نظر، سابق وزیرِ تعلیم حکومت پاکستان کی سفارش پر الحاق منظور کرلیا۔ اس کے بعد یہ قومی کالج ترقی کی راہ پر گامزن ہوگیا ۱۹۵۳ء میں شعبۂ قانون کا اضافہ عمل میں آیا اور ۱۹۵۴ء میں شعبۂ

سائنس کی ابتدا کی گئی مالی دشواریوں کی وجہ سے پہلے سال جغرافیہ اور ریاضی اختیاری مضامین رکھے گئے لیکن رفتہ رفتہ نباتیات، حیوانیات، کیمیا، طبعیات اور آخر میں ارضیات کا اضافہ کیا گیا۔ یہ کالج پاکستان کا واحد ادارہ ہے جہاں ایم ایس سی تک مختلف سائنسی مضامین کی تدریس اردو میں ہوتی ہے۔

اردو کالج کی قدیم عمارت طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ناکافی تھی۔ قدیم عمارت شہر کے ایک گنجان علاقہ میں واقع تھی۔ علاوہ ازیں قدیم عمارت میں توسیع کی گنجائش نہیں تھی۔ سائنس کے تجربہ خانے چھوٹے اور غیر معیاری تھے۔ یہ معاملہ کالج کی انتظامیہ کے لئے ابتدا ہی سے حل طلب تھا۔ آخر کار ۱۹۶۳ء میں سابق انتظامیہ کالج نے حکومت سے یونیورسٹی روڈ پر ۶ ر ۱۹ ایکڑ زمین حاصل کر لی۔ ادارۂ ترقیات کراچی نے اردو کالج کے عظیم کارناموں اور اعلیٰ کارکردگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بہت کم نرخ پر زمین دی۔ ماہر تعمیرات کے مشورے سے اردو کالج کے نئے کیمپس کی تعمیر کے لئے جامع منصوبے تیار کئے گئے۔ جناب اختر حسین صاحب، صدر انجمن ترقی اردو و اردو کالج کی اپیل پر حکومت نے ایک گراں قدر رقم بطور بلڈنگ گرانٹ عنایت کی اس کے علاوہ پاکستان کے دیگر عوامی اداروں اور مخیر حضرات نے عطیوں سے نوازا۔ ۱۲ر مئی ۱۹۶۴ء کو اردو کالج کے نئے کیمپس میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب مرحوم سابق صدر پاکستان نے سائنس بلاک کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ۱۹۶۶ء میں فراہم شدہ ۲ لاکھ روپے کے سرمائے سے اردو کالج (سائنس بلاک) کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ ۱۹۶۷ء میں خرابیٔ صحت کی بنا پر جناب کرنل عطاء الرحیم صاحب پرنسپل کے عہدے سے مستعفی ہو گئے اور جناب جمیل الدین عالی صاحب کو کالج کا ناظم نامزد کیا گیا۔ یکم جون ۱۹۶۸ء کو پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن صاحب کو سینیئر وائس پرنسپل مقرر کیا گیا اور پھر جنوری ۱۹۶۹ء میں قائم مقام پرنسپل بنا دیا گیا۔ اگست ۱۹۶۹ء میں سائنس بلاک کے سامنے کا حصہ اور پیچھے کے دونوں اطراف کے حصے پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں کالج کا پچھلا حصہ بھی مکمل ہو گیا۔

اردو کالج (قدیم عمارت) میں تجربہ خانوں اور تدریسی کمروں کی خستہ حالات کے پیشِ نظر اکتوبر ۱۹۶۹ء میں سائنس کے تمام شعبوں کو ہنگامی طور پر اقامتی کالج (سائنس بلاک) میں منتقل کر دیا گیا اور سائنسی شعبوں کی تنظیم نو کی خاطر پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن صاحب کو نئی عمارت میں تعینات کیا گیا۔

۷۰-۱۹۶۹ء کا پہلا تعلیمی سال نئے کیمپس میں انتہائی صعوبتوں میں گزرا، دیواریں تو کھڑی تھیں لیکن دروازے اور کھڑکیاں غائب۔ ایام سرما میں اساتذہ و طلبہ مسلسل تکلیف برداشت کرتے رہے لیکن درس و تدریس کا سلسلہ ہر حالت میں



بزم سائنس ۱۹۶۵ء



۱۹۶۲ء میں بزم سائنس کے ارکان کرنل عطاء الرحیم اور مہمان فضل احمد کشمیر والا کے ہمراہ

جاری رہا۔ آخر کار اپریل میں دروازے اور کھڑکیاں لگائی گئیں۔ فرش پر پلاسٹر بھی کرا دیا گیا۔ پانی کی سپلائی کا بہتر انتظام کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں مجلس منتظمہ اردو کالج کے مختلف با اثر اراکین کی اپیل پر چندے کی فراہمی کی کوشش کی گئی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی اور کالج کی تعمیر کا کام ادھورا ہی رہ گیا۔ اس وقت سائنس بلاک مکمل ہو چکا ہے جس پر تقریباً ۳۲ لاکھ روپے لاگت آچکی ہے۔ امید ہے کہ وفاقی حکومت کی امداد سے بقیہ بالائی منزل کی تعمیر موجودہ تعلیمی سال میں مکمل ہو جائے گی۔

وسطی دور

اردو کالج عرصے سے مالی بحران کا شکار تھا۔ خاص طور پر سالِ تعلیمی ۷۱-۱۹۷۰ء اور ۷۲-۱۹۷۱ء تو انتہائی پریشان کن گزرے۔ تجربہ گاہوں میں عملی کاموں کے لئے ضروری سامان فراہم نہیں کئے جا سکتے تھے، اساتذہ اور طلبہ بار بار انتظامیہ کالج کی توجہ حل طلب مسائل پر مبذول کراتے رہے۔ مالی دشواریوں کے پیشِ نظر صدر اردو کالج نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد مرکزی حکومت سے التماس کی کہ یہ ادارہ قومی تحویل میں لے لیا جائے۔ یکم ستمبر ۱۹۷۲ء کو تمام نجی کالجوں کے ساتھ اردو کالج کو بھی قومی تحویل میں لے لیا گیا اور پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن کو پرنسپل مقرر کیا گیا۔ کالج کے جمیع اساتذہ و طلبہ نے ادارہ کو قومیانے کے بعد اطمینان کا سانس لیا اور ان میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ محکمۂ تعلیم، حکومتِ سندھ کے اعلان کے مطابق نومبر ۱۹۷۲ء میں اردو کالج کو تقسیم کرکے فنون، تجارت اور قانون پر مشتمل گورنمنٹ اردو کالج بنا دیا گیا اور اردو کالج (شعبۂ سائنس) کو گورنمنٹ اردو سائنس کالج کے نام سے ایک باضابطہ علیحدہ کالج کر دیا گیا۔ اس کا پہلا پرنسپل پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن صاحب کو بنایا گیا اس ادارے کی افادیت اور قومی اہمیت کے پیشِ نظر یکم مئی ۱۹۷۵ء سے وفاقی حکومت نے اس کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔

اساتذۂ کالج کی درخواست پر ۱۶ر جولائی ۱۹۷۸ء کو عالی جناب فضیلت مآب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب، صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج میں تشریف لائے، اساتذۂ کرام کو خطاب فرماتے ہوئے اس قومی ادارے کی تعلیمی، مالی اور رہائشی ضروریات کے سلسلہ میں نہایت فیاضانہ احکامات صادر فرمائے۔ صدر محترم نے اردو سائنس کالج کی عمارت کی خستہ حالی کا جائزہ لیتے ہوئے اساتذۂ کرام کی کارکردگی، تدریسی صلاحیتوں اور ان کے عزم اور جذبہ کو سراہا جو اس

وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج، کراچی

(تعداد اساتذہ شعبہ وار سن وار)

سال تعلیمی	شعبہ اسلامیات	شعبہ اردو	شعبہ انگریزی	شعبہ کیمیا	شعبہ طبیعیات	شعبہ ریاضی	شعبہ حیوانیات	شعبہ نباتیات	شعبہ جغرافیہ	شعبہ ارضیات	شعبہ سندھی	شعبہ شماریات	شعبہ حیاتی کیمیا	شعبہ خوردحیاتیات	میزان
١٩٥٣-٥٥ء	١	–	١	٢	٢	١	١	١	١	–	–				١٠
١٩٥٥-٥٦ء	٢	–	١	٢	٢	١	٢	١	١	١	–				١٣
١٩٥٦-٥٧ء	١	–	٢	٢	٢	٢	٢	٢	١	١	–				١٥
١٩٥٧-٥٨ء	١	٢	٢	٣	٣	٢	٢	٢	٢	١	–				٢١
١٩٥٨-٥٩ء	١	٢	٢	٥	٣	٢	٢	٢	٢	١	–				٢٣
١٩٥٩-٦٠ء	١	٢	٢	٥	٣	٣	٣	٣	٢	١	–				٢٦
١٩٦٠-٦١ء	١	٢	٢	٥	٣	٣	٣	٣	٢	٢	–				٢٨
١٩٦١-٦٢ء	١	٢	٢	٥	٣	٣	٣	٣	٢	٢	–				٢٨
١٩٦٢-٦٣ء	١	٢	٢	٥	٣	٣	٣	٣	٢	٢	–				٢٩
١٩٦٣-٦٤ء	١	٢	٢	٦	٣	٣	٣	٣	٢	٢	–				٣٠
١٩٦٤-٦٥ء	١	٢	٢	٦	٥	٢	٣	٣	٢	٢	–				٣٠
١٩٦٥-٦٦ء	١	٢	٢	٦	٥	٢	٣	٣	٢	٢	–				٣٠
١٩٦٦-٦٧ء	١	٢	٢	٦	٥	٢	٣	٣	٢	٢	–				٣٠
١٩٦٧-٦٨ء	١	٢	٢	٦	٥	٢	٣	٣	٢	٣	–				٣١
١٩٦٨-٦٩ء	١	٢	٢	٦	٥	٢	٣	٣	٢	٣	–				٣١
١٩٦٩-٧٠ء	١	٢	٢	٦	٥	٢	٣	٣	٢	٣	–				٣١
١٩٧٠-٧١ء	١	٢	٢	٦	٥	٢	٣	٣	٢	٣	–				٣١
١٩٧١-٧٢ء	١	٢	٢	٧	٥	٢	٣	٣	٢	٢	–				٣٠
١٩٧٢-٧٣ء	١	٢	٢	٧	٦	٢	٣	٣	٢	٢	–				٣١
١٩٧٣-٧٤ء	١	٢	٣	٧	٦	٢	٣	٣	٢	٢	١				٣٣
١٩٧٤-٧٥ء	١	٢	٣	٦	٦	٢	٣	٣	٢	٢	١				٣٢
١٩٧٥-٧٦ء	١	٢	٣	٦	٦	٢	٣	٣	٢	٢	١				٣٣
١٩٧٦-٧٧ء	١	٢	٣	٧	٦	٢	٣	٤	٢	٢	١				٣٥
١٩٧٧-٧٨ء	١	٢	٣	٨	٦	٢	٥	٦	٣	٢	١	١	١	–	٣١
١٩٧٨-٧٩ء	١	٣	٣	١٢	٩	٥	٨	٦	٣	٣	١	٢	٢	١	٦٠
١٩٧٩-٨٠ء	١	٣	٣	١٢	٩	٥	٨	٦	٥	٣	١	٢	٢	١	٦١
١٩٨٠-٨١ء	١	٣	٣	١٢	١١	٦	٩	٧	٥	٣	١	٢	٢	٢	٧٠
١٩٨١-٨٢ء	١	٣	٣	١٢	١١	٦	٩	٧	٥	٣	١	٢	٢	٢	٧٠

نوع کے نامساعد حالات کے باوجود تعلیم وتربیت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں صدر محترم نے کالج کے ذہین اور باصلاحیت طلبہ کے لئے ایک لاکھ روپے کا وظیفہ بھی منظور فرمایا۔ اساتذہ کی کمی کو دور کرنے کے لئے ۲۰ لکچراروں کے تقررات کے احکامات صادر کئے۔ وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کے لئے علیحدہ بورڈ آف گورنرز کی تشکیل نو کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے وفاقی وزیر تعلیم، وفاقی سیکرٹری تعلیم، میجر آفتاب حسن صاحب سابق پرنسپل اردو کالج اور کالج کے موجودہ پرنسپل پر مشتمل ایک بورڈ کی تشکیل کا اعلان فرمایا۔ وزارت تعلیم حکومت پاکستان کو احکامات صادر فرمائے کہ وہ اس قومی ادارہ کی تعلیمی، تعمیراتی و رہائشی ضروریات کی تکمیل کے لئے ہرطرح اعانت اور امداد کرے اور یہ بھی حکم صادر فرمایا کہ قومی زبان اردو کی ترقی وترویج کے سلسلہ میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم ومغفور کی اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں ایک ایسا یادگاری کتب خانہ تعمیر کیا جائے جو بابائے اردو کے شایانِ شان ہو۔ یہ بھی مزید فرمایا کہ وزارتِ تعلیم اس کتاب خانہ کی تعمیر، کتابوں اور دیگر لوازمات کے لئے تمام اخراجات برداشت کرے گی۔

اردو سائنس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کے سلسلہ میں فضیلت مآب نے اعلان کیا کہ اس پوسٹ گریجویٹ کالج کے معیارِ تعلیم کو بلند کیا جائے اور یہ کام سال چھ ماہ میں ہوسکتا ہے اگر یہ کرلیا گیا تو اس کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے گا اور وہ خود اس کا افتتاح کریں گے۔

صدر پاکستان کے احکامات کے تحت تشکیل شدہ مذکورہ بالا بورڈ کی سفارش پر اکتوبر ۱۹۷۸ء میں وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کے لئے اعلیٰ سطح پر علیحدہ بورڈ آف گورنرز کا قیام عمل میں آیا۔ وفاقی وزیر تعلیم اس بورڈ آف گورنرز کے چیرمین، وفاقی سیکرٹری تعلیم وائس چیرمین ہیں۔ کالج کے پرنسپل کو بربنائے عہدہ سیکرٹری بورڈ آف گورنرز بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں کالج کے بورڈ آف گورنرز میں ملک کے کئی نامور سائنسدان، فنی ماہرین شامل کئے گئے ہیں۔ جن کی شمولیت سے یہ تعلیمی ادارہ مستفید ہورہا ہے۔ وزارتِ تعلیم نے اس قومی ادارہ کی اہمیت کے پیشِ نظر ابتداء ہی سے اس کی تعمیر وترقی میں ہرطرح کی معاونت کی۔ وفاقی وزیر تعلیم، وفاقی سیکرٹری تعلیم کے علاوہ وزارت تعلیم کے اعلیٰ حکام متعدد بار کالج کے مسائل ومشکلات کا جائزہ لینے کے لئے کالج تشریف لائے۔ وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے اس کالج کی اعانت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کے لئے بورڈ آف گورنرز نے اپنے اجلاسوں میں کالج کی تعلیمی، تدریسی اور تعمیراتی ضروریات کا جائزہ لیا۔ بورڈ آف گورنرز کی ہدایت پر پرنسپل/سیکرٹری نے ایک نئے عزم وجذبہ کے ساتھ کالج کی ترقی کے

وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج ، کراچی

(تعداد طلبہ جماعت وار مضمون وار ۸۱-۱۹۸۰ء)

اسلامیات	اردو	انگریزی	کیمیا	طبیعیات	حیاتیات	حیوانیات	نباتیات	ارضیات	جغرافیہ	ریاضی	شماریات	حیاتی کیمیا	خورد حیاتیات
سال اول سائنس													
-	۴۸۲	۴۸۲	۴۸۲	۴۳۱	۲۲۱	-	-	۳۱	۳۱	۵۰۳	-	-	-
سال دوم سائنس													
-	۳۳۱	۳۳۱	۳۳۱	۳۰۳	۱۳۵	-	-	۳۴	۳۴	۲۶۹	-	-	-
بی۔ ایس سی سال اول													
۴۲۰	-	۴۲۰	۵۱۲	۳۳۴	-	۱۶۳	۱۶۳	۳۳۳	۱۴۰	۳۳۴	۳۵	۳۹	۳۹
بی۔ ایس سی سال دوم													
-	۲۹۲	-	۳۵۴	۲۲۵	-	۱۰۳	۱۰۳	۲۲۸	۱۲۲	۲۲۵	۳۲	۳۲	۳۲
ایم۔ ایس سی سال اول													
-	-	-	-	۱۸	-	۲۰	-	-	-	۱۶	-	-	-
ایم۔ ایس سی سال دوم													
-	-	-	-	۵	-	۹	-	-	-	۵	-	-	-

اِسلامیات

درس گاہ کے بنیادی فرائض میں یہ بھی ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے طلبہ کے کردار کی صحیح تعمیر میں وہ ان کی مدد کرے تاکہ اس کے فارغ التحصیل نوجوان ملک وملت کی مفید خدمت کے اہل ثابت ہوں۔ یہ فرض بہ طریق احسن اس وقت انجام پاسکتا ہے جبکہ مسلمان طلبہ کو اسلامی عقائد، احکامِ خداوندی اور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے اچھی طرح واقفیت بہم پہنچائی جائے اور طلبہ کو جدید سماجی اور سائنسی علوم کے پیشِ نظر اسلام اور قرآن کی تعلیم دی جائے۔ اس امر کو نظر رکھتے ہوئے ہر سال ممتاز علمائے کرام کی مختلف عنوانات پر تقاریر کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اعلےٰ ثانوی اور بی ایس سی میں اسلامیات کی تدریس لازمی ہے۔ اس وقت اس شعبہ میں دو سینئر اساتذہ تدریسی فرائض انجام دیتے ہیں۔

بیرونی طلبہ

کئی سال سے کالج کی مخصوص نوعیت کے پیشِ نظر بیرونی ممالک سے طلبہ کالج میں اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ ۶۲-۱۹۶۱ء سے اب تک اٹلی، برطانیہ، امریکہ، مصر، ایران، کویت، جاپان، اردن، فلسطین، سعودی عربیہ، فرانس یوگوسلاویہ اور مختلف اسلامی ممالک کے طلبہ اس کالج میں زیرِ تعلیم رہے ہیں انہوں نے اپنی بہترین کارکردگی اور صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ ۷۱-۱۹۷۰ء اور ۷۲-۱۹۷۱ء میں بھی وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج میں اردن، فلسطین اور کویت کے کئی طلبہ زیرِ تعلیم تھے

کتب خانہ اور دارالمطالعہ

کالج میں اساتذہ اور طلبہ کے لئے ایک وسیع دارالمطالعہ اور کتب خانہ قائم ہے جس کی ترتیب میں نصابی اور دوسری ضروریات کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ کتب خانہ میں مختلف سائنسی مضامین کی اردو زبان میں معیاری نادر اور بیش قیمت کتابیں دستیاب ہیں، طلبہ کو بک بینک سے بھی نصابی کتابیں فراہم کی جاتی ہیں۔ مستحق اور نادار طلبہ کو



طالبات کتب خانے میں مصروفِ مطالعہ



طلبہ کتب خانے میں مصروفِ مطالعہ

کو کتابیں مفت بھی دی جاتی ہیں سال تعلیمی ۷۷-۱۹۷۶ء میں کتب خانہ کی تنظیم نو کی گئی، نئے فرنیچر، برقی پنکھوں اور ٹیوب لائٹ کا انتظام کیا گیا، ایک لاکھ روپے کی لاگت سے اردو اور انگریزی میں شائع شدہ سائنسی کتابیں خریدی گئی ہیں، حال ہی میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، انسائیکلوپیڈیا آف اسپیس، انسائیکلوپیڈیا آف پلانٹس اور معارف اسلامیہ، سیرت النبیؐ، تاریخ ابن خلدون کے مکمل سیٹ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

وفاقی وزارت تعلیم نے مالی سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق یادگاری کتب خانہ کی تعمیر کے لئے ۲۹,۳۲,۵۰۰ روپے بطور گرانٹ دئے تھے۔ اس رقم سے کتب خانہ کی تعمیر کا کام شروع ہوچکا ہے۔ دسمبر ۱۹۸۱ء تک انشاءاللہ تعالیٰ کتب خانہ کی عالی شان عمارت مکمل ہو جائے گی۔

دارالمطالعہ میں طلبہ و طالبات کے لئے علیحدہ علیحدہ نشستوں کا انتظام کیا گیا ہے، طلبہ کے لئے انجمن اتحادِ طلبہ کی جانب سے ایک مستعاری کتب خانہ قائم ہے۔ کتب خانہ، فنڈ اور طلبہ بہبود فنڈ سے بھی طلبہ کے نصابی کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ یہ کتابیں ضرورت مند طلبہ کو ایک سال کے لئے جاری کی جاتی ہیں۔

جسمانی تربیت اور کھیل

طلبہ کی ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت پر بھی پوری توجہ دی جاتی ہے، میدانی کھیلوں مثلاً ہاکی، کرکٹ اور فٹ بال کی الگ الگ ٹیمیں قائم ہیں۔ علاوہ ازیں والی بال، ٹیبل ٹینس، اور بیڈمنٹن کی علیحدہ ٹیمیں بھی بنائی گئی ہیں تاکہ بین الکلیاتی مقابلوں میں شرکت کر سکیں، جیم خانہ کے نگراں کے پاس ایک سینیئر استاد ہیں، معتمدِ جیم خانہ ایک تجربہ کار کھلاڑی ہوتا ہے جو طلبہ میں سے منتخب کیا جاتا ہے۔ کالج کے وسیع کیمپس میں کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور والی بال کھیلنے کے میدان موجود ہیں جہاں کالج کے طلبہ شام کو کھیلنے کی مشق کرتے ہیں۔

نیشنل کیڈٹ کور

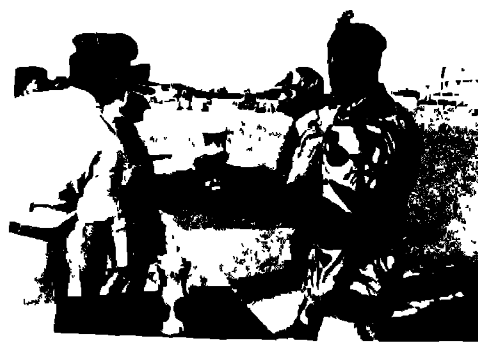
کالج میں سالِ تعلیمی ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۵۰۰ طلبہ نے اور ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۵۱۰ طلبہ نے این سی سی کی

این سی سی



نیشنل کیڈٹ کور کی تربیت کے مکمل کرنے پر اساتذہ وطالب علم اپنے پرنسپل و دیگر اساتذہ کے ہمراہ





این سی سی کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کے دو مناظر





مہمانِ خصوصی پرنسپل کالج کے ہمراہ

اتربیت یافتہ طلبہ کو سندیں اور تین بہترین کیڈٹس کو ان کی بہتر کارکردگی پر انعامات دئے گئے۔

اس وقت کالج میں ایک میجر، ایک صوبیدار اور ۳ حولدار طلبہ کی تربیت کے لئے تعینات کئے گئے ہیں جو طلبہ کو مختلف اوقات میں تربیت دیتے ہیں، نیشنل کیڈٹ کور کے اسٹاف کے لئے کالج کی عمارت میں رہائش کے انتظامات موجود ہیں۔ تربیت کے لحاظ سے کالج کی این سی سی بٹالین اعلیٰ صلاحیت کی حامل ہے۔ اساتذہ وطلبہ میں این سی سی کی تربیت کے لئے بڑا ذوق وشوق پایا جاتا ہے۔ این سی سی کی تربیت مکمل کرنے والے طلبہ کے لئے ہر سال سالانہ تقسیم انعامات کی تقریب کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس موقعہ پر ایک شاندار پاسنگ آؤٹ پریڈ ہوتی ہے۔ کالج کی این سی سی بٹالین اپنی کارکردگی کے لحاظ سے کراچی کے کالجوں کی بہترین بٹالینوں میں شمار کی جاتی ہے یہ کراچی کا واحد کالج ہے جس میں تمام اساتذۂ کرام نے این سی سی کی تربیت حاصل کی ہے۔

امتیازات

یونیورسٹی کے امتحانات میں وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کے طلبہ کی کامیابیاں حقیقت میں فخر کا باعث ہیں۔ ۷۰۔ ۱۹۶۹ء میں کالج کے ایک طالب علم اشرف صحرائی نے بی ایس سی میں اوّل درجہ اور یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن حاصل کی ۷۱۔۱۹۷۰ء میں کالج کے ایک طالب علم معین الدین نے کراچی یونیورسٹی سے بی ایس سی کے امتحان میں اوّل بہ درجہ اوّل کی پوزیشن حاصل کی۔ یونیورسٹی اور بورڈ کے امتحانات میں ہر سال کالج کی کثیر تعداد طلبہ اول درجہ میں کامیاب ہوتی رہی۔ ۱۹۷۷ء کے بی ایس سی فائنل کے سالانہ امتحان میں کالج کے طالب علم سید حسن احمد نے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ کالج سے ہر سال بی ایس سی اور انٹرمیڈیٹ سائنس کے سالانہ امتحانات میں بھی بہت سے طلبہ اول درجہ میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ پری میڈیکل اور پری انجینیرنگ میں اول درجہ حاصل کرنے والے طلبہ میڈیکل کالجوں اور انجینیرنگ کالجوں میں داخلہ حاصل کرتے ہیں۔

شعبۂ تصنیف وتالیف

کالج کا شعبہ تصنیف وتالیف اب تک الجبرا، طبعیات، کیمیا، حیوانیات، جغرافیہ اور ارضیات پر کئی کتابیں شائع کرچکا ہے جو درسگاہوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ کالج کے سالانہ جریدہ کا نام "کائنات" ہے جس میں اساتذہ وطلبہ کے معیاری سائنسی مضامین شائع ہوتے ہیں کالج نے بطور خاص البیرونی، ابن ہیثم، قائداعظمؒ نمبر اور علامہ اقبالؒ نمبر شائع کئے ہیں

کالج کے ایک سینیئر استاد شعبۂ تصنیف و تالیف کے نگراں ہیں۔

اعلےٰ جماعتوں میں سائنس کی نصابی کتابوں کی اشاعت کے لئے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے لئے وزارتِ تعلیم، حکومتِ پاکستان نے ساڑھے سات لاکھ روپے منظور کئے ہیں۔ اس رقم سے موجودہ تعلیمی سال سے نصابی کتب کی اشاعت کا آغاز کیا جارہا ہے۔ امید کامل ہے کہ دو تین سالوں میں اردو میں پوسٹ گریجویٹ سطح تک ہر مضمون کی سائنسی نصابی کتابیں شائع ہو جائیں گی اور اردو میں سائنسی کتب کی عدم دستیابی کا مسئلہ بھی کافی حد تک حل ہو جائے گا۔

رعایتِ فیس و وظائف

موجودہ حکومت کی پالیسی اور ہدایات کے مطابق ذہین، باصلاحیت اور نادار طلبہ کو زیادہ سے زیادہ مالی رعایت دی جاتی ہے، وفاقی حکومت کے احکامات کے تحت کالج کے ۲۰ فیصد طلبہ کی فیسیں معاف کی جاتی ہیں اس کے علاوہ پاکستان کے بہت سے مخیر حضرات ذہین اور غریب طلبہ کو کالج کی معرفت وظائف اور کتابیں دیتے ہیں۔ کالج کے کئی ذہین طلبہ کو حکومت کی جانب سے وظائف مل رہے ہیں مستحق اور نادار طلبہ کو طلبہ بہبود فنڈ سے امتحانی فیس ادا کی جاتی ہے، اسپورٹس، مباحثہ اور حُسنِ قرأت کے مقابلوں میں اوّل آنے والے نمایاں اور ممتاز طلبہ کو بطورِ خاص فیس کی رعایت دی جاتی ہے۔ علاوہ نادار اور باصلاحیت طلبہ کی اعانت کے لئے قرضِ حسنہ فنڈ قائم ہے۔ اس فنڈ سے بہت سے ذہین طلبہ کو سال بہ سال قرضِ حسنہ دیا جاتا ہے علاوہ ازیں ضرورت مند طلبہ و طالبات کو یونیفارم مفت فراہم کیا جاتا ہے اور پاکستان کے عنایت کردہ ایک لاکھ روپے کی رقم سے کالج کے ذہین و باصلاحیت طلبہ کے لئے وظائف فنڈ قائم ہے یہ وظائف ایسے طلبہ کو ایصال کئے جاتے ہیں جن کے والدین کی آمدنی ایک ہزار روپے سے کم ہے۔ وظیفہ فنڈ سے انٹرمیڈیٹ سائنس اور بی ایس سی کے طلبہ کو پچاس روپیہ ماہانہ اور ایم ایس سی کے طلبہ کو پچھتر روپے ماہانہ دیا جاتا ہے۔ وظیفہ کی سالانہ رقم دو قسطوں میں دی جاتی ہے

طالبات

کالج میں سائنس کی جماعتوں میں طلبہ کے ساتھ طالبات بھی تعلیم پاتی ہیں۔ کلاسوں میں ان کے لئے علیحدہ نشستوں کا انتظام ہے۔ خالی اوقات میں نشست کے لئے ان کا کمرہ مخصوص ہے، اس وقت مختلف جماعتوں میں طالبات کی تعداد ۳۲۵ ہے۔ سفید یونیفارم طالبات کے لئے لازمی ہے۔

شعبۂ تادیب

کالج میں شعبۂ تادیب قائم ہے، یہ شعبہ کالج میں نظم و نسق قائم رکھنے میں ناظم امورِ طلبہ اور پرنسپل کی مدد کرتا ہے۔ ہر سال بلند کردار طلبہ بحیثیت رضاکار مقرر کئے جاتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کے طریقۂ عمل اور عام سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہیں اور ضروری مواقع پر طلبہ کی رہنمائی کرتے ہیں کیونکہ تعلیم کا مقصد صرف ورق گردانی کرنا نہیں بلکہ طلبہ کے کردار کی تکمیل بھی ہے۔

طلبا کامن روم

حدود کالج میں طلبہ و طالبات کے لئے علیحدہ علیحدہ کامن روم موجود ہیں جہاں طلبہ فرصت کے اوقات میں بیٹھتے ہیں اور درونِ خانہ کھیلوں میں وقت گزارتے ہیں اس وقت دونوں کامن روم میں۔ ا طلبہ و طالبات کی نشستوں کا انتظام ہے

کینٹین

اس وقت کالج میں ایک کینٹین موجود ہے۔ کالج ایک اعلیٰ قسم کی کینٹین اور امدادِ باہمی اسٹور کی تعمیر کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ وہاں سے طلبہ اور اساتذہ کو ارزاں قیمتوں پر اشیائے ضرورت مل سکیں اس وقت کالج کی کینٹین سے مناسب نرخوں پر ناشتہ کا سامان مہیا کیا جاتا ہے۔ کینٹین کے معیار کو قائم رکھنے پر اور جملہ انتظامات کی نگرانی کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔

گاؤن

حدود کالج میں تمام طلبہ کے لئے سیاہ گاؤن پہننا لازمی ہے۔



طالبات نظری تدریس کے دوران



موجودہ انجمنِ اساتذہ کے اراکین پرنسپل اور معتمد ارشد حسین صدیقی کے ہمراہ



طلباء و طالبات شعبۂ کیمیا میں عملی تدریس کے دوران



طلباء و طالبات شعبۂ طبیعیات میں عملی تدریس کے دوران

ایم ایس سی کی تدریس

سال تعلیمی ۷۷-۱۹۷۶ء سے باجازتِ جامعہ کراچی کالج میں سمسٹر نظام کے تحت ایم ایس سی سالِ اوّل اطلاقی ریاضی کی تدریس کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پیشہ ورانہ تعلیم میں حسن کمال کا راز قومی زبان ہی میں مضمر ہے اردو سائنس کالج کا یہ اقدام بہ صورت ایم ایس سی تدریس قومی زبان کی وسعتوں کا عملی ثبوت ہے تعلیمی سال ۷۹-۱۹۷۸ء سے طبعیات اور حیوانیات میں بھی ایم ایس سی کی تدریس شروع ہو چکی ہے۔

حال ہی میں جامعہ کراچی نے ایم ایس سی فائینل ریاضی کے سالانہ امتحان کے نتائج کا اعلان کیا ہے۔ اس امتحان میں وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج سے ۱۲ طلبہ شریک ہوئے تھے ان میں سے ۱۱ طلبہ اول درجہ میں اور ایک دوم درجہ میں کامیاب ہوا۔ نتیجہ صد فی صد رہا۔

شعبۂ ارضیات

معدنیات اور تیل جو ملک کی ترقی کے بہت ہی اہم جز ہیں ان کے حصول کے لئے ارضیات کی تعلیم بہت ہی اہم ہے۔ قیام پاکستان کے وقت صرف ڈھاکہ اور لاہور میں ارضیات کی تعلیم کا انتظام یونیورسٹی کی سطح پر تھا۔ کراچی یونیورسٹی میں اردو سائنس کالج کے ذریعہ ۱۹۵۴ء میں یہ شعبہ وجود میں آیا۔ اردو سائنس کالج اس لحاظ سے پاکستان کا واحد قومی ادارہ ہے جہاں ارضیات کی تعلیم انٹرمیڈیٹ سطح پر بھی دی جاتی ہے۔ اس کالج کا طالب علم میٹرک کے بعد ہی ارضیات کا انتخاب کر سکتا ہے اور ایم ایس سی کر کے ماہر ارضیات بن کر نکلتا ہے

شعبۂ ارضیات میں بی ایس سی تک تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ شعبہ دو تجربہ خانوں اور ایک اعلیٰ میوزیم پر مشتمل ہے۔ اس شعبہ سے سالانہ چھ سو طالب علم مستفید ہوتے ہیں۔

شعبۂ کیمیا

طلبہ کی تعداد کی نسبت سے شعبہ کیمیا سب سے بڑا شعبہ ہے جس میں طلبہ کی تعداد پچیس سو اور اساتذہ کی



اساتذہ کرام (شعبہ ریاضیات) پرنسپل کے ہمراہ



اساتذہ کرام (شعبہ کیمیا) پرنسپل کے ہمراہ

تعداد بارہ ہے۔ ان میں سے ایک پروفیسر، چار مددگار پروفیسر اور بقیہ سات لکچرار ہیں۔ ایک استاد پی ایچ ڈی اور دو ایم فل ہیں۔ اس شعبہ میں تین تجربہ گاہیں موجود ہیں جو جدید آلات سے مزین ہیں، ہر تجربہ خانے میں بیک وقت ۴۰۔ ۴۰ طلبہ کو عملی کام کرایا جا سکتا ہے۔

شعبۂ طبیعیات

یہ کالج کا دوسرا سب سے بڑا شعبہ ہے۔ اس شعبے میں ایم۔ ایس سی کی تعلیم کا انتظام ہے اس میں چار اعلیٰ

تجربہ گاہیں ہیں اس شعبہ میں ۲۲۰۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں جو ایک پروفیسر، دو مددگار پروفیسر اور سات لکچراروں سے مستفید ہوتے ہیں

ومعیاری تجربہ گاہیں موجود ہیں اس شعبہ میں ۲۲۰۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں جو ایک پروفیسر، دو مددگار پروفیسر اور آٹھ لکچراروں سے

اس شعبہ کے لئے بیرونِ ملک سے جدید ترین آلات وساز و سامان درآمد کئے جاتے ہیں جن سے ایم ایس سی تک کے

طلبہ استفادہ کر رہے ہیں۔ اس شعبہ میں کالج کے سینئر ترین اساتذہ تدریسی فرائض انجام دیتے ہیں۔

شعبۂ حیوانیات

شعبۂ حیوانیات اردو سائنس کالج میں ان دو شعبوں میں سے ہے جن میں بی ایس سی کی تدریس سب سے پہلے ۱۹۵۸ء میں شروع ہوئی۔ اس کی ابتدا گنتی کے چند طلبہ اور صرف ایک استاد سے ہوئی تھی۔ تجربہ خانہ بھی نباتیات کے ساتھ مشترک تھا۔ اس وقت اس شعبہ کی ترقی کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اب یہاں ایم ایس سی کی تدریس بھی ہوتی ہے اس وقت اس شعبے میں ایک ہزار طلبہ ہیں جن کی تعلیم کے لئے ایک پروفیسر، تین مددگار پروفیسر اور پانچ لکچرار موجود ہیں ان میں دو اساتذہ پی ایچ ڈی ہیں۔ اس شعبہ میں اس وقت دو تجربہ گاہیں جدید آلات سے مزین اور ایک شاندار عجائب خانہ بھی موجود ہے۔ شعبۂ حیوانیات میں ایم ایس سی کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ اس شعبہ کے کئی اساتذہ صاحبِ تصنیف بھی ہیں۔

جن کے تحقیقی مقالے بیرونِ ملک جرائد میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

شعبۂ نباتیات

یہ شعبہ بھی حیوانیات کی طرح ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے۔ ایک پروفیسر، ایک مددگار پروفیسر اور پانچ لکچرا



اساتذہ کرام (شعبہ طبعیات) پرنسپل کے ہمراہ



اساتذہ کرام (شعبہ حیوانیات) پرنسپل کے ہمراہ



اساتذہ کرام (شعبہ نباتیات) پرنسپل کے ہمراہ



اساتذہ کرام (شعبہ ریاضی) پرنسپل کے ہمراہ

اپنے علمی تجربے اور لیاقت سے ایک ہزار طلبہ کو بہرہ ور کرنے میں مصروف عمل رہتے ہیں۔ اس شعبہ میں دو تجربہ گاہیں اور ایک وسیع عجائب خانہ ہے۔ اس شعبہ میں تحقیق کاموں کے لئے بھی سہولتیں موجود ہیں۔

شعبۂ ریاضی

سائنسی دور میں ریاضی کے بغیر سائنسی تعلیم کا تصور بھی محال ہے لہٰذا کالج کا یہ شعبہ بھی قدیم ترین ہے اس شعبہ میں ایم ایس سی کی بھی تعلیم ہوتی ہے طلبہ کی ضرورتوں کے پیش نظر اس شعبہ میں ایک پروفیسر، ایک مددگار پروفیسر اور چار لکچرار ہیں۔ اس شعبہ کا شمار کالج کے اہم شعبوں میں ہوتا ہے۔ اس شعبہ کے طلبہ کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے۔

شعبۂ جغرافیہ

یہ کالج کا قدیم ترین شعبہ ہے۔ چونکہ اس مضمون کی تعلیم فنون اور سائنس دونوں کے طلبہ حاصل کرتے ہیں ماضی میں کئی اعلےٰ تعلیم یافتہ اساتذہ اس سے منسلک رہے ہیں [illegible]ء میں جب شعبہ سائنس کو موجودہ عمارت میں منتقل کیا گیا تو شعبۂ جغرافیہ بھی سائنس کا ایک مکمل شعبہ بن گیا۔ اس شعبہ سے منسلک ایک پروفیسر، ایک مددگار پروفیسر اور تین لکچرار ہیں جن میں سے ایک پی ایچ ڈی اور ایک ایم ایس (امریکہ) ہے۔ شعبۂ جغرافیہ کالج کا ایک اہم شعبہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس شعبہ میں جدید ترین آلات وساز وسامان کا انتظام ہے۔ شعبۂ جغرافیہ وارضیات کا عجائب خانہ مشترک ہے۔ عجائب خانہ میں چٹانوں اور معدنیات کے اعلیٰ ونادر نمونے ہیں جن میں بیرونِ ملک سے درآمد شدہ معدنی نمونے بھی شامل ہیں

شعبۂ خورد حیاتیات

اس شعبہ کا قیام ۱۹۷۸ء میں عمل میں آیا۔ اس میں صرف بی ایس سی کی تعلیم ہوتی ہے۔ حالاں کہ شعبہ نیا ہے پھر بھی جدید ترین آلاتِ سائنس سے مزین ہے اس شعبہ میں ۱۵۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں اور دو اعلےٰ صلاحیتوں کے حامل اساتذہ تدریسی فرائض انجام دیتے ہیں۔



اساتذۂ کرام (شعبہ جغرافیہ) پرنسپل کے ہمراہ



اساتذۂ کرام (شعبہ حیاتی کیمیا) پرنسپل کے ہمراہ

شعبۂ حیاتی کیمیا

خورد حیاتیات کی طرح یہ شعبہ بھی ۱۹۷۰ء میں قائم کیا گیا۔ دو اساتذہ صاحبان ۱۵۰۰ طلبہ کی تعلیم کے لئے اس شعبہ سے وابستہ ہیں۔ اس شعبہ میں ایک اعلیٰ درجہ کا تجربہ خانہ بھی ہے۔ جس میں جدید ترین آلات موجود ہیں

شعبۂ شماریات

شماریات کا شمار آج ان مضامین میں ہوتا ہے جن کا تعلق علوم و فنون کے ہر اس مضمون سے ہے، جہاں تحقیق کے طریقوں میں کئی طریقے کا رواج ہے اور ہر شعبۂ زندگی میں شماریات کی ضرورت پڑتی ہے۔ کالج میں اس شعبہ کا آغاز ۱۹۷۸ء میں ہوا۔ اس وقت دو اساتذہ اس شعبے سے وابستہ ہیں اور ایک سو طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔

منصوبے

وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کے لئے عظیم منصوبے بنائے گئے ہیں جن کی رفتہ رفتہ تکمیل ہو رہی ہے۔ پنج سالہ منصوبے ۸۳-۱۹۷۸ء کی تفصیل درج ذیل ہے:

- پورے منصوبے کی لاگت تقریباً چھ کروڑ نواسی لاکھ روپے سے زائد ہوگی
- تعمیری منصوبے کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے میں اب تک سائنس بلاک کی ایک منزل کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے اور بالائی منزل زیرِ تعمیر ہے۔ کتب خانے کی عظیم الشان سہ منزلہ عمارت کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا ہے فرشی منزل کی تکمیل ہو چکی ہے۔
- دوسرے مرحلے میں موجودہ یک منزلہ عمارت کی تکمیل کے علاوہ اوپر دو منزلوں کا اضافہ کیا جائے گا، تاکہ کلاس اور تجربہ خانوں کی ضروریات پوری ہو جائیں۔



خواتین اساتذہ پرنسپل کے ہمراہ



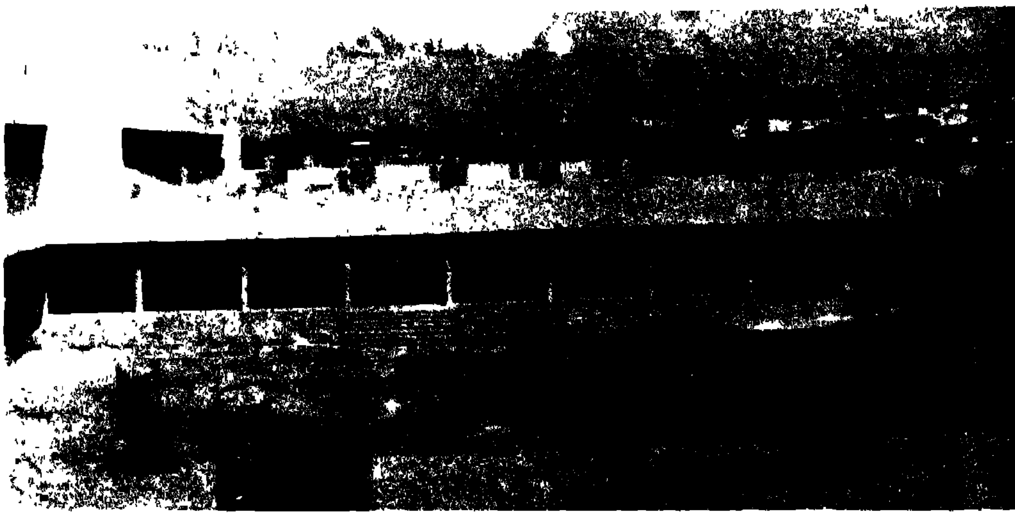
اراکین کمیٹی کتب خانہ پرنسپل کے ہمراہ



کالج کا بیرونی منظر



اندرونی منظر



عمارت کا اندرونی منظر



عجائب خانہ شعبۂ حیوانات

اس کے علاوہ ایک سماعت گاہ، طلبہ و طالبات کے لئے رہائش گاہ، اساتذہ اور عمال دفتر کے لئے رہائشی مکانات، جامع مسجد، امداد باہمی کے اسٹور، جمنازیم، چہار دیواری اور کالج کے خواتین سیکشن کی عمارت کی تعمیر منصوبہ میں شامل ہے۔

عمارتیں ایسی بنائی جائیں گی جو ظاہری خوبیوں کے ساتھ ساتھ ممکنہ سہولتوں کی بھی حامل ہے۔ کالج کے ماحول کو زیادہ سے زیادہ جاذب نظر اور صحت بخش بنانے کے لئے چمن بندی اور شجرکاری کے بھی منصوبے بنائے گئے ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ شجرکاری کا سارا منصوبہ سائنسی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ کھیل کے میدان میں جیم خانہ، آڈیٹوریم، تیراکی کا تالاب بھی منصوبے میں شامل ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ایک اقامتی درسگاہ کی تعلیمی ضرورتوں اور سہولتوں کو مدنظر رکھ کر تعمیراتی نقطۂ نظر سے وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کا کیمپس مجموعی طور پر قدیم اور جدید طرز کا اچھوتا نمونہ ہوگا۔

مُستقبل

وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج بحمدللہ اس وقت ایک روشن مستقبل کی دہلیز پر پہنچ چکا ہے اور اردو یونیورسٹی کا قیام جو گذشتہ تیس سالوں سے خواب نظر آتا تھا، اب ایک جیتی جاگتی حقیقت کی صورت میں متشکل ہوتا نظر آرہا ہے۔ اس قومی درسگاہ میں کئی مضامین میں ایم ایس سی کی تدریس پہلے ہی بطریق احسن جاری ہے صرف اسے وسعت دینے اور رسمی طور پر یونیورسٹی کا نام دینے کی ضرورت ہے۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کا نظریہ محض ایک خواہش نہیں بلکہ ملّی ضرورت ہے۔ ملّی ضرورت اس وجہ سے کہ وطن عزیز کی ملّتِ اسلامیہ کو مربوط و منضبط رکھنے کے دو ہی ذریعے ہیں۔ ایک "اسلام" اور دوسرا قومی زبان "اردو"۔ اسلام ایک نظریۂ حیات بن کر ملّت کو جوڑ رکھے ہے اور اردو رابطہ کا ذریعہ بن کر درہ خیبر سے ساحلِ مکران تک برادرانِ وطن کو منسلک رکھتی ہے۔ مشرقی پاکستان بھی پچیس سال تک ان ہی دونوں ذرائع کی مدد سے مربوط رہا۔ اگر یہ دونوں ذریعے کمزور نہ کر دئے گئے ہوتے تو



طلبا و طالبات شعبہ حیاتی کیمیا میں عملی تدریس کے دوران



طلبا و طالبات کالج لان میں

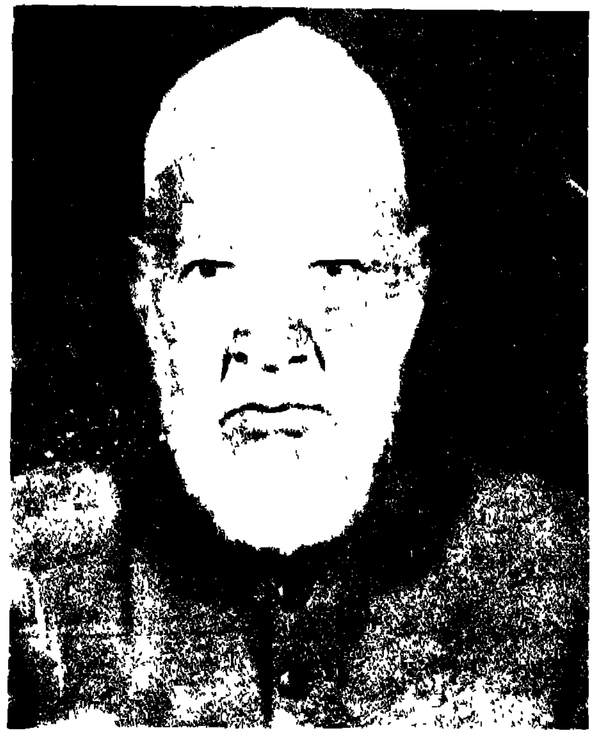
مشرقی خطہ ہم سے کبھی جُدا نہ ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری موجودہ حکومت ان دونوں عوامل کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہے۔ اور اس نے اسلام کے نام پر قائم ہونے والی اس سب سے بڑی مملکت کے اتحاد و استحکام کی خاطر بے شمار عملی اقدامات کئے ہیں۔ ملت اسلامیہ کو متحد کرنے کے لئے اسلام آباد میں اسلامی یونیورسٹی کا قیام مستحسن شگون ہے۔ وطنِ عزیز میں باہمی روابط، یکجہتی اور یگانگت کے فروغ کے لئے قومی زبان اردو کی ہر شعبۂ حیات اور ہر سطح پر ترویج و ترقی کی بھی بھرپور کوششیں جاری ہیں۔ ایسے وقت میں اردو یونیورسٹی کا قیام بلاشبہ ایک ایسا مثبت قدم ہوگا جس کے نتیجے میں قومی وحدتِ فکر اجاگر ہوگی۔

موجودہ تعلیمی سال میں اردو سائنس کالج اور اردو کالج کو ملا کر سات ہزار سے زائد طلبہ و طالبات زیرِ تعلیم ہیں۔ مستقبل قریب میں ان دونوں اداروں میں طلبہ کی تعداد دس ہزار سے تجاوز کر جائے گی، یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد اس کی مرکزی حیثیت ہوگی جس میں علاقے، رنگ اور نسل کی تفریق سے بالاتر ہر شخص وطنِ عزیز کا یکساں طالبِ علم ہوگا۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ساتھ جب بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق یادگاری کتب خانہ کی تین منزلہ پرشکوہ عمارت، کالج کی مرکزی سہ منزلہ عمارت، طالبات سیکشن، اقامت گاہیں، کالج ہال، جامع مسجد اور جمنازیم وغیرہ کی تعمیرات مکمل ہو جائیں گی تو نو اردو یونیورسٹی کیمپس اس عظیم تر کراچی میں ایک جدید اور نادر طرزِ تعمیر کا نمونہ ہوگا۔ جسے دیکھ کر ہر پاکستانی کو نہ صرف اپنے قومی تشخص کا احساس ہوگا۔ بلکہ جذبۂ مسرت کے ساتھ وہ اپنا سر فخر سے بلند کر سکے گا۔

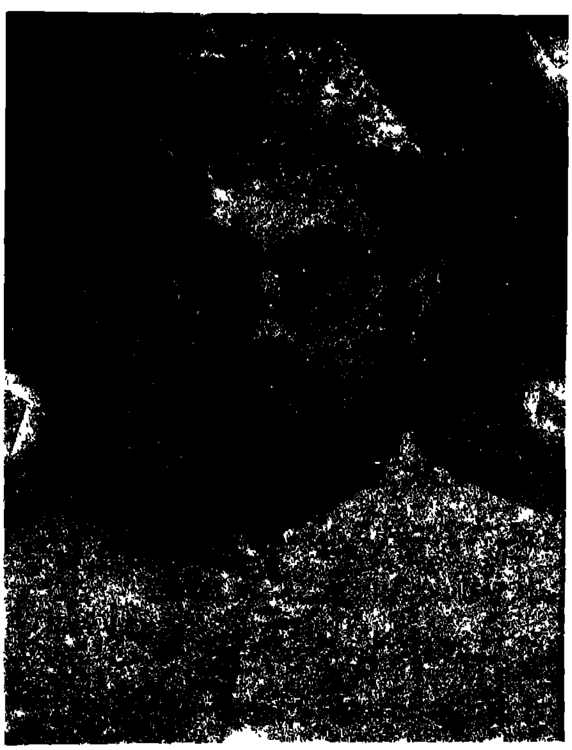


۱۹۶۳ء میں بزمِ سائنس کے افتتاح کے موقع پر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اساتذہ و طلباء



مولوی محی الدین صاحب

کالج کے بانی پرنسپل



میجر آفتاب حسن

کالج کے سابق پرنسپل



کرنل عطاء الرحیم

کالج کے سابق پرنسپل



پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن

کالج کے موجودہ پرنسپل

مختار اشرف
لائبریرین

مولوی عبدالحق کتب خانہ

وفاقی حکومت اردو سائنس کالج

اردو سائنس کالج پاکستان کا واحد کالج ہے جہاں سائنسی مضامین کی پوسٹ گریجویٹ تک اردو زبان میں بھی تعلیم دی جاتی ہے اردو ہماری مادری زبان ہے۔ اس کی ترویج و ترقی دراصل ملک و قوم کی ترویج و ترقی ہے۔ ہم اپنے قومی و ملی فرض کی ادائیگی کے لئے کوشاں ہیں۔

مولوی عبدالحق مرحوم نے جب اردو کالج قائم کیا تو اس کے ساتھ ہی ایک کتب خانہ بھی قائم کیا۔ اس کتب خانے کا شمار پاکستان کے اہم ترین کتب خانوں میں کیا جاتا ہے۔ اس میں تمام قدیم جدید موضوع پر کتابیں جمع کرنے کی کامیاب کوشش نے کتب خانے کی اہمیت کو بے انتہا اجاگر کردیا ہے۔

اردو کالج کی ترقی نے تنگئ داماں کا احساس اجاگر کیا۔ قدیم عمارت میں جگہ کی قلت محسوس ہونے لگی تو اس دور کے صدر مملکت جنرل ایوب خان نے کالج کی اہمیت انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوئے گلشن اقبال میں موجودہ قطعہ زمین عطا فرمایا۔

کالج کے شعبہ سائنس کو اردو کالج میں جگہ کی کمی کے باعث ۱۹۶۹ء میں کالج کی موجودہ عمارت میں منتقل کردیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سائنسی کتب بھی جو اس شعبے کے لئے ضروری تھیں منتقل کردی گئیں۔ اردو سائنس کالج ۷۱-۱۹۷۰ ۷۲-۱۹۷۱ء کے تعلیمی سال کے دوران مالی بحران کا شکار رہا۔ اس وجہ سے کتب خانہ میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہوسکا۔ ۱۹۷۲ء میں حکومت نے تمام نجی کالجوں کو اپنی تحویل میں لے لیا اس کے بعد ۷۵-۱۹۷۴ء کے تعلیمی سال میں صوبائی حکومت نے کتب خانے کیلئے ایک ہزار روپے برائے خریداری سندھی کتب   اسی سال طلبہ کے لئے نہایت ضروری نصابی کتابوں کی خریداری بھی کی گئی۔

یکم مئی ۱۹۷۵ء کو وفاقی حکومت نے اردو سائنس کالج کو اپنی تحویل میں لے لیا اور انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے بورڈ آف گورنرز مقرر کردیا۔

۷۶-۱۹۷۵ء کے دوران وفاقی حکومت نے کالج کو سائنسی آلات، فرنیچر اور کتب کی خریداری کے لئے خاطر خواہ امداد دی اس طرح کتب خانے میں خاطر خواہ کتب کا اضافہ ہوا۔ وفاقی حکومت کے تحویل میں لئے جانے کے بعد سے اب تک کتب خانے

میں سائنسی و حوالہ جاتی کتب میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

۱۹۷۵ء میں وفاقی حکومت کی تحویل میں آنے کے بعد کتب خانے کی تنظیم نو کی گئی جس میں ہمارے محترم پرنسپل جناب محمد اکرام الرحمٰن صاحب نے بنفس نفیس دلچسپی لی۔ کتب خانہ کے لئے الماریاں دارالمطالعہ، فرنیچر کی خریداری کے ساتھ ساتھ طلبہ و طالبات و اساتذہ کے لئے علیحدہ نشستوں کا اہتمام بھی کیا گیا۔

۷۷-۱۹۷۶ء سے وفاقی حکومت اردو سائنس کالج میں ایم ایس سی ریاضی کے بعد بتدریج ایم ایس سی طبیعات و ایم ایس سی حیوانیات کے مضامین میں بھی کلاسیں شروع ہو گئیں ان مضامین کے لئے خصوصی فنڈ مختص کئے گئے اور ان سے درج بالا مضامین کے لئے ضروری کتب خریدی گئیں۔ اسی دوران کالج ہذا کے اندر ڈگری جماعتوں میں کچھ نئے مضامین جن میں حیاتی کیمیا خورد حیاتیات اور شماریات شامل ہیں۔ شروع کئے گئے۔ اور ان مضامین میں بھی نصاب کے مطابق جدید ترین کتب حاصل کی گئیں۔

کتب خانہ کے حوالہ جاتی شعبہ میں موجود ۶ انسائیکلوپیڈیا کے علاوہ ضخیم لغات بھی خریدی گئیں۔ موجودہ لائبریری دو شعبوں پر مشتمل ہے

۱ (۱) عمومی شعبہ

(۲) حوالہ جاتی شعبہ

(۱) عمومی شعبہ:۔ اس شعبہ سے طلبہ و طالبات کو کارڈ پر دو ہفتہ کے لئے کتابیں جاری کی جاتی ہیں۔

حوالہ جاتی شعبہ:۔ اس شعبہ سے طلبہ و طالبات شناختی کارڈ جمع کر کے مطالعہ کے لئے دارالمطالعہ کے اوقات کار میں کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں انسائیکلوپیڈیا، لغات، حوالہ جاتی نصابی کتب کے علاوہ مختلف حوالہ کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ کتب خانے کے ساتھ اس کے دو ذیلی حصے بھی ہیں۔

(۱) بک بینک

(۲) مستعاری کتب خانہ

(۱) بک بینک:۔ بک بینک کالج ہذا میں وفاقی حکومت یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے تعاون سے ۱۹۷۵ء میں قائم کیا گیا ہے۔

(۲) مستعاری کتب خانہ:۔ مستعاری کتب خانہ ہمارے کالج کے محترم پرنسپل محمد اکرام الرحمٰن صاحب نے طلبہ بہبود فنڈ سے قائم کیا ہے۔

طلبہ و طالبات کی سال بہ سال کتب خانے کی ممبر شپ کی تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔

تعلیمی سال	کل تعداد طلبہ	ممبر کتب خانہ	فیصد
۱۹۷۴-۷۵	۶۲۵	۴۶۲	۷۳٫۹۲
۷۵-۷۶	۸۵۳	۵۱۲	۶۰٫۰۹
۷۶-۷۷	۱۲۰۹	۹۸۷	۸۰٫۰۴
۷۷-۷۸	۱۵۶۰	۱۰۹۵	۷۰٫۲۰
۷۸-۷۹	۱۹۷۵	۱۲۲۰	۶۷٫۳۴
۷۹-۸۰	۲۳۹۰	۱۸۷۰	۷۳٫۱۰

نو تعمیر مولوی عبدالحق لائبریری:۔

وفاقی حکومت اردو سائنس کالج کے لئے ۲ جولائی

۱۹۷۸ء ایک تاریخی دن تھا۔ اس دن صدرِ پاکستان فضیلت مآب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر پاکستان کالج ہذا تشریف لائے۔ موجودہ کتب خانہ میں اساتذہ کالج کو خطاب فرماتے ہوئے کئی احکامات صادر فرمائے۔ جس میں صاحب موصوف نے حکم دیا کہ کالج کے کتب خانے کی عمارت کی تعمیر کرائے کتب خانے کو بابائے اردو کے شایانِ شان بنایا جائے اور اس سلسلے میں کتب اور فرنیچر کے اخراجات وفاقی حکومت ادا کرے گی۔

ان احکامات کے پیشِ نظر کالج ہذا سے ملحق ایک علیحدہ کتب خانے کی عمارت کی تعمیر شروع ہو چکی ہے۔ جس کا رقبہ ۱۶,۸۰۰ (سولہ ہزار آٹھ سو) مربع فٹ ہے۔

یہ کتب خانہ مرحلوں میں تکمیل کے مراحل طے کرے گا۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد کتب خانہ ہوگا۔ اس میں سائنس سے متعلق مضامین کے علاوہ درج ذیل مضامین پر کتابیں رکھی جائیں گی۔ تاکہ یہ ایک طرح کی حوالہ جاتی لائبریری بھی کہی جاسکے۔

(۱) مذہب	(۲) سماجی علوم
(۳) لسانیات	(۴) سائنس
(۵) فنیات	(۶) فنون
(۷) ادبیات	(۸) جنرل جغرافیہ و تاریخ

اس میں مندرجہ ذیل شعبہ ہوں گے۔

لائبریری ← ذیلی شعبہ

عمومی شعبہ — حوالہ جاتی شعبہ — مائیکروفلم کا شعبہ

مستعاری شعبہ — بک بینک کا شعبہ

(۱) عمومی شعبہ:- یہ شعبہ کتب خانے کا عام شعبہ ہوگا۔ جہاں سے نصاب سے متعلق کتب طلبہ و طالبات کو ۱۵ یوم کے لئے جاری کی جائیں گی۔

(۲) حوالہ جاتی شعبہ:- اس شعبہ کے اندر طلبہ بیٹھ کر مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہاں سے طلبہ کتب باہر لے جانے کے مجاز نہ ہوں گے۔

(۳) مائیکروفلم کا شعبہ:- یہاں ایسی سلائیڈز ہوں گی جہاں طلبہ کو سائنس کی نئی ایجادات کے تحفظات کے بارے میں بتایا جائے گا۔ اس کے لئے متصل آڈیٹوریم کا بھی انتظام ہوگا۔ جہاں جدید سائنسی تحقیقات کے مطالعے کا خاطر خواہ اضافہ کیا جائے گا۔

لائبریری کے ساتھ اس کے دو ذیلی شعبوں بھی قائم ہوں گے۔

(۱) مستعاری شعبہ:- یہاں سے نادار اور غریب طلبہ و طالبات کو سال بھر کے لئے مفت مستعد ضمانت پر کتابیں جاری کی جائیں گی۔

(۲) بک بینک:- اس شعبہ سے طلباء و طالبات کی کتب کی ۷۵ فیصد رقم ناقابلِ واپسی وصول کر کے ایک سال کے لئے دی جائیں گی۔ تاکہ طلباء پر مالی بوجھ نہ پڑ سکے۔

اس کے علاوہ کتب خانے میں ایک جدید سیکشن منسٹریل کا بھی ہوگا۔ جہاں جدید ٹائپ رائٹر، سائیکلو اسٹائل مشینیں، اس کے علاوہ ایک عدد فوٹو کاپیر بھی نصب ہوگا۔ طلبہ کی بیشتر تحقیقاتی ضروریات کو پورا کیا جائے گا۔ اس طرح حصولِ علم میں سہولت ہو جائے گی۔

کتب خانے کے اندر مندرجہ ذیل کمرے مختص

کئے جائیں گے۔

(۱) لائبریرین کا کمرہ
(۲) آفس
(۳) طلبہ و طالبات کے لئے مطالعہ کا علیحدہ علیحدہ کمرہ
(۴) کیٹلاگ کا کمرہ
(۵) حوالہ جات کا کمرہ
(۶) آڈیٹوریم
(۷) اساتذہ کے لئے تحقیق کا کمرہ

مولوی عبدالحق لائبریری جو کہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔ اس کے موجودہ پلان کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک منفرد لائبریری ہو گی جس سے طلبا زیادہ سے زیادہ فیض اٹھا سکیں گے



"سمپوزیم سائنس" ۱۹۶۳ء۔

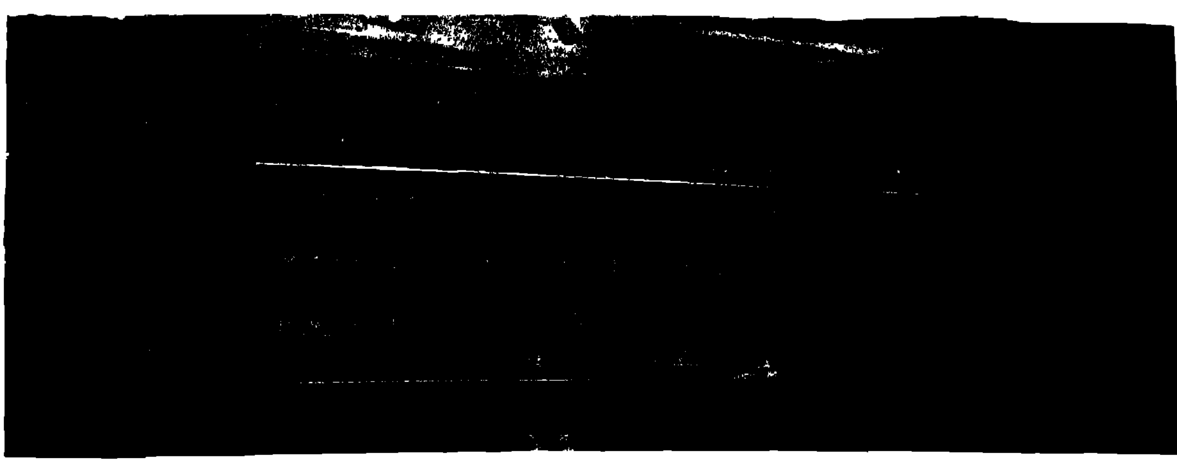
کتب خانہ وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج، کراچی

تعداد کتب علمی وار و اضافہ کتب سن وار

نام مضمون	۱۹۶۸-۶۹ء	۱۹۶۹-۷۰ء	۱۹۷۰-۷۱ء	۱۹۷۱-۷۲ء	۱۹۷۲-۷۳ء	۱۹۷۳-۷۴ء	۱۹۷۴-۷۵ء	۱۹۷۵-۷۶ء	۱۹۷۶-۷۷ء	۱۹۷۷-۷۸ء	۱۹۷۸-۷۹ء	۱۹۷۹-۸۰ء	۱۹۸۰-۸۱ء
علمیات	-	-	-	-	-					-	۵	۵	۵
اسلامیات	-	-	-	-	-	۱۰	۱۰	۵۹	۶۰	۶۱	۶۱	۶۱	۶۱
سیاسیات	-	-	-	-	-	-	۲۴	۲۴	۲۴	۲۶	۲۴	۲۴	۲۴
تجارت	-	-	-	-	-	-	-	۱۲	۱۲	۱۲	۱۳	۱۴	۱۲
ریاضی	۳۹۲	۳۹۲	۵۱۲	۵۹۲	۶۰۱	۶۰۷	۶۲۸	۷۰۵	۹۱۱	۹۲۱	۹۲۱	۱۱۰۰	۱۱۵۶
شماریات	-	-	-	-	-	-	۵	۵	۵	۲۶	۲۹	۷۹	۹۲
طبیعیات	۳۵۹	۳۶۹	۵۸۲	۶۲۰	۶۳۳	۶۳۱	۶۹۵	۸۲۱	۸۵۱	۹۹۷	۱۰۰۰	۱۱۳۳	۱۲۸۱
کیمیا	۳۳۰	۳۵۱	۳۸۹	۳۹۹	۵۰۳	۵۴۰	۵۴۲	۶۲۸	۷۱۳	۷۷۹	۶۳۹	۷۸۱	۹۹۱
ارضیات	۵۰	۹۲	۲۲۰	۲۲۲	۲۲۹	۳۳۹	۲۵۳	۳۰۱	۳۱۹	۳۳۷	۳۵۷	۳۸۷	۴۷۳
حیاتیات	۱۳۰	۱۳۹	۱۶۷	۱۷۷	۱۷۷	۱۷۷	۱۷۷	۱۷۷	۱۷۸	۱۸۳	۱۹۰	۱۸۳	۱۸۳
حیاتی کیمیا	-	-	-	-	-	-	-	-	-	۲۶	۳۱	۶۱	۸۱
نباتیات	۲۲۰	۲۳۰	۲۸۱	۲۹۰	۲۹۵	۳۰۱	۳۸۸	۴۷۱	۵۳۲	۵۵۳	۵۵۶	۶۵۱	۷۳۲
حیوانیات	۲۰۰	۲۱۳	۲۱۳	۲۳۰	۲۲۱	۲۲۱	۲۹۱	۳۵۲	۳۸۳	۳۲۳	۳۶۳	۵۳	۶۵۳
اردو ادب	۱۲۰	۱۳۱	۱۴۰	۱۴۰	۱۵۹	۱۷۵	۱۹۵	۲۸۳	۲۸۸	۲۸۸	۲۸۸	۲۸۸	۳۲۶
سندھی ادب	-	-	-	-	-	-	۲۰	۱۶۳	۱۶۳	۱۶۳	۱۶۳	۱۶۳	۱۶۳
انگریزی ادب	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۱۶	۱۶	۵۳	۵۵	۵۵	۵۵	۵۵	۵۵
جغرافیہ	۳۶	۳۰	۶۱	۶۱	۶۱	۷۹	۸۰	۱۵۳	۱۷۳	۱۹۳	۱۹۳	۲۲۶	۲۵۵
سوانح حیات	-	-	-	-	-	-	-	۱۳۲	۱۳۲	۱۳۲	۱۳۲	۱۳۲	۱۳۲
تاریخ اسلام/تاریخ عام	-	-	-	-	-	۲	۲	۵۰	۵۰	۵۰	۵۰	۵۰	۵۰
حوالہ جات و معرفات	۱۵۱	۱۷۰	۱۹۸	۲۰۳	۲۰۷	۲۰۷	۲۰۹	۲۰۱	۲۲۱	۲۸۰	۲۸۳	۳۱۷	۳۱۷
لائبریری سائنس	-	-	-	-	-	-	-	۲	۲	۲	۲	۴۱	۴۱
خورد حیاتیات	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	۶۷	۱۰۲
	۲۲۳۲	۲۳۵۳	۲۷۹۸	۳۰۹۸	۳۱۲۹	۳۲۳۵	۳۶۰۹	۴۷۵۳	۵۳۰۸	۵۳۲۳	۵۹۱۷	۶۳۷۷	۷۵۹۳

انسائیکلوپیڈیا

۱ـ	انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ترجمہ)	۱۵ جلدیں
۲ـ	انسائیکلوپیڈیا آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی	۱۰ جلدیں
۳ـ	انسائیکلوپیڈیا برٹینکا	۳۲ جلدیں
۴ـ	انسائیکلوپیڈیا سوشل سائنس	۸ جلدیں
۵ـ	انسائیکلوپیڈیا اسپیس فلائٹ	۱ جلد
۶ـ	انسائیکلوپیڈیا آف ورلڈ جیوگرافی	۱ جلد
۷ـ	انسائیکلوپیڈیا آف ارتھ	۱ جلد
۸ـ	انسائیکلوپیڈیا آف [illegible]	۱ جلد
۹ـ	انسائیکلوپیڈیا آف فزکس	۱ جلد
۱۰ـ	انسائیکلوپیڈیا آف اسپیکٹر	۱ جلد
۱۱ـ	انسائیکلوپیڈیا آف [illegible]	۱۳ جلدیں
۱۲	سائنٹفک بائیوگرافی	۲۲ جلدیں
۱۳ـ	انسائیکلوپیڈیا آف فوٹوگرافک ریکارڈ نیوٹرون	۱ جلد
۱۴ـ	انسائیکلوپیڈیا آف [illegible]	۱ جلد
۱۵ـ	انسائیکلوپیڈیا آف کمپیوٹر سائنس	۱ جلد
۱۶ـ	انسائیکلوپیڈیا آف اکولوجی	۱ جلد
۱۷ـ	انسائیکلوپیڈیا آف [illegible]	۱ جلد



اردو سائنس کالج کا زیرِ تعمیر بابائے اردو مولوی عبدالحق کتب خانہ

جناب ضیاء الدین فصیحی

اردو سائنس کالج اور میں

ڈی جے کالج کے وسیع اور قدیم کیمپ کے تجربہ خانہ میں سخت گرمیوں کے دن ہیں۔ اور حیران و پریشان طلباء کا ایک گروپ پریکٹیکل کے امتحان میں مشغول ہے۔ اس امتحان کو لینے کے لئے ایک لحیم شحیم۔ قوی الجثہ انتہائی مرعوب کن شخصیت آئی ہوئی تھی۔ جو کہ طلباء کے پاس خود جاکر ان کی دلجوئی اور ہمت افزائی کر رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ممتحن کو پورا پورا علم ہے کہ یہ امتحان صرف طلباء کی لیاقت اور قابلیت کا ہی نہیں ہے بلکہ ان کی جسمانی قوت کا بھی ہے۔ کیونکہ یہ تین دنوں تک متواتر لیا جاتا ہے۔ آخری دن کیمسٹری امتحان کا مرحلہ بھی آیا۔ میں بھی اس بدحال اور پریشان زدہ گروہ میں شامل تھا۔ امتحان اللہ اللہ کر کے ختم ہوا۔ لیکن ممتحن نے ہر طالب علم کو جتنا متاثر کیا اس کا اندازہ بہت مشکل ہے۔

جلیل الدین احمد خان (صدر شعبہ انگریزی اردو کالج) چند ماہ بعد میرے پاس آئے۔ (یہ میرے پرانے شفیق اور استاد بھی ہیں) اور بتایا کہ پرنسپل اردو کالج میجر آفتاب حسن نے یاد فرمایا ہے۔ یہ وہی بزرگ تھے جو کہ ممتحن کی حیثیت سے چند ماہ قبل میرا امتحان لے چکے تھے۔

ان کا ارادہ اردو کالج میں سائنس کی تدریس شروع کرنے کا ہے۔ میرے والد کا انتقال چند ماہ قبل ہو چکا تھا۔ اور مجھ کو ذریعہ معاش کی فکر لاحق تھی۔ اور یہ موقع بہت مناسب اور خدا کی طرف سے تھا۔

۱۹ سال کا انتہائی ناتجربہ کار نوجوان طالب علم ایک معمولی شیروانی اور پاجامہ میں ملبوس اردو کالج صبح دس بجے جناب جلیل احمد خان کے پاس پہنچ گیا۔ جنھوں نے مجھ کو میجر صاحب کے دفتر میں جاکر کھڑا کر دیا اور حسب دستور دفتر میں دوسرے اساتذہ موجود تھے۔ ایک علمی ادارے کا مشغول دفتر تھا۔ میجر صاحب نے انتہائی مشفقانہ اور بزرگانہ انداز میں سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا۔

"میاں! آپ کو ملازمت کی تلاش ہے؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کب سے کام شروع کر سکتے ہیں؟"

"جب سے آپ حکم کریں لیکن میرے سپرد کیا کام ہوگا؟"

"آپ کو تجربہ خانے کی صفائی اور دیکھ بھال اور

عملی تدریس کرنی ہوگی۔ اس کے علاوہ جب میں خود موجود نہ ہوں تو نظری تدریس بھی کرنی ہوگی۔"

یہ ایک بی۔ ایس۔ سی آنرز کے طالب علم کے لئے بہت مناسب اور میرے لئے خصوصی طور پر بہت اچھا موقع تھا۔ میں نے فوراً تائید کردی۔ لیکن یہ انٹرویو ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اسکا بہت اہم پہلو ابھی باقی ہے۔ "کیا معاوضہ ہوگا" اس سوال کے لئے میں بالکل تیار نہ تھا۔ گویا کہ یہ بہت ضمنی اور ذیلی بات تھی۔ میں نے بغیر پس و پیش کے کہا۔ "کہ آپ مجھے وہی رقم جو کہ میرے والد ہر ماہ روانہ کرتے تھے۔ عنایت فرمادیں یعنی ۷۵ روپیہ ماہانہ یہ میرے میٹھارام ہوسٹل میں رہنے کا خرچ ہوتا ہے۔ اور جب میری فیس جمع کرنے کا وقت آئیگا میں عرض کردوں گا۔" میجر صاحب نے بہت غور سے میری طرف دیکھا اور انتہائی شفقت سے فرمایا کہ "میاں منظور ہے۔"

ایک یتیم نوجوان کو ایسا لگا کہ اس کو خدا نے پھر سے والد کی سرپرستی اور شفقت کا ہاتھ رکھنے والا والد عطا کر دیا ہے۔ لیکن میرے لئے اس وقت ایک انتہائی غیر معمولی اور غیبی عمل تھا۔ جو کہ بہت ہی مناسب طور پر طے پایا۔ مجھ کو اس کا ذرہ برابر بھی علم نہ تھا کہ دس سالہ رفاقت ایک مضبوط اور پختہ عمارت کی بنیاد بن جائے گی۔ اور میرے تدریس تربیت کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ یہ تھا پہلا تقرر اس وفاقی اردو سائنس کالج میں جسکا آپ ۲۵ سالہ جشن منارہے ہیں۔

اس ۳۰ سال کے وقفہ کے بعد آج میں پھر اس کے متعلق سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ کل کی بات ہے اور اس شفیق استاد نے جس نے ایک دن بھی مجھ کو باقاعدہ بٹھا کر درس نہیں دیا۔ لیکن رموز زندگی، لین دین۔ تدریسی نکات۔ اونچ نیچ اور انسانی میکانیت جس طرح آسان زبان اور اپنے عمل سے سمجھائی ہے شاید بڑی سے بڑی یونیورسٹی اور ٹیچرز ٹریننگ کالجوں میں کبھی بھی میسر نہ ہوگی۔

میں نے انگلستان میں ۱۶ سال پڑھایا۔ وہاں ۸ سال تک پورے سائنس کے شعبے کا صدر رہا۔ کراچی کے مختلف تدریسی اداروں میں ۱۵ سال پڑھایا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ لیکن جو خزانہ اس مرد مجاہد نے عطا کیا اور جو علم کا فیض اس نے پہنچایا وہ ابھی تک خالی نہ ہوا ہے اور نہ ہی ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ میں ہی کیا میرے جیسے ہزارہا اصحاب ہیں جو اس کی صحت اور زندگی کے لئے ہمیشہ دست بہ دعا ہیں اور رہیں گے۔

میں نے ملازمت طالب علم ڈیمانسٹریٹر کی حیثیت سے ستمبر ۱۹۵۲ء میں شروع کی اور اسی سال اردو میں سائنسی تدریس کا آغاز ہوا۔ میں نے سمجھا تھا کہ صفائی اور تجربہ خانے کو چاق و چوبند کرنے اور عملی تدریس کے علاوہ میرا اور کوئی اہم کام نہ ہوگا۔ اردو میں درس و تدریس کا نہ مجھے کوئی تجربہ تھا اور نہ ہی کوئی اندازہ کہ میں کچھ کرسکتا۔ لیکن آفتاب حسن صاحب نے دوسرے دن سے سالِ اول سائنس میں کیمیا کی نظری تدریس میرے سپرد کردی۔ انکار کرنا بھی اگر چاہتا تو ان کے سامنے یہ ہمت نہ ہوسکتی تھی۔ ان کا بزرگانہ رویہ اور ادب و تعظیم اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ حکم کے مطابق میں نے پورے طور پر عملی اور نظری تدریس شروع کردی اور آفتاب حسن صاحب کی مصروفیات بڑھتی رہیں اور میرا یہ معمول بن گیا کہ ہوسٹل میں بیٹھ کر پورا لیکچر لکھتا۔ اردو کے الفاظ اور اصطلاحات

جمع کر لیا۔ اللہ بھلا کرے حیدرآباد دکن میں یہ کوشش ہو چکی تھی وہاں سے ہم کو ورثہ میں اردو کی تحریر کردہ کئی اچھی کتابیں اور اچھی خاصی اصطلاحات بھی ملیں۔ جس سے مدد مل جاتی تھی لیکن اس کے علاوہ اہم ترین مسئلہ طلباء کو کلاس میں پڑھانا تھا۔ اس کے لئے مشق کے علاوہ میجر صاحب سے ہر وقت مشورہ اور رہنمائی حاصل کی گئی۔ کیمیاء میں میرے تقرر کے بعد کالج میں عسکری امام صاحب (مرحوم) کا تقرر ہوا۔ وہ طبعیات کی تدریس فرماتے تھے۔ یہ میرے ہم جماعت اور بہت عزیز دوست تھے۔ ان کی علمی تدریس اور اردو زبان سے   سے طلباء کو بہت فائدہ پہنچا۔ علاوہ ازیں ریاضی کے استاد جناب حنفی صاحب نے بھی سائنس اور آرٹس میں اپنے مضمون سے متعلق فرائض بہ احسن وخوبی انجام دیئے۔

ہم لوگوں کے پاس تجربہ خانہ اور فرنیچر کے لئے کوئی رقم نہ تھی اور نہ کسی خاص امداد کی امید۔ بے سروسامانی اور غربت جو کہ اس وقت کا خاص طرۂ امتیاز تھی پوری طرح اپنے حصار میں پابند کئے ہوئے تھی۔ میجر صاحب نے چند بہت پرانی کھانے کی میزوں کو حاصل کیا اور ان کو کیمیاء کے تجربے کے لئے ضروری سامان سے آراستہ کیا گیا۔ پانی اور گیس کا نام بھی نہیں لے سکتے تھے بس چند ٹنکی اور بالٹیوں کا انتظام ہو گیا۔ طلباء خود ہی پانی بھرتے اور استعمال شدہ پانی کی بالٹی خالی کرتے۔ موجودہ اردو آرٹس کالج کی دو عمارتوں کے درمیان جو سائبان بنے ہیں۔ ان میں کیمیاء اور طبعیات کی تجربہ گاہیں قائم کی گئیں۔ اور ایک کلاس روم سائنس کے لئے مختص کر دیا گیا۔ میجر صاحب سامان کے لئے چند ہزار روپوں کا انتظام بہت تگ و دو کے کرنے میں کامیاب ہوئے

طبعیات کی تدریس میں عسکری امام صاحب کو بہت دشواری اٹھانی پڑی جس کی گواہی طبعیات کے موجودہ استاد کاظم مہدی صاحب جو اس وقت ہونہار طالبعلم تھے دے سکتے ہیں۔ ہمیں اس وقت اپنی بے سروسامانی کا احساس بالکل نہ تھا بلکہ یہ چیلنج کام کرتا تھا۔ اور کام کی دھن کے علاوہ ہر مشکل کو آسان کرنے کی کوشش صرف پرنسپل اور اساتذہ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کوشش میں طلباء جس اپنائیت اور محبت کا ثبوت دیتے تھے ہماری کامیابی کی ضمانت بنی۔

کلاس روم بالکل زینے کے نیچے رکھا گیا۔ یہ بات کچھ دنوں کے بعد سمجھ میں آئی کہ میجر صاحب سیڑھیوں پہ آتے جاتے ہم لوگوں کے لیکچر سنتے۔ اردو میں تدریسی طرز وطریقہ پر خاص نگاہ رکھتے اور اپنے مشوروں سے نوازتے۔ ہم لوگ تجربہ خانوں کے لئے آلات وسامان غزالی صاحب سے مستعار لیا کرتے تھے۔ اور پھر استعمال کے بعد واپس کر دیا کرتے۔

سال اول و دوئم میں دوسرے سال طلبہ کی مجموعی تعداد چالیس ہو گئی۔ صرف ۳ مضامین ریاضی۔ کیمیاء اور طبعیات کی تدریس شروع کی جاسکتی تھی۔ تیسرے سال میں حیاتیات اور ارضیات کے شعبے قائم ہوئے۔ اس وقت بدرالحسن صاحب لیکچرار طبعیات۔ بہاؤالدین صاحب لیکچرار ریاضی کے علاوہ حیاتیات میں مظہرالحق اور ارضیات میں عظمت علی خان صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔

حیاتیات کا شعبہ بھی ان دو سائبانوں میں جن کو طلباء اور اساتذہ کبوتر خانہ کہا کرتے تھے قائم ہوا۔ مسئلہ تھا خوردبین کا۔ ہم کو خریدنا ضروری لیکن رقم موجود نہ تھی۔ لہٰذا مظہر الحق نے خود ایسی خوردبین بنائی جو کہ سستی ہونے کے علاوہ قابل استعمال بھی تھی۔ غرض کہ اردو میں ہم لوگ سائنس کی کتب کی نایابی کے علاوہ فنڈ کی کمی کا برابر شکار رہتے تھے۔ میجر صاحب اکثر ہم پر ناراض ہوتے اور ہم ہر وقت تحفوں کی فرمائش کرتے تھے۔ ان دنوں ہم لوگ کیمیا کے تجربہ خانے میں اسپرٹ لیمپ استعمال کرتے تھے۔ مجھ کو یہ جان کر تھوڑی سی تقویت ہوئی کہ آج بھی اس عالیشان عمارت کے باوجود اسپرٹ لیمپ کی روایت قائم ہے۔ کچھ تو ماضی کی یاد تازہ کرنے کے لئے باقی رہنا چاہیئے۔

ہم لوگوں کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ورثہ میں کچھ کتب ملیں۔ لیکن وہ یا تو بہت پرانی تھیں یا ان کی اردو انتہائی ثقیل اور اکثر اصطلاحات مشکل اور ناکافی تھیں۔ تالیف اور تصنیف کا کام بھی شروع ہو گیا۔ ترجمہ بھی انتہائی ضروری تھا۔ اس لئے شعبۂ سائنس کے تمام اساتذہ ایسے مجالس میں شرکت کرتے جو اصطلاحات وضع کرتیں۔ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتیں۔ کراچی یونیورسٹی کی قربت اور میجر آفتاب حسن صاحب کی انتھک کوشش سے یہ کام بہت تیز رفتاری اور مستعدی سے ہوتا رہا۔ تقریباً ہر شام کو مختلف کمیٹیاں اساتذہ اور ماہرین کے زیر نگرانی منعقد ہوتیں اور پابندی سے اصطلاحات وضع کی جاتیں۔

اردو کالج صرف ایک کالج ہی نہیں تھا بلکہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ اور اس سے متعلق ہر شخص اس تحریک کا رکن تھا۔ اساتذہ کا کام صرف تدریس ہی کا نہ تھا بلکہ اردو کی ترویج و ترقی اور اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں معاونت ان کے فرائض میں داخل تھا۔ اساتذہ اور طلبہ بخوبی جانتے تھے کہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا اور یہ ثابت کرنا کہ تعلیم صرف قومی زبان میں دی جا سکتی ہے۔ ان کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ آج اس ۲۵ سالہ کوشش کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص اور ہر درس گاہ اردو کو ذریعۂ تعلیم تسلیم کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتی۔ ہر کالج اور یونیورسٹی کا طالب علم اردو میں علم حاصل کرتا ہے اور اس کی قابلیت اور علمیت کو ہر ادارہ تسلیم کرتا ہے۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں اردو ذریعۂ تعلیم بحث کا موضوع تھا۔ خاص طور پر اردو کو سائنسی تدریس کے لئے ذریعۂ تعلیم تسلیم کرنے کے لئے بہت کم لوگ تیار تھے۔ مشکلات بھی بہت تھیں۔ اردو میں کتب بہت کم دستیاب تھیں۔ جو عام درسی کتابیں موجود تھیں وہ سب ہندوستان اور انگلستان سے انگریزی میں شائع ہوئی تھیں اور بیشتر پاکستانی اساتذہ اور سائنس دان ہماری کوششوں کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اردو کالج کے شعبۂ سائنس میں صرف وہی طلباء داخلہ لیا کرتے تھے جو کسی اور کالج میں داخلے سے محروم رہ جاتے۔ اس دور میں صرف ۲ کالج تھے۔ ڈی جے سائنس کالج اور ایس۔ ایم سائنس کالج اور تیسرا اردو کالج تھا۔ وہ طلباء جو ان دو کالجوں میں داخلہ نہیں لے پاتے تھے اردو کالج کا رخ کرتے اور بادل ناخواستہ داخلہ لیتے۔ بیشتر طلباء تھرڈ ڈویژن یا ضمنی امتحانات والے ہوتے۔ ہمارے پاس پہلے صرف ۲۰ طالب علموں نے سال

اوّل سائنس میں داخلہ لیا۔ اور پھر دوسرے سال اوّل دوئم میں ملا کر چالیس کی تعداد ہوئی۔ اگلے سال حیاتیات اور ارضیات کی تدریس شروع ہوئی۔ ہمارا سب سے بڑا سرمایہ اور ہر مشکل کو آسان کرنے والا عنصر طلباء اور اساتذہ کا لگاؤ اخوت اور اپنے ادارے سے بے پناہ محبت تھی۔

یہ ضرب المثل تھا کہ سائنس کا طالب علم کالج میں کوئی غلط کام کر ہی نہیں پایا۔ سائنس کے طالب علم کو پڑھنے اور اپنے کام سے بہت کم فرصت مل سکتی ہے۔ اور وہ دیگر مصروفیات کا شکار ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن ان مشکلات کے باوجود ہمارا نتیجہ ہمیشہ قابل ستائش رہا۔ فرسٹ ڈویژن اور سیکنڈ ڈویژن میں طلباء نے امتحانات میں کامیابی حاصل کی اور جامعہ کراچی کے امتحان میں ہمارے کالج کو پوزیشن بھی ملی۔ یہ تمام اس لئے ممکن ہو سکا کہ اردو کالج کا طالب علم اپنی زبان میں بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا۔ اور اس کا اطلاق بھی بہتر طور پر کر سکتا تھا۔

ہر ادارے کی جان اس سے متعلق اشخاص ہوا کرتے ہیں۔ جب ۱۹۵۳ء میں عظمت علی خان کا تقرر ہوا تو گویا اس شعبے کو اسکا پرستار مل گیا۔ انہوں نے جس محنت اور محبت سے اس شعبہ کی خدمت کی ہے اس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے۔ ۵ فٹ ۶ انچ قد اور ایک عدد داڑھی کے ساتھ یہ رات اور دن اس شعبہ میں پائے جاتے تھے۔ ہمارا یہ شعبہ ترقی کر کے اردو کالج میں اب باقاعدہ ایک پوری عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔ پوری پہلی منزل میں تجربہ خانہ کیمیاء اور دوسری منزل پر تجربہ خانہ طبیعیات اور تیسری پر تجربہ خانہ حیاتیات قائم ہو گیا۔ تمام فرنیچر باقاعدہ بنا ہوا کہ اب تک بعض تجربہ خانوں میں نظر آتا ہے۔ سامان بھی براہِ راست درآمد کیا گیا اور اردو کالج کا شعبۂ سائنس ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ تجربہ خانہ کیمیاء کی رونق مولانا عظمت علی خان تھے۔ میزوں کی صفائی اور رنگ و روغن۔ طلباء کی دیکھ بھال اور اساتذہ پر کڑی نگاہ کے علاوہ شعبہ ارضیات کی ابتداء اور اس کی تدریس ان کے ذوق و شوق کا نتیجہ تھی۔ پاکستان میں ارضیات کی تعلیم انٹر سائنس میں سب سے پہلے اردو کالج میں شروع ہوئی اور یہ مولانا عظمت علی خان کی کاوش کا نتیجہ تھی۔

اس طرح شعبہ سائنس اردو میں کیمیاء۔ طبیعیات حیاتیات۔ ریاضی۔ ارضیات اور جغرافیہ کے تمام مضامین میں تدریس دینے لگا۔ اس اعتبار سے اردو کالج کا شعبۂ سائنس پاکستان کے تمام کالجوں میں پہلا اور واحد شعبہ بن گیا۔ جس میں سائنس کے تمام مضامین کی تعلیم دی جانے لگی۔ سائنس کو عملی بنانے اور عوام و طلباء میں سائنسی شعور پیدا کرنے اور ان کے مزاج کو سائنسی بنانے کے لئے سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان نے ۱۹۶۰ء میں جدید سائنس شائع کیا تو اس کی ترتیب و تدوین اور پیشکش بھی اس شعبہ کے اساتذہ کے تعاون سے عمل میں آئی۔ جو وہ میجر آفتاب حسن کی ادارتی رہنمائی میں انجام دیتے تھے۔ عظمت علی خان کی شخصیت یہاں بھی ضروری تھی

شعبہ سائنس اس وقت کراچی کے تمام سائنسی حلقوں میں بڑی قدر اور منزلت سے دیکھا جاتا تھا۔ کوئی میلہ۔ نمائش یا مقابلہ ایسا نہ تھا جس میں طلباء اور اساتذہ حصّہ نہ لیتے ہوں۔ شکیل احمد

منیر صاحب جو کہ طبعیات کے استاد تھے۔ انہوں نے اپنی کاوشوں سے ہر سائنس نمائش میں حصّہ لیا۔ اور شعبہ کو انعام اور ٹرافی ملی۔ وہ ۲۵ فٹ لمبا راکٹ جسکو شعبۂ سائنس نے کئی رات اور دن کی کاوشوں کے بعد ماڈل کی شکل بنا کر پیش کیا لوگوں کو اب بھی یاد ہے۔

چند ایسے اساتذہ بھی اس شعبے میں کام کر چکے ہیں جو کہ اپنے وقت کے بہت اچھے سائنس دان اور اساتذہ ثابت ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صابر علی نے کیمیا کی تدریس تقریباً دو سال کی ہے۔ اور ہمارے شعبہ کے بہت اچھے اور ماہر استاد مانے جاتے تھے۔ یہ جامعہ کراچی میں حیاتیاتی کیمیا کے صدر اور جامعہ کے رئیس کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ ڈاکٹر خورشید مصطفیٰ نے حیاتیات میں ایم۔ایس سی کرنے کے بعد کالج میں تدریس شروع کی۔ انہوں نے شعبہ سائنس کے حیاتیات کے شعبہ کو پروان چڑھایا اور اب سندھ یونیورسٹی میں نباتیات کے پروفیسر ہیں۔ جناب ڈاکٹر مرحوم بقائی نے اپنے اخلاق اور علمیت سے اس شعبہ کو نوازا جو بعد میں جامعہ کراچی میں حیوانیات کے بہت اچھے استاد اور محقق ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر مشتاق صاحب نے اس شعبہ کو سنبھالا اور انتہائی جانفشانی سے نباتیات کی تعلیم دی۔ ان ہی اساتذہ کی محنت کا نتیجہ تھا کہ اردو میں بی۔ایس سی کی تعلیم بھی شروع ہوئی۔ اس کے علاوہ ارضیات میں اشرف جہانگیر جو کہ اب ریونیو بورڈ کے ممبر ہیں ایس۔ ایم کالج سے پڑھانے آتے تھے اور ان کے ساتھ کراچی کے بہت مشہور پرنسپل جناب حشمت اللہ لودھی بھی جز وقتی استاد کی حیثیت سے پڑھانے کی زحمت کر چکے ہیں۔

نجم الہدیٰ صاحب نے تقریباً ۱۹۵۷ء میں کیمیا کی اور اس کے بعد جغرافیہ اور ارضیات میں کافی دنوں تک تدریس کر چکے ہیں۔ جناب شمس ضحیٰ مرحوم نے اصطلاحات اور اردو سے متعلق دیگر مشکلات حل کرنے میں ہماری پوری پوری مدد کی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اردو کالج میں پڑھانے والا استاد گھر جانا بھول جاتا تھا۔ اسکا بسیرا اسکا شعبہ ہی بن جاتا تھا۔ ادریس صاحب طبعیات ہو رہے تھے ان کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ جب ہم صبح آتے تو معلوم ہوتا کہ ادریس صاحب اپنے تمام تجربوں میں اتنے منہمک رہے کہ گھر جانا بھول گئے۔ ان کے ساتھ ناشتہ دوبارہ ضروری ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ طلباء بھی ان دعوتوں میں شریک ہو جاتے۔ کاظم مہدی صاحب کا ذکر یہاں بہت ضروری ہے۔ وہ بذاتِ خود اردو کالج ہیں۔ انہوں نے اردو کالج میں بحیثیت طالب علم داخلہ لیا۔ اور وہاں ایک سال کے بعد ہی ملازمت شروع کر دی۔ یہ خود تجربہ کرتے۔ تجربہ خانے کے تمام آلات کی نگرانی کرتے اور خود پڑھتے اور پڑھاتے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ اردو کالج سے منسلک ہیں۔ موصوف چار سال نائجیریا میں سائنس کی تدریس کے بعد اب واپس آ چکے ہیں۔ کاظم مہدی صاحب نے جس محنت اور محبت اور خلوص سے اردو کالج کے شعبہ سائنس کی خدمت کی ہے اس کو تحریر میں لانا مشکل ہے۔

ہارون الرشید نجمی صاحب نے ۱۴ اگست ۱۹۵۶ء

سے شعبہ طبعیات میں تدریس شروع کی۔ اور اب وہ صدر شعبۂ طبعیات اور پروفیسر کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس شعبہ کی اور خصوصاً طبعیات کی مکمل دیکھ بھال اور درس و تدریس کی ہے۔ یہ ان چند شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے مستعدی اور لگن کو اپنا وطیرا بنایا ہے۔ روزِ اوّل سے اپنے فرائض کی ادائیگی۔ طلباء کی بہبودی اور ان کے مستقبل کو ہمیشہ ہر بات پر ترجیح دی ہے۔ وہ سب پر پوری طرح ظاہر ہے۔ اردو میں ان دنوں حیوانیات کی تدریس بہت مشکل کام تھا۔ اصطلاحات اور اردو میں کتب کی کمی نے اس مسئلہ کو مزید مشکل بنادیا تھا۔ حفیظ صاحب نے بہت محنت سے اس کمی کو پورا کیا۔ تصنیف و تالیف کے کام میں پوری دلچسپی لیتے رہے نہ صرف یہ بلکہ اس شعبہ کو جو عجائب خانہ آج میسّر ہے یہ ان کی محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے۔ جو نمونے اس میوزیم میں جمع ہیں دوسرے کالجوں کے حصّے میں یہ نعمت نہیں آئی۔ یہ ان کی محنت کا ثمر ہے۔ درس و تدریس کی روایت ان ہی چند اصحاب نے قائم کی ہے۔ اور اس کو مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ڈاکٹر نعیم الحسن نقوی سابق صدر شعبہ سائنس اور استاد جامعہ کراچی شعبۂ حیوانیات بھی نہیں بھلائے جاسکتے۔ ان کی شرافت اور نرمی و تحمل و بردباری نے طلباء کو وہ راستے دکھائے ہیں جس سے اس شعبہ نے مثالی راہیں بنائیں اور اپنے ملک کی خاطر خواہ خدمت کی ہے۔

یہ تھے ان چند اساتذہ کے نام جو کہ میرے دور میں درس دینے آئے اور ہم نے مل کر اس شعبے کی روایت کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اس کی کامیابی آپ کے سامنے ہے لیکن یہ طلباء کی کامیابی سے ہی ناپی جاسکتی ہے۔ اردو کالج سے فیض یاب ہونے والے طلباء کی فہرست بہت طویل ہے۔ لیکن ڈاکٹر اقبال صدیقی اور ڈاکٹر قیصر امام خاص طور پر یاد کئے جاتے ہیں۔ وہ صرف طالب علم نہیں رہے ہیں بلکہ شعبۂ کیمیا میں کارکن کی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے شعبہ سائنس کی خدمت کی۔ اس شعبہ نے ان کی مدد کی۔

محمد علی کے بغیر تجربہ خانہ نامکمل تھا۔ اور ہے۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب جامعہ کراچی سے ان کے والد نے آکر ایک ۱۸ سالہ نوجوان کو ہمارے حوالے کیا۔ جسے کیمیاء یا سائنس کے نام سے کوئی لگاؤ نہ تھا لیکن چند سالوں کے بعد اردو کالج کے تجربہ خانے میں کیمیاء کی تدریس۔ امتحانات کا تسلی بخش انداز میں انعقاد اور اختتام۔ مخدوش مرکبات اور قیمتی آلات کی دیکھ بھال کا پورا انتظام محمد علی نے سنبھال لیا۔ اور اب سنبھالا کہ ان کے بغیر اردو کالج کا تجربہ خانہ صرف خانہ رہ جائیگا۔ تجربہ سے محروم ہو جائیگا۔

کسی بھی ادارے کی کامیابی و کامرانی کے لئے عمارات اور ضروری ساز و سامان کی اہمیت اپنی جگہ لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اشخاص کے بغیر یہ ساری چیزیں ناکارہ ہیں۔ دراصل اعلیٰ مقاصد کا حصول اعلیٰ کردار قابلیت، علمیت کے ساتھ ساتھ مقاصد کی اہمیت کو تسلیم کرنے اور اس سے پورا پورا انصاف کرنے پر منحصر ہے۔

شعبۂ سائنس کے اساتذہ کی خدمات اس کے مختصر جائزہ۔ کو ہمارا منشور اور راہِ عمل کہہ سکتے ہیں۔ اسے

ترتیب دینے اور قابلِ عمل بنانے میں میجر آفتاب صاحب کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

میجر صاحب نے اپنے عمل، کردار اور سادگی، شفقت اور بردباری سے ان خطوط کا تعین ہمارے لئے کیا۔ اور ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم کو اس نے توفیق دی کہ ہم اس پر اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔



۱۹۵۸ء میں اساتذہ شعبہ سائنس میجر آفتاب حسن کے ہمراہ

ڈاکٹر نعیم الحسن نقوی

یادش بخیر

ایک مدت ہوئی جب میں مسلم یونیورسٹی میں پڑھتا تھا کہ میرے ہم پلہ دوست کراچی سے گئے۔ ملاقات ہونے پر انہوں نے بتایا کہ وہ اردو کالج میں پڑھتے ہیں جس کے پرنسپل میجر آفتاب حسن ہیں اور جہاں تمام کے تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ سن کر خوشی ہوئی اور یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ کاش میں بھی اردو میں پڑھ سکتا۔ کیونکہ ہائی اسکول میں جو سائنسی کتابیں میں نے پڑھی تھیں وہ اردو میں تھیں اور اس وقت تک مسلم اسکول میں ہندی کتب کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس خواہش کا دوسرا سبب شاید یہ بھی تھا کہ علی گڑھ میں ابتدائی ایک ماہ تک لیکچر میرے سر پر سے گذر گئے۔ میرا خیال ہے کہ کم و بیش یہی کیفیت نوے فیصد طلباء کی آج بھی ہوتی ہے اور کل بھی ہوتی تھی۔ (سوائے ان ۱۰-۲۰ فیصد طلباء کے جو گرائمر اسکول وغیرہ سے آتے ہیں) نتیجہ یہ ہوا کہ میٹرک میں فرسٹ ڈویژن ہونے کے باوجود انٹر میں میری ڈویژن خراب ہوگئی جس کو میں بی ایس سی اور ایم ایس سی میں بہتر کر سکا۔ کیونکہ نفسِ مضمون کے ساتھ زبان پر بھی محنت کرنی پڑی۔ آج کل جو معیار انگریزی زبان کا ہے ہمارے زمانے میں اس سے کہیں بہتر تھا۔ لہٰذا آپ سوچ سکتے ہیں کہ آج کل کے طلبا پر کیا گذرتی ہوگی۔ ان کا نصف سے زیادہ وقت تحصیلِ علم کے بجائے تحصیلِ زبان میں یا پھر رٹنے میں گذرتا ہے۔ گویا ہم مضمون نہیں زبان پڑھاتے ہیں اور وہ بھی ناقص طریقے سے۔ ناقص میں نے اپنے تجربے کی بنا پر کہا ہے۔ عمر کا بیشتر حصّہ انگریزی میں مضامین پڑھنے اور پڑھانے کے باوجود میں انگریزی پر عبور حاصل نہیں کر سکا۔ دراصل زبان سیکھنے کے لئے ایک خاص ماحول اور طریقے کی ضرورت ہے جو ہمارے یہاں رائج نہیں مثلاً جرمنی میں دو ماہ کا ابتدائی کورس کرنے کے بعد مجھے اتنی جرمن زبان آگئی کہ کراچی میں ثانوی کورس کرنے والے طلباء کو بھی نہیں آپاتی۔ یا عراق میں ۳ سال رہنے کے بعد بغیر پڑھے تھوڑی بہت عربی آگئی۔ یہ ماحول کی بات ہے یا ضرورت کی۔ برخلاف اس کے ۳ سال نائیجیریا میں رہنے کے باوجود میں ہوسا نہیں سیکھ سکا۔ کیونکہ وہاں پر ہر جگہ انگریزی کا دور دورہ ہے پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک، لہٰذا ہر پڑھا لکھا انگریزی

بولتا ہے۔ اور بہت سے غیر تعلیمیافتہ حضرات جو عربی نژاد ہیں عربی بولتے ہیں۔ کچھ لوگ ہندی فلموں کی بدولت اردو بھی بولتے ہیں۔ شاید یہی وجوہ تھیں کہ میں مقامی زبان "سواہو" نہیں سیکھ سکا۔

بہرحال بی ایس سی کرنے کے بعد میں نے دو سال تک پنجاب اور کراچی میں ملازمت کی اور پھر ایم ایس سی کرنے کے شوق میں ڈاکٹر قادری (مرحوم) کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ایم ایس سی میں داخلہ دے دیجئے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے پہلی بار ملا تھا لیکن علی گڑھ کے ناطے جس شفقت سے وہ ملے آج بھی یاد ہے۔ پوچھا کہ کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا کہ مجلس تحقیقات سائنس صنعت میں ملازمت کرتا ہوں۔ فرمایا کہ پھر ایم ایس سی کیسے کر سکتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ ملازمت چھوڑ دوں گا۔ فرمایا کہ پھر گذر اوقات کیسے ہوگا۔ میں نے کہا۔ اللہ مالک ہے۔ مسکرائے اور ایک کاغذ پر چند سطور لکھیں اور لفافے میں بند کر کے میرے حوالے کیا اور کہا کہ آفتاب صاحب سے مل لینا۔ حسب الحکم میں خط لے کر میجر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خط پڑھ کر بولے کہ افضال بھی عجیب ہیں۔ دو دو آدمیوں کو سفارشی خطوط دیئے ہیں۔ آخر میں کس کو رکھوں۔ (دوسرا خط ڈاکٹر مرحوم لقائی کے لئے تھا) میں نے عرض کیا کہ جسکو آپ مناسب سمجھیں۔ فرمایا کہ صاحب زادے یہاں اردو میں پڑھانا ہوگا اور تم نے انگریزی میں پڑھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کوشش کروں گا اور اللہ تعالی کی ذات سے امید ہے کہ آہستہ آہستہ کامیاب ہو جاؤں گا۔ آفتاب صاحب نے فرمایا کہ اچھا کل بتاؤں گا۔ اور تم جاکر بدر الحسن یا ضیاالدین فصیحی سے مل لو۔ ان لوگوں نے مجھے خورشید مصطفی خان صاحب کے حوالے کردیا جو نباتیات پڑھاتے تھے (حالیہ پروفیسر ڈاکٹر خورشید مصطفی خان جامعہ سندھ) حیوانیات میں اس وقت ڈاکٹر مظہر الحق پڑھاتے تھے جو آجکل یونیسکو میں ہیں وہ یونیورسٹی جارہے تھے لہذا ایک استاد کی ضرورت تھی جس کے لئے ڈاکٹر صاحب نے میری اور لقائی صاحب کی سفارش کی تھی۔

بہرنوع خورشید صاحب نے مجھے کچھ نوٹس اردو کے دیئے اور کہا کہ کل سے کلاس لیں اگر کامیاب رہے تو تقرر ہو جائیگا۔ میں نے کلاسیں شروع کردیں اس دوران میجر صاحب نے اپنے رفقاء سے رپورٹ لی ہوگی اور ڈاکٹر صاحب (یعنی ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری مرحوم جن کو سب ہی ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کیونکہ شاید ہی حیوانیات کا کوئی ماہر ایسا ہو جو انکا بالواسطہ یا بلاواسطہ شاگرد نہ رہا ہو) سے مشورہ کیا ہوگا۔ جس کی بنا پر مجھے تقرر نامہ مل گیا اور بھائی جان (لقائی صاحب مرحوم) کا ایک سال بعد تقرر ہوا۔ اس کی کیا وجہ تھی۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بہرحال جس کالج میں مجھے پڑھنے کا شوق تھا وہاں پڑھانا پڑ گیا۔ لیکن ایک دو ماہ کی محنت سے معلوم ہوا کہ یہ کام مشکل نہیں ہے۔ دوسری بات جو واضح ہوئی کہ اپنی زبان میں کسی مضمون کا سمجھنا کئی گنا آسان ہے۔ بہت سی اصطلاحات جو انگریزی میں ہم رٹ لیتے ہیں اردو میں ان کا صحیح مفہوم سمجھ میں آیا۔ مثلاً گرفت (Valency) وغیرہ۔ اور میجر صاحب کا

قول کہ کسی مضمون کی صحیح افہام و تفہیم اپنی زبان میں ہی ہو سکتی ہے" آفتاب کی طرح حقیقت ثابت ہوا۔

یوں ۱۹۵۶ میں اردو کالج سے وابستہ ہو گیا اور "آفتاب صاحب کے علاوہ دوسرے بہت سے پرخلوص ساتھیوں کے ہمراہ کام کرنے کا موقع ملا۔ جن میں پروفیسر اکرام الرحمٰن۔ ڈاکٹر عسکری مرحوم۔ شمس ضحیٰ مرحوم، بدرالحسن صاحب ضیاء الدین نفیسی صاحب، عظمت علی خاں صاحب، ڈاکٹر خورشید مصطفیٰ خاں۔ ہارون الرشید کمپی صاحب، نجم الہدیٰ صاحب۔ کاظم مہدی صاحب اور غلام اشرف جہانگیر (حالیہ ممبر ریلوے بورڈ) جیسے پرخلوص حضرات شامل تھے۔ بعد میں آنے والے مخلص حضرات میں ڈاکٹر لیاقت (مرحوم) شکیل احمد صاحب، ڈاکٹر مشتاق حسین، ڈاکٹر حسن الدین احمد، ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی اور ڈاکٹر وقار احمد زبیری قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات جیسا خلوص چاہیے وہ دکھتوں کے ساتھ ہو یا اپنے کام کے ساتھ شاذونادر ہی ملتا ہے اس زمانے میں اردو کالج کا سائنس سیکشن عارضی عمارت میں تھا۔ ذرائع آمدنی بھی محدود تھے مگر تعلیم واقعی اردو میں ہوتی تھی۔ گویا ایک لگن تھی جس میں صدر شعبہ سے لے کر محمد علی اور بشیر بیگ تک سرشار رہتے تھے۔ وقت کا تعین نہ تھا کہ کب آتا اور کب جاتا ہے۔ صبح آئے تو رات کے نو دس بھی بج گئے تو پرواہ نہیں۔ اپنے اپنے شعبے کو بنانے کی دھن میں لوگ لگے رہتے تھے۔ پرانی الماریوں کو نئے شوکیس میں تبدیل کر رہے ہیں۔ عجائب خانے کے لئے نمونے جمع کئے جا رہے ہیں۔ ان کو سجایا جا رہا ہے۔ کہیں پر طبیعیات کے اساتذہ میزوں پر رندہ چلا رہے ہیں تو کہیں پر اہل کیمیا ان پر تیزاب پروف پینٹ کرنے میں مصروف ہیں۔ اگر مرکبات اور ٹیسٹ ٹیوب نہیں ہیں تو جامعہ کراچی (جو اس وقت برابر میں تھی) استعارہ لا رہے ہیں۔ آلات نہیں ہیں تو انعظم کے یہاں سے چند دنوں کے لئے منگائے اور تجربات کرانے کے بعد واپس کر دیئے۔ اور اصطلاحات کی تلاش جاری ہے۔ اردو میں نوٹس بنائے جا رہے ہیں۔ گویا ہر شخص اس فکر میں ہے کہ تدریس اپنی زباں میں ہو، قومی زبان میں ہو۔ ہر طالب علم پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ میٹرک تھرڈ کلاس طلبہ کو داخلہ دیا تو ان میں سے کچھ تو فرسٹ کلاس اور کچھ سیکنڈ کلاس میں انٹر پاس کرتے۔ یہی نہیں بلکہ بعض تو پوزیشن لاتے۔ میڈیکل اور انجنیئرنگ میں داخلہ پاتے۔ اور میجر صاحب ہمارے کام کو اور ہماری محنت کو سراہتے حالانکہ اس محنت کے بدلے پیسے نہیں ملتے تھے بلکہ تنخواہ بھی اللہ اللہ کر کے ملتی تھی۔

اس کے بعد کرنل عطاالرحیم کا دور آیا۔ کرنل صاحب سیدھے آدمی تھے۔ گو کہ میجر صاحب جیسے منظم نہ تھے لیکن انہوں نے اور اختر حسین صاحب نے کالج کی موجودہ بلڈنگ کے واسطے دیگر اساتذہ کی مدد سے کافی کام کیا۔ ۱۹۶۲ء میں میں نے اردو کالج چھوڑ دیا اور پی ایچ ڈی میں داخلہ لے کر جامعہ کراچی آ گیا۔ لیکن کالج سے وابستگی برابر رہی حد یہ کہ مدتوں گھر سے نکلتا تو برابر زبان سے یہی نکلتا کہ کالج جا رہا ہوں۔ یہ وابستگی آج بھی باقی ہے۔ گو میں نے اس عرصہ میں بہت سے ممالک دیکھے۔ کئی ممالک میں تدریس و تحقیق کا کام کیا بلکہ کراچی میں بھی دو ایک اداروں

میں کام کیا مگر جو خلوص اردو کالج کے ساتھیوں سے ملا اور آج بھی ملتا ہے وہ شاید چند ہی لوگوں میں پایا اور ماحول تو مل ہی نہ سکا۔ آج بھی جب پرانے ساتھی ملتے ہیں تو وہی خلوص، وہی محبت، وہی اعتماد اب بھی ان میں پایا جاتا ہے۔

خوشی ہوتی ہے کہ اردو کالج اب ترقی کر رہا ہے طلباء کی تعداد اب بڑھ رہی ہے۔ اساتذہ مالی مشکلات میں نہیں ہیں۔ بیشتر اساتذہ اردو کالج کے طلبہ میں سے ہیں جس پودے کی قطرہ قطرہ برابر آبیاری میں نے کی تھی اب وہ سایہ دار درخت بنتا جا رہا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ طلباء کی تعداد بڑھنے کی وجہ سے انفرادی توجہ اب ممکن نہیں۔ اساتذہ شاید اب وقت سے آتے اور وقت پر چلے جاتے ہیں۔ وہ عظمت علی خان والی دیوانگی اب کم لوگوں میں باقی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پرانے ساتھی اب بھی اردو زبان میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے جو پہلے مالی مجبوریوں کی وجہ سے کم تھا۔ اردو کالج وفاقی حکومت کا ایک ممتاز ادارہ بنتا جا رہا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ جلد یا بدیر مولوی عبدالحق صاحب کا خواب پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب اپنے رفقاء کی مدد سے شرمندۂ تعبیر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ ایم ایس سی کی کلاسیں شروع ہو چکی ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ جلد جامعہ اردو قائم ہو گی۔ آمین۔

موجودہ حکومت اردو کے لئے بہت کچھ کر رہی ہے اور شاید وہ دن بھی آئے کہ ہر کالج میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔ لیکن اب بھی ایک طبقہ ایسا ہے جو ہر مرحلہ میں اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ ان حضرات سے میں پوچھنا چاہوں گا کہ کیا ہماری ستر اسّی فیصد آبادی انگریزی داں ہے کیا ہمارا تجارتی کاروبار اور دفتری کام اردو میں نہیں ہو سکتا؟ عرب ممالک میں، یورپی ممالک میں، روس اور چین میں کیا یہ سب کام انگریزی میں ہوتا ہے؟ کیا وہ بیرونی تجارت میں ناکام ہیں؟ کیا ان ممالک میں مقابلے کے امتحانات انگریزی میں ہوتے ہیں۔ کیا فرانسیسی، روسی، چینی، جرمن، اطالوی، یونانی، جاپانی، ہسپانوی، پولونی، چیکی، رومانیائی اقوام میں تعلیم انگریزی میں ہوتی ہے؟ اور کیا وہاں بین الاقوامی شہرت کے سائنس دان پیدا نہیں ہوئے؟ کیا ابن سینا اور البیرونی نے انگریزی میں تعلیم حاصل کی تھی؟ کیا آئن اسٹائن انگریزی زبان کا ماہر تھا۔ مگر بچپن میں ان آنکھوں نے وہ ادارہ دیکھا جہاں اس نے نظریۂ "اضافیت" پر کام کیا اور دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ آج بھی اس ملک کے بیشتر پروفیسر انگریزی جانتے ہوئے بھی جرمن زبان میں بات کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض پروفیسر تو اپنے غیر ملکی شاگردوں اور رفقاء پر یہ پابندی لگا دیتے ہیں کہ پہلے جرمن سیکھو پھر میرے ساتھ کام کرو۔ کہتے ہیں کہ جب تم انگریزی سیکھ سکتے ہو تو جرمن کیوں نہیں؟ یہی حال فرانس کا ہے۔ اٹلی کا ہے اور کس ملک کا نام گنواؤں جس نے بھی ان ممالک کا بغور مشاہدہ کیا ہے ان اقوام کے دل میں انگریزی کے لئے اچھے جذبات نہیں پائے۔ بلکہ بعض اوقات تو عوام آپ کی بات کا جواب دینا گوارہ نہیں کرتے کیونکہ آپ انگریزی بول رہے ہیں۔ اگر آپ اردو بولیں تو وہ غیر ملکی سمجھ کر آپ کی مدد کر دے گا۔ انگریزی بولیں گے تو ممکن ہے کہ وہ منہ

پھر کر چلا جائے۔ یہ میرے ساتھ کم از کم چار یورپی ممالک میں ہو چکا ہے۔

بہرنوع مقصد میرا یہ ہے کہ وہ لوگ انگریزی وہاں پر ہی استعمال کرتے ہیں جہاں ضروری ہو۔ وہ لوگ حصولِ علم کے قائل ہیں۔ حصولِ انگریزی کے نہیں۔ دو دو غیر ملکی زبانیں وہ ہائی اسکول سے ہی سیکھتے ہیں۔ ان میں ایک انگریزی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ زبان صحیح طریقہ سے سیکھتے ہیں امتحان پاس کرنے کے لئے رٹنے اور بھول جانے کے لئے نہیں۔ ہمارے یہاں بھی ضرورت تو اس بات کی ہے کہ انگریزی بحیثیت ایک مضمون پڑھائی جائے۔ اور جدید طریقوں سے پڑھائی جائے تاکہ انگریزی کا معیار بلند ہو۔ یہ نہ ہو کہ ایم اے یا ایم ایس سی انگریزی زبان کے ذریعہ کیا لیکن ایک درخواست صحیح نہیں لکھ سکتے رہا سوال برطانیہ، امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا کا تو ان کی مادری زبان ہی انگریزی ہے لہٰذا وہ اسی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اگر ان کے پاس واٹسن اور کرک پیدا ہوتے ہیں تو دوسرے ممالک میں ہائنزہ برگ، چولی ڈورش وغیرہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ پھر انگریزی داں ممالک کے لوگ بھی دوسری زبانیں سیکھتے ہیں تاکہ ان زبانوں کا لٹریچر بھی پڑھ سکیں۔ ممکن ہے بعض حضرات کہیں کہ ہمارے یہاں اصطلاحات اور کتابوں کی کمی ہے۔ لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اتنی کمی نہیں جتنا سمجھتے ہیں۔ اور یہ کمی محنت سے دور کی جا سکتی ہے۔ صرف وقت درکار ہے بہر حال اس مسئلہ پر کافی بحث کی جا سکتی ہے اور ہر اعتراض کا جواب موجود ہے مگر یہ مضمون اس مقصد کے لئے نہیں تھا۔ برسبیل تذکرہ یہ بات آگئی۔ آخر میں میں معذرت خواہ ہوں ان حضرات سے جن کو میری تلخ نوائی گراں گذری (کیونکہ حقیقت تلخ ہوتی ہے) امید ہے کہ وہ مجھے معاف فرمائیں گے۔



۱۹۵۹ء میں شعبۂ سائنس کے اساتذہ کرنل عطاء الرحیم کے ہمراہ

صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق

کا دورۂ کالج

۱۹۷۵ء میں وفاقی حکومت نے اردو سائنس کالج کو اپنی تحویل میں لے لیا اور انتظامی امور کی انجام دہی کیلئے وفاقی وزیر تعلیم کی سرکردگی میں ایک بورڈ آف گورنرز تشکیل دیا

اس وقت ہمیں امید ہو چلی تھی کہ کالج خاطر خواہ ترقی کر سکے گا۔ لیکن بہت جلد حالات و واقعات نے یہ باور کرا دیا کہ فی الحال کچھ بھی ممکن نہیں۔ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات سے قبل اس وقت کی حکومت نے کالج کی ترقی و تعمیر کے لئے خاطر خواہ رقم مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ "سوکھے دھانوں میں جان پڑ گئی" ادارے سے متعلق ہر شخص خوش تھا

وقت گذرنے لگا انتظار کی شدت بے چین کرنے لگی وعدہ وعدہ ہی رہا، اور ہم سب شک و شبہ کی فضا میں سانس لیتے رہے انتخابات میں ملک میں بے چینی پھیلی، بدنظمی افراتفری نے ملک کی فضا مسموم کر دی حالات کی ابتری رنگ لائی اور ملک ایک نئے انقلاب سے دوچار ہو گیا۔ نتیجہ میں بری افواج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق برسر اقتدار آئے اردو زبان کی قومی اور سرکاری حیثیت کا تعین بابائے قوم قائد اعظم نے بہت پہلے کر دیا تھا لیکن سیاست اور سازشوں نے اردو کی اہمیت

کو کم کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا شاید وہ لوگ کامیاب نہ ہو جاتے کہ امید کی کرن جنرل ضیاء الحق کی شکل میں پھوٹی انہوں نے اردو دوستی کا ثبوت جا بجا اپنی تقاریر خطابات اور گفتگو میں فراہم کیا انہوں نے اردو زبان کو اختیار کیا۔ بلکہ اس کی سربلندی اور سرفرازی کیلئے زبانی ہی نہیں عملاً بھی بہت کچھ کیا۔ جو آج روز روشن کی طرح ہم سب پر ظاہر ہے لیکن ہم یہ بات بہت پہلے سے جانتے تھے کہ ہماری فوج کا سربراہ ابتدا ہی سے اردو دوستی کا دم بھرتا ہے۔

۱۹۷۷ء کا سال حکومت وقت کے ایماء پر قائداعظم کا سال قرار دیا گیا ہمارے ادارے نے بھی "کائنات" کا قائداعظم نمبر شائع کیا۔ اس کا ایک نسخہ فوج کے سربراہ یعنی جنرل ضیاء الحق صاحب کی خدمت میں بھی ارسال کیا گیا جس کی وصولیابی کی اطلاع ایک خط کے ذریعے ملی خط اور دستخط اردو زبان میں دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی لہذا جب انہوں نے ملک کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں تو ہم سب کی خواہش تھی کہ وہ ہمارے کالج کو بھی رونق بخشیں پرنسپل صاحب نے سب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اردو سائنس کالج کی طرف سے ایک دعوت نامہ ارسال کر دیا۔ خاصے دن تذبذب کی کیفیت رہی مگر امید اور نا امیدی کا یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا۔ جبکہ چند دیگر حضرات کی مدد سے دوبارہ رابطہ قائم ہوا تو جنرل ضیاء الحق صاحب نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ہمارے کالج کا دورہ کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا جلد ہی وقت اور دن کا بھی تعین ہو گیا۔ پرنسپل صاحب نے مختلف ضروری امور کی انجام دہی کے لئے اساتذہ پر مشتمل کمیٹیاں تشکیل دیں اس طرح وقت مقررہ پر تمام ضروری تیاریاں بخیر و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچ گئیں ضیاء

الحق صاحب نے ظہرانے میں شرکت سے معذرت کی
محض فقط مشروبات پر اکتفا کرنے پر زور دیا۔
انتظار کی شدت ختم ہوئی تھا فلا کر کے وہ دن
آیا جب محترم جنرل ضیاء الحق صاحب کو تشریف لانا تھا
ایک دن پہلے بابائے اردو ہال میں کرسیوں کی ترتیب
اور مقدار حتی کرسیوں کے دائیں بائیں لگائی جانے والی
کرسیوں اور ان پر رونق افروز ہونے والے معزز مہمانوں
کا انتخاب کرنے کے بعد ہم مطمئن ہو گئے۔ دوسرے دن مہمان
خصوصی کے آنے سے کچھ پہلے مہمان گرامی تشریف لانے لگے
کرسیوں پر لگائی گئی پرچیوں کی وجہ سے ہم سب کسی
بھی قسم کی پریشانی سے ہم محفوظ رہے۔

وقت مقررہ پر صدر مملکت جنرل ضیاء الحق جنرل
کی وردی میں ملبوس گورنر سندھ جنرل محمد اقبال خان
اور دیگر سول اور فوجی افسروں کی رفاقت میں تشریف
لائے۔ کالج کے صدر دروازے یعنی باب اقرا پر پرنسپل صاحب
نے معتمد انجمن اساتذہ اور دیگر اساتذہ کی معیت میں بڑا تپاک و پرجوش
استقبال کیا۔ صدر مملکت تر و تازہ اور بشاش نظر آرہے تھے۔
کالج کا سرسری معائنہ کرتے ہوئے۔ بابائے ہال کی طرف بڑھے۔
پروفیسر اکرام الرحمان صاحب نے صدر کی آمد کو قائم و دائم رکھنے
کے لیے۔ کالج کے درمیانی میدان میں ان کے ہاتھوں
ایک پودا لگوایا۔ صدر محترم نے مالی کو اپنی جیب سے سو روپے
بطور انعام عطا فرمائے۔ بعد میں ہال کی طرف بڑھے دروازے
پر حسب پروگرام چند اساتذہ نے ان کا استقبال کیا۔ اور انہیں
خوش آمدید کہا۔ صدر مملکت نے نہایت خلوص و مہربانی
اور گرم جوشی سے سب سے ہاتھ ملایا۔ بعد ازاں وہ ہال میں
تشریف لائے۔ تو تمام مہمانوں نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔
جناب پروفیسر اکرام الرحمان صاحب اور معتمد انجمن اساتذہ
جناب ادیب احمد ہاشمی صاحب نے پھولوں کے ہار معزز

مہمانوں کو پہنانے لگا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ مہمانوں میں ماہرین تعلیم، دانشور، معززین شہر، سول اور فوجی حکام کے ساتھ ساتھ صحافی صاحبان اور اردو آرٹس، کامرس اور لا کالج کے تدریسی عملے کے تمام اراکین موجود تھے۔

ڈاکٹر وقار احمد زبیری صاحب نے افتتاحی جلوس سے کارروائی کا آغاز کیا۔ تلاوت قرآن اردو کالج کے سابق طالبعلم قاری شاکر قاسمی صاحب نے فرمائی اس کے بعد پروفیسر جناب اکرام الرحمٰن صاحب پرنسپل اردو سائنس کالج نے پروقار سپاسنامہ پیش کیا۔

سپاس نامہ کے بعد صدر مملکت سے درخواست کی گئی کہ وہ اردو کالج کے اساتذہ سے خطاب فرمائیں جنرل محمد ضیاء الحق صاحب تالیوں کی گونج میں مائیک پر تشریف لائے انہوں نے سیدھے سادے لیکن نپے تلے انداز میں شرکاء کو مخاطب کیا اور سپاس نامہ کے جواب میں فرمایا:۔

صدر محترم جوابی تقریر کے بعد جب اپنی کرسی پر تشریف لائے تو جناب محمد امین فاروقی صاحب نائب نگران شعبہ تصنیف و تالیف ترجمان کی خدمت میں کالج کے مجلّے "برگ ادب" کا ... کے پچھلے شماروں کا ایک مجموعہ پیش کیا۔ صدر محترم نے مختلف لوگوں سے تبادلہ خیال بھی کیا جن میں میجر آفتاب حسن صاحب اور شیخ الجامع کراچی پروفیسر ڈاکٹر احسان رشید صاحب پیش پیش تھے اسی دوران اے کے آفریدی نے جو کہ کالج کے سابق طالبعلم تھے مختصر تقریر کی جس میں انہوں نے کالج سے اپنی محبت و خلوص اساتذہ سے یگانگت کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی جیب سے ۲۵ غریب طالبعلموں کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کا اعلان کیا۔

جناب اکرام الرحمٰن صاحب نے سپاس نامہ میں اپنی تمام ضروریات کو ان کی مناسب اہمیت کے ساتھ پیش کر دیا تھا۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے عام

مہمانوں کی طرح نقطۂ عدم پر نہیں ٹالا۔ بلکہ ایک صاف
گو اور کھرے انسان کی مانند بروقت اپنے فیصلوں کا اعلان
کر دیا۔ ان کے خیال میں جو مطالبات لازم اور اہم
تھے۔ انہیں فوراً تسلیم کر لیا۔ جن امور پر غور کی ضرورت
تھی ان کے لئے وہیں بیٹھے بیٹھے کمیٹی تشکیل دے دی
اور جن کو غیر ضروری خیال کیا ان کی انجام دہی سے
معذرت چاہ لی۔ اجلاس کی کاروائی پایۂ تکمیل کو
پہنچی تو مختلف لوگوں نے صدر مملکت کے ساتھ تصویریں
بنوائیں۔ چند یادگار گروپ فوٹو بھی بنوائے گئے۔ اس
کے بعد صدر مملکت شعبہ طبعیات میں تشریف لے گئے
جہاں صدر شعبہ پروفیسر ہارون الرشید نجمی صاحب نے
دیگر اساتذہ کے ساتھ صدر کو خوش آمدید کہا۔ شعبہ طبعیات
کی ایک تجربہ گاہ میں مشروبات کا انتظام تھا۔ اس
کے فوراً بعد صدر محترم مہمانوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے
باہر کی طرف بڑھے۔ پرنسپل صاحب اور معتمد انجمن اساتذہ نے دیگر
اساتذہ کرام کے ساتھ صدر کو الوداع کہا۔ اس طرح صدر
مملکت کا یہ یادگار دورہ اختتام کو پہنچا۔

مختار اشرف
لائبریرین
وفاقی حکومت اردو سائنس کالج کراچی



پروفیسر اکرام الرحمٰن

پرنسپل
وفاقی حکومت اردو سائنس کالج

کی جانب سے پیش کردہ سپاسنامہ

فضیلت مآب عالی جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب

معزز مہمانان گرامی ، اساتذہ کرام ، وفاقی حکومت اردو سائنس کالج

میرے لئے یہ امر باعثِ صد افتخار و شادمانی ہے کہ آج مجھے حدود دار دو سائنس کالج میں حکومت اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کے سربراہ ، اسلام کے شیدائی ، مردِ مومن ، پاسبانِ وطن کو خوش آمدید کہنے کا شرف حاصل ہے۔ اسلام کی سربلندی ، پاکستان کی سالمیت و بقا کے لئے عالی جناب کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں ۔

آپ نے وطن عزیز کو ایسے وقت پر سنبھالا دیا جب کہ قوم میں مایوسی کی فضا پیدا ہو رہی تھی ۔ آپ کی ولولہ انگیز قیادت نے نہ صرف قوم کے اندر اخوت ، یگانگت ، ہم آہنگی ، اخلاص ، محبت و ایثار و قربانی کا جذبہ بیدار کیا بلکہ ملک کو استحکام اور امن و سکون بخشا ۔ یہی وہ خدمات ہیں جس نے آپ کو مملکتِ پاکستان کی ایک تاریخ ساز شخصیت کا روپ دیا ہے ۔ جب تک پاکستان زندہ و تابندہ ہے ۔ آپ کی شمع فروزاں آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو گی ۔

مہمانِ محترم !

گزشتہ ایک سال سے آپ جس قومی جذبہ ، خلوص اور سیاسی تدبر سے اس قوم کی رہنمائی فرما رہے ہیں خاص طور سے ملک کی اقتصادی ترقی ، تعلیمی فروغ ، تمدنی و معاشرتی بہبود ، سیاسی استحکام کے لئے شب و روز کوشاں ہیں ۔ اس ضمن میں آپ کی بے لوث خدمات اور کارہائے نمایاں پاکستان کی تاریخ میں نہ صرف سنہری حروف میں لکھے جائیں گے بلکہ پاکستانی قوم آپ کو ایک محسن کی حیثیت سے یاد کرے گی ۔

قابلِ صد احترام جنرل صاحب !

اساتذہ کرام اردو سائنس کالج کراچی کی عرصہ سے دلی خواہش تھی کہ آپ کو اس قومی ادارے میں بحیثیت

مہمان خصوصی تشریف لانے کی زحمت دی جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ حکومت اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کے سربراہ کی حیثیت سے آپ کی مصروفیات اور مشغولیات بے انتہا ہیں لیکن آپ نے اساتذہ کالج کی دعوت کو شرف قبولیت بخشا ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں۔ وفاقی حکومت اردو سائنس کالج میں آپ کی تشریف آوری اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کو قومی زبان اور سائنس کے تعلیمی اداروں سے کس قدر لگاؤ ہے۔

مہمان مکرم

اردو کالج میں شعبہ سائنس کا قیام ۱۹۵۴ء میں عمل میں آیا تھا۔ ابتدا میں اس شعبہ میں ۲۰ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے اس وقت اردو سائنس کالج میں انٹرمیڈیٹ سائنس بی ایس سی میں اور ایم ایس سی میں ۱۵۹۶ طلبہ زیر تعلیم ہیں جن میں ۱۵۰ طالبات بھی شامل ہیں۔ یہ کالج اپنی نوعیت کا واحد تعلیمی ادارہ ہے جہاں اعلیٰ جماعتوں میں سائنس کی تعلیم قومی زبان اردو میں دی جاتی ہے۔ اس طرح یہ ادارہ پاکستان میں ایک راہنما کا کام انجام دے رہا ہے۔ طبعیات، کیمیا، نباتیات، حیوانیات، جغرافیہ، ریاضی، حیاتی کیمیا، شماریات اور ارضیات بطور اختیاری مضامین نصاب میں شامل ہیں۔

مہمان گرامی قدر!

وفاقی حکومت اردو سائنس کالج کی یہ وسیع و عریض لیکن نامکمل عمارت جہاں آپ اس وقت تشریف فرما ہیں اردو یونیورسٹی کے اس عظیم منصوبے کا ایک حصہ ہے جس کا خواب بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے دیکھا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ موصوف کی زندگی میں یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

جناب والا!

کئی سال کی کوششوں کے بعد ہماری موجودہ حکومت نے کالج کے تعمیراتی منصوبے کے کچھ حصے کی تکمیل کے لئے ۲۲ لاکھ ۷۰ ہزار روپے منظور کئے ہیں جس میں سے جون کے آخری ہفتہ میں ۵ لاکھ ۲۰ ہزار روپے موصول ہو چکے ہیں۔ اس کے لئے ہم وفاقی حکومت اور خاص طور سے عالی جناب محمد علی خان ہوتی صاحب مشیر برائے تعلیم اور ڈاکٹر ایم اے قاضی صاحب، وفاقی سیکریٹری تعلیم اور بی اے شیخ صاحب، جوائنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر کے مشکور ہیں جنہوں نے اس کالج کی تعمیرات کے سلسلے میں خاص طور سے دلچسپی لی۔ ڈاکٹر ایم اے قاضی صاحب، میری گذارش پر بذات خود اس قومی ادارے کی عمارت کو دیکھنے تشریف لائے تھے۔ اردو سائنس کالج کیمپس تقریباً ۱۹ ایکڑ اراضی پر پھیلا ہوا ہے۔ منصوبے کے مطابق موجودہ عمارت پر دو منازل کا اضافہ، طلبہ کے لئے ہوسٹل، ایک جامع مسجد، اساتذہ و عمال غیر تدریسی کے لئے رہائشی مکانات، اسپورٹس کمپلیکس اور کیمپس کے چاروں طرف چار دیواری کی تکمیل باقی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم آپ کی خصوصی توجہ اور اعانت کے

طالب ہیں ۔ ۲ سال پیشتر اس کالج میں ۵۰۰ طلبہ کی تدریس کے لئے ۳۳ اساتذہ موجود تھے موجودہ تعلیمی سال میں ۱۵۶۰ طلبہ کے لئے صرف ۳۸ اساتذہ تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں ۔ امید ہے کہ آئندہ سال طلبہ کی تعداد ۲ ہزار تک پہنچ جائے گی ۔ اس وقت شعبہ ارضیات میں طلبہ کی تعداد ۵۰۰ سے زائد ہے لیکن صرف ۲ اساتذہ تدریس کر رہے ہیں موجودہ تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس وقت کم از کم ۱۸ لیکچرار کی اشد ضرورت ہے ۔ لیکچرار کے تقررات کی منظوری محکمۂ تعلیم حکومت پاکستان کی موجود ہے ۔ ان اسامیوں کو پُر کرنے کے لئے جنوری ۱۹۷۸ء میں اشتہار دیا گیا تھا ۔ لیکن چھ ماہ گزرنے کے باوجود صرف ۲ شعبوں میں ۲ اساتذہ کا تقرر عمل میں لایا گیا ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ وفاقی حکومت اردو سائنس اور وفاقی حکومت اردو آرٹس کالج کا بورڈ آف گورنرز مشترک ہے ۔ دونوں کالجوں میں دس میل کا فاصلہ ہے ۔ ابتدا میں جب یہ دونوں کالج قومی تحویل میں لئے گئے تھے تو انجمن ترقی اردو کے ۳ اراکین بورڈ آف گورنرز میں شامل تھے ۔ لیکن اب وہ موجودہ بورڈ میں نہیں رہے ۔ وفاقی حکومت نے جتنے ادارے اپنی تحویل میں لئے ہیں سب کے بورڈ آف گورنرز علیحدہ علیحدہ ہیں ۔

گذشتہ ۶ سال سے دونوں کالج علیحدہ علیحدہ ہیں دونوں کے پرنسپل، انتظامات علیحدہ ہیں، بجٹ بھی علیحدہ ہے ۔ ملازمین کی سینارٹی بھی علیحدہ ہے ۔ یہ کالج صرف سائنس کی تعلیم کے لئے مختص ہے ۔ لہذا جناب والا سے التماس ہے کہ دوسرے کالجوں کی طرح وفاقی حکومت اردو سائنس کالج کا علیحدہ بورڈ آف گورنرز بنایا جائے ۔ اس بورڈ میں ملک کے نامور سائنس داں، فنی ماہرین، بحیثیت اراکین لئے جائیں تاکہ یہ ادارہ ان کی خدمات سے مستفید ہو سکے ۔

مہمان مکرم !

تمام نامساعد حالات کے باوجود گورنمنٹ اردو سائنس کالج کے اساتذہ صاحبان نہایت تندہی، اخلاص اور دیانت داری کے ساتھ اپنے تدریسی فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں ۔ یہ امر کالج کے لئے باعث افتخار ہے کہ اس سال بھی وفاقی حکومت اردو سائنس کالج کے ایک ہونہار اور ذہین طالب علم نے کراچی کے تمام کالجوں میں بی ایس سی فائنل کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے ۔ اس سے پیشتر بھی اس کالج کے طلبہ کئی بار یونیورسٹی کے امتحان میں امتیازی مقام حاصل کر چکے ہیں ۔ کالج ایسے ذہین و باصلاحیت طلبہ کی ہمت افزائی کے لئے ایک فنڈ قائم کرنا چاہتا ہے جس سے ان کو وظائف دیئے جائیں اور غریب و نادار طلبہ کی اعانت کی جا سکے ۔

مہمان معظم !

آپ نے ۲۶ جون ۱۹۷۸ء کو وفاقی بجٹ اردو میں پیش کر کے قوم کو قومی زبان کی اہمیت کا احساس

دلایا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی سالمیت اور بقا کا راز اسلامی نظام کے فروغ اور قومی زبان
کی ترویج و ترقی میں مضمر ہے۔ اردو کا نفاذ ہمارے ملک کی فکری اور نظریاتی سرحدوں
کی حفاظت کے لئے بھی قومی زبان کے فروغ سے ملک کے مختلف صوبوں کے عوام کے
درمیان گہرے روابط، اخوت ہم آہنگی اور اتحاد کا جذبہ پیدا ہوگا۔
فروغ سے ملک کے مختلف صوبوں کے عوام کے درمیان گہرے روابط، اخوت، ہم آہنگی اور اتحاد کا جذبہ پیدا
ہوگا۔

آخر میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعاگو ہوں کہ آپ کو عزم استقلال عطا فرمائے تاکہ آپ
ملک و قوم کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرسکیں۔

آخر میں ایک بار پھر اردو سائنس کالج کی جانب سے آپ کی کرم فرمائی اور تشریف آوری
کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں

پاکستان پائندہ باد

نیازمند

محمد اکرام الرحمٰن

پرنسپل

وفاقی حکومت اردو سائنس کالج کراچی



صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کا خطاب

جناب جنرل اقبال صاحب، جناب اکرام الرحمن صاحب، خواتین و حضرات میں نے صرف حاضرین لکھا ہے۔ لیکن خواتین کو دیکھ کر خواتین و حضرات کہہ رہا ہوں کیونکہ اردو کالج میں توقع کے خلاف خواتین کی اچھی خاصی تعداد نظر آرہی ہے۔ پرنسپل صاحب نے جو کچھ میرے متعلق کہا اس پر میں ان کا نہایت مشکور ہوں، میں ملک و قوم کا ادنیٰ سا خادم اور فوج کا ایک چھوٹا سا سپاہی ہوں۔ لیکن اس وقت میرے ذمہ کچھ کام ہیں۔ وہ انشاءاللہ خدا کے فضل و کرم سے اور آپ کی دعاؤں سے خوش اسلوبی سے سرانجام پا جائیں تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔ کالج سے میرا تعارف میرے دوست اور عزیز اے کے آفریدی نے کرایا۔ ان سے معلوم ہوا کہ وفاقی حکومت کی زیر نگرانی کراچی میں ایک اردو کالج بھی ہے۔ بابائے اردو کا نام تو ضرور سنا تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کا قائم کردہ ایک ادارہ بھی وجود میں ہے۔ لہذا جب پرنسپل صاحب کی طرف سے حکمنامہ صادر ہوا تو میرا بھی دل چاہا کہ اردو کالج کو دیکھا جائے کہ یہ کس قسم کا ادارہ ہے۔ کسی تعلیمی ادارے کو جاننے کے لئے طلبہ و طالبات کا جائزہ لیا جائے تو اس کی اہمیت کا صحیح طور پر پتہ چلتا ہے اس کالج کے طالب علموں میں سے ایک آفریدی صاحب بھی ہیں۔ میں ان کی تعریف کرنا نہیں چاہتا کیونکہ انہیں پہلے سے جانتا ہوں مگر آج صلاح الدین صاحب (مدیر جسارت) اور انور خلیل صاحب (مدیر حریت) کو یہاں دیکھ کر اور یہ جان کر کہ یہ دونوں بھی اردو کالج کے فارغ التحصیل ہیں۔ اندازہ ہوا کہ اس کالج کی مٹی زرخیز ہے لیکن کچھ مشکلات ہیں جن کا میں انشاءاللہ تجزیہ کروں گا۔

مولوی عبدالحق صاحب کو بجا طور پر بابائے اردو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اردو کی ترویج و ترقی کو اپنا مشن بنا رکھا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر جو کچھ کمایا اس مشن کی نذر کر دیا۔ یہ افسوس کا مقام ہے کہ ان کی زندگی میں اردو کو اس کا موجودہ مقام بھی حاصل نہ ہو سکا اور ابھی تک وہ منزل کچھ دور نظر آ رہی ہے۔ جس کے لئے وہ خاص طور پر کوشاں رہے۔ آج بھی اردو اپنے جائز مقام سے محروم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولوی عبدالحق کی کوششوں سے اردو زبان یہاں تک آ گئی ہے۔ تو انشاء اللہ اپنی منزل بھی پا لے گی۔ مولوی عبدالحق صاحب کا لگایا ہوا یہ پودا پھولنے پھلنے لگا ہے اس کے زیر اہتمام چار ادارے ہیں۔ اردو سائنس کالج، آرٹس، کامرس کالج اور لاء کالج جہاں ایل ایل بی کی کلاسیں بھی ہوتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قومی زبان میں ان چار اداروں کا قیام ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اردو کے مخالفین اکثر یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس زبان میں اتنی وسعت نہیں کہ یہ تکنیکی اور فنی امضامین کے لئے ذریعہ اظہار بن سکیں۔ ان اداروں کی کامیابی اس الزام کی زبردست تردید ہے۔ ذاتی طور پر میں اردو زبان کی وسعت اور صلاحیتوں کا قائل ہوں اگر میرے لہجے میں پنجابیت نمایاں ہے تو معذرت خواہ ہوں علاوہ ازیں میرے لہجے میں صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان سے میری دیرینہ وابستگی کا بھی دخل ہے۔ تاہم میں کوشش کرتا ہوں کہ اردو بھی صاف بول سکوں ذاتی طور پر میں نے عرض کیا کہ اردو زبان کا قائل ہوں اور یہ ہماری قومی ضرورت ہے کسی ملک کو متحد کرنے اور ان میں قومیت کا احساس ابھارنے کے لئے بنیادی طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اس کا نظریہ جو مملکت کی بنیاد ہوتا ہے۔ اور دوسری اس کی قومی زبان اس لئے میں اپنی تقریروں میں اردو زبان پر زور دیتا ہوں۔ اور آج بھی میرے یہاں آنے کا مقصد اردو زبان میں چلنے والے اداروں کی سرپرستی ہے۔ میں اردو سائنس کالج اور اس سے ملحقہ کالجوں کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان کی نشوونما دراصل اردو زبان کی نشوونما ہے۔ پرنسپل صاحب نے اپنی تقریر میں مالی مشکلات کا ذکر کیا ہے اور اس کالج کی انتظامی امور کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ ان کے تجزیے کے مطابق اردو کالج کو عظیم الشان منصوبے کے تحت ترقی دینے کا خیال قابل تحسین ہے۔ لیکن اس کے لئے ہمیں قدم بہ قدم چلنا ہوگا۔ ایک ہی جست میں ساری مشکلات پر قابو حاصل کرنا ناممکن ہے۔ جس کی وجہ حکومت کی بے اعتنائی نہیں بلکہ قومی وسائل کی کمی ہے۔ اساتذہ اور دیگر عملے کے لئے رہائشی امکانات، اسپورٹس کمپلیکس، چہار دیواری ایسے مسئلے ہیں۔ جن کے لئے وقت اور پیسہ درکار ہے۔ میں آپ کی مشکلات کے فوری حل کے لئے ایک منصوبہ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ امید ہے اس سے حالات کچھ بہتر اور سازگار ہو جائیں گے۔ اور چونکہ یہ وفاقی حکومت کا ادارہ ہے۔ اس لئے مرکزی وزارت تعلیم کو ہدایت کروں گا۔ کہ وہ آپ کے مسائل اور ضروریات کا جائزہ لے کر اگر ضرورت ہو تو مزید سفارشات مرتب کرے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے۔ یہ اپنے وسائل کے مطابق اردو سائنس کالج کی مدد کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی۔ جہاں تک بورڈ آف گورنرز کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ چاروں ادارے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم کے خواب کی تعبیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو جدا کر کے علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کر دینے کے لئے فی الحال کوئی حکم صادر نہیں کرنا چاہتا۔ اپنے منصوبے کو زیر بحث لاؤں گا تو اس کا ذکر کروں گا۔ سائنس کالج، آرٹس

کالج، کامرس کالج، اور لاء کالج سب کی اپنی اپنی جگہ ایک حیثیت ہے۔ ان کو اسی نظریہ سے دیکھنا چاہیئے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے میں اردو سائنس کالج میں زیادہ وقت نہیں گزار سکتا جس کیلئے میں معذرت چاہتا ہوں۔ اردو سائنس کالج اور آپ کے مقاصد مجھے بہت عزیز ہیں۔ اس کی ترقی میں میں ذاتی دلچسپی رکھتا ہوں۔ اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کالج کو اور اس کے باقی اداروں کو زیادہ سے زیادہ کامیابیوں سے ہمکنار کرے اور صحیح معنوں میں اردو زبان اور ملک و قوم کی خدمت کرسکے۔ جہاں تک آپ کی مشکلات کا تعلق ہے۔ کچھ رقم کا ذکر آپ نے فرمایا وہ آپ کی مرضی ہے۔ جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ میں جس ادارے میں جاتا ہوں۔ وہاں دو چیزوں پر زیادہ توجہ دیتا ہوں۔ ایک ادارے کا ماحول جس کے لئے اساتذہ بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اور یہ میں خواتین و حضرات کو خوش کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ اپنا ذاتی تجربہ ہے۔ اب اس میں میری والدہ اور بیوی کا کیا رول ہے۔ اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ میرا اپنا تجربہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں اپنی تھوڑی سی ریزرویشن علیحدہ رکھیں۔ میرے اپنے خیال اور ذاتی مشاہدہ میں آیا ہے کہ خواتین تعلیمی اداروں میں زیادہ اہم رول ادا کرسکتی ہیں۔ اس لئے میں سفارش کروں گا کہ جتنے اساتذہ کی ضرورت ہے۔ اس میں زیادہ کوشش کریں کہ وہ خواتین ہی میں سے لی جائیں۔ آپ نے اٹھارہ آسامیوں کا ذکر کیا ہے۔ میں دو اپنی طرف سے دیتا ہوں۔ اس طرح یہ بیس ہوتی ہیں۔ شرط اتنی سی ہے کہ خواتین کا کوٹہ ذرا بڑھا کر رکھیئے۔ اس کے تمام اخراجات کی ادائیگی وفاقی حکومت کرے گی۔ دوسری چیز جس پر میں توجہ دیتا ہوں۔ وہ لائبریری ہے۔ اگر یہی لائبریری ہے تو یہ لائبریری کہلانے کے لائق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور لائبریری ہے تو بہت بہتر اور اگر نہیں ہے تو اردو کالج کے لئے اس کی لائبریری کا معیار بھی اس کالج کے بانی مولوی عبدالحق کے مطابق ہونا چاہیئے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس کالج کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر ان کی تمام خواہشات ہم پوری نہیں کرسکتے تو کم از کم اس کی طرف قدم مزید بڑھانا چاہیئے۔ اس کالج کی لائبریری ملک کے تمام کالجوں کی لائبریریوں سے بہتر ہونی چاہیئے۔ اور اس کے لئے جتنی رقم کی ضرورت ہوگی میں مہیا کروں گا۔

تیسری چیز جس کی اشد ضرورت ہے وہ ہے غریب طلبہ کے لئے اسکالرشپ تعلیم کسی ایک طبقہ کا حق نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ ایسے طلبہ جن کے والدین کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ ان کی مالی مدد کرنا حکومت ہی کا فرض نہیں بلکہ ہم سب کا فرض ہے۔ یہ ہمارا معاشی اور سوشل فنکشن بھی ہے کہ ہم ان طلبہ و طالبات کی مدد کریں جو ذہین ہیں۔ اس کے لئے میں ایک لاکھ روپے کی خصوصی رقم مخصوص کرتا ہوں۔ جو کہ ان طلبہ و طالبات کو وظائف دینے کے لئے خرچ کی جائے گی۔ جن کے والدین کی آمدنی پانچسو روپے سے کم ہے۔ مستحق طلبہ کا انتخاب آپ خود کریں گے۔ اس کے علاوہ جہاں تک بورڈ آف گورنرز کا تعلق ہے میں ایک کمیٹی تشکیل دے رہا ہوں۔ جس کے صدر وزیر تعلیم جناب محمد علی خان ہوتی صاحب ہوں گے۔ اس کے ممبران میں ڈاکٹر ممتاز قاضی صاحب سیکریٹری وزارت تعلیم اور کالج کے پرنسپل صاحب ہوں گے۔ ان کی مدد کے لئے اگر آپ چاہیں تو ایک دو ممبر اور لے لیں۔ اس کے بعد اپنی سفارشات پیش کریں کہ آیا ان اداروں کے بورڈ آف گورنرز علیحدہ علیحدہ ہونے چاہئیں یا ان اداروں کا ایک بورڈ آف گورنرز ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اس کالج کو جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ایک آئیڈیل یونیورسٹی کے معیار

تک پہنچایا جائے۔ لیکن اس کے لئے وقت کی ضرورت ہے۔ اور یونیورسٹی بنانے میں میرا رویہ اور ان لوگوں سے جو مجھ سے پہلے صاحب اقتدار تھے۔ ذرا مختلف ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ پہلے اپنی پوزیشن اور اپنے اسٹیٹس کو اس قابل بنائیے کہ یونیورسٹی کہلوانے کے لئے حق بجانب ہو سکیں۔ میرے کہنے سے اگر آج اردو سائنس کالج کو یونیورسٹی کا نام دے دیا جائے۔ تو اس سے کام نہیں بنے گا۔ میں آپ کو ایک میعاد دیتا ہوں۔ یہ میعاد میرے دور میں آئے یا میرے بعد تین مہینے، چھ مہینے یا سال کے اندر آپ اس کالج کو پوسٹ گریجویٹ کے معیار پر لے آئیے۔ اگر آپ ایسا کر سکیں تو اسے یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لئے میں انشاء اللہ خود آؤں گا۔ لیکن اس دوران آپ کو اس کے لئے محنت کرنی ہو گی۔ جو کمیٹی میں نے تشکیل دی ہے اس کے ذمہ میں ایک اور کام دینا چاہتا ہوں۔ کہ اردو سائنس کالج کی عمارت کو جو زبوں حالی باہر سے دیکھنے میں نظر آ رہی ہے۔ اس کو بہتر بنانے کے لئے ایک جامع منصوبہ بنایا جائے۔ منصوبہ مرتب ہونے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا کہ کتنے ہاسٹل، کلاس روم، آڈیٹوریم اور چہار دیواری چاہیئے۔ پرائیویٹ تیز مقرر کریں میں نے چوتھی جماعت تک تعلیم ایسے اسکول میں حاصل کی۔ جہاں زمین پر بچھانے کے لئے بوری بھی نہیں ہوتی تھی۔ دسویں جماعت تک گورنمنٹ ہائی اسکول کا طالب علم رہا۔ جہاں بعض اوقات ڈیسک ہوتا۔ بعض اوقات نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنی زندگی میں تعلیمی معیار سے جو چیز حاصل کی ہے۔ بہت کم لوگوں نے اسے حاصل کیا ہے۔ میرے خیال میں تعلیم کا معیار اچھی بلڈنگ اچھے کمرے کا مرہون منت نہیں ہوتا۔ بلکہ اساتذہ کے معیار و تعلیمی مضامین سے دلچسپی اور فرض شناسی کے ساتھ ساتھ طلبہ و طالبات کی تعلیم حاصل کرنے کی جدوجہد اور لگن سے ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

اساتذہ ان لوگوں کے ساتھ مل کر جنہوں نے تعلیم و تدریس کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ کوشش کریں تو سب کچھ درست ہو سکتا ہے کہ یہ ذریعہ معاش میرے خیال میں سب سے بڑی قربانی کا متقاضی ہے اگر اصلی معنوں میں جہاد کر سکیں۔ میں فوجی ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ فوجی زندگی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن آپ کا ذریعہ معاش درس و تدریس کو فوجی زندگی پر بھی قابل ترجیح رکھتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ اس ملک کے جوانوں لڑکوں اور لڑکیوں کو پاکستانی اور صحیح مسلمان بنائیں۔ اور انہیں اپنی زبان عطا کریں جسے ذریعہ اظہار کے طور پر استعمال کر سکیں۔

شکریہ

سپاسنامہ

بخدمت اقدس عالیجناب محمد علی خان صاحب

وفاقی وزیر تعلیم، حکومت پاکستان و چیرمین بورڈ آف گورنر

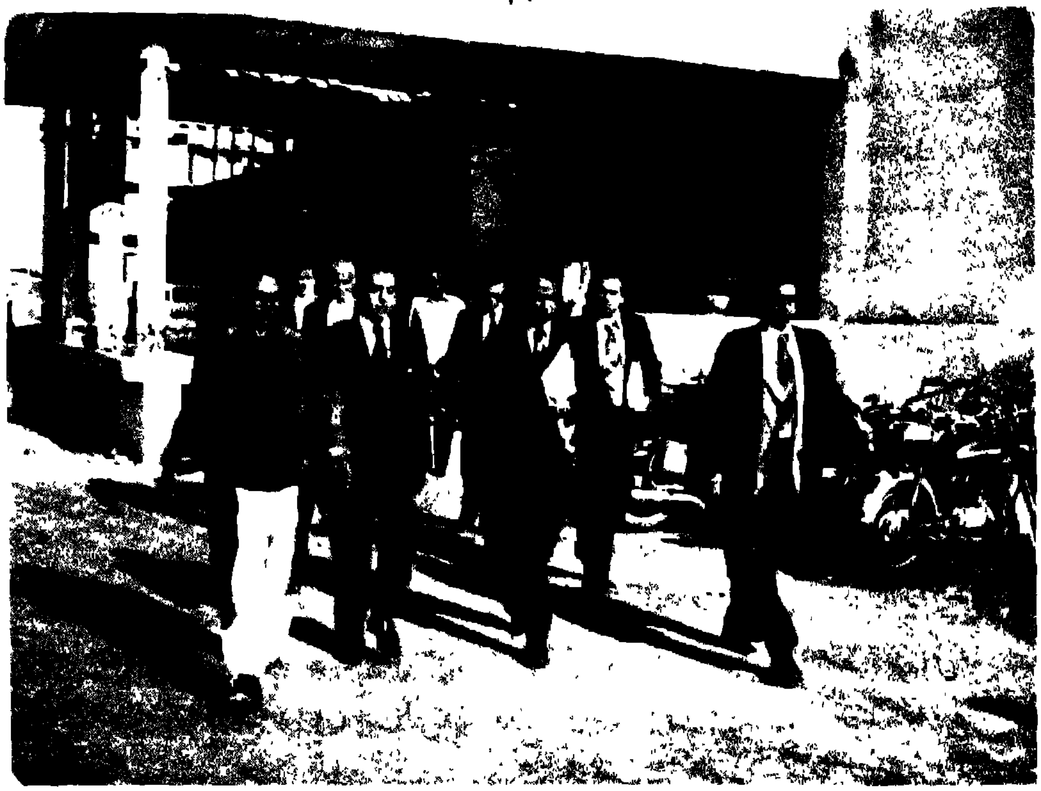
وفاقی حکومت اردو سائنس کالج۔ کراچی

عزت مآب عالی جناب!
محمد علی خان صاحب، معزز مہمانان گرامی!
اساتذہ کرام وفاقی حکومت اردو سائنس کالج

میرے لیے یہ امر باعث صد افتخار و شادمانی ہے کہ آج مجھے حدود اردو سائنس کالج میں وفاقی وزیر تعلیم چیرمین بورڈ آف گورنرز کو خوش آمدید کہنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ آپ کی سرپرستی اور نگرانی میں نئے دور کے قومی تقاضے اور اسلامی تعلیمات کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو قومی تعلیمی پالیسی مرتب کی گئی ہے اور جس طرح اس پر خوش اسلوبی سے عمل درآمد ہو رہا ہے اور بذات خود جس قومی جذبہ خلوص، تدبر اور جس انہماک سے گذشتہ دو سال سے ناساعد حالات کے باوجود آپ تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں شب و روز کوشاں ہیں قوم آپ کی مرہون منت ہے۔
ہمیں آپ کی ملکی مصروفیات و مشغولیات کا پورا علم ہے لیکن آپ نے اردو کی ترویج و ترقی کے لئے اس قومی ادارے کی جس فراخدلی سے اعانت فرمائی ہے اور خاص طور سے کتب خانہ کالج کی تعمیر کے لئے جو گراں قدر گرانٹ بعجلت ممکنہ منظور کی ہے اس کے لئے ہم سب آپ کے شکر گذار ہیں ہم آپ کو اردو اور اردو سائنس کالج کا ایک محسن سمجھتے ہیں ویسے تو آپ اس کالج میں کئی بار تشریف لا چکے ہیں لیکن اساتذہ کرام اردو سائنس کالج کی عرصہ سے دلی خواہش تھی کہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق یادگاری کتب خانہ کا سنگ بنیاد آپ کے دست مبارک سے رکھا جائے یہی وجہ ہے کہ ہم نے آپ کو اس قومی ادارے میں بحیثیت مہمان خصوصی تشریف لانے کی زحمت دی ہے۔ آپ نے اساتذہ کالج کی دعوت کو شرف قبولیت بخشا ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں۔

مہمان گرامی قدر!

وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کی وسیع و عریض لیکن نامکمل عمارت جہاں آپ اس وقت تشریف فرما ہیں۔ اردو یونیورسٹی کے اس عظیم منصوبے کا ایک حصہ ہے جس کا خواب بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق



وفاقی وزیر تعلیم چیئرمین بورڈ آف گورنرز اردو سائنس کالج مولوی عبدالحق یادگاری کتب خانہ کا سنگ بنیاد رکھنے کیلئے تشریف لے جارہے ہیں



محمد علی خان صاحب سنگ بنیاد کی نقاب کشائی فرمارہے ہیں

مرحوم نے دیکھا تھا لیکن افسوس ہے کہ صاحب موصوف کی زندگی میں یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ امید ہے کہ آپ کی سرپرستی اور رہنمائی میں یہ قومی ادارہ مستقبل قریب میں ایک ممتاز اور مثالی سائنس کی تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ بن جائے گا۔ یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد اس کو ایک تحریک کی حیثیت حاصل ہوگی۔ بابائے اردو نے اردو یونیورسٹی کا جو خواب دیکھا تھا۔ وہ انشاءاللہ آپ کے ہاتھوں شرمندہ تعبیر ہوگا۔

مہمان مکرّم!

موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد ۱۹۶۴ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب سابق صدر پاکستان نے رکھا تھا۔ ۱۵ سال گذر جانے کے بعد بھی یہ عمارت ہنوز نامکمل ہے۔ محکمہ تعلیم حکومت پاکستان نے موجودہ عمارت کے لئے ۲۲,۷۲,۰۰۰/- روپے منظور کئے تھے۔ اس میں سے ۱,۳۲,۰۰۰/- روپے ابھی تک نہیں ملے ہیں۔ علاوہ ازیں اس منظور شدہ رقم سے صرف ۱۴ کمرے تعمیر ہوں گے۔ جو ہماری تدریسی ضروریات کے لئے قطعی ناکافی ہیں۔

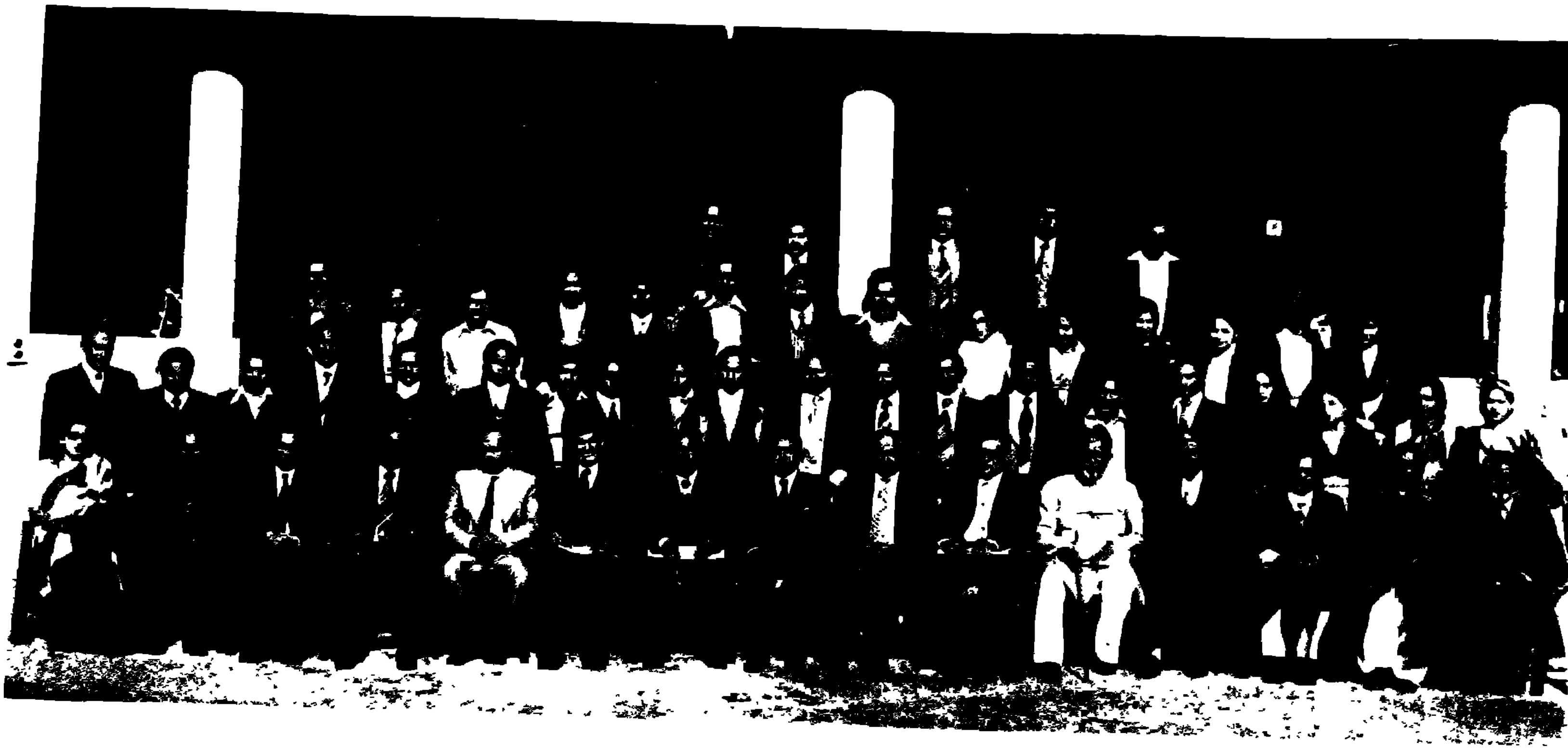
جناب والا!

اردو کالج کے شعبہ سائنس کا قیام ۱۹۵۴ء میں عمل میں آیا تھا۔ ابتداء میں اس شعبہ میں ۲۰ طلبہ زیر تعلیم تھے لیکن خدا کے فضل و کرم سے اس وقت اردو سائنس کالج میں انٹرمیڈیٹ سائنس، بی ایس سی اور ایم ایس سی میں تقریباً ۲۵۰۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں جن میں ۲۰۰ طالبات بھی شامل ہیں یہ کالج اپنی نوعیت کا واحد تعلیمی ادارہ ہے جہاں اعلیٰ جماعتوں میں سائنس کی تعلیم قومی زبان اردو میں دی جاتی ہے اس طرح یہ ادارہ پاکستان میں ایک راہنما کا کام انجام دے رہا ہے۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ بی ایس سی کی سطح تک اس ادارے میں طبیعیات، کیمیا، ریاضی، نباتیات، حیوانیات، جغرافیہ، ارضیات، شماریات، حیاتی کیمیا، خورد حیاتیات یعنی تمام بنیادی اور اطلاقی سائنس کے مضامین بطور اختیاری مضامین نصاب میں شامل ہیں علاوہ ازیں اس ادارے میں ایم ایس سی طبیعیات، ریاضی اور حیوانیات کی تدریس کا بھی انتظام ہے۔

گلشن اقبال اسکیم نمبر ۲۴ کی آبادی میں روزافزوں اضافے، قومی زبان اردو کی اہمیت اور کالج میں پرسکون تعلیمی ماحول کی وجہ سے کراچی اور پاکستان کے مختلف خطوں کے کثیر طلبہ داخلہ لیتے ہیں داخلے کی یہی رفتار رہی تو آئندہ چار پانچ سالوں میں اس کالج میں طلبہ کی تعداد ۵ ہزار سے تجاوز کر جائے گی۔

انشاءاللہ آئندہ تعلیمی سال میں ہی یہ کالج سائنس کی تعلیم کا پاکستان کا سب سے بڑا کالج ہوگا لہٰذا تدریسی ضروریات کے لئے اس عمارت میں توسیع کی ضرورت ہے۔ التماس ہے کہ پہلی منزل کے بقیہ تینوں ونگ کے لئے گرانٹ عنایت فرمائی جائے تاکہ مزید کمرے تعمیر کرائے جاسکیں۔

مزید گزارش ہے کہ کالج کیمپس میں مسجد کی تعمیر کو ترجیحی اہمیت دی جائے۔ جس کی گنجائش کالج کے منظور شدہ نقشہ میں موجود ہے طلبہ اور اساتذہ کی بڑی تعداد ادائیگی نماز کی پابندی کرتی



اساتذہ کرام وفاقی وزیر تعلیم محمد علی خان اور اراکین بورڈ آف گورنرز کے ہمراہ

ہے دوران تدریس نماز باجماعت کا اہتمام کالج کی انتظامی ذمہ داریوں میں شامل ہے اس وقت امتحانی ہال کے ایک حصے میں عارضی طور پر نماز کا انتظام کیا گیا ہے۔

اس قومی ادارہ کو فخر حاصل ہے کہ پاکستان کے دو صدور مملکت اس مادر درسگاہ میں تشریف لا چکے ہیں۔

۲۶ جولائی ۱۹۷۸ء کو جب فضیلت مآب عالی جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب، صدر پاکستان کالج تشریف لائے تھے تو فرمایا تھا کہ وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کیمپس کے تعمیراتی و رہائشی و دیگر منصوبہ جات کی تکمیل کے سلسلے میں حکومت ہر طرح کی اعانت و امداد کرے گی۔

جناب والا!

صدر پاکستان کے احکامات کے بموجب گذشتہ سال کالج کا پنج سالہ منصوبہ محکمہ تعلیم کو ارسال کر دیا گیا ہے۔ التماس ہے کہ یہ منصوبہ منظور فرما لیا جائے تاکہ کیمپس کی تعمیراتی و رہائشی ضروریات کی تکمیل ہو سکے اور یہ ادارہ جو عرصہ سے زبوں حالی کا شکار ہے اس صورت حال سے نجات پا سکے۔ اس سلسلے میں آپ کی ذاتی توجہ کا طالب ہے۔

آخر میں ایک بار پھر اساتذہ کرام اردو سائنس کالج کی جانب سے آپ کی کرم فرمائی اور تشریف آوری کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

"پاکستان پائندہ باد!"

نیاز مند

(پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن)

پرنسپل

وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کراچی!



وفاقی وزیر تعلیم کی پرنسپل صاحب اور نمائندہ اساتذہ جناب ادریس ہاشمی سے گفتگو



وفاقی وزیر تعلیم شعبہ نباتیات میں



مستقبل کے منصوبوں پر تبادلہ خیال



پرنسپل سے ادارہ کے تعمیری منصوبوں پر گفتگو

محمد علی خان ہوتی

وفاقی وزیر تعلیم و چیئرمین

بورڈ آف گورنرز اردو سائنس کالج

جناب پرنسپل صاحب!

خواتین و حضرات!

میرے لئے یہ باعث مسرت ہے کہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق یادگاری کتب خانہ کی تنصیب کی تقریب کے موقع پر مجھے مدعو کیا گیا ہے۔ آپ کا ادارہ یقیناً اپنی نوعیت کا واحد تعلیمی ادارہ ہے جہاں سائنس کی تعلیم اردو میں دی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک خوش آئیند بات ہے کہ آپ کے طلباء و طالبات کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر اسی لگن اور محنت سے کام کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب آپ کی درسگاہ سائنس کی تعلیم کے لیے ایک ممتاز ادارہ بن جائے گی۔ کسی بھی ادارے کی ترقی میں اساتذہ کی عموماً اور سربراہ کی دلچسپی خصوصاً مطلوب ہوتی ہے اور آپ کی رپورٹ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کافی دلچسپی اور تندہی سے کام کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ آئندہ بھی اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایسے ہی کوشاں رہیں گے۔

یہ دور سائنس و ٹیکنالوجی کا دور ہے اور اب ہر شعبے میں ترقی کے لیے سائنس و ٹیکنالوجی میں دسترس شرط اول بن گئی ہے۔ اس لیئے ضروری ہے کہ ہم بھی سائنس پر دسترس حاصل کرنے کے لیئے ہر ممکن کوشش کریں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بارہویں صدی میں اسپین اور دوسرے علاقوں میں مروجہ اسلامی تہذیب نے یورپ سے دور جہالت کے خاتمے کے لیئے اہم کردار ادا کیا تھا کیونکہ یہی وہ دور تھا جب انسان کو توہم پرستی سے نجات ملی اور سائنس کے اہم اصول وضع ہوئے لیکن بعد ازاں یورپ نے سائنس میں حیرت انگیز ترقی کی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت ترقی یافتہ ممالک نے اپنی صنعتی قوت میں حیرت انگیز اضافہ کر کے اپنی معیشت کو نہایت مستحکم بنالیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہر قوم کی ترقی اور خوشحالی کا انحصار سائنس کی ترقی پر ہی سمجھا جاتا ہے۔

پاکستان میں بھی اس کا زیادہ احساس ہو رہا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں جناب صدر جنرل ضیاء الحق صاحب نے بھی سائنس کی ترقی و فروغ کے لیے ترقی بجٹ کا کم از کم ایک فی صد حصہ مخصوص کرنے کا جو اعلان کیا ہے وہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حکومت سائنس کے ترویج اور تعلیم کو خصوصی اہمیت دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اب سائنس دانوں کو تحقیق کے لیئے ملک سے

باہر جانے کے لئے بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہمارے ہاں سائنس کی تعلیم و تحقیق کا موجودہ معیار کس حد تک زمانے کے تقاضوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ تو غالباً آپ حضرات مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے عوامل کارفرما ہیں کہ ہم ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔

اس بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے سائنسی تحقیق کے اداروں و دیگر اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں ضروری آلات اور معیاری ساز و سامان کے علاوہ ایسی فضا نہیں پائی جاتی جس میں سائنس دان قابل فخر ایجادات کر سکیں لیکن میرے خیال میں، بنیادی بات شوق اور لگن کی ہے۔ اگر ہمارے ملک میں عظیم سائنس دان تیار کرنا مطلوب ہے تو شروع سے ہی طلبا میں تحقیق و تجسس پیدا کرنا بھی ضروری ہوگا اب اگرچہ مغربی ممالک کے مقابلہ میں ہمارے وسائل نہایت محدود ہیں اور ہمارے سائنس دانوں کو وہ سہولتیں بھی میسر نہیں تاہم وقت کا تقاضا تو یہ ہے کہ موجودہ وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے وہ محنت اور لگن سے کام کریں تو اس اہم شعبہ میں کچھ نہ کچھ پیش رفت ممکن ہو سکے گی۔

پاکستان میں گزشتہ ۳۲ سالوں کے دوران سائنسی اداروں کی تشکیل کی جاتی رہی ہے اور ان میں بعض اداروں کا کام قابل تعریف بھی رہا ہے تاہم جب تک تحقیق کے عملی فوائد سے عوام الناس بہرہ ور نہیں ہوں گے اور ہمارا درآمدات پر انحصار کم نہ ہوگا اُس وقت تک منصوبہ بندی میں خلاء محسوس ہوتا رہے گا۔ قومی، سائنسی، فنی، تعلیمی اور معاشی پالیسیوں کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اور قومی منصوبہ بندی انہیں سے پایہ تکمیل تک پہنچتی ہے۔

خواتین و حضرات! زبان کسی بھی قوم کے تہذیبی امتیاز کی موثر اور دلکش ترجمان ہوا کرتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم اپنی قومی زبان اردو ہی کے ذریعے اپنے منفرد قومی تشخص کو اُجاگر کر سکتے ہیں۔ جو قوم اپنی روایات و تمدن کو نظر انداز کرتی ہے اُسے دیگر اقوام عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتیں۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہمیں انگریزی یا دیگر زبانوں سے استفادہ نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ہی کوئی معقول اور سنجیدہ شخص اس مشورے کی تائید کرے گا کہ دورِ غلامی کی یادگار ہونے کے باعث انگریزی سے پورا استفادہ نہ کیا جائے۔

مسلم تہذیب و ثقافت کے دور عروج میں جب مسلمان کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہوئے تو عباسی حکمرانوں کی سرپرستی میں دارالحکمت قائم کیا گیا اور دیگر زبانوں میں قابل عمل مواد کو زمانہ کی سب سے بڑی تہذیبی زبان عربی میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ تحقیق اور ترجموں کی اسی بنیاد پر مسلمانوں کی سائنس اور فلسفہ کی شاندار عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ جس کی بدولت ہسپانیہ، مصر، شام اور عراق کے تہذیب اور تمدن پر مسلمان دانشوروں اور مفکروں کے کے گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ یہ اثرات عربی زبان کو ذریعۂ اظہار بنانے سے ہی ممکن ہوئے تھے۔ لہٰذا ہماری مساعی بھی صرف اُسی وقت زیادہ بارآور ہوں

گی جب ہم اپنی تعلیمی اور سائنسی درسگاہوں میں اردو کو اس کا جائز مقام دیں گے۔

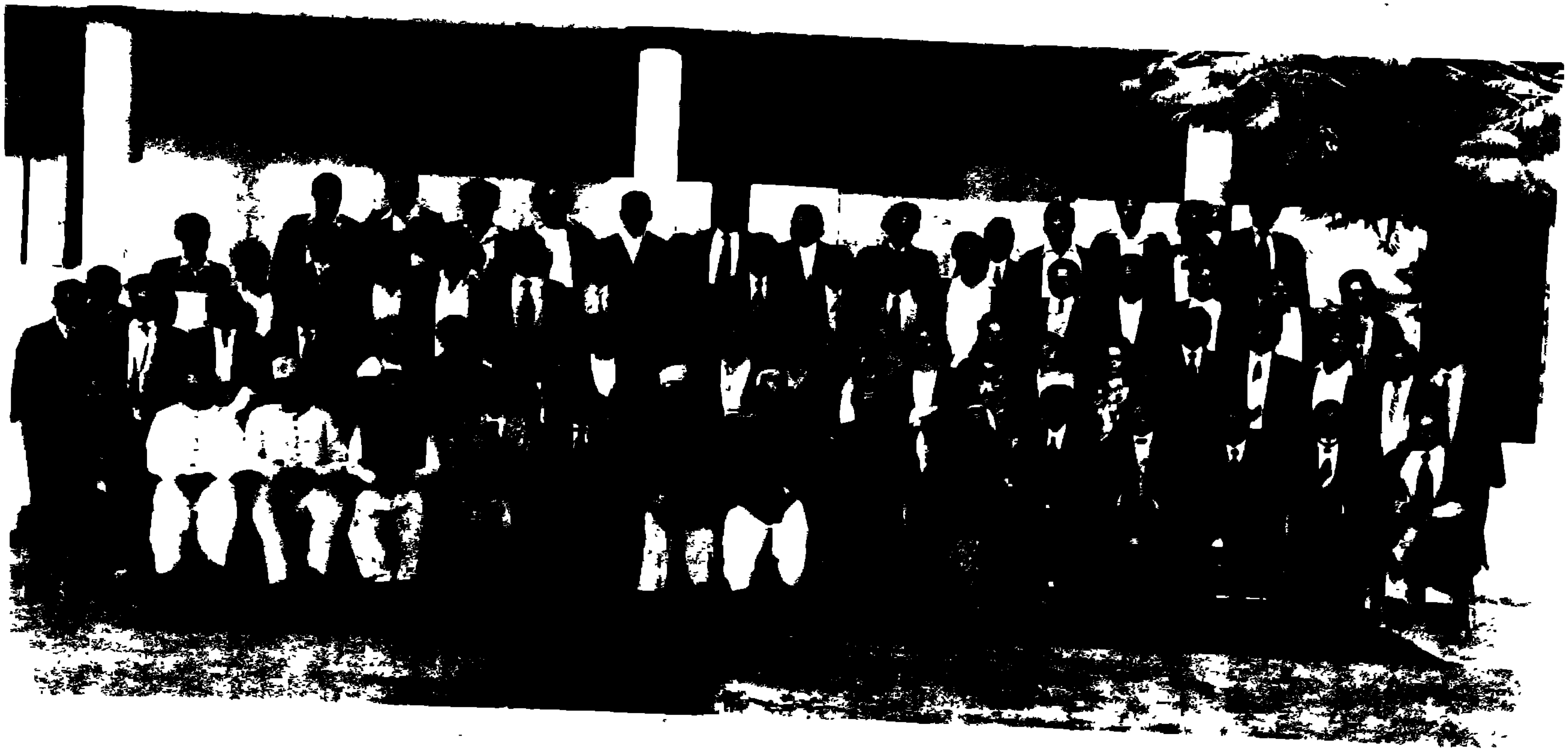
اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جسے ہمارے ملک کے ہر حصے میں باآسانی سمجھا اور بولا جاتا ہے۔ حکومت اور عوام دونوں اس کی ترویج کے لیے کوشاں ہیں اور چند ادارے بھی حتی الوسع اردو زبان کی ترقی کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اردو کا رواج بھی اسی وقت عام ہو سکتا ہے جب وسیع پیمانے پر ترجمہ و تصنیف کا کام آگے بڑھایا جائے۔ مختلف مضامین میں اعلیٰ اور معیاری کتابوں کی بھی کمی ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں اور اس میں سب سے اہم فرض ہماری اعلیٰ درسگاہوں کے اساتذہ سرانجام دے سکتے ہیں۔ محنت و دلجمعی سے کام کرنے کی اشد ضرورت اور ہمارے ہاں ایسے افراد کی کمی نہیں جو یہ کام بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔

عام شہری اردو کی قومی حیثیت اور اس کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں مگر وہ اس حقیقت سے بھی آشنا ہیں کہ تا حال مختلف علوم و فنون میں اردو زبان میں کثیر تعداد میں مستند کتب موجود نہیں۔ اس کمی کو ہمیں دور کرنا ہوگا۔

ایک مخصوص طرز فکر یہ بھی ہے کہ دوسری زبانوں کے ایسے الفاظ کو بھی جو ہماری بول چال کا اب حصہ بن چکے ہیں اردو سے خارج کر دیا جائے۔ ہر زندہ زبان کو دوسری زبانوں کے ضروری الفاظ سمو لینے سے تقویت پہنچتی ہے۔ اس لیے اردو کے فروغ اور ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں وسعت نظر سے کام لینا چاہیئے کچھ افراد تو مشکل و پیچیدہ الفاظ اور محاوروں کو پھر سے رائج کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں اور اپنا قیمتی وقت عام فہم الفاظ کے متبادل الفاظ تلاش کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ غالباً ایسے افراد عام شہری پر اپنی علمی دھاک و دبدبہ بٹھانا چاہتے ہیں مگر یہ رجحان میرے خیال میں کسی طرح بھی اردو کے حق میں نہیں اور ہمیں اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اردو ایک عام فہم و شیریں زبان ہے ہمیں اس کی رعنائی میں مزید دلکشی و خوبصورتی پیدا کرنی چاہیئے تاکہ اس کے فروغ و ترویج میں آسانی ہو۔

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق یادگاری کتب خانہ کی تنصیب کی تقریب میں شرکت میرے لیے یقیناً ایک اعزاز ہے۔ ہم بابائے اردو کی خدمات کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے مشن کو جاری رکھا جائے۔ افسوس کی بات ہے اور معیار تعلیم کی پستی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ طلبا درسی کتب کے علاوہ دیگر کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے۔ ہمارے کالجوں کے کتب خانوں میں اب شاذ و نادر ہی طالب علم دیکھے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کتب خانے سے طلبا و اساتذہ پوری طرح فائدہ اٹھائیں گے۔

پاکستان پائندہ باد



مہمانانِ گرامی اساتذہ کرام گورنر سندھ کے ہمراہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سندھ جناب ایس ایم عباسی کا دورہ کالج



مہمانِ معظم عالیجناب فضیلت مآب لیفٹیننٹ جنرل ایس ایم عباسی صاحب
(گورنر صوبہ سندھ)

معزز مہمانانِ گرامی و اساتذہ کرام!

میرے لئے یہ امر باعث صد افتخار و انبساط ہے کہ آج مجھے اردو سائنس کالج میں صوبہ سندھ کے قابلِ احترام آئینی و انتظامی سربراہ، اسلام کے شیدائی، مردِ مومن، پاسبانِ وطن لیفٹیننٹ جنرل ایس۔ ایم عباسی صاحب کو خوش آمدید کہنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ گذشتہ کئی سالوں سے آپ حسن تدبر، انہماک، خوش اسلوبی اور جذبہ ایثار سے صوبہ سندھ کی خوشحالی اس کی معاشی ترقی، تعلیمی اور سماجی بہبود کے لئے شب و روز کوشاں ہیں۔ وہ قابلِ تحسین و ستائش ہے۔ اہالیانِ سندھ آپ کے دور کو سنہری اور آپ کی شخصیت کو قابلِ فخر سمجھتے ہیں۔ صوبہ کا ہر فرد و بشر آپ سے والہانہ محبت کا جذبہ رکھتا ہے۔ اور اس جذبہ

میں اس قومی ادارہ کے اساتذہ کرام بھی شریک ہیں ۔ وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج ، کراچی کے اساتذہ کرام کی دلی خواہش تھی کہ بحیثیت مہمان خصوصی آپ کو تقریب استقبالیہ میں شرکت کی زحمت دی جائے۔ ہمارے لئے انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ آپ نے اساتذہ کرام کی دعوت کو شرف قبولیت بخشا اور اپنی گوناگوں مصروفیات و مشغولیات کے باوجود اس ادارہ میں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی ۔ میں اور کالج کے اساتذہ کرام آپ کی اس نوازش کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں ۔

مہمانِ مکرم ! پاکستان کا قیام برصغیر کے مسلمانوں کی ملی زندگی کا سب سے اہم واقعہ ہے ۔ مسلمانوں نے یہ خطہ زمین اس لئے حاصل کیا ہے کہ یہاں اپنی ملی، تہذیبی اور تمدنی روایات کو پھر سے زندہ کریں ۔ لہٰذا نئے ملک کے حصول کے ساتھ ملت اسلامیہ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اردو سائنس کالج اور اردو کالج کا قیام انہی ذمہ داریوں کو اپنے وسائل کے مطابق قبول کرنے کی ایک درخشاں مثال ہے ۔ یہ دونوں کالج پاکستان کے منفرد ادارے ہیں جہاں اعلیٰ جماعتوں میں ذریعہ تعلیم اُردو ہے ۔ اس طرح ہمارے طلباء کو اپنی صلاحیت اور شخصیت کے اظہار کا موقع ملتا ہے ۔ اِن دونوں درس گاہوں میں سائنس، فنون ، تجارت اور قانون کی اعلیٰ تعلیم نہایت کامیابی سے دی جاتی ہے ۔ اس نظام کی ستائش مرکزی حکومت کے تحقیقاتی کمیشن نے بھی کی ہے ۔

اردو سائنس کالج کراچی ملک کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے ۔ جہاں قومی زبان میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے ۔ اس ادارہ میں اس وقت تقریباً ۲۶۰۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں جن میں ۳۸۵ طالبات بھی شامل ہیں ۔ اِس قومی درسگاہ میں دورِ جدید کے تمام بنیادی و اطلاقی سائنسی مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ اور ایم ایس سی کی سطح تک کی تدریس اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قومی زبان میں سائنس اور فنیات کے تمام مضامین کی تدریس کی بڑی صلاحیت موجود ہے ۔ اردو سائنس کالج ایک ادارہ ہی نہیں ایک ایسی فعال تحریک کا نام ہے جس کا بنیادی مقصد سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک گیر راہیں استوار کرنا ہے تاکہ ہم دیگر ترقی یافتہ ممالک سے قدم سے قدم ملا کر چل سکیں ۔

اردو کالج کراچی کو ملک میں ایک منفرد مقام حاصل ہے ۔ یہ واحد ادارہ ہے جس میں فنون ، تجارت اور قانون کے مختلف شعبے قائم ہیں ۔ اور پوسٹ گریجویٹ سطح تک ایم ۔ اے ۔ سیاسیات ، اسلامیات اور تاریخ اسلام کی تدریس کا انتظام ہے ۔ علاوہ ازایں قانون میں ایل ۔ ایل ۔ ایم کی تعلیم نہایت کامیابی سے دی جا رہی ہے ۔ یہ قومی ادارہ ابتدا سے ملک میں قومی زبان کے فروغ میں اہم کردار انجام دے رہا ہے ۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی اس کالج کو امتیازی حیثیت حاصل ہے ۔ اس درسگاہ سے فارغ التحصیل ہزارہا طلباء ملک کے گوشے گوشے میں مختلف انتظامی ، مالی ، صنعتی ، تعلیمی اور پیشہ ورانہ اداروں میں اعلیٰ خدمات انجام دے رہے ہیں ۔

مہمانِ محترم ! یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر قوم اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں اپنی قومی زبان کو ترجیح دیتی ہے قومی زبان سائنس کی تفہیم و تعلیم کی علم بردار ہوتی ہے ۔ دنیا کی ترقی یافتہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے بدیسی زبان کے ذریعہ ترقی حاصل کی ہو ۔ ہر قوم کی ترقی خود اپنی زبان کی مرہونِ منت ہوتی ہے ۔ پاکستانی قوم اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل ہے لیکن ہم

سائنس کے میدان میں اسی صورت میں ترقی کر سکتے ہیں جب ہم حقیقی معنوں میں بدیسی زبان کو ترک کردیں اور اپنی زبان کو تعلیمی وسرکاری دائرہ کار میں اس کا جائز مقام دیں۔ ہم نے اردو زبان کی وسعتوں کا سہارا لے کر پورے برصغیر میں آزادی کا نعرہ بلند کیا تھا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد ہماری قومی زبان' وہ مقام حاصل نہ کر سکی جس کی یہ مستحق ہے۔ حالانکہ یہ ایک ہمہ گیر' وسیع اور جامع زبان ہے۔ اور تمام ترجدید تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس زبان میں علم وادب' تاریخ وثقافت' مذہب اور فلسفے کے بیش قیمت ذخائر موجود ہیں۔ قومی زبان میں ذریعہ تعلیم وتدریس سے نونہالان قوم کی ذہنی' فکری اور ارتقائی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور جو علوم وفنون کے حصول کے بعد بہتر طریقہ سے اپنی قوم کی مختلف شعبہ ہائے زندگی میں رہنمائی کر سکتے ہیں۔ مختلف صوبوں کے درمیان ہم آہنگی ورابطہ' اخوت اور یگانگت قائم رکھنے کے لئے قومی زبان کو ہر سطح پر اپنانے اور اسے دفاتر میں رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ بدیسی زبان ملک کو دو طبقوں میں تقسیم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ ایک مغربی تہذیب کا پروردہ اور دوسرا مشرقی تہذیب کا دلدادہ پاکستان کی بقاء وسالمیت اس کی خوشحالی اور استحکام کا راز ہماری قومی یک جہتی اور قومی زبان کی ترویج وترقی میں مضمر ہے جس کی نشاندھی بانئ پاکستان نے بارہا کی ہے۔ موجودہ حکومت نے صدر مملکت عالیجناب فضیلت مآب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی قیادت میں دیگر شعبوں کے علاوہ قومی زبان کی ترقی وفروغ کے لئے جو گرانقدر اور جامع اقدامات کئے ہیں۔ وہ قابل تحسین ہیں۔ خود صدر مملکت نے متعدد مواقع پر غیر ملکی دوروں میں اور دوست ممالک میں اپنے زریں خیالات کا اظہار اپنی قومی زبان اردو میں فرماکر جس ملی یک جہتی اور اخوت کا ثبوت دیا ہے وہ پوری پاکستانی قوم کے لئے قابل تقلید ہے اور یہ ہمارے تشخص کا مظہر بھی ہوگی۔

مہمانِ محترم! ۶ر جولائی ۱۹۸۴ء کو عالیجناب فضیلت مآب جنرل ضیاء الحق صاحب صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان اساتذۂ کرام کی دعوت پر اس قومی ادارہ کے معائنے کے لئے تشریف لائے تھے اور اساتذہ کرام کو خطاب فرماتے ہوئے صاحب موصوف نے اردو سائنس کالج کے اساتذہ وطلباء کے لئے بہت سی فراخدلانہ مراعات کا اعلان فرمایا تھا۔ صدر پاکستان نے یہ بھی حکم صادر فرمایا تھا کہ اردو سائنس کالج کے کیمپس کی تعلیمی ورہائشی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے پنج سالہ منصوبہ مرتب کیا جائے۔ وزارت تعلیم، حکومت پاکستان کالج کی تعلیمی ورہائشی عمارتوں کی تعمیرات کے لئے ہر طرح اعانت/امداد کرے گی۔

صدر مکرم کی ہدایت کے مطابق کیمپس کی تعلیمی ورہائشی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے بورڈ آف گورنرز کی منظوری سے ایک پنج سالہ منصوبہ وزارت تعلیم کو ارسال کیا گیا ہے۔ جو وزارت تعلیم کی منظوری کے آخری مراحل میں ہے۔

صدر محترم نے اس قومی ادارہ کے اساتذہ کرام، طلبہ ومحبان اردو اور اہل پاکستان کو ایک نہایت اہم مژدہ سنایا تھا وہ اردو یونیورسٹی کے قیام کے متعلق تھا۔ صدر پاکستان نے واضح طور پر اعلان فرمایا تھا کہ اس پوسٹ گریجویٹ کالج کے معیار تدریس کو بلند کیا جائے اور یہ کام سال ۶ ماہ میں ہو سکتا ہے۔ یہ اگر کر لیا گیا تو اس کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے گا۔ اور وہ خود اس کا افتتاح کریں گے۔ اردو یونیورسٹی کے قیام کا نظریہ محض ایک خواہش نہیں بلکہ ملی ضرورت بھی ہے۔ ملی

ضرورت اس وجہ سے کہ وطن عزیز کی ملت اسلامیہ کو مربوط و مضبوط رکھنے کے دو ہی ذریعے ہیں ۔ ایک اسلام اور دوسرا قومی زبان "اردو" اسلام ایک نظریۂ حیات بن کر ملت کو جوڑتا ہے ۔ اور اردو رابطہ کا ذریعہ بن کر درۂ خیبر سے ساحل مکران تک برادران وطن کو منسلک رکھتی ہے ۔ مشرقی پاکستان بھی پچیس سال تک ان ہی دونوں ذرائع کی مدد سے مربوط رہا۔ اگر یہ دونوں ذریعے کمزور نہ کردیئے گئے ہوتے تو مشرقی خطہ ہم سے کبھی جدا نہ ہوتا ۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری موجودہ حکومت ان دونوں عوامل کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہے ۔ اور اس نے اسلام کے نام پر قائم ہونے والی اس سب سے بڑی مملکت کے استحاد و استحکام کی خاطر بے شمار عملی اقدامات کئے ہیں ۔ ملت اسلامیہ کو متحد کرنے کے لئے اسلام آباد میں اسلامی یونیورسٹی کا قیام مستحسن شگون ہے ۔ وطن عزیز میں باہمی رابطہ ، یکجہتی اور یگانگت کے فروغ کے لئے قومی زبان اردو کی ہر شعبہ جات اور ہر سطح پر ترویج و ترقی کے لئے بھرپور کوششیں کی جارہی ہیں ۔ ایسے وقت میں اردو یونیورسٹی کا قیام بلاشبہ ایک ایسا مثبت قدم ہوگا جس کے نتیجے میں قومی وحدت فکرا جاگر ہوگی۔

اردو سائنس کالج اور اردو کالج میں رواں تعلیمی سال میں سات ہزار سے زائد طلباء و طالبات زیر تعلیم ہیں مستقبل قریب میں ان دونوں اداروں میں طلبہ کی تعداد دس ہزار سے تجاوز کر جائے گی ۔ یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد اس کی حیثیت مرکزی ہوگی جس میں علاقے ، رنگ اور نسل کی تفریق سے بالاتر ہوکر ہر شخص وطن عزیز کا یکساں طالبعلم ہوگا۔ پاکستان کے دیگر تعلیمی اداروں کے لئے اس قومی درسگاہ کی حیثیت ایک راہبر و راہنما کی بھی ہوگی۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ساتھ جب بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق یادگاری کتب خانہ کی تین منزلہ پرشکوہ عمارت کالج کی مرکزی سہ منزلہ عمارت ، سائنس کالج برائے خواتین ، فنی و تیکنیکی ادارے ، اقامت گاہیں ، کالج ہال ، جامع مسجد ، جمنازیم اسپورٹس کمپلیکس اس عظیم ترکراچی میں ایک جدید اور نادر طرز تعمیر کا نمونہ ہوگا۔ جسے دیکھ کر ہر پاکستانی کو نہ صرف اپنے قومی تشخص کا احساس ہوگا بلکہ جذبۂ مسرت کے ساتھ وہ اپنا سر فخر سے بلند کرسکے گا۔

مہمان معظم ! بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم و مغفور نے انجمن ترقی اردو کی عمارت میں قومی زبان کے فروغ کی خاطر ۱۹۴۹ء میں اردو کالج کی ابتدا کی تھی ۔ صاحب موصوف کا مقصد تھا کہ پاکستان میں ایک ایسا قومی ادارہ قائم کیا جائے جس میں پاکستان کے ہر خطہ اور ہر علاقے کے طلبہ اپنی قومی زبان اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں ۔ تاکہ اس ادارہ میں درس و تدریس کے علاوہ طلبہ میں قومی شعور ، بلند کرداری ، اخوت ، یگانگت اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوسکے ۔ بابائے اردو نئی مملکت میں ایک ایسی یونیورسٹی کے طالب تھے ۔ جو صحیح معنوں میں دہلی کالج ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ عثمانیہ کا جانشین ہو۔ جس میں مختلف علوم و فنون سائنس و فنیات ، تجارت و قانون اور طب و حکمت کے مختلف ادارے قائم ہوں ۔ اور جو نئے دور کے تقاضوں کی تکمیل کرسکے۔ لیکن افسوس ہے کہ بابائے اردو کی زندگی میں ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا ۔

صدر پاکستان کے احکامات کے تحت اردو سائنس کالج کے تمام اساتذہ کرام تعلیمی و تدریسی و تعمیراتی کاموں میں نئے

ولولہ و جذبے سے کام کر رہے ہیں۔ چند ماہ ہوئے جامعہ کراچی نے ایم۔ ایس سی فائنل ریاضی کے امتحان کے نتائج کا اعلان کیا تھا۔ اُردو سائنس کالج سے ۱۲ طلبا امتحان میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں سے ۱۱ درجہ اول میں اور ایک درجہ دوم میں کامیاب ہوا۔ نتیجہ صد فیصد رہا۔ موجودہ تعلیمی سال میں اردو سائنس کالج کے طلبا ایم ایس سی ریاضی کے علاوہ ایم ایس سی حیوانیات اور طبعیات کے فائینل کے سالانہ امتحان میں شریک ہو رہے ہیں۔ امید کامل ہے کہ نتائج بہت عمدہ ہوں گے۔ کئی سال بی۔ ایس سی کے سالانہ امتحان میں اس کالج کے طلباء نے پوزیشنیں حاصل کی ہیں۔ اردو سائنس کالج کے اساتذہ کرام نے معیار تدریس بلند کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

مہمان گرامی قدر! آپ کے توسط سے ایک بار پھر عالیجناب عزت مآب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان سے اس قومی ادارہ میں تشریف لانے کی درخواست کرتا ہوں۔ صدر محترم اس قومی ادارے میں ایک بار تشریف لا چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ کالج کی موجودہ عمارت نیز کتب خانہ، اساتذہ کی اعلیٰ کارکردگی اور تدریس کے اعلیٰ معیار کا مشاہدہ کر کے یقیناً خوش ہونگے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس ادارہ کی تمام تر ترقیات صدر پاکستان کی مرہونِ منت ہیں۔ کالج کے جمیع اساتذہ کرام و طلبہ صاحب موصوف کے احسان مند ہیں۔

اردو سائنس کالج میں پرسکون تعلیمی ماحول اور قومی زبان اردو کی مقبولیت کی وجہ سے ہر سال تقریباً دو تین سو طلباء کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ کالج کی موجودہ عمارت میں توسیع کے باوجود اب بھی یہ عمارت طلبہ کی تدریسی ضروریات کے لئے ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ طلبہ کی تعداد میں روزافزوں اضافہ کی وجہ سے آئندہ سالوں میں تعلیمی، تدریسی و رہائشی مقاصد کے لئے کئی عمارتیں درکار ہونگی۔ مستقبل قریب میں اردو یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہونے کے بعد موجودہ کیمپس میں توسیع کی اشد ضرورت ہوگی۔ عالیجناب محمد علی خان صاحب وفاقی وزیر تعلیم اور کالج کے بورڈ آف گورنرز کی توجہ عمارت میں توسیع کے مسئلہ کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔ اردو سائنس کالج سے ملحق بلاک ۶ میں ایس ٹی۔ ۳۰، ۳۱، ۳۴ کے رفاہی پلاٹ خالی پڑے ہوئے ہیں اور ادارہ ترقیات کراچی نے یہ پلاٹ تعلیمی مقاصد کے لئے مختص کئے ہیں۔ اس قومی ادارہ کے کیمپس کی توسیع کے لئے اگر یہ پلاٹ مل جائیں تو مناسب ہوگا۔ وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے تحریری طور پر مطلع کیا ہے کہ یہ ملحقہ زمین جو تعلیمی مقاصد کے لئے مختص ہے وہ رعایتی قیمت پر کالج کی توسیع کے لئے حاصل کی جائے۔ مذکورہ زمین کے حصول کے لئے میں نے آپ کی خدمت میں ایک مراسلہ ۲؍ دسمبر ۱۹۸۶ء کو ارسال کیا تھا۔ آپ نے از راہ کرم اس درخواست کو محکمہ ہاؤسنگ ٹاؤن پلاننگ لوکل گورنمنٹ و دیہی ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ حکومت سندھ کو ضروری کارروائی کے لئے ارسال فرما دیا تھا۔

مذکورہ بالا محکمہ نے اپنی سفارشات کے ساتھ اس مراسلہ کو ادارۂ ترقیات کراچی کو بھیجدیا ہے۔ جناب ڈائریکٹر جنرل صاحب ادارہ ترقیات کراچی نے قومی زبان کے فروغ اور کالج کے اعلیٰ تعلیمی مقاصد کے لئے ہر طرح

اعانت و امداد کا وعدہ فرمایا ہے۔ صاحب موصوف نے مزید فرمایا ہے کہ کالج کیمپس کی تعلیمی ضروریات کے لئے وہ ورکس سوسائٹی سے رابطہ قائم کریں گے۔

مہمانِ محترم! کالج سے یہ ملحق زمین جو تعلیمی مقاصد کے لئے مختص ہے اور عرصہ سے خالی پڑی ہوئی ہے۔ اردو سائنس کالج کی توسیع اور مستقبل قریب میں اردو یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد تعلیمی ضروریات کے لئے نہایت اہم ہے کیونکہ آئندہ کالج سے ملحق اور اس قدر قریب جگہ پر زمین نہیں مل سکے گی۔ آپ کی ذاتی توجہ سے یہ زمین کالج کو آسانی سے مل سکتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی خصوصی توجہ کا طالب ہوں۔ ورکس سوسائٹی کو دیگر اسکیموں میں رفاہی پلاٹ مختص کئے جا سکتے ہیں۔ وزارت تعلیم حکومت پاکستان قومی زبان اردو کے فروغ اور سائنس کی ترقی کے لئے اردو سائنس کالج کی پہلے ہی سے ہر طرح اعانت کر رہی ہے۔ انشاءاللہ دو تین سال کے اندر ان پلاٹوں پر مختلف شعبوں کی عمارتیں تعمیر کی جائیں گی۔ اردو سائنس کالج کی توسیع اگر منصوبہ کے مطابق جاری رہی تو آئندہ پانچ سال میں اس پوسٹ گریجویٹ کالج میں چھ، سات ہزار سے زیادہ طلباء و طالبات کے داخلوں کی گنجائش ہوگی۔ اور کراچی کی بڑھتی ہوئی تعلیمی ضروریات کو یہ قومی ادارہ خاصی حد تک پوری کر سکے گا اردو سائنس کالج کی توسیع اور مستقبل قریب میں اردو یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرنے کے لئے بعد آپ کا یہ گراں قدر عطیہ نہ صرف اردو سائنس کالج کے اساتذۂ کرام اور طلبہ یاد رکھیں گے بلکہ قومی زبان اردو کے فروغ و ترقی کے لئے آپ کی یہ اعانت اہالیانِ کراچی کے لئے ناقابلِ فراموش ہوگی۔ امید ہے کہ آپ اِس قومی ادارہ کی سرپرستی فرمائیں گے۔

آخر میں ایک بار پھر اساتذہ کرام اردو سائنس کالج کی جانب سے آپ کی کرم فرمائی اور اس ادارہ میں تشریف آوری کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہم اور جمیع اساتذۂ کرام اللہ رب العزت کی بارگاہ میں آپ کی درازیٔ عمر کے لئے دعاگو ہیں۔ خداوند کریم آپ کو اس صوبہ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقع عطا فرمائے۔
آمین

پاکستان پائندہ باد

سپاس گزار
پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن
پرنسپل و سیکرٹری بورڈ آف گورنرز
وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج
کراچی



گورنر سندھ کے دورہ کالج کے موقع پر مہمانانِ گرامی



گورنر سندھ کالج کا معائنہ فرما رہے ہیں



گورنر عباسی کا خطاب

وقت آگیا ہے کہ تمام ذہنی رکاوٹوں اور خدشات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے خلوص دل سے اپنا لیا جائے میرے خیال سے اردو زبان میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری ہے کہ وہ سائنس اور دیگر علمی شعبوں میں ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہے۔ آج اردو میں انگریزی زبان کے بہت سے الفاظ رائج ہیں کسی زبان کے زندہ رہنے کی علامت یہ ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرتی ہو اور اردو میں اتنی وسعت ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرتی ہے میں اردو زبان کو بطور ذریعہ تعلیم رائج کرنے کے بارے میں اس اعتراض کو مسترد کرتا ہوں کہ جدید تحقیقات کے نتائج اور اعلیٰ تعلیم کے مواقع انگریزی زبان میں ہیں اس لیئے ہمارے تعلیمی اداروں میں اردو رائج کرنے سے مشکلات پیدا ہوں گی۔

ہمیں دراصل قیام پاکستان سے پہلے کے حالات کا جائزہ لینا چاہیئے۔ اس زمانے میں گنے چنے چند ادارے انگریزی ذریعہ تعلیم کے تحت چل رہے تھے۔ اور بیشتر درسگاہیں اردو ذریعہ تعلیم کی تھیں۔ اسکے باوجود ہمارے رہنماؤں نے بیرونی ممالک کی جامعات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ڈگریاں لیں اور قوم کی خدمت کی۔ ۳۴ سال بعد وقت آگیا ہے کہ ہم اردو رائج کریں انہوں نے کہا کہ کسی

قوم کو پہچاننے کے لئے لباس، خوراک، طرزِ زندگی، زبان و ثقافت کو بہت اہمیت حاصل ہے تاریخ سے ظاہر ہے کہ ایک قوم دوسری قوم پر مسلط ہوتی ہے وہ اپنی زبان و ثقافت بھی مسلط کرتی ہے۔ انگریز آئے تو ان کی کاروائی بھی مختلف نہ تھی اس وقت نظریہ تھا کہ ذاتی ترقی اور تحفظ کے لئے حکومت کی نوکری کی جائے اور لوگ بابو بن جائیں۔

ہم آکسفورڈ اور کیمبرج گئے میں بھی ان ہی لوگوں میں شامل تھا۔ ۶ ماہ تک نوکری کی لیکن آزادی مل گئی آپ کا کالج اس ضمن میں قابلِ ستائش ہے کہ اس نے قومی زبان کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ کے کالج کو یونیورسٹی ضرور بننا چاہیئے لیکن اس کو یونیورسٹی کا درجہ دیئے جانے میں مالی مشکلات کو زیادہ دخل ہے۔ میں عمارت کی توسیع کے لئے ملحقہ اراضی دیئے جانے کے بارے میں کے۔ڈی۔ اے کے چیئرمین اور کمشنر کراچی اور دیگر متعلقہ افراد کو ہدایت دیتا ہوں کہ ان پلاٹوں کا جائزہ لینے کے بعد اردو کالج کو دے دیئے جائیں۔ آخر میں میں امید کرتا ہوں کہ اردو کالج کے اساتذہ مستقل مزاجی کے ساتھ طلباء و طالبات کو علم کے زیور سے آراستہ کرتے رہیں گے۔

گورنر سندھ
لیفٹیننٹ جنرل ایس۔ایم۔عباسی

پرنسپل صاحب گورنر صاحب کو
بیسویں قومی سائنس کانفرنس
کے خطبات صدارت پیش
کر رہے ہیں



شیخ الجامعہ کے استقبالیہ کی چند تصاویر



شیخ الجامعہ ڈاکٹر سید معصوم علی ترمذی اساتذہ کے استقبالیہ میں تقریر فرما رہے ہیں



استقبالیہ کے شرکاء



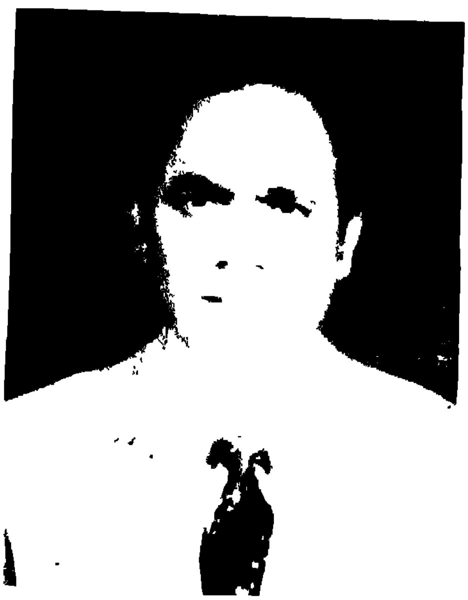
شیخ الجامعہ کراچی اساتذہ کرام کے ہمراہ



شعبۂ طبیعات کے اساتذہ و طلباء (۱۹۶۸ء)



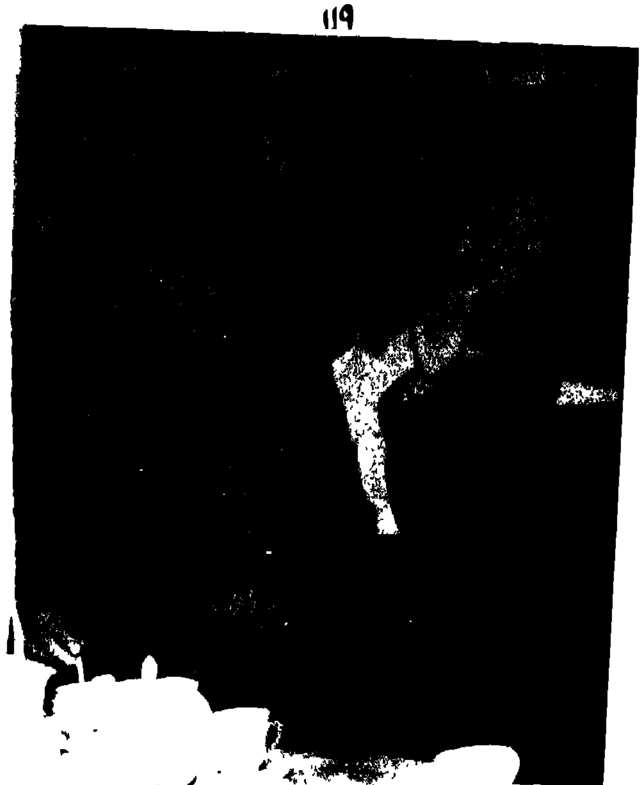
← نگرانِ کتب خانہ
شاہد حسین عثمانی مددگار پروفیسر



← نگرانِ امورِ طلبا
اشفاق احمد ہاشمی مددگار پروفیسر



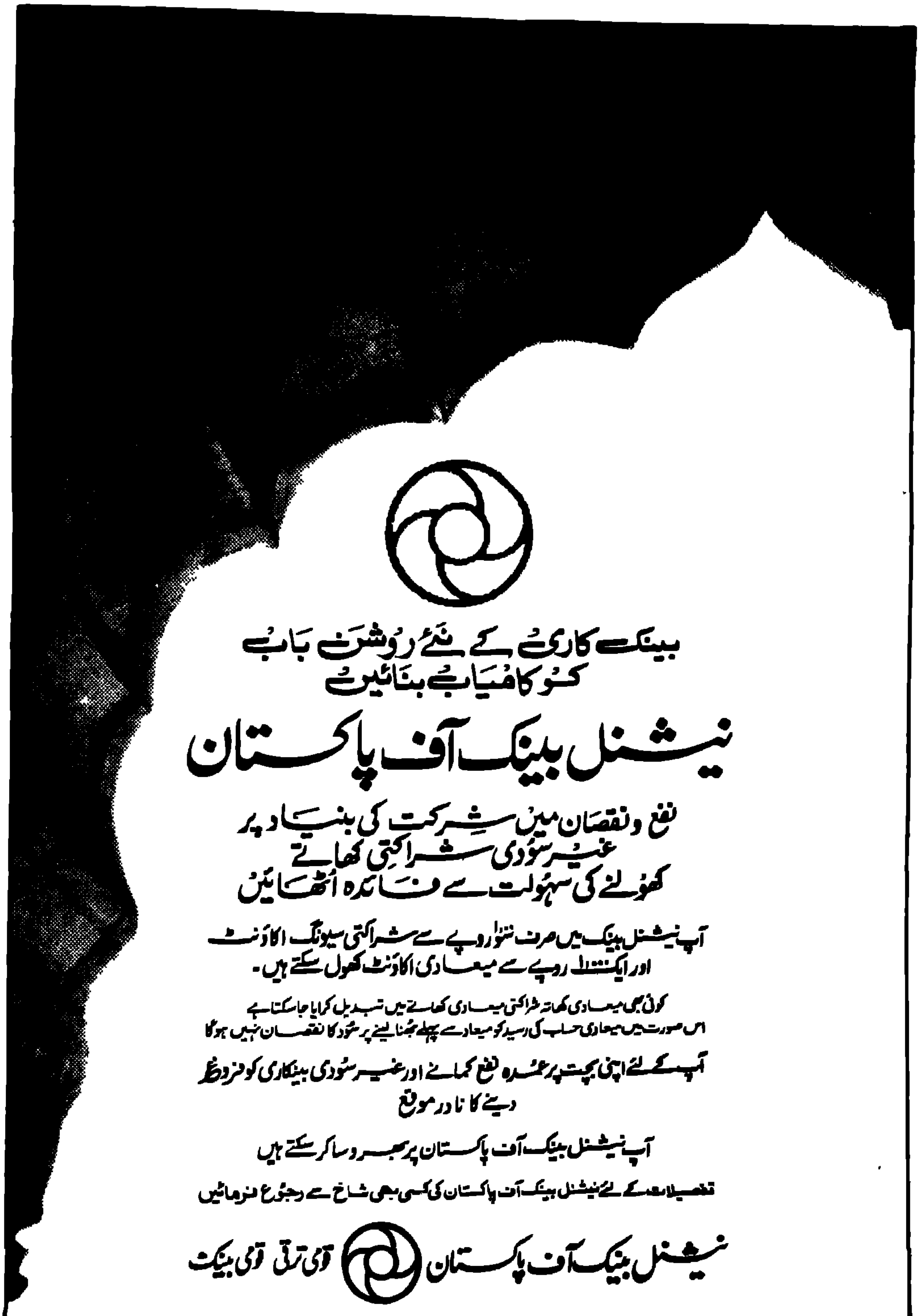
← نگرانِ تادیب کمیٹی
اعجاز احمد مددگار پروفیسر



سابق پرنسپل کرنل عطاء الرحیم صاحب جوہری توانائی کے سربراہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے محو گفتگو ہیں۔



شعبہ حیوانیات کے طلباء سندھ یونیورسٹی میں



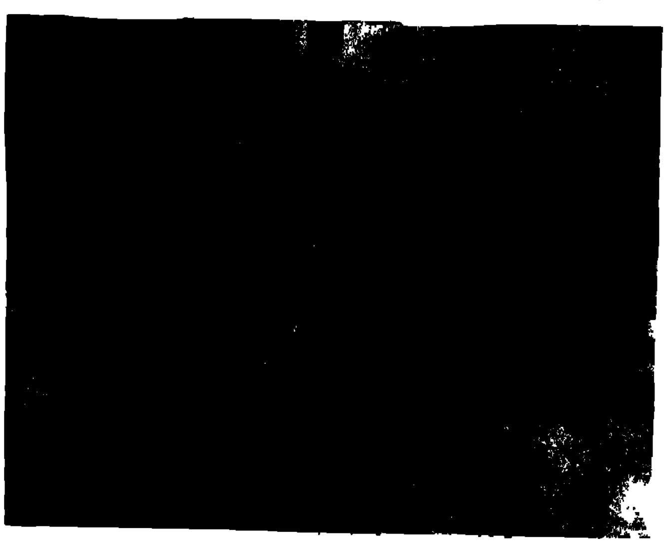
United PID—I—4/81

انٹرویوز

اردو سائنس کالج کے سلسلے میں مختلف اوقات میں اردو، سائنس، اور تعلیم کے ماہرین اور نامور حضرات سے گفتگو کی گئی جو پیشِ خدمت ہے۔ اردو کالج کے سابق پرنسپل میجر آفتاب حسن، کرنل عطاء الرحیم اور موجودہ پرنسپل پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن صاحب سے مہر افشاں عثمانی، وقار احمد زبیری، عقیل احمد اور ناہید ناز نے گفتگو کی نیز ملک کے عظیم ماہرِ تعلیم اور مقتدرہ کے صدر نشین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب سے حسن وقار گل نے گفتگو کی واضح رہے کہ یہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا آخری انٹرویو ہے۔



محترمہ مہر افشاں عثمانی میجر آفتاب حسن صاحب کا انٹرویو لے رہی ہیں



جناب حسن وقار گل ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سے انٹرویو لے رہے ہیں

انٹرویو

کرنلؔ عطاء الرحیم

کرنل عطا الرحیم ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک اردو کالج کے پرنسپل رہے۔ اس عرصے میں اردو کالج کے لئے کسی مناسب عمارت کا خاکہ تیار کرایا گیا۔ اور پھر کوشش کر کے شاہراہ جامعہ پر زمین حاصل کرلی گئی، نقشے تیار کرلئے گئے۔ پھر ۱۲ اپریل ۱۹۶۴ء کو اسوقت کے صدر جنرل محمد ایوب خان صاحب نے عمارت کا سنگ بنیاد رکھا اور عمارت کی تعمیر شروع ہوگئی۔ اسوقت بزم سائنس نے ایک رسالہ "سائنس" شائع کیا گیا۔ اسکے لئے کرنل صاحب کا ایک انٹرویو لیا گیا۔ اسکے اقتباسات قندِ مکرر کے طور پر پیش کئے جارہے ہیں۔

پہلا سوال کیا گیا کہ ....؟

شاہراہ جامعہ پر اردو کالج کی تعمیر کس مرحلے میں ہے۔ اور وہاں تدریس شروع ہونے کا کب سے امکان ہے۔ ؟

کرنل صاحب شاید سوچنے لگے کہ یہ بات کہاں سے شروع کریں انہوں نے کہنا شروع کیا پچیس ایکڑ زمین ہم کو مل چکی ہے۔ کام شروع ہوچکا ہے اس وقت صورتحال یہ ہے کہ اسکا ایک حصّہ پوری طرح تعمیر ہوچکا ہے دوسرے حصّے میں دیواریں کھڑی ہوچکی ہیں۔ چھت کی پٹائی کا کام ہورہا ہے اگست کے آخر تک تعمیر ہوچکنے والے پورے حصّے پر چھت پڑنے کا کام مکمل ہوجائے گا۔ یہ مرحلۂ اوّل بھی اردو کالج کی موجودہ عمارت سے بدرجہا بہتر ہوگا۔ کرنل صاحب بولتے بولتے یوں رُکے جیسے دم لینا چاہتے ہوں۔ پھر انہوں نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا "میں آپ کے توسط سے یہ سوال پوری قوم سے کرنا چاہتا ہوں کہ اردو کالج کی تکمیل کب ہوگی کب وہ ہمیں اتنا سرمایہ فراہم کرے گی"؟

معیار تعلیم کے بارے میں کرنل صاحب نے بڑے

ملنسر یہ لہجے میں کہا، یعنی آج کل کراچی میں غالباً
ہر شخص کی یہ خواہش ہے کہ وہ بھی ایک سائنس یا
ٹیکنیکی کالج بنائے۔ نہ وہ لوگ اپنے وسائل پر غور کرتے
ہیں نہ ہی وہ ذرائع کے بارے میں سوچنے کی زحمت
کرتے ہیں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ کہیں ایک کوٹھی کرائے پر
لی اس کے غسل خانے میں پرنسپل کا دفتر، کمرۂ
نشست میں ایک تجربہ خانہ، کمرۂ طعام میں
دوسرا تجربہ خانہ اور کمرۂ خواب میں نظری
کی تدریس کا انتظام کر دیا گیا چلئے کالج بن گیا۔ اسی
ذہنیت کو مریضانہ اور طرز فکر کو خام ہی کہا
جائے گا۔ سائنس کالج کے لئے جہاں بے شمار
ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں اسکے لئے
ایک عمارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی عمارت
جہاں سے علم کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔ اسلامیہ
کالج کی عمارت دور سے اپنے کالج ہونے کا اعلان کرتی
ہے۔ نیشنل کالج کی خوبصورت عمارت بھی اسی کے
شایان شان ہے۔ اسوقت ہمارے پاس جو
عمارت ہے اس کو دیکھ کر ہم قوم کی غفلت
پر آنسو بہانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔
سائنس کی تعلیم کو معیاری بنانے کے لئے ہر شعبہ
میں تمام ضروری سامان فراہم کر دیا گیا ہے۔
اتنا کہ شاید ہی کسی دوسرے کالج میں ہو مگر اس سامان
سے کیا فائدہ جب تک طلبہ اس سے پوری طرح
استفادہ نہ کر سکیں۔ اور اسکے لیے جیسا کہ میں
نے پہلے عرض کیا کہ عمارت انتہائی ضروری چیز
ہے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور وہ سوال بھی پوچھ
لیا جو کبھی کبھی مجھے بھی پریشان کرتا تھا۔ عرض کیا کہ کراچی
میں آمد و رفت کے شدائد کے پیش نظر کیا طلبا
کی تعداد متاثر ہوگی؟ کرنل صاحب کے لبوں پر
ایک بار پھر وہی مسکراہٹ نظر آئی۔ میں فوراً
سمجھ گیا کہ کرنل صاحب ان مسائل پر پہلے ہی
غور کر چکے ہیں۔ انہوں نے ذرائع نقل و حمل کے ایک
ماہر کے انداز میں کہا کہ ۱۹۷۵ء میں سڑکوں پر چلنے
والی موٹروں کی تعداد دوگنی ہو جائے گی اسکے لئے موجودہ
سڑکیں قطعاً ناکافی ہیں چنانچہ سرکلر ریلیں ہی سب
سے اہم ذریعہ ہوں گی۔ کراچی کا مرکزی ریلوے
اسٹیشن اسی علاقے میں بننے والا ہے۔ علاوہ ازیں
مرکزی بس ڈپو بھی اسی گلشن اقبال میں اردو کالج
کی زیر تعمیر عمارت کے قریب ہی بننے والا ہے مزید
یہ کہ گیارہ منزلہ جدید ترین بازار بھی اس علاقے میں
بننے والا ہے۔ یعنی کراچی کی تجارت کا مرکز شاید
یہی علاقہ ہو جائے گا۔ نیز یہ کہ آئندہ شہر کی
توسیع اسی سمت میں ہو رہی ہے۔ ان سب کا نتیجہ یہ
ہونا ہوگا کہ اس علاقے میں آمد و رفت کی جس قدر
آسانی ہوگی پورے شہر میں کہیں نہ ہوگی۔

"چند لمحات ٹھہر کر موصوف نے فرمایا۔۔۔
"گو خواب کی باتیں ہوش میں کرنی مناسب تو
نہیں مگر بہت سے خواب ایسے بھی ہوتے ہیں کہ
اگر انکے لئے کوشش کی جاتی ہے تو وہ حقائق میں
بدل جاتے ہیں۔ اب چونکہ تعبیر کی ایک جھلک نظر
آنے لگی ہے اس لیے امید ہے کہ شاید یہ خواب شرمندۂ
تعبیر ہو ہی جائے۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ شاہراہ

جامعہ پر ٹھیک اس جگہ ہے جہاں سے سرکلر ریلوے گزرتی ہے۔ ایک اردو کالج ہالٹ بنا دیا جائے۔ اسی سلسلے میں کچھ عملی اقدامات کئے جاچکے ہیں۔ اسی طرح آمد و رفت کا مسئلہ انشاء اللہ سنگین نہیں ہوگا۔

عقیل صاحب نے پوچھا کیا کراچی جیسے پھیلتے ہوئے شہر کے لئے ایک جامعہ کافی ہے۔ کرنل صاحب نے بالکل صاف اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا کہ ذرا یہ دیکھیے کہ لندن اور نیویارک میں کیا حال ہے۔ نیویارک کے لوگوں نے ایک کی بجائے چار جامعات قائم کرلیں کہ ایک علاقے کے لوگ اپنی قریب ترین جامعہ سے استفادہ کرلیں۔ ایک شہر کے اندر اگر ایک سے زیادہ جامعات ہوں تو مقابلے کا صحتمند جذبہ ابھرتا ہے۔ اور تعلیم کے معیار کو نکھارتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے میں اسی نتیجے پر پہونچا ہوں کہ کراچی میں بھی صرف ایک جامعہ سے کام نہیں چلے گا۔ اگر ممکن ہو تو ایک جامعہ سائنس ہو، ایک جامعہ فنون، ایک صرف امتحان لینے کی اور جامعہ کراچی کو صرف ایک الحاقی جامعہ کی حیثیت حاصل ہو تو تقسیم کار کی وجہ سے معیار یقیناً بہتر ہو جائے گا۔"

کیا آپ شعبۂ سائنس کے طلباء و طالبات کے لیے کوئی پیغام مرحمت فرمائیں گے۔؟

کرنل صاحب نے غور سے عقیل صاحب کی طرف اور ایک گہری سانس لے کر کہا" میرے پاس سوائے اس پیغام کے کچھ نہیں ہے کہ علامہ اقبال کے اس شعر کو دہرا دوں۔

ع

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے۔
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر ۳۵۳ ———

ہو جس میں مختلف علوم و فنون، سائنسی فنیات، تجارت و قانون اور طب و حکمت کے مختلف ادارے قائم ہوں ——— اردو کالج آج انہی خطوط پر ترقی کی جانب رواں دواں ہے۔ اسوقت اردو کالج میں سائنس و قانون کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔ اردو سائنس کالج میں مختلف مضامین میں پوسٹ گریجویشن کی کلاسیں جاری ہیں۔ کالج کا شعبۂ تصنیف و تالیف اب تک الجبرا، طبیعات، کیمیا، حیاتیات، جغرافیہ اور ارضیات پر کئی کتابیں شائع کر چکا ہے۔ جو درسگاہوں کے نصاب میں شامل ہیں

مختصراً یہ کہ سائنسی علوم اردو میں اس اعلے پیمانے پر داخل ہو چکے ہیں اور جس منظم طریقے سے کوشش کی جارہی ہیں اسکو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مستقبل قریب میں برِ صغیر پاک و ہند کے طالبانِ علم سائنسی علوم کے حصول کیلئے اردو کو اپنانے پر مجبور ہو جائینگے۔

۔ تمت بالخیر ۔

انٹرویو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی انتقال کر گئے!

یہ خبر بجلی بن کر مجھ پر گری۔ سماعت پر یقین نہ آیا۔ صدر دفتر مقتدرہ فون کیا تو نورالدین صاحب نے بڑے شکستہ لہجے میں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب راولپنڈی میں انتقال کر گئے۔ پھر بھی دل نہ مانا تو تمام مصروفیات ترک کر کے مقتدرہ کے صدر دفتر پہنچا عجب ہو کا عالم تھا ہر طرف سناٹا در و دیوار پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ایک کمرے میں نورالدین صاحب فون پر پنڈی سے کسی نئی اطلاع کے منتظر تھے۔ چوکیدار چپراسی وغیرہ گیٹ پر بیٹھے تھے۔ چہروں پر اداسی کا مہیب سایہ جھلک رہا تھا نورالدین صاحب کے کمرے میں حسیب صاحب اور سامنے ڈاکٹر صاحب کا خاص خدمت گار محمد یونس نڈھال بیٹھے تھے۔ مجھے اس اداس ماحول میں کسی سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اچانک محمد یونس خود بول اٹھا ڈاکٹر صاحب اب نہیں آئیں گے اس کے اس کہنے پر میں نے معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ پرسوں پنڈی جانے سے پہلے ہی ڈاکٹر صاحب کی طبیعت ناساز تھی مگر انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ یہ بات تم کو پتہ ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں کسی اور کو نہیں بتانا ورنہ گھر والے پنڈی نہیں جانے دیں گے جبکہ میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ پرسوں لوٹ آؤں گا مگر کسے خبر نہیں زندہ جا رہے مر کر لوٹیں گے۔

میری نظروں کے سامنے ڈاکٹر صاحب کا چہرہ گھوم رہا تھا ابھی چند روز قبل تو ملاقات کی تھی مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ میری ان کی آخری ملاقات ہوگی ۰۰ جنوری کو وقت لے کر گیارہ بجے انٹرویو کے لئے مقتدرہ کے صدر دفتر گیا تھا۔ جہاں نئے افراد کی تقرری پر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محبت اور شفقت سے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر والی کرسی پر بٹھا لیا۔ میرے برابر میں ہلال احمد زبیری اور سامنے میجر آفتاب حسن تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری انور علیگی اور محمود خاور سامنے ہی کھڑے تھے۔

ڈاکٹر صاحب بہت ہی نحیف نظر آ رہے تھے میجر آفتاب حسن صاحب اور میں نے انہیں سہارا دے کر ان کے کمرے تک پہنچایا ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ہاں تو جناب اب پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں جس پر میں نے ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ تو اس وقت ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ کئی روز سے ان کے منہ میں چھالے پڑے ہوئے ہیں جس کے سبب بات کرتے ہوئے بار بار تھوکنا پڑتا ہے۔ اور اگر میں یہ بات پہلے آپ کو بتا تا تو ممکن ہے آپ میرے لحاظ میں اپنا کام پورا کئے بغیر لوٹ جاتے اس طرح آپ کا وقت ضائع ہوتا۔

بظاہر یہ معمولی سی بات ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب وقت اور دوسروں کا کتنا احساس کرتے تھے۔ اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آج وہ ہم سے بچھڑ گئے ہیں لیکن دل نہیں مانتا نظریں ان کی منتظر ہیں ایسے عظیم انسان بار بار اس دنیا میں پیدا نہیں ہوتے ڈاکٹر صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے دل بھی کانپ اٹھتا ہے اور قلم بھی۔ وہ قلم کی حرمت تھے ملک کا وقار تھے قوم کے مدبر تھے آج ڈاکٹر صاحب کا انٹرویو لکھنے بیٹھا ہوں عجب ناقابل بیان کیفیت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہید میں کیا لکھوں آنکھیں پرنم ہیں قلم کو آنسوؤں میں ڈبویا ہے تو حرف کاغذ پر بکھر سے گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کا شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ بھی اردو میں سائنسی مضامین کی نصابی کتب کی اشاعت کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ اس سلسلے میں مقتدرہ ہم سے کس حد تک تعاون کر سکتا ہے؟

ہم اس سلسلے میں آپ سے ہر ممکنہ تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ بلکہ یہ کام تو آپ مقتدرہ کے منصوبہ بندی کے مطابق کر رہے ہیں۔ اور میری رائے اس سلسلے میں یہ ہے کہ آپ اردو میں سائنسی مضامین کی درسی کتب کا ترجمہ کروانے کے بعد اہل لوگوں سے نئی نصابی کتب لکھوائیں جو موجودہ دور کے جدید تقاضوں کے عین مطابق ہوں لیکن ایسے لوگوں کو زحمت نہ دیں جو ہندوستانی کتب کی نقل کر کے مصنف بن بیٹھے ہیں۔ اس سلسلے میں ملک کے تمام ماہرین سے رجوع کریں لیکن کتاب کی اشاعت میں اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ اس کی طباعت نشانات، تصاویر اور دیگر سائنسی اشکال طالب علموں کی پریشانی کا باعث نہ بن جائے کیونکہ مصنف تو کتاب لکھ کر اس کا مسودہ آپ کے حوالے کر دے گا۔ مگر اس کے صحیح خدوخال کو سامنے لانے کی ذمہ داری ناشر پر ہوتی ہے کیونکہ یہ ایک تکنیکی کام ہے۔ اور ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے اراکین نہ صرف اشاعتی تکنیک سے بھی واقف ہوں۔ بلکہ اس کا سابقہ تجربہ بھی رکھتے ہوں۔ ورنہ ایسے اداروں میں جہاں اس قسم کے کام کی ابتدا کی جا رہی ہو اگر نشر و اشاعت کی فنی باریکیوں سے ناواقف افراد شامل ہو جائیں۔ خواہ وہ کتنے ہی مخلص کیوں نہ ہوں قومی سرمائے کا زیاں ہو گا اور اگر اس سلسلے میں مقتدرہ کے تعاون کی ضرورت پیش آئے یا مشوروں کی ضرورت ہو تو ہم آپ کے ادارے سے بھرپور تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ اور آپ اردو میں سائنسی کتب کی اشاعت کر کے ایک اہم قومی خدمت کا کام انجام دیں گے لیکن اس بات کا بھی خیال رہے کہ جس مضمون کی کتاب کسی دوسرے ادارے سے شائع ہو رہی ہو یا ہو چکی ہو آپ بھی اسی مضمون کی کتاب پر زور نہ دیں۔ بلکہ پہلے ملک کے تمام تعلیمی اداروں سے ان کی نصابی ضروریات معلوم کریں پھر تمام اشاعتی اداروں سے ان کے اشاعتی منصوبے کے متعلق معلومات جمع کریں تب کہیں آپ مطلوبہ مقاصد بھرپور طریقے پر حاصل کر سکیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اردو کے مکمل نفاذ کے بعد ہماری ترقی میں رکاوٹیں پیش آئیں گی یا ہمارا بیرونی دنیا سے لسانی رابطہ منقطع ہو جائے گا اس سلسلے میں آپ کوئی وضاحت کرنا پسند کریں گے؟

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں وہ غلط فہمی کا شکار ہیں ہمارا مقصد انگریزی کو یکسر اور مکمل طور پر ختم کرنا نہیں بلکہ اپنے ملک میں انگریزی زبان کی بالادستی ختم کر کے اردو کو فروغ کر دینے تاکہ ہماری قوم جو دو طبقوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ یہ طبقاتی تقسیم ختم ہو سکے، ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو فوقیت انگریزی کو حاصل ہے وہ فوقیت اردو کو دی جائے۔ اور انگریزی زبان کو اختیاری زبان کی حیثیت سے برقرار رکھا جائے۔ جس طرح عربی، فارسی، جرمنی اور فرانسیسی وغیرہ ہیں۔ یعنی جس شخص کو جس زبان سے واقعی دلچسپی ہو وہ اس زبان کو ضرور سیکھے کیونکہ ہمیں بیرونی دنیا سے رابطہ کے لئے کوئی نہ کوئی بیرونی زبان تو سیکھنا ہی پڑے گی۔ لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ انگریزی کی لازمی حیثیت ختم کی جائے۔ اور اس کی جگہ اردو کر دی جائے تاکہ ہمارا قومی تشخص قائم ہو سکے کیونکہ لازمی مضمون کے سبب ہمارے طالب علم کی آدھی صلاحیت تو انگریزی زبان سیکھنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ اور جس کا رجحان ہو شوق ہو وہ ضرور انگریزی سیکھے اگر کسی کو صحیح معنوں میں شوق اور دلچسپی ہو گی تو وہ اختیاری

مضمون کی حیثیت سے بھی انگریزی زبان سیکھ سکتا ہے۔ اور جلدی سیکھ سکتا ہے ساری بات شوق اور جستجو کی ہے۔ جب تک تمام مضامین کی کتب اردو میں نہ لکھ لی جائیں کسی بھی غیر ممالک کی زبان کا سیکھنا ضروری امر ہے۔

اور میرا خیال یہ ہے کہ بیرونی دنیا کی تخلیق سے رابطہ رکھنے کے لئے وہاں کی زبانیں سیکھنے پر طلبہ کی توجہ دلائی جائے۔

ڈاکٹر صاحب سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں اردو کے نفاذ کے سلسلے میں کس قسم کی مشکلات درپیش ہیں اور کیا اس سلسلے میں مزید وقت درکار ہے؟

جی ہاں کچھ تو وقت لگے گا۔ جب ہم نے یہ کہا کہ اسے سرکاری زبان بناؤ تو ہم سے یہ کہا گیا کہ ٹائپ رائٹر بناؤ ہم نے ٹائپ رائٹر تیار کر لیا۔ اور اب بہت جلد انگریزی اردو ٹیلی پرنٹر بھی آجائے گا۔ جس کا کلیدی تختہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کر چکے ہیں۔ مگر مشکلات دراصل یہ ہیں کہ جو شخص آج انگریزی میں لکھتا ہے۔ اس کی تربیت میں کچھ وقت تو ضرور لگے گا کہ وہ اردو میں لکھے ہمیں پورے ملک کو دیکھنا ہے جو سینکڑوں افراد انگریزی میں کام کر رہے ہیں انہیں ہم برخاست نہیں کر سکتے بعض اساتذہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اردو نہیں پڑھا سکتے انہیں اردو میں پڑھانے کے لئے بھی تربیت کی ضرورت پڑے گی۔ اور اس میں تھوڑا سا وقت تو لگے گا۔ اور تمام سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں اردو کے مکمل نفاذ کے ساتھ ساتھ تمام تعلیمی اداروں میں بھی ذریعہ تعلیم اردو کا نفاذ کر دیا جائے تو بہتر نتائج برآمد ہوں گے کیونکہ معاش حاصل کرنے کے لئے جب تک تمام اداروں میں اردو کا نفاذ نہ کر دیا جائے صرف تعلیمی اداروں میں اردو کے نفاذ سے کام نہیں چلے گا۔

ڈاکٹر صاحب آپ کے خیال میں اردو سائنس کالج کو جامعہ کا درجہ دینا چاہیئے یا نہیں کیونکہ جامعہ کی سطح پر ایم اے اور ایم ایس سی کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ابتداء سے انتہا تک ہر سطح پر ذریعۂ تعلیم اردو ہے؟ اور ملک میں کوئی دوسرا ادارہ ایسا نہیں جہاں اعلیٰ سطح تک ذریعہ تعلیم اردو ہو؟

جی ہاں جامعہ کا درجہ دینا چاہیئے صرف اس لئے نہیں کہ ایم اے اور ایم ایس سی کی تعلیم وہاں دی جاتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ ملک کا واحد ادارہ ہے۔ جس نے تعلیمی سطح پر قومی زبان کے فروغ اور نشو و نما میں ایک تحریک کی حیثیت سے خدمات انجام دی ہیں۔ اس کالج میں لائق اساتذہ موجود ہیں دیگر انتظامی سہولتیں بھی بتدریج حاصل ہو جائیں گی کالج کی نئی عمارت موجود ہے اور جہاں تک میرے علم میں ہے۔ اس کالج میں پاس بڑی زمین بھی موجود ہے جس پر تعمیرات کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کراچی کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر صرف دو جامعات کراچی کے لئے ناکافی ہیں۔ اور مزید دو جامعات کا قیام عمل میں آنا چاہیئے جن میں سے ایک جامعہ اردو ہو مگر صرف یہی نہیں بلکہ ملک کی دوسری تمام جامعات کا ذریعہ تعلیم بھی مکمل طور پر اردو کر دیا جائے تاکہ معیار تعلیم میں فرق نہ پڑے اور ایک ہی زبان یعنی قومی زبان میں ذریعۂ تعلیم کے باعث مقابلے کا جذبہ پیدا ہو اور معیار مزید بہتر ہو سکے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم کام یہ بھی کیا جائے کہ تمام معاشی اداروں میں جہاں لوگ حصول زر کے لئے خدمات انجام دیتے ہیں اردو کا مکمل نفاذ کر دیا جائے۔ تاکہ اردو ذریعہ تعلیم سے علم حاصل کرنے والے افراد کی کھپت ہو سکے ورنہ اس کے بغیر صرف اردو ذریعہ تعلیم سے کام نہیں چلے گا۔

ڈاکٹر صاحب جامعہ اردو کا منصوبہ اردو سائنس کالج کی جانب سے حکومت کو بھیجا جا چکا ہے اور یہ منظوری کے آخری مراحل میں ہے کیونکہ صدر مملکت ۷۸ میں جب کالج تشریف لائے تھے تو وعدہ کر کے گئے تھے کہ آپ معیار بہتر بنائیں تو میں خود یہاں آکر اسے یونیورسٹی کا درجہ دینے میں خوشی محسوس کروں گا۔ اور اب جبکہ کالج کا معیار تعلیم اس درجہ تک بلند ہو چکا ہے یہاں پوسٹ گریجویٹ سطح تک تعلیم دی جا رہی ہے۔ امید ہے صدر مملکت اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گے آپ اس بارے میں اپنی رائے دینا پسند کریں گے؟

بات یہ ہے ڈنمارگل کہ وہی لوگ ترقی کرتے ہیں جو اپنی دھن کے پکے ہوں اور اردو سائنس کالج کے پرنسپل پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب اور دیگر تدریسی و غیر تدریسی عملہ جس تندہی محنت اور جانفشانی سے اپنی خدمات انجام دے رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ صدر مملکت حالات کی مناسبت سے اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس موقع پر اکرام الرحمٰن جیسے محنتی مخلص دیانت دار اور شریف النفس اردو سائنس کالج کے پرنسپل ہیں اور خلوص نیت کے ساتھ کالج کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کے تعاون سے اتنی جلد کالج کی نئی عمارت انہوں نے اپنی نگرانی میں تعمیر بھی کروالی۔ اور کالج میں ہونے والے دیگر ترقیاتی کاموں کی اطلاع مجھ تک پہنچتی رہتی ہے اور یہی نہیں کالج کے بیشتر اساتذہ بلا معاوضہ اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں۔ اور جہاں ایسے دھن کے پکے لوگ ہوں تو وہاں جس کام کی ابتدا بھی ہوگی وہ پایۂ تکمیل کو ضرور پہنچے گا۔ اور اگر تمام اساتذہ نے تہیہ کر لیا ہے کہ اردو سائنس کالج کو اردو یونیورسٹی کا درجہ دلوا کر ہی دم لیں گے تو یقیناً وہ صدق دل سے اس کا تعلیمی معیار بلند کرنے میں بھی ہمہ تن کوشاں ہوں گے جس کے بعد یقیناً صدر محترم بھی اپنا وعدہ پورا کریں گے اور مجھے بھی انتہائی خوشی ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب مقتدرہ قومی زبان کے سلسلے میں مزید آپ نے کیا منصوبہ بندی کی ہے؟

اس سلسلے میں ہم نے ایک جامع پنج سالہ منصوبہ بنایا ہے جو بہت جلد سامنے آسکے گا۔ اس سے قبل ہمارا پہلا منصوبہ چھ سالہ حکومت کو بھیجا جا چکا ہے۔ اور یہ منصوبہ ہم نے ملک اور قوم کی ضروریات کو سامنے رکھ کر حکومت کے کہنے سے تیار کیا ہے اور امید ہے کہ حکومت اس پر فوراً عمل کرے گی

ڈاکٹر صاحب آج کل سننے میں آرہا ہے کہ مقتدرہ کا صدر دفتر کراچی سے کسی دوسرے شہر میں منتقل ہونے کے امکانات ہیں؟

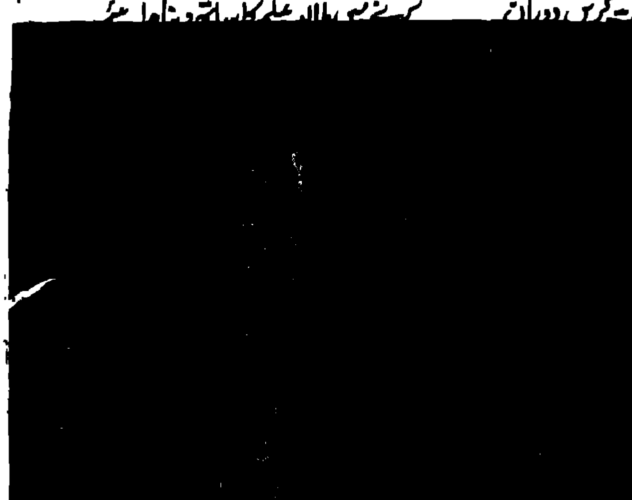
اس قسم کی خبر میں کوئی صداقت تو نہیں لیکن اس قسم کی افواہ پہلے بھی میرے کان تک پہنچی ہے۔ اگر کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ کراچی مقتدرہ کے کسی دوسرے شہر منتقل کر دیا جائے۔ تو شاید یہ ان کا خیال ہوگا کہ کراچی اہل لوگوں کا شہر نہیں یا کراچی میں رہکر مقتدرہ کوئی فعال کام نہیں کر رہی یا اس قسم کے اداروں سے اس شہر کی ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اگر انہیں یہ بات ناگوار گزرتی ہے تو میری ان سے یہی گزارش ہے کہ کراچی میں مقتدرہ اور قائد اعظم اکیڈمی کے علاوہ بھی کئی چیزیں ایسی ہیں جو نہ صرف اس شہر بلکہ پورے ملک و قوم کی ترقی اور عزت و تکریم کا باعث ہیں۔ اگر سب کچھ یہاں سے لیجا سکتے ہو تو کراچی میں سمندر بھی ہے جس پر پورے

ملک کی تجارت کا دار و مدار ہے اسے بھی لے جاؤ۔ بانی پاکستان کے آبائی شہر سے ان کی یادگار بھی لے جاؤ جبکہ میری نظر میں پاکستان کا ہر چھوٹا بڑا شہر اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ کراچی اور ہمارا نصب العین یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ فلاں شہر میں فلاں ادارہ یا فلاں چیز کیوں بنائی گئی ہے بلکہ کسی بھی ایک شہر کی پوری ترقی پورے ملک کی ترقی ہے۔ مجھے اگر یہ ملک عزیز ہے تو اس کا ہر شہر اور ایک ایک انچ زمین اور اس پر بسنے والے بھی اتنے ہی عزیز ہیں خواہ وہ بلوچستان ہو یا سرحد و سندھ ہو یا پنجاب ہم ایک قوم کے فرد ہیں اور ہمیں ان معمولی اختلاف میں پڑ کر یہ نہیں بھول جانا چاہیئے کہ ہم پہلے پاکستانی مسلمان اور بعد میں کچھ اور ہیں اور ہمیں اپنے ملک اپنی قوم اور قومی زبان پر فخر ہونا سمجھئے اور اس کی ترقی کے لئے حتیٰ المقدور کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب آپ ہمارے طالب علموں کے لئے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

میں طالب علموں سے صرف یہ بات کہنا چاہوں گا کہ وہ اپنی تمام تر توجہ اپنی تعلیم پر رکھیں اور معیار تعلیم بڑھانے کے لئے سخت محنت کریں دوران

تعلیم سیاسی جماعتوں کا آلہ کار نہ بنیں۔ ہم اپنے ملک کا ایک حصّہ تو گنوا چکے ہیں۔ اب تو ہمیں ہوش آ جانا چاہیئے اور اپنے ملک و قوم کے وقار کے تحفظ کی خاطر قائداعظم کے بتائے ہوئے اصولوں پر یعنی تنظیم، اتحاد اور یقین محکم پر عمل پیرا ہونا چاہیئے اور ہمیں دوسروں کی نقالی کرنے کے بجائے اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی قومی زبان کا معیار اتنا بلند کرنا چاہیئے کہ دوسری اقوام ہماری نقل کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور ہمیں اپنے قومی تشخص کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے ذاتی مفاد پر ملک و قوم کے مفاد کو ترجیح دینا چاہیئے کیونکہ ہم آج جو کچھ بوئیں گے کل ہمیں ہی کاٹنا پڑے گا۔ ہمارا ملک جتنے نازک دور سے گزر رہا ہے، ہمیں اس کا احساس ہونا چاہیئے اور ہمارے ہر طالب علم کو سچائی اور محنت کے ساتھ صرف علم کی شمع کو فروزاں رکھنے کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دینا چاہیئے ساتھ ہی اساتذہ کو بھی فرائض کی ادائیگی میں غفلت نہیں برتنی چاہیئے ورنہ ان کی یہ کوتاہی ملک و ملت کی تباہی کا سبب بھی بن سکتی ہے اس اپنے پیشے کے تقدس کا لحاظ رکھتے ہوئے معیار تعلیم بلند کرنے میں طالب علم کا ساتھ دینا چاہئے



ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب، میر مجتبیٰ حسن، بلال حسین زبیری، محمد ادریس اور محسن وقار گل کے ہمراہ۔

انٹرویو

میجر آفتاب حسن

گلشنِ اقبال کے بلاک نمبر ، میں "الندیم" نامی عمارت میں مقتدرہ قومی زبان کا صدر دفتر واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں ملک کے ماہرِ تعلیم سائنس اور اردو تحریک کی ایک نامور شخصیت میجر آفتاب حسن بحیثیت قائم مقام صدرِ نشین تشریف رکھتے ہیں۔ اگر میجر صاحب کو پاکستان میں اردو میں سائنسی تعلیم کا روحِ رواں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ آپ کی زندگی کا بڑا حصّہ اردو
کی ترویج و ترقی میں گزرا ——— یوں تو مجھے میجر صاحب سے شرفِ نیاز وقتاً فوقتاً حاصل ہوتا رہا ہے اور اسکو میں اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہوں لیکن اس بار میرے لئے اردو سائنس کالج کے جشن سیمیں نمبر کے لئے انٹرویو لینے کا مرحلہ درپیش تھا کیونکہ مجھے میجر صاحب سے بطور اردو کالج کے سابق پرنسپل کی حیثیت سے انٹرویو لینا تھا۔
میں نے فون پر ان سے دفتر حاضر ہونے کی اجازت طلب کی۔ میجر صاحب نے فوراً بغیر کسی تامّل کے اجازت مرحمت فرمادی۔ دن کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے میں مقتدرہ قومی زبان کے دفتر کے اس کمرے میں موجود تھی کہ جسے کمرۂ مجلس کہا جاتا ہے۔ اور میرے سامنے مشہور ماہرِ تعلیم سائنس ، سائنٹفک سوسائٹی کے معتمد، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی کے سابق ناظم ، اردو سائنس کالج کی مجلس منتظمہ کے رکن اور اردو کالج کے سابق پرنسپل تشریف فرما تھے۔ چند لمحوں کی غیر رسمی گفتگو کے بعد میں نے اپنا مدعا بیان کیا کہ میں کالج کے مجلّے کے لئے آپ کا انٹرویو لینا چاہتی ہوں۔ میجر صاحب کا جواب تھا فرمائیے۔

سوال : میجر صاحب اردو کالج سے آپ کی وابستگی ابتداً
ابتدا ہی سے ہے۔ یہ فرمائیں کہ اردو کی ترویج و ترقی میں آپ کے خیال میں اس کالج کا کیا کردار رہا ہے۔

جواب: جناب اس کالج نے احساسِ کمتری کا علاج کیا۔ جو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان کے بنتے ہی لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو گئی تھی جس وقت پاکستان کی جنگ لڑی جا رہی تھی اسوقت اردو زبان بھی ان مسائل میں شامل تھی جسکے لیے پاکستان طلب کیا جا رہا تھا۔ لیکن جب پاکستان بن گیا زمین مل گئی، مملکت قائم ہو گئی تو وہ کرسیوں کی اپادھاپی اور وہ دوڑ بھاگ ہوئی کہ بے چاری زبان کو کوئی پوچھنے والا ہی نہ رہا۔ اور آزادی کے بعد یورپی قوموں سے رابطہ بڑھ گیا تو اس کے نتیجے میں ایسی کمتری پیدا ہو گئی جس کا جواب آج تک کسی ملک یا قوم میں نہیں ملتا۔ چنانچہ قومی زبان بھی اسی لحاظ سے ناممکن عمل قرار پائی۔ اس ناممکن عمل کو اردو کالج نے ممکن کر دکھایا۔ حالانکہ اس سے پیشتر جامعہ عثمانیہ ہند نے چالیس سال تک اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کر کے اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ تو اردو کالج نے اسے سب سے پہلے ثابت کیا۔ لیکن اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اسکے لیے کوئی مثال پوری نہیں ہوتی۔

سوال: اردو کالج میں جب آپ پرنسپل تھے تو اسوقت کے اور آج کے اردو کالج میں آپ نے کیا نمایاں فرق محسوس کیا۔؟

جواب: تمہارے کالج کی عمارت اچھی ہو گئی ہے۔۔۔۔ ۔۔۔ مضامین بہت بڑھ گئے ہیں۔ آپ اپنے کالج میں ایم۔ ایس سی پڑھانے لگے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کا کالج دوسرے کالجوں کے لیے نمونہ ہے کہ نہیں۔۔۔۔ سب سے پہلے اس بات کا ذکر آئے گا۔۔۔۔ آپ یونیورسٹیوں کے بارے میں سن رہی ہوں گی کہ خواتین یونیورسٹی کا ذکر ہو رہا ہے۔ تو وہاں بھی پڑھنے پڑھانے کا ذکر ہو گا۔ میں نے خواتین یونی ورسٹی کی بات اسلیے کی کہ اردو کالج میں خواتین زیادہ نظر آ رہی ہیں۔ اگر خواتین یونیورسٹی بن گئی جو کہ بننا چاہیئے اور تم بھی یقیناً وہاں جاؤ گی۔ اور وہاں سب سے پہلا سوال یہ ہی ہو گا کہ ذریعۂ تعلیم کیا ہو۔ اور اب وہ دن ہیں کہ انگریزی زبان والے انگریزی کی طرف سے بولیں گے تو آپ نمونہ کون سا پیش کریں گی۔۔ چند لمحے توقف کے بعد فرمایا نمونہ تو یہ ہی اردو کالج ہونا چاہیئے اردو کالج کی اسوقت بھی جو اہمیت ہے وہ یہ کہ اگر کوئی کہے اردو میں کیسے پڑھائیں تو کہہ دو کہ اردو کالج جا کر دیکھ لو کہ کسطرح پڑھاتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں آپ کو سخت محنت کی ضرورت ہے۔ بہت سی باتیں کہنے کی نہیں ہیں اور بہت سی باتیں کہنے کی ہیں مثال کے طور پر بہت سارے استاد آپ کے ایسے ہیں جو اپنی آسانی کیلیے سوچتے ہیں کہ کہاں اردو وردو یاد کریں۔ جس وقت نوکری کے لیے آتے ہیں اسوقت تو کہتے ہیں کہ میں اردو کے لیے جان دے دوں گا، میں تو پیدا ہی اردو کے لیے ہوا ہوں اور اب مجھے نوکری ملنا چاہیئے اور جب نوکری مل جاتی ہے تو جو اردو کے لیے محنت کرنی چاہیئے وہ نہیں کرتے۔

سوال: جب آپ نے اردو کالج کے پرنسپل کا عہدہ سنبھالا تو کن کن نامساعد حالات سے دو چار ہونا پڑا۔ اور ان پر قابو پانے یا بہتر بنانے کے لیے آپ نے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کیا کیا اقدامات کیے ؟

جواب: کن کن نامساعد حالات سے۔۔۔۔۔۔۔۔ تو حالات مساعد کون سے تھے جو نامساعد کی بات کرتی ہو۔ دیکھیے جب میں ۱۹۵۲ء میں آیا تو یہ ایک چھوٹی سی عمارت

تھی ۔ ضروریات کے لحاظ سے اسمیں دو جماعتیں تھیں ۔ ایک تو آرٹس کا حصہ جس میں بہت تھوڑے طالبعلم تھے دوسرا حصہ تجارت کا بس یہی کچھ اردو کالج تھا ۔ اگر کوئی نیس آتی تھی تو کامرس والوں سے آرٹس میں دو سو ڈھائی سو سے زیادہ لڑکے نہیں تھے ۔ تو ظاہر ہے کہ اس سے کام چلنے والی بات نہیں تھی ۔ لیکن اردو کالج کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اسمیں نہایت اعلیٰ درجے کا تدریسی عملہ موجود تھا ۔ یہ اساتذہ بہت تجربہ کار اور اپنے مقصد سے خوب اچھی طرح واقف اور آگاہ اور کام کرنے والے تھے ۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کوئی ادارہ مکمل کہا ہی نہیں جا سکتا کہ جب تک جدید نہ ہو جدید کے معنی یہ ہیں کہ اس میں سائنس بھی ہو اس میں قانون کی تعلیم بھی ہو اور اس میں جس قسم کی کمی ہو وہ پوری کی جائے ۔ چنانچہ جناب والا سب سے پہلے اس میں سائنس کی کلاسیں قائم کی گئیں ۔ اور اگر آپ اس زمانے میں ہوتیں تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ کس محنت سے وہ لوگ کام کرتے تھے ۔ یہ لوگ ابھی موجود ہیں ۔ ان لوگوں نے کس طرح دن رات بیٹھ کر کھانے کی میزوں کو جمع کر کے اس سے تجربے خانے بنائے ۔ تجربہ کی میزیں بنائیں اور اسطرح سے سائنس کی کلاسیں قائم کی گئیں ۔ اور یوں چلا معاملہ ۔ یہ وہی سائنس کی کلاسیں تھیں جو اب آپ کا سائنس کالج بن گیا ۔

سوال : کیا آپ مقتدرہ کے قائم مقام صدر نشین ، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی کے سابق ناظم اور اردو کالج کے سابق پرنسپل کی حیثیتوں میں پورے وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس میں اصطلاحات اتنی ہو گئی ہیں کہ اردو کو بحیثیت سرکاری زبان ہر سطح پر نافذ کیا جا سکتا ہے ۔ ؟

جواب : یہ عجیب سوال ہے آپکو کرنا ہی نہیں چاہیئے تھا ۔ اردو میں سائنسی اصطلاحات ۱۸۲۱ء سے شروع ہو گئی تھیں بہر حال اب جب تم نے پوچھ ہی لیا ہے اور عام لوگوں کی وضاحت کے لیئے اسے ضروری سمجھتی ہو تو سنو ویسے ایک بات بتا دوں کہ جن لوگوں پر اب تک یہ حقیقت واضح نہیں وہ لوگ کم علم یا نا علم لوگ ہیں جن کو کسی قسم کا شوق نہ ہو وہ اس بارے میں جاننا نہیں چاہتے ۔ دراصل بات یہ ہے کہ اصطلاح کا جہاں تک تعلق ہے اردو واحد زبان ہے پورے برِ صغیر میں جسمیں ہر شعبۂ زندگی کی اصطلاحات ضرورت بھر کافی ہیں ۔ ضرورت بھر اس لیئے استعمال کیا ہے کہ ضرورت کی کوئی حد نہیں ہوتی ۔ لیکن جب آپ ایم ۔ ایس سی میں پڑھانا شروع کر دیتی ہیں میں الٹی بات کر رہا ہوں تو اسمیں سے ۹۰ فیصد الفاظ پہلے سے بی ۔ ایس سی میں پڑھا چکی ہوتی ہیں ۔ بی ۔ ایس سی میں پڑھاتی ہیں تو اس سے پہلے تھوڑے بہت بچوں کو معلوم ہوتے ہیں ۔ جیسے جیسے مدارج بڑھتے جاتے ہیں الفاظ کی تعداد بڑھتی جاتی ہے ۔ اتنی نہیں بڑھتی کہ بالکل ہی نئی بات معلوم ہو ہر قسم کی اصطلاح موجود ہے ۔ اور اصطلاح اگر موجود نہ ہو تو قواعد موجود ہیں جنکی مدد سے جس قسم کی اصطلاح بنانا چاہیں بنائی جا سکتی ہے ۔ اجتماعی طور پر اصطلاحات سازی کا کام جاری ہے لیکن اگر فوری ضرورت ہو یا کسی قسم کی دقت پیش آ رہی ہو تو یہ کام اساتذہ کا ہے کہ قانونِ اصطلاحات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اصطلاح بنا لیں ۔ ۔ ۔

سوال :۔ اردو کالج کے اساتذہ کی تالیف و تراجم جو آپ کی نظر سے گزرے ہیں کیا آپ ان کے معیار سے مطمئن ہیں ۔ ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جواب : جی مطمئن تو ہوں ۔ دیکھیں یہ بڑا مشکل سوال کیا ہے آپ نے ۔ مشکل بات یہ ہے کہ ہر کتاب کا معیار کیا ہے

لیکن جتنا کچھ انہوں نے لکھا ہے اسمیں سے جتنا میں نے دیکھا ہے اس سے بہت خوش ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام تصانیف میری نظر سے گزری ہی ہوں لیکن ایک بات کی شکایت ہے کہ اساتذہ کی مجموعی تصانیف بہت کم ہیں دیکھئے تمام دنیا میں۔ کرائے کے لوگ کتابیں نہیں لکھتے جو لکھتے ہیں وہ ڈائجسٹ بنانے ہیں اس قسم کی چیزوں کو

لیکن علمی اور درسی کتاب تو استاد ہی لکھ سکتا ہے۔ استاد اپنے تجربے سے یہ بتا سکتا ہے کہ کیا کرنا چاہئیے کیا نہیں کرنا چاہئیے۔ آپ لوگوں کا تو ایک مشن بن جانا چاہئیے کہ ہر شخص لکھے کوئی اصطلاح بنائے کوئی کتاب لکھے اور میرے خیال میں اس کام میں کوئی رکاوٹ نہیں سوائے کاہلی کہ دیکھئے اگر کوئی مصنف یہ سوچ کر کتاب لکھنے بیٹھے کہ ہم مالدار ہو جائیں گے یا ہو جائیں گی تو یہ خیال بالکل دل سے نکال دیجئیے یہ تو ہلکا ادب لکھنے والوں کا تصور ہوتا ہے۔ لیکن اس پر بھی یہ مال دار نہیں ہوتے علمی کام

میں تو کبھی پیسے اور دولت حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ قومی مفاد مدِ نظر ہونا چاہئیے۔

سوال: اردو کالج سے فارغ التحصیل ہونے والے کچھ ایسے طالب علموں کی نشاندہی کیجئیے جن لوگوں نے قوم و ملک کا نام روشن کیا؟...

جواب:۔ جہاں تک اردو کالج کا تعلق ہے یہ مسلسل اور مضبوط تحریک ہے۔ یہ وہ مثالی کالج رہا ہے جہاں نہ صرف قومی زبان اور قومی رنگ حاوی رہا ہے بلکہ اس کالج سے متعلق ہر فرد کا یہ عزم رہا ہے کہ اس کالج کے لڑکے زندگی کے ہر میدان میں صفِ اول میں جگہ پائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج آپ کو شعبۂ زندگی کے اہم مقامات پر اردو کالج کے شاگرد ضرور ملیں گے۔

ایک بات بتاتا چلوں کہ اردو کالج کا معیار اس حد تک بلند رہا ہے کہ جامعہ کراچی کی سولہ اعلیٰ نشستوں میں سے تیرہ اعلیٰ نشستیں اردو کالج کے طلبہ نے حاصل کی ہیں۔ اسوقت چند شخصیتوں کے نام ذہن میں آتے ہیں مثلاً خواجہ معین الدین مشہور ڈرامہ نگار۔ ابنِ انشا مرحوم۔ عالمی شہرت کے حامل ماہر معاشیات سید شاہد حسین۔ اسکے علاوہ سائنس کے طالبعلموں میں بیشتر پوسٹ گریجویٹ اور اعلیٰ تدریسی عہدوں پر فائز ہیں جیسے ڈاکٹر وقار احمد زبیری جیسے لوگ شامل ہیں جنہوں نے نہ صرف ملک میں بلکہ بیرونِ ملک بھی یہ ثابت کر دیا کہ قومی زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے صفِ اول میں رہتے ہیں۔

سوال: آخر میں آپ سے گزارش کروں گی کہ اردو کالج کے اساتذہ اور طلبا کے نام کوئی پیغام ارشاد فرمائیں ....

جواب: اردو کالج کے اساتذہ اور طلبا کی یہ ذمہ داری ہے کہ کالج کو ایک نمونہ بنائیں تاکہ دوسرے یہ کہہ سکیں کہ اردو میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہر لحاظ سے قول سے بھی اور فعل سے بھی یہ ثابت کریں کہ اردو زبان ہی ہم سب کی ضرورت ہے یہ نہ سمجھئیے ان تمام معاملات میں نظم و ضبط   کا کوئی تعلق نہیں میرے خیال میں بنیادی طور پر جب تک کسی ادارے میں نظم و ضبط قائم نہیں ہوگا نہ وہ پڑھا سکتا ہے نہ وہ لکھا سکتا ہے ہو سکتا ہے وہ ڈگریاں دلاتا چلا جائے لیکن یہ انداز اردو کالج کا نہیں ہونا چاہئیے....

گفتگو

محمد اکرام الرحمٰن

استادِ محترم جناب پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب نے یکم ستمبر ۱۹۲۳ء کو ضلع جونپور کے قصبے رامپور میں زندگی کا پہلا سانس لیا۔ ابتدائی تعلیم الٰہ آباد میں حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے امتیازی نمبروں کے ساتھ بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد علیگڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۴۶ء میں ایم۔اے (جغرافیہ) کا امتحان اوّل بدرجہ اوّل میں پاس کر کے (گولڈ میڈل) سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان تشریف لے آئے اور کراچی کے اسلامیہ کالج کے شعبۂ جغرافیہ میں بحیثیت استاد درس و تدریس کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۰ء میں مددگار پروفیسر کی حیثیت سے اردو کالج میں تقرری ہوئی جہاں سے اعلیٰ تعلیم کیلئے آپ امریکہ تشریف لے گئے اور ۱۹۵۴ء میں وسکانسن یونیورسٹی امریکہ سے ایم۔ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد واپس پاکستان آکر اردو کالج کے اُمورِ تدریس کے نگراں مقرر ہوئے ۱۹۶۲ء میں موصوف کی اعلیٰ کارکردگی کے پیشِ نظر نائب پرنسپل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ ۱۹۶۹ء میں اردو کالج (سائنس، آرٹس، کامرس اور لاء) کے پرنسپل کی ذمہ داری سنبھالی۔ اور جب مولوی عبدالحق کے خواب (اردو کالج سے اردو یونیورسٹی تک) کی تعبیر نظر آنے لگی تھی اُردو ذریعہ تعلیم کو فروغ حاصل ہوا تو کالج کے طلباء و طالبات کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر سائنس سیکشن کو اردو کالج کیلئے حاصل کی گئی بیس ایکڑ زمین پر مختصر سی عمارت بنا کر منتقل کر دیا گیا۔ جبکہ آرٹس سیکشن حسب سابق کالج کی پرانی عمارت ہی میں رہا جہاں تمام سہولیات میسر تھیں لیکن موصوف کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو گیا کیونکہ کالج کے دونوں حصوں کی نگرانی کرنا ایک دقت طلب مسئلہ تھا۔ آپ

لیئے موصوف نے اپنے آپ کو اردو سائنس کالج کیلیئے وقف کر دیا لیکن یہ پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ جو انہوں نے اپنے رفقائے ساتھ ملکر کیں کہ اردو سائنس کالج کی پرشکوہ عمارت اپنی شان و شوکت کے ساتھ شاہراہ جامعہ پر اس بات کی منتظر ہے کہ کب اسے یونیورسٹی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب کی محنت رنگ لائی اور اردو کالج جہاں ابتدأ میں صرف ۵۴ طلباً و طالبات تھے آج تقریباً تین ہزار سے زائد طلبا و طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آپکی دوسری کوشش جو یونیورسٹی بننے کی جانب ایک اور اہم قدم ہے وہ ہے پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر تعلیم کا آغاز یعنی موصوف کی کاوشوں سے اردو سائنس کالج میں ایم۔ ایس سی کی کلاسوں کا اجرأ ممکن ہو سکا۔ جو اس بات کی ضمانت ہے کہ اردو سائنس کالج میں وہ ممکنہ سہولیات موجود ہیں جو کسی بھی یونیورسٹی کی ابتدائی ضروریات کے مطابق ہوں۔ مورخہ ۶ر جولائی ۱۹۷۸ء کو جب صدرِ مملکت جناب جنرل محمد ضیأ الحق صاحب اردو سائنس کالج تشریف لائے تو موصوف نے صدرِ مملکت کے سامنے کالج کی تعمیر کا مکمل منصوبہ پیش کرتے ہوئے درپیش مسائل سے آگاہ کیا جسکے سبب صدرِ مملکت نے خصوصی طور پر کالج کی عمارت کی تعمیر میں نہ صرف دلچسپی لی بلکہ اردو سائنس کالج کے لیئے ایک بورڈ آف گورنرز کی تشکیل کا بھی حکم دیا جسمیں پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب کو بورڈ کا سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ صدرِ مملکت نے اس بات کا وعدہ بھی کیا کہ اگر آپ کی کارکردگی کا معیار بلند رہا تو میں اردو کالج کو اردو یونیورسٹی کا درجہ دینے کا اعلان کر کے فخر محسوس کرونگا۔ اب جبکہ کالج کے قابل اساتذہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں سیکریٹری بورڈ آف گورنرز اور پرنسپل وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج جناب پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب کی زیرِ نگرانی اردو سائنس کالج کے پچیس برس مکمل ہونے پر کالج کا جشنِ سیمیں (سلور جوبلی) منایا جا رہا ہے۔

ہم نے اپنے ہردلعزیز استاد اور پرنسپل جناب اکرام الرحمٰن صاحب سے اردو زبان اور اردو کالج کے بارے میں چند معلوماتی سوال کیئے جنکا جواب انہوں نے ہمیں نہایت محبت و شفقت سے اپنے مخصوص انداز میں کچھ اس طرح عطا کیا۔

جواب ۱۔ پاکستان میں قومی زبان اردو قرار دی گئی ہے لیکن اسکی ترویج و ترقی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ ہماری حکومت اور عوام اسکے نافذ کرنے میں کس حد تک دلچسپی لیتے ہیں۔ پاکستان ایک عرصۂ دراز سے انگریزوں کا محکوم رہا ہے اس سے پہلے یہ مسلمان بہت ترقی یافتہ تھے لیکن انگریزوں نے یہاں آکر اپنے قدم جمانے شروع کر دیئے لہذا پاکستان ایک عرصے تک انگریزوں کا محکوم رہا اور اس عرصے میں بیرونی حاکموں کی یہ کوشش رہی کہ پاکستانی قوم کی سوچ اسطرح مغلوب کر دی جائے کہ انہیں یہ احساس ہی نہ ہو سکے کہ وہ انگریزی زبان کے علاوہ اپنی قومی زبان کو اپنا کر بھی صنعت و حرفت، سائنسی و فنی، نظری و ثقافتی مختلف میدانوں میں ترقی بھی کر سکتے ہیں۔ انگریزوں کی

سوال نمبر ۱۔ اردو زبان میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے میں آپ کوئی دشواری تو محسوس نہیں کرتے ؟

جواب ۱۔ دشواری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ تو ہماری مادری زبان ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ درس و تدریس قومی زبان میں زیادہ بہتر طریقے سے ہو سکتی ہے اور گزشتہ ۲۵ سال سے ہم یہاں پر اردو زبان میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مجھے اردو میں پڑھانے میں لطف آتا ہے اور اچھا لگتا ہے اور سب سے بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ اردو زبان ذریعۂ تعلیم ہونے کی وجہ سے ہم غور و فکر زیادہ کر سکتے ہیں کیونکہ اگر انگریزی ذریعہ تعلیم ہو تو بھی وقت انگریزی سمجھنے میں لگ جاتا ہے۔

سوال نمبر ۲۔ وہ کونسے اقدامات ہیں جنکے نافذ کرنے سے اردو زبان بہت جلد سرکاری زبان بن سکتی ہے ؟

تعلیم کا مقصد صرف کلرک ، بابو اور انکے ماتحت پیدا کرنا تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ڈیڑھ سو سال حکومت کی لیکن کوئی بھی سائنسدان پیدا نہیں ہوا جبکہ اس سے پہلے مسلمان بہت ترقی یافتہ تھے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ لوگ اردو زبان کو زیادہ سے زیادہ اپنانے کی کوشش کریں ۔

اسکے علاوہ پبلک سروس کمیشن کے امتحانوں میں سوالات و جوابات انگریزی کے بجائے اردو زبان میں ہونے چاہئیں ۔ تمام سرکاری و نیم سرکاری خودمختار اداروں میں خط وکتابت اور جملہ امور اردو زبان میں انجام دینا چاہئیں ۔ اور تمام بورڈوں میں بھی بدیسی زبان کی ترویج و ترقی آرڈیننس کے ذریعے ممنوع قرار دی جائے ۔ تمام صنعت و حرفت سے متعلق اشتہارات اور سائن بورڈ وغیرہ قومی زبان اردو میں ہوں ۔ کسی ملک کی قومی زبان اسکی تہذیبی ، علمی ، قومی ، ثقافتی ، روایتی اور نظری امور کی حامل ہوتی ہے ۔ علاوہ ازیں قومی زبان اتحاد اور ملکی سالمیت و بقاء کی ضامن ہوتی ہے ۔ اسوقت تمام ترقی یافتہ قوموں نے ٹیکنالوجی ، سائنس ، صنعت و حرفت اور تمام میدانوں میں جو ترقی حاصل کی ہے وہ قومی زبان کی وجہ سے ہے ۔ قومی زبان کی ترویج و ترقی پاکستان کی ترقی کیلئے بھی ضروری ہے ۔

اردو میں انٹرسائنس تک تعلیم حاصل کرنے والا طالبعلم میڈیکل یا انجینئرنگ کالج میں داخلے کے بعد زبان کے فرق کی وجہ سے کیا پریشانی محسوس کرتا ہے ؟ ۔ اسکے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں ؟

جواب :- ایک تو یہ کہ اردو سائنس کالج وہ واحد کالج ہے کہ جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہے اور جب ہمارے ہاں کے طلباء و طالبات میڈیکل یا انجینئرنگ کالجوں میں جاتے ہیں تو انکے لئے تین سالوں میں ابتدائی زمانے میں زبان کے فرق کی وجہ سے دقت تو ضرور ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ طلباء اس پر عبور حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ انٹرسائنس میں انگریزی کا نصاب وہی ہے جو انگریزی کالج کے طلباء کیلئے ہے ۔ لیکن مشاہدے میں آیا ہے کہ ہمارے ہاں کا طالبعلم اچھے نمبروں سے کامیاب ہو کر میڈیکل یا انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیتا ہے تو وہ انگریزی کی استعداد میں اور کالجوں کے مقابلے میں بہتر ہوتے ہیں ، کم نہیں ہوتے ۔ میرا تو یہ کہنا ہے کہ اگر میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہو جائے جو کہ آج نہیں تو کچھ عرصے بعد آخر کار ہمیں کرنا ہوگا ۔ اسوقت ہمارے ہاں کے طلباء میڈیکل اور انجینئرنگ کالج میں سب سے نمایاں ہونگے

سوال نمبر ۳ : اردو کالج کے ماحول کے متعلق آپکے کیا تاثرات ہیں ۔ آپ مطمئن ہیں یا نہیں ۔ ؟ اردو کالج کی ترقی میں یہ طلباء کیا کردار ادا کر سکتے ہیں ؟

جواب :- آپ اس معاملے کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اردو سائنس کالج اسوقت پاکستان کا سب سے بڑا سائنس کالج ہے ۔ آج سے سات سال پہلے طلباء کی تعداد ۵۰۰ تھی اور اسوقت تقریباً ۳۰۰۰ ہے ۔ ہر سال ۲۰۰ سے ۲۵۰ تک طلباء کا اضافہ ہو رہا ہے ۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ ایسے طالبعلم جو اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں ہم انہیں دوسرے طلباء کے مقابلے میں پہلے ترجیح دیں اور شکر ہے کہ اس سلسلے میں کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں ۔ اردو کالج میں طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں کے پرسکون تعلیمی ماحول موجود ہے میں یہاں کے تعلیمی ماحول سے بہت مطمئن ہوں ۔ کسی بھی کالج کی ترقی میں طلباء کا بڑا حصہ ہوتا ہے ۔ یعنی جب طلباء کالج میں داخلہ لیتے ہیں تو انکا فرض ہے کہ وہ اپنا تمام وقت تعلیم کی طرف توجہ دیں اساتذہ کرام کا احترام کریں اور محنت و مشقت سے تعلیم حاصل

کرنے کے بعد اچھے نمبروں سے کامیابی بلکہ غیر نصابی
سرگرمیوں میں بھی حصہ لیکر اچھی پوزیشن حاصل کریں اسطرح کالج
کی توقیر میں بھی اضافہ ہوگا۔

سوال نمبر ۵۔ اگر اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے
تو اسکی کیا اہمیت ہوگی ؟

جواب :۔ اردو سائنس کالج پاکستان کا وہ واحد تعلیمی ادارہ ہے جہاں
اعلیٰ جماعتوں تک کی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی ہے۔ اس کالج میں
اسوقت ایم۔ایس سی کی سطح تک ذریعۂ تعلیم اردو ہے حقیقت تو یہ
ہے کہ یہ ادارہ ایک تحریک کی حیثیت بلکہ رہنما کی حیثیت رکھتا ہے
اسوقت اس ادارے میں طلباء و طالبات مختلف سطح پر
سائنسی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

کالج میں بی۔ایس سی کی سطح تک تمام اطلاقی اور بنیادی مضامین
نصاب میں شامل ہیں۔ جو پاکستان کے کسی دوسرے کالج میں نہیں
ہیں اس کالج میں سالِ تعلیمی ۷۸ – ۱۹۷۷ میں ایم ایس سی ریاضی
کی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ اور ۷۹ – ۱۹۷۸ میں ایم۔ایس سی
حیوانیات اور طبعیات کا اضافہ کیا گیا یہ ہمارے لئے باعثِ افتخار ہے۔
وفاقی حکومت اردو سائنس کالج سے شریک ہونے والے ایم۔ایس سی
فائنل ریاضی کے پہلے گروپ کا نتیجہ صد فیصد رہا اور گیارہ طلباء اول درجے
میں کامیاب ہوئے اس کالج کے بی۔ایس سی کے نتائج بھی ہمیشہ
شاندار رہے کئی مرتبہ بی۔ایس سی فائنل کے طلباء یونیورسٹی میں
پوزیشن حاصل کرتے رہے ہیں طلباء کی روز افزوں بڑھتی ہوئی تعداد
اور بہتر امتحانی نتائج اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہماری زبان اردو
سب سے بہتر اور کامیاب ذریعۂ تعلیم ہے اگر اس کالج کو یونیورسٹی
کا درجہ دے دیا گیا تو یہ پاکستان کی قومی زبان کی پہلی اردو
یونیورسٹی ہوگی اور برِ صغیر کے مسلمانوں نے جس مقصد کیلئے پاکستان
حاصل کیا تھا اسکا ایک حصہ مکمل ہو جائے گا یعنی پاکستان کی تشکیل کا
مقصد پورا ہو جائیگا۔

سوال نمبر ۶۔ اگر اردو کالج کو یونیورسٹی بنا دیا گیا تو جو لوگ
اردو یونیورسٹی سے ایم ایس سی کرینگے ان کے مقابلے
میں کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کرنے والے طلباء
کو ترجیح دی جائے گی۔ ؟ اس سلسلے میں آپکی کیا رائے ہے
اور اسے کسطرح حل کیا جا سکتا ہے ؟۔

جواب :۔ موجودہ پوزیشن تو یہی ہے لیکن اگر پورے
پاکستان میں قومی زبان اردو کو ہر میدان میں اپنا لیا گیا تو پھر اس
یونیورسٹی کی پوزیشن
ایک تحریک اور رہنما کی سی ہوگی اور اس
کالج کے فارغ التحصیل طلباء دوسرے طلباء کے مقابلے میں بہتر ہونگے۔
جسطرح دوسرے ملکوں نے اپنی قومی زبان کو اپنا رکھا ہے مثلاً سپین
میں ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے اسی طرح جاپان ائیر پورٹ پر
اگر کوئی شخص انگریزی میں سوال کرے تو کوئی اسکا جواب نہیں
دیتا۔ اور اگر پاکستانی تہذیب و تمدن کو آگے بڑھانا ہے تو ذریعہ
تعلیم کو قومی زبان میں بدلنا ہوگا کیونکہ ملک کی سالمیت و بقا کا راز
اسی میں ہے۔

سوال نمبر ۷۔ آپکے خیال میں معاشرے میں طلباء کا کیا کردار ہونا
چاہئے اور اساتذہ کرام اس سلسلے میں طلباء کی کیا مدد
کر سکتے ہیں ؟۔

جواب :۔ طلباء قوم کے معمار ہیں اور کسی ملک کی ترقی ان ہی
نونہالانِ قوم کی جدوجہد سرگرمی پر منحصر ہوتی ہے اور پاکستان کی
ترقی بھی اسکے طلباء پر منحصر ہے اسکے علاوہ پاکستان غیر ممالک کی
طرح صنعت و حرفت کی ترقی میں اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے
کہ جب ہمارے نوجوان یہ عزم کر لیں کہ ہمیں اپنے ملک کی

ترقی کے لئے گامزن ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب طلبأ بحیثیت طالبعلم ایک اچھے مسلمان شہری بنیں تاکہ قوم کو ان پر اعتماد ہو۔ اساتذہ طلبأ کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار ہوتے ہیں انکا ذاتی کردار بھی بہت اہمیت رکھتا ہے اگر طلبأ اپنے گھر کو چھوڑ کر کسی سے متاثر ہو سکتے ہیں تو وہ اساتذہ ہیں۔ اساتذہ کا مشفقانہ رویہ انکی تربیت طلبأ کو کمال تک پہنچا سکتی ہے۔

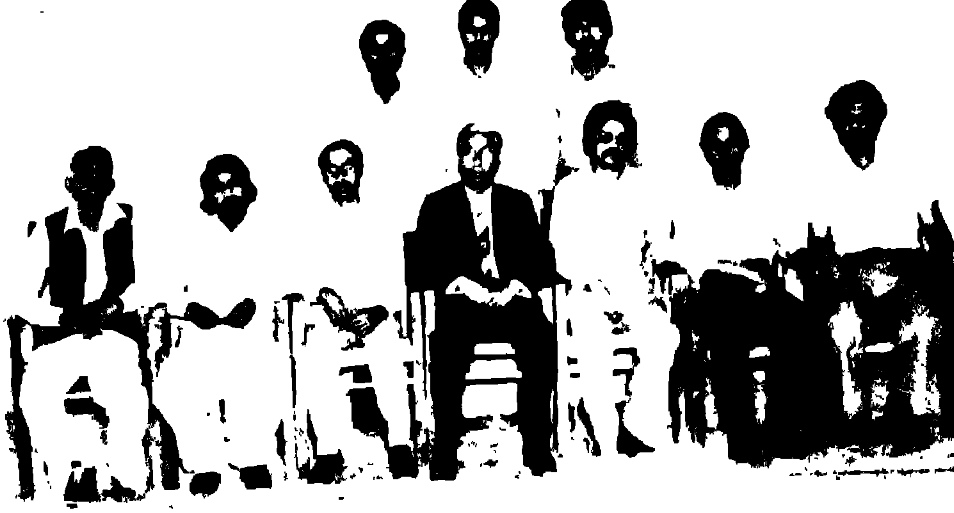
آخر میں پرنسپل صاحب نے اپنے طلبأ و طالبات کیلئے پیغام دیا۔

عزیز طلبأ و طالبات کیلئے میرا پیغام یہ ہے کہ اس ادارے میں اللہ تعالٰی نے تعلیم کے حصول کیلئے بہت زیادہ سہولتیں دی ہیں۔ اب ہمارے طلبأ کا فرض ہے کہ وہ ان سے فائدہ اٹھائیں۔ علم کے زیور سے آراستہ ہوں کیونکہ تعلیم ہی انسان کو زندہ رہنے کے اسلوب و طریقہ سکھاتی ہے۔ اور تعلیم کے حصول سے ہمارا طالب علم وہ سب کچھ کر سکتا ہے جو اسکی خواہش ہے۔

اسکی زندگی سنوارنے میں تعلیم ہی مدد و معاون ثابت ہوگی۔ ہمارے بچوں کو ہمارے کالج کے طلبأ کو چاہئیے کہ نہ صرف قومی زبان کی ترویج و ترقی میں نمایاں کردار ادا کریں بلکہ اپنے دین کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں کیونکہ دنیا و عقبٰی کی فلاح اسی میں ہے۔ اسلام ہمیں اتحاد، اخوت، یگانگت کا سبق دیتا ہے اور یہی دینِ فطرت پاکستان کے استحکام اور سالمیت کا ضامن ہے۔



پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب کالج کے غیر تدریسی عملے کے ہمراہ



پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب عملۂ دفتر کے ہمراہ۔

فاہیدہ ناز / یوسف رضوی
ادیبہ اقبال

کہتی ہے تجھے خلقِ خدا

شاہراہِ جامعہ پر واقع وفاقی حکومت اردو سائنس کالج جو مولوی عبدالحق کی کاوشوں کا نتیجہ اور ان کے خوابوں کی عین تعبیر ہے آج پچیس (۲۵) سال گزرنے پر نئی آن بان اور اپنی نئی تعلیمی روایات کے ساتھ جو مولوی عبدالحق نے قائم کی تھیں پورا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے انتقال کے بعد اپنے ورثا کیلئے جو جائیداد چھوڑی اس میں سے ہمیں اردو زبان اور اردو کالج ورثہ میں ملا اور ظاہر ہے کہ ہر باشعور شخص اپنی میراث کو جو اسے بزرگوں کی طرف سے نصیب ہوئی ہو سنبھال کر اور حفاظت سے رکھتا ہے۔ بلکہ اس جائیداد میں مزید اضافہ کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے لہذا اردو کالج کے تمام طالب علموں جو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے وارثوں میں سے ہیں یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس میراث اردو زبان اور اردو کالج کی حفاظت کریں اور اسکی ترویج و ترقی میں ہمہ تن مصروف و کوشاں رہیں۔ جب بات اردو زبان اور اردو کالج کی چلی تو ہم نے سوچا کیوں نہ اس سلسلے میں مختصر سا جائزہ لیا جائے اور اس موضوع پر دیگر سائنسی تعلیمی اداروں کے پرنسپل صاحبان و مختلف شعبوں کے اساتذہ کرام کے فکر انگیز خیالات معلوم کیے جائیں اسکے علاوہ اپنے اساتذہ کرام تدریسی و غیر تدریسی عملے اور انتظامی عملے کے علاوہ طالبعلم ساتھیوں کے تاثرات قلمبند کریں۔ تاکہ ہمیں اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ ہمارے اساتذہ اور طالب علم ساتھی ہم سے اس سلسلے میں کس حد تک اتفاق کرتے ہیں چنانچہ ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ چند سوالات ترتیب دیئے چونکہ فرداً فرداً ہر استاد سے تاثرات قلمبند کرنا ہمارے لیے مشکل مرحلہ تھا اسلیئے ہم نے یہ بہتر جانا کہ اپنے کالج کے صدور شعبہ جات کو رائے دہی کے لیئے منتخب کیا جائے (جنہیں ہمارے کالج کے پرنسپل جناب پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب کے علاوہ دیگر اساتذہ بھی شامل ہیں)

تو آئیے سب سے پہلے ہم چلتے ہیں اپنے پرنسپل جناب پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب کی طرف اور دیکھتے ہیں کہ اردو زبان اور اردو کالج کے متعلق انکے کیا تاثرات ہیں اسکے ساتھ ساتھ ہم انکا مختصر سا تعارف بھی کراتے چلیں۔

داؤد کالج آف انجینئرنگ ٹیکنالوجی

انجینئر و ڈاکٹر ایم آئی حسین

۳۳ برس گزرنے کے باوجود اردو کو اسکا جائز مقام نہ ملنے کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہم نے زبانی جمع خرچ تو بہت کیا لیکن عملی کام بہت کم کیا ہے جہاں تک انگریزی ذریعہ تعلیم کا تعلق ہے تو لوگوں کے اس طرف رجحان کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انکے خیال میں انگلش میڈیم وجہِ معیار ہے بلکہ اس جانب لوگوں کی رغبت کی اصل وجہ وہ سہولتیں ہیں جو انہیں انگلش میڈیم کے تعلیمی اداروں میں حاصل ہیں۔ اگر ہم یہی سہولتیں اردو میڈیم کے تعلیمی اداروں میں فراہم کر دیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ انکا معیار بلند نہ ہو۔ اور لوگ اس طرف توجہ نہ دیں۔ نفاذ اردو کے سلسلے میں ہمیں ایک بات مدِ نظر رکھنی چاہیئے اور وہ یہ کہ ہم اسے ہوّا نہ بنائیں۔ ہم نے اس سلسلے میں اتنا شور کیا ہے کہ لوگ اردو کے نام ہی سے الرجک ہوگئے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اردو کو اسطرح پیش کریں کہ لوگ خود اسکی طرف راغب ہوں۔ بجائے اسکے کہ ہم اسے کسی کے سر تھوپنے کی کوشش کریں اردو کو قبولِ عام کا درجہ حاصل نہ ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔ اسی سلسلے میں ہم نے کئی غلطیاں بھی کی ہیں۔ ہم نے سائنسی علوم کی اصطلاحات تک بدل دیں کیا انگریزی زبان میں تمام سائنسی اصطلاحات انگریزی زبان کی ہیں۔ ؟ ہم نے ناحق ایک اصطلاح کے اردو میں کئی متبادل الفاظ بنائے جس نے طالبانِ علم کو مزید الجھا دیا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب ہم انگریزی ہندسوں کو اردو میں استعمال کر سکتے ہیں تو سائنس کی انگریزی و غیر انگریزی اصطلاحات کو (جو کہ بین الاقوامی ہیں) کیوں نہیں اپنا سکتے جبکہ اردو زبان میں غیر زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ سائنسی علوم کو اردو میں فروغ دینے کیلئے ہمیں بہت کچھ کرنا ہوگا ہمیں ان مصنفین کی حوصلہ افزائی کرنی پڑے گی کہ جو اردو میں سائنسی علوم کو منتقل کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ہم اگر انکے لیئے کچھ نہیں کر سکتے تو کیا انکی ترجمہ یا تالیف شدہ کتابیں چھپوا بھی نہیں سکتے۔ ؟ اس ضمن میں ایک اور بات قابل غور ہے کہ ہمارے ہاں اسوقت بھی بہت سی غیر ملکی کتب دوبارہ شائع ہوتی ہیں یا REPRINT ہوتی ہے ہم انہیں ری پرنٹ کرنے کے بجائے اگر ترجمہ کر کے شائع کریں تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا ؟۔

شعبہ اردو (جامعہ کراچی)

ڈاکٹر ابواللیث صدّیقی

اردو کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود ہمارے قول و فعل میں تضاد کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے دراصل ہم خود صدقِ دل سے اردو کو انگریزی پر برتری کا درجہ دینا نہیں چاہتے ورنہ کیا وجہ ہے کہ ہم مشنری اسکولوں کی مخالفت تو خوب کرتے ہیں مگر اپنے بچوں کو انہی اسکولوں میں داخل کراتے ہیں۔ گزشتہ برس حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ اسکولوں میں پہلی جماعت سے بتدریج ذریعہ تعلیم اردو ہوگی مگر اسوقت بھی پہلی جماعت میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو کو فی الفور نافذ کیا جائے۔ آخر اس بتدریج کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔

گذشتہ ۳۳ سال کیا بتدریج کوششوں کے لئے کم تھے۔
انڈونیشی زبان ہر اعتبار سے اردو سے کمتر ہے
لیکن جب حکومت انڈونیشیا نے فیصلہ کیا کہ ذریعہ تعلیم انڈونیشی زبان ہو گی تو اسے فی الفور نافذ کر دیا۔ جبکہ اسوقت اس انڈونیشی زبان میں نصابی کتب صفر کے برابر تھیں۔ مگر اساتذہ نے انڈونیشی زبان میں لیکچر دے کر انہیں کو ٹیپ کر لیا۔ اور تعلیمی سیشن کے اختتام پر ٹیپ شدہ لیکچرز کو کتابی صورت دے دی گئی۔ اسطرح نصابی کتب کی عدم دستیابی کا مسئلہ ختم ہو گیا جبکہ ہمارے ہاں تو اب کوئی مسئلہ سرے سے ہے ہی نہیں۔

ہمارے ہاں تقریباً ہر درجے کی نصابی کتابیں اردو میں موجود ہیں ـــــ تاہم انکی اشاعت کی رفتار کم ہونے کا شکوہ کیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں انکی مانگ نہیں ہے۔ جب کتابوں کی مانگ نہیں ہے تو اسے چھاپنے پر آمادہ کون ہو گا ؟ اور جب کوئی چھاپنے پر آمادہ نہیں ہو گا تو لکھے گا کون۔ ؟ ـــــ اور کتابوں کی مانگ اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب میڈیم اردو کر دیا جائے۔

انجینئر اے ایم اخوند

والئس چانسلر (این ای ڈی)

میرا تعلق تعلیم کے صرف ایک شعبے یعنی طب سے ہے۔ لہذا مجھے نہیں معلوم کہ دیگر شعبوں میں اردو میں اور اردو کیلئے کیا ہو رہا ہے۔ جہانتک میرے شعبے یعنی شعبہ طب کا تعلق ہے تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ علمِ طب کے حصول کیلئے ہمیں لازماً غیر اردو زبان کا سہارا لینا پڑیگا واضح رہے کہ میں نے غیر اردو کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انگریزی کا نہیں۔ ایک وقت تھا جب سائنس کے میدان میں جرمن اور فرنچ زبان میں کافی کام ہوا۔ چنانچہ باوجود اسکے کہ میں نے ابتداً ہی سے ساری تعلیم انگریزی میں حاصل کی مجھے طب میں اعلےٰ التعلیم کیلئے جرمن اور فرنچ زبان سیکھنی پڑیں۔ چنانچہ اسوقت اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ سائنسی علوم سے آگاہی حاصل کریں تو لامحالہ ہمیں انگریزی کا سہارا لینا پڑے گا۔ کیونکہ پاکستان میں بالخصوص اردو زبان میں تو سائنسی مواد صفر کے برابر ہے۔ ہاں ! اگر تمام علومِ سائنسی کو اردو میں منتقل کرنے کا کام ابھی سے شروع کر دیں اور کم از کم ۱۵ ۔ ۲۰ پبلیکیشنز ادارے اسکے لئے کمربستہ ہو جائیں تو اگلے ۲۵ برسوں میں ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر ایم ایم حسین

پرنسپل (ڈاؤ میڈیکل کالج)

اگرچہ میرا یہ مضمون نہیں ہے تاہم یہ بات تو سب کے سامنے ہے کہ ہماری موجودہ حکومت اردو کے فروغ کیلئے کوشاں ہے۔ لیکن یہ کام تدریج ہی ہو سکتا ہے پہلے ہمیں میٹرک وانٹرتک ذریعہ تعلیم اردو کو بنانا ہو گا اسکے بعد ہی یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ پیشہ ورانہ تعلیم اردو میں دیجا سکے اب آپ خود ہی دیکھیں کہ اسوقت انجینئرنگ کی تعلیم اردو میں دیجا سکے کسطرح دیجا سکتی ہے۔ جبکہ انجینئرنگ میں نہ صرف یہ کہ اردو میں بلکہ انگریزی میں بھی کسی پاکستانی مصنف کی کوئی کتاب نہیں ہے علاوہ ازیں اگر ہم اعلیٰ تعلیم بالخصوص پروفیشنل ایجوکیشن کیلئے اردو کو منتخب کریں تو ہمیں پہلے اساتذہ کی تربیت کرنی پڑے گی اور اسکے لئے باقاعدہ ایک اکیڈمی قائم کرنا ہو گی اور پھر جو غیر ملکی پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کرنے کیلئے آتے ہیں انکا کیا بنے گا ؟ میرا کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمیں اردو کو اپنانے سے پہلے ان باتوں پر غور کر لینا چاہیئے۔

شعبہ حیوانیات (جامعہ کراچی)

ڈاکٹر نسیمہ معصوم ترمذی

سائنس کی تعلیم ہم اردو میں کیوں نہیں حاصل کر سکتے ہیں۔

بالکل کر سکتے ہیں میں تو سو فیصد اردو میں تعلیم حاصل کرنے کی رائے دونگی۔ لیکن یہاں پر میں اس اردو کی بات کر رہی ہوں جو ہماری روزمرہ کی زبان ہے۔ اگر اس زبان میں انگریزی کے چند الفاظ آجائیں تو ہمیں برداشت کرنا چاہئیے کیونکہ ہم انگریزی زبان سے کسی بھی صورت میں تعلق نہیں توڑ سکتے۔ جاپان جو آج ترقی یافتہ قوم ہے وہ بھی انگریزی زبان کو اہمیت دیتی ہے۔ اگر انگریزی زبان سے علم حاصل ہوتا ہے تو اسکو کاٹ کر نہیں پھینکنا چاہئیے۔ جہاں تک اردو کی ترقی کی بات ہے تو اسکے لیے ہر شخص کو یہ سمجھنا چاہئیے کہ یہ اسکی اپنی ذمہ داری ہے۔ ہر شخص کو اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کرنا چاہئیے۔ ہمارے ہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ اگر انگریزی میں کسی شخص سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسکو شرم آتی ہے اور لوگ اسکا مذاق اڑاتے ہیں لیکن اگر اردو میں غلطی ہو جائے تو شرم نہیں آتی اور لوگ اسکا مذاق بھی نہیں اڑاتے۔ جہاں تک اصطلاح کے ترجمے کا تعلق ہے تو اسکا اردو میں ترجمہ نہیں کرنا چاہئیے کیونکہ انگریزی زبان ہر جگہ بولی جاتی ہے۔ اگر ہم نے اصطلاح کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا تو ہمیں آگے چلکر بہت مشکل پیش آئیگی۔

اردو ہمارے ملک کی قومی زبان ہے لیکن یہ بات صرف کہنے کی حد تک ہے جبکہ ہمارے ملک میں تمام تر کام انگریزی میں ہوتے ہیں۔ آپ نشریاتی اداروں کی مثال لیجئے ان میں ۴۰٪ فیصد پروگرام انگریزی میں ہوتے ہیں یہاں تک کہ ریڈیو اور ٹی وی میں متعلق اشتہارات بھی انگریزی میں ہوتے ہیں اسکے علاوہ بینک، انشورنس کمپنیاں، سرکاری و نیم سرکاری دفاتر اور تعلیمی درسگاہوں کے تمام کام اور کاغذی کاروائیاں انگریزی ہی میں ہوتی ہیں۔ جہازوں، سینماؤں، بسوں اور ریل گاڑی کے ٹکٹ بھی انگریزی میں ہوتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی شخص بھلا یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ جہاں تک سائنس کی تعلیم اردو میں دینے کا سوال ہے تو سب سے پہلے اردو میں جدید سائنسی کتابوں کی ضرورت پڑے گی جبکہ ابھی تک ہمارے ہاں سوائے ان کتابوں کے جو بورڈ نے نکالی ہیں اور جنکی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسکے علاوہ آپ کو کوئی بھی معیاری کتاب اردو میں کہیں سے نہیں ملے گی۔ ہم طلبا کو اردو میں لیکچر دے سکتے ہیں مگر جب گھر جاکر اسکو اردو میں کتابیں نہیں ملینگی تو پھر ہمارے لیکچر دینے کا کیا فائدہ۔ لیکچر سننے کے بعد کتاب کا پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ اور پھر صرف تعلیمی درسگاہوں میں اردو کو داخل کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اردو کی ترقی کیلئے ہمیں اپنے ماحول کو اردو میں لانا پڑے گا۔ اپنی عام زندگی میں، اپنے ریڈیو اور ٹی۔ وی میں اپنے دفاتروں میں اردو کو اہمیت دینا پڑے گی۔ تب کہیں جاکے ہمیں کامیابی ہوگی۔ اور یہ کام کسی ایک فرد کا نہیں ہے بلکہ معاشرے کے ہر فرد کا ہے۔ جہاں تک موجودہ حکومت کا تعلق ہے تو وہ تعلیمی اداروں میں اردو لانے کی کوشش کر رہی ہے مگر یہ رفتار کچھ سست ہے۔

سائنس کی تعلیم اردو میں دینے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ کتابیں مہیا ہو جائیں۔ ہوتا یہ ہے جو ملک ترقی میں آگے ہوتا ہے لوگ اس کی باتیں جاننا چاہتے ہیں اور اس کے لئے وہ ان کی زبان کو سیکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں صرف اردو زبان سے بات نہیں بن سکے گی۔ اردو میں تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اس زبان کو بھی سیکھنا ضروری ہے جس میں ہم کو زیادہ سے زیادہ مواد حاصل ہو سکے۔ اور چونکہ انگریزی زبان کا دائرہ بہت وسیع ہے اس لئے اس کو سمجھنا اور پڑھنا ضروری ہے۔ کیونکہ ایڈوانس سائنس کی عام کتابیں یا معلومات انگریزی زبان میں ہی ملتی ہیں۔ اردو کی ترقی کے لئے پہلی اور کامیاب کوشش صرف اور صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اس زبان کو دفتری زبان قرار دیا جائے اگر طلباء کے والدین یہ چاہتے ہیں کہ انکی اولاد انگریزی میں تعلیم حاصل کرے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمام اداروں میں چاہے وہ پرائیوٹ ہوں یا سرکاری ہوں ان میں تمام تر کاغذی کاروائی یا فارم وغیرہ انگریزی میں ہوتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں جن کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے وہ سنجیدہ نہیں ہو پاتے اور مسئلہ کاغذی کاروائی تک ہی رہ جاتا ہے ۔ بہرحال ہمیں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ جس کی وجہ سے ہم اردو کو رائج نہیں کر سکتے۔ تمام کی تمام اصطلاحات کا ترجمہ اردو میں کرنا چاہیئے۔ شروع میں مشکل ضرور ہو گی۔ اصل میں سارا مسئلہ ماحول کا ہوتا ہے۔ جب ماحول اردو کا پیدا ہو جائے گا تو کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ اور ویسے بھی ہمارے یہاں انگریزی کی تعلیم بالکل ناقص ہے۔ ذرا تصوّر کریں کہ دس سال پڑھنے کے بعد بھی طلباء انگریزی ٹھیک طور پہ لکھ نہیں سکتے، بول نہیں سکتے۔ حالانکہ کسی دوسری زبان کو سیکھنے میں زیادہ سے زیادہ تین سال لگ سکتے ہیں۔ اگر آپ طلباء کو بہترین تعلیم دینا چاہتے ہیں تو بہترین اساتذہ فراہم کرنا ہوگا اور اگر آپ بہترین استاد چاہتے ہیں تو بہترین معاشی سہولتیں دینا ہوں گی۔ جبکہ ہمارے یہاں ایسا بالکل نہیں ہے جو معیارِ تعلیم کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

ڈاکٹر نذر الحسنین

شعبہ حیاتی کیمیا (جامعہ کراچی)

اردو ہمارے ملک کی قومی زبان ہے اور پاکستان میں رہنے والا ہر فرد اس کو آسانی سے بول اور سمجھ سکتا ہے۔ جبکہ انگریزی زبان کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا ہماری سائنس کی تعلیم اردو میں ہی ہونا چاہیئے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد کم سے کم وقت میں اس کو پڑھ اور سمجھ سکیں ہمارے یہاں سب سے بڑا مسئلہ کتابوں کا ہے۔ ہمارے یہاں سائنس پر مبنی کتابیں بالکل نہیں ہیں۔ ہمارا سب سے پہلا کام تو یہ ہونا چاہیئے کہ اچھی اور معیاری کتابوں کا ترجمہ کریں۔ یہاں پر اصطلاحات کی بات نکلتی ہے ہمیں صرف ان اصطلاحات کا ترجمہ کرنا چاہیئے۔ جو آسانی کے ساتھ ہو جائیں اور جن کی ادائیگی بھی مشکل نہ ہو۔ پھر اس کے بعد سائنس کی تعلیم چھوٹی جماعتوں سے شروع کرتے ہوئے بڑی جماعتوں تک لایا جائے اور جہاں تک ذمّہ داری کی بات ہے تو ساری ذمّہ داری ان افراد پر ہے جو پالیسیاں بناتے ہیں۔ اگر یہ افراد تمام نازک پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے مثبت اور ٹھوس پالیسیاں بنائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ سائنس کی تعلیم اردو میں نہ ہو۔ اور پھر ہمارا ملک تو جدید ٹیکنالوجی میں

دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے ہم جس چیز کے بارے میں صرف سوچ ہی پاتے ہیں اس پر دوسرے ممالک تحقیق بھی کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں تعلیم یافتہ اور خاص طور پر سائنس کے میدان میں تعلیم یافتہ افراد کی کمی ہے۔ اس کے لئے ہمیں باقاعدہ طور پر منصوبہ بندی کرنا پڑیگی تاکہ ہم جدید ٹیکنالوجی کے میدان میں برابر آسکیں۔

ڈاکٹر ظفر نعیم

سائنس کی تعلیم کو میں انگریزی میں پڑھانا چاہتا ہوں کیونکہ میں خود انگریزی میں پڑھاتا ہوں۔ لہٰذا اردو میں ٹھیک طور پر نہیں پڑھا سکتا یا یوں سمجھئے کہ انگریزی زبان میں تعلیم دینا میرے لئے زیادہ آسان ہے لیکن اب سوچتا ہوں کہ اگر میں اردو میں تعلیم حاصل کرتا تو زیادہ تعلیم حاصل کر سکتا تھا کیونکہ ہر شخص اپنی مادری یا قومی زبان میں ہی بہتر اور اچھے طریقے پر بول اور سمجھ سکتا ہے۔ بہرحال انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنا ہمارے لئے نقصان دہ ہے۔ انگریزی زبان کو صرف رابطے کی زبان کی حیثیت دے کر سیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ایک عالمگیر زبان ہے اور اگر صحیح پوچھئے تو میری خواہش ہے کہ عربی زبان وہ حیثیت اختیار کرلے جو انگریزی زبان کو حاصل ہے۔ رہا سوال کہ اردو کی ترقی کیوں نہیں ہوئی تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم کو اس کی عادت نہیں ہے۔ دوسرے اردو میں تعلیم حاصل کرنے والوں کا ملک میں کوئی روشن مستقبل نہیں ہے۔ تیسرے کتابوں کی کمی کا بہانہ ہے حالانکہ کتابیں چھپ سکتی ہیں۔ اگر بڑے لوگ اپنی فطری جھجک کو چھوڑ کر یہ ذمہ داری لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ترقی ہو سکتی ہے۔ سائنس کی موجودہ اصطلاحات کو اردو کے ساتھ لکھا جائے تاکہ انگریزی اور اردو دونوں ساتھ چلیں یہ بات ذہن میں رہے کہ اردو کی ترقی ایک دم نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو پرائمری جماعتوں سے رائج کرنا پڑے گا۔

ڈاکٹر اظہر حسین شعبہ ارضیات

ہمارے ملک کی بڑی بڑی درسگاہوں خاص طور پر جامعہ کراچی میں کافی تعداد ایسے طالب علموں کی ہوتی ہے جو باہر سے آتے ہیں۔ جن کے باعث اردو میں تعلیم دینا ذرا مشکل ہے۔ یہ ہمارے نظام تعلیم کی خرابی ہے کہ کوئی ایسی پابندی نہیں ہے جس کی وجہ سے باہر سے آئے ہوئے طالب علموں کو اردو سکھائی جائے۔ جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہوتا ہے مثلاً یہ کہ اگر آپ جرمنی جاکر تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کو ان کی قومی زبان سیکھنی پڑے گی۔ دوسری بات یہ کہ اساتذہ اردو میں کتابیں لکھنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں ہیں اور پھر حکومت بھی تعاون نہیں کرتی۔ اردو کی ترقی جو ابھی تک نہیں ہوئی اس کے ذمہ دار وہ ادارے ہیں جہاں پر اس کے لئے عطیات جاتے ہیں اور پھر اس کام کے لئے سب سے پہلے پیسہ اور پھر ذہنی تیاری کی ضرورت ہے۔ اساتذہ سے کتابیں لکھوا کر انکی معاشی ضرورت کو پورا کیا جائے۔ سائنس پر مبنی موجود کتابوں میں موجود اصطلاحات (TERMS) کا بھی اردو میں ترجمہ کیا جائے مگر ساتھ ہی ساتھ انگریزی میں بھی لکھا جائے اور جب کتابیں تیار ہو جائیں تو ان کو نچلی جماعتوں سے شروع کیا جائے۔ اس میں عرصہ تو بے شک لگے گا مگر اس کے نتائج بہت سود مند ہوں گے۔ اس سے

اردو کو حیات ملے گی اور ملک کی ترقی کی رفتار بڑھ جائے گی۔

شعبہ ریاضی

ڈاکٹر انصار حسین

ہمارے یہاں اردو میں تعلیم حاصل کرنے والوں کا مستقبل زیادہ روشن نہیں ہے۔ سرکاری اور بڑے امتحانات وغیرہ انگریزی میں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام دفتری امور انگریزی ہی میں طے پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص نوکری کے لئے اردو میں درخواست دیدے تو اس درخواست کو دیکھے بغیر کہا جاتا ہے کہ انگریزی میں لکھ کر لاؤ۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر شخص کو مجبوراً انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلیمی درسگاہوں میں شروع سے آخر تک تعلیم انگریزی زبان میں ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ خود سوچئے کہ اردو زبان کیسے ترقی پاسکتی ہے۔

سائنس کی تعلیم کو پورا کا پورا اردو میں کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ سائنس میں جو (TERMS) اصطلاحات استعمال ہوتی ہے ان میں سے بہت سی ایسی ہیں کہ اگر ان کا ترجمہ کیا جائے تو وہ بہت مشکل ہوتا ہے اور اس کو یاد کرنا انگریزی سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ انگریزی بین الاقوامی زبان ہے اس کو دنیا کا ہر آدمی سمجھ سکتا ہے اگر ہم نے انگریزی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کیا تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جو طالب علم باہر جاتے ہیں ان کو بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑیگا لہٰذا TERMS کو انگریزی میں رکھا جائے اور سائنس کی باقی تعلیم اردو میں دی جائے لیکن اس کے لئے کافی عرصہ لگے گا مگر اس کے نتائج سود مند ہوں گے۔

وہ زبان سب سے بہتر ہوتی ہے جو بہتر طور پر ادا کی جاسکے اور کسی چیز کے اظہار کے لئے سب سے مؤثر ذریعہ صرف اپنی زبان ہی ہوسکتی ہے۔ جہاں تک سائنس کی تعلیم اردو میں دینے کا سوال ہے تو سائنس صرف بولنے سے نہیں آتی بلکہ سیکھی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے لئے ہم کو لیکچر اور کتابوں کا سہارا لینا پڑتا ہے بدقسمتی سے جدید سائنسی لٹریچر اردو میں نہیں ہے۔ دراصل ہمارے یہاں اس طرف توجہ نہیں دی گئی اور نہ ہی ہمارے یہاں کوئی باقاعدہ تعلیمی میدان میں کوئی ریسرچ سیکشن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے۔ اگر حکومت چاہے تو سائنس کی تعلیم اردو میں ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ سارا کام حکومت کرے بلکہ یہ ایک ٹیم ورک ہونا چاہیئے۔ سب سے پہلے کتابوں کا اردو ترجمہ ہونا چاہیئے لیکن TERMS کا ترجمہ نہ کریں۔ اس کے بعد اس کو چھوٹی جماعتوں سے شروع کرکے بتدریج بڑی جماعتوں تک لایا جائے اور اس کے لئے باقاعدہ پلاننگ کی جائے۔ اب سوال انگریزی زبان کا ہے تو یہ انٹرنیشنل زبان ہے اور ہم اس سے تعلق کسی صورت میں بھی نہیں توڑ سکتے لہٰذا اس کو رابطے کی زبان کی حیثیت دے کر سیکھنا چاہیئے اور ویسے بھی کسی بھی زبان کو سیکھنا فائدہ مند ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ولی اللہ (مرحوم)

شعبہ الہٰیات

اردو میں پڑھنے میں سہولت ہے کیونکہ یہ ہماری مادری زبان ہے اور دوسرے یہ کہ قومی زبان بھی ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس زبان میں معیاری کتابوں کا

فقدان ہے۔ خاص طور پر سائنسی کتابوں کا۔ اردو کی ترقی کے سلسلے میں بابائے اردو کی کوششوں کو بھلایا نہیں جاسکتا مگر اُن کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ جہاں تک سائنس اور اردو کا تعلق ہے تو جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ کتابوں کا فقدان ہے اگر یہ فقدان ختم ہو جائے تو سائنس کی تعلیم ہم اردو میں دے سکتے ہیں اور دینی چاہیئے کیونکہ اس کو ہم آسانی کے ساتھ بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن یہاں سوال معاشی صورتحال کا پیدا ہوتا ہے۔ ہم اساتذہ اس سلسلے میں حکومت سے تعاون کرنے کو تیار ہیں مگر حکومت بھی معاشی طور پر ہم کو سہولت پہنچائے۔ اردو زبان کو سائنس میں عام کرنے کے لئے شروع میں تو کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مثلاً یہ کہ موجودہ اساتذہ میں جنہوں نے زیادہ تر انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کی ہے لہذا ان کے لئے انگریزی زبان ہی میں تعلیم دینا آسان رہتا ہے۔ دوسری بڑی دشواری اصطلاحات کا اردو ترجمہ کرنے کا ہے۔ میرے خیال میں تو ان کا اردو ترجمہ ہونا چاہیئے مگر ساتھ ہی ساتھ انگریزی زبان میں بھی لکھنا چاہیئے۔ بہرحال اگر ہم نے محنت اور خلوص سے یہ کام کیا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اردو زبان میں سائنس کی تعلیم عام نہ ہو۔

ڈاکٹر مسعود قریشی شعبہ فلکیات

سائنس کی تعلیم ہر ملک کے لئے بہت ضروری ہے ہمارے یہاں سائنس کی تعلیم میٹرک یا انٹر تک تو صحیح ہے مگر اس کے بعد صحیح نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں سائنس کی تعلیم اردو زبان میں دینا چاہیئے کیونکہ یہ ہماری قومی زبان ہے اور ہم اس کو آسانی کے ساتھ بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ اور اساتذہ کو بھی پڑھانے میں آسانی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں انگریزی کو لازمی قرار دینے کی اب ضرورت نہیں ہے کیونکہ اب اس کا موقع نہیں ہے ہمیں اسے صرف ایک زبان کی حیثیت سے سیکھنا چاہیئے۔ جب دوسرے ملک اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کرکے پڑھا سکتے ہیں تو آخر ہمارا ملک کیوں نہیں کرسکتا۔ ہمارے یہاں آج تک کسی نے یہ نہیں کیا کہ فلاں سائنس کے مضمون کا ترجمہ کریں اور پھر ہم اساتذہ کو زیادہ آسانیاں بھی نہیں ملتی ہیں۔ ان کو معاشی سہولتیں اتنی میسر نہیں ہوتی ہیں جتنی کہ ہونی چاہیئے۔ تسلیم شدہ کتابوں کے ترجمے کئے جائیں اور اگر انگریزی اصطلاحات کو آسان اردو اصطلاحات میں تبدیل کیا جاسکتا ہو تو ٹھیک ہے ورنہ انہیں انگریزی میں لکھ کر اپنا لیا جائے کیونکہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم اصطلاحات کے چکر میں پڑے رہیں۔ اردو کی ترقی کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے کیونکہ تمام پالیسیاں بنانا ان کے ذمہ ہوتا ہے۔ پاکستان کو بنے ۳۳ سال ہو گئے ہیں اور گذشتہ دس سالوں سے کہا جارہا ہے مگر اب تک کوئی واضح صورت سامنے نہیں آئی۔ خامی یہ ہے کہ ہم باتیں زیادہ کرتے ہیں اور کام کم۔ حکومت کے علاوہ وہ طبقہ جس کے سپرد یہ کام دیا گیا ہے اس پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اردو کے لئے کام کرے۔ ہمارے یہاں ہر پانچ سال بعد یا ہر سے آنے والی نئی حکومت تعلیمی پالیسی تبدیل کرتی ہے جس کی وجہ سے تعلیم کا معیار بلند نہیں ہوتا ہے۔ ترقی کے لئے ابتدائی دور سے ہی اردو میں تعلیم دینا چاہیئے۔


کارکردگی میں بیمثال
سومیٹوموٹائر
● مضبوطی، پائیداری، گارنٹی اور بعد از فروخت سروس میں سب سے اوّل
● ڈیزل لاگت میں کمی کی وجہ سے منافع بخش۔
● ٹرانسپورٹروں کی اولین پسند۔
SUMITOMO TYRES
اعوان اینڈ کمپنی

شعبہ اطلاقی حیاتیات
(جامعہ کراچی)

ڈاکٹر افضل احمد

سائنس کی تعلیم اردو میں دینے کا جہاں تک سوال ہے تو میری رائے اور میرے خیال کے مطابق اردو کی تعلیم یا ابتدائی تعلیم تو اردو میں دی جاسکتی ہے مگر یونیورسٹی میں تعلیم انگریزی ہی میں دینا چاہئیے۔ کیونکہ جتنی بھی ایڈوانس سائنس ہے وہ ہمارے ملک میں باہر سے آئی ہے اور بدقسمتی سے ہم اس ٹیکنالوجی میں بہت پیچھے ہیں۔ ہاں اگر سائنس میں ہم دوسری قوموں سے آگے بڑھ جائیں تو بے شک بڑی تعلیمی درسگاہوں میں تعلیم اردو ہی میں دینی چاہئیے۔ اور پھر ہمارے پاس کوئی کتاب بھی جو کہ بڑی کلاسوں کیلئے ہوتی ہے وہ موجود نہیں ہے۔ اور جو چھوٹی کلاسوں کیلئے کتابیں چھپتی ہیں وہ صرف اور صرف تجارت کی بنیادوں پر چھپتی ہیں۔ جسکے اندر بے شمار خامیاں نظر آتی ہیں۔ پھر اسکے علاوہ والدین چاہتے ہیں کہ انکا بچہ بڑا ہوکر اچھی جگہ پر جائے۔ مگر چونکہ ہمارے ہاں ہر جگہ پر انگریزی کو اہمیت دی جاتی ہے اسی وجہ سے والدین اپنی اولاد کو انگریزی میں تعلیم دیتے ہیں۔

سائنس کی تعلیم اردو میں دینے کیلئے سب سے پہلے تو ضروری ہے کہ ہمارے پاس اردو میں کتابیں موجود ہوں۔ جسکے لئے ہمیں جدید سائنسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا پڑے گا پھر اسکے بعد سائنس کی اردو میں تعلیم ابتدائی کلاسوں سے کرنا پڑے گی۔ اور پھر آہستہ آہستہ اونچی کلاسوں تک لانا پڑے گا عرصہ تو کافی لگے گا مگر کامیابی ضرور ہوگی۔ اور اسکے لئے ہم سب کو ملکر یہ کام کرنا پڑے گا۔

سوال نمبر ۱ :- اردو زبان میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے میں آپ دشواری تو محسوس نہیں کرتے ؟۔

سوال نمبر ۲ :- وہ کونسے اقدامات ہیں جنکے نافذ کرنے سے اردو زبان بہت جلد سرکاری زبان بن سکتی ہے۔ ؟

سوال نمبر ۳ :- اردو کالج کے ماحول کے متعلق آپکے کیا تاثرات ہیں آپ مطمئن ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو وہ اقدامات بتائیے کہ جنکے نافذ کرنے سے اردو کالج کا ماحول بہتر ہوسکے۔

سوال نمبر ۴ :- اگر اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے تو اسکی کیا اہمیت ہوگی ؟

پروفیسر جمال الدین
صدر شعبہ انگریزی

جواب نمبر ۱ :- میرے خیال میں اردو زبان کو عملی طور پر انگریزی کی جگہ لینے کیلئے صرف تکلم سے لیکر عملی زندگی کے تمام شعبوں تک اردو زبان نافذ العمل ہونا چاہئیے اسکے علاوہ ترجموں کے ذریعے اردو کے ذخیرے کو وسعت دینے کی ضرورت ہے تاکہ اردو زبان جدید علوم و فنون کو اپنے دائرے میں سمیٹ سکے۔ پاکستان کی قومی صورتحال کے پیشِ نظر اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اردو زبان کو زیادہ آزادی کے ساتھ مختلف علاقائی زبانوں کے ساتھ مربوط ہونا چاہئیے۔ تاکہ باہمی استفادہ ہو۔ اور اس زبان کی جڑیں پاکستان کی سرزمین میں چل سکیں۔

جواب نمبر ۲ :- جی نہیں مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں اس ماحول سے مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تقریباً سارے ہی تعلیمی اداروں میں ایسا ہی غیر اطمینان بخش ماحول پایا جاتا ہے۔ جہاں تک اصلاح کا

تعلق ہے تو میرے خیال میں تعلیمی ادارے معاشرے کا جزو ہوتے ہیں۔ اور خوبیوں و خامیوں کا انحصار معاشرے پر ہوتا ہے معاشرے کی اصلاح تعلیمی اداروں کے بغیر کسی اور جزو کی اصلاح کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ ہمارا معاشرہ یقیناً بہت سی بنیادی اصلاحات کا طالب ہے اور جب تک اصلاحات نہیں ہونگی تعلیمی اداروں کی بے راہ روی اور بے مقصدیت دونوں پر قابو نہ پایا جا سکے گا۔ جہاں تک اردو کالج کے ماحول کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اردو کالج کا ماحول ان تمام تعلیمی اداروں سے بہت بہتر ہے جہاں مخلوط تعلیم ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام مخلوط تعلیمی اداروں میں سب سے اچھا ماحول اردو کالج کا ہے۔

جواب نمبر ۱۔ اس سوال کا جواب ظاہر ہے کہ اردو کالج کو یقیناً اردو یونیورسٹی کا درجہ دینا چاہیئے اور اس قدم کی سب سے بڑی افادیت یہ ہوگی کہ یہ اردو کی پسندیدہ اور جدید علوم و فنون سے مالا مال کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ اور لوگوں کی نظروں میں یہ بات آ سکے گی کہ اردو زبان میں کوئی ایسی بنیادی کمی نہیں جس سے وہ عملی طور سے وہ مقام حاصل نہیں کر سکتی جو اسکو نظری طور پر حاصل ہے۔

جواب نمبر ۲: طلبأ معاشرے کے وہ نوجوان ہیں جنکو تعلیم جیسی نعمت میسر ہے۔ ویسے تو سارے نوجوانوں کو طالب علم ہونا چاہئیے تھا لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ابھی یہ صورت نہیں۔ طلبأ اور نوجوان معاشرے کا وہ حصہ ہیں جنکو اپنے بزرگوں کا ورثہ ملتا ہے اور جو اس ورثے کو اپنی کاوشوں سے بڑھا کر نئی نسل کیلئے بہتر معاشرہ تعمیر کرتے ہیں اسطرح سے طلبأ کا کام پچھلی نسلوں کا حاصل کیئے ہوئے تجربے کو اپنانا ہے، اسے تنقیدی نظروں سے جائزہ لینا ہے اور اسکو پہلے سے بہتر بنا دینا ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ طلبأ معاشرے کو تنقیدی نظر سے دیکھ کر اسے مزید بہتر بنانے کے لئے سعی کرتے ہیں اور یہی سعی معاشرے کے لئے طلب کا بہترین تحفہ ہے۔

اساتذہ وہ ذریعہ ہیں جن سے طلبأ کو انسانیت کا مجموعی علم اور تجربے کا ذخیرہ ملتا ہے اساتذہ جتنی بہتر طور پر اپنے نوجوانوں کو علم سے مالا مال کرینگے اتنی ہی خوش اسلوبی سے طلبأ اپنے نئے تخلیقی عمل کو انجام دے سکیں گے۔ اگر ہماری نظر میں یہ بات ہے کہ طلبأ وارث بھی ہیں اور ورثے کی تجدید بھی کرتے ہیں تو ہمیں اساتذہ اور طلبأ کا باہمی رشتہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی۔

پروفیسر اے کے آفتاب زبیری

جواب نمبر ۱:۔

تمام سرکاری خط و کتابت اور دفتری کام کیلئے سرکاری زبان اردو ہو۔ خصوصی طور پر عدالتی کاروائیاں اردو زبان میں ہوں اور عدالتی زبان اردو ہو تو فطری اور نفسیاتی طور پر عوام اسکی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسکی طرف رجوع کا ہونگے۔ اسکے علاوہ درس و تدریس کے سلسلے میں بطور خاص جملہ اداروں میں اگر اردو نافذ ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ بہت قلیل عرصے میں اردو زبان اپنا جائز حق حاصل کرلے۔ جائز حق کو پانے کیلئے ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ

قانونی اعتبار سے عوام کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنے صنعتی اور تاجرانہ اداروں میں دفتری اور تشہیری معاملات میں اردو کو نظر انداز نہ کریں۔ اعلیٰ اسامیوں کے تمام امتحانات میں ذریعہ اظہار اردو قرار دی جائے۔ اردو زبان جن جماعتوں میں لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل ہے اسکے نمبر ڈویژن میں شامل کیئے جائیں اسی صورت سے طلبا اسکی اہمیت کو تسلیم بھی کرینگے اور خاطر خواہ دلچسپی کا اظہار بھی کرینگے۔

جواب نمبر۲ ۔ ذاتی طور پر میں شروع ہی سے اس تعلیمی ادارے سے منسلک ہوں اور اردو کالج کی کارکردگی میرے خیال میں اطمینان بخش ہے ۔ البتہ ملک میں صرف اردو کالج ہی کو اس تہذیبی اور علمی کام کیلئے یعنی اردو زبان کی خدمت کے لئے مختص نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس ملک کا ہر کالج یا تعلیمی ادارہ اپنے ذریعۂ تعلیم کے اعتبار سے اردو کالج بن جانا چاہئے ۔ مخصوص طور پر دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی تخلیقات کا بڑے پیمانے پر ترجمہ اور تالیف کا سلسلہ ہر کالج میں سرکاری اعتبار سے قائم ہو تاکہ اردو میں جدید علوم کی تعلیم ترقی یافتہ دنیا کے قدم بہ قدم جاری رہے ۔

جواب نمبر۳ ۔ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ قدم انتہائی مبارک ہوگا اور ملک و قوم کے لئے نیک فال ہوگا ویسے ہونا تو یہ چاہئے کہ اس ملک کی ہر یونیورسٹی اردو یونیورسٹی ہو جیسا کہ ہمارے پڑوسی ملک جس نے ہمارے ساتھ ساتھ آزادی حاصل کی لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہاں کی ہر یونیورسٹی ہندی یونیورسٹی نظر آتی ہے اسلیئے ہمارے ملک کی یونیورسٹیوں کو بھی اردو یونیورسٹی کے قالب میں ڈھل جانا چاہئے اور یوں بھی ہماری آزادی کی پوری جنگ نثر اور نظم دونوں اعتبار سے اردو زبان میں ہے اور برصغیر پاک و ہند میں آزادی و بیداری کے تمام کام اردو میں ہی انجام دیئے گئے ۔

جواب نمبر۴ ۔ چوتھے سوال کے جواب میں آپ نے کہا کہ تعلیم بغیر تربیت کے مکمل ہو ہی نہیں سکتی علم نام ہے سیکھنے کا اور سکھانے کا اور سیکھ کر اپنے کردار اور اطوار کو علم کی روشنی میں استوار کرنے کا اور اس استواری کا تعلق معلم اور متعلم دونوں کی ذات سے وجود میں آتا ہے استاد نہ صرف اپنے فرائض کو مقدس جان کر عمل پیرا ہوں بلکہ دیانت کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو درس و تدریس میں استعمال کریں اور اپنے خلوص سے طلباء میں اپنے ذوقِ علم کی تشکیل کریں اسکے علاوہ طلباء و طالبات کا بھی یہ فرض ہے جو بہ منزلہ کہ وہ اپنے فرائض کی بطریق احسن انجام دہی میں دیانت اور محنت کے ساتھ عمل پیرا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ کوئی وجہ نہیں کہ ملک کا تعلیمی، اخلاقی، علمی، ادبی، سائنسی، فنی، ثقافتی ماحول صحت فراغ و فرحت حاصل ہو ۔

یہ تو تھے جناب ہمارے صدر شعبۂ انگریزی اور صدر شعبۂ اردو کے تاثرات اور اب چلتے ہیں کالج کے باقی صدر شعبہ جات کی طرف

پروفیسر ہارون رشید نجمی

صدر شعبہ طبیعات

جواب نمبر۱ ۔ بی ۔ ایس سی میں اردو میں تدریس میں مجھے قطعی کوئی دشواری پیش نہیں آتی بلکہ نسبتاً سہولت محسوس ہوتی ہے ایم ۔ ایس سی میں چونکہ اصطلاحات کی کمی ہے لہٰذا کہیں کہیں پہ دشواری محسوس ہوتی ہے ۔

جواب نمبر ۲ :- سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہم انگریزوں کی ذہنی غلامی یعنی احساس کمتری سے چھٹکارا حاصل کریں۔ تمام اداروں میں اردو نافذ العمل ہو اور ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو کو نافذ کیا جائے۔ اردو رائج کرنے میں عملی دشواری کوئی نہیں ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ ذہنی طور پر اسکے لیئے تیار ہوں اور اردو بولنے اور سمجھنے میں فخر محسوس کریں

جواب نمبر ۳ :- کالج کے ماحول سے میں کوئی خاص مطمئن نہیں ہوں اور ۱۹۶۲ء سے پہلے کا ماحول تلاش کرتا ہوں۔ یہاں کے طلبا میں نظم و ضبط نہیں پایا جاتا اسلئے طلبا تدریس و درس میں دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے۔ نظم و ضبط کے علاوہ دوسری چیز کثرت تعداد ہے اسلیئے اکثر طلبا برآمدوں میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ کراچی کا کوئی ایک آدھ ہی کالج ایسا ہوگا جہاں اردو کالج جیسے قابل اور تجربہ کار اساتذہ موجود ہوں۔ جگہ کی کمی ضرور ہے اور ہر کمی جلد ہی لیکن توسیع کا کام جاری ہے۔ کمی پوری ہو جائے گی اسکے علاوہ اساتذہ کی کمی کو پورا کیا جائے اور کالج میں نظم و ضبط برقرار رکھا جائے تو ایک مثالی ماحول بن سکتا ہے۔

جواب نمبر ۴ :- یہ پاکستان کی پہلی اور واحد اردو یونیورسٹی ہوگی اور اردو کو رائج کرنے میں آسانی ہوگی یہاں سے زیادہ ڈاکٹر اور انجینئر بن سکیں گے۔ لہٰذا طلباء کیلیئے آسانی ہوگی اور نتائج بھی بہتر ہونگے۔

اردو یونیورسٹی کا قیام نہ صرف طلباء بلکہ اساتذہ کے علاوہ پاکستانی عوام کیلیئے بھی خوشی اور فخر کا باعث ہوگی۔ اور یہ ابتداء ہوگی جسکے بعد بتدریج تمام جامعات میں ذریعہ تعلیم اردو میں رائج ہو سکے گا۔

ڈاکٹر حفیظ الرحمن صدیقی

صدر شعبہ حیوانیات

جواب نمبر ۱ :- نہ صرف یہ کہ میں دشواری محسوس نہیں کرتا بلکہ انگریزی کے مقابلے میں زیادہ عمدگی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر ادا کر سکتا ہوں۔

جواب نمبر ۲ :- اردو کو سرکاری زبان قرار دینے کیلیئے صرف ایک آرڈیننس کے اجراء کی ضرورت ہے اور بس !

جواب نمبر ۳ :- کالج کے ماحول میں صرف ایک مسئلہ پریشانی کا موجب ہے اور وہ ہے کہ طلباء کی ایک تعداد جو اگرچہ کافی بڑی نہیں ہے مگر وہ نظم و ضبط کو خراب کرنے کا باعث بن گئی ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ انتظامیہ کے تادیبی اختیارات میں اضافہ کیا جائے یعنی انہیں ایسے طلباء کے داخلے منسوخ کرنے، اور ان پر جرمانے کرنے اور انکی حاضری کی کمی کی صورت میں فارم روک لینے تک کے اختیارات حاصل ہوں اگر ان اختیارات کو دو تین سال تک رائج کیا جائے تو یہ کالج مثالی نظم و ضبط کا حامل بن سکتا ہے۔ جب تک یہ تقاضے پورے نہیں کیے جاتے عام اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ کالج میں نظم و ضبط قائم کرنے میں کالج کی انتظامیہ کا ہاتھ بٹائیں وہ کم از کم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ طلباء کو کلاسوں میں باقاعدگی سے شرکت کرنے کی ترغیب دیں "انہیں احاطۂ کالج میں سگریٹ نوشی، سیٹیاں بجانے اور شور و غل کرنے سے منع کریں۔ اگر وہ اتنا ہی ہاتھ بٹائیں تو نظم و ضبط قائم ہو سکتا ہے۔

جواب نمبر ۴ :- جب تک اردو ملک کی سرکاری زبان نہیں بن جاتی اسوقت تک اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ نہیں دینا چاہیئے ہاں اتنا ضرور ہے کہ پوسٹ گریجویٹ جماعتوں تک تعلیم دی جائے ایسا کرنے سے وہ ہی فائدہ حاصل ہو جائے گا جو ایسے

یونیورسٹی بنا کر حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے طلباؑ اس امکانی نقصانات سے محفوظ رہیں گے جو مکمل یونیورسٹی بننے سے طلباؑ کو پہنچ سکتا ہے۔ مفہوم اسکا یہ ہے کہ اگر ملک کی زبان بدستور انگریزی رہے تو ظاہر ہے کہ سرکاری اور نیم سرکاری ملازمتوں میں ترجیح ان طلباؑ کو دیجائے گی جنہوں نے انگریزی ذریعہ تعلیم والی یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی ہو اور اسکے مقابلے میں اردو یونیورسٹی والے طلباؑ خسارے میں رہیں گے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے ملک میں مکمل طور پر اردو کا عملی طور پر نفاذ کیا جائے پھر اردو کالج کو اردو یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے۔

پروفیسر شاہد عثمانی

صدر شعبہ اسلامیات

جواب نمبر ۱:- مجھے قطعاً دشواری محسوس نہیں ہوتی بلکہ طلباؑ کو سمجھانے میں خاصی آسانی ہوتی ہے کیونکہ اگر ہم طلباؑ کو کسی دوسری زبان میں تعلیم دیں یا سمجھائیں تو پہلی بات یہ ہوگی کہ طلباؑ کو وہ زبان سکھائیں اور اسکے بعد وہ علم جو طلباؑ حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لئے عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ دوسری زبانوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اسمیں تعلیم کا بیشتر حصہ زبان سیکھنے میں ہی صرف ہو جاتا ہے۔

جواب نمبر ۲:- جب تک اردو زبان سرکاری دفاتر میں رائج نہیں ہوگی اسوقت تک اردو زبان ملک میں رائج نہیں ہو سکتی اسکے ساتھ ساتھ اردو ذریعہ تعلیم ہونا چاہئے۔ اور سرکاری و غیر سرکاری تمام اقدامات اردو زبان میں ہونے چاہئیں۔

جواب نمبر ۳:- میں اردو کالج کے ماحول سے مطمئن ہوں لیکن طلباؑ کی اصلاح کا عمل جاری رہنا چاہئے کراچی کے دو کالج کہ جہاں مخلوط تعلیم ہے انکی نسبت اردو کالج کا ماحول بہت بہتر ہے۔ اور طلباؑ و طالبات کو چاہئے کہ وہ کالج کی فضا کو خوشگوار رکھنے کیلئے اپنے اساتذہ سے تعاون کریں۔

جواب نمبر ۴:- اس اقدام سے اردو زبان میں مزید ترقی ہوگی اور یہ ہماری حکومت کا ایک نہایت اہم قدم ہے۔ حالانکہ اردو زبان ہماری قومی زبان ہونے کے باوجود ابھی تک پورے ملک میں عملی طور پر رائج نہیں ہو سکی اور کوئی قوم اسوقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اسکے عقائد، نظریات اور زبان ایک نہ ہوں اس پر پوری طرح عملدرآمد نہ ہو۔

اردو کالج کا اردو یونیورسٹی میں تبدیل ہونا ہم سب کے علاوہ طلباؑ کے لئے بھی خوشی کا باعث ہے اور اس اردو یونیورسٹی سے نہ صرف پاکستان بلکہ بیرونی ممالک کے طلباؑ بھی استفادہ کر سکیں گے اور یقیناً ملک کی دوسری جامعات بھی اردو یونیورسٹی کی تقلید کر سکیں گی۔

پروفیسر اشفاق احمد ہاشمی

صدر شعبہ کیمیا

جواب نمبر ۱:- جی نہیں! میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتا میں خود یہاں کا طالبعلم رہا ہوں اسلئے مجھے قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

جواب نمبر ۲:- پرائمری سے لیکر اعلیٰ ثانوی جماعتوں تک اردو زبان میں تعلیم دینی چاہئے اسکے علاوہ سرکاری پیمانے پر تمام سرکاری دفاتر میں مختلف خانہ پری کے لئے گوشوارے اردو زبان میں ہونے چاہئیں اسکے علاوہ مقابلے کے تمام امتحانات مکمل طور پر اردو زبان میں ہونے چاہئیں۔

جواب نمبر ۳:- اردو کالج کی طلباء تعداد اسوقت تقریباً تین

ہزار (۲۴۰۰۰) ہو چکی ہے لہذا اتنے بڑے تعلیمی ادارے میں کسی آئیڈیل نظم و ضبط کی توقع نہیں کرنا چاہئیے۔ جسطرح سے پورے معاشرے میں نظم و ضبط چل رہا ہے اسی قسم کا نظم و ضبط ہمارے ادارے میں بھی ہے لیکن یہ بات میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ کراچی کے مخلوط اداروں میں مثال کے طور پر جامعہ کراچی جو کہ ہمارے کالج سے صرف تین میل کے فاصلے پر واقع ہے اگر اسکا موازنہ ہمارے کالج سے کیا جائے تو اس کالج کا ماحول جامعہ کراچی کے ماحول سے بہت بہتر ثابت ہوگا

جواب نمبر ۳:۔ میرے خیال میں یہ سوال مبہم ہے کیونکہ اردو کالج میں ایم۔ ایس سی کی کلاسوں کا باقاعدہ آغاز ہو چکا ہے۔ اور ریاضی، طبیعات و حیوانیات کی درس و تدریس کا عمل جاری ہے۔ چونکہ ہمارا کالج ایک وفاقی ادارہ ہے لہٰذا اگر اس کو جامعہ کا درجہ دے دیا جائے تو وفاق کے سارے صوبوں سے اردو زبان میں اپنی تعلیم حاصل کرنے والے بے شمار طلباء اس سے استفادہ کرینگے جس سے قومی زبان کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوگا اور بحیثیت ایک زندہ قوم ہم اپنی زبان پر مزید فخر محسوس کریں گے اور اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینا ملک و قوم کے مفاد میں ہے۔

پروفیسر افسر علی بیگ

صدر شعبہ ارضیات

جواب نمبر ۱:۔ جی نہیں! کبھی بھی دشواری محسوس نہیں ہوتی بات یہ ہے کہ درس و تدریس کا جو سلسلہ ہے وہ مادری زبان یا قومی زبان میں ہونا چاہیئے چونکہ میری مادری زبان اردو ہی ہے اسلیئے مسئلہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ میں نے تعلیم انگریزی زبان میں حاصل کی لیکن اردو زبان سے ہمیشہ ہی لگاؤ رہا چنانچہ زمانۂ طالبعلمی میں بھی اکثر و بیشتر انگریزی مضامین کا اردو زبان میں ترجمہ کرتا تھا اس وجہ سے اردو سائنس کالج میں اردو پڑھانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

جواب نمبر ۲:۔ خاص طور پر عدالت کی زبان اردو ہونا چاہئیے اسکے علاوہ دیگر دفاتر کی زبان بھی اردو ہو اسکے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں میں خاص طور پر میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں وغیرہ میں بھی درس و تدریس اردو زبان میں ہونا چاہئیے۔

جواب نمبر ۳:۔ میری نظر میں اردو سائنس کالج کا ماحول بہ نسبت ان کالجوں کے جہاں مخلوط تعلیم ہے بہت بہتر ہے اگرچہ اسٹاف کی کمی ہے لیکن اساتذہ میں تعاون کی فضا نہایت اچھی ہونے کی وجہ سے کمی محسوس نہیں ہوتی اگر طلبا و طالبات اپنے اساتذہ کے ساتھ تعاون کریں تو ہمارا کالج ایک مثالی کالج کہلائے گا

جواب نمبر ۴:۔ اردو کالج کو جامعہ بنانے کے سلسلے میں اقدامات ہونے والے ہیں جسکی وجہ سے نتائج نہایت عمدہ ہونگے بابائے اردو نے جو خواب دیکھا تھا جو اقدامات ان کے خواب اردو یونیورسٹی کی شکل میں اسکی تعبیر ملنے والی ہے اسکے اثرات پورے ملک پر مرتب ہونگے اور اردو بولو، پڑھو، لکھو کا چرچا ہر طرف ہوگا۔

اردو کالج کے جامعہ بننے سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ اردو میں اتنی وسعت ہے کہ یہ نہ صرف پاکستان کی تعلیمی زبان بلکہ دفاتر کی بھی زبان ہو سکے گی۔ یہ تجربہ پہلے بھی کامیاب ہوا تھا انشاء اللہ اب بھی کامیاب ثابت ہوگا۔

پروفیسر قیصر عباس

جواب نمبر ۱:- مجھے کبھی بھی دشواری نہیں ہوتی کیونکہ اوّل تو ہم نے اردو کالج سے اپنی تعلیم مکمل کی ہے، دوئم ہماری قومی اور مادری زبان اردو ہے لہٰذا درس و تدریس میں کبھی بھی پریشانی نہیں ہوتی۔

جواب نمبر ۲:- جب تک ملک کے تمام بلند ترین لوگ یعنی اعلیٰ سرکاری حکام اور افسرانِ بالا اور درس و تدریس جیسے پیشے سے منسلک لوگ اردو کو نہیں اپنائیں گے اور بذاتِ خود اردو کالج سے وابستہ لوگ اپنے بچوں کو یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل نہیں کروائیں گے اسوقت تک ہمارے ملک کی سرکاری زبان اردو نہیں بن سکتی۔

جواب نمبر ۳:- جی نہیں! میں کالج کے ماحول سے مطمئن نہیں ہوں کیونکہ کالج میں مکمل طور پر نظم و ضبط نہیں پایا جاتا اور اسکی سب سے بڑی وجہ اساتذہ کی تعداد میں کمی ہے لیکن ماحول کو بہتر بنانے کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ کالج کے اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کیا جائے تاکہ اساتذہ بہتر طور طالبعلموں کی اصلاح کر سکیں۔ اور طلباء کو ہر طرح کی سہولتیں میسر آسکیں۔

جواب نمبر ۴:- یہ بات ہمارے لیئے باعثِ فخر ہے اور یہ حکومت کا نہایت عمدہ اور اہم قدم ہے۔ اس اردو یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کیا ہوا طالبعلم اپنی عملی زندگی میں بھی ایک اچھا اور با اصول شہری ثابت ہوگا لیکن یہ جب ممکن ہے جبکہ طلباء کو وہی سہولتیں مہیا کی جائیں جو باقی تمام یونیورسٹیوں کے طلباء کو مہیا کی جاتی ہیں۔

پروفیسر رشید خان لودھی

جواب نمبر ۱:- بالکل کوئی دشواری نہیں ہوتی بلکہ راحت محسوس ہوتی ہے کیونکہ یہ ہماری قومی زبان ہے اور ہر پاکستانی کو اپنی قومی زبان میں تدریسی فرائض انجام دینے میں فخر محسوس ہوتا ہے۔

جواب نمبر ۲:- تمام سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں اردو زبان کو سختی کے ساتھ نافذ کرایا جائے اسلیئے کہ جب تک سخت قدم نہ اٹھائیں یہ نافذ نہیں ہوگی۔ اور یہ مسئلہ گذشتہ تیس سال سے التوا میں پڑا ہوا ہے۔ تعلیمی اداروں میں بھی اردو نافذ ہونا چاہئیے تاکہ پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہو۔

جواب نمبر ۳:- کالج کا ماحول اساتذہ پر منحصر ہوتا ہے اور اگر اساتذہ و طلباء آپس میں تعاون کریں تو ماحول بہتر ثابت ہوسکتا ہے اور یہ اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ طلباء کو اپنی زبان میں لکھا کردار اور اسکی اہمیت کے بارے میں بتائیں جب تک اپنی زبان کے بارے میں اسکی سوچ اور فطرت کے بارے میں نہیں بتائیں گے اردو زبان ترقی نہیں کرے گی۔ اسکے ساتھ ساتھ طلباء کو چاہیئے کہ وہ اساتذہ کے ساتھ ملکر کالج کے نظم و ضبط کو برقرار رکھنے میں تعاون کریں۔

جواب نمبر ۴:- جہاں تک یونیورسٹی کا تعلق ہے تو یہ بہت اہم قدم ہے کیونکہ پاکستان میں ایک اردو یونیورسٹی ہونی چاہیئے جیسا کہ تمام دنیا میں مختلف ممالک میں ہے اور بیشتر قومی مسائل اردو ترقی کے ذریعے حل کیئے جاسکتے ہیں اردو زبان میں درس و تدریس اور مشاہدات و نظریات آسانی سے پیش کرسکتے ہیں اور مجھے فخر ہے کہ اگر اردو کالج کو یہ درجہ

ے دیا جائے تو ہم سب کے لیئے بہت خوشی اور فخر کا باعث ہے کہ اس یونیورسٹی میں تمام سائنسی مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اور پڑھائے جائیں گے اور بہت سے پوسٹ گریجویٹ طلبا اس سے استفادہ کر سکیں گے

اسمٰعیل آدم صاحب

صدر شعبہ سندھی

جواب نمبر ۱:۔ جہاں تک اردو زبان میں درس و تدریس کا تعلق ہے مجھے اس میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی اسکی خاص وجہ یہ ہے کہ میں نے سندھی کے ساتھ ساتھ اردو بھی پڑھی ہے اور اسکے علاوہ میٹرک کے علاوہ کالج سے لیکر یونیورسٹی تک تمام مضامین کے امتحان اردو میں پاس کیئے ہیں اور ویسے بھی کراچی سے تعلق ہونے کی وجہ سے اردو زبان سے بہت زیادہ رابطہ رہا ہے کیونکہ یہاں پر سب سے زیادہ اردو بولی جاتی ہے اسلیئے اس معاملے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

جواب نمبر ۲:۔ حکومت اردو زبان کو سرکاری زبان قرار دے چکی ہے اور جہاں تک اسکے نفاذ کا تعلق ہے تو میرے خیال میں اسکے نفاذ کا سلسلہ نچلی سطح سے شروع ہونا چاہیئے۔ جن اداروں کا تعلق عوام سے زیادہ رہتا ہے وہاں پر فوراً دفتری کام اور عوام کے لیئے دیگر اطلاعات و اعلانات وغیرہ اردو زبان میں ہونے چاہئیں اسکے علاوہ تمام تعلیمی اداروں میں بھی ذریعہ تعلیم اردو قرار دی جائے اور اسکے ساتھ ساتھ اردو زبان میں کتابیں وغیرہ مہیا کی جائیں۔ عدالتوں اور دیگر محکموں میں بھی جلد سے جلد اردو زبان کو لازمی قرار دیا جائے اسطرح آہستہ آہستہ کچھ عرصے بعد یہ زبان خود بخود مکمل طور پر سرکاری زبان کا رتبہ حاصل کرلے گی۔

جواب نمبر ۳:۔ جہاں تک کالج کے ماحول سے مطمئن ہونے کا تعلق ہے تو میں کالج کے ماحول سے مطمئن تو ہوں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں اصلاح کا عمل جاری رکھنا چاہیئے اور یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ تمام طلبا و طالبات اس ذمہ داری کو محسوس کریں۔

جواب نمبر ۴:۔ ہمارا اردو سائنس کالج کراچی کے تمام سائنس کالجوں کے مقابلے میں بڑا ہے اسکے علاوہ یہ واحد سائنس کالج ہے جہاں سائنس کے تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہیں اور جہاں تک یونیورسٹی کا تعلق ہے تو یہاں پر اب بھی یونیورسٹی کی سطح تک کی کلاسیں ، ایم۔ ایس سی پڑھائی جاتی ہیں اور اب صرف درجہ دینے کی بات رہ جاتی ہے کہ یہ یونیورسٹی کا درجہ دینے کے ساتھ ساتھ اسکے لیئے زمین اور فنڈ بھی دیئے جائیں تاکہ اسکو مکمل یونیورسٹی بنایا جا سکے۔

محمد اقبال خان صاحب

صدر شعبہ شماریات

جواب نمبر ۱:۔ ویسے تو کوئی دشواری نہیں ہوتی لیکن کتابوں کی کمی کی وجہ سے بعض اوقات دشواری محسوس ہوتی ہے۔ اگر ایسی کتابیں مہیا کی جائیں جن میں اصطلاحات اردو میں دی جائیں تاکہ ہمیں سمجھنے اور پڑھانے میں آسانی ہو اور طلبا بھی آسانی محسوس کریں۔

جواب نمبر ۲:۔ سب سے پہلے حکومت کے تمام سرکاری

ونیم سرکاری اداروں میں اردو نافذ ہونی چاہئیے کیونکہ ہمارے ملک میں تمام اداروں نے انگریزی کو قابلِ ترجیح ہے مثلاً کسی بھی ملازمت کے سلسلے میں ان اداروں میں امیدوار سے انٹرویو وہ انگریزی میں لیتے ہیں اگر وہ اردو زبان میں انٹرویو لیں تو انہیں لوگوں کی قابلیت کا اندازہ ہوگا اسکے علاوہ تمام تعلیمی اداروں میں بھی اردو نافذ ہونی چاہئیے۔

جواب نمبر ۳ ا۔ اردو کالج کے ماحول سے میں مطمئن ہوں اسلیئے کہ یہاں کا ماحول بہ نسبت دوسرے مخلوط تعلیمی اداروں کے بہتر ہے۔ لیکن اس میں بھی مزید اصلاح کی ضرورت ہے۔ طلباؔ و طالباتؔ کو چاہئیے کہ وہ اپنے اساتذہ سے تعاون کریں تاکہ کالج کا ماحول ایک آئیڈیل ماحول ثابت ہو سکے گا۔

جواب نمبر ۱۔ یہ حکومت کا بہت اچھا قدم ہے اور طلباؔ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے لیئے بھی خوشی و فخر کا باعث ہے اس اردو یونیورسٹی کے پورے پاکستان میں بہت اہمیت ہوگی کیونکہ یہ ملک کی وہ واحد یونیورسٹی ہوگی جہاں کہ تمام سائنسی علوم اردو میں پڑھائے جائیں گے اور ملک کے تمام صوبوں کے طلباؔ اس سے استفادہ کر سکیں گے اور ظاہر ہے کہ اس یونیورسٹی کا نتیجہ بھی بہت بہتر ہوگا۔

وسیم احمد صاحب

شعبہ حیاتی کیمیا

جواب نمبر ۱۔ مجھے اردو زبان میں پڑھانے میں انگریزی کے مقابلے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے کیونکہ انگریزی میں وہ روانی پیدا ہو ہی نہیں سکتی جو ہمیں اردو میں حاصل ہے کیونکہ اردو ہماری قومی زبان ہے اور میں یہ کہنا پسند کروں گا کہ ہمارے ملک میں درس و تدریس کے لیئے اردو سے بہتر کوئی زبان نہیں ہے کیونکہ اس میں اساتذہ بہ آسانی ... منتقل کر سکتے ہیں اور کئی طریقوں سے سمجھا سکتے ہیں اور اس مقصد کیلیئے طرح طرح کی مثالیں دے سکتے ہیں۔ اردو زبان میں درس و تدریس میں ایک چھوٹی سی دشواری اصطلاحات کی کمی ہے جسکا دور کیا جانا اشد ضروری ہے دوسری طرف اصطلاحات کا حصول ایک مشکل کام ہے لہٰذا میرے خیال میں ہر مضمون کی اصطلاحات الگ حاصل کرنی چاہئیں۔ اور ہر مضمون کی اصطلاحات کے حصول کو پورے پاکستان میں آسان سے آسان کر دینا چاہئیے۔ انگریزی زبان میں درس و تدریس کا تاریک پہلو یہ ہے کہ وہ طالبعلم جو درسگاہ میں کچھ سیکھنے آیا ہے اسکی انگریزی بنیادی طور پر کمزور ہے کیونکہ یہ اسکی مادری زبان نہیں ہے خواہ وہ انٹرمیڈیٹ یا بی۔ایس سی کا طالبعلم ہو اسلیئے کہ اسے ایک طرف تو لیکچر سمجھ نہیں آتا دوسری طرف اسکے ذہن میں مختلف سوالات ہوتے ہوئے بھی وہ سوال کرنے سے قاصر ہے کیونکہ اسے سوال انگریزی میں کرنا پڑے گا اور اسکی انگریزی اس کام میں اسکا ساتھ نہیں دیتی۔

جواب نمبر ا۔ اردو کو صحیح مقام ملنے کی راہ میں رکاوٹ لوگوں کا وہ مخصوص گروہ ہے جو یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ بڑا آدمی نہ رہے کیونکہ اسکی دانست میں وہ بڑا اسلیئے ہے کہ وہ بہت اچھی انگریزی جانتا ہے جو اسکے ماتحت نہیں جانتے خواہ اسکے پاس مطلوبہ معیار کی قابلیت نہ ہو لیکن اگر اردو زبان رائج ہو گئی تو ہو سکتا ہے کہ اسکے ماتحت اس سے اچھی اردو جانتے ہوں اسلیئے اسکا احساس برتری اسی دن ختم ہو جائے گا اسلیئے میری رائے کے مطابق اس رکاوٹ کو دور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ میرے خیال میں اردو کو سرکاری

زبان بنانے کیلئے پورے پاکستان میں ہر قسم کے انگریزی اسکولوں کا فوری خاتمہ، دفتروں، عدالتوں، بینکوں اور دوسرے اداروں میں اسکا بتدریج استعمال، اردو میں ہر قسم کی کتب کی باآسانی فراہمی ہر سرکاری یا نجی محفل میں خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو اردو کا آزادانہ استعمال اور اسے اپنے لئے باعثِ فخر سمجھنا انتہائی ضروری ہے اس مقصد کے لیئے حکومت کو چاہیئے کہ ہر اس ادارے کا سختی سے نوٹس لے جہاں انگریزی کا آزادانہ استعمال ہو رہا ہے اسکے علاوہ انگریزی اور دوسری زبانوں میں موجود بہترین کتب کا اردو میں ترجمہ کرنے کیلئے ایک بڑے دارالترجمہ کی ضرورت ہمیں پیش آئے گی، اگر ہم جاپان، جرمنی اور فرانس وغیرہ پر نظر ڈالیں تو ان قوموں نے بھی اپنی زبان کو فروغ دیکر ہی ترقی کی اور جلد ہی ساری دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔

جواب نمبر ۸:- اردو کالج کا ماحول میرے خیال میں تو کراچی کے دوسرے کالجوں کے ماحول سے بہتر ہے کیونکہ یہاں طالبعلموں میں پڑھنے کا رجحان بھی ہے۔ اور اساتذہ بھی پڑھانا چاہتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ماحول بہتر ہے اور روز بروز بہتر ہوتا جائیگا اس ماحول کو بہتر بنانے میں طلباء اور اساتذہ ذہنی طور پر ملکر بہت اچھا کردار ادا کر سکتے ہیں اس عمل میں طلباء اسطرح حصہ لے سکتے ہیں کہ وہ اپنی تعلیم پر زیادہ اور دوسری سرگرمیوں میں کم حصہ لیں اور اپنے آپ کو ایک اچھا مہذب، خوش اخلاق اور قابل طالبعلم بنانے کی کوشش کریں جبکہ اساتذہ اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھائیں اور طلباء کو ایک قابل، خوش اخلاق، مہذب اور مستقبل کے لیئے ایک کارآمد شہری بنانے پر اپنی توجہ صرف کریں جیسا کہ وہ اب بھی کر رہے ہیں۔

جواب نمبر ۹:- اردو کالج کو اگر یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اردو کالج کی اہمیت اور افادیت میں بہت اضافہ ہو جائے گا کیونکہ اس طرح وہ طالب علم جو اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن اردو زبان میں تعلیم اسلیئے حاصل نہیں کرتے کہ انٹر یا گریجویشن کرنے کے بعد جب وہ میڈیکل یا انجینئرنگ کالج کا رخ کرتے ہیں تو وہاں چونکہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہوتا ہے اسلیئے انکو سمجھنے میں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔ اگر اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ مل جائے گا تو وہ طالبعلم جو مختلف مضامین میں ایم۔ ایس سی، ایم۔ اے اور ایم کام کرنا چاہتے ہیں وہ بجائے انگریزی کے اردو ذریعہ تعلیم کو اپنائیں گے اور اردو کالج میں داخلہ لینا چاہیں گے دوسری طرف ابھی جو لوگ ایم۔ ایس سی کرتے ہیں انمیں سے تقریباً ۵۰ فیصدی لوگ صحیح طور پر تعلیم حاصل نہیں کر پاتے کیونکہ انگریزی میں انہیں سمجھنے، سوالات کرنے اور مستقبل کے لیئے اپنے آپ کو تیار کرنے میں خاصی دشواری پیش آتی ہے جبکہ اردو میں انکی ساری پریشانی رفع ہو جائیگی اور اسطرح ان لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوگی جو اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور دوسری طرف اردو کو فروغ حاصل ہوگا اور اس طرح ایسے لوگ میدان میں آئینگے جن سے دفتروں اور دوسرے اداروں میں اردو رائج کرنے میں خود بخود آسانیاں پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔

اقبال عالم صاحب

شعبہ خورد حیاتیات

جواب نمبر ۱:- مجھے کوئی دشواری نہیں ہوتی کیونکہ اردو میں مطبوعہ مواد حاصل ہو جاتا ہے اور باقی ماندہ مواد کا خود انگریزی کتب سے ترجمہ کر لیتا ہوں۔ اردو کتب کی فراہمی چونکہ ایک مسئلہ بنی ہوتی ہے لہٰذا اردو میں اصطلاحات کی کمی کے باعث کبھی کبھار دشواری پیش آتی ہے۔

جواب نمبر ۲:-

تمام سائنسی کتب کا اردو ترجمہ کیا جائے اسکے علاوہ اساتذہ کو اردو زبان میں پڑھانے کیلئے تربیت کا انتظام کیا جائے کیونکہ اکثر وہ خود تو انگریزی میڈیم سے پڑھ کر آتے ہیں اس سلسلے میں اردو کالج کے سینیئر اساتذہ سے مدد لی جائے۔

جواب نمبر ۳:- دوسرے کالجوں کے مقابلے میں یہاں کا ماحول بہتر ہے۔ کسی بھی کالج کے ماحول کا معیار بتدریج ہی درست ہو سکتا ہے جسکی ابتدا ہو چکی ہے۔

جواب نمبر ۴:- ایسا بالکل ہونا چاہئیے کیونکہ قومی زبان میں درس و تدریس از حد ضروری ہے کیونکہ ہم اپنے تعلیمی معیار کو اس مقبولی پر استوار کر سکیں جو کہ قوم کی سائنسی اور علمی نشو و نما میں نہ صرف یہ کہ معاون ثابت ہوں بلکہ ایسا معیار اور مقدار فراہم کر سکے جسکی مثال کہیں نہ ملتی ہو۔

ڈاکٹر بلقیس جہاں

صدر شعبہ جغرافیہ

جواب نمبر ۱:- جی ہاں تھوڑی بہت دشواری ہوتی ہے کیونکہ کتابیں خالصتاً اردو زبان میں نہیں ہیں۔ بہت سی کتابوں میں انگریزی میں اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں اگر انکے معنی بھی ساتھ ہی دیئے جائیں تو ہم بہتر انداز میں سمجھا سکتے ہیں۔

جواب نمبر ۲:- تمام تعلیمی اداروں میں اور دفاتر کے ساتھ ساتھ پاکستانی عوام کو بھی چاہیئے کہ وہ اردو زبان کو اپنائیں تاکہ اردو زبان کو صحیح معنوں میں وہ حیثیت حاصل ہو جائے جو واقعی اسے ہونی چاہیئے۔

جواب نمبر ۳:- جی نہیں میں اردو کالج کے ماحول سے مطمئن نہیں ہوں لیکن پھر بھی دوسرے تمام مخلوط کالجوں کے مقابلے میں اردو کالج کا ماحول تھا سا بہتر ہے میرے مطمئن نہ ہونے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ کالج میں ابھی اساتذہ کی کمی ہے۔ دیگر یہ کہ یہاں پر ابھی مزید اصلاح کی ضرورت ہے تاکہ کالج میں نظم و ضبط قائم ہو اور کالج کی فضا خوشگوار اور پرسکون ہو سکے۔

جواب نمبر ۴:- یہ اردو کالج کے لیئے بہت فخر کی بات ہے کیونکہ یہ پاکستان کی وہ پہلی اور واحد یونیورسٹی ہوگی کہ جس میں تمام سائنسی مضامین اردو زبان میں پڑھائے جائیں گے۔ اسطرح بہت سے طالبعلم اس یونیورسٹی سے استفادہ کر سکینگے اور ظاہر ہے کہ اس یونیورسٹی کا نتیجہ بھی اور یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بہت بہتر ہوگا اسطرح اردو یونیورسٹی کی اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہوگا اور ملک کی دوسری تمام یونیورسٹیوں کے لیئے یہ ایک قابلِ تقلید مثال ہوگی۔

یہ تو تھے ان تمام اساتذۂ کرام کے تاثرات جو سوالوں کی صورت ہم نے ان سے معلوم کیئے۔ لیکن صاحب ہم آپکو ایک بات بتلاتے چلیں کہ جب ہم نے تمام اساتذہ سے یہ سوال ، پوچھا کہ وہ کونسے اقدام ہیں کہ جنکے نافذ کرنے سے اردو زبان سرکاری زبان بن جاتے ؟

تو تقریباً ہر استاد نے ہماری اور تمام اعلیٰ حکام کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ اردو زبان کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ اردو کتب کی فراہمی کا مسئلہ ہے اردو میں کتب کی بے انتہا کمی ہے اگر اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا جائے یعنی اردو کتب کی فراہمی پہلے سے زیادہ اچھی طرح ہو اور تمام معیاری کتب طلباً اور اساتذہ کو فراہم کی جائیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ اردو زبان بہت جلد سرکاری زبان نہ بن جائے۔

تو جناب چونکہ یہ مسئلہ نہ صرف تمام یونیورسٹیوں ، کالجوں ، سرکاری و نیم سرکاری اداروں اور تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ ہمارے کالج کے لیئے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے چنانچہ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اس سلسلے میں ہم اپنے کالج کے لائبریرین جناب مختار اشرف صاحب سے اردو زبان ، اردو کالج اور لائبریری کے مسئلے پر انکے تاثرات معلوم کریں۔ تو آیئے چلتے ہیں اپنے کالج کے لائبریرین جناب مختار اشرف صاحب کے پاس اور دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے سوالوں کا جواب کس انداز سے دیتے ہیں۔

مختار اشرف

لائبریرین

جواب ۱ :۔ جہاں تک اردو زبان کے نفاذ کا تعلق ہے تو وہ ایک دم سے تو نافذ ہو نہیں سکتی اسکے لیئے تو بتدریج کام کرنا پڑے گا مثلاً طلباً و طالبات کو پرائمری درجے سے اردو میں تعلیم دینی چاہیئے اسکے علاوہ جتنے پرائمری اسکول قائم ہو رہے ہیں وہ انگریزی زبان میں تعلیم دے رہے ہیں اور ہمارے ہاں کا جتنا بھی تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو کہ پاکستان میں ۱۵٪ فیصد ہے وہ اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں تعلیم دلوانے میں فخر محسوس کرتا ہے تو آپ بتائیں کہ کیونکر اردو زبان کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ صرف ہم کانفرنس کر کے یا اخبارات و رسائل میں اسکا پرچار کرتے ہیں اس طریقے سے تو اردو عام نہیں ہو سکتی۔ اسکے لیئے عملی طور پر قدم اٹھانا پڑے گا۔

جواب نمبر ۳ :۔ اردو کالج کے ماحول کے متعلق یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہاں کا ماحول دوسرے کالجوں سے منفرد ہے آپ یہاں کے اساتذہ کو لیں وہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہیں ان میں یکجہتی اور بھائی چارے کی بہترین فضا قائم ہے۔ جناب اکرام الرحمٰن صاحب جو کالج کے پرنسپل ہیں انکا اپنے رفقا کار کے ساتھ نہایت ہی مشفقانہ اور ہمدردانہ رویہ ہے اسکے ساتھ ساتھ طلباً و طالبات کا جہاں تک تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ ہر کالج میں تمام طلباً تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن یہاں کچھ انفرادیت ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کا بےحد احترام کرتے ہیں

جواب نمبر ۴ :۔ اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے کیونکہ یہ ملک کا ایک منفرد کالج ہے اسکی یونیورسٹی کی اہمیت بھی ملک میں منفرد ہوگی۔

اردو کالج کی موجودہ لائبریری کے مسائل و وسائل اور نئی لائبریری سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ موجودہ

لائبریری جو کالج کے مولوی عبدالحق ہال میں ہے یہ کالج کے طلباء و طالبات کیلئے ناکافی ہے کیونکہ کالج میں طلباء و طالبات کی تعداد تقریباً تین ہزار ہے جبکہ لائبریری میں بیک وقت بیٹھنے کی گنجائش تقریباً ساٹھ طلباء و طالبات کی ہے اسکے ساتھ ساتھ جیسا کہ ہمارے ملک میں اردو زبان میں سائنسی کتب کی دستیابی نایاب ہے یہی وجہ ہے کہ اردو سائنس کالج میں بھی جو کتب دستیاب ہوتی منگوالی جاتی ہیں لیکن بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ہمارے ہاں اردو زبان میں سائنسی کتابیں لکھنے کا بہت کم رجحان پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لائبریری میں سائنسی مضامین پر انگریزی زبان میں کتابیں منگوائی جاتی ہیں جو کہ کافی قیمتی ہوتی ہیں اسکے لیئے فنڈ کی بھی کافی ضرورت ہوتی ہے لیکن اب جبکہ اردو سائنس کالج کی نئی عمارت تعمیر ہو رہی ہے اسطرح کافی مسائل حل ہو جائینگے۔ اردو سائنس کالج کی نئی لائبریری جسکا سنگِ بنیاد جناب وفاقی وزیر تعلیم محمد علی خان نے رکھا تھا اسکے لیئے جناب صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے تقریباً اسّی لاکھ روپے کی امداد دی۔ اسکا پہلا مرحلہ ۱۹۸۰ء کے آخر تک مکمل ہو جائے گا جسمیں طلبا و طالبات کے علیحدہ علیحدہ کمرۂ مطالعہ، حوالہ جاتی کمرہ، اسٹیک روم اور کیٹلاگ روم وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرے مرحلے میں مطالعے کا کمرہ، اسمبلی روم، ریسرچ روم وغیرہ شامل ہیں جو کہ انشاءاللہ ۱۹۸۱ء تک تکمیل کے مراحل طے کرے گی اور امید ہے کہ ضروریات کے تحت لائبریری کے عملے میں بھی اضافہ ہوگا۔ اسکے ساتھ ساتھ لائبریری کیلئے ایک عدد فوٹو کاپیئر بھی منگوایا گیا ہے جس سے نایاب کتب کی دشواریوں کا ازالہ کیا جا سکے گا۔ ہمارے ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اساتذہ میں مطالعہ کا رجحان تو پایا جاتا ہے لیکن ایک چیز جو آج کل کے اساتذہ میں مفقود ہے کہ اپنے مضمون میں جو سائنسی ایجادات و تصورات سامنے آ رہی ہیں انکا مطالعہ نہیں کر رہے اسکے بجائے جو کچھ انہوں نے اپنے اساتذہ سے سیکھا تھا اسی پر انحصار کرتے ہیں اسی طرح طلباء میں بھی تقریباً وہی رجحان ہے کہ وہ اپنی ٹیکسٹ بک کے علاوہ ان مضامین پر دوسری کتابیں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنے اساتذہ کی بتائی ہوئی کتب پر انحصار کرتے ہیں اسکے علاوہ ایسی کتب کی تلاش میں رہتے ہیں جنمیں سے انہیں امتحانی سوالات سے متعلق سارا مواد مل جائے

ہم نے اپنے کالج کے غیر تدریسی عملے کے بھی بعض سینئر افراد کے تاثرات قلمبند کیئے ان سے ہم نے جو سوالات پوچھے وہ یہ ہیں:۔

۱۔ وہ کونسے اقدامات ہیں جنکے نافذ کرنے سے اردو زبان بہت جلد سرکاری زبان بن سکتی ہے۔

۲۔ اردو کالج کے ماحول میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان پر روشنی ڈالیں۔

۳۔ اگر اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے تو اسکی کیا اہمیت ہوگی۔؟

سب سے پہلے چلتے ہیں اپنے کالج کے سینئر کلرک رزاق صاحب کے پاس۔

عبدالرزاق صاحب

سینئر کلرک

جواب نمبر ۱ قومی زبان اردو کو سرکاری، دفتری اور نجی اداروں میں سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ کرنے کیلئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ اردو کی اصطلاحات مرتب کی جائیں اور اس طرح

کسی نے بھی توجہ نہیں دی ہے۔ اس کام کیلئے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی، مرکزی اردو بورڈ لاہور اور مقتدرہ کراچی کو فوری توجہ دینی چاہیئے۔

۔ طبی اور انجینئرنگ کی کتب کی اشاعت اس سلسلے میں خاص توجہ طلب ہوگی لیکن اگر ہمارے اعلیٰ حکام اس امر کی جانب توجہ دیں تو یہ کام مشکل نہیں۔

جواب نمبر۲ :- اردو کالج کے ماحول کے متعلق آپ نے کہا کہ تعلیمی ادارہ شروع سے اب تک نہایت خوشگوار ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہے اور کالج کی انتظامیہ کی ہر ممکن کوشش یہی رہی ہے کہ اور کافی حد تک اس میں کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ دوسری طرف تدریسی و غیر تدریسی عملہ جو اس کالج میں موجود ہے شاید ہی پاکستان کے کسی دوسرے ادارے کو میسر ہو۔ جب ہم نے ان سے پوچھا کہ ماحول میں شروع سے اب تک کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں تو انہوں نے کہا کہ شروع میں تعلیمی اداروں میں طلباء میں کوئی سیاسی شعور نہ تھا اور دوسری طرف جیسا کہ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۰ء تک اس کالج میں طلباء کی تعداد شاید ۴۰۰ (چارسو) تک تھی اور اس وقت کی تعداد تقریباً تین ہزار کے قریب ہے جو تعلیمی ماحول کی تبدیلی کا ایک بہترین ثبوت ہے لہٰذا شروع اور آخر کے درمیان تبدیلی رونما ہونا خواہ تعمیری ہو یا تخریبی یہ ایک فطری امر ہے اور اس کالج میں ایسا ہی ہوا ہے۔

جواب نمبر۳ :- پاکستان کا قیام نظریاتی بنیادوں پر عمل میں آیا اور عوام کی اکثریت اردو بول، لکھ اور پڑھ سکتی ہے۔ اردو یونیورسٹی کا قیام اس سے پہلے ہی ہو جانا چاہیئے تھا۔ اگر اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا تو یہ فیصلہ عوام کی مذکورہ بالا امنگوں کے عین مطابق ہوگا اور

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہر ملک اپنی قومی زبان میں ترقی کر کے بہتر نتائج حاصل کر سکتا ہے۔ جو چیز ہم اردو زبان، اصلاح اور دیگر لغات میں تلاش نہیں کر پاتے اپنی زبان میں بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں موجودہ عمارت میں تعمیر و توسیع کا کام جاری ہوا جو آپکے سامنے ہے۔ پہلی منزل کی تعمیر مکمل ہونے والی ہے رنگ و روغن کا کام جاری ہے اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کالج کٹھن مراحل سے نکل کر اب رفتہ رفتہ ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اور مولوی عبدالحق یادگاری کتب خانے کا کام بھی آپکے سامنے ہے۔

ہمارے کالج کے مختلف شعبوں کی تجربہ گاہوں میں کئی صاحبان ایسے ہیں جو تجربہ گاہ میں مددگار کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اور کالج سے تقریباً ۲۰ ـ ۲۵ سال سے منسلک ہیں۔ ایمن محمد بشیر صاحب، محمد علی صاحب اور محمد اسرائیل صاحب شامل ہیں۔ ہم نے ان تینوں حضرات کے تاثرات قلمبند کیئے اسکے ساتھ ہی ہم وہ سوال بتاتے چلیں جو ہم نے ان سے کیئے۔

١۔ آپکو تجربہ خانے میں کام کرتے ہوئے اردو میں چیزوں یا مختلف آلات وغیرہ کے ناموں کی وجہ سے کوئی دشواری تو پیش نہیں آتی۔ ؟
٢۔ وہ کونسے اقدامات ہیں جنکے نافذ کرنے سے اردو زبان بہت جلد سرکاری زبان بن سکتی ہے۔ ؟
٣۔ اردو کالج کے ماحول کے متعلق آپکے کیا تاثرات ہیں؟
۴۔ اگر اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے تو اسکی کیا اہمیت ہوگی۔

جناب بشیر لالہ صاحب
شعبہ ہیرا جانچ
لالہ

بشیر احمد
شعبہ حیوانیات

فائل

جواب نمبر ۱ :- ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوتی بلکہ اردو میں زیادہ سہولت ہوتی ہے۔

جواب نمبر ۲ :- اردو نافذ کرنے کیلئے اردو زبان کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ دفتری سرکاری اور تجارتی اداروں میں بھی زیادہ سے زیادہ اردو زبان استعمال ہو تمام اشتہارات وغیرہ بھی اردو میں ہوں۔

جواب نمبر ۳ :- ہمارے کالج کا ماحول اور دوسرے کالجوں کے مقابلے میں بہت زیادہ اچھا ہے لیکن یہاں طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اور گنجائش کم ہے لہٰذا پہلے نظم و ضبط نہیں پایا جاتا۔

جواب نمبر ۴ :- اگر اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا تو اسکی بہت زیادہ اہمیت ہوگی اور زیادہ سے زیادہ لوگ اپنی قومی زبان اردو میں تعلیم حاصل کر سکیں گے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ پاکستان کی پہلی اور واحد یونیورسٹی ہوگی جو قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنائے گی جس کی تقلید ملک کی دوسری جامعات بھی کر سکیں گی

محمد علی صاحب

شعبہ کیمیا

جواب نمبر ۱ :- ہمیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کام آتے ہیں اسلئے کوئی مشکل نہیں ہوتی۔

جواب نمبر ۲ :- کالج کا ماحول پہلے جیسا تو نہیں ہے لیکن پھر بھی دوسرے کالجوں کے مقابلے میں بہت بہتر ہے ویسے یہاں کے طالب علم آپس میں تعاون کرتے ہیں اساتذہ کا رویہ بھی اچھا ہوتا ہے اور اسکے علاوہ تجربہ خانوں میں کام کے دوران بھی آپس میں محبت سے رہتے ہیں لہٰذا مجموعی طور پر کالج کا ماحول بہت بہتر ہے۔

جواب نمبر ۳ :- اردو زبان کو نافذ کرنے کیلئے تمام تعلیمی اداروں اور دوسری جگہوں پر بھی تمام کام اردو میں کیئے جائیں۔ اردو زبان میں زیادہ سے زیادہ کتابیں شائع کی جائیں اور پاکستانی عوام اردو اپنانے میں فخر محسوس کر سکیں۔

جواب نمبر ۴ :- کالج کو اگر یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے تو یہ بہت خوشی کی بات ہوگی۔ کیونکہ یہ قومی زبان کی پہلی اور واحد یونیورسٹی ہوگی۔

محمد اسرائیل صاحب

شعبہ نباتیات

جواب نمبر ۱ :- اردو میں کام کرنے میں ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی بلکہ بہت زیادہ آسانی محسوس ہوتی ہے۔

جواب نمبر ۲ :- اسکے نافذ کرنے کیلئے تمام تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم اردو ہو اور ہر طرح کے سرکاری و نیم سرکاری کام اردو میں کیئے جائیں

جواب نمبر ۳ :- کالج کا ماحول پہلے کی طرح نہیں رہا کیونکہ پہلے تعداد بہت کم تھی اور اب طلباء کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی اور کالجوں کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔

جواب نمبر ۴ :- اگر یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا تو اسکی اہمیت بہت زیادہ ہوگی۔ اسکو تو بہت پہلے ہی یہ درجہ مل گیا ہوتا کیونکہ بابائے اردو نے اسی مقصد کیلئے یہ زمین حاصل کی تھی۔ لیکن ان کے انتقال کے باعث یہ کام التوائ

میں پڑا رہا۔ اب امید ہے کہ بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے گا۔

یہ تو تھے کالج کے غیر تدریسی عملے کے تاثرات آئیے اب ہم ان لوگوں سے سوالات کرنے چلیں جو مستقبل میں اس قوم کے معمار ثابت ہونگے جنکے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور ہوگی۔ اور جنکی رائے ہمارے لیئے کم از کم بحیثیت طالبعلم بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ چونکہ کالج میں طلباؑ و طالبات کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے اسلیئے ان سب کے تاثرات قلمبند کرنا تو ہمارے لیئے کافی پریشان کن مرحلہ تھا اسی لیئے ہم نے اپنے کالج کے ایم۔ایس سی سے لیکر سال اوّل تک کے چند طلباؑ و طالبات کی رائے لی یہ چند طلباؑ و طالبات ہمارے کالج کے تمام طلباؑ و طالبات کی جانب سے نمائندے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم ان طلباؑ و طالبات کے پاس چلیں آئیے ان سوالات کی طرف جو ہم ان سے پوچھیں گے۔

سوال نمبر ۱:- آپ نے اور کالجوں کے مقابلے میں اردو کالج کو ترجیح کیوں دی ہے؟

سوال نمبر ۲:- کیا آپ اردو ذریعہ تعلیم سے مطمئن ہیں۔؟

سوال نمبر ۳:- اردو کالج کی ترقی میں طلباؑ و طالبات کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔؟

سوال نمبر ۴:- اگر اردو کالج کو اردو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے تو بحیثیت طالبعلم آپ کیا محسوس کریں گے۔

تو آئیے سب سے پہلے چلتے ہیں ایم۔ایس سی فائنل کے طالبعلم ظہیرالدین صاحب کے پاس اور دیکھتے ہیں کہ انکے اردو زبان اور اردو کالج کے بارے میں کیا تاثرات ہیں۔

ظہیرالدین

ایم ایس سی (فائنل)

میں نے اردو کالج کو ترجیح اسلیئے دی ہے کہ یہاں پر ہماری مادری زبان اردو میں تعلیم دی جاتی ہے اور جہاں تک ذریعہ تعلیم سے مطمئن ہونے کا سوال ہے تو اسکے جواب میں میں یہ ہی کہوں گا کہ انسان کو ترقی کرنے کیلیئے مطمئن ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیئے بلکہ قائدِاعظم کے قول کے مطابق محنت اور کوشش کرنا چاہیئے۔

اردو ذریعہ تعلیم کی طرف لوگ مائل تو ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں کافی کام بھی ہوا ہے مگر اس کام کی تکمیل کیلیئے کافی وقت درکار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مصنفین حضرات بھی اردو میں اچھی کتابوں کے ترجمے کریں۔ تاکہ اردو ذریعہ تعلیم کی ترویج و ترقی ہو سکے۔ کالج کی ترقی میں طلباؑ کے کردار کے متعلق ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی ترویج میں طالبعلم جتنا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں شاید ہی کوئی اور کر سکے۔ مثلاً یہ لوگوں کو اردو ذریعہ تعلیم کی اہمیت سے واقف کرا سکتے ہیں اسکے علاوہ طالبعلم ساتھیوں کو چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اردو کالج میں داخلہ لیکر اردو زبان کی ترویج و ترقی میں اہم کردار ادا کریں۔

اگر کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے تو نہایت خوشی کی بات ہوگی اور میں ہی نہیں بلکہ سارے پاکستان کے طالبعلم اس بات پر فخر محسوس کر سکیں گے کہ یہ قومی زبان کی واحد اور پہلی یونیورسٹی ہوگی۔

شگفتہ

ایم ایس سی (سال اول)

میں نے اردو سائنس کالج کو صرف اسلیئے ترجیح دی کہ یہاں اردو زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اردو ذریعہ تعلیم سے میں بالکل مطمئن ہوں۔ اور اردو سائنس کالج کی ترقی میں طلباء اسی طرح مدد کر سکتے ہیں کہ وہ چاہے کچھ کریں یا نہ کریں لیکن کم از کم ہنگامہ بازی نہ کریں اور کالج کا ماحول خوشگوار رکھیں۔

اگر اردو سائنس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے تو یہ بہت خوشی کی بات ہوگی اور دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلے میں اسکی بہت زیادہ اہمیت ہوگی۔ کیونکہ یہ قومی زبان کی پہلی یونیورسٹی ہوگی۔ لیکن اسکے لئے ضروری ہے کہ دوسرے تعلیمی اداروں میں بھی ذریعہ تعلیم اردو ہو ورنہ تو کراچی یونیورسٹی اور باقی دوسری یونیورسٹیوں کے طالبعلموں کو ہماری اردو یونیورسٹی سے ایم۔ ایس سی کرنے والوں پر فوقیت دی جائے گی اسطرح ہمارے ہاں کے طالب علموں کو احساسِ کمتری کا شکار ہونا پڑے گا لیکن اسکے ساتھ ساتھ پورے ملک میں اردو کا عملی نفاذ ضروری ہے تاکہ اردو میں تعلیم حاصل کرنے والے جب عملی میدان میں قدم رکھیں تو ان کا واسطہ اردو کے بجائے انگریزی سے نہ پڑے ورنہ بے حد دشواریاں پیدا ہونگی۔

سید ذوالفقار حیدر
سالِ چہارم

میں نے اور دوسرے کالجوں کے مقابلے میں اردو کالج کو ترجیح اسلیئے دی کہ اکثر کالجوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اسلیئے ان کالجوں میں تمام لیکچر انگریزی زبان میں ہوتے ہیں جبکہ میں اپنی قومی اور مادری زبان اردو میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا اور انشاءاللہ مزید چاہوں گا کہ اسی کالج سے اپنی تعلیم مکمل کروں اور دراصل میرا یہاں اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا ایک اور مقصد یہ بھی ہے کہ میں اپنے گردو نواح میں رہنے والے ان لوگوں کو جو چند درجوں تک تعلیم انگریزی اسکولوں سے حاصل کرتے ہیں اور اس پر فخر محسوس کرتے ہیں یہ دکھانا اور ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اردو زبان میں مکمل تعلیم حاصل کرنے والا طالبعلم بھی اچھا طالبعلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا اور باشعور شہری بھی بن سکتا ہے اور اسے کسی قسم کا احساسِ کمتری نہیں ہوتا اسلیئے کہ وہ اپنی تعلیم اس زبان میں حاصل کرتا ہے جو اسکی اپنی زمین کی اپنے ملک کی اور اپنی قوم کی زبان ہے۔ جہاں تک اردو ذریعہ تعلیم کا سوال ہے میں اس سے بالکل مطمئن ہوں کیونکہ یہ ہماری مادری اور قومی زبان ہے اور اس پر تو ہمیں مکمل عبور حاصل ہے۔

اردو کالج کی ترقی و ترقی میں طلباء کا کردار سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کسی بھی کالج کے ماحول کو پرسکون رکھنے کیلیئے طلباء کا پرسکون ہونا انتہائی ضروری ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ طلباء ہی کالج کے ماحول کو خوشگوار بنا سکتے ہیں۔ کالج کا ماحول بگاڑنے یا خراب کرنے میں کسی بھی دوسرے کا یا اساتذہ کا ہاتھ نہیں ہوتا یہ صرف طلباء پر منحصر ہوتا ہے۔ لہذا طلباء کو چاہیئے کہ سب سے پہلے ایک اہم مسئلے کو یعنی کتب کی فراہمی کو حل کریں۔ اگر طلباء و طالبات ایک دوسرے کے

تعاون سے ایسی کمیٹیاں بنائیں جسطرح دیگر کالجوں اور یونیورسٹی وغیرہ میں ہے اور جنکے تحت ہفتہ کتب وغیرہ منایا جاتا ہے تاکہ غریب و نادار طلباء بھی استفادہ کر سکیں تو یہ مسائل ہم خود بھی حل کر سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ اخبار و رسائل اور مختلف اشتہارات کے ذریعے اپنے مسائل پیش کر کے اعلیٰ حکام کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرا سکتے ہیں اور اس طرح ہم تمام طالبعلم مشترکہ تعاون سے اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔

اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے سے کیا مُراد ہے؟ اسے بھی اب تک تو اسکو یہ درجہ ملجانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ طلباء اور عوام کی سہولت کے علاوہ یہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا دیرینہ خواب تھا۔ اور اب صدر مملکت خود اس بات میں گہری دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ جسکی وجہ سے اب کالج میں ایم۔ ایس سی کی کلاسوں کا باقاعدہ آغاز ہو چکا ہے اور یہ حکومت کا نہایت اہم اور اچھا قدم ہے اور وہ دوسرے طالبعلم جو سائنسی علوم اردو زبان میں حاصل کرنا چاہتے ہیں یہاں آکر استفادہ کر سکیں گے اسطرح اردو کو بھی فروغ حاصل ہوگا اور وہ دن دور نہیں جب ملک کے گوشے گوشے چپے چپے میں اردو زبان اپنا صحیح مقام حاصل کر لے گی۔

بی ایس سی (سال اول)

نزہت سلطانہ

میں نے اردو کالج کو دوسرے کالجوں پر اسلیئے ترجیح دی کہ یہاں ہماری قومی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے جسکی وجہ سے لیکچر سمجھنے میں آسانی رہتی ہے اسکے علاوہ یہاں پر مضامین اور کالجوں کے مقابلے میں اچھے ہیں۔ اساتذہ کرام بھی شفیق اور تجربہ کار ہیں۔

اسکے علاوہ میں اردو ذریعہ تعلیم سے بالکل مطمئن ہوں کیونکہ یہ ہماری قومی زبان ہے۔ اردو کالج کی ترقی میں طلباء اس طرح مدد کر سکتے ہیں کہ وہ ہر شعبے میں قومی زبان کو ترجیح دیں اور جو اساتذہ کرام اردو میں پڑھاتے ہیں انکے ساتھ تعاون کریں ہنگامہ بازی سے پرہیز کریں۔ کالج میں پرسکون فضا قائم کریں اور جس مقصد کے لیئے وہ کالج آتے ہیں اسے پورا کریں۔ اپنے کردار سے یہ ثابت کریں کہ وہ اچھے طالب علم ہیں۔

جہاں تک اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کا تعلق ہے تو میں کیا سب ہی اس موقعہ پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں کہ بابائے اردو کی ایک بہت بڑی اور دیرینہ خواہش پوری ہونے والی ہے۔ اس یونیورسٹی سے اس صوبے کے علاوہ دوسرے صوبوں کے طلبا بھی استفادہ کر سکینگے۔

سید طاہر

سال دوئم (آنرز)

میں نے اردو کالج کو ترجیح اسلیئے دی کہ یہاں پر ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔

میں اردو ذریعہ تعلیم سے مطمئن ہوں کیونکہ یہ ہماری قومی اور مادری زبان ہے اور ہم سب پاکستانیوں کو اپنی زبان پر فخر ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ اردو زبان میں کتب کی فراہمی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ سب سے پہلے اسکو حل کیا جائے۔

اردو کالج کے ماحول کو صرف یہاں کے طلبا ہی بہتر بنا سکتے ہیں کیونکہ یہ انکی اہم ذمہ داری ہے اور انہیں یہیں سے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔ چنانچہ ہم سب کا فرض ہے کہ آپس میں اور اساتذہ کے ساتھ تعاون کریں اور کالج کے ماحول کو پرسکون رکھنے میں اساتذہ کا ہاتھ بٹائیں۔

اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے گا یہ بات بہت خوشی اور فخر کی ہے۔ اور میرے خیال میں اس یونیورسٹی کا نتیجہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں سے زیادہ بہتر ہوگا اور بہت سے طلبا اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

نسرین نقوی

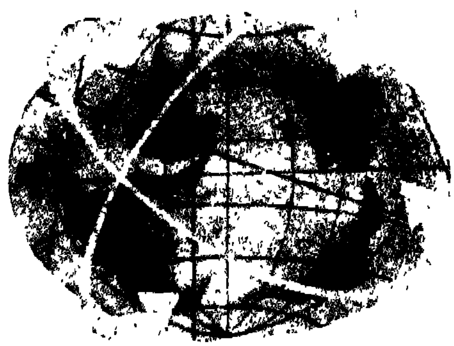
سال اول (انٹر)

میں نے اس کالج میں داخلہ محض اسلیئے لیا تھا کہ میں اپنی تعلیم اردو میں حاصل کرنا چاہتی تھی دوسرے کالجوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے جبکہ یہاں تمام تدریسی وغیر تدریسی کام اردو میں ہوتا ہے۔

میں اردو ذریعہ تعلیم سے بالکل مطمئن ہوں کیونکہ یہ ہماری قومی زبان ہے اور عوام اس زبان کو بآسانی بول سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ اردو ملک کے تقریباً تمام ہی صوبوں میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ میرے خیال میں حکومت کو چاہیئے کہ وہ فوری طور پر تمام تعلیمی اداروں میں اردو نافذ کرے۔

اردو کالج کی ترقی میں طلبا یہ کردار ادا کر سکتے ہیں کہ تمام طالب علم آپس میں ملکر کالج کی ترقی میں اور مسائل کو حل کرنے میں اساتذہ کی مدد کریں اور انکا ہاتھ بٹانے میں بھرپور تعاون کا ثبوت دیں کالج کی فضا کو خوشگوار بنانے کیلیئے ایسی کمیٹیاں تشکیل دیں کہ کالج کی فضا میں تو امن و امان قائم ہو سکے اور یہ ایک مثالی کالج کہلائے۔

جہاں تک اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کا تعلق ہے۔ اسکی اہمیت کیا ہے؟ اور بحیثیت طالبعلم میں کیا محسوس کرونگی تو بھئی کم از کم میرے خیال میں تو یہ میرے علاوہ تمام طالبعلم ساتھیوں کیلیئے انتہائی فخر کی بات ہے کیونکہ مستقبل میں ہم بھی کسی سے یہ کہہ سکینگے کہ ہم نے تو اردو یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ پاکستان کی پہلی اور واحد یونیورسٹی ہوگی اسی لیئے اسکی اہمیت بھی زیادہ ہوگی۔



ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

اُردو زبان کی تاریخ اور ارتقاء

مولوی عبدالحق کے خطبات سے اقتباسات

"اردو ادب"

نشو و نما اور ارتقاء

پیدائش اور نشو و نما

اردو کانفرنس، ناگپور میں فرمایا:-

حضرات اردو کی پیدائش اور اس کی تاریخ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کا نہایت اہم عظیم الشان واقعہ ہے۔ یہ اس وقت وجود میں آئی جبکہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا ہر جوڑا خود مختاری کا دعویدار تھا۔ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک بے سر و سامانی انتشار اور بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی۔ آپس کی پھوٹ نے سارے کام درہم برہم کر رکھے تھے۔ کوئی ایک ملک تھا۔ اور نہ کوئی نظام ایسے وقت میں مسلمان یہاں آئے بے ترتیبی اور بد نظمی کو رفع کیا اور امن قائم کیا نئے قواعد اور نئے آئین نافذ کئے۔ ایک ملک، ایک زبان اور ایک تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ وہی تہذیب اصل ہندوستانی تہذیب اور وہی زبان اصل ہندوستانی زبان ہے۔ کیونکہ اس میں ہندو مسلم دونوں کا رنگ و روپ موجود ہے۔"

بولیورہ اردو نیشنل کانفرنس ۷ دسمبر ۱۹۳۳ء میں فرمایا:-

"مسلمان بھی آریاؤں کی طرح فاتح کی حیثیت سے آئے۔ ان کی تعداد اہل ملک کے مقابلے میں کم تھی وہ فارسی بولتے تھے۔ اور اہل ملک ہندی (یعنی مقامی پراکرتیں) ان حالات میں جیسا کہ دستور ہے کاروبار، ملکی اور معاشرتی ضرورت سے مسلمان بول چال میں ہندی الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور ہندو فارسی الفاظ کچھ عرصے تک تو مسلمانوں کا تعلق اپنے اصلی ملک سے رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ تعلق کم ہوتا گیا۔ اور وہ یہیں کے ہو گئے۔ اس تعلق کے استقلال کے ساتھ اس زبان کو بھی استقلال ہو گیا۔ اگرچہ سرکاری درباری زبان فارسی تھی۔ اور مسلمانوں کی تعلیمی زبان بھی یہی تھی۔ لیکن نوکر چاکروں، بیوی بچوں اور ملک کے دوسرے لوگوں سے جو اس زبان سے واقف نہ تھے۔ انہیں لوٹی پھوٹی ہندی ہی میں باتیں کرنی پڑتی تھیں۔ ادھر اہل ملک کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جس کا تعلق دفاتر اور دربار اور امراء وغیرہ سے تھا اور بہت سے ایسے تھے جو حلقۂ اسلام میں آ گئے تھے۔

اور وہ سب فارسی جانتے اور بولتے تھے لیکن اصل زبان ان سب کی ہندی ہی تھی۔ اس لئے اس مخلوط زبان کو بہت زیادہ تقویت پہنچی اور دن بہ دن فروغ ہوتا گیا۔"

اسی خطبے میں آگے چل کر کہتے ہیں کہ:-

"جب اردو نے اپنی جگہ بنالی اور بول چال سے نکل کر ادب میں قدم رکھا تو ابتدا جیسا کہ اکثر زبانوں کی ہوئی ہے، شعر و سخن سے ہوئی اور اس وقت الفاظ ہی نہیں بلکہ فارسی ترکیبیں، انداز بیان، تشبیہات و استعارات اور تلمیحات یہاں تک کہ بعض عربی نحوی صورتیں بھی خود بخود اس میں منتقل ہوگئیں۔ اس زمانے میں ہمارے اکثر شعراء فارسی اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے۔ رفتہ رفتہ فارسی کا زور کم ہوتا گیا۔ اور اردو کو فروغ ہونا شروع ہوا مگر اس کی ساخت اور ہیئت وہی رہی جو قائم ہو چکی تھی۔"

گجرات کے خطبۂ صدارت (۱۳ اپریل ۱۹۴۸ء) میں فرمایا:-

"یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ اردو ادب کا نشو و نما سب سے پہلے گجرات میں ہوا۔ یہاں پانچ سو سال سے اردو ادب کا سکہ رائج ہے سب سے اول درویشوں اور صوفیوں نے یہیں اس زبان میں نغمے سنائے۔ اسی سرزمین کو اس شخص (ولی) کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے، جو اردو کا باوا آدم کہلاتا ہے۔ اور جس نے اپنے کلام سے ہندو دکن کو مسحور کر دیا۔ اور آج تک اردو کے غزل گو شعراء اس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اس وقت سے برابر یہاں علوم و ادب اور شعر و سخن کا چرچا رہا۔ اور اس کی گود کبھی اردو کے قدردانوں سے خالی نہ رہی۔"

زبان کے نام

زبان[1] کے معنوں میں ہندوستانی کا لفظ ہمارے کسی مستند شاعر یا ادیب یا اہل زبان نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ یہ یورپ والوں کی اپج ہے۔ یورپ کے سیاحوں نے جو سترہویں صدی سے اس ملک میں آنے شروع ہوئے۔ اس زبان کو جو شمالی ہند میں عام طور سے بولی جاتی تھی۔ اندوستان، اندستانی، اور بعد ازاں ہندوستانی کے نام سے موسوم کیا لیکن اس لفظ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے اس وقت فروغ ہوا جب ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔

حیدر بخش حیدری قصۂ حاتم طائی کی زبان کو ریختہ کہتا تھا۔ میر امن گنج خوبی میں گلکرسٹ کو اردو کا قدردان لکھتا ہے۔ مہر چند کھتری لاہوری اپنی کتاب نو آئین ہندی میں لکھتا ہے کہ اس نے قصۂ آذر شاہ اور سمن رخ کو فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اپنی تصانیف میں ہندوستانی

[1] خطبات عبدالحق ص ۲۵۷۔ یہ تقریر ۲۱ فروری ۱۹۳۹ء کو ہوئی تھی۔

لفظ ہندوی دونوں لفظ اس ایک زبان کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہ لفظ ہندی یا اس زبان کے لئے قدیم دکنی اور گجراتی اردو میں بھی انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ وہ معذرت کے طور پر اکثر اپنی تصانیف میں لکھتے ہیں کہ جو لوگ فارسی و عربی سے بہرہ نہیں رکھتے ان کے لئے ہم نے یہ کتاب ہندی میں لکھی ہے۔ یا یہ کہ یہ کتاب فارسی میں تھی عام لوگوں کی خاطر ہندی میں ترجمہ کی۔ یہ لفظ مصحفی کے زمانے تک انہی معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔ مصحفی اپنے دو تذکروں کو تذکرۂ ہندی یا ہندی گویان کے نام سے یاد کرتا ہے۔ جب اس بولی کو خود ایک زبان کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اور اس نے زبانی بول چال سے نکل کر ادب میں قدم رکھا تو یہ لفظ خود بخود متروک وقت استعمال ہوا جب اس میں ادبی شان پیدا ہو چلی تھی بلکہ زیادہ تر شعر و سخن اور ادبی کلام کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ لیکن جب یہ زبان عام ہو گئی تو یہ لفظ خود بخود خارج ہو گیا۔ سترہویں نیز اٹھارہویں صدی میں پرانے فیشن کے یورپین اور انگریز اسے مورز (MOORS) کہتے تھے۔ جس طرح احاطہ مدراس اور بمبئی کے بعض مقامات میں اسے مسلمانی سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن یہ نام غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اور اس لئے اب بالکل متروک ہے۔ گول کنڈہ کا اردو شاعر اور ادیب وجہی اپنی کتاب سب رس میں جو ۱۰۴۵ھ کی تصنیف ہے اسے زبان ہندوستان کہتا ہے۔ اردو کا لفظ بعد میں آیا۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں زبان اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد دہلی لکھتے ہیں۔ اس کے بعد زبان اردو کہنے لگے۔ ریختہ ریختہ زبان کا لفظ اڑ گیا اور خود اردو زبان کے معنوں میں آنے لگا۔ مصحفی اور انشا کے زمانے میں اس کا رواج عام ہو گیا تھا۔[1] مراد (متوفی ۱۲۱۵ھ) ان پہلے چند حضرات میں سے ہیں جنہوں نے اردو کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا۔

بڑودہ کانفرنس میں میں نے دسمبر ۱۹۲۳ء کو خطبہ دیا تھا اس میں کہا ہے :۔

ادب کی راہ ہمیشہ صاف اور سیدھی نہیں رہتی اس میں بہت سے پیچ و خم ہوتے ہیں اس لئے اس کے جانچنے کے لئے ہر کروٹ کے بدلنے پر نظر دوڑانی چاہئے چنانچہ اس زمانے میں بعض ایسی نئی باتیں نظر آتی ہیں جو پہلے نہیں تھیں۔ اور تھیں تو بہت کم۔ مثلاً چھوٹے افسانے لکھنے کا آج کل عام رواج پایا جاتا ہے اگرچہ اس وقت سوائے منشی پریم چند کے جن کے بعض افسانے درحقیقت بے نظیر ہیں۔ کوئی ایسا نظر نہیں آتا [illegible] مستند ہو۔ لیکن ان لکھنے والوں میں بعض بہت ہونہار ہیں جن سے یہ توقع ہے کہ آگے چل کر نام پیدا کریں گے۔ دوسری چیز ادبی تنقید ہے جس کی ابتدا مولوی حالی نے کی اور اب اس فن پر متعدد لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں جن میں سے بعض نہایت بڑی لیاقت رکھتے ہیں۔ یہ زیادہ تر مغربی تعلیم کا اثر ہے اور کم و بیش مغربی اصول پر کام ہو رہا ہے۔ [illegible]

[1] ایضاً صفحہ نمبر ۱۵

میں بھی اردو زبان کسی سے پیچھے نہیں اگرچہ اس وقت حالی سا کوئی انقلابی عنصر پیدا نہیں ہوا۔ سوائے ایک شخص کے جس نے حقیقت میں اردو شاعری میں جان ڈال دی تھی۔ اور جس نے اپنی قوت کلام اور زور بیان سے زبان میں ایک نئی تازگی اور نیا جوش پیدا کر دیا تھا۔ لیکن اس بدقسمتی کا کیا علاج کہ اقبال اردو سے روٹھ گئے ہیں[1]

دلی مرکز

"جب تک دلی اردو کا مرکز رہی، ہندی کے دلکش الفاظ اس میں برابر داخل ہوتے رہے اور اب تک دلی کے ادیبوں نے اس کی پابندی کی ہے۔ چنانچہ زمانہ حال کے مصنفین خصوصاً آزاد، حالی، ذکاء اللہ، نذیر احمد نیز مرزا داغ نے سیکڑوں ہزاروں ہندی لفظ جو صرف زبانوں پر تھے۔ اور مبتذل سمجھے جاتے تھے۔ اور جنہیں ادب میں بار نہیں ملا تھا۔ اس خوبی سے اپنے کلام میں استعمال کئے ہیں کہ خاصے متین اور سنجیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ جب یہ زبان دوسرے صوبوں اور علاقوں میں پہنچی تو وہ اس سے محروم ہو گئی اور خصوصاً انگریزی تعلیم کے اثر سے زبان میں جب نئے نئے خیالات آنے شروع ہوئے تو انہوں مجبوراً فارسی عربی الفاظ سے کام لینا شروع کیا پھر اکثر مترجموں نے جو انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔ اور اپنی زبان پر پوری قدرت نہ رکھتے تھے۔ فارسی

[1] ایضاً صفحہ نمبر ۱۵

عربی الفاظ کے سوا انگریزی الفاظ کا بھی اضافہ کیا میں اس میں مسلمانوں کو بھی بری الذمہ نہیں سمجھتا لیکن اگر ہندی والے پہلے کی طرح شریک رہتے تو یہ افراط تفریط نہ ہونے پاتی[1] مرزا غالب کا شعر ہے؎

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مرزا غالب کی مشکل پسندی مشہور ہے۔ جب اس کی شکایت بہت بڑھ چلی تو انہوں نے یہ عذر کیا۔ یہ عذر تو ایک لطیفہ ہے۔ لیکن عام شکایت کا اثر یہ ہوا کہ وہ سچ مچ آسان کہنے لگے۔ اور آسان بھی ایسا کہ اس کا جواب نہیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت اسی آسان کلام پر ہے[2]

لکھنو کی زبان

"جدت پسندی کے شوق میں لکھنو کے شاعروں اور ادیبوں نے ایسے مشکل اور ثقیل عربی کے لفظ اپنے کلام میں شروع کر دیئے تھے کہ عام فہم تو کیا۔ خاص فہم بھی پریشان ہو گئے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو کے بہت سے ٹھیٹھ لفظ اور بول چال کے عام فہم محاورے عامیانہ قرار دے کر متروک کر دیئے گئے۔ یہ معیار شرافت و ثقافت سمجھا جاتا تھا تحریر ہی میں نہیں بات چیت میں بھی یہ شان پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی علمیت جتانے کے لئے یہ لوگ عجیب طرح کی زبان بولنے لگے تھے۔ ایک زمانے میں یہاں

[1] خطبات صفحہ ۸ ، [2] خطبات صفحہ ۵۲۳

"(حیدرآباد دکن") کی ہائی کورٹ میں لکھنؤ کے ایک صاحب علم میر مجلس تھے۔ ایک دن میں یونہی ان سے ملنے گیا مزاج پوچھا تو فرمایا: "صدر پر انصباب نوازل ہے"۔ آپ سمجھے کیا کہا؟ غزل جس کی زبان صاف فصیح اور عام فہم ہوتی ہے۔ وہ بھی اس کی زد سے نہ بچی اور اس میں بھی وہاں کے شاعروں نے ایسے ثقیل اور نامانوس عربی فارسی لفظ لکھنے شروع کر دیئے جن کی وہ کسی طرح متحمل نہیں ہو سکتی[۱]" البتہ اردو پر ایک ایسا تاریک زمانہ آیا تھا کہ ہمارے شاعروں نے اکثر ہندی لفظوں کو متروک قرار دیا اور ان کی بجائے عربی فارسی الفاظ جو بہ تغیر ہیئت یا بہ تغیر تلفظ اردو میں داخل ہو گئے تھے انہیں بھی غلط قرار دے کر اصل صورت میں پیش کیا۔ اور اس کا نام اصلاح زبان رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تکلف اور تصنع ہمارے ادب پر چھا گئے تھے۔ شاعری ضلع جگت ہو گئی تھی۔ سخنوروں نے لفظوں کو کھیل بنا لیا تھا۔ شاعر کا مقصد کچھ کہنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا کام قافیئے کی رعایت سے لفظوں کو جما دینا، ان میں صنائع و بدائع کا رنگ بھر دینا، قافیہ ردیف کھپا دینا اور محاوروں کا نبھا دینا رہ گیا تھا۔ اس میلان کی وجہ سے ہماری شاعری رنگ بہ رنگ لفظوں کا ایک ڈھانچہ تھی۔ جس پر طرح طرح کی نقاشی ہوئی تھی لیکن اس میں جان نہ تھی اور ہماری زبان ایک ایسی زبان ہو گئی تھی کہ اسے بہت کم انسان بولتے تھے غرض اس رنگ نے ہمارے ادب کو بے جان اور بے اثر

---

[۱] : خطبات صفحہ نمبر ۵۲۳

بنا دیا تھا لیکن یہ دور تاریکی چند روزہ تھا اس کے رفع کرنے میں سب سے بڑا کام سر سید احمد خان نے کیا۔ اس کی تحریروں نے ہمارے ادب میں نئی جان ڈال دی۔ اگرچہ اس کی زبان اور اس کا انداز بیان سادہ تھا لیکن اس میں فصاحت، اثر اور قوت تھی۔ اس نے علمی اور سنجیدہ مضامین لکھنے کا ایک نیا ڈول ڈالا۔ اور موافق و مخالف دونوں نے اس کی پیروی کی اور اس کے رفقاء یعنی نذیر احمد، شبلی، حالی اور ذکاء اللہ وغیرہ نے اسے چمکایا اور بڑھایا۔ سر سید احمد خان کا اردو پر بڑا احسان ہے[۱] اردو زبان و ادب کا جدید دور گزشتہ صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے اس میں چار بڑی باقاعدہ تحریکیں عمل میں آئیں۔ (۱) فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) (۲) دہلی کالج، (۳) سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ اور (۴) اورینٹل کالج لاہور[۲]

علی گڑھ کا دبستان

۱۴ر فروری ۱۹۴۱ء کو فرمایا:۔

یہ مقام (علی گڑھ) جہاں آپ جلوہ فرما ہیں اردو کا گہوارہ رہا ہے اسی ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں ہماری زبان کے نامور ادیب، مورخ، مصنف، شاعر تشریف فرماتے اور اپنے کلام سے اہل کانفرنس کو محظوظ کرتے تھے۔ لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے تھے۔ اور بڑے شوق سے ان

---

[۱] :۔ خطبات صفحہ ۱۱۹

[۲] خطبات صفحہ ۲۸، پھر ان چاروں تحریکوں کی تفصیل آئی ہے

طلبہ ان میں مشہور ہوگئے تھے۔ قطع نظر دوسرے فوائد کے ان بزرگوں کو دیکھنا ان کی باتیں سننا یا ان سے ملنا ہی اپنی بڑی خوش قسمتی اور اپنی زندگی کا بڑا کارنامہ سمجھتے تھے اور ان باتوں کا تذکرہ آج بھی ہم اپنی صحبتوں میں بڑے فخر سے کرتے ہیں۔ حالی، شبلی، نذیر احمد کے جوہر یہیں کھلے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اردو کی بنیادیں مستحکم کیں۔ سرسید احمد خاں ان سب کے سردار تھے۔ سید کے احسانات سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یہ گوناگوں ہیں۔ لیکن ان سب کا سب سے بڑا احسان اردو زبان پر ہے۔ اس نے زبان کو پستی سے نکالا۔ انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی۔ سنجیدہ مضامین لکھنے کا ڈول ڈالا۔ سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جدید علوم و فنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے خود کتابیں لکھیں اور دوسروں سے لکھوائیں۔ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی (علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ) جاری کرکے اپنے انداز تحریر بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے اخبار نویسی کا پایہ بڑھایا۔ تہذیب الاخلاق کے ذریعے اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا۔ ٹائپ کو رواج دیا۔ ان بزرگوں کی سعی و عمل سے علی گڑھ اردو ادب اور روشن خیالی کا ایسا مرکز ہوگیا تھا جس کی فضیلت اور برتری سب نے تسلیم کی ہے۔ یہ اردو ادب کے عروج اور اوج کا زمانہ تھا۔ اور اردو ادب کی تاریخ میں اس کا ذکر ہمیشہ احترام سے کیا جائے گا۔ سید کے زمانے میں کالج میں ادبیت کا رنگ نظر آتا تھا۔ اول تو وہ خود ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ دوسرے بعض اہل کمال اور ادیب کالج میں آتے اور قیام فرماتے۔ طلبہ ان کی صحبت سے فیض حاصل کرتے۔ اس کے علاوہ بعض پروفیسر مثلاً آرنلڈ، مولانا شبلی، مولوی کرامت حسین اس پائے کے تھے۔ ان کی تعلیم گفتگو اور صحبت، صحیح علمی اور ادبی ذوق کی ضامن تھی۔ ظاہر ہے کہ سب ادیب اور عالم نہیں ہو سکتے لیکن جن میں کچھ صلاحیت اور مادہ تھا۔ اس سے مستفید ہوئے اور کچھ لیا بھی۔ حالانکہ اس زمانے میں کالج کے نصاب تعلیم میں اردو داخل نہ تھی۔[1]

عورتوں کی زبان

اردو زبان کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ وہ عورتوں کی زبان ہے۔ یوں تو دنیا میں اور بھی زبانیں ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کی بول چال میں کچھ کچھ فرق ہے۔ لیکن اردو زبان میں یہ امتیاز بہت گہرا اور نمایاں ہے۔ اردو نے جس خطے میں جنم لیا۔ یا جہاں جہاں اس نے زیادہ رواج پایا۔ وہاں پردے کی رسم رہی ہے۔ اسی وجہ سے مردوں اور عورتوں کی معاشرت میں بہت کچھ فرق پیدا ہوگیا۔ عورتوں کے الفاظ اور محاورے اور ان کا طرز بیان اور بول چال بھی بہت کچھ الگ ہوگئی۔ عورتوں کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے وہ

---

[1] خطبات صفحہ ۲۵ ، ۳۰۵۲

انسانوں یا چیزوں میں بعض ایسی چھوٹی چھوٹی خوبیاں یا کمزوریاں دیکھ لیتی ہیں جن پر مردوں کی نظر نہیں پڑتی۔ پردے میں رہنے کی وجہ سے ان کا سارا وقت امور خانہ داری بال بچوں کی پرورش اور نگہداشت، شادی بیاہ رسم و رواج کی پابندی اور ان کے متعلق جتنے معاملات ہیں اس میں صرف ہوتا ہے۔ اور اسی اقلیم میں ان کی عملداری کامل ہوتی ہے۔ پھر ان کی زبان اور لہجے میں قدرتی لطافت، نزاکت، لوچ ہوتا ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے تعلقات کے لحاظ سے جو طرح طرح کے لفظ محاورے اور مثلیں بنائی ہیں وہ بڑی لطیف، نازک، خوب صورت اور سبک ہیں۔ وہ گیت جو عورتوں نے بنائے ہیں بہت ہی پرلطف اور دلکش ہیں اور نفسیاتی اعتبار سے خاص طور پر قابل قدر ہیں۔ ایسے الفاظ جن کا زبان سے نکالنا بدتمیزی سمجھا جاتا ہے یا جن کے کہنے میں حجاب مانع ہوتا ہے عورتیں ایسے الفاظ نہیں بولتیں بلکہ وہ اس کو لطیف پیرائے میں یا تشبیہ اور استعارے کے رنگ میں بڑی خوب صورتی سے بیان کر جاتی ہیں۔ عربی، فارسی کے ثقیل الفاظ جن کا تلفظ آسانی سے ادا نہیں ہوتا۔ وہ انہیں بہت سہل و سڈول بنا لیتی ہیں بعض اوقات ان کے معنی تک بدل جاتے ہیں اور وہ خالص اردو کے لفظ ہو جاتے ہیں۔ ریختی گو شعراء کا بڑا احسان ہے (اگرچہ ان میں سے بعض نے بہت کچھ فحش بھی بکا ہے) کہ انہوں نے اس زبان کو محفوظ کر دیا ہے۔ اس زمانے میں نذیر احمد، حالی، سید احمد دہلوی، راشد الخیری اور بعض دیگر اصحاب کی بدولت صنف نازک کی پاکیزہ زبان کا اکثر حصہ ہمارا مشترک سرمایہ ہو گیا ہے۔"

اردو اسٹیج

اردو کانفرنس بمبئی (۱۹۳۵ء) میں فرمایا:-

پسٹن جی فرام جی اردو اسٹیج کے پہلے بانی تھے، وہ صرف اردو شناس کیا قدردان بھی نہ تھے خود بھی اردو شاعر تھے۔ رنگ بہ رنگ تخلص کرتے تھے۔ اور نواب علی فہیم سے اصلاح لیتے تھے۔ انہوں نے اورینٹل تھیٹریکل کمپنی کے نام سے ایک تھیٹر قائم کیا۔ اس کمپنی کے ڈرامے جو تیس چالیس سے کم نہ ہوں گے۔ اردو زبان میں تھے۔ اس کمپنی کو خوب فروغ ہوا۔ پسٹن جی کی وفات کے بعد بائی والا نے وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی اور کاؤس جی کھٹاؤ نے الفریڈ تھیٹر قائم کیا۔ یہ دونوں بہت مشہور ایکٹر تھے۔ ان کے علاوہ بھی الفریڈ یا بمبئی پارسی تھیٹریکل کمپنیاں ہیں جو پارسیوں کی ہمت اور جدت کی رہین منت تھیں ان کمپنیوں میں بعض بڑے پایہ کے منشی اور شاعر تھے۔ طالب، احسن، بے تاب، حشر کے نام ڈرامہ نویس کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ یہ کمپنیاں تمام بڑے بڑے شہروں میں جاتیں، وہاں عجیب رونق اور چہل پہل ہو جاتی تھی۔ جب کوئی بڑھیا گانے والا یا ایکٹر

"کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور انکی شہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشان ہے مٹا دیا جائے۔ اس وقت سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلم باہم متفق ہو کر کام نہیں کر سکتے میں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اسی سے ہوئی۔"

سرسید کا یہ قول عبد الحق صاحب نے علی گڑھ کانفرنس میں ۲۸ اپریل ۱۸۳۷ء میں اور ۲۴ فروری ۱۹۶۱ء میں نقل کیا ہے۔ موخر الذکر موقع پر یہ بھی فرمایا ہے کہ :-

" ۱۸۶۸ء اور ۱۸۶۹ء میں اردو ہندی کی بحث میں شدت شروع ہوئی۔ الہ آباد میں ہندی کی حمایت میں ایک صدر مجلس قائم ہوئی۔ اور مختلف مقامات میں اس کی شاخیں بنائی گئیں اس صدر مجلس کے سکریٹری (بابو سرودا پرشاد سنڈیال) اور سرسید میں اسی تنازعہ سے متعلق مراسلت ہوئی۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی، بنارس گزٹ، رسالہ جلسہ تہذیب (لکھنؤ) نور الابصار وغیرہ اخبارات میں دونوں طرف سے بڑے گرم مضامین نکلے ادھر یہ بحث ہو رہی تھی کہ بہار میں حکومت بنگال نے زبردستی اردو کی جگہ ہندی رائج کر دی۔ الغرض ۱۸۷۳ء میں جب سرسید کو یہ معلوم ہوا کہ

لے تفصیل، خطبات (کراچی ۱۹۵۲ء) صفحہ ۵۳۰ میں دیکھیں۔

سر انٹنی میکڈانل ہوئے جو اس صوبے میں لیفٹیننٹ

مدرسوں اور دفتروں میں دیوناگری جاری کرنے کے لیے ایک درخواست ہندوؤں کے دستخطوں کے لیے گشت کرائی جا رہی ہے تو انہوں نے ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو الہ آباد میں ایک بڑا جلسہ کیا اور اردو کی حفاظت کے لیے ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی جس کے سرسید سکریٹری قرار پائے اور اس کی شاخیں دوسرے اضلاع میں قائم کی گئیں۔ سرسید نے ایک پرزور اور مدلل سرکلر جاری کیا جس میں ان نقصانات کو مفصل طور پر بیان کیا جو اس تبدیلی سے پہنچیں گے۔ ۱۸۸۳ء میں جب حکومت ہند کے مقرر کردہ مشہور ایجوکیشن کمیشن کا دورہ بغرض تحقیقات ملک میں ہوا تو یہ جنون پھر شدت سے اچھلا اور اضلاع شمال و مغرب اور پنجاب سے ہندوؤں نے اردو زبان کی بڑی زور و شور سے مخالفت کی اور دونوں صوبوں کی بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر پیش ہوئے چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو اس کمیشن کے صدر تھے ایم اے او کالج علی گڑھ کے اڈریس کے جواب میں کہا کہ روزانہ ڈاک میں ہمارے پاس بیشمار دستخطوں کے ساتھ ہندی کی حمایت میں میموریل وصول ہو رہے ہیں۔ صرف ایک درخواست پر جو کل ہی موصول ہوئی تین ہزار دو سو ستاسی اشخاص کے دستخط ثبت ہیں۔ کمیشن میں بھی یہ معاملہ پہنچایا گیا لیکن سرسید نے اس بنا پر کہ یہ معاملہ اب تعلیمی نہیں رہا۔ سیاسی ہو گیا ہے اس ناگوار بحث کو کمیشن میں نہ آنے دیا۔ ..."

یہ آگ جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ مارچ ۱۸۹۸ء میں یکایک بھڑک اٹھی اشتعال کا باعث

گورنر ہو کر آئے تھے۔ اس سے پہلے صوبہ بہار میں کلکٹر تھے وہاں بھی اس آگ پر بہت تیل چھڑکا تھا۔ ان کے آنے سے ہندی کے طرفداروں کے حوصلے بڑھ گئے معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل لیفٹیننٹ گورنر کی خدمت پیش کیا مولانا حالی لکھتے ہیں کہ اگرچہ سرسید پر اس زمانے میں ہجوم رنج والم کے سبب ایسا سکتے کا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقشِ دیوار بن گئے تھے۔ مگر اسی حالت میں انہوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو ۱۵ مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد میں اردو کی حمایت کے لئے قائم کی تھی۔ اس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کچھ مشورے دیئے۔

اسی سال ہندی والوں کا ایک ڈیپوٹیشن لیفٹیننٹ گورنر بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا جس کو جواب دیتے ہوئے "آنرنے موجودہ دستور عدالت میں جلد تبادلے کو ناپسند کر کے جس کے افسران گورنمنٹ عادی نہیں ہیں۔ قبول کیا کہ سرکاری کاغذات میں ناگری حروف کے مزید استعمال سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ گورنمنٹ کے ریزولیوشن مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء میں ناگری حروف جاری کرنے کا قطعی فیصلہ کر دیا گیا۔ والسرائے کرزن نے اپنے احکام میں حروف کا لفظ بدل کر زبان کا لفظ بنا دیا۔ وہ جو ذرا سا تسمہ لگا رہ گیا تھا۔ ظالم نے وہ بھی کاٹ کر رکھ دیا۔

اس پر مسلمانوں میں بڑا ہیجان ہوا۔ نواب محسن الملک بہادر نے ان احکام کی ناانصافی کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلانے کی غرض سے ایک بڑا جلسہ منعقد اور ملک کے سربرآوردہ اور تعلیم یافتہ اصحاب کو مدعو کیا۔ یہ جلسہ ۱۸/۱۷ اگست ۱۹۰۰ء کو بمقام لکھنؤ، بارہ دری قیصر باغ میں بڑی دھوم دھام اور جوش و خروش سے ہوا۔ (لیکن نواب محسن الملک کو) ایسی سخت دھمکی دی گئی کہ نواب صاحب کو یہ تحریک چھوڑ دینی پڑی اور ساری کوششوں پر پانی پھر گیا۔ یہ واقعہ نہایت عبرتناک ہے یہ اردو کی بہت بڑی شکست ہوئی۔

اس وقت سے یہ زبان جسے اب ہندی کہا جاتا ہے۔ ترقی کرتی چلی گئی پنڈت مالویا جی نے جب شدھی اور سنگھٹن کے دنگل قائم کئے تو اس کا زور اور بڑھا اور اس مذہبی جنون سے ہندی کی اشاعت کا خوب فائدہ اٹھایا گیا۔ راجپوتانہ اور سنٹرل انڈیا کی ہندو ریاستوں میں اس وقت دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو تھی۔ وہاں دفعۃً بھیج بھیج کر اردو کو اکھاڑا اور ہندی کو جما دیا۔ ایک جودھپور ان کی گرفت سے بچ رہا تھا۔ اس کا جو حشر ہوا وہ آپ نے دیکھ لیا۔ ایک پنڈت رام چندر شرما نامی نے مرن برت رکھا۔ یہ مرن برت نہیں دھمکی برت ہے اور جس طرح راج کوٹ کے معاملے میں والسرائے دھمکی میں آگئے تھے۔ اسی طرح جودھپور کے وزیر اعظم بھی دھمکی میں آگئے۔

سرایٹنی (میکڈانل) کو دلیو ناگری جاری کرنے میں دو سال لگ گئے تھے۔ مگر جودھپور کے وزیر باتدبیر نے چند ہی روز میں حکم ناطق نافذ کر دیا۔ اور بے گناہ اردو کے قتل کا فتویٰ سر مرزا اسمٰعیل کے دست مبارک سے لکھا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

علی گڑھ کانفرنس نے (۱۴ فروری ۱۹۴۱ء میں) سے فرمایا:-

آپ کو معلوم ہے کہ نومبر ۱۸۳۲ء میں حکومت نے ایک بجٹ پاس کیا جس کی رو سے دفتروں اور عدالتوں کی زبان فارسی سے اردو کر دی گئی۔ جب تک فارسی رہی کسی نے زبان کی شکایت نہ کی۔ اور جب اردو ہوئی تو بھی کوئی شکایت نہ پیش ہوئی ہندی اردو کی نزاع ۱۸۶۷ء سے شروع ہوتی ہے جب بنارس کے بعض معززین ہندوؤں نے (بابو فتح نراین سنگھ کی سرکردگی میں) تمام سرکاری دفتروں میں اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرنے اور اس کے بجائے ہندی بھاشا رائج کرنے کی کوشش کی۔ (مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ سرسید کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندوستان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔)

اس سے پہلے اسی خطبے میں فرمایا تھا کہ:۔

۵۷ء کے بعد کمپنی بہادر برخاست ہوئی۔ انگریزی راج آیا۔ حالات نے پلٹا کھایا۔ جدید قانون نافذ ہوئے ریل اور تار کی حیرت انگیز اختراعوں کا لجوں کی تعلیم، آزادی اور حب وطن کی تقریروں اور تحریروں انگریزی انصاف پسندی کے اعتقاد نے قومیت اور وطنیت کے جذبے کو اور اکسایا۔ خاص کر ہندو اس سے زیادہ متاثر ہوئے۔ قومیت اور ماضی کے فخر نے بھی دلوں میں نیا جوش پیدا کیا جسے میکس مولر نے ابھارا اور جس سے بعد میں اینی بزانٹ نے خوب کام لیا۔ لیکن سب سے زیادہ مستحکم طور پر یہ خیال سوامی دیانند سرسوتی نے دلوں میں جمایا۔ گروکل قائم ہوئے جس میں سنسکرت پڑھنا اور سنسکرت بولنا لازم تھا۔ ویدک زمانے کی نقل کی جانے لگی ننگے پاؤں پھرنا ایک بے سلی چادر اوڑھنا، پٹنا، جنگلوں میں رہنا، زیر سما سونا وغیرہ قومی شعار پایا سب سے زیادہ نزلہ اردو زبان پر گرا۔"

مجلس ادب لاہور والے خطبہ ۱۹۳۹ء میں فرمایا:۔

"آپ کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو کہ ہندو مسلم اختلاف کی ابتدا سیاست سے نہیں بلکہ اردو کی مخالفت سے ہوئی۔ ۱۸۶۷ء میں جب کہ نہ نیشنل کانگریس کا وجود تھا نہ کسی دوسری سیاسی تحریک کا ہندوؤں نے اردو کی مخالفت کا آغاز کیا۔ اور اسے دفتروں، عدالتوں اور دوسرے اداروں سے خارج کرنے کے لئے کوششیں شروع کیں۔ سرسید احمد خان نے اردو کی حمایت میں اس کا توڑ کیا اور مرتے دم تک اردو کی حفاظت اور حمایت میں مردانہ وار لڑتے رہے۔ ہندوؤں کی کوششیں اس وقت سے برابر جاری رہیں اور اسی سال تک مسلسل اردو دشمنی پر تلے رہے اور مختلف صورتوں اور ترکیبوں سے اس آگ کو سلگاتے رہے اور دو قومی نظریہ قائم کر کے ہندو مسلم اختلاف کو بڑھاتے رہے۔ دو قومی نظریہ کے بانی ہندو تھے نہ کہ قائد اعظم یا مسلم لیگ"۔

۱۳ راپریل ۱۹۴۸ء کو احمد آباد میں کل گجرات اردو کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں:۔

یوں تو اردو کی مخالفت اسی برس سے مسلسل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ مگر اب اس پر ایسا برا وقت آیا ہے جو پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ کیونکہ اس وقت حکومت

میں ان کا مکمل دخل ہے جو سالہا سال سے اس کی مخالفت کرتے آئے ہیں۔ اس میدان کے سب سے منچلے سردار آپ کے مردم خیز خطے کے سردار (پٹیل) ہیں جنہوں نے ریڈیو میں وہ زبان چلائی جو سوائے ریڈیو کے اور کہیں سننے میں نہیں آتی۔"

ہر صوبہ پہل کی عزت حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ پنڈت شکلا (روی شنکر) وزیر اعظم سی پی نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ اس صوبے میں سرکاری زبان ہندی ہوگی۔ ناگ پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے ان کا ساتھ دیا اور ہندی ذریعہ تعلیم قرار پائی۔ "میں نے اسی وقت مہاتما گاندھی کو لکھا کہ آپ نے ایک مدت کے غور و فکر اور مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ملک کی عام زبان ہندوستانی ہونی چاہیے۔ لہٰذا آپ مہربانی فرما کر سی پی کے وزیر اعظم اور ناگ پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ہدایت فرمائیے کہ وہ ہندی کے بجائے ہندوستانی کو رواج دیں۔ اس کے بعد یوپی کی حکومت نے اعلان کیا کہ ہندی حکومت کی دفتری اور عدالتی زبان ہوگی اور رسم الخط ناگری ہوگا۔ اور صوبے کے تمام سرکاری اور نیم سرکاری محکموں کو اطلاع دی گئی کہ ہندی زبان اور ناگری رسم خط فوراً جاری کر دیا جائے اور ان سرکاری ملازموں کو جو ہندی نہیں جانتے تھے۔ ہدایت کی گئی کہ وہ تین مہینے کے اندر ہندی سیکھ لیں اور آئندہ کوئی شخص جو ہندی نہیں جانتا ملازمت کا حق دار نہ ہوگا۔"

اسی خطبے میں کچھ پہلے مولانا فرماتے ہیں کہ:

"میں کم و بیش ۶۵ سال سے جیسی کچھ بن پڑی بری بھلی اردو کی خدمت کر رہا ہوں۔ بزعم خود یہ سمجھتا رہا ہوں کہ میں اردو کی قدر و قیمت اور اہمیت کو سمجھتا ہوں لیکن آج میں آپ کے سامنے نہایت صاف دلی سے اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں بھی اب تک اس کی قدر و منزلت کو نہیں سمجھا اور سمجھا تو اب؛ جب پنڈت راوی شنکر شکلا[1] وزیر اعظم حکومت سی پی نے مسلمانوں کو خطاب کر کے یہ کہا کہ ہم تمہاری وفاداری کے زبانی دعوٰی کو نہیں مانتے۔ اپنی وفاداری کا عملی ثبوت دو اور اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ اردو زبان کو قطعاً ترک کر دو اگرچہ زبان کے مسئلے کا فیصلہ مجلس آئین ساز پر رکھا گیا تھا۔ لیکن ان صوبوں نے اس فیصلے[2] کا مطلق انتظار نہ کیا اور بڑی چالاکی سے اور عجلت سے ہندی کے حق میں احکام جاری کر دیے۔"

اورنگ آباد (دکن) سے ۱۹۴۷ء میں جو تقریر نشر کی تھی اس میں ہے:۔

"اردو پر کڑا نازک دور گزر چکے ہیں اب اس نئے عہد میں پہلے سے بھی سخت وقت آیا ہے۔ سب سے اول پہل کی عزت صوبۂ متوسط (سی پی) کو حاصل ہوئی۔ وہاں کے وزیر اعظم نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس صوبے کی زبان ہندی ہوگی۔ مدارس اور کالجوں میں ذریعہ تعلیم ہندی ہوگا۔ دفتروں اور عدالتوں میں بھی ہندی رہے گی۔ خانگی مدارس جو اس کی تعمیل نہیں کریں گے۔ ان کو امداد نہیں دی جائے گی۔ اس کے بعد یوپی نے بھی یہی راگ الاپا۔ اس کا اثر میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں پر

[1] صحیح تلفظ 'روی شنکر' سنا جاتا تھا۔ [2] کانگریس کی ڈھائی سالہ حکومت میں شکلا نے ودیا مندر اسکیم تیار کی تھی اور ہندی رائج کرنے کی سازش کی تھی۔

میں ہوا اور انتہا یہ ہے کہ کانگریس پارٹی نے اپنے جلسے میں کثرت رائے سے یہ قرارداد منظور کر دی کہ اس ملک کی زبان بخط ناگری ہو گی۔"

۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور میں فرمایا:۔

انڈین نیشنل کانگریس نے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہو گی خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ یہ فیصلہ معقول تھا اور اس دور اندیشی پر مبنی تھا۔ جو اس قسم کی کانگریس ایسے موقعوں پر عمل میں لاتی ہیں۔ لیکن ان صاحبوں کے اطمینان کے لئے کافی نہ تھا۔ جن کا منشا کچھ اور تھا ان کی کوششوں کا نتیجہ اپریل ۱۹۳۵ء میں ظہور میں آیا۔ یعنی ہندی سمیلن کا سالانہ اجلاس اندور میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت مہاتما گاندھی نے فرمائی۔

(ہندی اتھوا ہندوستانی کے چند نمونے دے کر گاندھی کی زبان کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ) ممکن ہے کہ مہاتما گاندھی جو لتجیہ و تاویل کے فن کے استاد کامل ہیں لفظ اتھوا دیا ہے کچھ اور معنی پیدا کریں۔ ورنہ بحالت موجودہ ہندی یا ہندوستانی کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہو سکتا۔

انہوں نے (گاندھی) ہندی کا پرچار مدراس سے شروع کیا۔ یہ تو اس لئے کہ ہندی وہاں سرے سے ہی نہیں اور اگر اس خطے کو رام کر لیا تو دوسرے علاقے خود بخود ہم نوا ہو جائیں گے۔ دوسرے اس لئے کہ یہ کارروائی شمالی ہند والوں کی نظر سے اوجھل رہے گی۔ جو ایسے معاملوں میں بحث و تکرار اور جھگڑے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔[1]

[1] خطبات۔ صفحہ نمبر ۵۳۳

"ملک پر اس بزرگوار کے بہت احسان ہیں اس نے سیاسیات، معاشرت، اقتصادیات میں بڑا انقلاب کر دیا۔ قدرت نے اسے خاص قسم کا دماغ عطا کیا ہے۔ اس کا ذہن رسا، اس کی نظر دوربین اور اس کا ارادہ اٹل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی فکر کا راستہ گو بظاہر صاف اور سیدھا ہے لیکن یہ باطن میں پیچ در پیچ ہے وہ اتفاق آباد جانے کا عزم کرتا ہے تو چلتے چلتے نفاق نگر کی راہ جا نکلتا ہے۔ وہ وصل کا طالب ہے لیکن داخل ہوتا ہے فصل کے دروازے سے وہ لیکے کا آرزو مند ہے لیکن وہاں تک پہنچتا ہے پھوٹ کے توسل سے۔ میں کسی کی نیت پر حملہ کرنا نہیں چاہتا دلوں کا جاننے والا خدا ہے۔ لیکن جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ انسان اپنے اعمال سے جانا جاتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب کبھی ایسا موقع آیا کہ سالہا سال کی گتھیاں اور پیچیدہ مسائل فریقین نے باہمی مشورے اور مصالحت سے سلجھا لئے اور یہ امید بندھ گئی کہ اب نفاق کی گھٹا چھٹنے والی ہے۔ اور آفتاب اتحاد افق سے طلوع ہونے والا ہے وقت پر اس مقدس ہستی نے مل کر برسوں کی محنت خاک میں ملا دی۔ پھر بہترا سر مارا ہزار منتیں کیے۔ نہ ماننا تھا نہ مانا۔ ہمارے ملک میں تین ہٹیں مشہور ہیں راج ہٹ، تریا ہٹ اور بالک ہٹ لیکن حضرات ایک چوتھی ہٹ اور بھی ہے اور وہ ہے لیڈر ہٹ۔ وہ لیڈر ہی کیا جو دوسرے کی مان جائے مرزا داغ نے اپنے خاص انداز میں ایک بہت ہی پر لطف اور صاف ستھرا شعر کہا ہے کہا تو ہے اپنے محبوب کی شان

میں لیکن صادق آتا ہے ہمارے ملک کے سب سے محبوب ڈکٹیٹر لیڈر پر سہ

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں
کہنا نہیں مانتے کسی کا ! !

مشکل یہ آ پڑی ہے کہ وہ ہر مسئلے کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے جس سے ایک ہی رخ نظر آتا ہے دوسرا رخ نہ دیکھتا ہے اور نہ اس کی پرواہ ہے ۲ے

بہار میں ۱۹۳۶ء میں فرمایا :-

" انڈین نیشنل کانگریس نے بہت معقول فیصلہ کیا تھا کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہے خواہ رسم الخط کچھ بھی ہو۔ لیکن تعجب اور افسوس ہے کہ جس مدبرانہ دماغ نے یہ تجویز سوچی تھی اور جنہوں نے اس پر اتفاق صاد کیا تھا۔ سب سے پہلے اب وہی اس سے انحراف کر رہے ہیں ۔ مہاتما گاندھی کی جدت پسند طبیعت نے ایک نیا لفظ ہندی ہندوستانی وضع کر کے گویا جلتی آگ میں تیل ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جب مہاتما جی سے یہ دریافت کیا گیا کہ اس جدید مرکب لفظ سے آپ کی کیا مراد ہے تو فرمایا کہ " ہندی جو آئندہ چل کر ہندوستانی ہو جائے گی "۔ تو یہ زبان نہ ہوئی آئندہ کا پروگرام ہوا "۔

بلوچستان کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۶ جولائی ۱۹۴۸ء کے خطبے میں انگریزوں اور انگریزی تعلیم کے مقاصد بیان کئے ہیں

بات یہ ہے کہ انگریزی حکومت میں ہماری تعلیم کا جو ڈول ڈالا گیا تھا۔ اس کا مقصد ہمیں علم سکھانا نہ تھا۔ بلکہ اس کی تہہ میں زیادہ تر سیاسی اغراض تھیں ۔ بہت دنوں کے بحث مباحثے کے بعد جب میکالے کی یادداشت کی بنا پر گورنر جنرل کی تائید سے یہ قطعی طور پر طے پایا کہ انگریزی زبان اور تمام یورپی علوم کی تعلیم انگریزی کے ذریعے سے دی جائے تو اس میں حکومت کی خاص مصلحت تھی (میکالے نے یادداشت میں کہا تھا کہ) ہمیں فی الحال انتہائی کوشش کرنی چاہیے کہ ہم ایک ایسی جماعت پیدا کریں جو ہمارے اور ہماری رعایا کے لاکھوں انسانوں کے درمیان ترجمان کا کام دے۔ یہ لوگ خون اور رنگ میں ہندوستانی لیکن ذوق، خیالات اور ذہنیت میں انگریز ہوں گے۔ کمپنی کے حکام بظاہر مذہب کے معاملے میں طرفدار تھے لیکن یہ طرفداری دکھاوے کی تھی۔ وہ بھی دل سے مشنریوں کی تائید میں تھے۔ چنانچہ میکالے نے اپنی یادداشت کے دوسرے سال ۱۸۳۶ء کو اپنے والد کو ایک خط میں لکھا کہ اگر تعلیم کی تجاویز پر عمل کیا گیا تو تیس سال کے بعد بنگال کے معزز طبقوں میں ایک شخص بھی بت پرست نہیں رہے گا۔ ایک اور بات جو انگریزی کی تعلیم کی محرک ہوئی وہ یہ تھی کہ دفتروں میں انگریزی داں کلارکوں اور اسی قسم کی چھوٹی موٹی ملازمتوں کی ضرورت تھی۔ انگریز کم تنخواہ پر کہاں ملتے انگریزی پڑھے لکھے ہندی بہت سستے ملنے لگے اس میں سرکاری کفایت مدِنظر تھی "۔

۲ے :۔ ایضاً۔ صفحات ۲۴۶ بعید۔ اسی مقابلے پر بابائے اردو نے اردو کی ترقی کیلئے مختلف تجاویز از ذرائع صفحہ ۴۴، ۲۹۶، ۲۸۱، ۲۹۰ پر پیش کئے ہیں۔

لاہور کے خطبے میں ۱۹۴۹ء میں فرمایا:۔

ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریزی طرح سنتے اور رہتے تھے اور خفا ہوتے تو اینگلو انڈین گالیاں دیتے جیسے اس زمانے کے یادگار بزرگ اب بھی موجود ہیں۔ انگریز کیسا خوش قسمت اور خوش اقبال تھا کہ اسے ایسے نیک اور وفادار بندے ملے۔

میں ایک بار سر سکندر حیات خاں مرحوم کے عہد وزارت میں یہاں لاہور آیا اور وزیر تعلیم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ یونیورسٹی میں نہیں تو کم سے کم میٹریکولیشن جماعتوں میں اردو کو ذریعہ تعلیم کر دیا جائے۔ اس سے یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ یونیورسٹی کے درجوں میں بھی اردو ذریعہ تعلیم ہو جائے گی۔ یہ سننا تھا کہ ان پر ایک جلالی کیفیت طاری ہو گئی۔ فرمانے لگے کہ اردو یا ہماری کوئی اور زبان ہرگز ذریعہ تعلیم نہیں ہو سکتی۔ کوئی زبان انگریزی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آپ اس زمانے میں ایسی باتیں کرتے ہیں جبکہ لوگ کوٹ پتلون پہنتے اور پاٹ پر بیٹھتے ہیں اس کے بعد فرمایا کہ اگر میرا بس چلے تو کشمیر سے لے کر راس کماری تک انگریزی ہی انگریزی کر دوں۔

۲۶، ۲۷ مارچ ۱۹۴۸ کے خطبے میں فرمایا کہ:۔

ترقی کی یہ رو جو اس وقت ہم پنجاب میں دیکھتے ہیں اس کے سرچشمہ کا سراغ اگر تلاش کیا جائے تو انجمن پنجاب میں ملے گا۔ جو ۱۸۶۵ء میں قائم ہوئی اس کا مقصد علوم مشرقی کی تعلیم کا از سر نو جاری کرنا اور ایسی زبانوں کے ذریعہ سے ملک میں علوم مفیدہ کی اشاعت تھا۔ انجمن پنجاب نے ۱۸۹۵ء میں اپنے ایک جلسے میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز منظور کی۔ انجمن کا منشا یہ تھا کہ مشرقی زبانوں یعنی عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم سے اردو ہندی کو تقویت پہنچائی جائے۔ اور ان کے ذریعے سے علوم و فنون کی انگریزی کتابوں کے ترجمے اپنی زبان میں کرائے۔ اور ان کی اشاعت ملک میں عام کرے۔ اسی زمانے میں ہماری قوم کے عالی دماغ مصلح سرسید احمد خان نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے جس کے وہ بانی اور آنریری لائف سیکریٹری تھے اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا میں ایک یادداشت پیش کی۔ ان دونوں تجویزوں کا حشر ایک ہی ہوا۔ وہی شبہات اور اعتراضات پیش آئے جواب بھی کبھی کبھی بعض انگریزی تعلیم یافتہ اور خاص کر وہ اصحاب جن کے ہاتھ میں نظام تعلیم ہے کرتے ہیں یعنی ابھی ہماری زبان میں اتنی سکت نہیں کہ جدید علوم کی تعلیم کا بار اٹھا سکے۔

اس میں زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ خصوصاً جبکہ ہماری رہنمائی کے لئے دو روشن مثالیں موجود ہیں۔ ایک سو سوا سو برس پہلے کی (دہلی کالج) اور ایک زمانہ حال کی (جامعہ عثمانیہ) [1]

اردو نے ہر مسلم تحریک کی مدد کی ہے۔ وہابی تحریک کو اس نے مدد دی۔ سرسید کے مشن کو اس نے چمکایا۔ خلافت کا پیغام گھر گھر اس نے پہنچایا۔ لیگ کی آواز اس نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں پہنچائی

---

[1]:- ۷۵ سال پہلے کی اور پھر جامعہ عثمانیہ سے متعلق اصطلاحات کی توضیح کی تفصیل خطبات (صفحہ ۳۵۲ بعد)

پاکستان کا پروپیگنڈا جس برق رفتاری اور قوت سے اس نے براعظم کے کونے کونے تک میں کیا اور مسلمانوں کے دلوں میں جو نیا ولولہ اور جوش اور ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ ہمارے اس زمانے کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں کیا اب ایسے وقت میں جب اسے وطن سے دیس نکالا ملا ہے پاکستان اس کی کچھ بھی مدد نہ کرے گا ؟ کیا آزادی اور حکومت ملنے کے بعد وہ اپنے اس محسن کو بھول جائے گا ؟ لہ

پاکستان میں اردو

بابائے اردو نے ایک کتابچہ "پاکستان میں اردو کا المیہ" ۱۹۵۶ء میں شائع کیا تھا اس میں سے چند ضروری اقتباسات درج کئے جاتے ہیں :۔

پاکستان کے قیام کو ابھی کچھ اوپر تین مہینے ہی ہوئے تھے کہ اس باجماعت وزیر تعلیم (فضل الرحمٰن صاحب) نے بڑے پیمانے پر ایک ایجوکیشنل کانفرنس کا ڈول ڈالا۔ جس کے اجلاس دارالحکومت کراچی میں ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء سے یکم دسمبر ۱۹۴۷ء تک ہوتے رہے۔ صدر کانفرنس جناب فضل الرحمٰن صاحب نے فرمایا :۔

ہمیں اپنی صوبائی زبانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش رکھنی چاہیئے۔ نہ صرف ذریعہ تعلیم کے لئے بلکہ اس تہذیب کی اشاعت کے لئے بھی جو ان زبانوں میں پائی جاتی ہے لیکن صرف اس حد تک کہ ہماری مشترک تہذیب (کلچر) کی وحدت کو کوئی آسیب نہ پہنچے۔ اس وحدت کے تعین کے لئے ہمیں ایک بین الصوبائی زبان کی ضرورت ہے اس بارے میں اردو زبان کے حقوق ہماری خاص توجہ کے محتاج ہیں۔ یہ مسلمانان ہند کی خاص تخلیق ہے۔ اور اس نے مقابلتاً اپنی زندگی کی کم مدت میں ادا رے مافی الضمیر خیال کے نازک سے نازک فروق اور تخیل کی بلند ترین پرواز کے اظہار کی غیر معمولی قوت اور نزاکتِ احساس حاصل کر لی ہے غیر زبانوں کے الفاظ مستعار لینے اور اپنے میں جذب کر لینے کی صلاحیت فارسی، عربی اور انگریزی سے اس کے تاریخی تعلقات اور نظم و نثر میں اس کا اعلیٰ تخلیقی سرمایہ یہ سب میری نظر میں اسے پاکستان کی لنگوا فرینکا کا مرتبہ دینے کے حق میں ناقابل تردید دلائل ہیں ؛

(ادھر پاکستان وجود میں آنے کے صرف دو ہفتے بعد یعنی یکم ستمبر ۱۹۴۷ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے کچھ اساتذہ اور طلبہ نے ایک جماعت اس مقصد سے بنائی کہ بنگالی کو پاکستان کی دوسری قومی زبان بنایا جائے یا کم از کم منوایا جائے۔ پھر فضل الرحمٰن صاحب اور دوسرے ذمہ دار حضرات کے خلاف یہ افواہ اڑائی گئی کہ وہ منی آرڈر فارموں اور نوٹوں سے بنگلہ اڑا دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ فروری ۱۹۴۸ء کو یوم احتجاج منایا گیا اور ضرب رسیدہ دوانیاں کی گئیں)

سردار عبدالرب نشتر مرحوم نے اس موقع پر فرمایا تھا کہ :۔

لہ :۔ خطبات۔ صفحہ ۱۷۴ ملاحظہ فرمائیں۔ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی خدمات کا ذکر صفحہ ۱۸ پر ہے۔

اس وقت حضرت قائداعظم بقید حیات تھے۔ انہوں نے محسوس فرمایا کہ یہ تحریک ملک کی وحدت، اور بنیادی تخیل پر ایک کاری ضرب ہے بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ بہت بڑا خطرہ مول لے کر بنگال پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان نیا نیا عالم وجود میں آیا تھا اور حکومت بے سروسامانی کی حالت میں قائم ہوئی تھی۔ ہمارے پاس کوئی ایسا طیارہ موجود نہ تھا۔ جو ایک ہی اڑان میں مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان پہنچ جائے۔ قائداعظم نے ایک پرانی مشین میں پٹرول کا انتظام کیا۔ اور ڈھاکے کے سفر کا خطرہ مول لیا۔ ہماری خواہشات اور درخواستوں کی پرواہ نہ کرکے انہوں نے اپنی زندگی کو لسانی وحدت و استحکام کی بازی پر لگا دیا۔ ایک پرانے ڈکوٹا جہاز میں ڈھاکے پہنچے اور ان سرپھرے طلبہ کو جنہوں نے دشمنان پاکستان کے کہنے میں آکر اس قسم کا سوال اٹھایا تھا۔ سمجھایا کہ اگر تم پاکستان کو قائم اور برقرار رکھنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ پاکستان کی زبان اردو اور صرف اردو ہو سکتی ہے۔ کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی۔

(قائداعظم ۹ر مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکے تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے اپنا فیصلہ اس طرح سے سنایا)

میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔ جو کوئی اس معاملے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ صریحاً پاکستان کا دشمن ہے۔

(قائد ملت لیاقت علی خان مرحوم نے انجمن ترقی اردو" کراچی کے جلسے میں ۱۹ر نومبر ۱۹۴۹ء کو فرمایا:-)

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں اور میں چاہتا ہوں کہ صاف الفاظ میں یہ واضح کر دوں کہ اردو اور صرف اردو ہماری قومی زبان ہے اور یہی ایک زبان ہے جو پاکستان کی قومی زبان بننے کی مستحق ہے۔

بنیادی اصول کی کمیٹی کی انٹرم رپورٹ ۱۹۵۰ کی دفعہ ۱۲۰ میں صاف الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ مملکت کی قومی زبان اردو ہوگی۔ ۱۹۵۲ء میں جب خواجہ ناظم الدین صاحب مسلم لیگ کے اجلاس کے سلسلے میں ڈھاکہ تشریف لے گئے تو آپ نے ۲۷ جنوری کو ایک عام جلسے میں زبان کا ذکر کرتے ہوئے قائداعظم کے اس مشہور یادگار قول کو دہرایا۔ جسے اب تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ کہنا تھا کہ دوسرے یونیورسٹیوں کے فتنہ پرداز بھارتی ہندو پروفیسروں نے جن کی کثرت تھی اور جو لڑکوں کو متحدہ بنگال کے خواب دکھا رہے تھے۔ طلبہ کو بھڑکایا۔ ایک بیل لمبا جلوس نکالا گیا۔ اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ وزیراعظم اپنا یہ بیان واپس لیں کہ پاکستان کی سرکاری زبان صرف اردو ہوگی۔ یونیورسٹی اور کالجوں میں اندر ہی اندر یہ مواد پکتا رہا۔ اور ہندو پروفیسر طلبا و طالبات کو نئی نئی ترکیبوں اور حیلہ سازیوں سے برابر اشتعال دلاتے رہے۔ حتیٰ کہ حرارت اشتعال انتہائی نقطے پر پہنچ گئی۔ انہیں اپنے اوپر قابو نہ رہا۔ اور عملی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ اور جلوس نکالا۔

(۲۲ فروری کو تین لڑکے ہلاک ہوئے اور بنگالی کو سرکاری زبان بنانے کی تحریک منظور ہو گئی۔)

مسٹر نورالامین (وزیر اعلیٰ) نے اس المناک سانحہ سے خوب فائدہ اٹھایا۔ کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے۔ خواجہ صاحب کے بعد محمد علی صاحب (بوگرہ) وزارت عظمیٰ کی مسند پر جلوہ فرما ہوئے۔ آپ نے اس منصب عالی پر فائز ہوتے ہی بنگلہ کی حمایت شروع کر دی۔ ڈھاکہ کے جلسۂ عام منعقدہ ۲ جنوری ۱۹۵۳ء میں اعلان فرمایا کہ بنگلہ کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کی خود میں سربراہی کروں گا۔

چنانچہ میں نے متواتر اسی قسم کی اطلاعات پہنچنے پر ۹ فروری ۱۹۵۴ء کو ایک بیان اخبارات کو دیا جس میں وزیر اعظم کی نسبت یہ الفاظ تھے۔

موصوف کو متحدہ پاکستان کی قومیت کا تصور ہی نہیں وہ اول و آخر صرف بنگالی ہیں۔ یہ بات ایسی مملکت کے وزیر اعظم کے منصب سے متعلق مناسبت نہیں رکھتی جبکہ وہ مختلف وحدتوں کا وفاقی مجموعہ ہے۔ جناب محمد علی صاحب کے لئے درست راستہ یہ تھا کہ وہ بنگلہ تحریک کی قیادت کرنے کے لئے اپنے عہدے سے مستعفی ہو جاتے۔

اس تحریک کی تہہ میں جہاں اور کئی باتیں ہیں وہاں ایک خاص بات یہ تھی کہ مشرقی بنگال کے انتخاب میں چند ہی روز باقی تھے۔ بنگالیوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے بھاشا کا حربہ سب سے زبردست تھا۔ آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا کھٹکا تھا ۱۹ اپریل (۱۹۵۴ء) کو شب کے وقت لیگ کی پارلیمانی پارٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اردو کے ساتھ بنگالی بھی سرکاری زبان ہو گی۔ کئی روز سے ارکان مسلم لیگ سودے بازی کر رہے تھے۔ یہ بات کبھی چھپی نہ رہی کہ مغربی پاکستان کے بعض لیگی ممبروں نے اس معاملے میں بڑی غداری اور پاک دشمنی کی۔

(اس فیصلہ کے خلاف احتجاج کیا گیا ۲۲ اپریل کو بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ اور ہڑتال کی گئی گو کہ اسے روکنے کی سرکاری کوششیں بھی بہت ہوئیں) یہ عظیم جلوس جو میرے ساتھ مجلس دستور ساز تک گیا۔ اس کی مثال اس ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی یہ جلوس انسانوں کا ایک بہتا ہوا سمندر تھا لیکن جس نظم و ضبط کا مظاہرہ جلوس میں حصہ لینے والوں کی طرف سے کیا گیا وہ ملک کی سیاسی جماعتوں کے لئے ایک سبق اور عوام کے لئے ایک زندہ مثال رہے گا۔ (پھر مذاکرات ہوئے) لیکن نہایت افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ پاکستان کے عالی مرتبت وزیر اعظم (بوگرا) نے اس معاہدہ و اثق کے خلاف جو انہوں نے اپنے دو معزز وزیروں (شعیب قریشی اور چودھری محمد علی) کی معیت میں مجھ سے اور میرے رفقاء سے کیا تھا۔ مجلس دستور ساز ۷ مئی ۱۹۵۴ء کو وہی پہلا فرسودہ ضابطہ (اردو اور بنگالی دونوں کو سرکاری زبان بنانے کا[1]) پیش کیا۔ جسے ہم رد کر چکے تھے۔ اور جس کے نقائص تسلیم کر کے انہوں نے خود اس میں مناسب تبدیلی کی تھی۔ (سوائے بی ڈی بھنڈارا کے اکثر ممبروں نے اردو کے مقابلے میں

---

[1]۔ اس ضابطہ میں آٹھ دفعات تھیں: پاکستان میں اردو کا المیہ کے صفحہ ۵۶ پر تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

"علاقائی زبانوں کی حمایت میں تقریریں کیں اور اسی طرح کی قراردادیں منظور ہو گئیں) حالات عجیب بے ہنگم طور پر بدل رہے تھے۔ اقتدار کے بھوکے سب کچھ گوارا کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ کسی طرح گوارا نہیں ہوتا کہ ان کے اقتدار پر آنچ آئے۔ اس کشمکش میں ہار جیت لازم ہے۔ گورنر جنرل نے بڑی جرأت کر کے اپنے اختیار سے کابینہ کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ اور نئی کابینہ اور نئی مجلس دستور ساز بنا ڈالی۔ اور دفعتاً ون یونٹ کا بم اس طرح پارلیمنٹ میں لا کر پھینکا کہ کسی کو سوچنے کا موقعہ بھی نہ ملا۔ اب مغربی پاکستان کو اس کے مختلف صوبوں اور ریاستوں کے حدود اور نشان مٹا کر ایک وحدت میں بدل دیا گیا۔ اس میں بھی جیت مشرقی بنگال کی رہی۔ اس کا صوبہ اکھنڈ رہا۔ اور یہاں باوجود وحدت کے کھنڈت پڑ گئی۔ ڈھونڈ کر ایک ایسے شخص کو وزارت عظمیٰ کی کرسی پر لا بٹھایا جسے تدبر سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ اس نے چند روز نظام کی طرح دام چلائے اور اپنے منصب کو بٹا لگا کر اپنے آقا کے ساتھ بساط سیاست سے پٹے ہوئے مہرے کی طرح روپوش ہو گیا۔ اس وزیر بے تدبیر نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور پھوٹ کا بیج بو دیا۔ باوجود مملکت پاکستان کے وزیراعظم اور آل پاکستان مسلم لیگ کے صدر ہونے کے وہ مشرقی پاکستان میں بنگالی کی تبلیغ کرتا پھرا محض اس نیت سے کہ آئندہ الیکشن میں اسے ووٹ ملیں۔ اور اس کی وزارت قائم رہے۔ اب ایک دوسرا نیا دور شروع ہوتا ہے اور گورنر جنرل نئے وزیراعظم اور نئے وزراء کی سبھا قائم ہوتی ہے۔ ہر طرف دستور کی دہائی ہے۔ گویا گزشتہ سات سال میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اور اب چند مہینے میں سب کچھ ہو جائے گا۔ وزیراعظم کو دستور کی دھن تھی۔ یہ قانون، سیاست تدبر کا مسئلہ نہ تھا۔ عزت و آبرو کا معاملہ بن گیا تھا۔ اندر ہی اندر سمجھوتے ہونے لگے۔ دستور کا جلد سے جلد پاس کرانا مقدم ٹھہرا۔ یہ سب جانتے تھے کہ زبان کا مسئلہ مجلس دستور ساز میں ضرور آئے گا۔ اور جلد آئے گا۔ لیکن ہمارے محترم وزیراعظم سے نہ رہا گیا۔ اور جذبہ خوشنودی سے بیتاب ہو کر قبل از وقت ایوان میں بلا تکلف اور بلا خوف ملامتِ ضمیر یہ اعلان فرمایا کہ بنگالی بھی سرکاری زبان ہو گی۔ اگرچہ یہ اعلان اسوقت بالکل بے محل تھا لیکن شاید مصلحت کا تقاضا یہی ہو۔ یہ سیاسی رموز ہیں۔ اسے ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب اردو کے گلے پر چھری پھرنے والی تھی۔

۱۶ر فروری ۱۹۵۶ء کو زبان کا مسئلہ مجلس دستور ساز میں پیش ہوا۔ (ملی بھگت سے علاقائی زبانوں کی سرپرستی پر زور دیا گیا۔ اور مشرقی پاکستان میں جو چند طلباء ہمارے دشمنوں کی حمایت سے بے قابو ہو کر ہلاکت کی زد میں آ گئے تھے۔ ان پر فخر کر کے بنگالی کو سرکاری زبان منظور کرایا گیا۔) یہ حشر ہوا ہماری قومی زبان کا "اسلامی جمہوریہ پاکستان میں۔ یہ جائے عبرت ہے (لیکن) ہم ان کی قراردادوں سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کی رکاوٹیں ہمارے کام میں تیزی پیدا کرتی ہیں۔ اردو نے مخالفتوں میں پرورش پائی ہے۔ اس کا پایہ اس قدر مضبوط ہے کہ اس قسم کے طوفانی حوادث اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔ ہم

اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ اور اب یہ کام خاص اصول اور منصوبے کے تحت انجام پائے گا۔ اعلیٰ ترین پائے تک پہنچنے کے لئے ہمارے ادب میں جو کمی ہے اسے پورا کیا جائے گا۔ جو خامیاں ہیں ان کی اصلاح کی جائے گی دائرہ تحقیق وسیع تر کیا جائے گا۔ ہر شعبے کو جہاں تک ممکن ہوگا قومی بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اور ہم اپنی ساری، ذہنی، دماغی اور اخلاقی قوتیں اس عظیم نصب العین کے حصول میں صرف کریں گے جسے ہم اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ یعنی اردو یونیورسٹی کا قیام[۱] یہ یونیورسٹی اپنی نظیر آپ ہوگی یہ قومی زبان اور قومی روایات کو زندہ رکھے گی اور فروغ دے گی۔ اس کا سنگ بنیاد ایک ایسے شخص کا دست مبارک رکھے گا۔ جس کے آنے کا انتظار ہے۔

پاکستان کے وزیر اعظم کے متعلق ۱۹۵۶ء میں کہتے ہیں :۔

ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایسے شخص کو وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر لا بٹھایا جسے تدبر سے کچھ واسطہ نہیں تھا۔ اس نے چند روز نظام کی طرح چام کے دام چلائے۔ اور اپنے منصب کو بٹا لگا کر اپنے آقا کے ساتھ بساطِ سیاست سے پٹے ہوئے مہرے کی طرح روپوش ہو گیا۔ اسی وزیر بے تدبیر نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور پیپرٹ کا بیج بو دیا۔"

اسی ضمن میں آگے چل کر کہتے ہیں

جمہوریت کا زمانہ ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا مدار تعداد پر ہے۔ جدھر زیادہ ہاتھ اٹھ گئے۔ وہی جیت گیا۔ جہاں دماغ نہیں ہوتا۔ اخلاقی جرات نہیں ہوتی جہاں ذاتی یا پارٹی کا مفاد مدِنظر ہوتا ہے۔ جہاں شہرت یا ہر دلعزیزی کی چاہت ہوتی ہے۔ جہاں جذبات سے زیادہ عقل و دانش سے کم بحث ہوتی ہے۔ جہاں خود اعتمادی اور قوت ایمانی کا فقدان ہوتا ہے وہاں تعداد ہی غالب ہوتی ہے[۱]

"پاکستان میں اردو کا المیہ" کے آخر میں فرماتے ہیں کہ :۔

ہم بہی خواہان اردو کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ (اردو) یونیورسٹی اپنی نظیر آپ ہوگی۔ یہ قومی زبان اور قومی تہذیب و روایات کو زندہ رکھے گی اور فروغ دے گی اس کا سنگ بنیاد ایک ایسے شخص کا دست مبارک رکھے گا جس کے آنے کا انتظار ہے"۔

اور اسی کتابچے کے صرف حالیہ میں ہے کہ :۔

حکومت بودوں کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کی تلاش ہے۔ اس کی آمد کا انتظار ہے"۔

یہ ہے اسے بابائے اردو کے قلم کی بے باکی جسے ماہانہ وظیفہ دے کر حکومت نے خوش کرنا چاہا تھا۔

زبان کی سلاست، قوت اور پختگی کے لئے "درد دل" اور اخلاص کی ضرورت ہے۔ جہاں یہ چیز ہوگی کامیابی قدم چومے گی اور ہر موضوع ایک شاہکار بن جائے گا۔ دیکھئے ایک اصلاحی بحث میں بھی کس قدر زورِ بیان پایا جاتا ہے"۔

"رجعت اور ترقی، اضافی چیزیں ہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ حرکت میں ہے۔ اور ہر چیز پر تغیر کا عمل جاری ہے۔ رجعت یا ترقی، ہر زمانے کے حالات

اور ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یہ خیال ہے کہ ہر چیز جس کا تعلق گزشتہ زمانے سے ہے۔ سراسر رجعت سے آلودہ ہے۔ یہ صحیح نہیں محض اس بنا پر کہ ہم آگے بڑھ گئے ہیں۔ گزشتہ سے تعلق قطع نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا کرنا اپنی جڑیں کاٹنا ہے۔" ؂۱

یہی "درد دل" عقل و عشق کی بحث میں بھی دیکھئے۔ فرماتے ہیں کہ:-

عقل و عشق کی لڑائی ایک عجیب داستان ہے یہ مہا بھارت اور جرمن جنگ سے بھی کہیں زیادہ ہولناک ہے۔ یہ عالمگیر جنگ ہے۔ جو ہر آن ہر ساعت اور ہر مقام پر برپا ہے۔ اور ابتدائے آفرینش سے اب تک قائم ہے۔ اور رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ انسان نہ صرف عقل ہی عقل ہے۔ اور نہ جذبات ہی جذبات اگر وہ محض عقل ہی ہوتا تو ایک اچھی خاصی مشین ہوتا اور اگر جذبات ہی جذبات ہوتا تو بلاشبہ مجنوں ہوتا۔ کاش وہ کچھ ہوتا۔ ایک ہوتا لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ اس میں دونوں فتنے موجود ہیں۔ عقل اسے ایک طرف کھینچتی ہے اور عشق دوسری طرف اور دونوں کے راستے ایک دوسرے سے مخالف اور متضاد ہیں۔ جب توفیق یاوری کرتی ہے۔ تو ایسے نازک وقت پر بہت سامنے آتی ہے اور التوائے جنگ کا ڈول ڈال کر لڑاکوؤں کو سمجھانا بجھانا شروع کرتی ہے۔ عشق پر معمولی پند و نصائح کا اثر کیا ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ اسے اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے بھاتی ہے کہ وہ صلح پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس صلح میں راہ مستقیم ہے۔ اسی راستے کے چلنے والوں میں کبھی کبھی کامل نظر آجاتے ہیں۔" ؂۱

بظاہر یہ بحث سب رس کے تمثیلی قصے سے متعلق ہے۔ لیکن حقیقت ہے کہ اس بحث میں ایک بہت بڑی حقیقت کی پردہ کشائی ہے۔ سچ ہے کہ صرف علم ادب کی تحصیل ایک ادیب کیلئے کافی نہیں۔ اس کے لئے علم، ذکاوت، محنت، شوق، تربیت، جرأت، بصیرت اور سب سے زیادہ اخلاص اور "درد دل" کی ضرورت ہے۔ اور یہ سب چیزیں بابائے اردو کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

(ج)

بابائے اردو کی نثر

بابائے اردو کی نثر کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی ہے۔ انھوں نے بارہا اس سادگی کا ذکر کیا ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ باغ و بہار کے مقدمے میں فرماتے ہیں:-

سادہ زبان لکھنا سخت مشکل ہے۔ سادگی بعض وقت عامیانہ یا بے مزہ ہو جاتی ہے۔ سادگی کے ساتھ فصاحت اور لطف بیان کو قائم رکھنا بڑا کمال ہے۔"

خطبات میں متعدد مقامات پر

؂۱ خطبات صفحہ نمبر ۹۰۔ ؂۱ مقدمہ سب رس۔

سادگی اور لفظ کی قوت کا ذکر ہے۔ ایک
جگہ فرماتے ہیں کہ:۔

"لفظ ایک بڑی قوت ہے۔ اور اس کا برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کرتا ہے۔ جو اس گُر سے واقف نہیں اور لفظ کے صحیح برمحل استعمال کو نہیں جانتا اس کا بیان اکثر ناقص، ادھورا اور بے جان ہوتا ہے۔ یہ دو چیزیں ہیں۔ ایک ادب کا ظاہر یعنی زبان اور دوسرے ادب کا باطن یعنی خیال۔ اگرچہ ان کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ یہ لازم و ملزوم ہیں۔ انہی کے میل سے اسلوب بیان یعنی اسٹائل بنتا ہے"۔ [1]

ایک جگہ اس طرح مشورہ دیتے ہیں:۔

"زیادہ زور اس بات پر دینا چاہئے کہ بیان سادہ اور سہل ہو رہا لفظ تو اس کا پرکھنے والا ادیب ہی ہو سکتا ہے۔ وہ ہر لفظ کی نبض پہچانتا ہے اور خوب سمجھتا ہے کہ کون سا لفظ کہاں آنا چاہئے اس موقع اور محل کو پہچاننا بڑی بات ہے۔ یہ انشا پردازی کا بڑا گُر ہے۔ لفظ میں ایک جادو ہوتا ہے جو بے محل استعمال سے پھیکا پڑ جاتا ہے اور اچھا خاصا لفظ بے جان اور بے اثر ہو جاتا ہے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری آواز زیادہ سے زیادہ اشخاص تک پہنچے تو ہمیں ایسی زبان میں لکھنا یا بولنا چاہئے۔ جسے زیادہ سے زیادہ اشخاص سمجھ سکیں۔ اور اگر ساتھ ہی آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر و تقریر میں اثر اور دلکشی بھی ہو تو اس کے لئے بڑی محنت، مشق اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ ورنہ بڑی سادہ زبان زیادہ کارآمد نہیں ہو سکتی"۔ [1]

ایک اور جگہ یوں ارشاد ہے:۔

"محض زبان کا آسان ہونا کافی نہیں۔ اس میں جان، اثر اور لطف بھی ہونا چاہیئے اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایسی زبان صرف کامل ادیب ہی لکھ سکتے ہیں ورنہ ایسی تحریر سے کیا فائدہ جو سپاٹ بے مزہ اور بھدی ہو"۔ [2]

اسی لئے سرسید کی نثر کی قدر کرتے ہیں اور صحیح طور پر سراہتے ہیں کہ:۔

"سرسید کی سادہ نویسی مشہور ہے۔ مجھے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں اپنے خیالات ایسی زبان میں ادا کرنا چاہتا ہوں جسے گھر کی ماما اور سائیس بھی سمجھ لے کہ اور انہوں نے یہ کر دکھایا۔ سنجیدہ اور علمی مضامین بھی انہوں نے بڑی ستھری اور اور آسان زبان میں لکھے ہیں۔ اور بعض اوقات انہیں سادہ الفاظ [3] اور فقروں کے صحیح استعمال نے وہ قوت اور دلکشی پیدا کر دی ہے کہ جو بڑے بڑے الفاظ اور جملوں سے ممکن نہیں۔ جس زمانے میں مولانا شبلی حیدر آباد میں مقیم تھے۔ میں ایک روز ان سے ملنے گیا۔ دیکھا کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں۔ (اس زمانے میں وہ علم الکلام لکھ رہے تھے) میں نے پوچھا "مولانا کس فکر میں ہیں؟ فرمایا

---

[1] ایضاً صفحہ ۳۵۴

الہام ووحی کے موضوع پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں سرسید نے نے بھی اس پر لکھا ہے، لکھا کیا مسئلے کو پانی کر دیا ہے میں حیران ہوں کہ کیا پیرایہ اختیار کردں " [1]

باباے اردو کے پیش نظر سرسید کی زبان تھی لیکن انکا انداز بیان شہادت دیتا ہے کہ وہ مولانا حالی سے زیادہ متاثر ہیں اور یہ چیز بذات خود سرسید سے اثر پذیری کی نشان دہی کرتی ہے۔ مولانا حالی کے متعلق تحریر ونز ملتے ہیں:۔

لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے۔ ادب کا بڑا کمال ہے۔ اور یہ کوئی حالی سے سیکھے دلوں میں گھر کر لینے کے جو گر ادب میں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔" [2]

اس سے پہلے اسی مضمون میں مولانا حالی کے متعلق بابا نے لکھا ہے:۔
مولانا کی سیرت میں دو ممتاز خصوصیتیں تھیں ایک سادگی اور دوسری درد دل اور شان ان کے کلام میں ہے ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔"

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ٹھیک یہی دو خصوصیتیں خود باباے اردو میں ہیں اور یہی شان ان کے کلام میں بھی ہے۔ ان کی کوئی عبارت کوئی مضمون اور کوئی تقریر ان دو خصوصیتوں سے خالی نہیں اور یہی ان کا سب سے بڑا کمال ہے۔

سرسید اور مولانا حالی کی نثر میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ ہندی کے عام اور سبک الفاظ جو بول چال میں بلاتکلف آتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے تھے۔ چند ہم عصروں نے حالی کے ذکر میں ہے کہ:۔

ایک بار جب اردو لغت کی ترتیب کا ذکر ان سے آیا تو فرمانے لگے کہ

اردو لغت میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں۔ یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں۔ بلاتکلف کثرت سے داخل کرنے چاہئیں۔ خود اپنی نظم ونثر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوبصورتی سے لکھ جاتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اسی موقع کے لئے وضع ہوئے تھے۔ انہوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اردو ادب میں داخل کئے

---

[3] صفحہ ۵۲۱ میں ہے کہ " اس سے قبل ہماری زبان میں قوم کا لفظ ذات کے معنوں میں آتا تھا۔ سرسید نے اس لفظ کا مفہوم بدل دیا اور پہلی بار قوم کو " نیشن " کے معنوں میں استعمال کیا۔

[1] ایضاً ۴۵۴ ، [2] ایضاً ۴۶۱

[1] ایضاً ۵۲۵ ، [2] چند ہم عصر (حالی لفظ کی قدر)

[3] ایک اور عمدہ بیان خطبات (۵۲۶) میں بھی ہے

جو ہماری نظر سے اوجھل تھے ۔ اور جن کا آج تک
کبھی کسی اردو ادیب یا شاعر نے تو کیا ہندی
ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا
بابائے اردو کا عمل بھی اسی پر ہے
چنانچہ ان کی تمام تحریروں میں ہندی
اور عام بول چال کے الفاظ بھی بکثرت
پائے جاتے ہیں ۔ کچھ نمونے یہاں
درج کئے جاتے ہیں :۔

(۱) باغ و بہار کے مقدمہ میں ہے :۔
" اردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب
زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے
لگا نہیں کھاتی ۔ اگرچہ زبان نے بہت کچھ پلٹا کھایا
ہے ۔ اس وقت اور اس وقت کی زبان میں بہت
بڑا فرق ہے ۔ تاہم باغ و بہار اب بھی ویسی ہی دلچسپ
اور پڑھنے کے قابل ہے جیسے پہلے تھی ۔"

(۲) کلیات ولی (مرتبہ مولانا احسن مارہروی)
کے شروع میں التماس کے ذیل میں ہے
" جن صاحبوں کو کبھی قلمی نسخوں سے سابقہ
پڑا ہے ۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ قلمی نسخوں کی صحت
اور مقابلے میں کیسی کچھ کھکھیڑ اٹھانی پڑتی ہے
کم سوار خوشنویسوں ہی نے نہیں ، بلکہ ذہین
خوشنویسوں نے بھی کتابوں کا وہ ستیاناس کیا ہے
کہ صحت کی بحث ان کی بدولت ، رہتی دنیا تک
رہے گی ۔ اگرچہ اس تصحیح و ترتیب ، ترمیم و اضافہ
میں بہت کچھ کھڑاگ کرنا پڑا ۔ اور طوالت بھی بہت
زیادہ ہوگئی ہے ۔ تاہم مجھے امید ہے کہ یہ محنت
رائیگاں نہ جائے گی ۔"

(۳) سب رس کے مقدمے میں ایسے
جملے آتے ہیں :۔
" فتاحی سے ایسی چوک نہیں ہوئی ۔"
" یہ بڑے مزے کا قصہ ہے اور کون ہے جو
اس کوچے سے ناآشنا ہے ۔ اور اس نے اس موکے
میں چوٹ نہ کھائی ہو ۔"
" آخر یہ چوری کب تک چھپتی ، رقیب کی ایک بیٹی
تھی جس کا نام غیر تھا ۔ حسن کے پاس رہتی تھی ظاہر
میں دوست پر دل میں کھوٹ تھا ۔"

(۴) مضامین محفوظ علی کے مقدمے
میں ہے :۔
" مختلف ممالک کے سامانوں کی جانچ پڑتال
کی ۔ ایک دستکی یعنی نوٹ بک ہر وقت ان کی
جیب میں شرم تھی ۔ جہاں کوئی کام کی چیز نظر پڑی
فوراً ٹانک لی ۔" مولانا ظفر علی خان رسی تڑا کے
بھاگے تھے ۔ پھر اسی تھان پر آگئے ۔" مولانا محمد علی
نے کیسے کیسے جتن کئے کہ وہ ان کے پاس دلی میں
رہیں اور ہمدرد کے کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں مگر
وہ کسی طرح ہتے نہ چڑھے ۔"

(۵) صرف ایک کتاب خطبات میں سے
بکثرت ایسے نمونے تلاش کئے جا سکتے ہیں ۔
" اس کے جانچنے کے لئے ہر کونے کھدرے
پر نظر دوڑانی چاہیئے ۔" صفحہ نمبر ۱۴
" انجمن ترقی اردو ایک مدت تک اٹکل پچو
کام کرتی رہی ۔" صفحہ نمبر ۳۷

• اس (سیاسی) رنگ کو اور گہرا کرنے کے لئے اکثر مذھب کی پٹ جاتی ہے" صفحہ نمبر ۵۲

"رسم الخط کا مسئلہ آج کل بہت زیر بحث ہے اور خاصا بھڑوں کا چھتا بن گیا ہے" صفحہ نمبر ۴۱

"بہت پتا مارنے کا کام ہے" صفحہ نمبر ۶۷

"مدتوں تک انتظار کرنے اور سالہا سال کی مصیبت اور کھکیڑ اٹھانے سے حاصل" صفحہ نمبر ۸۳

"جب لفظ ہماری زبان میں آگیا اور رس بس گیا تو وہ غیر زبان کا نہیں رہتا۔ دوسری زبان میں مل جانے سے نہ اس کی پہلی سی صورت اور چہرہ مہرہ رہتا ہے اور نہ سیرت و خصلت" صفحہ نمبر ۱۱۱

"ہندی کی بھونڈی بولیوں کو ملا کر جھاڑ جھنکار کو چھانٹا" صفحہ نمبر ۲۴۳

"حالات نے پلٹا کھایا" صفحہ نمبر ۱۰۹

"زمانے نے پلٹا کھایا" صفحہ نمبر ۲۹۱

"یہ مقام جہاں جلوہ فرما ہیں۔ اردو کا گہوارہ اور اتارہ رہا ہے" صفحہ نمبر ۲۵۱

"لیکن جب انہیں اس کی سن گن معلوم ہوئی" صفحہ نمبر ۳۶۴

"اس وقت سے دلوں میں ایسا بل پڑا ہے کہ اب تک نہیں نکلا" صفحہ نمبر ۲۶۹

"یہ آگ جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، مارچ ۱۸۹۸ء میں یکایک بھڑک اٹھی" صفحہ نمبر ۲۷۱

"وہ جو ذرا سا تسمہ لگا رہ گیا تھا، ظالم نے وہ کاٹ کر رکھ دیا" صفحہ نمبر ۲۷۲

"ہندو سبھا نے اس کی حمایت میں زمین آسمان ایک کر دیا" صفحہ نمبر ۲۷۴

"وہ اسمیں بھی پیچھے نہیں رہی" صفحہ نمبر ۴۰۶

"یہ خدا لگتی بات تھی۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کہاں سنائی دیتی ہے؟ گاندھی جی لکیر پیٹتے رہ گئے۔ اور سانپ کبھی کا نکل چکا تھا" صفحہ نمبر ۳۶۸

"بعض نے ہامی بھری مگر کچھ نہ کیا" صفحہ نمبر ۴۹

"سارے میخیں نکالیں اور ایک ایک کے پھوسڑے نکال ڈالے" صفحہ نمبر ۴۱۲

"یہ کام کرنے کے لچھن نہیں، ٹالنے کی باتیں ہیں" صفحہ نمبر ۴۳۰

"اس میں پتا مارنا پڑتا ہے" صفحہ نمبر ۴۳۷

"تنے کی چھال اتار لینے سے درخت ٹھنٹھ ہو کے رہ جاتا ہے" صفحہ نمبر ۴۸

"ہم اردو والوں کو بڑا غرہ ہے" صفحہ نمبر ۴۵۴

"غلامی کا جوا اتار پھینکنے کا خیال خوب ہے" صفحہ نمبر ۴۷۹

"لوکیاں ان کی شان میں جھنتے پڑ جاتے"؟ صفحہ نمبر ۵۲۲

مذکورہ بالا اقتباسات میں ہندی کے میٹھے بچن بھی ہیں۔ اور عام بول چال کے الفاظ و محاورات بھی ہیں کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جو صرف ادبا کی زبان پر ہیں۔ لیکن سادگی ان سب میں ہے۔ اور اس سادگی میں وہ زور اور قوت ہے کہ ان

کے اور مترادف میں بمشکل نظر آئے گی برسوں کی محنت، مطالعے اور مشاقی سے یہ چیز ضرور حاصل ہو سکتی ہے لیکن وہ جو مولانا حالی کی سادگی کے ساتھ درد دل والا جذبہ کارفرما ہوا کرتا تھا۔ ٹھیک وہی جذبہ بابائے اردو کی تحریر و تقریر میں موجود ہے۔ اور از دل خیزد و بر دل ریزد کے مصداق اس کلام کی اثر انگیزی میں کوئی کلام نہیں۔ دیکھئے حسب ذیل اقوال اور خیالات میں کس قدر اخلاص اور کس درجہ اثر ہے؟

"جب کوئی وار کارگر نہیں ہوتا تو مذہب اور سیاست کی آڑ لی جاتی ہے"۔ صفحہ نمبر ۵۵

"زندگی مسلسل ہے، اسی طرح ادب بھی مسلسل ہے"۔ صفحہ نمبر ۶۸

"ہر پرانی چیز بری نہیں اور ہر نئی چیز اچھی نہیں"۔ صفحہ نمبر ۶۹

"دنیا میں سب سے بڑا وہ ہے جس کی آواز تمام بنی نوع انسان تک پہنچ سکتی ہے"۔ صفحہ نمبر ۱۲۳

"جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ انسان اپنے اعمال سے جانا جاتا ہے"۔ صفحہ ۲۴۶

"سکوت و سکون، بے عملی و بے اعتنائی انسانوں اور قوموں کے سب سے بڑے دشمن ہیں" صفحہ نمبر ۲۸۲

"زبان کی پھوٹ سب سے بڑی پھوٹ ہے" صفحہ نمبر ۳۴۹

"جب ایک قوم دوسری قوم کو فتح کر لیتی ہے یا اس پر غالب آ جاتی ہے تو سب سے پہلے وہ مفتوح یا مغلوب قوم کی زبان پر حملہ کرتی ہے۔ اور اس کے مٹانے کی کوشش کرتی ہے"۔[1] صفحہ نمبر ۳۶۴

"حسن تدبیر اور حسن عمل آئی بلا کو ٹالنے کے لئے دو ہتھیار ہیں"۔ صفحہ نمبر ۳۸۱

"ہم سوچتے بہت ہیں کرتے کم ہیں"۔ صفحہ نمبر ۳۸۱

"مصیبت بعض وقت رحمت ثابت ہوتی ہے"۔ صفحہ نمبر ۳۸۴

"کام وہ اکسیر ہے جو بڈھے کو بھی جوان بنائے رکھتی ہے"۔ صفحہ نمبر ۳۸۵

"جو لوگ اور قومیں سختی برداشت کرنے اور دل لگا کر مسلسل کام کرنے سے جی چراتی ہیں، انہیں کبھی آزادی نصیب نہیں ہوتی"۔ صفحہ نمبر ۳۹۹

"جب کسی کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں تو اس کے اثر سے جسمانی اور دماغی قوا بھی زوال پذیر ہو جاتے ہیں" صفحہ نمبر ۳۹۹

"غلطی وہی کرتا ہے جو کچھ کرتا بھی ہے۔ جو کچھ کرتا نہیں وہ غلطی کیا کرے گا"۔ صفحہ نمبر ۴۳۵

"میرا یہ عقیدہ ہے کہ سب انسان نیک ہیں سوائے کاہل کے"۔ صفحہ نمبر ۴۳۶

---

[1] یہ قول بظاہر ایک عیسائی سے نقل کیا گیا ہے۔ لیکن الفاظ تو عبدالحق صاحب ہی کے ہیں۔


توانائی کی
انتھک
مسلسل تلاش
قومی ترقی و توسیع کے بے شمار نئے منصوبوں پر
پاکستان تیز رفتاری سے گامزن ہے.
ترقی کی اس رفتار کو قائم رکھنے کے لئے
ملک کو زیادہ سے زیادہ توانائی کی ضرورت ہے
آئل اینڈ گیس ڈیولپمنٹ کارپوریشن
قدرتی ذخائر سے مالامال زمین وطن سے
توانائی کی تلاش و فراہمی میں سرگرم عمل ہے
تپتے ہوئے صحراؤں میں
ہم دن رات، اپنی ترقی کی بنیادی قوت۔
توانائی تلاش کر رہے ہیں۔
OGDC
آئل اینڈ گیس
ڈیولپمنٹ
کارپوریشن
ہمارا عہد۔ تیل میں خود کفیل پاکستان

جناب بدر شکیب

اُردو کی سرکاری حیثیت اور ایسٹ انڈیا کمپنی

شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت کے انحطاط کیساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثر واقتدار میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔ بنگال میں تو پورے طور پر ان کی عملداری قائم ہو گئی تھی۔ اور انگریزوں نے اپنے علاقوں کا پورا دیوانی اور فوجداری نظم ونسق سنبھال لیا تھا۔ اس زمانے میں مغلیہ سلطنت کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ حکومت کا سارا کاروبار اسی زبان میں انجام پاتا تھا۔ اور اس کے حصول کو باعثِ عزت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن انگریز اس کی بالادستی کو برداشت نہیں کرسکتے تھے چونکہ خود ان کی اپنی زبان انگریزی کی ترویج کے لیے فضا سازگار نہیں تھی اور نہ میکالے کو ابھی تک اس زبان کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے رپورٹ پیش کرنے کیلئے مقرر کیا گیا تھا۔ اس لیے انگریز فارسی کی جگہ کسی ملکی زبان کو لانا چاہتے تھے۔ ان کی نظرِ انتخاب اردو پر پڑی کیونکہ دیسی زبانوں میں سب سے زیادہ یہی عوام میں مقبول تھی۔ چنانچہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے حکم سے ۲۰ نومبر ۱۸۳۷ء کو فارسی کی سرکاری حیثیت ختم کردی گئی اور عدالتی مقدمات اور محکمۂ مال کی کارروائیوں میں فارسی کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔

اس حکم نامے میں اس امر کی صراحت نہیں کی گئی تھی کہ فارسی کی جگہ کون سی زبان استعمال کی جائیگی۔ اس کے انتخاب کا اختیار گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو دیا گیا تھا جس کی جانب سے وہ کسی مجلس (اتھارٹی) یا عہدیدار کو تفویض بھی کیا جاسکتا تھا۔

۱۸۳۹ء میں ڈپٹی گورنر کے حکم سے عدالتی زبان اردو قرار دی گئی اور اس کا رسم الخط فارسی منظور کیا گیا۔ اس خصوصی حکم میں صدر عدالت دیوانی اور صدر نظامت کلکتہ نے مشترکہ طور پر اردو کی ترویج کے بارے میں جو حکم جاری کیا اس کے اقتباس کا ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"(الف) عدالت یہ طے کرتی ہے کہ عزت مآب ڈپٹی گورنر کی منظوری سے آئندہ پریسیڈنسی

صدر دیوانی اور نظامت عدالت کی تمام کارروائیاں اور احکام میں اردو زبان کو سرکاری حیثیت حاصل ہوگی اور جو فارسی رسم الخط میں لکھی جائے گی۔

(ب) تمام دیوانی مقدمات کے امثلہ اور کاغذات جو عدالت ہذا کو روانہ کئے جاتے ہیں اور جو فارسی اردو یا بنگالی میں ہوتے ہیں ان کے ساتھ اب ترجموں کے بھیجنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن نظامت عدالت کو سپرد ہونے والے فوجداری مقدمات بجز مقدمات جرم ٹھگی کے جو فارسی یا اردو میں مرتب نہ ہوئے ہوں ان کے ساتھ اردو ترجمہ روانہ کیا جائیگا۔

(ج) موگ، اڑیسہ اور دیگر بولیوں کے تمام کاغذات کے ساتھ ان کا اردو ترجمہ منسلک کیا جائیگا۔

(د) اضلاع بنگال کے عہدیدار آپس میں مقامی زبان میں مراسلت کریں گے۔ لیکن دیگر اضلاع کی عدالتوں سے مراسلت کے وقت اردو زبان استعمال کی جائے گی۔ اس قاعدے کا اطلاق بلا کسی لحاظ کے کٹک اور دوسرے صوبہ جات پر بھی ہوگا جو عدالت ہذا کے ماتحت ہوں گے۔

(ھ) ان اضلاع کے عہدیداروں کو جہاں کے عملہ کو دیسی زبان میں خاطر خواہ دستگاہ حاصل نہیں یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ انہیں اس زبان میں مہارت حاصل کرنے کا مناسب وقت دیا جائے

ایک مہذب اور متمدن حکومت فصل خصومات اور مقدمات کے تصفیہ میں قانون کی بالادستی اور انصاف کی اعلیٰ روایات کو اسی وقت برقرار رکھ سکتی ہے جب حکومت کے قوانین کو عوام سمجھ سکیں اور جب ان پر جرائم کی خلاف ورزی کا الزام عائد کیا جائے تو وہ اپنی صفائی میں اپنی زبان کو پیش کر سکیں۔ عدالتی زبان اور عوام کی زبان اگر ایک نہ ہو تو حکومت اور عوام کے درمیان مغائرت کے پردے حائل ہو جاتے ہیں۔ انصاف میں خلل واقع ہوتا ہے اور عوام حکومت سے بددل ہو جاتی ہے۔ اس نکتہ کو کمپنی بہادر اور اس کے ذی ہوش عہدیداروں نے بروقت محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے ایک انگریز جج فریڈرک جان شور نے جس طرح اس کو بیان کیا ہے اسکا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

"جس زبان میں قوانین کی اشاعت ہوتی ہے اس کو لازماً وہی زبان ہونی چاہیئے جس میں عدالتی کارروائیاں انجام پاتی ہوں۔ میں مکرر حکومت پر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ انصاف رسانی اور عوام کو مطمئن کرنے کے واحد دانشمندانہ طریقے کو قبول کر کے دیسی زبان اور اس کے رسم الخط کو منظور کیا جائے تاکہ آبادی کے کثیر طبقہ کو اس امر کی شکایت نہ رہے کہ اسے اصطلاحاتِ قانونی کو جاننے سے روکا گیا ہے اور یہ کہ عدالتوں کی کارروائیوں کو وہ سمجھ نہیں سکتے۔ ایک دیوانی مقدمے میں ایک شخص اپنے مقدمے کی کارروائی ایک غیر زبان میں سنتا ہے اور اس کی سمجھ میں اس کا ایک لفظ بھی نہیں آتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کو اس وقت معلوم ہوتا ہے جب اس

کا وکیل اس کی طرف متوجہ ہو کر اسکو بتاتا ہے کہ وہ مقدمہ ہار گیا۔ اسی طرح ایک غریب ملزم کو اسکے خلاف ایک غیر زبان میں مقدمہ چلانے کے لیے عدالت میں لایا جاتا ہے۔ غیر زبان میں اس کو سزا دی جاتی ہے۔ حیرت اور لاعلمی سے وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے کہ اس کے خلاف کیا ہو رہا ہے۔ اور جب وہ عدالت کے باہر لایا جاتا ہے تو شریف اس کو یہ اہم اطلاع دیتا ہے کہ اس کو پھانسی دی جانے والی ہے۔"

ایک انگریز جج نے ایسے زمانے میں جب کہ ہند پر انگریزوں کا تسلط مستحکم نہیں ہوا تھا عدالتوں میں ایک غیر زبان کے استعمال کے خلاف جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے آج بھی سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ اصول تھے جس نے انگریزوں کو اردو کی سرکاری حیثیت قبول کرنے پر مائل کیا تھا اور جنگ آزادی ہنگامہ خیز دور تک انگریزوں نے اپنی حکومت اردو میں ہی چلائی اس کے بعد میکالے اور دوسرے انگریزوں کی آراء کے بموجب اردو کی بجائے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا جس کی تفصیل آئندہ باب میں دی گئی ہے۔ موجودہ باب کے اغراض کیلئے یہاں ہمیں یہ بتلانا مقصود ہے کہ انگریزوں نے ابتدا میں اردو کو کیوں منتخب کیا تھا اور اس کی توسیع و اشاعت میں انہوں نے کیا حصہ لیا۔

کسی زبان کو سرکاری حیثیت دینے کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے سارے آئین و قوانین، احکام و قواعد، عدالتی کارروائیاں، مراسلت اور حکومت کے سارے کاروبار میں سرکاری زبان کا استعمال لازمی ہو جاتا ہے۔ عوام کے لیے اس کا حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر حکومت سے ربط و ارتباط قائم نہیں ہو سکتا۔ اس سے ایک طرف حکومت کے کاروبار میں سہولت پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف اس زبان کی ترقی کی راہیں بھی کھلتی ہیں۔

چنانچہ انگریزوں نے بھی اردو کی ترقی پر اپنی توجہ مرکوز کی اور خود انگریز عہدیداروں نے اردو کے ادیبوں کو ساتھ لے کر ضروری قانونی کتابوں کے تراجم کئے۔ قانونی کتابوں، عدالتی گشتیوں اور احکام کی اردو میں تدوین ہونے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۰۰ء میں قانون ۱۵ کا ترجمہ گل کرائسٹ نے کیا۔ ۱۸۰۳ء میں قانونی دیوانی کا خلاصہ فہرست نما مسٹر ڈبلیو ایچ ٹرائٹ اور نعمت علی کی شراکت میں شائع ہوا۔ دستور العمل عدالت دیوانی کے مؤلف مسٹر ولیم میکفرسن اور جارج اسمولٹ تھے جن کی امداد منشی نصیر الدین احمد نے کی تھی۔

شمالی ہند میں دلّی کالج میں جو تراجم کا کام ہوا ان میں ۲۲ کتب قانونی موضوعات پر تھیں۔ چند کے نام ملاحظہ ہوں۔

اصول قانون، اصول قوانین مالگذاری، اصول حکومت، اصول قوانین مختلفہ قانون دیوانی، قانون فوجداری، قانون مال، سراجیہ (اسلامی قانون وراثت) قانون محمدی و فوجداری (ترجمہ کتاب میکناٹن) دھرم شاستر اور شرع اسلام وغیرہ۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ

مسٹر ایلیٹ کمشنر ممالک شمالی و مغربی نے ۱۸۴۷ء میں کیا تھا جس کو پارلیمنٹ کی منظوری کے لیے انگلستان بھی روانہ کیا گیا۔ یہ ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ تعزیرات ہند سے تقریباً ۱۷ سال قبل کا ہے۔

قانونی کتاب کے تراجم کے ساتھ قانونی لغات کی تدوین کا کام بھی انگریزوں نے اپنے ذمہ لیا تھا اور ایک درجن سے زیادہ قانونی اور دفتری اصطلاحات کے لغات ۱۸۱۳ء سے ۱۸۹۳ء تک شائع ہوئیں جن میں سے دو ایک کی ضخامت ایک ہزار صفحات سے زاید ہے۔

کسی کام کے کرنے کے لیے عزم کی ضرورت ہے اور جب یہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس کی راہ میں کوئی بھی مشکل نہیں رہتی۔ انگریزوں نے اپنے پیشرو حکومت کی سرکاری زبان کے اثر و نفوذ کو زائل کرنے کے لیے اردو کی سرپرستی جس اصول کے تحت کی ہے وہ نہ صرف عین فطری قانون کے مطابق تھا بلکہ انہوں نے تو دور اندیشی سے کام لے کر یہ ثابت کر دیا کہ حکومت کی زبان عوام کی زبان کے سوا اور دوسری ہو نہیں سکتی لیکن جب انہوں نے اس اصول سے انحراف کیا تو ان کی سلطنت ہندوستان میں ایک سو سال بھی قائم نہ رہ سکی۔

انگریزوں نے اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے قبول تو کر لیا تھا اور اس کی ترقی اور فروغ میں بھی وہ منہمک ہو گئے تھے لیکن جیسے جیسے ہندوستان میں ان کے قدم مضبوط ہوتے جا رہے تھے مغلیہ شہنشاہیت کی جانشینی کا وہ خواب دیکھنے لگے اور ان کے سارے وسائل اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے وقف ہو گئے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے ابتدا میں انگریزوں کے قبضہ میں جو علاقے تھے ان پر انکی پوری عملداری قائم تھی۔ دیوانی۔ مالگذاری، فوجداری اور سارے نظم و نسق پر ان کا اختیار تھا اور اردو کو انہوں نے اپنی سرکاری زبان کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس نظماء میں بعض متعصب قسم کے لوگ تھے جو ہندوستان کو مفتوحہ ملک قرار دیکر اس پر اپنی زبان، اپنا مذہب اور اپنی ثقافت مسلط کرنا چاہتے تھے چنانچہ ۱۸۶۵ء میں چارلس گرانٹ نامی ایک شخص کمپنی کا صدر منتخب ہوا۔ یہ بہت با اثر آدمی تھا اور پارلیمنٹ کا رکن بھی منتخب ہو گیا تھا۔ اس کو ہندوستان کی انگریزی مقبوضات میں اردو کو سرکاری زبان قرار دینے پر شدید اعتراض تھا۔ ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد اس نے "مشاہدات" کے نام سے انگریزی میں ایک پمفلٹ تحریر کیا اور اس میں اس نے انگریزی کو جو اس کے نزدیک فاتحین کی زبان تھی اردو کی بجائے سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ کرنے پر زور دیا تھا۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"مفتوحہ لوگوں کو اپنے اندر پوری طرح جذب کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ان میں فاتحین کی زبان رائج کی جائے۔ مقامی لوگ حکومتی زبان بہت جلد سیکھ لیتے ہیں کیونکہ مالگذاری اور عدالت کا سارا کام اس زبان میں ہی انجام پاتا ہے"

لارڈ میکالے نے بعد میں اسی تصور پر اپنی تعلیمی حکمت عملی کی بنیاد رکھی۔ یہ وہی متعصب اور تنگ نظر

میکالے ہے جو برصغیر ہندو پاک میں تعلیم کے ذریعہ محض دفتر کے کلرک پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی نجی ملاقاتوں میں ان نام نہاد تعلیم یافتہ ہندوستانی کلرکوں کے متعلق کہا کرتا تھا۔

"صرف خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی لیکن ذوق، خیالات اخلاق اور عقل کے اعتبار سے انگریز"

اور جس کی انتہا پسندی کا یہ عالم تھا کہ وہ کہا کرتا تھا کہ:۔

"ہندوستان اور عرب کے تمام ادبی شہ پاروں کی اس سے زیادہ ہرگز قیمت نہیں جتنی ایک اچھی یورپی لائبریری کی صرف ایک کتاب کی الماری کی ہوتی ہے۔"

یہی متعصب میکالے ہے جس نے اپنے تنگ نظر پیشرو چارلس گرانٹ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ پر تقریر کرتے ہوئے ایوانِ عام (ہاؤس آف کامنس) میں کہا تھا کہ:۔

"آئندہ ایک زمانہ آئے گا کہ ہندوستانی ایسے ہی فرنگی تعلیمی اداروں کی خواہش کریں گے۔ کیا ایسا دن کبھی آئیگا؟ میں نہیں جانتا لیکن اگر ایسا دن آئے تو میں کبھی کبھی اُسے ٹالنے یا اُس کی مزاحمت کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ وہ دن جب بھی آئیگا انگلستان کی تاریخ کا ایک سنہری دن ہوگا۔"

اور اس طرح ان متعصب تنگ نظر انگریزوں کی سربراہی میں علم اور تعلیم کے مقدس نام پر ہندوستانی بچوں کے ذہنوں کو بگاڑنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور کسی حد تک اب بھی ہو رہا ہے۔ بہت سے مسلمان بھی اس "مقدس" کام میں ان انگریزوں کے ساتھ ہوگئے۔

چارلس گرانٹ کی دوسری خواہش جسے لارڈ میکالے نے بعد میں پورے زور و شور سے عملی جامہ پہنایا وہ یہ تھی کہ ان غیر ترقی یافتہ ہندوستانیوں کو ان تعلیمی اداروں کے ذریعہ آہستہ آہستہ ان کے غیر ترقی یافتہ مذہب سے بدل دیا جائے اور اس کے بجائے پورے حسنِ انتظام اور دانائی کے ساتھ عیسائیت جیسے اعلیٰ اور ترقی یافتہ مذہب کے انجکشن دیئے جائیں۔

بہرکیف اردو کی سرکاری حیثیت ختم کرنے میں جو عوامل کارفرما تھے ان کو اجمالی طور پر اوپر بیان کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ انگریزوں نے کن مقاصد کی تکمیل کے لیے میکالے کی رپورٹ کی اتباع میں اردو کی بجائے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیا۔ لیکن قانونِ قدرت کے اٹل اصولوں کے تحت انگریزوں کی سلطنت بھی ہندوستان میں ختم ہوکر رہی۔ ان کے جانے کے بعد بھارت اور پاکستان کی دو آزاد مملکتیں ہندوستان کے نقشے پر ابھریں اور قدرت نے ان دونوں کو پھر سے اپنی زبان، اپنی ثقافت اور اپنے مذہب کے اصولوں کے مطابق زندگی کو تشکیل دینے کا موقع عطا کیا۔ لیکن اس کو محض قوم کی بدقسمتی ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ آج بھی آزادی حاصل کرنے کے ۴۳ سال بعد انگریزی زبان کی حاکمیت سے ہمیں نجات نہیں ملی۔

اس کے خواہ کچھ بھی اسباب ہوں لیکن اس امر سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ملک میں قومی زبان کی اہمیت اور افادیت کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا گیا اور اردو کو کم از کم پاکستان میں ایک سرکاری زبان کی حیثیت قرار دینے کے لیے جس عزم کی ضرورت ہے وہ ابھی پیدا نہیں ہوا لیکن حالات اور قرائن یہ بتلاتے ہیں کہ وہ دن بہت قریب آ گیا ہے کہ جب اردو سرکاری زبان کی حیثیت سے انگریزی کی جگہ لے لیگی۔

بقیہ اردو اور تحریکِ احیاءِ اسلام — صفحہ نمبر ۲۱۵

میں یہ رہا ہے وہ محض دھوکہ دینے اور دھوکا کھانے کے لئے پھیلایا گیا تھا یا حقیقت میں برصغیر پاکستان و ہند کے مسلمان ایک ایسی مملکت کی تعمیر کے لئے جان و مال عزت و آبرو، عیش و آرام سب کی بازی لگا رہے تھے جہاں وہ اپنی زندگی اپنے نظام کے تحت گزار سکیں اگر یہ صحیح ہے تو ہمارا ادب ان ہی اقدار کی ترجمانی کرے گا اور اسے ایسا کرنا ہی چاہیے، اگر ایسا وہ نہیں کرتا تو وہ پاکستانی ادیب پاکستانی شاعر یا پاکستانی نقاد نہیں ادب کا بازی گر ہے اور

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا۔

"بدر شکیب مرحوم" کتاب سے ماخوذ



۱۹۶۵ء میں حیوانیات اور نباتیات کے طلبا ادارہ زرعی تحقیقات ٹنڈوجام میں وہاں کے عملے اور اپنے اساتذہ کے ساتھ

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

اردو تحریک اور احیائے اسلام

دنیا میں بہت سے مذاہب اور ادیان پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے اپنے ماننے والوں کے معاشرے اور تہذیبیں قائم کیں۔ بعض ان میں سے اب ناپید ہو چکے ہیں کہ تاریخوں میں بھی ان کا پتہ مشکل سے چلتا ہے، بعض کا سراغ صرف ماہرین ان کے آثار باقیہ ان کے شہروں اور عمارتوں کے کھنڈروں اور ان سے برآمد ہونے والی اشیاء سے لگاتے ہیں، بعض کے متعلق ہماری معلومات صرف تاریخ کے حوالے سے ہیں، بعض مذاہب آج بھی زندہ ہیں، اور صدیوں سے زندہ ہیں، اسلام بھی ان مذاہب اور ادیان میں ہے، جو چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی آج تک زندہ ہے، بلکہ زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہوا ہے اور ساتویں صدی عیسوی میں اس دین نے جو سبق دیا تھا اور جو راہ دکھائی تھی، وہ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کے جدید ترین مسائل اور معاملات کا حل پیش کرنے کے لائق ہے۔ اپنی اس طویل تاریخ میں اس نے بڑے نشیب و فراز دیکھے، سیاسی عروج و زوال کے کتنے ہی دور اس میں گزرے، چھوٹی بڑی کتنی ہی ریاستیں اور حکومتیں قائم ہوئیں اور ختم ہو گئیں۔ اس کی جغرافیائی حدود کبھی یورپ کے آخری حصے تک یعنی اسپین تک پہنچ گئیں، مشرقی یورپ کا بڑا حصہ اس کا حلقہ بگوش رہا، شمالی افریقہ میں مختلف ادوار میں حکومتیں اور ریاستیں قائم ہوئیں، جن کو آج عرب ممالک کہا جاتا ہے، ہم ان میں کتنی ہی چھوٹی بڑی ریاستیں قائم ہوئیں اور ان کی حدود میں تغیر و تبدل ہوتا رہا۔ ایران اور برصغیر پاک و ہند میں اسلامی ریاستیں قائم ہوئیں اور آخر الذکر سے پھر پاکستان کی الگ ایک حکومت اور سیاسی و جغرافیائی مملکت وجود میں آئی۔

ایک المیہ نے پاکستان کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور آج ایک اور اسلامی مملکت بنگلہ دیش موجود ہے۔ اسی طویل تاریخی دور میں حکومتوں، سلطنتوں اور مملکتوں کی اس طویل فہرست کی تاریخ میں اس سے کیا کیا نہ گزرا۔ اسپین کی ایک داستان الگ ہے جس پر آج تک الحمرا اور مسجد قرطبہ کی دیواروں کے کھنڈر چشم بے نور بنے ایک دور کے مرثیہ خواں ہیں، ترکوں پر کیا گزری کہ ایک طویل دور کی تاریخ میں اسے یورپ کا مرد بیمار کہہ کر اس کے حصے بخروں کی تجویزیں بنتی رہیں، اس تاریخ میں بغداد کا سانحہ دیکھا جس نے مسلمانوں کی تہذیبی بنیادوں کو ہلا دیا، اس نے برصغیر میں وہ دور بھی دیکھا جب مسلمانوں کی مرکزی حکومت ان کے اقبال اور اقتدار کے دور میں مسلمانوں کو طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ یہ وہ دور تھا جسے ہمارے مشہور مورخ ڈاکٹر اشتیاق

حسین قریشی نے دورِ اعتقادی کا دور کہا ہے، یہ جملہ بیزار دربار تھا۔ جس کا ایک مظاہرہ مغل شہنشاہ اکبر کے دور میں ہوا تھا اور جس کے خلاف اس وقت سے آج تک مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کا جہاد جاری ہے یہ اسلام کی ابدی حقیقت ہے کہ ایسے ہر مرحلہ اور ہر آزمائش سے مسلمان قوم کامیابی اور کامرانی کے ساتھ نکلی ہے، آج بھی ایسے جن مسائل کا سامنا ہے اور جسے اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک چیلنج کہا جا سکتا ہے، انشاء اللہ اس امتحان میں بھی ملتِ اسلامیہ کو کامیابی ہوگی، جاء الحق و زھق الباطل، ان الباطل کان زھوقا، حق آیا اور ہمیشہ آئے گا، اور غالب رہے گا۔ باطل نے راہ فرار اختیار کی اور ہمیشہ راہ فرار ہی اسے نصیب ہوگی۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، یہی مرحلے احیائے دین کے مراحل ہیں، اس بحث میں احیائے دین کے معنی یہ نہیں کہ کوئی دور ایسا آیا کہ یہ دین یا اس کے ماننے والے ختم ہوگئے، یا اس کے اصلی خدوخال مٹ گئے یا اس کے بنیادی ماخذ قرآن میں کوئی تحریف ہوا یا احادیث کی اہمیت سے انکار کیا گیا یا [illegible] اللہ نیا عہد سے بالکل بے مقصود ہوگئے مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ اقدار جن کو ہم اسلامی اقدار کہتے ہیں، ان پر حالات کا ایسا اثر ہوا کہ ان کی اصل شکل و صورت وہ نہ رہی جو تھی اور اصل اور حقیقی تھی، نام رہ گیا حقیقت کو لوگ بھول گئے، جسم رہ گیا روح نکل گئی لفظ باقی رہے ان کے معنی معدوم ہوگئے، لیکن جب بھی ایسا وقت آیا اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اسلامی اقدار کا احیاء ہوتا رہا۔

اس بحث کو محدود رکھنے کے لئے ہم صرف اردو ادب میں اسلامی اقدار کے احیاء کی داستان کو مختصراً بیان کرنا چاہتے ہیں اردو کی تاریخ کا آغاز ہی ان مبلغین اسلام صوفیائے کرام اور علمائے عظام سے ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی زندگی اور مثال سے برصغیر میں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیا، بادشاہوں کی اپنی مصلحتیں تھیں کہ آٹھ سو سال جس ملک پر حکومت کی اس کے دارالخلافہ میں ان کی تعداد چودہ فی صد سے آگے نہ بڑھ سکی، اس کے برعکس اسلامی اقدار کے یہ علمبردار جہاں پہنچے وہاں اسلام خود بخود پہنچا، آج جبکہ ان بادشاہوں کے نام تاریخ کے صفحوں میں کیڑے چاٹ رہے ہیں ان اللہ والوں کے مزارات آج بھی مرجعِ خلائق ہیں،

اس طرح برصغیر میں تعلیمات اسلام اور اقدارِ اسلامی کی ترویج کی تاریخ صدیوں پرانی ہے، اس کی ایک ہلکی سی جھلک اس قاموس الکتب میں دیکھی جا سکتی ہے جو مولوی عبدالحق مرحوم نے جلد اول میں مرتب کی تھی اور جس میں صرف مذہبی کتب کا ذکر تھا اس کے مقدمہ میں "فہرست کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوگا کہ ہماری زبان اور ادب کا دامن کتنا وسیع ہے اور یہ بھی کہ اس زبان میں خاص طور پر مذہب اسلام کے بارے میں اب تک جو ذخیرہ فراہم ہوا ہے، شاید ہی دنیا کی کسی دوسری زبان میں ہو۔"

اور یہ بات صرف عبدالحق صاحب نے ہی نہیں کہی ہے اردو زبان و ادب اور اس کی تاریخ کا ہر طالب علم اس کی تصدیق کرے گا اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر قیام پاکستان کے بعد کئی جامعات سے پی، ایچ، ڈی کی سطح کا تحقیقی کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے، ہم اس کی تاریخ سے قطع نظر دورِ حاضر میں اردو ادب میں اسلامی اقدار کے احیاء تک اپنی بحث کو محدود رکھیں گے اور دورِ حاضر کو ہم انیسویں صدی کے آخر سے عصر تک شمار کرتے ہیں۔

خورشید احمد صاحب لکھتے ہیں،

اردو اگر ایک طرف برصغیر پاک و ہند کے لسانی و ثقافتی ذخیرہ پر مسلمانوں کے فکر اور ان کے تہذیب و تمدن کے عمل اور تعامل کی پیداوار ہے تو دوسری طرف یہ زبان اور اس کا ادب عصرِ جدید میں روحِ اسلام کے اظہار کا اہم ترین ذریعہ ہے، عربی کے بعد اسلام کے دینی ادب کا سب سے بڑا ذخیرہ اسی زبان میں ہے، انیسویں صدی کے وسط

قاموس الکتب - جلد اول - مرتبہ مولوی عبدالحق - جون ۱۹۶۱ء

میں مسلمانانِ پاکستان و ہند کے افکار و نظریات کا اصل اظہار اُنہی کے ذریعہ ہوا ہے،

ہم پھر ایک مرتبہ، ۱۸۵۷ء کے انقلاب تحریک سرسید اس کے اثرات عمل رد عمل کی بحث چھوڑ کر بیسویں صدی کی دوسری دہائی پر آجاتے ہیں جہاں ہمیں پہلی جنگ عظیم کے بعد جہاں دنیا بھر میں مختلف تحریکات جنم لیتی ہیں، وہاں برصغیر پاکستان میں بھی مسلمان ایک جہت تازہ کی تلاش میں سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ اور اس کا سب سے نمایاں اظہار علامہ اقبال کی شاعری اور ادب میں ہوتا ہے، علامہ کی نظم طلوعِ اسلام سامنے رکھیے۔ یہ بند دیکھیے۔

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز
پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شراب خانہ ساز
بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

اقبال کا اشارہ جس شراب کی طرف ہے خانہ ساز کی طرف ہے اس کی وضاحت صاحبانِ دانش کی اس مجلس میں ضروری نہیں، اقبال کی مثال میں نے اس لئے دی ہے کہ یہ تحریک صرف شاعری ہی کی ذریعہ نہیں بلکہ دیگر اصناف کے وسیلے بھی پروان چڑھتی ہے خود علامہ کے خطابات مضامین و مکتوبات ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں، یہ در اصل، جہاں ایک طرف علیگڑھ کی تحریک اس دور میں نئی فکری، تہذیبی، ثقافتی، ادبی تاریخ شعور کی روح بنکر سامنے آتی ہے، وہیں طبقۂ علماء میں بھی ایک نیا دور شروع ہوا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ قدیم اور جدید کے تصادم سے حتی الامکان گریز کرکے دینی اور ثقافتی ورثہ اسلام کی حفاظت کی جائے اسلامی افکار، اقدار اور اخلاقی و معاشرتی روایات کی ممکنہ پاسبانی دینی تعلیم اور وعظ و تلقین کے ذریعے کی جائے نیز معاشرے، اس تعلیم کے حاصل کرنے والوں کا پورے ملک میں جال پھیلا کر کم از کم علم و اخلاق کی اس شمع کو روشن اور اس روایت کو باقی رکھا جائے، جیسے سیاست اور اختیار و اقتدار کے میدان میں شکست ہو گئی ہے، دیوبند اس رجحان کا نمائندہ ہے، علمائے دیوبند میں مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی ہیں جن کی تصنیف کتب و رسائل کی تعداد اور بعض روایتوں میں ڈھائی سو کے قریب ہے، تعداد کچھ ہو اس سے انکار نہیں کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے تعلیمات اسلام کو جن پر اسلامی اقدار کی بنیادیں استوار ہیں عوام تک پہنچانے میں اپنے قلم سے بڑا کام لیا ہے، قرآن کی حکمت اور فضیلت پر بہت کچھ لکھا ہے، سیرت رسولِ پاک پر جوانی افکار کا علمی نمونہ تھی توجہ کی علماء کے اس گروہ میں جن میں بعض کا تعلق دیوبند سے ہے، بعض کا ندوہ سے بعض کسی ادارہ یا تحریک سے منسلک ہیں بکثرت ایسے نام ملتے ہیں جنہوں نے عصرِ جدید میں ایسی خدمات انجام دی ہیں، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولوی عبدالماجد دریا آبادی، مولانا محمد الیاس ان میں سے چند نام ہیں ان کی مستقل تصانیف کی ہی فہرست گنائی جائے تو خاصی طویل ہو جائے گی مثلاً مناظر احسن گیلانی کی چند تصانیف ہیں۔

۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ۔ ۲ جلد
(۲) سوانح قاسمی، ۳۔ جلد
(۳) تذکرہ شاہ ولی اللہ
(۴) الدین القیم
(۵) النبی الخاتم
(۶) مقالات احسانی
(۷) تدوین حدیث
(۸) امام ابو حنیفہ کا سیاسی کارنامہ
(۹) مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ اور مولانا ماجد کے بے شمار مضامین کے علاوہ،
(۱) تفسیر ماجدی (۲ جلد)

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند دسویں جلد، اردو ادب ۔ پنجم طبع لاہور ۱۹۷۲ء ۔ ص ۲۷۱، بعد

(۱) قصص و مسائل

۲. سفرنامہ حج ...

(۳) حیوانات قرآن (۵) جغرافیہ قرآن (۶) اعلام القرآن

(۷) سیرت النبیؐ قرآن کی روشنی میں۔

یہ تو میں نے مثالاً عرض کیا ایک طبقہ ان لوگوں کا تھا جو اس دور میں سیاسی میدان میں نمایاں تھے، لیکن بقول خورشید احمد اسلامی احیاء اور اسلامی قومیت کے تصور کی صورت گری میں انہوں نے بڑا موثر کردار ادا کیا مثلاً وہ حضرات جو تحریک خلافت یا جدوجہد آزادی کی تحریک سے وابستہ تھے اور جن کی کوششوں سے اسی مصنف کے بقول مسلمانوں میں یہ شعور اجاگر ہوا کہ وہ مسلمان صرف پہلے مسلمان تھے، اور اس کے بعد ہندوستانی۔ پھر مسلمانوں کی ایک اور تنظیم ابھری جس کے سربراہ عنایت اللہ خان مشرقی تھے جن کی نظر میں تعمیر ملی کا صرف ایک نسخہ تھا، اور وہ نسخہ اسلام تھا، انہوں نے اپنے خیالات تفصیل سے تذکرہ میں پیش کئے ہیں؛

اصلاح کی ایک تحریک وہ ہے جس کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں جن کی مقبول ترین کتاب تفہیم القرآن تفسیر قرآن ہے، اس مکتبۂ فکر سے بہت سے حضرات وابستہ رہے اور انہوں نے مسلمانوں میں اسلام کی روح کو بیدار کرنے اور بالخصوص نوجوان، مغربی تعلیم یافتہ طبقہ میں ان خیالات کے پھیلانے میں بڑی خدمت ادا کی ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اسلامی اقدار کی احیاء کی تحریک صرف اندرون جماعت اور تحریکوں تک محدود نہیں، ہمارے جدید ادبی تاریخ میں ایسے بزرگ بھی ہیں جیسے مولانا فضل الحسن حسرت موہانی مولانا ظفر علی خان اور ان جیسے لوگ جن کی زندگی اسلام کی عملی تفسیر تھی، میں یہاں قصداً مصنفین اور ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کا ذکر نہیں کر رہا جو اس روایت کے علمبردار ہیں، ان لوگوں نے ناول لکھے ہیں، انہوں نے نعت گوئی کے فن کو نئی وسعت بخشی ہے، انہوں نے تنقید میں ان رجحانات کا ذکر کیا ہے جو اردو ادب اور ترقی پسندی کی آڑ میں دراصل اسلام اور اس کی اقدار پر آخری وار کے طور پر کیا گیا تھا ہماری اپنی تاریخ شاہد ہے کہ ان میں بہت سے لوگ اب بحمد للہ اب مسلمان ہو گئے ہیں، اور ان کا ہے کے افسانہ نگار قرآن حکیم کی تفسیر لکھ رہے ہیں،

یہ بات محض اس نقطۂ نظر سے اہم نہیں کہ آج ہم پاکستان میں ایک مکمل اسلامی ضابطۂ حیات رائج کرنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں اور بعض حضرات محض خوف سے یا لالچ یا محض بعض حاصل ہونے والے فوائد کی امید میں اپنی دینی تخلیقات کو اسلامی اقدار کے احیاء کا ایک ذریعہ بنا رہے ہیں، اس مختصر سے جائزہ کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ برصغیر پاک و ہند میں بقول مولانا حالیؔ صدق و صفا کے چشمے میں جو گندگی شامل ہو گئی تھی اسے دور کیا جائے اس کے معالج کو تلاش کیا جائے، تاکہ یہ صورت پیش نہ آئے یہ تحریک جو شاہ ولی اللہ سے شروع ہوتی ہے جیسے سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید کی تحریک جہاد اپنے خون سے پروان چڑھاتی ہے، جیسے ۱۸۵۷ء کے علماء قید و بند کی صعوبتوں اور پھانسیوں کے سامنے قبول کرتے ہیں، ایک مسلسل عمل اور زندہ تحریک ہے، یورپ، امریکہ، افریقہ اور مشرق بعید میں اسلام کا دور جدید بھی ایسی تحریک کا ایک حصہ ہے اور آج دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے بارے میں جو کچھ تحقیق ہو رہی ہے اس کا ایک بڑا ماخذ

ہمارا اردو ادب ہے۔ کوئی شخص جو کم از کم پچھلے دو سال سے برصغیر پاکستان و ہند کے مسلمانوں کے افکار خواہ سیاسی ہوں، تعلیمی یا تہذیبی ان کے ماخذ کا سراغ لگانا چاہتا ہو وہ اردو ادب کو نظرانداز نہیں کر سکتا، خواہ اسے سرسید کی تصانیف کا مطالعہ کرنا ہو یا علیگڑھ اسکول کے دوسرے اکابر کا، خواہ علامہ شبلی نعمانی ندوۃ العلماء لکھنو اور دارالمصنفین اعظم گڑھ خواہ خاکسار تحریک کا، خواہ شدھی اور سنگھٹن کی جوابی تحریکات کا خواہ تبلیغی جماعت کا یا جماعت اسلامی کا اور چاہے دیوبند کے علمائے کرام کا

یا بریلوی حضرات کے افکار و خیالات کا، خواہ [illegible] مسلمان کا یا مسلم لیگی مسلمانوں کا وہ آج کے اردو ادب کے اس دور کے پس منظر کو نظر انداز نہیں کرتا، جو ان تمام تحریکات، افکار اور خیالات پر اثر ڈالتا ہے،

اس حقیقت کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ ہم برصغیر پاک و ہند میں ۱۹۳۶ء - اس تحریک سے جسے ادب میں ترقی پسند تحریک کہا جاتا ہے، آج تک اردو ادب کے سفر کا مختصر جائزہ لے لیں اس دور میں ترقی پسندی کے نام پر ادب میں جن رجحانات کو داخل کرنا مقصود تھا وہ صرف عریانی یا جنسیت نہ تھی، اس کے نمونے اردو ادب کیا دنیا کے ہر ادب میں مل جاتے ہیں نہ اس کا مقصد محض ایک خاص سیاسی نظریہ کی تبلیغ تھی، جسے اس زمانے میں مارکسی نظریہ حیات کہتے تھے بلکہ اس کا ایک بنیادی عنصر مذہب کا استہزا اور مذہبی اقدار کی تضحیک و تذلیل تھی بے شک ہماری شاعری میں بعض اثرات کے تحت ایسے عنصر پہلے بھی داخل ہو چکے تھے جو ہماری شاعری اسلامی کی تضحیک کے رجحان کو ظاہر کرتے ہیں، مثلاً شراب اسلام میں حرام ہے لیکن ہماری شاعری بادہ و جام سے بھری پڑی ہے۔ بلا شبہ ہمارے بعض شعرا بلاکیاز تھے اور انہوں نے ان استعاروں کو محض رائج شاعرانہ استعاروں کی حد تک استعمال کیا تھا شاعرانہ شوخی کی بعض مثالیں علامہ اقبال کے یہاں تک ملتی ہیں اس طرح رندی کو زہد پر ترجیح، کعبہ ڈھا کر بت خانے کی دعوت، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ منزل کہ میر نے فرمایا تھا،

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو یار ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

گو ترک اسلام واقعی ترک اسلام ہو تو ایسا شخص تو مرتد اور واجب القتل ہو گا، لیکن ان میں سے کسی شاعر افسانہ نویس یا ناول نگار نقاد نے بازی بازی با ریش بابا ہم بازی والی بات نہ کی تھی، یہ شرف ہمارے اس دور کے ترقی پسند شاعروں کو نصیب ہوا،

اس کی مثال ن۔ م۔ راشد کی شاعری ہے جن کے پہلے مجموعے پر اسی زمانے میں جب وہ پہلی مرتبہ طبع ہوا تھا آل انڈیا ریڈیو سے تبصرہ کر کے ترقی پسندوں کے نزدیک گنہگاروں کی فہرست میں اپنا نام لکھا لیا تھا، بات صرف اتنی تھی کہ راشد صاحب کو اپنی ایک نظم میں نعوذ باللہ خدا بھی اونگھتا نظر آ رہا تھا، ہم مسلمانوں نے تو یہی پڑھ رکھا تھا کہ۔ لا تاخذہ سنۃ ولا نوم، کہ اسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ اور اس سے شاعری میں کوئی مزہ پیدا نہیں ہوا تھا، پھر یہ ن۔ م۔ راشد صاحب اس حلقے کے پیر مغاں بنے، حال میں انتقال ہوا ہے سنا ہے کہ ان کے فرمانے کے مطابق ان کی لاش کو اسلامی طریقے سے تجہیز و تکفین کی بجائے جلایا گیا، ہم جیسے کٹھ ملاؤں کے خیال میں اس آغاز کا یہی انجام ہونا تھا تفصیل دیکھنا ہو تو ترقی پسند شاعری پر مرا ایک مضمون دیکھ لیجئے جو غالباً اسی زمانہ میں نگار میں شائع ہوا تھا، اور پھر دوسرے رسالوں میں نقل ہوا تھا شاید میرے بھی کسی مجموعے میں شامل ہے، ان حضرات کے ایک ناقد نے لکھا ہے کہ انہیں ایک ایسی جگہ کی تلاش ہے، جہاں خیر و شر کے تصورات نہ ہوں، ملائیت ان کے نزدیک صرف دو ہی ہیں جنس اور جنسی تشنگی اور ان کی وجہ سے خواہش مرگ،

یہ ساری تحریک اردو زبان کے مزاج کے خلاف تھی، اور اسی لئے بیرونی طاقتوں، سرمایے اور سرپرستیوں کے باوجود اس ماحول میں پنپ نہ سکی، اور تحریک بہت جلد تحریک کی حیثیت سے ختم ہو گئی، اب اس کی جگہ ایک نیا محاذ کھولا جا رہا ہے، اسلامی ادب کیوں؟ ادب کو اسلامی اور غیر اسلامی خانوں میں کیوں تقسیم کیا جاتا ہے، ادب کو صرف ادب رہنا چاہیے یہ ان لوگوں کی آواز ہے جو اب کھل کر سامنے آتے ہیں اور ایک ایسی مملکت میں جو اسلام کے نام پر بنی ہے جس کا نظام حکومت اور نظام زندگی اسلام ہی کے تابع ہو سکتا ہے، وہاں کا ادب اسلامی نہ ہوگا تو کیا ہوگا، یہی لوگ کہتے ہیں کہ ادب کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے ایسے حقیقت کی عکاسی کرنا چاہیے، اگر یہ سچ ہے تو پھر پاکستانی ادب اسلامی ادب ہی ہوگا کیونکہ ہماری زندگی کی اساس جب اسلام ہوگا! ادب لازماً

بقیہ صفحہ نمبر ۲۱۰ پر

درودِ ہفت برگ

بارگاہِ رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم میں

اے شاہِ عرب سلطانِ عجم امّت پہ نگاہِ لطف وکرم
اے جلوۂ شمعِ بزمِ کرم امّت پہ نگاہِ لطف وکرم

اے مالکِ دنیا، حاصلِ دیں اے نورِ فلک اے حسنِ زمیں
اے رازِ بنائے دوعالم امّت پہ نگاہِ لطف وکرم

اے مظہرِ شانِ یزدانی اے ذاتِ مجسّم نورانی!
اے پیکرِ صد الطاف وکرم امّت پہ نگاہِ لطف وکرم

اے عقدہ کشائے رازِ خفی اے سیّدِ مکّی ومدنی
اسرارِ حقیقت کے محرم امّت پہ نگاہِ لطف وکرم

یہ شان تیری اے صلّ علیٰ جبریلِ امیں دربان تیرا
قرآں میں تیری توصیف رقم امّت پہ نگاہِ لطف وکرم

اے نائبِ رب محبوبِ خدا اے شافعِ محشر صلّ علیٰ
اے صبحِ کرم اے شامِ کرم امّت پہ نگاہِ لطف وکرم

جالی کو پکڑ کر روضے کی محمودؔ کہے گا رو رو کر!!
اے رحمتِ کل اے ابرِ کرم امّت پہ نگاہِ لطف وکرم

محمود احمد محمود قریشی دہلوی کراچی

ڈاکٹر معین الدین عقیل

تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ

برعظیم میں جس قدر سیاسی تحریکات ابھریں ان میں مسلمانوں کا حصّہ نمایاں ہے۔ بعض مسلمان حکمرانوں کی دیگر ذکر اعتقادی، سیاسی و مذہبی حکمت عملیوں پر جو تحریکات ان کی مخالفت میں شروع کی گئیں وہ زیادہ تر علماء کی جانب سے یا ان کی تحریک پر شروع کی گئی تھیں۔ بعض ہندو مصلحین کی مذہبی اصلاحی تحریکوں کے علاوہ تمام تر فعال اور موثر تحریکیں مسلمانوں کے دم قدم سے تھیں۔ ان کا مقصد فی الواقعی احیائے اسلام اور اللہ کی حاکمیت کا حصول تھا۔ ایسی تحریکوں میں اپنے وسیع اور راسخ مقاصد کے اعتبار سے مجدّد الف ثانی، شاہ ولی اللہ اور احمد شہید کی تحریکات مثالی تھیں۔ انہوں نے اپنی جدوجہد سے جس کی آبیاری راسخ فکر اور راسخ عمل سے ہو رہی تھی۔ برعظیم کے تمام مسلمانوں کو مذہبی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے متاثر کیا۔ برعظیم کی اسلامی زندگی کے ہر پہلو میں ان کے اثرات سرایت کرتے رہے۔ ان کے زیرِ اثر متعدد تحریکیں رونما ہوئیں جو ان کے ساتھ ساتھ یا ان کے مقاصد اور نصب العین کے تحت احیائے اسلام اور حاکمیت الٰہی کے حصول کے لیے مستقل جدوجہد کرتی رہیں۔ بظاہر یہ مذہبی تحریکات تھیں لیکن فی الحقیقت ان کے تمام تر مقاصد سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کو خدا کے سپرد کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے بعد انہیں متعلقہ ضمنی مقاصد حاصل ہو سکتے تھے۔ ان میں سے بعض تحریکوں نے مثلاً تحریک مجاہدین نے اپنے اصل مقصد کو کھل کر واضح نہیں کیا۔ جن حالات میں یہ تحریکیں شروع ہوتی تھیں انہیں ایسی آزادی حاصل نہ تھی کہ وہ براہِ راست اور اپنے اصل مقصد کے اعلانیہ اظہار کے ساتھ اقتدارِ اعلیٰ سے ٹکرا سکتیں۔

سلطنتِ مغلیہ کا دورِ زوال اصل میں غیر ملکی استعمار کی ابتداء کا دور تھا۔ جہاں جہاں برعظیم میں برطانوی اقتدار قائم ہوتا گیا تحریکاتِ اسلامی کا ایک خاص مقصد اس غیر ملکی اقتدار سے آزادی کا حصول بھی قرار پایا۔ یہ جدوجہد سیاسی سطح پر مختلف علاقوں میں اپنی اپنی

بساط کے مطابق ہوتی رہی۔ پلاسی کی جنگ اور میسور کی جنگِ آزادی برِعظیم میں اسلامی حکومت کو سہارا دینے کی کوششیں تھیں۔ ان جنگوں میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل نہ ہوسکی کیونکہ انہیں بڑی زبردست مشکلات کا سامنا تھا۔ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان نے اپنی جیسی کوششوں میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اپنی قلمرو کے دفاع اور مستقبل کی آزادی کے لیے مردانہ وار لڑتے ہوئے جان دیدی۔ اس وقت برِعظیم میں نہ صرف مغربی بلکہ غیر مسلم قومیں بھی مسلمانوں کے مقابلے پر آگئی تھیں۔ ابتدا میں ان غیر مسلم قوموں کی مسلح افواج تھیں۔ زیادہ سخت خطرہ نظر آرہی تھیں مگر بہت جلد مغرب نے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کا تختہ الٹ دیا۔ غیر مسلم قومیں بھی خواہ وہ جنگجو تھیں یا غیر عسکری سب انگریزوں کے زیرِ تسلط آگئیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مختلف قومیں تھک ہار کر بیٹھ گئیں تاکہ ان پُرامن مشاغل ہی کو جاری رکھ سکیں جن کے دروازے اب بھی ان پر کھلے ہوئے تھے۔ اس کلیہ سے صرف شمال مغربی سرحد کے مجاہدین اور ان کے حامیوں کی جدوجہد مستثنیٰ تھی۔ بعد میں تحریک عدم تعاون میں مسلمانوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ بلکہ اس تحریک کے تحت ان کی قربانیاں ان کی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ تھیں۔ اس تحریک کے دوران ہندوستان کے مسلمان آزادی کے خیال سے جوش میں آئے۔ مگر تحریکِ خلافت اصلاً دوسروں کے لیے ان کے ایثارِ نفس کی قسمت آزما جدوجہد تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے ممالک کے مسلمان بھائیوں کو یورپ کی غلامی سے بچایا جائے۔ اگرچہ اس وقت ان کو یہ معلوم نہ تھا مگر ان کی قربانیاں ان کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوئیں۔ انہی قربانیوں نے انہیں بڑے پیمانے پر عوامی تحریک کو منظم کرنے کے طریق کار کی تعلیم دی اور سارے برِعظیم میں سیاسی بیداری عام کردی۔ اب مسلمانوں نے اس خیال کو ترک کردیا تھا کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں یا برطانیہ کے بھروسے ہی پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ اب یہ مقابلے کے لیے تیسرے فریق کی حیثیت سے سیاسی جدوجہد کے میدان میں شامل ہوئے۔ تحریک خلافت کے دوران مسلمانوں کے جوش و خروش نے برِعظیم کی سیاسی زندگی میں ایک نئی سرگرمی پیدا کردی تھی اور اس کے میدان کو بہت زیادہ وسیع کردیا تھا۔ کانگریس کو بھی جو ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تھی اس تحریک کی حمایت سے فائدہ پہنچا تھا۔ اب اس کی طاقت اور اس کا اثر حقیقتاً ہندوؤں کی وجہ سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے طفیل تھا۔

ان تحریکات کے حلقۂ اثر میں سارا برِعظیم اور بالخصوص تمام مسلمان تھے۔ مجدد الف ثانیؒ کی تحریک کا تبلیغی مقصد یہی تھا کہ اسلامی تعلیمات کو ہندومت کے ساتھ اشتراک مقصد سے روکیں۔ مسلمانوں کی ملت اور اسلامی تعلیمات کی خالص پاکیزگی اس طرح برقرار رہ سکتی تھی کہ ان کی جداگانہ ہستی اور انفرادیت پر اصرار کیا جائے مجددؒ کا اثر ان کے بعد بھی اپنا نقش مرتسم کرتا رہا۔ اور ان کی فکر نے بعد کی تحریکات کے لیے بھی آبیاری کی۔ شاہ

ولی اللہ بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان برعظیم کے عام ماحول کا ایک جزو بن کر رہ جائیں۔ وہ مسلمانوں کی علیحدہ ہستی کو برقرار رکھنے کے لیے بے چین تھے۔ ان کی رائے میں مسلم معاشرے کی صحت کا تقاضہ یہ تھا کہ اسلامی اصولوں اور قدروں کو ان کی خالص پاکیزگی کے ساتھ قائم رکھا جائے۔ اور انہیں خارجی اثرات سے آلودہ نہ ہونے دیا جائے۔ یہ سمجھتے تھے کہ ایک قوم کی صحت کے لیے سیاسی اقتدار ناگزیر ہے۔ شاہ ولی اللہ کے پیروؤں نے قوم کے ساتھ اپنے روابط کو خاصی وسعت دی۔ اس کی متعدد صورتیں تھیں۔ شاہ صاحب کے افکار کے مطابق تعلیمات اسلامی کی اشاعت کے لیے عام جلسے منعقد کیے اور ان کی تعلیمات کو اردو زبان میں لکھنا شروع کیا۔ جو اصطلاحی کم اور عام فہم زیادہ تھی۔ اس کام میں شاہ صاحب کے صاحبزادوں نے نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی باپ کے بلند اصولوں اور افکار و آرا کی نشر و اشاعت میں گذار دی۔ متعدد کتابیں تحریر کیں۔ ان کی زبان ایسی تھی کہ انہیں اوسط درجے کی تعلیم کا آدمی بھی بہ آسانی سمجھ سکتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز ہفتے میں دو مرتبہ بڑے بڑے اجتماعات میں وعظ کرتے تھے۔ ان کے بھائیوں نے اردو میں قرآن کے ترجمے کیے۔ یہ اردو میں مقصدی ادب کی تخلیق کا ابتدائی دور تھا۔ مجدد الف ثانی کی تحریک سے شاہ ولی اللہ کی تحریک تک اردو کو ایک مقصدی رجحان بھی حاصل ہوا۔ وہ اس قابل ہوئی کہ تمام موضوعات کو سمیٹ سکے۔ اور دوسرے اس زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اس امر کی متقاضی تھی کہ فارسی کے بجائے جو اب، طبقہ امرا اور تعلیم یافتہ افراد کی زبان تھی۔ اردو کو ذریعۂ اظہار بنایا جائے۔ مجدد کے پیروؤں نے بھی اس ضرورت کا احساس کر لیا تھا اور شاہ ولی اللہ کے معتقدین نے بھی اس کو اپنانے کی ضرورت کو تسلیم کر لیا تھا۔ ان دو ابتدائی تحریکوں کے بعد کا دور اردو زبان کے عروج اور ترقی کا زمانہ تھا ہر تحریک کے لیے اب اس زبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنانا ناگزیر تھا۔ بلکہ سید احمد کی تحریک اور اس کے بعد اٹھنے والی ایسی تمام تحریکات جو عام مسلمانوں کی طرف رجوع کرتی تھیں، دوسری کسی زبان کے مقابلے میں زیادہ اردو ہی میں اپنی سرگرمیوں کا اظہار کرتی ہیں۔ اظہار و بیان کے تمام ذرائع اور وسائل اس زبان میں مخصوص کیے گئے۔ تحریر و تقریر دونوں صورتوں میں اس زبان کا سہارا سارے برعظیم کے لیے کافی تھا۔ اسلامی تحریکوں کے علاوہ دیگر قوموں کی تحریکیں بھی اردو کو اختیار کرنے پر مجبور ہوئیں۔ انیسویں صدی کے ابتدا تک یہ زبان اپنے زیادہ وسیع اور بسیط ماحول میں واحد "لنگوا فرینکا" کا درجہ رکھتی تھی۔ یہاں کی تمام قوموں کی اپنی اپنی مختلف تحریکوں کے علاوہ غیر ملکیوں کے لیے بھی، ان کے اپنے مشاغل اور تمام مساعی میں یہی زبان مستعمل رہی۔ عیسائیوں کا تمام تبلیغی کام زیادہ تر اردو میں ہوا۔

انیسویں صدی کے آخر میں اس زبان کے استعمال پر ہندوؤں کی جانب سے مخالفت شروع ہوئی۔ اپنی قومی اور اصلاحی تحریکوں کے طفیل اس دور میں ہندو ہندو قومیت کے جذبے سے سرشار ہو چکے تھے۔ اب انہیں ایسی ہر چیز سے نفرت ہو رہی تھی جو انہیں ان

کے ماضی کی یاد دلاتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے سب ہندو مسلمان اردو کو اپنی "لنگوا فرنکا" سمجھتے تھے۔ لیکن فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد انگریزوں کی سیاسی حکمت عملی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" لسانی اعتبار سے اردو ہندی تنازعہ کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اس حکمت عملی کے تحت ایسی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی گئی جو ہندوؤں میں ہندو قومیت کا احساس پیدا کرنے کا سبب ہو سکتی تھیں اس کے ردعمل کے طور پر ہندی اردو کا قضیہ شروع ہوا اور ہندی کو سنسکرت آمیز بنانے کا رجحان شدید ہوتا گیا اور پھر جیسے جیسے ہندو مسلم مناقشات بڑھتے گئے ہندی میں سنسکرت کا غلبہ ہوتا گیا۔ اس بنا پر اردو اور ہندی دونوں کا ارتقاء متضاد سمتوں میں ہونے لگا۔

برعظیم میں آنے کے بعد مسلمان جہاں جہاں آباد ہوئے انہوں نے وہیں کی زبان کو اپنایا اور اسے فارسی رسم الخط میں تحریر کیا۔ اس میں دخیل الفاظ کا استعمال کچھ تو اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ سرکاری اور دفتری زبان فارسی تھی جس کے کثیر التعداد الفاظ عوام کی زبانوں پر عادی ہو چکے تھے اور کچھ اس وجہ سے بھی ہوا کہ فارسی اس زمانے کی عام علمی و تہذیبی زبان بھی بنی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے علوم و معارف کا واحد مخزن یہی زبان تھی اردو میں فارسی الفاظ کو داخل کرنے کا کام مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں نے کیا تھا اور اس سے ان کا مقصد اپنے مسلمان آقاؤں کو خوش کرنا تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس زبان کو غیر مسلموں نے پرورش کیا تھا اور مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی غیر مسلموں کے شاندار کارنامے اس کا نمایاں حصہ ہیں۔ فی الحقیقت یہ زبان تمام قوموں کی متفقہ کوششوں سے پروان چڑھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی کوششیں تمام قوموں سے زیادہ ہیں جس کی وجہ یہ تھی کہ کسی دوسری قوم نے اس زبان کو من حیث القوم نہیں اپنایا تھا ان کے پاس وسیلۂ اظہار کے لیے دوسری دیسی زبانیں بھی موجود تھیں لیکن مسلمانوں نے برعظیم کی متعدد زبانوں میں سے صرف اسی زبان پر قناعت کی اور اسے اپنی پوری متاع سپرد کر کے اپنے خیالات کے اظہار کا بھرپور اور مؤثر وسیلہ بنایا۔ یہ تو اس زبان کی اپنی خصوصیات اور خوبیاں ہیں کہ اس نے بہت جلد "لنگوا فرنکا" کا درجہ حاصل کر لیا اور دوسری قوموں کے لیے جہاں انہیں عوام سے مخاطب ہونا پڑتا، اس زبان کا استعمال ناگزیر ہو گیا۔

مسلمانوں نے اردو کو ہر موضوع پر استعمال کیا برعظیم میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم رکھنے کے لیے اسلام کے بعد بلاشبہ اردو ہی اہم ذریعہ ہے۔ یہ زبان مسلمانانِ برعظیم کی حیات اجتماعی کی مظہر اور ایک ایسا مجلّہ اور مصفّا آئینہ ہے جس میں ان کی زندگی اور تہذیب کے خدوخال پوری طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ ان کی ہر تحریک اس زبان سے بارآور ہوئی۔ حتیٰ کہ برعظیم کے وہ علاقے جہاں اردو عام بول چال کی زبان نہیں تھی وہاں اٹھنے والی اسلامی تحریک بھی کبھی کبھی اردو کو ذریعۂ اظہار بناتی رہی ہے۔ اگر انیسویں صدی میں برعظیم کے مسلمانوں کی سیاست کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ عنصر نمایاں

نظر آتا ہے کہ یہی زبان تھی جس نے انہیں سیاست میں سرگرم کیا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں اردو ہندی تنازعہ زبان کے مسئلہ سے ہٹ کر مذہبی اور تہذیبی مسئلہ بن گیا تھا۔ سیاسی اور قومی احساس کے ارتقا نے شروع شروع میں ایک فرقہ وارانہ شکل اختیار کی اور اس کا نتیجہ زبانوں کی علیحدگی اور رسم الخط کے جھگڑوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جب انگریزوں نے سیاسی مصلحت کے پیشِ نظر اردو، ہندی یا ہندوستانی سے قطع نظر انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا تب بھی ہندو مایوس نہ ہوئے اور انہوں نے ہندی کو ثانوی سرکاری زبان کا درجہ دلانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اپنی قومی تر حریف اردو کی مخالفت کو بھی اپنا قومی شعار بنایا۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء سے اب تک مختلف طریقوں سے ہندی پرچار اور اردو دشمنی کی گئی اور پھر ساتھ ہی ہندوستانی کے نام سے اردو کو ہندی میں ضم کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں نے ہندو ذہنیت کے اس لائحہ عمل کو بہت پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ اور اردو یا اپنی تہذیب کے تحفظ یا اس کے نشوونما کے لیے ایک علیحدہ راستے کی ضرورت محسوس کی جس پر وہ اپنی تہذیب اور نظریۂ حیات کو گامزن کر سکیں۔

برعظیم کی اسلامی تاریخ ہمیشہ ایسی دینی تحریکات کے اثرات کی منت پذیر رہی ہے جن کا مقصد اسلام کا احیا اور برعظیم میں اس کا نفاذ تھا تاکہ ایک مثالی اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست وجود میں آئے۔ ہر دور میں اسلامی مفکرین اور مجاہدین کے فکر و عمل کے نتیجہ میں برابر ایسی تحریکیں اٹھتی رہیں جن کی بدولت مسلمانوں میں آنا اسلامی ریاست کا تصور جلا پاتا رہا۔ تحریک آزادی اور تحریک پاکستان اسی سلسلے کی انتہائی کڑیاں تھیں۔ اس ضمن میں جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے برعظیم کے مسلمانوں کے مختلف مذہبی۔ تہذیبی اقدار کے علاوہ اردو نے بھی مسلمانوں کی توجّہ ان کی علیحدہ اور منفرد قومیت کی تشکیل اور اس کے تحفظ اور استحکام کی جانب منعطف کرائی اور ۱۸۵۷ء کے بعد برعظیم کے مسلمانوں کی قومی و سیاسی تحریکات کا جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ اردو ہی کے طفیل مسلمانوں کی قومی زندگی میں وحدت خیال و عمل پیدا ہوئی اور مشترک مقاصد کے لیے مل کر کام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اردو کی جانب ہندوؤں کے معاندانہ تحریکوں کے نتیجہ میں مسلمان اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کے تحفظ کی جانب متوجّہ ہوئے۔ دو قومی نظریے کا احساس جو ابتدا ہی سے ان میں موجود تھا لیکن یہ عام مسلمانوں میں خوابیدہ تھا اب زیادہ تر قوی اور شدید ہو گیا۔ اس مرحلہ پر سیّد احمد خان نے جو دو قومی نظریہ کو اردو دشمنی کے نتیجہ میں پیش کرتے ہیں، مستقبل میں ہندو مسلم اتحاد کو ناممکن قرار دیا۔ ہندوؤں کی اردو دشمنی اور لسانی تنازعہ نے مسلمانوں کو اسلام کی اجتماعی روح سے آشنا کیا اور ہزار سال کے خوابیدہ ملی شعور کو بیدار کیا۔ برعظیم کے مسلمانوں کو وطنیت، علاقائیت اور نسلی تعصبات سے بالاتر رکھ کر ان کو احساسات ملّی اور ملّی مفادات کے زیر اثر رکھا۔ اس زبان کے ذریعہ اس کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، علماء اور قائدین اور جماعتوں اور اداروں نے مسلمانانِ برعظیم کی ساری قومی اور اجتماعی کوششوں کو بارآور کیا۔ ان کی تمام

قومی اور سیاسی تحریکیں اسی زبان کے سہارے رو بہ عمل رہیں اور قبولیت و کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ یہاں اس امر کا اظہار حیرت کا باعث نہیں ہے کہ ہندو جو مسلسل اردو دشمنی کا اظہار کرتے رہے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کی تحریک آزادی کی مخالفت میں ان کی مستقل تحریکیں جاری رہیں، اپنی تحریکوں کی کامیابی کے لیے اردو کو استعمال کرنے پر مجبور رہے۔

فی الحقیقت

اردو زبان نے مسلمانوں کی ملی تحریکات کے فروغ اور مسلمانوں میں ملی شعور کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہر تحریک اس کو اپنے ذریعۂ اظہار کی ضرورت کے طور پر اپناتی رہی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی تمام تحریکات اور بالخصوص تحریک آزادی ہند نے اس کے طفیل ہی قبولیت عام حاصل کی۔ ہندوؤں نے ہندی کو بھی اختیار کیا تھا لیکن تمام ہندوستانیوں اور مسلمانوں کو اپنی طرف راغب کرنے، انہیں اپنے قوم پرستانہ اور متحدہ قومیت کے خیالات کا حامی بنانے کے لیے اردو زبان استعمال کرنی پڑی۔ اسے بعض دوسرے نام بھی دیئے گئے لیکن تحریر و تقریر دونوں میں عام طور پر اردو زبان ہی استعمال کی گئی۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اس کی حیثیت زیادہ اہم تھی۔ اردو ہی کے سبب ان کے دو قومی نظریہ کے احساس میں شدت پیدا ہوئی جس کی بنیاد پر علیحدگی کی سیاست کا دور شروع ہوا۔ مسلمانوں نے اپنی علیحدہ اور منفرد قومیت کے تحفظ اور اپنی تہذیب کے احیاء کے لئے آزاد اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کی۔ اس جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے، قومیت کے احساس کو بیدار کرنے، آزاد اسلامی ریاست کے قیام کی ضرورت کے ابلاغ میں اردو ایک موثر ذریعہ ثابت ہوئی۔



ظفر احمد انصاری صاحب مقابلۂ حسن قرات میں

افسر علی بیگ

جامعہ عثمانیہ اور اردو

انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ برصغیر کے مسلمانوں نے آزادی کی جنگ بزورِ شمشیر لڑنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انگریزوں کو طاقت کے ذریعے نہیں نکال سکتے تو اس وقت کے عظیم مفکرین، علمائے دین اور دانشوروں نے یہ فیصلہ کیا کہ تعلیم کے اسلحہ سے لیس ہو کر سامراج کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ان ہی دنوں کی بات ہے جب کہ سر سید احمد خاں، الطاف حسین حالی وغیرہ نے علم حاصل کرنے کے لئے برصغیر میں زبردست تحریک چلائی جس کے بعد اسکول، کالج وجامعات وجود میں آئے۔

جنوبی ہند میں آزاد مسلم ریاست جو مملکتِ آصفیہ کہلاتی تھی اور حکمراں نظام دکن کہلاتے تھے انھوں نے تعلیم کے میدان میں عظیم کارنامے انجام دیئے تعلیمی میدان میں ان کی جدوجہد کا ایک جیتا جاگتا ثبوت جامعہ عثمانیہ ہے۔ اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر سابق نظام دکن نے ۴ر رجب المرجب ۱۳۳۵ھ میں اپنے ایک حکم نامے کے ذریعے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی اجازت دیتے ہوئے اپنے حکم نامے میں فرمایا "اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دیا جائے۔

اس حکم نامے کے تحت جامعہ عثمانیہ کا قیام مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۱۹ء بروز پنجشنبہ دس بجے صبح میں ہوا

یہ زمانہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کا وہ دور تھا جب انھوں نے ہندوستان کی سرکاری زبان انگریزی قرار دے دی تھی۔ بلکہ وہ اس معاملے میں اتنے حساس تھے کہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی بھی ادارہ انگریزی کے مقابل مقامی زبان کو لائے۔ دوسری طرف سرکاری ملازمت کا حصول انگریزی زبان کی تعلیم کے ساتھ منسلک تھا۔ ایسے میں اردو ذریعہ تعلیم کے تعلیمی ادارے قائم کرنا اور اُسے کامیابی سے ہمکنار کرنا بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ لیکن فرزندانِ دکن نے اپنے نواب کی سربراہی میں اس ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ انگریزوں کی مخالفت سے واسطہ اس لئے نہیں پڑا کہ ان کے ریاست کے ساتھ مساوی حیثیت کے تعلقات تھے۔ دوسری طرف وہ سمجھتے تھے کہ مقامی زبان میں یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم دینا ناممکن ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر روشن ہے کہ جب فیصلہ ہو جائے اور عزت وحرمت کا معاملہ ہو تو سب کچھ ہو جاتا ہے اس جذبے کے تحت جامعہ عثمانیہ کا آغاز ہوا جس کے اصول وضوابط کو احاطہ تحریر میں لانے اور دستور کی تکمیل کے بعد نصاب کی تیاری کا کام نہایت تیزی اور جوش وخروش کے ساتھ شروع کیا گیا۔ اس زمانے کے ماہرین تعلیم وعالم وفاضل پر مشتمل کمیٹیاں ترتیب دی گئیں جنہوں نے دن رات ایک کر کے نصاب تیار کیا۔

ان حضرات کی پرخلوص کاوش کو جب اپنے

زمانے کے ماہرینِ علم نواب عماد الملک ۔ ملا عبدالقیوم
علامہ شبلی اور نواب سر مسعود جنگ (سر راس مسعود) جیسی
شخصیات کا تعاون میسر آیا تو جامعہ نے دن دگنی اور
رات چوگنی ترقی کر کے ہندوستان اور مغرب کے کئی ممالک
میں وہ شہرت حاصل کی کہ جو اس سے پہلے ہندوستان کی
کوئی یونیورسٹی حاصل نہ کر سکی تھی ۔ اس شہرت کا بنیادی
سبب یہاں کے فارغ التحصیل طالب علموں کی وہ کھیپ
تھی جو مشرق و مغرب کی تعلیمی درسگاہوں میں اپنی تعلیم و
تربیت کی بنیاد پر نئے نئے انکشافات اور کارنامے انجام
دینے لگی جس نے غیروں کے ساتھ ساتھ اپنوں کو انگشت
بدنداں کر دیا ۔ جامعہ سے فارغ التحصیل طالب علم بہت
جلد دنیائے علم و ادب پر چھا گئے ۔ کوئی یونیورسٹی ، کالج
اخبار ، رسالہ یا کتاب ایسی نہ ہوتی تھی جس میں عثمانیہ یونیورسٹی
کے طالب علموں کا حصّہ نہ ہوتا ہو ۔ دنیائے علم و ادب اور
سائنس میں کارہائے نمایاں انجام دینے والی شخصیات میں
ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور پروفیسر حمید احمد خاں کا
نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا ۔ رضی الدین صدیقی
صاحب نے علم ریاضی میں وہ کارنامے انجام دئے جو
کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے ۔ وہ جامعہ پشاور
اور سندھ کے وائس چانسلر رہے ۔ بعد میں اسلام آباد
یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر کئے گئے ۔ اور دوسری
طرف حمید احمد خاں کی زندگی نے وفا نہ کی وہ اپنی
مختصر زندگی میں جامعہ پنجاب کے کامیاب وائس چانسلر
ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب اور صفِ اول کے ماہرِ
تعلیم رہے ۔ ان دونوں حضرات کا تعلق جامعہ عثمانیہ
سے تھا ۔ انھوں نے دینی تعلیم حاصل کی تھی اور حیرت
کی بات یہ ہے کہ رضی الدین صدیقی نے آئن اسٹائن
کے ساتھ مل کر نظریۂ اضافیت پر تحقیقات بھی
کی تھی ۔ اس کے علاوہ بے شمار مضامین احاطۂ
تحریر میں لانے کی وجہ سے علم و ادب کے ہر حلقہ میں
عزت و احترام سے جانے اور پہچانے جاتے تھے ۔ ان کی
قابلیت اور علمیت کا احترام کرتے ہوئے جامعہ عثمانیہ
نے انھیں ایل ایل ڈی کی ڈگری دی ۔ اور وائس
چانسلر بھی مقرر کیا ۔ اسی طرح عشرت حسین زبیری مرحوم
بھی اس جامعہ کے طالب علم رہے ۔ جنھوں نے انگریزی
علم و ادب میں اپنی کامیابیوں کا اعتراف انگلستان
کی یونیورسٹیوں سے کرایا ۔ انگریزی شاعری کے "مابعد
الطبیعاتی عنصر" پر مقالہ لکھ کر انگلستان کی یونیورسٹی
سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی تھی ۔

یہ وہی عشرت حسین زبیری ہیں جو بعد میں پاکستان
کے ماہرینِ تعلیم میں شمار کئے جاتے رہے ۔ راجشاہی
یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور بعد میں مرکزی حکومت
کے مشیرِ تعلیم بھی تھے ۔ یہ چند مثالیں ہیں ورنہ اس جامعہ
نے اپنی مختصر زندگی میں بیسیوں سائنس داں ، ریاضی داں
ڈاکٹر ، انجینئر ، شاعر ، انشا پرداز ، فن کار ، ماہرِ تعلیم اور
وکیل پیدا کئے ۔

وکیل کی مناسبت سے ایک بات یاد آگئی ۔
اس زمانے میں قانون کے آخری سال کے امتحان کے لئے
جن ممتحن حضرات کا تقرر کیا گیا ان میں ہندوستان کے
مشہور وکیل سر تیج بہادر سپرو بھی شامل تھے کل ۲۲
طالب علم امتحان میں شریک ہوئے اور سب کے سب اول درجے میں
کامیاب قرار دئے گئے ۔ سر تیج بہادر سپرو نے بھی واضح الفاظ میں ان
کی قابلیت ، علمیت اور معلومات کا اعتراف کیا تھا ۔ یہ سب کچھ کیوں
کر ممکن ہوا اس کے متعلق مختلف لوگوں کی مختلف آراء ہیں ۔ کچھ
لوگوں نے جامعہ کے معیار کو بنیاد قرار دیا جبکہ بیشتر نے اساتذہ کرام کی کاوش

اور شب و روز کی محنت کو سراہا۔ جب کہ بنیادی بات کی طرف بھی اکثر ماہرین نے اشارہ کیا۔ اور وہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ یعنی اپنی زبان میں حصولِ تعلیم حقیقت اپنی جگہ روشن ہے کہ معیار کے معاملے میں دیگر جامعات، جامعہ عثمانیہ سے کم نہیں۔ دوسری طرف اساتذہ کرام کی کاوش کی جانب جو اشارہ کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن دوسری طرف جامعات میں بھی ایسے اساتذۂ کرام ملتے تھے جو اپنے خونِ جگر سے علم کی آب یاری کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیگر جامعات کے مقابلے میں جامعہ عثمانیہ کو یہ انفرادیت حاصل تھی کہ وہاں کا ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی جو عام لوگوں کی زبان تھی جس میں بات کرنا اور سمجھنا نہ صرف آسان تھا بلکہ نئے نتائج اخذ کرنے کے لئے ذہن کی تیاری بھی ممکن تھی۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قاضی محمد حسین صاحب جو کہ جامعہ کے اولین اساتذۂ کرام میں سے تھے۔ فرماتے ہیں "علم جو اب تک نامانوس زبان میں مقید تھا۔ وہ اس سرزمین میں آزاد ہوا۔ عام ہوا"

ڈاکٹر اے۔ ایچ میکنزی ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ جامعہ عثمانیہ کے پرو وائس چانسلر بھی رہے۔ انھوں نے ایک خطبے میں مقامی زبان اور تعلیم کے حوالے سے جامعہ عثمانیہ کے طالب علموں کی کامیابیوں کا تذکرہ اس طرح کیا ہے؟

"یہ ایک غیر طبعی امر ہے کہ تعلیم ایسی زبان کے ذریعہ دی جارہی ہے جو نہ طلباء کی زبان ہے نہ اساتذہ کی۔ اس طریقے میں تخیل مسخ ہو جاتا ہے، فکری تازگی میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اور وقت و محنت رائیگاں جاتی ہے۔ یہی اسباب تھے جو جامعہ عثمانیہ میں زبان اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کے موجب بنے۔ میرے ذاتی مشاہدات نے مجھے یہ بھی یقین دلادیا کہ شمالی ہندوستان کے طلباء کی بہ نسبت جہاں انگریزی ذریعہ تعلیم ہے جامعہ عثمانیہ کے طالب علم استادوں کی تقریر کا زیادہ اثر قبول کرتے۔ اپنے کام میں زیادہ دلچسپی لیتے اور دماغی اعتبار سے زیادہ چست و بیدار ہیں"

ان اقتباسات کے ذریعہ ہم بخوبی یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کی کامیابی کے اسباب کیا تھے

جامعہ عثمانیہ کا قیام نظام دکن صاحب کے ایک حکم نامے کے تحت دس بجے صبح بروز پنجشنبہ ۲۸ اگست ۱۹۱۹ء میں عمل میں آیا۔ اس کی صدارت کے لئے عبدالرحمن بجنوری کا تقرر ہوا۔ وہ اس وقت اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں کیمبرج یونیورسٹی انگلستان میں تھے۔ انھوں نے یہ تقرر قبول کیا مگر وقت پہنچ نہ سکے اور جب اس فرض کی ادائیگی کے لئے یہاں آگئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی عدم موجودگی کے دوران مختلف لوگوں نے عارضی طور پر صدارت کے فرائض انجام دئے۔ جس میں سر راس مسعود بھی شامل رہے۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے ساتھ تعلیم کا آغاز ہوا۔ اعلیٰ ثانوی (انٹرمیڈیٹ) کی پہلی جماعت سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس وقت طالب علموں کی تعداد ۲۱۴ تھی۔ جیسے جیسے جماعتیں آگے بڑھتی گئیں اوپر کی جماعتیں قائم ہوتی گئیں۔ اس طرح ۱۹۲۴ء میں کالج کی پوری جماعتیں مکمل ہو گئیں۔ اس طرح یہ حصہ مکمل ہو گیا ابتدا میں کلیہ عثمانیہ، مدراس یونیورسٹی سے منسلک رہا بعد میں بتدریج علیحدگی حاصل کرتا چلا گیا۔ جیسے جیسے

دوسری جامعات جامعہ عثمانیہ کی اہمیت کو تسلیم کر
سے جامعہ عثمانیہ کامیابی کی منزلیں طے کرتی چلی گئی ۔
ابتداء میں یہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کہلاتا تھا ۔لیکن جامعہ
جیسے ہی اپنی مستقل جگہ پر عارضی عمارتوں میں منتقل ہوئی
کلیہ ختم کر دیا گیا ۔ اور جامعہ عثمانیہ کی زیر نگرانی مختلف
شعبہ جات کو منظم کیا گیا ۔ ان میں شعبہ اردو ، انگریزی
تاریخ ۔ لسانیات ۔فلسفہ ۔ عمرانیات دینیات ۔فارسی
معاشیات ۔ تلنگی اور سنسکرت آرٹ میں ۔ سائنس
میں شعبۂ طبعیات ۔ کیمیا ۔ نباتات ۔ حیاتیات
ریاضی ۔ ارضیات ۔ فلکیات ۔ کے ساتھ ساتھ شعبہ
قانون بھی قائم کیا گیا ۔

دفتری امور کی انجام دہی کے لئے دفتری معتمد
و دیگر امور کی انجام دہی کے لئے دیگر شعبہ جات
قائم کئے گئے ۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں
تعلیم دینے کے لئے طب انجینیرنگ اور ٹریننگ کالج قائم
کر دیئے گئے تھے ۔ جن کے نتائج بے انتہا حوصلہ افزا
تھے ۔

کلیہ عثمانیہ کا شروع میں مدراس یونیورسٹی سے الحاق
تھا ۔ لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ اردو کے ذریعہ
اعلیٰ درجہ کی تعلیم بہت ہی عمدگی سے دی جا سکتی ہے
تو کئی کالجوں کو کھولا گیا ۔ مثلاً نظام کالج ، سٹی کالج
چادر گھاٹ کالج ۔ اس کے علاوہ اضلاع میں بھی
کالج کھولے گئے ۔ مثلاً اورنگ آباد کالج ۔ ورنگل
کالج وغیرہ ۔

جامعہ عثمانیہ کی انفرادیت اردو زبان ذریعہ تعلیم
تھی ۔ یہ کام بظاہر بہت آسان نظر آرہا تھا ۔ لیکن
حقیقتاً اس وقت بے انتہا دشوار ہو جاتا تھا جبکہ

اساتذہ جدید ترین سائنسی تعلیم کا انگریزی زبان میں حاصل
کرنا اور اسطرح اساتذہ کو نہ صرف انگریزی زبان میں کتابیں
پڑھنی پڑتی تھیں ۔ بلکہ انہیں اردو میں لیکچر کی صورت میں
ڈھال کر طالب علموں تک پہنچانا پڑتا تھا ۔

ان مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک شعبہ ترجمہ و
تالیف کیلئے دار الترجمہ کے نام سے قائم کرنے کا فیصلہ ابتدا
ہی میں ہو گیا تھا ۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی
اہمیت بڑھی تو کام شروع کر دیا گیا ۔ اس کام کے
پیش نظر سارے ہندوستان سے بہترین مترجموں کو
حیدرآباد لایا گیا ۔ ان کو مناسب مشاہروں سے دارالترجمہ
سے وابستہ کر دیا گیا ۔ یہ اگر اپنے فن میں ماہرانہ ترجمہ
کے علاوہ تصنیف و تالیف بھی کرتے تھے ۔ ان لوگوں
میں مولوی عبدالحق کے علاوہ قاضی محمد حسین ۔ چودھری
برکت علی ۔ سید ہاشمی ۔ محمد الیاس برنی عبدالماجد
عبدالحلیم اور سید علی رضا جیسے لوگ شامل تھے ۔ جو
عربی کے علاوہ اور زبانوں پر عبور رکھنے میں اپنی مثال
آپ تھے ۔ ان لوگوں نے دارالترجمہ میں بے انتہا محنت
و مشقت کر کے بہت کم وقت میں تقریباً ۴۲۸ کتابیں
شائع کیں ۔ جن میں طبع زاد ہونے کے علاوہ ترجمے
بھی شامل تھے ۔ اس دارالترجمہ نے جو کام کیا وہ اپنی جگہ
بے مثال تھا ۔ اس کو سر اکبر حیدری نے اس طرح خراج
تحسین پیش کیا ۔

" اس کی حیات بخش کامیابیوں کی نظیر صرف
اس دور عباسی میں بغداد میں ملتی ہے جبکہ یونانی
زبان سے فلسفہ اور طب کی تمام کتابوں کے ترجموں نے
مشرق کے علم میں اضافہ کیا تھا ۔"

جامعہ عثمانیہ کا قیام جہاں مسلمانوں کے

بقیہ ۲۲۸



سابقہ انجمن اساتذہ وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج



سابق اراکینِ شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ

تھے۔ دبارا بوش۔ ولولہ پھر مایوسی کی مختلف کیفیات پڑھنے والے پر اسی انداز میں اثر انداز ہوتی ہیں جیسا کہ مولانا نے محسوس کیا

مندرجہ بالا عنوانات کے تحت ہم نے مولانا عبدالحق کی زندگی، علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات کا مختصر جائزہ لیا۔ یہ جائزہ حقیقتاً سرسری نظر کہلانے کا مستحق ہے۔ اس مختصر جائزے کے بعد جو چیز ابھر کر نظروں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ وہی مولانا کی انتھک محنت اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد، ہمارے لئے اس میں واضح طور پر ایک سبق ہے کہ کام کئے جاؤ۔ صلہ خداوند کریم پر چھوڑ دو۔ وہ اپنے بندوں کی کاوشوں کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔

مولانا نے زندگی کے ایک ایک لمحے سے جس طرح استفادہ کیا وہ مثال ہے اور قابل تقلید ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو جا اور بے جا تنقید کرنا چاہتے ہیں۔ جب عمل کا وقت آتا ہے تو تصویر حیرانی بنے ہیں۔ مولانا کی راہ میں رکاوٹیں بھی آئیں اور مصائب نے بھی سر اٹھایا۔ لیکن وہ اپنے مقاصد کے لئے صبر و شکر اور استقلال کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ آج ان کے اعلیٰ وارفع مقاصد زندہ و پائندہ ہیں۔ وہ جو کچھ چاہتے تھے بظاہر خواب ہی نظر آتے تھے لیکن ان خوابوں کی تعبیر پاکستانیوں کے لئے مسرت اور خوشی کا پیغام ہے۔ وہ ادارہ جسے قائم کرنے وقت

یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے یقیناً اپنے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے پاکستان کے تمام تعلیمی اداروں کے لئے مثالی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور وہ لوگ جو مولوی صاحب کے خواب کی تعبیر اردو یونیورسٹی کے نام کو حقیقت قرار دیتے تھے۔ اب ملک کی تمام یونیورسٹیوں سے توقع کر رہے ہیں کہ قومی زبان کی اہمیت اور افادیت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ سب اردو کو تعلیمی زبان کے طور پر قبول کر لیں۔ حقیقتاً یہی ہے موجودہ حکومت سے توقع بھی ہے کہ قومی زبان کو سرکاری زبان قرار دے کر انگریزی کی جگہ نافذ کر دے گی۔ اس طرح اردو کو وہ مقام مل جائے گا جس کی خواہش مولوی عبدالحق کرتے رہے۔

آج اردو زبان جس مقام پر کھڑی ہے اس کے متعلق واضح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ مولوی عبدالحق کی کاوش ہائے شب و روز کا نتیجہ ہے اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ روشن ہے کہ اردو زبان جب تک قائم و دائم ہے۔ مولوی صاحب کا نام بھی باقی رہے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا کے کارناموں کا کوئی صلہ نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی بابائے اردو کہہ کر انہیں جو کچھ دیا گیا اس کی اہمیت ان کی جذبات اور احساسات کا اعتراف ہے۔ ورنہ کچھ بھی نہیں۔ بابائے اردو میں بھی درحقیقت ممنونیت کا اظہار اور اعتراف پایا جاتا ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۱۶

عظیم دور کی نشاندہی کرتا ہے۔ خصوصاً دکن کے لوگ اس جامعہ کی منہ بولتی تصویر نظر آتا ہے یہ امر باعث حیرت ہے۔ اس جامعہ نے بہت ہی مختصر عرصہ میں تمام اداروں سے اپنی برتری تسلیم کروائی۔ اس کے بڑھتے ہوئے معیار، شہرت اور کامیابیوں سے ہر شخص حیران تھا۔ لیکن جلد ہی اس جامعہ کا زوال کا دور آگیا۔

قیام پاکستان کی تحریک اور اس کی کامیابی کے بعد ہندوستان نے بزور شمشیر دکن پر قبضہ کر کے نہ صرف نظام دکن کے اقتدار کو ختم کر دیا۔ بلکہ جامعہ عثمانیہ کی روح بھی سلب کر لی۔ یعنی اردو ذریعہ تعلیم کو ختم کر کے اس کی انفرادیت ختم کر دی۔

جناب محمد محسن اتا

سرسیّد اور اُن کے رُفقائے کار

اردو ادب میں سرسید احمد خان کا مقام بہت بلند ہے۔ انہوں نے جدید نثر کی بنیاد ڈالی۔ سرسید سے پہلے اردو میں حقیقت کا رنگ قطعاً نہ تھا بلکہ اردو ادب میں مافوق الفطرت واقعات اور مشکل پسندی نے جگہ کی ہوئی تھی۔ رنگین عبارت آرائی، مقفیٰ اور مسجع الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ سرسید نے ان تمام رنگینیوں کو چھوڑ کر بالکل نئی زبان، سادہ تحریر میں آسان زبان استعمال کی تاکہ پڑھنے والا بہ آسانی سمجھ سکے اور پڑھ سکے۔ مضامین میں ندرت، خیالات میں پاکیزگی، حقیقت سے قریب، مشاہدہ اور تجربہ یہ تمام باتیں ان کی نثر کو منفرد مقام دلاتی ہیں۔ وہ واحد شخص ہیں جنہوں نے اردو ادب میں باقاعدہ مضمون نگاری کی ابتدا کی جس سے آج ہم استفادہ کر رہے ہیں۔

سید عبداللہ، سرسید کے بارے میں لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خان کے ادبی سرمائے کو جو چیزیں مستقل امتیاز اور انفرادیت بخشتی ہیں، ان کو خصوصیت کے لحاظ سے تین چار جملوں میں یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں سرسید ہی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے فکر و ادب میں روایت کی تقلید سے ہٹ کر آزادی اسلوب کی رسم جاری کی اور ایک ایسے مکتب کی بنیاد رکھی جس کے عقائد میں عقل، نیچر، تہذیب اور مادی ترقی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ سرسید نے ادب میں ایک نیا پن، ایک ہمہ گیری، ایک مقصد، ایک سنجیدگی اور ایک خاص قسم کی معقولیت پیدا کی جس کے سبب [illegible] بیکاروں کا مشغلہ نہ رہ سکا تھا۔ انہوں نے ادب اور زندگی ہی کو باہم پیوند نہیں دیا بلکہ ادب اور اجتماع کے درمیان رشتہ قائم کیا۔ اور ادیبانہ ذہن و فکر کی کاوشوں کو جمہور کی خدمت پر لگایا۔ انہوں نے یہ تجربہ اور اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ ادب [illegible] ذریعہ دل کی سچی آواز ہی نہیں بلکہ جمہور اجتماع اور قوم کے دل کی سچی آواز اور ایسی سچی آواز ہے جو اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے جمہور کی اصلاح و ترقی اور تکمیل کے لیے اٹھائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب سرسید احمد خان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ سرسید انیسویں صدی کے مسلمانوں میں ایک بڑے فعال اور سرگرم کارکن تھے۔ سیاست، تعلیم، مذہب، معاشرتی اصلاح، زبان و ادب کی ترقی غرض سماجی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس پر

ان کی نظیر نہ ہو۔

سرسید احمد خان نے نہ صرف اردو ادب کی خدمت کی بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو بیدار کر نے ان میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کا شعور پیدا کیا تاکہ مسلمان کبھی اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکیں اور ایک ایسا ادارہ قائم کیا جس سے مسلمان آج بھی استفادہ کر رہے ہیں۔ یہ تھی علی گڑھ تحریک جس میں سرسید اور ان کے رفقا ءکرام بڑے سرگرم عمل رہے جن میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکا ءاللہ، چراغ علی اور محسن الملک سر فہرست ہیں۔ جبکہ مولانا وحید الدین سلیم، نواب عماد الملک، مولانا عبدالحلیم شرر، نواب صدر یار جنگ اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب جیسی قابل ذکر ہستیاں بھی شامل فہرست ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا محمد حسین آزاد جن کا شمار ان کے رفقا ءمیں تو نہیں ہوتا لیکن ان کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ مولانا علی گڑھ تحریک سے وابستہ نہ تھے۔ لیکن وہ اس تحریک کے مخالف بھی نہ تھے۔ مولانا نے تحریک سے ہٹ کر اپنے تئیں اردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں چاہے وہ شاعری کا میدان ہو یا نثر کا ہر دو جگہ وہ اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

اردو شاعری میں محمد حسین آزاد کا مقام جدید شاعری کے بانیوں میں سے ہے۔ اردو میں ادبی تاریخ کی ابتدا بھی انہوں نے کی۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے زمانے میں ادبی تاریخ، تذکرہ نگاری تک محدود تھی۔ انہوں نے یکسر یہ انداز بدل دیا اور "آب حیات" کے نام سے اردو شاعری کی پہلی با اصول تاریخ لکھی انہوں نے تاریخ لکھنے کا ایک نیا انداز

کے لیے ایک راستہ متعین کر دیا جس سے لوگ آج تک مستفید ہو رہے ہیں۔ اردو نثر کے بارے میں ہم وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے نثر کے میدان میں جو انداز اختیار کیا وہ بالکل منفرد ہے۔ یعنی نثر میں شاعری فرماتے ہیں۔ رنگین عبارت آرائی، مقفیٰ و مسجع الفاظ اور عربی و فارسی کی بھرمار ان تمام چیزوں کے ہونے کے باوجود تحریر پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آزاد کا رنگ گویا اس دور کے مصنفین میں سب سے منفرد تھا۔ اور آج بھی ان کی پیروی کوئی نہ کر سکا۔ حالانکہ شروع میں کچھ لوگوں نے ان کا طرز اپنانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ڈاکٹر ایت صاحب فرماتے ہیں

"مولانا محمد حسین آزاد انشاء پرداز ہیں، مورخ ہیں ادبی نقاد ہیں، شاعر ہیں ماہر لسانیات ہیں معلم ہیں اور انہیں خاص طور پر جدید شاعری اور تنقید کا نقیب کہا جاتا ہے"۔

ڈاکٹر محی الدین زور فرماتے ہیں کہ آزاد خوش گوئی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اور یہ خوش گوئی ان کی تحریروں میں قوس و قزح کے سے رنگ بکھیر دیتی ہے۔ ان کی تحریروں میں آبشاروں کا سا ترنم، کہساروں کا سا تکلم، چاندنی رات کا رنگین تبسم نظر آتا ہے۔ کہیں ہوا کا فراٹا ہے تو کہیں فضا کا سناٹا کہیں غنچوں کی چٹک ہے تو کہیں پھولوں کی مہک کہیں ستاروں کی چمک ہے تو کہیں بجلی کی کڑک کہیں چاند کی تابانی ہے۔ تو کہیں سورج کی درخشانی کہیں تہہ سمندر کا سکوت ہے تو کہیں رم آہو کہیں رقص طاؤس ہے تو کہیں صبح صادق کا نکھار تو کہیں شام کا سلونا پن غرض کہ یہ جذبات کی وہ چاندنی ہے جو ان کی تحریروں میں آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ گویا محمد حسین آزاد

اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں جنہوں نے ہمیں ایک منفرد اسلوب دیا۔ ادبی تاریخ کی ابتدا کی، جدید نظم اور شاعری کی بنیاد ڈالی جس سے اردو ادب خاصا مالا مال ہو گیا۔

سرسید کی انجمن کے تیسرے ممتاز رکن شبلی نعمانی ہیں جنہوں نے اردو میں اعلیٰ درجے کے تحقیقی مضامین اور کتب لکھنے پر خاص توجہ دی جس کا ثمر آج تک ابھر رہے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی پر مغربی اثر نظر نہیں آتا۔ حالانکہ سرسید کے دیگر ساتھیوں میں یہ اثر نمایاں ہے۔ شبلی کی شخصیت بڑی ہمہ گیر تھی۔ وہ ایک مورخ، معلم، نقاد اور محقق ہی نہیں تھے بلکہ ایک سوانح نگار اور شاعر بھی تھے۔ مہدی افادی نے انہیں تاریخ کا معلم قرار دیا ہے مولانا شبلی سرسید کے رفقار کار میں تھے۔ اور یہ کہ شبلی کو شبلی بنانے میں سرسید احمد خان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ شبلی نے اردو ادب میں ماضی کی روایات کو زندہ رکھا انہیں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں عبور حاصل تھا۔ سیرت نگار اس پایہ کے کہ سیرۃ النبی جیسی تخلیق پیش کی ہے جس کی مثال اردو میں نہیں مل سکتی۔ نثر کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی ان کا جواب نہ تھا وہ ایک طرف ناقد ہیں تو دوسری طرف ایک عاشق مزاج شاعر بھی ہیں۔ اور ان سب سے بڑھ کر مصنف عظیم اور بلند پایہ تحقیقات کے۔ خاص طور پر ان کی تصانیف نے اردو نثر کے نئے انداز اور مقصدیت کو اپناتے ہوئے جو کارنامے انجام دیئے وہ تا ابد اپنی ضو فشانی سے اردو زبان و ادب کے آسمان کو منور کرتے رہیں گے انہوں نے سیرۃ النبی سے پہلے الفاروق اور المامون لکھ کر عدل عمر فاروق رضؓ انتظام اور اسلامی قانون کی بالادستی ثابت کی تو المامون میں مامون الرشید کے دور کے حالات فلسفیانہ اور عالمانہ بنیاد پر مسلمانوں کے عروج و کمال کو یکجا کیا۔ جب کلام "الکلام اور علم الکلام تخلیق کیں تو فلسفہ عرب و عجم زیر بحث آیا اور شعر العجم کی مختلف جلدوں میں فارسی شاعری پر سیر حاصل بحث کی۔ غرض یہ کہ ان کی تصانیف حقیقتاً جدید اردو نثر کی کاسیکوں میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر ابو اللیث صاحب فرماتے ہیں:

شبلی کی شخصیت بڑی ہمہ جہت اور طرح دار ہے۔ وہ عاشق مزاج بھی ہیں۔ اور شعر کے نقاد بھی، مورخ بھی ہیں اور سوانح نگار بھی، محقق بھی ہیں اور فلسفی بھی، نثر اور نظم اردو اور فارسی دونوں میں یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ ماضی کی عظیم روایات کے پاسباں بھی ہیں اور جدید عصری تقاضوں سے آشنا بھی، وہ عالم بھی ہیں، شاعر اور انشاء پرداز بھی۔ سیرت نگار اس پایہ کے کہ سیرۃ النبی ایک ایسی تصنیف ہے جس کی مثال اردو میں دوسری نہیں اور اس پایہ کی کہ اردو سے اس کا ترجمہ دوسری زبانوں میں، ہوا غرض اردو ادب کی شبلی نے دل و جان سے خدمت کی اس کے بعد مولانا الطاف حسین حالی ہیں ان کا تعلق بھی سرسید تحریک سے ہے۔

سرسید احمد خان کے ساتھیوں میں حالی کا ایک خاص مقام ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حالی کی تحریر میں سرسید کا رنگ چھپائے نہیں چھپتا حالی کی تحریر کی خوبیوں میں ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ذات کو نمایاں نہیں کرتے بلکہ ایک مبصر یا واقعہ نگار کی حیثیت سے بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ مولانا حالی نے سرسید سے

بہت کچھ لکھا۔ نثر کے ساتھ ساتھ مولانا شاعری میں بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں حالانکہ ان کے زمانے میں شاعری کا جو انداز تھا۔ اس میں لب و رخسار اور معشوق کو زیادہ اہمیت تھی۔ حالی نے شاعری سے قومی اصلاح کا کام لیا۔ اور اپنے کام میں مگن رہے چاہتے تو وہ بھی شہرت کی خاطر اس دور کے تقاضے کو مدِنظر رکھتے ہوئے شاعری کرتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ سر سید نے حالی کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے اور ایک دفعہ سر سید سے لوگوں نے پوچھا کہ دنیاوی کام تو بہت ہو گئے کچھ اور بھی فکر کرو اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ سید دنیا سے کیا لائے ہو کہنے لگے کہ دوں گا حالی سے مدوجزرِ اسلام لکھوالایا ہوں۔

سر سید کا قول سر آنکھوں پر لیکن اس حقیقت سے فرار ممکن نہیں کہ حالی نے سر سید کی بامقصد زبان کو اپنی شاعرانہ طبیعت کے ذریعے اثر نثری خشکی سے نجات دلائی اور اس تاثر کو عام کیا کہ بامقصد باتوں میں بھی نثری صلاحیت اور ربط کا پایا جانا ضروری ہے۔ جہاں تک حالی کی خدمات کا تعلق ہے۔ تو ان سے انکار ناممکن ہے۔ اردو نثر کو یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید اور حیاتِ سعدی جیسی اعلیٰ و ارفع تخلیقات سے آراستہ کر کے دنیائے علم و ادب میں ہمیشہ کے لیے سرفرازی و بلندی عطا کر دی۔

نذیر احمد نے بھی سر سید کے مشن کو خاصی تقویت پہنچائی۔ نذیر احمد ایک اچھے انشاء پرداز تھے۔ یہ درست ہے کہ نذیر احمد کی تحریریں ناصحانہ رنگ نمایاں ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں نصیحت کا پہلو ہمیشہ نمایاں رہا۔ جب بھی کچھ لکھا اسے خاصا طول دے دیا۔ حالانکہ وہی بات چند لفظوں میں بھی بہ آسانی کہی جا سکتی تھی لیکن چونکہ نذیر احمد کا انداز ہی مختلف تھا۔ ناولوں کے کردار ان کے اپنے تخلیق کردہ تھے۔ اور ہر نام ایک منفرد خصوصیت رکھتا ہے مثلاً ظاہر دار بیگ، مبتلا بیگم، ہریالی، آزادی بیگم یا النصوح گویا یوں معلوم دیتا ہے کہ کردار پہلے تخلیق ہوئے ہیں اور نام بعد میں تجویز کیے گئے ہیں۔ ان کی تحریریں عربی اصطلاحات اور الفاظ کا بے جا استعمال اور غیر ضروری طور سے انگریزی کے الفاظ کا استعمال بعض اوقات کھٹکنے لگتا ہے نذیر احمد خواتین میں بے حد مقبول تھے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے ناصحانہ رنگ اپنایا لیکن اس کے باوجود ان کی تحریر میں دلکشی نمایاں تھی۔

دیگر رفقاء میں محسن الملک شروع میں سر سید کو اہمیت نہ دیتے تھے۔ لیکن جب خود جائزہ لیا تو بڑے متاثر ہوئے۔ اور ان کے ساتھ مل کر ملک و قوم کی خدمت میں لگ گئے۔ اور ساتھ ہی اردو ادب کی خدمت ہوتی رہی۔ اردو جو سر سید احمد خان سے پہلے خاصی مشکل زبان سمجھی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ مختلف مدارج طے کرتی ہوئی۔ سلاست و روانی کا پیکر بن گئی۔ اس کی ابتداء میں سر سید کا نام پیش پیش ہے۔ تو آخر میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا نام گرامی تابندہ و درخشاں رہے گا کہ جنہوں نے اردو ادب کی خاطر تن من دھن کی بازی لگا دی۔ اور اس کی ترقی و ترویج میں دن رات ایک کر دیے۔ کہیں حکومت سے لڑ رہے ہیں جب تک ہندوستان میں رہے۔ وہاں کے لیڈروں سے اچھی خاصی بحث رہی کہ ہندوستان کی سرکاری زبان اردو ہونی چاہیئے اس لئے کہ یہی زبان ملک کے کونے کونے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جب پاکستان تشریف لے آئے تو یہاں پر اردو کے نفاذ کی کوششوں میں

لگے رہے۔ زندگی بھر شادی اس لیے نہیں کی کہ اگر شادی کرلی تو بچوں کے بکھیڑوں میں پھنس جائیں گے بلکہ مولوی صاحب کا یہ کہنا تھا کہ میری شادی تو اردو سے ہو گئی ہے۔ انہیں اردو زبان سے بے تحاشہ محبت و عشق تھا آج ہم جو کچھ اردو کو اس منزل پر دیکھ رہے ہیں یہ مولوی صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب مولوی صاحب کا یونیورسٹی کا خواب پورا ہوگا۔ حالانکہ وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن پاکستان اور اردو ادب جب تک زندہ ہے مولوی صاحب کا نام بھی زندہ رہے گا۔

سید سلیمان ندوی مرحوم فرماتے ہیں:۔

"مولوی عبدالحق نے سادہ نگاری کو ترقی دی، نقد و تبصرہ کی نئی راہ نکالی۔ اردو کی تاریخ کئی سو سال آگے بڑھا دی، اردو کے قواعد کو نئے سرے سے مرتب کیا اردو لغت، اردو تذکرے، اردو کے پرانے دیوان اور اردو میں نئے علوم کی عمدہ کتابیں چھپوائیں اور لکھوائیں اور انجمن ترقی اردو کو ہر حیثیت سے وہ ترقی دی کہ آج وہ ملک کا ایک زندہ ادارہ ہے"۔

سر سید احمد خان نے قدیم اردو جسے ہم خواب و خیال یا افسانوی زبان کہہ کر مخاطب کر سکتے ہیں جو شعر و شاعری اور حسن و عشق کی بے سروپا کہانیوں تک محدود نظر آتی تھی، جس کے متعلق عام تاثر یہ تھا کہ علمی کارناموں اور تحقیقی کاموں کے لئے ناموزوں ہے۔ اسی زبان کو سر سید نے معانی خیالات کی ادائیگی کے لئے تیار کیا۔ اور سر سید کے رفقاء نے اپنی ان تھک محنت کے ذریعہ اسے اس لائق بنایا کہ ہر قسم کے خیالات کو بخوبی اور آسانی پیش کیا جانے لگا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ روشن ہے کہ

جب مولوی عبدالحق نے اردو زبان کو قومی اور سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرانے کی جدوجہد کی تو اس وقت تک اردو زبان ان امور کی انجام دہی کے لئے بڑی حد تک تیار ہو گئی تھی۔ جس کا واضح ثبوت جامعہ عثمانیہ اور اس سے الحاق شدہ کالج ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اردو کے لئے جو تحریک چلائی اس کی بنیاد سر سید نے رکھی اور شبلی حالی و دیگر رفقاء کار نے دن رات محنت کر کے اردو زبان میں وہ ادب تخلیق کیا جو دوسری زبانوں کی کامیابی و کامرانی کا سبب بنتے رہے ہیں۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سر سید سے عبدالحق تک اردو نے اپنی بنیادوں کو اس قدر استوار کر لیا تھا کہ اس پر کسی بھی قسم کی کتنی ہی بلند عمارت تعمیر کر لی جائے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا مولوی صاحب کی خوش نصیبی تھی کہ وہ اس دور میں اردو زبان کی خدمت کے لئے کمربستہ ہوئے جب سر سید کی تحریک اپنے شباب پر تھی مولوی صاحب نے اپنی جانفشانی سخت محنت اور خلوص سے کام کر کے اردو زبان کو وہ مرتبہ دلوایا جس کی وہ حقدار بن چکی تھی۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سر سید نے جس کام کا آغاز کیا۔ مولوی صاحب کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہوئی۔



امین فاروقی

مولوی عبدالحق کی خدمات

خداوند کریم نے انسان کو زندگی دیتے وقت ایک عہد لیا تھا کہ وہ دنیا میں جا کر انسانیت کی عظمت کے لئے اپنے آپ کو —— برائی سے بچائے گا۔ انسان نے دنیا میں آکر مختلف انداز سے اپنے اِس عہد کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ عہد کو نبھانے کا بہترین طریقہ یہ قرار دیا کہ انسان اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔ اور ضمیر کی آواز کو تسلیم کرے۔ جن لوگوں نے اِس پر عمل کیا وہ انسانیت کی تاریخ میں تا ابد اپنا نام روشن کر گئے۔ ایسے ہی لوگوں میں مولوی عبدالحق کا شمار بھی ہوتا ہے۔ جنہوں نے اردو زبان و ادب کے لئے اپنی تمام تر خواہشاتِ انسانی کو کچل کر رکھ دیا اُردو زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا جس نے اردو کے لئے جان و مال کی قربانی سے کبھی فرار نہ چاہا۔

زندگی کا سفر آگے بڑھتا رہا۔ ایک مضبوط توانا جسم اپنے مقصد کے حصول کیلئے گھلتا رہا اور ایک دن خاک کا ڈھیر بن کر قبر کی آغوش میں جا سویا۔ عام طور پر انسان کی تاریخ یہاں آکر مکمل ہو جاتی ہے۔ مولوی عبدالحق کی تاریخ کا یہ حصہ ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو مکمل ہو گیا۔ اور اُردو کالج کے احاطے میں جُزو اپنے کُل سے مل گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بابائے اُردو لافانی ہیں۔ وہ امر ہو چکے ہیں۔ اِن کی اِس زندگی کو کوئی نہیں چھین سکتا کیونکہ اردو زبان کا روشن مستقبل اور بڑھتی ہوئی اہمیت بابائے اُردو کے نام کو تا ابد قائم و دائم رکھے گی۔ ــہ

حق ملا حق دار کو از روئے حقِ احتساب
پھر کیوں نہ اس پر سجے بابائے اردو کا خطاب

مولوی صاحب کے جدِ امجد کا نام صادق علی اور دادا کا نام شیخ صفدر تھا۔ صفدر صاحب کے دو بھائیوں کے نام شیخ شارت علی اور شیخ ضامن علی تھے۔ صفدر صاحب نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے شیخ امام بخش تھے دوسری بیوی سے شیخ علی حسین جو مولوی عبدالحق کے والدِ محترم تھے۔ حالاتِ زمانہ و روزگار ان کے سر پرستوں کو فیروزپور (مشرقی پنجاب) لے آئے جہاں عبدالحق نے تعلیم کا آغاز کیا۔ مختلف مقامات پر اپنے تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے سنہ ۱۸۸۸ء میں تقریباً ۱۸ سال کی عمر میں علی گڑھ کالج میں بغرضِ تعلیم تشریف لائے۔ چھ سال یعنی سنہ ۱۸۸۸ء تا سنہ ۱۸۹۴ء تک علی گڑھ میں پڑھنے کے بعد بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ دورانِ تعلیم جن اساتذہ کرام سے فیض حاصل کیا ان میں تھیوڈر بیک، پروفیسر آرنلڈ، شبلی نعمانی اور مولانا عباس حسین کے نامِ نامی شامل ہیں۔ جبکہ ہم جماعتوں میں مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین، سید محفوظ علی اور مولوی حمید الدین جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں۔

سنہ ۱۸۹۵ء میں تعلیمی مراحل سے گذرنے کے بعد مولانا نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو مدرسہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں بحیثیت صدر مدرس تقرر ہو گیا۔

انہوں نے نہایت محنت اور جانکاہی سے

سے اپنے فرائض منصبی انجام دیئے۔ اس دوران بحیثیت مترجم ریاست دکن کے معتمدی اور امورِ عامہ میں اپنی ذمہ داریوں کو بھی باحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ اپنی ذمہ داریاں دلچسپی اور توجہ سے سنبھالنے کی وجہ سے جلد ہی ریاستی حکام کی نظروں میں آگئے۔ اس طرح ۱۹۱۱ء میں ناظم تعلیم کا معاون ومددگار بنا دیا گیا۔ اور جلد ہی یعنی ایک سال بعد اورنگ آباد کے شعبہ تعلیم کے صدر مہتمم مقرر کر دیئے گئے۔

تصنیف وتالیف سے دلچسپی ابتدا ہی سے تھی دورانِ ملازمت یہ دلچسپی بڑھتی گئی اور ایک وہ زمانہ آیا کہ انھیں ڈائرکٹر سررشتہ تالیف وترجمہ بنا دیا گیا جہاں ۱۹۱۹ء تک اپنے فرائض منصبی نہایت خلوص ودلچسپی سے انجام دیتے رہے۔ ان کی علمی وتعلیمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں عثمانیہ کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ اور جب عثمانیہ کالج ترقی کرتے کرتے عثمانیہ یونیورسٹی میں بدل گیا تو مولوی عبدالحق صاحب کو ۱۹۳۰ء میں شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کا صدر مقرر کر دیا گیا۔ یہ جگہ وحیدالدین سلیم صاحب کے انتقال کی وجہ سے خالی ہوئی تھی۔ ان کے اعلیٰ ادبی وعلمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۳۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری دی۔ اسی طرح ۱۹۳۷ء میں ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی نے بھی ڈی لٹ کی ڈگری دی۔

انجمن ترقی اُردو

۱۹۰۳ء میں علی گڑھ میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی گئی۔ پہلے صدر کے طور پر پروفیسر آرنلڈ اور معتمد اعلیٰ مولانا شبلی نعمانی کو مقرر کیا گیا۔ اردو کی ترویج وترقی انجمن کے اصلی مقاصد تھے جن پر مولانا شبلی نہایت کامیابی اور مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہے۔ بڑھتی ہوئی معروفیات

دسمبر ۱۹۰۹ء میں ان کی جگہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو منتخب کیا گیا۔ اس زمانے میں صدر پروفیسر آرنلڈ انگلستان چلے گئے۔ جبکہ ممبران کی اکثریت حیدرآباد دکن میں مقیم تھی اس لئے رابطہ قائم کرنے میں دشواریاں پیش آنے لگیں تو انجمن کا کام بھی متاثر ہوا۔ شیروانی صاحب ان حالات میں کوئی قابلِ ذکر کام نہ کر سکے۔ تو انھوں نے استعفیٰ پیش کر دیا۔ اِن کے بعد اردو اور انگریزی ادب پر مکمل دسترس رکھنے والی شخصیت مولوی عزیز مرزا کو معتمد کے فرائض کے لئے منتخب کیا گیا۔ انجمن کی بدقسمتی کہ مولانا صاحب ایک سال بعد انتقال فرما گئے۔ اور انجمن بے یار ومددگار رہ گئی۔ اس دوران علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد کیا گیا۔ وہاں کانفرنس کے سربراہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے انجمن کے معتمد کے لئے مولوی عبدالحق صاحب کا نام نامی پیش کیا جسے کانفرنس نے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ اس طرح مولوی عبدالحق صاحب ۱۹۱۲ء میں انجمن کے معتمد چن لئے گئے اس زمانے میں مولوی صاحب بغرض ملازمت اورنگ آباد میں مقیم تھے۔ لہٰذا انجمن کا دفتر بھی وہیں قائم کر لیا۔
مولانا نے جب کام کا آغاز کیا تو انجمن کی بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ایک صندوق خستہ حالت میں ملا تھا جس میں چند ضروری کاغذات، فائلیں، اور مسودات نہایت خستہ حالت میں پڑے تھے۔ بہرحال انھوں نے نہایت دلچسپی وجانفشانی سے اپنے فرائض کی طرف توجہ مبذول کی۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۸ء تک اورنگ آباد میں اپنی ملازمت کی وجہ سے مقیم رہنے اور علاوہ ملازمت انجمن کے لئے بھی کوشاں رہے۔

۴۲ سال کی ملازمت کے دوران انھوں نے انجمن اور عمر نے مجبور کیا تو ۱۹۰۵ء میں استعفیٰ دے دیا۔

کی نئے سرے سے تنظیم کی۔ صحیح منصوبہ بندی اور خلوص و محنت سے انجام دینے کے اصول کی وجہ سے انجمن نہایت آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگی۔ دراصل وسائل کی کمی اور کام کی زیادتی نے انجمن کو بروقت ترقی کرنے سے معذور رکھا لیکن مولوی صاحب کی بلند ہمتی اور لگن نے بڑی حد تک انجمن کو آگے بڑھایا۔ جو چیز ترقی میں آڑے آ رہی تھی وہ مولوی صاحب کی ملازمت اور انجمن کا دفتر اورنگ آباد میں ہونا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ کی مجلس مشاورت کے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے انجمن کا دفتر دہلی منتقل کیا گیا۔ اتنے عرصے میں مولانا انجمن کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ لہذا انہوں نے انجمن کی خاطر ملازمت چھوڑ دی اور انجمن کے ہمراہ دہلی منتقل ہو گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے کامل یکسوئی کے ساتھ انجمن کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کی خاطر دن رات جدوجہد کی۔ سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور دفتر قائم کئے۔ عام و خاص کو اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے بیدار کیا۔ اور احساس دلایا کہ اردو زبان کی ترقی کے کیا فوائد ہیں۔ مولوی صاحب کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ انجمن تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہی تھی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک مولوی صاحب سارے ہندوستان میں اپنی تحریک پھیلا چکے تھے۔ یہ دور بے انتہا جدوجہد کا دور تھا مخالفین کی نئی نئی چالیں، چالاکیاں اور شعبدے بازیاں ... مولانا کے لئے پریشان کن تھیں۔ جہاں غیر نالاں تھے وہاں اپنے بھی مخالف تھے۔ ہر ایک کو سمجھانا ان سے ملاقات کرنا آسان کام نہ تھا۔ ... مولانا کا کھانا پینا حرام ہو گیا تھا۔ اسی دوران سیاسی حالات میں زبردست کشیدگی آئی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے

چلے گئے۔ ۱۹۴۷ء اگست میں ہندوستان تقسیم کر دیا گیا اور پاکستان عالم وجود میں آیا۔ پاکستان کے قیام سے جہاں مسلمانوں کو ایک وطن مل گیا وہیں اردو کو بھی دہلی سے دیس نکالا ملا۔ کیونکہ اردو کے معاملے میں ہندو تنگ نظر تھے۔ وہ صرف سیاسی مصلحت کی بناء پر اسے برداشت کر رہے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد سیاسی مصلحت ختم ہو گئی تو انہوں نے اردو انجمن کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح مولوی صاحب کے لئے لازم ہو گیا کہ وہ بھی اردو کے ساتھ پاکستان ہجرت کر جائیں سو نومبر ۱۹۴۷ء میں مولانا کراچی تشریف لے آئے اور یہاں از سر نو کام کرنے کا آغاز کیا۔ لیکن اپنوں کی مخالفت اور ارباب حل و عقد کی ریشہ دوانیاں اور ملک کے مخصوص لسانی حالات کی وجہ سے مولانا پاکستان میں اپنے اعلیٰ مقاصد میں وہ کامیابیاں حاصل نہ کر سکے جن کی توقع قائد اعظم کے اعلانات اور اردو کی قومی حیثیت کی وجہ سے نظر آ رہی تھیں۔ دراصل قائد اعظم کی وفات اور لیاقت علی کی شہادت نے ملک قائم کرنے کے اعلیٰ مقاصد کو پس پردہ ڈال دیا۔ ایسے میں قومی زبان کے خلاف بھی تحریک وجود میں آئی۔ جس میں فتنہ انگیز لوگ پیش پیش تھے۔ بنگالی اور اردو جھگڑے نے بھی مولانا کو مایوس کیا اور رہی سہی کسر بڑھتی ہوئی عمر نے پوری کر دی۔ مولانا نہایت صبر و استقامت کے ساتھ حالات کے عین مطابق اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔ اسی دوران ۱۹۵۸ء میں فوج کے سربراہ جنرل ایوب خان نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مولوی صاحب نے نئے سرے سے جدوجہد شروع کی۔ ایوب خان نے مولانا کے جذبے کو سراہا

اور انجمن کے مقاصد میں تعاون کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ مولانا نے ذرا اطمینان کا سانس لیا تھا کہ موت نے آن گھیرا اور مولانا ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء میں رحلت فرما گئے۔ پاکستان میں آنے کے بعد وہ ابتدا میں معتمد اور ۱۹۵۹ء میں صدر انجمن بن گئے تھے۔ بعد ۱۹۶۱ء تک اسی حیثیت سے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔

اردو کالج کا قیام: مولوی عبدالحق کی ادبی تعلیمی یا علمی خدمات کا اعتراف نہ کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ انھیں تعلیم سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ شعبۂ تعلیم کی ملازمت کے دوران نہایت خاموشی اور جاں کاہی کے ساتھ تعلیمی مقاصد کی تکمیل کے لئے کوشاں رہے اور جب اردو زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تو ان کی دلچسپی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو زبان سے بے انتہا بڑھ گئی۔ ایسے ادارے جہاں اردو زبان بحیثیت ذریعہ تعلیم رہی یا اردو کو منفرد مقام حاصل رہا۔ ان سب سے مولوی صاحب کی ہمدردیاں بھی وابستہ رہیں۔ ان کی ترقی و تعمیر کے لئے یا مسائل حل کرنے کے لئے مولانا ہر وقت تیار رہا کرتے تھے۔ دکن کی جامعہ عثمانیہ، رڑکی کالج ہو یا آگرہ کا نوزائیدہ تعلیمی ادارہ ہو دہلی کالج ان سب سے مولانا کسی نہ کسی طور وابستہ رہے۔ جب تقسیم کے بعد پاکستان آگئے تو ابتدا میں انجمن ترقی اردو کے امور کا کام وہی میں مصروف رہے۔ بعد میں ۱۹۴۹ء میں انجمن کے دفتر میں انجمن ترقی اردو کالج قائم کیا۔ اس کالج کے قیام کے وقت ان کے ذہن میں واضح ترین مقصد یہی تھا کہ اردو کالج میں پاکستان کے ہر حصے کے لوگ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یکجا ہوں۔ جہاں ان کی تربیت قومی سطح پر اس طرح کی جائے کہ پاکستان کے نظریۂ قومیت کو تقویت حاصل ہو۔ نیز ہر صوبے کے لوگ اضلاع سے وابستگی محسوس کریں۔

مولانا پاکستان میں اردو یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔ جہاں تجارت، فن، سائنس۔ قانون طب، حکمت کی تعلیم اردو زبان میں دی جائے۔ ان کی زندگی میں یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ البتہ ان کی وفات کے بعد اردو کالج نے بے انتہا ترقی کی۔ جہاں تک اردو کالج کا سوال ہے اس کی بنیاد ۱۹۴۹ء میں رکھی گئی تھی۔ اس وقت جملہ اساتذہ کی تعداد دس اور طالب علموں کی تعداد تقریباً دو سو پچیس تھی۔ کالج میں صرف آرٹس کی تعلیم کا انتظام تھا۔ ۱۹۵۰ء میں تجارت (کامرس) کی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ اس دوران میں کالج کا سندھ یونیورسٹی سے الحاق ہوگیا۔ ۱۹۵۱ء میں شعبہ قانون قائم کیا گیا۔ اور اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۵۲ء میں سائنس کے شعبے کا قیام عمل میں آیا۔

ارتقائی عمل سے گذرتے ہوئے کالج ترقی کی راہ پر کبھی تیزی سے اور کبھی آہستگی سے آگے بڑھتا رہا۔ طالب علموں کی تعداد ابتدا میں کم لیکن بتدریج بڑھنے لگی۔ شروع میں چند سائنسی مضامین پڑھائے جاتے تھے آہستہ آہستہ تقریباً تمام مضامین کی درس و تدریس کا انتظام کردیا گیا۔ شعبہ سائنس ترقی کرنے لگا تو تنگیٔ داماں نے آن گھیرا۔ ایسے میں صدر ایوب خان کا دورہ آگیا۔ ان کی مہربانی اور انجمن ترقی اردو کے اس وقت کے صدر اختر حسین کی کاوش رنگ لائی اور کالج کے لئے مخصوصاً سائنس کالج کے قیام کے لئے کراچی یونیورسٹی روڈ پر گلشن اقبال میں تقریباً ۲۰ ایکڑ زمین

حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ نیز حضرات و حکومت کی توجہ و دلچسپی کی بنا پر خاصی رقم دستیاب ہوئی جس کی وجہ سے سائنس کے شعبہ کے قیام کا آغاز کیا گیا۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں نے ۱۲ مئی ۱۹۶۴ء کو شعبۂ سائنس کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد بتدریج عمارت کو اس طرح مکمل کرنے کی جدوجہد کا آغاز ہوا کہ جس تجربہ گاہ یا کمرے کی تعمیر ضروری ہوئی اسے بنا لیا گیا آہستہ آہستہ عمارت کے پہلے حصے کی تعمیر کا بڑا کام مکمل ہو گیا۔ تو ۱۹۶۹ء میں شعبۂ سائنس نئی عمارت میں منتقل ہو گیا۔ اس وقت گلشنِ اقبال کی آبادکاری کا ابتدائی کام ہو رہا تھا۔ سائنس کے شعبے کو بھی بنیادی نوعیت کی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ سائنس کالج میں بجلی اور پانی نہیں۔ ۔ ۔ طلبہ و طالبات اور اساتذہ کرام نے جیسے تیسے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے جدوجہد جاری رکھی۔ کالج کو پہلے صوبائی حکومت نے اور بعد میں وفاقی حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں کالج کی امدادی رقم میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ جنرل صاحب نے بذاتِ خود کالج کا دورہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں کالج کی عمارت میں مزید توسیع کا منصوبہ تیار ہوا جس پر آج کل کام ہو رہا ہے۔ دوسری طرف کتب خانے کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ جو نہایت تیزی اور کامیابی کے ساتھ تکمیل کے مختلف مراحل سے گذر رہا ہے۔

اردو کالج کا سفر اردو یونیورسٹی کی طرف جاری ہے۔ راہ کی صعوبتیں مستقل مزاج مسافروں کے سامنے دم توڑ رہی ہیں۔ یہ مسافر وہی لوگ ہیں جن کی فوج مولانا نے تیار کی تھی۔ ان لوگوں کی کامیابی حقیقتاً مولانا کی کامیابی ہے۔

مقدمہ نگاری:-

عام طور پر کتابوں کی ابتداء میں مقدمہ لکھوانے کے پس منظر پر غور کرتے وقت ایک ہی جذبہ موجزن نظر آتا ہے کہ ہماری تخلیق کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے اور اس کے لئے مشہور زمانہ ادیب یا شاعر کا کسی بھی لحاظ سے شہرت یافتہ فرد سے مقدمہ لکھوا لیا جائے۔ اور کتاب کی شہرت کا بندوبست کیا جائے۔ بعض مرتبہ بڑی ہی دلچسپ صورتیں دیکھنے میں آئی ہیں کہ سیاست داں سے ادبی ذوق کے فقدان کے باوجود ادبی تخلیق کا مقدمہ لکھوایا۔ یا پھر عموماً ایک ہی قسم کا مقدمہ ملتا ہے جو غماز ہوتا ہے اس بات کا کہ صاحبِ تحریر نے کتاب پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ بعض دفعہ ایسے لکھنے والوں کا نام دیکھ کر مقدمہ پڑھنے کو دل چاہا۔ لیکن پڑھتے پڑھتے یہ پتہ چلا کہ ان کی اپنی تخلیق میں جو دلچسپی پائی جاتی ہے یہاں اس کا فقدان بلکہ قحط الرجال ہے۔ دراصل مقدمہ آئینہ ہوتا ہے اس تحریر کا جو تخلیق کی گئی ہے۔ وہ تعارف بھی ہے اور تبصرہ بھی۔ مقدمہ لکھنے والا اپنے انداز بیان دلچسپی اور مکمل توجہ کی بنیاد پر تخلیق کی اہمیت بڑھا سکتا ہے۔ اور عدم دلچسپی، عدم توجہی یا انداز بیان کی مدد سے اس کی وقعت کو ختم کر سکتا ہے مطلب صرف یہی ہے کہ مقدمہ لکھنا بھی ایک فن اور ضرورت ہے۔ روایت نہیں جبکہ ہمارے ہاں مقدمہ لکھنے والے روایت کی پابندی کرتے ہوئے کتاب پر اپنے نام کی چھاپ لگوانے کے لئے مقدمہ بازی کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ اس کے برعکس مولوی عبدالحق مقدمہ نگاری، اہم اور آئینہ قرار دیتے ہوئے پوری توجہ اور کامل

لگن سے تحریر کرتے ہیں۔ ان کے بے شمار مقدمات کا مطالعہ جہاں علم و ادب کی سربلندی و سرفرازی کا پیغام سنا رہا ہے وہیں پڑھنے والے کی علمی اور ادبی معلومات میں بھی اضافہ کر رہا ہے۔ مقدمہ کا ایک نام عکس یا آئینہ بھی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب کے تحریر کردہ مقدمات اس تخلیق کے لئے آئینہ کا کام دیتے ہیں۔ پس باغ و بہار کا مقدمہ ہو یا میر تقی میر کی شاعری پر لکھا ہو! مقدمہ ہر ایک میں ضروری معلومات تعارف اور خوبیوں پر سیر حاصل بحث ملتی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ ان کا تحریر کردہ مقدمہ کتاب کے مواد کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے۔ شخصیت نگاری، انتقادیت اور تحقیق کے تقاضوں پر مکمل بحث ہیں۔ جس سنجیدگی اور بردباری کا عمل دخل واضح طور پر نظر آتا ہے ہمیں رہ رہ کر یہ احساس دلاتے رہتے ہیں کہ اردو علم و ادب میں ایک نئے انداز کا مقدمہ لکھنے کا رواج مولوی عبدالحق ڈال رہے ہیں۔ جو دوسرا ادبیات پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔

جہاں تک ان کے مقدمے کی خوبیوں کا تعلق ہے تو یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ جس کتاب کا مقدمہ مولوی صاحب نے لکھ دیا وہ علم و ادب میں اپنا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی کامل توجہ و دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ مصنف اپنی تخلیق کی تمام خوبیوں سے اس وقت واقف ہوتا ہے جب وہ مقدمہ پڑھتا ہے۔ دوسری طرف مولوی صاحب کی معلومات اور توجہ کا یہ عالم ہے کہ مقدمے ہی میں شخصیت نگاری اور تعارف کراتے کراتے اتنے مصروف ہو گئے کہ ایک اچھا خاصا مضمون تیار ہو گیا جس میں تنقید اور تحقیق کی خشکی کو سیرت نگاری کی چاشنی اور زبان کے آسان لیکن با ربط ہونے نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ان کے بے شمار مقدمات میں سے بیشتر مقدمات ایسے ہیں جو تحقیق اور تنقید کے ساتھ ساتھ سیرت نگاری کے بھی خوبصورت نمونے ہیں۔ مقدمات میں بے انتہا اہمیت کا حامل "مقدمہ کاروانِ میر" ہے جس میں تنقید اور تحقیق کی نمایاں جھلکیاں ملتی ہیں۔ جن کو مزید پروان چڑھاتے ہیں طرز نگارش و اسلوب اور جامعیت کا عمل دخل ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

"میر تقی میر سرتاجِ شعرائے اردو ہیں۔ ان کا کلام اس دلچسپی ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام فارسی زبان میں۔ اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میر کا نام اس فہرست میں ضرور داخل کرنا ہوگا۔ یہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جنھوں نے موزونیِ طبع کی وجہ سے یا اپنا دل بہلانے کی خاطر یا دوسروں سے تحسین سننے کے لئے شعر کہتے ہیں۔ بلکہ ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے۔"

یہ چند سطریں مولوی عبدالحق کی مقدمہ نویسی تحقیق و تنقید اور دلائل کے نقطۂ نظر کو بڑے مؤثر اور خوبصورت انداز میں واضح کر رہی ہیں۔ اسی طرح مسدس حالی پر لکھا ہوا مقدمہ مسدس حالی کے تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ ارتقائی حالات کو بھی نہایت خوبصورتی اور وضاحت کے ساتھ پیش

کر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حالی کی ذہنی الجھنیں اور ارتقا مولوی صاحب کے دماغ میں کسی مقناطیسیت کی مدد سے آگئی ہیں جنہیں مولوی صاحب محققانہ انداز میں نہایت موثر طریقے سے پیش کر رہے ہیں۔ دیوانِ اثر کے خالق سید محمد میر اثر کے کلام پر مولوی صاحب کا مقدمہ اپنی مثال آپ ہے۔ اثر کے دیوان پر مقدمہ دراصل ان کی شہرت ناموری کا سبب بنا ورنہ اثر کو بحیثیت شاعر لوگ جانتے بھی نہ تھے۔ مولوی صاحب کے جذبۂ علم کی واضح شان ہی اثر کے دیوان پر مقدمہ ہے۔ جو مقدمہ سے زیادہ تحقیق اور تحقیق سے زیادہ تعارف کہلانے کی مستحق ہے۔ لیکن تنقید کا اعلیٰ معیار ان مقدمات میں نہیں ملتا۔ دراصل مشرقی تنقید میں اچھائیوں کی نمائش اور برائیوں کی پردہ پوشی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور مولوی صاحب حالی سے ذہنی طور پر مطابقت رکھنے کی وجہ سے اس انداز میں تنقید کرتے ہیں جبکہ جدید اردو تنقید جو مغرب کی تابع ہے اس انداز کی تنقید کو تنقید نہیں سمجھتی لیکن جدید انداز کی تنقید اس وقت ہاتھ باندھ کر کھڑی رہ جاتی ہے جب مولانا عطیہ بیگم کے خطوط پر مقدمہ تحریر کرتے ہیں۔ یہ مقدمہ ایک طرف رازہائے پنہاں پر سے پردہ اٹھاتا ہوا ملتا ہے تو دوسری طرف تنقید کے جدید تقاضوں کو نمایاں طور پر پیش کر رہا ہے۔

"خطوط کا جائزہ" خطوط نگار کی ذہنی الجھن انسانی فطرت کے تقاضے اور پھر اسے سمجھانے کی عالمانہ کوشش کے تمام پردوں پر سے مولانا نہایت صفائی کے ساتھ پردے اٹھا دیتے ہیں۔ اور خطوط نگار خاص طور پر شبلی کے جذبات و احساسات اور سوچ کے وسیع ہوتے ہوئے دائرے خود بخود سمٹ کر مولوی صاحب کے قلم سے اس طرح پھیلنے لگتے ہیں کہ پڑھنے والا دم بخود رہ جاتا ہے۔ اور نقاد جو مولانا کی تنقید کو مشرقی روایات کا پابند کہہ رہے تھے اس لئے خاموش ہو جاتے ہیں کہ مغربی تنقید کے مناسب اصول یہاں کارفرما ہیں۔

مقدمہ نگاری میں مولانا کے فن کی انتہا باغ و بہار کا مقدمہ ہے جو تحقیق و تنقید کی اپنی مثال آپ ہے۔ باغ و بہار کی شہرت 'میر امن کی طرزِ تحریر' باغ و بہار کی دلچسپ داستان دہلی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مولوی صاحب کے مقدمہ کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ مولوی صاحب نے باغ و بہار پر تحقیق و تنقید کے دوران اپنی تمام تر صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ باغ و بہار کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔

مولانا کے فن مقدمہ نگاری کی اہمیت مندرجہ بالا مقدمات کا سرسری جائزہ لینے سے ابھر آتی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جتنے بھی مقدمات لکھے سب کے سب کسی نہ کسی لحاظ سے علمی اور ادبی رجحانات کو پروان چڑھاتے ہوئے ملتے ہیں۔ خطوط عطیہ بیگم کا مقدمہ شبلی کے رازہائے دروں سے پردہ اٹھا رہا ہے۔ میر پر لکھا ہوا مقدمہ اردو کے شاعر مصورِ غم کے کلام پر تحقیقی و تنقیدی مواد فراہم کر رہا ہے۔ اثر کے دیوان پر لکھا ہوا مقدمہ ایک گمنام شاعر کے کلام اور ذات کو متعارف کروا رہا ہے۔ اور باغ و بہار پر لکھا ہوا مقدمہ کلاسیکی ادب کے مختلف پہلوؤں کو نہایت ایمانداری و دیانت داری سے اجاگر کر رہا ہے۔ مولوی صاحب نے ان مقدمات کے ذریعے ادب کی کیا خدمت انجام دی اس کے متعلق حبیب الرحمان خان شیروانی کے چند الفاظ ہمارے مقصد کو اجاگر کر سکتے ہیں۔ "مولوی صاحب کی ادبی خدمات کا میں مدت سے معترف ہوں خصوصاً مقدمہ نگاری میں سب سے پہلے موصوف کے مقدمات میرے لئے چراغ

ہدایت ہوتے تھے"۔ مولوی صاحب کے تحریر کردہ مقدمات کی تعداد تقریباً پچاس ہے۔ پہلا مقدمہ ۱۹۰۵ء میں ایک کتاب جس کا نام "جنگ روس و جاپان" تھا پر لکھا گیا۔ آخری مقدمہ ۱۹۵۹ء میں کتاب "جدید اردو لغات" پر ہے۔

شخصیت نگاری

رشید احمد صدیقی کی "گنج ہائے گرانمایہ" خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری کا کمال قرار دی جاتی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ روشن ہے کہ اردو ادب میں رشید احمد صدیقی کے خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری نے نئے اسلوب اور خیال کو پروان چڑھانے میں بے انتہا اہم کام انجام دیا۔ لیکن اس بات سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مولوی عبدالحق کے چند ہم عصر کا بھی اس میدان میں اہم کام ہے۔ ان کی شخصیت نگاری سنجیدگی، متانت، صاف گوئی، جرأت و بے باکی کا مظہر ہونے کے علاوہ ان کی باریک بینی کی شاہد ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ چند ہم عصر کا اپنا مقام ہے اور یہ مقام مولوی عبدالحق کا مرہونِ منت ہے۔ جنہوں نے اپنی ریاضت، متانت، دیانت کے تمام تر مظاہرے کے بعد شخصیت نگاری کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

دراصل شخصیت نگاری ایک بہت مشکل اور دقت طلب کام ہے۔ اس کے چند تقاضے ہیں جن کی تکمیل کے بغیر یہ کام مکمل نہیں ہو سکتا۔ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ نہایت باریک بینی سے شخصیت کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ دوسری طرف اس شخصیت سے متعلق اپنے جذبات اور احساسات کو قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ ایسا کرنے کا سبب اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ جس کی شخصیت پیش کی جا رہی ہے۔ شخصیت نگار سے اس کا کوئی نہ کوئی واسطہ ضرور رہتا ہے۔ اس تعلق میں اچھی اور بری دونوں باتیں ہو سکتی ہیں۔ جبکہ دیانت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی اچھائیاں برائیوں دونوں کے ساتھ مکمل انصاف کیا جائے۔ دوسری طرف انسان اپنی شخصیت کے برے پہلوؤں کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسروں کے سامنے ایسے پہلوؤں کے ساتھ آتا ہے جو انسان دوست ہونے کا ثبوت فراہم کر سکے۔ ایسا کر کے وہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ یہ چیزیں مل کر شخصیت کو دبیز پردے میں اس طرح چھپا دیتی ہیں کہ پردے کے باہر نگاہیں دیکھنے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔ ایسے میں شخصیت کے پہلوؤں کی وضاحت نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن بن جاتی ہے۔ جہاں تک مولوی عبدالحق کا تعلق ہے ان کی چند ہم عصر شخصیت نگاری کا کمال نہیں بلکہ مولانا کے خلوص، دیانت داری گہری نظر سے شخصیت کا جائزہ اور صحیح رائے تک پہنچنے کا کمال قرار دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے شخصیت نگاری کے دوران کسی سے کوئی رعایت نہیں برتی۔ حالانکہ مزاجاً دوسروں کی غلطیوں پر انہیں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے لیکن شخصیت نگاری کے دوران صحیح بات کہنے کے لئے ہمہ وقت پوری طرح تیار اور کمربستہ نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت نگاری اس شخصیت کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتی ہے۔ اور پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تخیل کے پردے پر زیر بحث شخصیت اپنی تمام تر اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ جلوہ فرما ہے۔

مولوی عبدالحق کی شخصیت نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے فرمایا: "شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری کا انھوں نے ایک نیا انداز پیدا کیا ہے۔" حقیقت ہے اس کا اعتراف عام طور پر نقادوں نے برملا کیا۔ دلیل کے طور پر چند ہم عصر کو پیش کیا جاسکتا ہے جس میں ۲۴ شخصیات کو پیش کیا گیا۔

۲۴ مولانا کی تحریر کردہ ہیں۔ ان شخصیات پر انھوں نے زور آزمائی کی ہے۔ جو اپنی جگہ مقابلتاً کامیاب نظر آتی ہے۔ ان تمام شخصیات کو مولانا نے قریب سے دیکھا اور پرکھا پھر قلم اٹھایا تو انھیں الفاظ کی مدد سے کاغذ پر زندۂ جاوید کردیا۔ ان کی پیش کردہ شخصیات میں سرسید۔ حالی۔ محسن الملک۔ سید محمود۔ مولانا وحیدالدین سلیم۔ مولوی چراغ علی خواجہ غلام الثقلین اور مولانا محمد علی کے ساتھ ساتھ گدڑی کا لال نورخاں یا "نام دیو مالی" جیسے مذہب اور معاشرہ کے مختلف درجات کی تقسیم کی وجہ سے کمتر درجے کے لوگ بھی شامل ملتے ہیں۔ انھوں نے شخصیت نگاری کے دوران انصاف و دیانت کے تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز نہیں رکھی۔ بلکہ فن کی تکمیل کو پیش نظر رکھا۔ سرسید احمد خاں کی شخصیت نگاری کرتے ہوئے فرماتے ہیں "ان کی اخلاقی جرأت، آزادئ خیال۔ انصاف پسندی۔ بے تعصبی فیاضی اور ہمدردی کے ہندو مسلم سب قائل تھے۔" اسی طرح سید محمود کے متعلق اپنا تجزیہ نہایت دیانت داری سے پیش کرتے ہیں۔

"اس عزیز کی زندگی ہمارے لئے ایک بیش بہا سبق اور حیرت ناک عبرت ہے۔" مولوی چراغ علی کے متعلق فرماتے ہیں "ان کی زندگی ایک سبق ہے ان لوگوں کے لئے جو دنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے کارنامے ان ملک کے لئے دلیلِ راہ کا کام دیں گے۔"

حالی کے متعلق فرماتے ہیں "مرحوم ہماری تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی۔ اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔"

عظیم شخصیات کے ساتھ ساتھ نورخاں جیسے ایک نوکر کے لئے فرماتے ہیں "غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔" یا دیو مالی کی شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں تو فرماتے ہیں "سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں"

شخصیت نگاری کے یہ نمونے ہمیں واضح طور پر احساس دلاتے ہیں کہ شخصیت نگار دیانت داری، خلوص اور لگی لپٹی رکھے بغیر شخصیت کے سانچے میں پکے اور اصل رنگ بھر کر انھیں تا ابد محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کررہا ہے۔ ڈاکٹر شاہ عسلی نے ایک مضمون میں مولوی صاحب کی شخصیت نگاری پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

"مولوی صاحب کی قوت مشاہدہ اور باریک بیں نظریں ایکسرے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا کھرا اور استوار کردار کسی کی خوبیوں کو دبانے یا خامیوں کو اجاگر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔۔۔ مولوی صاحب کے جن سے جتنے زیادہ گہرے مراسم تھے ان کی اتنی ہی زیادہ پتے کی باتیں بتائی ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ سے درک اور بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔"

مکتوب نگاری

اردو نثر کے ارتقا میں داستان، افسانہ ناول، مقالات، اور مضامین کے ساتھ ساتھ مکتوب نگاری کا بھی اہم کردار ہے۔ دراصل مکتوب کی اہمیت تنقیدی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ ہے۔ عام طور پر تخلیق کار اپنی تخلیقات میں اپنی اصل شخصیت کو پردوں میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس کا سارا زور اس بات پر مرکوز رہتا ہے کہ اصل شخصیت کے گھناونے اور قابلِ اعتراض پہلو عام لوگوں سے پوشیدہ رہے تو میرے حق میں بہتر رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کے خیالات کا مطالعہ تو اس کی تخلیقات کے ذریعے نہیں ہو پاتا۔ البتہ مکتوب نگاری ایک ایسی چیز ہے جو ان کے اصل کردار کو پرکھنے والوں کے سامنے بے نقاب کر دیتی ہے اور یہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے مطالعہ کے بعد تخلیق نگار کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کی شخصیت کے پیچیدہ پہلو بھی روزِ روشن کی طرح نمایاں ہو جاتے ہیں۔

اُردو میں مکتوب نگاری کی اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب مرزا اسد اللہ خاں غالب کے خطوط شائع ہوئے۔ ابتدا میں ان خطوط کو جدید زبان شوخ اور نرم گرم گفتگو اور اندازِ بیان کی وجہ سے پسند کیا گیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ان خطوط کی اہمیت تاریخی اخلاقی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے بڑھتی چلی گئی۔

غالب کے خطوط نے جہاں اردو نثر کو ایک انقلابی انداز دیا وہیں اپنے زمانے کی تاریخ اور حالات کو بھی سمجھانے میں اہم کردار انجام دیا۔ غالب کے خطوط کی بڑھتی ہوئی قدر و منزلت نے لوگوں کو راہ دکھلائی اور اس طرح سرسید۔ حالی، شبلی۔ اقبال اور ابوالکلام آزاد کے مکاتیب کو بھی شائع کیا گیا۔ ان مجموعوں نے اپنے خالق کی سوچ کو اجاگر کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اردو ادب خصوصاً نثر کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار انجام دیا۔ ان مجموعوں میں ابوالکلام آزاد کا مجموعہ خطوط "غبارِ خاطر" بہترین طرزِ ادا کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے سیاسی حالات کا خوبصورت تجزیہ بھی کرتا ہوا ملتا ہے۔ زبان کی فصاحت و بلاغت سے بالاتر ہو کر دیکھا جائے تو غالب اور آزاد کے درمیان اردو نثر کے ارتقاء کی خطوط کے مجموعوں کے درمیان نئی منازل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جہاں تک مولانا عبدالحق کے خطوط کا تعلق ہے۔ وہ اپنی جگہ غالب سے لے کر آزاد تک کے خطوط سے منفرد انداز اور مقاصد کو واضح کرتے ہوئے ملتے ہیں ان کی زبان دلچسپ، اندازِ بیان موقع محل کے عین مطابق روانی اور واقعات نگاری کی نادر مثال دل کو لگنے ہوئے زخموں کی وجہ سے آہوں کے ابلتے ہوئے سیلاب کے ساتھ ساتھ کامیابیوں کے وقت بے بہا مسرت کا اظہار۔ ذہنی الجھن پریشانیاں۔ مقاصد کے حصول کی جد و جہد۔ کئی کہانیاں سیاسی واقعات۔ سیاسی لیڈروں کے کردار۔ قول و فعل

ملتا ہم آہنگی یا تضاد غرض کہ وہ کون سا موضوع ہے جس پر مولانا نے اپنے عزیز و اقارب، کرم فرماؤں، بزرگوں اور مشیروں کو خطوط کے ذریعہ مخاطب نہ کیا ہو۔ انجمن کے مسائل ہوں یا اُردو زبان کی ترقی کی کوشش مولانا کے خطوط ایک ایک بات کو نہایت صفائی سے واضح کرتے ہیں۔ ان کے خطوط تاریخ سازی کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیتے ہوئے ملتے ہیں۔ کامیابیوں کے اسباب پر بحث، ناکامی کی وجوہات غرض وہ کون سا موضوع ہے جس پر انھوں نے کھل کر بحث نہیں کی۔ ان کے مکاتیب کے ایک حصے کو مکتوبات عبدالحق کے نام سے جلیل قدوائی صاحب نے یکجا کیا ہے۔ جبکہ دوسرے مجموعہ کے "خطوط عبدالحق کے نام" سے اکبرالدین صدیقی نے کتابی صورت میں پیش کئے۔

ان خطوط کے مطالعہ سے جہاں مندرجہ بالا خصوصیات کا پتہ چلتا ہے وہیں مولوی صاحب کے طبیعت کے مختلف پہلوؤں کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ ایک خط میں حکیم امامی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے انکساری کا مظاہرہ اس طرح کرتے ہیں" آپ نے جن الفاظ میں میرا ذکر فرمایا ہے اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن جن محسنین اردو کے ساتھ آپ نے میرا نام لیا ہے میں ان کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں ہوں۔ میرا کیا منہ ہے کہ ان کی برابری کا دعویٰ کروں۔ میں اردو کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور بس!

سنجیدگی متانت اردو دوستی اور طبیعت کی خودداری کی مثال میں کئی خطوط پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایک خط جو پیر حسام الدین راشدی کو لکھا اس کا مندرجہ ذیل حصہ قابلِ غور ہے "سب سے بڑی عنایت اور احسان یہ کہ اردو کا کام جو سندھ میں شروع ہو چکا ہے وہ تکمیل کو پہنچ جائے۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں میرا کوئی مقصد نہیں یہی میرا دین و ایمان ہے۔ سندھ اردو مرکز کے مصارف کے لئے تھوڑا بہت سرمایہ ضرور ملنا چاہئے۔ اس وقت جس مشکل سے میں کام چلا رہا ہوں وہ میں ہی جانتا ہوں یہ کام آپ کے حوالے ہے لگا دیجئے یا بنا دیجئے۔ خدانخواستہ اگر بگڑا تو پھر مجھے آپ زندہ نہ پائیں گے۔" اس کے مقابل شوخی ظرافت کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ جب کہ عام طور پر مولانا کے متعلق یہ مشہور تھا کہ ظرافت یا شوخی انھیں چھو کر بھی نہیں گئی۔ اس راز پر سے پردہ بھی ان کے ایسے خطوط کی مدد سے اٹھ جاتا ہے جن میں اپنی طبیعت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ظرافت کو بھی پیش کر جاتے ہیں۔ محمود احمد مدنی صاحب کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں" آپ نے پچھلی سردیوں میں مجھے ایک ٹوپی بنوا دی تھی آپ کو معلوم ہے کہ پڑوسن کی چیل ایک روز جھپٹا مار کر میرے سر سے لے گئی۔ اب سردی کی شروعات ہیں ابھی سے چھینکیں آنے لگیں۔ ہر چھینک پر بجائے الحمدللہ کے آپ کا نام زبان پر آجاتا ہے۔ مہربانی فرما کر ویسی ہی ایک ٹوپی پھر بنوا دیجئے۔ آپ کا یہ احسان میرے سر پر رہے گا۔" یہ متنوع انداز بیان خطوط غالب کی یاد تازہ کرتا رہے گا۔ وہیں ان کا یہ سنجیدہ خط بھی غالب کے انداز میں جذبات۔ احساسات اور طبیعت کے استغفار کی مکمل عکاسی کر رہا ہے۔ "اب تو بھیک کی کچھ عادت سی پڑ گئی ہے۔ یوں تو بہت سی ذلتیں سہیں پر یہ باقی رہ گئی تھی۔ الحمدللہ عمر کے آخر میں یہ سعادت بھی نصیب ہو گئی۔ رفتہ رفتہ گوارہ ہو جائے گی اور پھر مزا آنے لگے گا"

مولوی صاحب کے خطوط کے مندرجہ بالا اقتباسات چند مثالیں تھیں ورنہ ان کے خطوط طبیعت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کا بغور مطالعہ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نا قابل

یقین حقیقت کا اظہار بھی کر رہے ہیں کہ مولانا اپنے عالمانہ، محققانہ مقدمات و مضامین و مقالات میں اپنی شخصیت کے جس رنگ کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہی رنگ کچھ گہرے ہوتے ہوئے ان کے خطوط میں بھی مل جاتے ہیں اور مولوی صاحب کی شخصیت کے ہر پہلو کو نمایاں طور پر واضح کر دیتے ہیں۔

مولوی عبدالحق کی تحقیقی کاوشوں کا تعین کرتے وقت محققینِ زمانہ ہمیشہ پریشان رہیں گے۔ وہ ایک مرتبہ خوب چھیلہ کریں گے یقیناً آگے چل کر خود ہی اس کی تردید بھی کر دیا کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں اسے ہلکا پھلکا کام قرار دے کر جذبہ جستجو و جدوجہد میں مصروف ہو جائیں گے۔ اس کا ایک سبب نو تحقیق کا ہر وقت جاری رہنا ہے۔ یعنی تحقیق میں کوئی بھی بات حتمی طور پر نہیں لکھی جا سکتی۔ آج اگر ایک بات پر اتفاق ہو گیا ہے تو یقیناً دوسرے سال یا کچھ سالوں بعد اسی اتفاق میں رخنے پڑنے لگیں گے۔ اور آخر کوئی نئی تحقیق پہلی تحقیق کو باطل قرار دے دے گی۔ دوسری وجہ مولوی صاحب کے کارنامے کا ایک سلسلہ دراز ہے جو بظاہر ختم ہوتا ہوا ملتا ہے لیکن پھر نئے انداز، اسلوب میں نمودار ہوتا ہے۔ اور اس طرح ان کی خدمات کو ایک نیا رخ دیتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ ان کے مقدمات مقالات مضامین اور خطابات اپنی علمی، معلوماتی اور تنقیدی بصیرت کے تقاضوں کو سربلندی عطا کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ وہی تحقیقی نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ ان کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ میر امّن کی باغ و بہار کو سدا بہار ادب کا اعلیٰ و افضل مقام ملا۔ سب رس کو اردو ادب میں اعلیٰ بلند تر مقام ملا۔ قطب مشتری جیسی مثنوی قعر گمنامی سے نکل کر شہرت کی بلندیوں پر پرواز کرنے لگی۔ یہ ان کی محققانہ فطرت کے جوہر ہیں کہ تذکرہ گلشن ہند اور نکات شعراء کی ادبی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا۔

مولوی صاحب مقدمہ لکھ کر اس سے متعلق تحقیقی باتیں منظر عام پر نہ لاتے تو یہ تخلیقات بھی اور سینکڑوں تخلیقات کی طرح گوشۂ گمنامی میں جا سوئی ہوتی۔ اردو زبان کے متعلق انھوں نے اپنے خطبات اور خطوط، مقالات اور مضامین میں جو تحقیقی کام انجام دیئے اسی کی وجہ سے زبان کا ارتقا اور تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کی بناوٹ اور راہ کا تعین کرنے میں سہولت حاصل ہوگئی اس طرح اردو ادب پر تحقیق کے ذریعے انھوں نے اکابرین مشاہرین کی کاوشوں کو یکجا کر کے ہمیں یہ بتلایا کہ اردو زبان و ادب کی ترقی و تعمیر میں ان کے کارنامے کیا تھے؟ اسی طرح تعلیم اور زبان کے موضوعات پر بحث کرتے ہوئے فن تحقیق کے سہارے ان راہوں کو روشن کیا جو اس سے پہلے گمنامی کے اندھیرے میں چھپی ہوئی تھی۔ اس طرح دہلی کالج پر تحقیقی کام نے اردو زبان کی اہمیت اور افادیت انتہا پر بڑھا رہا ہے۔

مولوی صاحب کی تحقیق کا کمال یہ ہے کہ آج تک ان کی تحقیق کو غلط یا بھٹکی ہوئی ثابت نہیں کیا جا سکا۔ جو بات کہی خوب غور و فکر کے بعد کہی اور جب کہی تو دلائل و شواہد کے دریا بہا دئے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر شہادتیں لائے اور پھر ان کو اس طرح ترتیب وار پیش کیا کہ پڑھنے والا نہ صرف متاثر ہوا بلکہ دائمی طور پر اپنے حافظے میں محفوظ رکھنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ دلچسپ اور قابلِ غور یہ بات ہے کہ عام طور پر محقق تحقیق کے زعم میں زبان کی چاشنی دلچسپی اور توازن قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے

یا یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ تحقیق کی روانی میں زبان کی لطافت
ونزاکت روز استعمال کر فراموش کر دیتے ہیں۔ جبکہ مولوی
صاحب پر یہ الزام لگانا دشوار ہے۔ ان کی زبان میں تحقیق
کے دوران تبدیلی تو آتی ہے لیکن یہ تبدیلی محققانہ کارناموں
کو مربوط و معنوط بنانے اور بات کو وضاحت سے بیان کرنے
کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ اس کے برخلاف توازن کا قائم رہنا
اور دلچسپی کے عنصر کو ابھارنا ان کا وہ کارنامہ ہے جو ان کی
تحقیق کو منفرد اور جداگانہ مقام دلاتی ہے۔ مولانا کی تحقیق
کے متعلق ڈاکٹر اختر سعید طوسی فرماتے ہیں " مولانا نے جہاں
مقدمات کی مدد سے تحقیقی کارنامے انجام دیئے وہیں دکن
میں قیام کے دوران اپنے ادبی رسائل میں تحقیقی مضامین کی
مدد سے بھی گمنام ادیبوں اور شاعروں کو حیاتِ جاوداں عطا
کی۔ انھوں نے اپنے رسالوں کی مدد سے شاہ میراں جی شمس العشاق
شاہ برہان الدین جانم، حضرت امین الدین اعلیٰ سب رس
منظوم یعنی وصال العاشقین از قدولی اور گلشنِ حسن و دل
از بحری، حسن شوقی کی نارائن شفیق، مراثی، غواصی، شمع
پروانہ، غزلیات اشرف، غزلیات ایجاد۔ شیخ ملا وجہی
ولی کے سن وفات کی تحقیق۔ حیدرآباد کا ایک شاعر خاندان
مشرقی۔ قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں، یہ تمام مضامین ہیں
اپنی محققانہ اہمیت کی وجہ سے اردو ادب میں ایک
نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان مضامین میں
شاعر کے حالاتِ زندگی، شاعری اور اشعار کے نمونے پیش کر کے
کئی گمنام شاعروں کو بھی گمنامی سے نکال لیا۔

مولوی عبدالحق اردو ادب کے مختلف شعبوں میں
اپنے کارناموں کی وجہ سے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں
اہم کردار کے مالک رہیں گے۔ جدید اردو زبان کے ارتقا
میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھوں نے تحقیق
نگاری، محقق، مقالہ نگار، مکتوب نگار کی حیثیت سے اپنے
مقام کو تسلیم کروالیا ہے۔ جبکہ بحیثیت نقاد انکی حیثیت کو سب
ہی تسلیم کرتے ہیں۔

اردو ادب میں تنقیدی نقطۂ نظر عرصہ دراز سے
نہایت خاموشی و اطمینان کے ساتھ مشرقی طرزِ اسلوب کی مدد
سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد
انگریزی ادب کے اثرات نے اردو علم و ادب کو متاثر کیا وہیں
مغربی تنقید کے جدید اصول سے ہماری تنقید بھی متاثر ہوئی۔ یہ
کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ ہم نے ان اصولوں کو من وعن اردو
تنقید کا ایک حصہ بنالیا۔ اور اس کی مدد سے اپنی زبان و
ادب کو ترقی کے لئے نئے رجحانات سے آشنا کیا جس نے
سرسید کے عہد میں اردو ادب کو . . . .

. . . متاثر کیا اور پھر بہت جلد مولانا حالی، شبلی اور
محمد حسین آزاد کے توسل سے اردو ادب میں اپنی جگہ مستحکم بنالی۔
شبلی نے جمالیاتی تنقید کی مدد سے نئی نئی راہوں کی نشاندہی
کی تو آزاد نے جمال کو تاثر کی حدود سے جا ملایا۔ دوسری طرف
سرسید اور حالی نے سائنٹیفک اندازِ تنقید کو اپنایا اور اس
کی مدد سے تنقید کے وہ کارنامے انجام دیئے جو اردو ادب
کے جدید رجحانات سے متعلق ہیں۔ مولوی عبدالحق تنقیدی نقطۂ
نظر میں شبلی اور آزاد سے اختلاف رائے رکھتے تھے۔ لیکن حالی
کے اندازِ تنقید کو پسند کرتے تھے۔ اس کا پتہ ان کی انتقادیات
کے مطالعہ سے چلتا ہے۔ جب وہ سائنٹیفک تنقید کی مدد
سے نثر پارے کی اچھائیوں اور برائیوں کو تاریخ مصنف

ماحول، خاندان اور تہذیب و تمدن کی روشنی سے اجاگر کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ . . . . ایسے ہی ان کے تنقیدی رجحانات، مقالات، مضامین، مقدمات اور شخصیت نگاری کے میدان میں بڑے دلنشیں انداز میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اچھائیوں کو ڈھونڈھنے نکلتے ہیں تو دلائل کے دریا بہا دیتے ہیں۔ اور برائیوں کو اجاگر کرتے ہیں تو داستان کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ . . . . دراصل یہی انداز حالی اور شیفتہ کا تھا۔ حالی یادگار غالب میں غالب کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہیں اور جب خامیوں کے تذکرہ کرنے کا موقع ملا تو چند مخصوص جملوں میں جھجکتے ہوئے اپنے خیالات پیش کر گئے۔ مولوی صاحب کا بھی یہی حال ہے۔ نقدِ عبدالحق میں جسے سید معین الرحمٰن صاحب نے مرتب کیا ہے شامل ایک مضمون "اردو تنقید اور مولوی عبدالحق" میں۔ متین الرحمٰن مرتضیٰ نے مولانا کی تنقید کے بارے میں فرمایا کہ "مولانا عبدالحق کی تنقید محققانہ، وقیع اور جامع ہوتی ہے۔ ان کے مزاج میں تحمل، اعتدال، متانت اور شفقت ہے اور یہی ان کی تنقید کی شان ہے۔ یہ متانت تحمل، شفقت اور حقیقت پسندی انھوں نے حالی کی معرفت شیفتہ سے پائی ہے۔ چنانچہ ان کے متعلق عام طور پر ناقدین کی رائے یہی ہے کہ وہ شیفتہ اور حالی سے متاثر ہیں۔"

مولانا کی تنقید شیفتہ اور حالی سے متاثر ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ انکی تنقید کی کامیابی کا سبب تحقیق کے فن پر کامل گرفت ہے۔ تحقیق میں شبلی کی حیثیت مسلم ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ مولوی عبدالحق کی تنقید حالی اور شیفتہ سے متاثر ہے۔ تو تحقیق میں شبلی کا سا انداز نمایاں ہے تنقید تو تحقیق کے پروان نہیں چڑھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تنقید تحقیق سے آراستہ ہونے کے بعد شبلی اور حالی کے انداز تنقید کو آگے بڑھاتی ہوئی ملتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنی کتاب "اردو تنقید پر ایک نظر" میں فرماتے ہیں "مولوی عبدالحق" اردو ادب کے ایک بہت بڑے نقاد ہیں۔ انھوں نے نظریاتی اور عملی تنقید کے شاندار نمونے پیش کئے ہیں۔ بابائے اردو کی تنقید ان کے وسیع مطالعے ان کے تاریخی، تہذیبی شعور، ان کے انسانی نقطۂ نظر، ان کے رچے ہوئے جمالیاتی احساس اور نکھرے ہوئے ادبی ذوق کا عطر ہے۔"

عبادت صاحب کی رائے اپنی جگہ مناسب سہی لیکن یہ حقیقت بھی روشن ہے کہ مولانا نے مشرقی و مغربی انداز تنقید سے استفادہ کیا ہے۔ مشہور نقاد کلیم الدین احمد نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان کی تنقید مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے اور وہ مشرقی ادب کو محدود، مقامی، مشرقی معیار سے جانچتے اور کھرے کھوٹے میں امتیاز کرتے ہیں"

کلیم الدین کی رائے کی تائید مولوی عبدالحق خود "اردو تنقید کا ارتقا" کے مقدمے میں اس طرح کرتے ہیں "مشرقی کلام کی تنقید میں کیوں نہ مشرقی اصطلاحات اور معانی و بیان کے الفاظ سے کام لیں۔ یہ ہمارے ادب میں شروع سے مستعمل ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے موقع و محل کے مطابق تنقیدی زاویوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ انھوں نے مغربی تنقید کے ساتھ ساتھ مشرقی یا مشرقی کے ساتھ ساتھ مغربی تنقید کا استعمال کیا۔ دراصل ان کا سارا زور اپنے مقصد پر ہے۔ جہاں تک ان کی تنقیدات کے جائزہ کا تعلق ہے تو چند مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ن۔م۔ راشد کے مجموعے نظم ماوراء پر تنقید کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں "نئے اسلوب اور اظہار کے نئے ڈھنگ کوئی جرم نہیں۔ لیکن نئے ڈھنگ کیوں نامعقول ہوتے ہیں؟ اس لئے نہیں کہ وہ نئے ہیں بلکہ

اسلئے کہ ان کے برتنے والے میں خامی ہے۔ اگر شاعر کے خیالات میں جدت، تازگی اور گہرائی ہے۔ اور ان کا اظہار، حسن اور سلیقے سے کر سکتا ہے تو نئے اسلوب ایک دن ضرور مقبول ہونگے ادب میں نیا اور پرانا کوئی چیز نہیں"

مندرجہ بالا خیالات کے مطالعے کے بعد ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ مولانا جدت پسندی کے قائل ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جدت پسندی اور قدامت پسندی کے درمیان ایک حدِ فاصل کھینچنے کا اعزاز بھی مولانا کو حاصل ہے۔ وہ "اردو ادب اور ماضی" کے عنوان کے تحت ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"یہ خیال کہ ہر چیز جس کا تعلق گذشتہ زمانے سے ہے۔ اسرار رجعت سے آلودہ ہے۔ صحیح نہیں۔ محض اس بنا پر کہ ہم لوگ آگے بڑھ گئے ہیں گذشتہ سے اپنا تعلق قطع نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا کرنا اپنی جڑیں کاٹنا ہے۔ ہم گذشتہ کے وارث ہیں" ان باتوں سے قطع نظر ان کی تنقید کے زاویے اپنی جگہ مکمل ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون میں شعر ہند پر تبصرہ کرتے ہوئے سائنٹیفک انداز تنقید کے سہارے تنقید کے اس نکتے کو اسطرح واضح کرتے ہیں "ہمارا فرض ہے کہ ہم شاعر کی زندگی کے حالات، اس کی عادات اس کے خصائل اور عادات پر غور کی نظر ڈالیں اور اس کے بعد اس کے عہد کے واقعات، حالات، اور تغیرات و انقلاب کا ذکر کم سے کم اس حد تک ضرور کریں۔ جہاں تک کہ ان کا تعلق شاعر اور ان کی شاعری سے ہو۔"

ان باتوں سے واضح طور پر مولانا کی تنقید اور طریقہ تنقید کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں تک عملی تنقید کا تعلق ہے تو ن۔ م۔ راشد کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں "زندگی سب کے لئے معمہ ہے۔ اس کے راز عقل سے نہیں کھلتے اس لئے راشد صاحب جھنجلاتے ہیں اور اخلاق اور معاشرہ گناہ، ثواب، عقل و فکر کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن لاچار ہیں۔ کچھ بس نہیں چلتا"

اسی طرح میر تقی میر کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "میر صاحب کے کلام میں سب خوبیاں موجود ہیں اس کے ساتھ ہی ان کا کلام ایسا ہے کہ اسکے پڑھنے سے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ میر کے متعلق بات میں اختصار برتا گیا ہے جبکہ میر اثر کے کلام کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوتے اس طرح ارشاد فرماتے ہیں "میر اثر کا کلام بہت ہی پاک و صاف اور فصیح ہے اور درد و اثر کی چاشنی ہے"

مندرجہ بالا تنقیدات مولانا کی تنقید کی طرف ایک اشارہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن یہی اشارے مولانا کی تنقید کے زاویے ترتیب دیتے ہیں۔ اس طرح مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ اشارے جہاں مصنف سے تعارف کرا رہے ہیں وہیں اس کی نمایاں خوبیوں پر تلے الفاظ میں حتمی فیصلہ صادر کر رہے ہیں۔ دلائل کی فراوانی، واقعات کی صحت کی طرف اشارہ اور تقابلی انداز میں بات کا بڑھانا یا واضح کرنا مولانا کی تنقید کی مختلف خوبیوں کو اجاگر کر رہا ہے۔ ایسے اشارات کو دیکھ کر ترکی کی محب وطن ادیب اور رہنما خاتون خالدہ ادیب ان کے متعلق لکھتی ہیں

"سن رسیدہ علماء میں جو ادبی تحقیقات اور اردو زبان پر جدید معروضی اصول کے مطابق ناقدانہ تصنیف کرنے میں غیر معمولی جامعیت رکھتے ہیں۔ مولانا عبدالحق ہیں"

مطبوعات خطوط غالب کو یکجا کر کے شائع کرنے سے اردو ادب خصوصاً نثر کو پروان چڑھنے کا ایک نیا انداز اور راستہ مل گیا جس کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے بعد اکابرین ادب کی توجہ نئی اور منفرد کوششوں کی طرف رہی اور جب سر سید احمد خاں نے عوام و خواص کو مخاطب کر کے اپنا مافی الضمیر

اُن تک پہنچایا تو خطبات کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا اور اس طرح خطباتِ احمدیہ کے نام سے ان کی تقاریر   یات کو بطا کر لیا گیا۔ شبلی، حالی اور اقبال نے خطبات کی اہمیت اور افادیت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار انجام دیا۔ اور جب خطبات نے ادب میں اپنے مقام کا تعین کر دا لیا تو مولوی عبدالحق کے خطبات نے اردو خطبات کو دیگر زبانوں کے مقابل لا کھڑا کیا۔ ان کے خطبات کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے فرمایا "مولوی عبدالحق کے خطبات کا لب لباب یہ ہے کہ قومی زبان زندگی اور تہذیب کا ایک لازمی جزو ہے۔ وہ زبان کی تاریخ اور زبان کی قومی و ثقافتی اہمیت پر بار بار زور دیتے ہیں۔ اور ہر مرتبہ اپنا کیس باندازِ تازہ پیش کرتے ہیں۔ ان کا ہر خطبہ کسی اعلیٰ عدالت میں کسی فصیح، خوش بیان وکیل کا تیار کیا ہوا عرضی دعویٰ یا جوابِ دعویٰ معلوم ہوتا ہے۔"

سید عبداللہ صاحب کے ارشادات اپنی جگہ لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک روشن حقیقت ہے کہ مولوی صاحب نے اپنے خطبات میں اردو زبان کے لسانی روابط۔ ارتقاء۔ ہندوستان میں اردو زبان کی تاریخ اور تحریک کے ساتھ ساتھ ایسے معاملات کو بھی پیش کیا جن کی وجہ سے خطباتِ عبدالحق کی اہمیت بے انتہا بڑھ گئی اور وہ علمی اور ادبی حلقوں میں بے انتہا سراہے گئے۔ مندرجہ بالا خصوصیات کے ساتھ خطبات کی افادیت اور اہمیت میں اضافہ کا سبب تعلیمی مسائل اور ان کے حل کی نشاندہی۔ تعلیمی اداروں کی اہمیت اور قومی زبان میں تعلیم کے فوائد۔ سر سید احمد خان کے دور قومی فکر پر منطقانہ بحث اور اس کا تحقیقی جائزہ۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی تاریخ جس میں پاکستان کے حصول کی تحریک، مغل فرمانرواؤں کے دور سے اب تک کے تاریخی واقعات کا تجزیہ اور تبصرہ۔ تہذیب و تمدن کا جائزہ۔ معاشرتی زندگی کے مختلف قابلِ غور پہلوؤں پر بحث کے ساتھ ساتھ ان کے خطبات کی ایک مسلّم حیثیت ناقابلِ فراموش ہے جس کو زیرِ بحث لانے کے لئے مولوی صاحب نے ارادتاً کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ لاشعوری یا غیر ارادی طور پر مولانا کی زندگی کے مختلف پہلو اس طرح زیرِ بحث آئے جن کی وجہ سے مولانا کی سوانح کو ترتیب دینے میں نہ صرف آسانی ہو گئی۔ بلکہ واقعات کو پرکھنے کے لئے کسوٹی بھی فراہم ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں۔ ان کی خدمات، اردو زبان سے متعلق ان کی سوچ، جذبات اور مقاصد پر بھی پوری طرح روشنی پڑ جاتی ہے۔ جو کہیں اور نہیں مل سکتی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مولانا کے خطبات نے اردو میں خطبات نگاری کے فن کو پروان چڑھایا۔ ان کے خطبات دو طرح کے ہیں۔ ایک فی البدیہہ۔ دوسرے مختلف اجلاسوں جلسوں کانفرنسوں اور سیمیناروں میں تحریر کر کے پڑھے ہوئے۔ مولانا صاحب کے تحریر کردہ خطبات نے اردو نثر و ادب میں نئے نئے انداز و اسالیب سے بروقت اردو زبان اور خطبات کی اہمیت کو مزید استحکام حاصل ہوا۔ ورنہ ان سے پہلے خطبات تو ملتے تھے لیکن موضوعات، تنوع اور زبان کے لحاظ سے وہ اہمیت نہیں رکھتے تھے جو خطباتِ عبدالحق کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ مولوی صاحب کے خطبات میں سے چند اقتباسات ان کی اہمیت اور افادیت پر پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں سنہ ۱۹۵۱ء میں کراچی میں اردو کانفرنس کے خطبے کا یہ حصہ قابلِ غور ہے جس میں مفکرانہ انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں "کسی تحریک کو ہمدردوں کی ہمدردی اور مربیوں کی سرپرستی سے تقویت نہیں پہنچتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تقویت کا راز بہت کچھ مخالفت میں ہے۔ مخالفت بیدار کرتی ہے۔ عملی قوت کو ابھارتی ہے۔ انسان کے ان جوہروں کو جلا دیتی ہے جو پہلے مدھم پڑے تھے۔" کس قدر قابلِ غور خیالات ہیں

اس طرح رائٹرز گلڈ کے پہلے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا "صرف انجمنیں بنا دینا، قرار دادیں منظور کر دینا یا حکومت سے امداد حاصل کر لینا کافی نہ ہوگا۔ ہمیں کام کرنا ہوگا۔" ان اقتباسات میں زبان کے متعلق کچھ نہیں ملتا لیکن جب اردو زبان کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہیں تو علم لسانیات پر ان کی معلومات، بیدار مغزی اور دلائل سے پڑھنے اور سننے والا متاثر ہی نہیں ہوتا بلکہ کچھ حاصل بھی کرتا ہے دسمبر ۱۹۴۳ء میں بمقام ڈیرہ، "انڈین اورینٹل کانفرنس" میں خطبہ صدارت میں فرماتے ہیں۔ "ایک زمانہ تک علمائے لسانیات کو مخلوط زبانوں کے وجود سے انکار رہا لیکن بعد کی تحقیقات نے قطعی طور سے ثابت کر دیا ہے کہ ایسی زبانیں موجود ہیں۔ انہی میں ہماری زبان اردو کا بھی شمار ہے خود ریختہ کا لفظ جو پہلے اردو کا معروف نام تھا۔ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔

یہ تو چند اقتباسات ہیں ورنہ مولوی صاحب کے خطبات میں ایک جہان آباد ہے۔ اور ..... علی گڑھ اسکول ہندو مسلم نفاق کی اصل وجہ، ہندؤں کی اردو دشمنی، بڑے بزرگوں کی وراثت، زندگی اور قدرت کا قانون، ادب اور زندگی، زندہ ادب، ادیب، سر سید اور اردو ادب زبان اور زندگی، انجمن حمایت الاسلام اور اردو میں عربی فارسی کے الفاظ، غرضیکہ ایسا کونسا علمی یا ادبی موضوع ہے جو مولوی صاحب کے خطبات میں زیر بحث نہیں آیا انہوں نے بحث کی اور خوب کی۔ اپنی محققانہ فطرت، سادہ انداز بیاں اور آسان الفاظ کا برمحل اور بروقت استعمال کر کے اردو خطبات کو وہ اعلیٰ مقام عطا کیا۔ جو اُن سے پہلے اور آج تک کوئی اور عطا نہ کر سکا۔

تخلیقات

مولوی صاحب کی ساری زندگی عملی جد و جہد میں ..... گذر گئی۔ ان کی مصروفیات اور دوڑ دھوپ کو دیکھنے کے بعد یہ توقع عبث ہی نظر آتی تھی۔ کہ تخلیقات پر بھی کوئی توجہ صرف کر سکیں گے۔ لیکن جب ہم مولوی صاحب کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں کہ اس قدر مصروف شخص اتنا وقت کہاں سے لے آیا کہ نادر الوجود تصانیف کا مصنف بھی کہلایا حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی کے ہر لمحے سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔ اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ تصانیف کی بنیاد مطالعہ ہے سو وہ جتنا وقت ملتا ان امور کے لئے وقف کر دیتے تھے

مولانا نے اردو نثر میں شخصیت نگاری، تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ مکتوب نگاری کے جس رجحان کو اپنی انتھک محنت سے جس طرح پروان چڑھایا وہ اس وقت بے انتہا حیرت انگیز کارنامہ نظر آنے لگتا ہے جب مولانا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ انجمن ترقی اردو کے لئے صرف ہو رہا تھا۔ ایسے میں ان کی تقریباً تخلیقات منفرد اور خصوصی نظر آتی ہیں۔ جن میں انہوں نے اردو زبان و نثر کی ترقی و تعمیر کے انمول تجربے کئے ہیں۔ ان کی تخلیقات جہاں نثر میں جدید رجحانات کی ابتدائی اکائی کہلاتی ہیں وہیں اردو داں اور اردو مخالفین کے لئے باعث تقلید اور باعث حیرت بھی ہیں۔ ان کی تخلیقات

کا مختصر جائزہ ہمارے اس دعوی کو بڑی حد تک صحیح ثابت کر سکتا ہے۔ اسلئے مندرجہ ذیل سطور میں ان کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر :- ۱۲۳ صفحات پر مشتمل۔ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ تاریخی، سیاسی اور سماجی پس منظر میں مرہٹی زبان میں فارسی کے اثرات کا جائزہ ملتا ہے۔

۲۔ مرحوم دلی کالج :- جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے اردو رسالہ میں چھپے۔ جنھیں یکجا کر کے کتاب کی شکل دی گئی۔ پیش نظر ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں چھپا جو ۱۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۸۲۵ء سے ۱۸۷۷ء تک کالج کی تاریخ، تعلیمی نصاب، ذریعہ تعلیم اردو کالج کے اساتذہ کی تخلیقات کا ذکر ہے۔

۳۔ سر سید احمد خاں حالات و افکار :- اردو رسالہ میں چھپنے والے مختلف مضامین کا مجموعہ ۱۹۵۹ء میں انجمن ترقی اردو نے کراچی سے شائع کی۔ صفحات ۱۹۲ ہیں۔ سر سید کی زندگی، ادبی تخلیقات، قومی خدمات اور ان کے اثرات بیان کئے گئے ہیں۔

۴۔ چند ہم عصر :- شخصیت نگاری کا کمال، ۱۹۳۵ء، ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۹ء میں اس کے مختلف ایڈیشن شائع ہوئے۔

۵۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ :- صفحات ۸۴۔ ۱۹۳۳ء، ۱۹۵۳ء ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں اردو زبان کے ابتدائی دور پر تحقیق شامل ہے۔

۶۔ نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور :- ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔ صفحات ۲۲۰ ہیں۔ نصرتی کے فن شاعری پر تحقیقی کتاب ہے جو نصرتی کی عظمت کا سبب بنتی ہے۔ مولوی صاحب نے اس کتاب میں تحقیق کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ نصرتی ولی سے افضل و اعلیٰ ہے۔

مقدمات عبدالحق :- دو جلدوں پر مشتمل ہیں۔ مولوی مرزا محمد بیگ نے ۱۹۳۱ء میں مرتب کئے۔ پہلے حصے میں ۳۱ جبکہ دوسرے حصے میں ۲۱ مقدمات شامل ہیں۔ اس کے بعد بھی مقدمات لکھے جن کی تعداد ۴۴ ہے۔

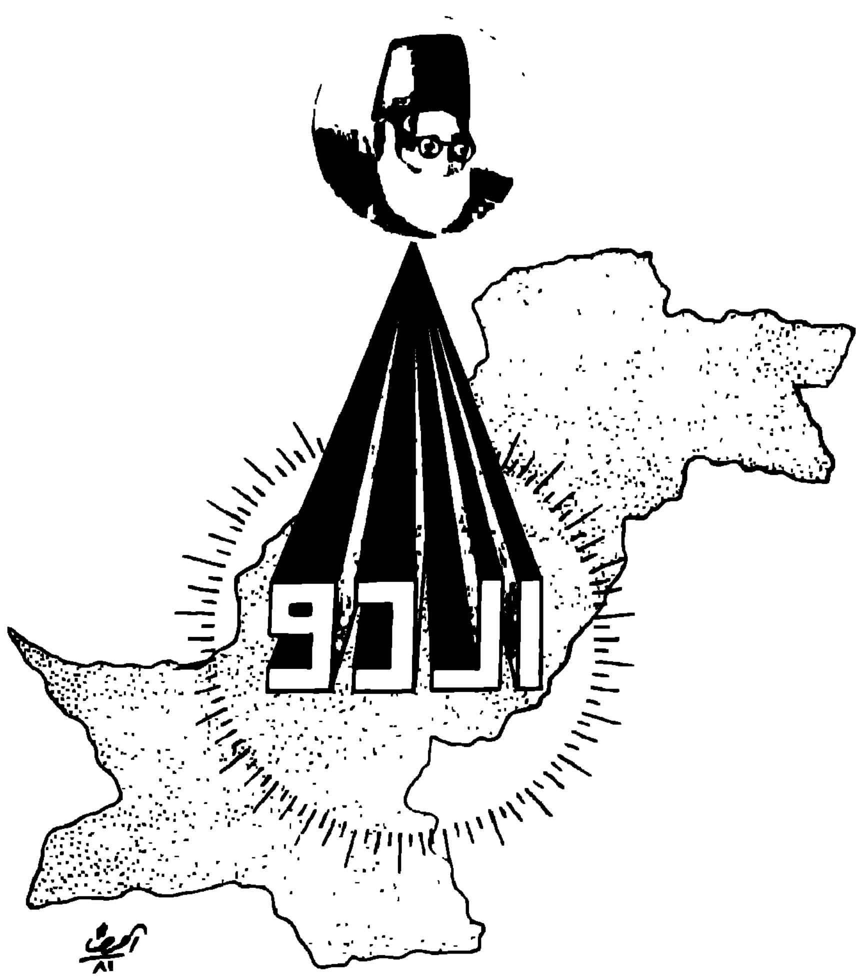
تنقیدات عبدالحق :- تنقیدات کے دو مجموعے ہیں۔ پہلا ۱۹۳۲ء میں تراب علی خاں نے مرتب کیا۔ جو حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ اس میں ۱۷۹ صفحات ہیں۔ جبکہ دوسرا مجموعہ چند تنقیدات عبدالحق کے نام سے شائع ہوا۔

مضامین عبدالحق :- اردو زبان کے قدیم کتبے، اردو میں دخیل الفاظ۔ اردو میں علمی اصطلاحات۔ پرانی اردو میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں۔ جائزہ زبان اردو۔ دکنی اردو میں داستانیں۔ دیوان رنگین (ریختی) سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ۔ سب رس منظوم۔ عورتوں کی زبان۔ غیر زبانوں کی قدیم و جدید اعلیٰ ادبی تصانیف کے ترجمے اردو نثر کی ایک بہت قدیم کتاب۔ قدیم اردو۔ گجراتی زبان گجرات کا ایک قدیم شاعر۔ ولی کے موضوعات کی تحقیق وقت کا اہم تقاضہ اردو یونیورسٹی۔ ---- یونیورسٹی کمیشن اور دیسی زبانوں کی تعلیم۔ نواب عماد الملک کے علاوہ اردو رسالوں میں شائع ہونے والے مستقل عنوان۔ افکار و حوادث اور ماجرہ کہن کے تحت بھی مولانا لکھتے رہے۔ اگر ان سب کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا جائے تو ان کے مضامین کی ایک طویل فہرست مرتب ہو جائے گی۔ ان کے مضامین پر شہود کام جاری ہے۔ انھیں نئے نئے موضوعات اور ادبی و علمی ضروریات کے تحت یکجا کیا جا رہا ہے۔ ان کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ بھی لیا جا رہا ہے۔

پاکستان میں اردو کا المیہ :-

مولانا کی تصنیف جہاں اردو زبان کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کرتی ہے۔ وہیں ان جذبات اور احساسات کی بھی مظہر ہے جو اردو سے متعلق مولانا کے دل میں موجزن

بقیہ ۲۲۸



ڈاکٹر سید عبداللہ

پاکستان میں اُردو کا مستقبل

ہندوستان کی تقسیم کے بعد اردو کا مستقبل کیا ہے!
یہ سوال اب عام زبانوں پر ہے۔ اس کا سادہ اور مختصر جواب یہ ہے کہ اردو کا مستقبل یقیناً شاندار اور خوشگوار ہے۔ بشرطیکہ اردو کے بہی خواہ سچے دل سے اس کی خدمت کا عہد کرلیں۔ اور اس نقصان کی تلافی کی ٹھان لیں جو ملک کے بٹوارے سے بظاہر اس کو پہنچا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو کی مملکت کا رقبہ اب پہلے سے کم ہو گیا ہے اور اُردو کے اصلی مرکزوں میں لوگوں کی زبان پر ہندی والوں کے سیاسی اقتدار نے اپنی مہر لگادی ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اردو کبھی ارباب سیاست کی دست نگر نہیں ہوئی۔ پنجاب سے مسلمان فوجوں کے ذریعے سے دہلی پہنچی۔ وہاں سے کچھ آگے بڑھ کر برج سے آمیزش پاکر دکن میں داخل ہوئی اور پھر اِدھر اُدھر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اس زمانے میں اس کے مقابلے میں فارسی کا سکہ چلتا تھا۔ سکے اور ٹکسال بادشاہی کے لوازم میں سے ہیں بغریب اردو تو عوام کی ملکیت تھی عوام ہی نے اُسے اپنایا۔ صوفی اور ملّا عوام کو مخاطب کرنا چاہتے تھے اس کے سوا اور کس زبان میں کرتے! اسی کا سہارا تلاش کیا، نظمیں لکھیں، کہانیاں تصنیف ہوئیں۔ خال خال نثر کی کتابیں بھی مرتّب ہوئیں مگر یہ سب کچھ شاہانہ سرپرستیوں سے نہیں ہوا۔ زبان نے اپنی صلاحیت سے اپنے لئے خود راستے پیدا کئے۔ اپنے لئے خود جگہ بنائی۔ عوام کی خادم تھی عوام نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ میں مانتا ہوں کہ اس کے عاشقوں اور خدمت گذاروں میں چند ایک سا امراء اور سلاطین کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ مگر واقعہ پھر بھی یہی ہے کہ اردو ان کی سرپرستی اور فیاضی کی چنداں رہین منت نہیں ہوئی۔ اس کے حقیقی خادم عوام النّاس ہی تھے۔ اور عوام النّاس ہی رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی والوں کے سیاسی غلبے کے باوجود میرا اعتقاد یہی ہے کہ اردو نہ صرف پاکستان میں ترقی کرے گی بلکہ ہندوستان میں بھی بڑھے گی۔ عزت اور احترام کے ساتھ بولی جائے گی۔ بڑے لاڈ پیار سے واپس بلائی جائیگی۔ اس لئے کہ اس کی خوبیاں، اس کی صلاحیتیں اس کے روشن پہلو اتنے دلکش اور جاذب نظر ہیں کہ خود بخود آنکھوں میں سما جاتی ہے۔ دل میں بس جاتی ہے اور زبانوں پر آجاتی ہے۔

ہندوستان میں مستقبل قریب میں اردو کی جو حالت اور حیثیت ہوگی اس سے میں اس مضمون میں بحث نہ کروں گا اس وقت میں صرف پاکستان میں اردو کے امکانات پر غور کرنا چاہتا ہوں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تقسیم سے اردو کی مملکت کو رقبے کی وسعت کے لحاظ سے بظاہر نقصان پہنچا۔ مگر دوسرے اعتبارات سے اُردو کو بہت سے فائدے ہوئے ہیں۔ اوّل تو یہ دیکھئے کہ متحدہ ہندوستان میں اُردو کی کیا حالت ہوتی؟ کانگرس اور گاندھی جی کے نظرئے کے مطابق سارے ملک کی زبان ہندوستانی ہونی قرار پائی تھی۔ یہ ہندوستانی زبان کوئی متعیّن اور مشخّص زبان نہ تھی۔ اس کے موجد اور مخترع خود گاندھی جی تھے۔ اور وہ   ایک ایسی زبان بنانا چاہتے تھے۔ جو سارے ملک میں بولی اور سمجھی جائے۔ ہندوستانی وہ زبان نہیں جو سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ زبانیں بنتی ہیں، بنائی نہیں جاتیں۔ زبانوں کے بنانے میں عملی ضرورتوں اور تقاضوں کا ہاتھ غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے۔ گاندھی جی کی ہندوستانی بنائی جا رہی تھی۔ بن نہیں رہی تھی اتنے بڑے ملک میں جس میں پندرہ بیس بڑے بڑے صوبے ہوں اور آٹھ دس الگ الگ زبانیں بولی جاتی ہوں۔ اُن کے لئے ایک زبان کا ہونا درست اور بجا مگر ایک زبان وضع کرنا آسان بات نہیں۔ مدراس، بنگال، ناگپور، احمد آباد کراچی، پشاور، کوئٹہ، دہلی، لاہور، پٹنہ ـــ ان شہروں کے

لسانیاتی رقبوں پر غور کیجئے اور خود ہی بتائیے کہ ان کے درمیان سوا اردو کے کون لسانیاتی رشتۂ وحدت قائم ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے مطالبے کی بنیاد یہ تھی کہ شمالی ہندوستان کے لوگوں کے علاوہ جنوبی اور مشرقی ہندوستان کے لوگوں کے لئے قابلِ فہم زبان کی ضرورت ہے۔ نتیجہ اس کا ایک دو سال کے اندر اندر یہ ہوا کہ ایک مصنوعی زبان بننے لگی جو ممکن ہے کہ جنوبی اور مشرقی ہندوستان کے لئے قابلِ فہم ہو مگر شمالی ہندوستان کے لوگوں کے لئے یقیناً ناقابلِ فہم تھی۔ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو جمہوریت کا تقاضا اور نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ شمالی ہندوستان کی سادہ اور عام فہم زبان جنوب اور مشرق کی خاطر اس قدر بگاڑ دی جاتی کہ آج اسے اردو کے لقب سے ہرگز ہرگز ملقب نہ کیا جا سکتا۔ اس طرح اردو اپنی فطرت، اپنے خمیر، اپنے اصلی رجحانات اپنی روح سے یکسر محروم اور منقطع ہو جاتی۔ ملک کی تقسیم نے اس کو اس خطرے سے یکسر بچا لیا ہے۔ اب اردو اپنے اصلی ماحول میں رہ کر پھل پھول سکتی ہے۔ ترقی کر سکتی ہے پھل پھول سکتی ہے۔

اسی نقطۂ نظر سے ادب کی حالت کا تصور کیجئے متحدہ ہندوستان کی ہندوستانی کا ادب کیسا ہوتا۔؟ ایک ایسا بے ڈھنگا اور بے تکا ادب ہوتا جو فرمائشی اور مصنوعی ہونے کی وجہ سے صداقت اور اصلیت سے محروم ہوتا۔ مشہور اشتراکی ادیب سید سجاد ظہیر صاحب نے نیا ادب کی کسی گزشتہ اشاعت میں اردو ادب کو مسلمانی روایات اور ہندی ادب کو ہندو روایات کا آئینہ دار قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں ان کی یہ رائے کسی حد تک درست ہے۔ رہا ہندوستانی ادب سو یہ ہندی ادب سے کسی حد تک ضرور مختلف ہوتا۔ مگر اس پر بھی اکثریت کی چھاپ کا لگنا یقینی تھا۔ یہ ایک بے رنگ اور بے مقصد طومار ہوتا جس میں اردو والے اپنے تہذیبی مضامین و مطالب کو ہرگز داخل نہ کر سکتے اگر کوئی ادیب ایسی جرأت کر بھی لیتا تو اس کے کارنامے غیر محبوب اور غیر مقبول قرار دیئے جاتے۔ لفکاڈیو ہرن نے ایک موقع پر کہا ہے کہ ادب دراصل قوم کی حیات اجتماعی کا رازدار اور ترجمان ہوتا ہے۔ اگر کوئی ادب کسی خاص نوع کی زندگی کی ترجمانی نہیں کرتا تو وہ ادب کھوکھلا اور بے روح کہلائے گا۔ اِس اصول کے پیشِ نظر اور مسلمانوں کے تہذیبی نظام کے نقطۂ نگاہ سے ہندوستانی ادب کے امکانات کو دیکھئے اور بتائیے کہ اس میں اسلامی تہذیب اور مسلمانی زندگی کی روح کس حد تک داخل کی جا سکتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مشترکہ نظامِ حیات میں رہ کر اردو اپنی روایات اور اصلی ماحول سے بالکل منقطع ہو جاتی اور ہندوستانی ہندوستان کی اکثریت کی ترجمان ہوتی، اسلامی تہذیب اور روایات اس کے پاس تک نہ پھٹکتیں۔ ہمارا ادب ہمارا ادب نہ ہوتا بلکہ ہمارے قلم سے ایک غیر زبان میں کسی اور کی کہانی لکھی جاتی ——! اگر اس خیال کی روشنی میں دیکھا جائے تو ملک کی تقسیم سے اردو کو بہت بڑا فائدہ ہوا ہے کہ اِس احتساب سے محفوظ رہ گئی جو مشترکہ ہندوستان میں اس کے رجحانات پر عائد ہوتا۔ اب اردو قدرتی نشو و ارتقا کی منزلیں طے کر سکتی ہے۔ اس کا ادب اپنی روایات کے تسلسل کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ اس میں وہی باتیں آزادانہ بیان ہو سکیں گی جو اردو اور اردو والوں کے مزاج اور فطرت کے مطابق ہوں گی۔ پُرانی ادبی

علامات قائم کی جائینگی۔ گل و بلبل کی زبان سے گلوں کی کہانیاں بدستور بیان ہوتی رہیں گی۔ شمع و پروانہ اور سرو قمری کی تشبیہوں اور استعاروں میں معاملات عشق ادا ہوتے رہیں گے۔ دیر و حرم، سجدہ و قبلہ، شیخ و برہمن، بت و خانقاہ شہباز و شاہیں سب کے سب الفاظ ہمارے مضمون و معنی کی خدمت گری کے لئے موجود ہوں گے۔ ان میں سے جن کو ہم چاہیں گے اٹھالیں گے، جس کو چاہیں گے گرا دیں گے مگر یہ ترک و اختیار اپنی مرضی سے ہوگا۔ اسمیں جبر اور زبردستی نہ ہوگی۔

ادبی علامتوں ہماری تلمیحات بھی زندہ رہیں گی ہماری رومانی کہانیوں کے ہیرو لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا قیس و لیلیٰ، وامق و عذرا بدستور ہمارے تخیل میں جان پیدا کرتے رہیں گے۔ ہم اپنے ابطال اور صنادید کی سیرتوں کی تصویر کھینچنے میں آزاد ہوں گے۔ ہم اپنی تاریخ کو اپنے آزاد تصورات کی روشنی میں پڑھیں گے۔ اور اپنے آزاد تصورات کی روشنی میں لکھیں گے۔ اس بارے میں ہماری فطرتوں اور صلاحیتوں کے شکنجے تنگی دل سے گھبرا کر مر نہ جائیں گے۔ بلکہ اپنی آزاد فضا کی وسعتوں میں پھیلیں گے پھولیں گے اور ادب کے باغ کو زینت بخشیں گے۔

ادب کے ساتھ ساتھ تعلیمی زبان کا سوال بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ گذشتہ آٹھ دس سال سے یونیورسٹیوں میں یہ بحث گرم تھی کہ ذریعہ تعلیم میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ مگر قابل حل یا ناقابل حل سوال یہ تھا کہ اس غرض کے لئے زبان کون سی استعمال میں لائی جائے ہندی والے ہندی کی چنڈی لگاتے تھے۔ اردو والے (بجا طور پر) اردو اردو کی رٹ لگاتے تھے۔ بعض صوبائی زبانیں بھی میدان میں تھیں۔ ان کو بھی ہمسری کا دعویٰ تھا۔ ان حالات میں دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی اعتدال اور بیچ کی راہ وہی ہندوستانی قرار پاتی مگر بدقسمتی سے ہندوستانی خود دنیا اور کمر معشوق کی طرح معدوم تھی

ع عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ!

با ایں ہمہ اگر ملک کی تقسیم عمل میں نہ آتی تو یہی ہندوستانی ذریعہ تعلیم قرار پاتی۔ پھر کیا ہوتا؟ یہی ہوتا کہ اچھی خاصی رائج الوقت علمی و تعلیمی زبان کو ترک کرتے ہوئے نامانوس اور غریب اور وحشی الفاظ تعلیمی زبان میں داخل کئے جاتے اور نصاب کی کتابوں کی زبان کو آسان کرنے کے بہانے سے مشکل اور ناقابل فہم بنا دیا جاتا۔ اصطلاحوں کا سوال سب سے مشکل تھا۔ علمی اصطلاحوں کو "فی صدی" تناسب کے اصول پر وضع کیا جاتا۔ اور کوشش یہی کی جاتی کہ جنوب کی خاطر شمال کی زبان مسخ ہو جائے۔ معمولی معمولی دیسی لفظ جنھیں سب لوگ بآسانی سمجھ لیتے ہیں اس طرح بگاڑ دئیے جاتے کہ ان کے لئے ہر وقت پلیٹس ہندوستانی ڈکشنری کی طرف رجوع کی ضرورت پڑتی۔ موجودہ سیاسی حل نے ہماری اس دقت کو بھی رفع کر دیا ہے۔ ہم ان پرانی اصطلاحات کو جو زندہ رہنے کے قابل ہیں زندہ رکھیں گے جو مرچکی ہیں انھیں بعد احترام دفن کر دیں گے۔ جہاں بین الاقوامی اصطلاحوں کو استعمال کرنے کی ضرورت ہوگی بلا تکلف استعمال کریں گے۔ اس معاملے میں بھی ہماری زبان بے جا مداخلت سے آزاد ہوگی۔

گذشتہ سطور سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ ہم خالص ہندوستانی مضامین اور ہندوستانی الفاظ سے پرہیز کریں گے۔ یا زبان و ادب میں جو ہندوستانی الفاظ و معانی موجود ہیں ان کو نکال باہر کریں گے۔ اردو والے یہ حرکت ہرگز نہیں کریں گے۔ اردو دراصل اپنی ترکیب اور فطرت کے لحاظ سے ہی اس کی مخالف ہے۔ اس کی تعمیر میں سب زبانوں کا حصہ ہے۔ اس نے سب زبانوں سے کسب فیض کیا مضمون بھی لئے معانی بھی اخذ کئے، بیان کے پیرائے بھی سیکھے، حسن و ادا کی

طرز بیاں بھی اپنائیں، جو جس سے من بھائے لیا مگر ایک شرط پر کہ جو کچھ لیا جائے ایسا ہو جو زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ ذوقِ سلیم کے لئے گوارا ہو اور زبان میں بآسانی جذب ہو سکے۔ ہماری زبان نے جس طرح عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، روسی، پرتگیزی، ہندی، بنگالی، مرہٹی وغیرہ سے پہلے استفادہ کیا ہے اب بھی اسی طرح برابر ان سب سے فیض حاصل کرتی جائے گی۔ مگر یہ سب کچھ اپنے ذوق اور اپنی ضرورتوں کی وجہ سے ہوگا اور آزادانہ ہوگا نہ کہ زبردستی۔

اِن امور سے قطع نظر اردو ہماری نوزائیدہ سلطنت کے مختلف صوبوں کے درمیان رابطہ مودّت قائم کرنے کے لئے بہترین وسیلہ ثابت ہوگی۔ پاکستان کا موجودہ دستوں میں چار صوبائی زبانیں موجود ہیں پشتو، پنجابی، سندھی اور بلوچی۔ اِن حالات میں پاکستان کو ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جو ان بکھرے ہوئے صوبوں کو کم از کم لسانی طور پر ایک رشتۂ وحدت میں پروئے۔ یہ زبان اردو ہی ہو سکتی ہے۔ سرکاری زبان بننے کا شرف بھی اسی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ مکاتبہ اور مراسلہ کی زبان بھی یہی ہوگی۔ اعلیٰ ادب اور کلچر کے مضمون بھی اسی میں باندھے جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم مضبوط رکھنے کے لئے جس قدر اردو کی پاکستان گیری مفید ہوگی، دوسری کوئی چیز اتنی نافع نہ ہوگی۔ یہ ممکن ہے کہ سیاسی اور اقتصادی معاملات میں صوبوں میں باہمی کشمکش پیدا ہو جائے مگر زبان کی وحدت آویزش کی بجائے آمیزش فصل کی بجائے وصل اور بُعد کی جگہ قرب کا باعث ہوگی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں امریکہ اور انگلستان کے درمیان

زبان کی وحدت اتحاد کی قوی ترین بنیاد تھی۔ زبان کی وحدت باہمی محبت والفت کا محکم ترین ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس کے توسط سے ہم فی الفور ایک دوسرے کے قریب ہو سکتے ہیں۔ زبان ایک ہو تو زمان و مکان کی دوری ہماری قربت میں حائل نہیں ہو سکتی زبان کی برکت سے ہم اشاروں سے وہ بات نکال سکتے ہیں جو عبارتوں میں نہ سما سکتی ہو۔ زبان سے ایک جملہ نکلا اور اس نے دلوں پر دستک دی۔ پاکستان کے لئے زبان کی وحدت اور یکرنگی (بایں ہمہ نگارنگی) نہایت ضروری ہے مجھے یقین ہے کہ ہمارے ارباب سیاست اس نکتے سے بخوبی آگاہ ہوں گے۔ اور اس نقطۂ نگاہ سے اردو کی اہمیت کے معترف ہوں گے۔ پس اگر یہ صحیح ہے تو یقیناً پاکستان اور اردو دونوں کا مستقبل خوشگوار ہے۔

اردو کے مستقبل کے بارے میں میں نے جن پُرامید خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے یہ مراد نہیں کہ اردو اپنے وطن میں بغیر کسی کوشش کے ترقی کر سکے گی۔ میرے خیال میں یہ قیاس درست نہ ہوگا۔ اردو کو بڑھانے اور اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لئے کسی سوچے سمجھے ہوئے پروگرام کی ضرورت ہوگی۔ جس کی تکمیل کے لئے اربابِ حکومت اہلِ علم و ادب اور عامۃ النّاس کو متفقہ طور پر اپنے اپنے فرائض انجام دینے پڑیں گے۔ حکومت کا فرض تو یہ ہے کہ فی الفور اردو کو واحد سرکاری اور عدالتی زبان بنانے کا اقدام کرے۔ بیرونی دنیا کے لوگوں سے مراسلت کے لئے انگریزی یا کسی دوسری زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح صوبائی زبانوں کو تعلیمات میں مناسب مقام دے دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر ان دو ضرورتوں کے علاوہ قلمرو پاکستان کے

طول و عرض میں اردو اور صرف اردو ہی کا سکہ رائج ہونا چاہیئے۔ عدالتوں میں، دفتروں میں، سرکاری کاروبار میں، ریڈیو میں، تقریروں میں، اشتہاروں میں تبلیغ و اشاعت میں، غرض اظہار اور ترجمانی کے ہر موقع پر اردو ہی کو استعمال کیا جائے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس معاملے میں کسی حد تک تعصب پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی کیونکہ سہل انگاری اور رواداری سے زبان کی وحدت کا مسئلہ حل ہو ہی نہیں سکتا۔ انگریزوں نے ہندوستان میں انگریزی کے حق میں خود ہندوستانیوں کے دل میں ایک طرح کا تعصب پیدا کر دیا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ہندوستانی بعد میں خود ہی انگریزی کے دلدادہ اور عاشق ہو گئے تھے۔ مگر اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چارلس گرانٹ کی اپیل اور میکالے کے نوٹ کے بعد حکومت نے اس ملک میں انگریزی کو کسی حد تک جبر سے نافذ کیا۔ اس کے لئے اقتصادی اور مجلسی منافع کی ترغیب کے علاوہ سرکاری رعب اور اثر کو بھی استعمال کیا گیا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت تھوڑے عرصے میں لوگ انگریزی میں بولنے اور لکھنے پر فخر محسوس کرنے لگے۔ اور رفتہ رفتہ اپنی زبانوں اور ادیبوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ انگریزی کے حق میں یہ تعصب آج تک موجود ہے۔ اور گو کہ سیاسی حالات نے انگریزی کا وقار بہت حد تک گھٹا دیا ہے پھر بھی غلامی کے اثرات کے ماتحت ہمارے ملک کے بہت سے لوگ ابھی تک اس کو ناگزیر اور بے بدل سمجھتے ہیں۔ پس اگر ایک غیر ملکی زبان کے حق میں یہ تعصب پیدا کیا جا سکتا ہے تو خود اپنی زبان کے بارے میں یہ عصبیت کیوں کر پیدا نہ ہو سکے گی۔ مگر اس بارے میں پہلا قدم حکومت ہی اٹھا سکتی ہے۔

میں پہلے یہ کہہ چکا ہوں کہ صوبائی زبانوں کو ان کے مناسب مقام پر رکھ کر ترقی دینی چاہیئے۔ اردو کے ساتھ تصادم کا ان کے لئے کوئی موقع نہیں جس طرح انگریزی زبان ان صوبائی زبانوں کے دوش بدوش چلتی رہی اور ان دونوں فریقوں کے درمیان کوئی پرخاش قائم نہ ہوئی بالکل اسی طرح عام ملکی زبان اور مقامی زبانوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے ملک کو ایک متحدہ زبان کی ضرورت ہے۔ وہ زبان زبانِ اردو ہے اس کو اس کے اصلی منصب سے نہ محروم کیا جا سکتا ہے نہ کرنا چاہیئے۔ اردو کو علمی زبان ہونے کا شرف ابھی سے حاصل ہے تعلیمی زبان بن چکی ہے اور بن رہی ہے۔ ابتدائی درجوں کے سوا اس کو ہر منزل اور ہر مرحلے پر ذریعہ تعلیم اور ذریعہ امتحان بنانا ہوگا اور سب صوبوں میں۔ کیونکہ اسی سے وحدت اور اتفاق کے رشتے مضبوط ہوں گے۔ طوائف الملوکی اور ذہنی انتشار ملک کے لئے نقصان دہ ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا سرچشمہ لسانی افتراق اور رنگا رنگی ہے۔ اور بھانت بھانت کی بولیاں جدا جدا مقاصد کی غمازی کریں گی ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر مہتہ نے لاہور کی میڈیکل کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ سارے ملک میں طب اور دوسرے علوم کو پڑھانے کے لئے زبان ایک ہی ہونی چاہیئے۔ اگر اس غرض کے لئے صوبائی زبانوں سے کام

دیا گیا تو ملک علمی لحاظ سے کئی الگ الگ مملکتوں میں
تقسیم ہو جائے گا۔ اور صوبے الگ الگ علمی زبانوں کی
وجہ سے افادہ و استفادہ سے محروم ہو جائیں گے۔ پس
مناسب یہی ہے کہ۔۔۔۔۔۔ ملک کی علمی اور تعلیمی زبان
صرف ایک یعنی اردو ہونی چاہیئے یہ اردو جس طرح سارے
ہندوستان کے لئے قابل عمل تھا اسی طرح مملکت پاکستان
کے لئے بھی قابل نفاذ ہے۔

اُردو کی تقویت اور فروغ کے سلسلے میں ایک بات
اور ــ! زبان والوں اور ادیبوں کا فرض ہے کہ اردو
ادب کو ہمہ گیر، دلچسپ اور عام فہم بنانے کی پوری پوری کوشش
کریں۔ اردو کی اصلی اور ترقی پذیر صلاحیتوں سے انکار
نہیں، مگر موجودہ حالات میں اردو کی ایک بنیادی کمزوری
یہ ہے کہ یہ زبان اب جن جن صوبوں میں رائج کی جا رہی
ہے ان میں سے کوئی بھی اس کا اصلی گھر یا وطن نہیں۔
اس کی جڑیں ان صوبوں میں گہرے طور پر پیوست نہیں عام
بول چال کے لئے عوام کے پاس ان کی اپنی مقامی بولیاں
موجود ہیں۔ بنا بریں اس امر کی احتیاط ملحوظ رہے کہ
لوگ ادیبوں اور عالموں کی مشکل زبان سے تنگ آ کر اردو
سے اپنا دامن نہ چھڑا لیں۔ جو ادب عوام کے لئے ہے (ادب
اس کا کوئی اصطلاحی پہلو نہیں) اس کی سلاست گیرائی
اور کشش اتنی نمایاں ہونی چاہیئے کہ لوگوں کے دل
خود بخود اس کی طرف کھچیں۔ مشکل زبان اکثر لکھنے
والوں ہی کی بے سلیقگی اور بدذوقی کی علامت ہوتی ہے
اس سے تو یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ صاحب مضمون کے پاس
الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے۔ مگر اس سے یہ بھی ثابت
ہو جاتا ہے کہ قدرت نے اس شخص کو شائستگی اور لطافت
سے محروم کر رکھا ہے۔ اسی طرح ادب کو زندگی کا
ترجمان بنا کر اس کو عوام و خواص دونوں میں مقبول
بنایا جائے۔ تاکہ اردو ادب اپنی پیداوار اور اشاعت
کے لحاظ سے بھی وسعت پا سکے۔

اس کے علاوہ ایک ضروری بحث محاورہ و روزمرہ
اور لب و لہجہ کی ہے۔ زمانے کے بے پناہ ہاتھ نے دہلی
اور لکھنؤ کی مرکزیت کو توڑ دیا ہے۔ اس کا ہمیں افسوس
ہے۔ ان مرکزوں میں معیاری زبان بولی اور لکھی جاتی
تھی۔ ان ٹکسالوں سے جو سکہ نکلتا تھا وہ سکہ چہرہ
کی طرح مسلّم اور مستند تھا۔ مگر اب سیاسی حالات نے کچھ
اس طرح پلٹا کھایا ہے کہ ہم تا دیر ان مرکزوں سے رابطہ
قائم نہ رکھ سکیں گے۔ ہمارا تعلق اہل زبان کی معیاری
زبان سے قائم نہ رہ سکے گا۔ اس صورت میں دہلی اور
لکھنؤ کا روزمرہ اور اہل زبان کا لب و لہجہ اور محاورہ
کہاں باقی رہ سکتا ہے۔؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ
اس بارے میں بے جا سختی روا نہ رکھی جائے۔ اردو
جن جن صوبوں میں جائے گی مقامی زبانوں سے ضرور
اثر قبول کرے گی۔ مقامی محاورے گفتگو میں آئیں گے
صوبائی الفاظ کی بہت بڑی تعداد زبان کے ذخیرے میں
زبردستی داخل ہو جائے گی۔ لب و لہجہ میں تغیر آئے گا
حروف و الفاظ کے مخرج بدلیں گے۔ یہ تبدیلیاں قدرتی
ہیں اور ہر صوبے کے خاص اثرات میں ان کا ظہور میں
آنا لازمی ہے۔ پس اس معاملہ میں پرانی
پابندیاں اور سختیاں نہ کی جائیں تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ
زبان کی وسعت اور ترقی کے لئے فرحت قلب کی بے حد
ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ لوگ خوردہ گیروں کے بے جا
احتساب سے تنگ آ کر ملکی اور مقامی زبانوں کی پناہ
ڈھونڈنے لگیں گے۔ مسلمانان ہندوستان نے ہزاروں سال

تک فارسی زبان کی وہ خدمت کی کہ خود ایرانیوں سے نہ ہو سکی فارسی کی اکثر بلند پایہ لغت کی کتابیں اہلِ ہند کے قلم سے مکمل ہیں۔ فارسی ادب میں ہندی مسلمانوں اور ہندوؤں کا حصہ قابلِ اعتبار ہے ـــــ مگر مغلوں کے زمانے میں تازہ وارد ایرانی جب ہندوستان میں آئے تو انھوں نے ہندوستانیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا اور ان کی زبان پر خوردہ گیری کی۔ یہ سلوک عام فارسی دانوں کے ساتھ ہی نہ کیا بلکہ مستند علما اور فضلا کے خلاف زبانِ طعن دراز کی۔ علی حزیں نے سراج المحققین خان آرزو کے متعلق کہا "در پوچ گویانِ ہند بدنیست" اس پر دہلی اور دیگر ادبی مرکزوں میں ایک ہنگامہ برپا ہوا۔ فضلائے ہند جو اس وقت تک فارسی کو دل و جان سے چاہتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ بددل ہو گئے اور کہنے لگے کہ جس زبان میں صدیوں تک لکھنے کے بعد بھی ہمارے بزرگ کوئی امتیاز پیدا نہ کر سکے۔ اس میں مزید سر کھپانے سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ لوگ ریختہ کی طرف مائل ہوتے گئے۔ اور نوبت باین جا رسید کہ اب فارسی کی تعلیم و تحصیل ہوتی ہے لیکن یہی کہ وقت گیا اور لوٹ تھا ـــــ مجھے ڈر ہے کہ اردو کے نادان دوستوں کی نادانی اور کم فہمی سے کہیں اردو کا بھی یہی حشر نہ ہو اردو کی حدود کی توسیع اب جن قدرتی راستوں پر ہوگی اس میں رکاوٹیں نہیں ڈالنی چاہئیں۔ تنقید اور ذوقِ صحیح دونوں اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کریں گے۔ اور مطلق العنانیوں اور بے اعتدالیوں کو خود روک دیں گے۔

قلمروِ پاکستان اس وقت صوبہ سرحد، پنجاب (مغربی)، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بلوچستان اور سندھ میں اردو کی کاشت ابھی ہوتی ہے اس کا پودا لگانا ہے ان صوبوں میں زبان کا خاص تعصب موجود ہے۔ ان لوگوں میں اردو کو بڑی دانائی سے رواج دینے کی ضرورت ہے۔ صوبائی زبانوں کی اہمیت تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان صوبوں میں اردو اور صوبائی زبان ہر دو بطور لازمی مضمون کے پڑھانی چاہیئے۔ مگر تعلیم کی زبان پرائمری سے اوپر اردو ہی ہونی چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ جب کبھی ان صوبوں کے لوگ اردو کے دلکش ادب سے براہ راست روشناس ہوں گے خود بخود اردو کے دلدادہ ہو جائیں گے۔ اور اس کے لئے ان کے دل میں ایک طرح کا تعصب پیدا ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ عدالتی اور سرکاری زبان ان صوبوں میں اردو ہی ہو۔ کیونکہ وہی اس اعزاز کی مستحق ہے۔

صوبہ سرحد کا حال بہتر ہے اگرچہ پشتو والوں کو اپنی زبان سے محبت بلکہ عشق ہے۔ مگر تقریباً ایک صدی سے اردو صوبہ سرحد میں رائج ہے۔ اکثر لوگ اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ ہزارہ اور ڈیرہ اسماعیل خاں میں پشتو کے علاقے کم ہیں۔ ان میں تقریر و تحریر اردو زبان میں ہوتی ہے پشتو میں ادب کچھ زیادہ نہیں۔ اس کا رسم الخط بھی مشکل اور بے ڈھنگا ہے۔ پشتو کی شاعری کم ہے۔ مگر جس قدر ہے بے مثل ہے۔ پٹھانوں کو خوشحال خان خٹک اور عبدالرحمٰن کی شاعری سے بڑی محبت ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ ابھی تک پشتو میں اعلیٰ نثر پیدا نہیں ہوتی۔ عوام میں اردو سمجھنے اور بولنے والوں کی کثرت ہے جمرود۔ لنڈی کوتل اور تورخام تک چلے جائیے اردو میں بات کرنے اور سمجھنے والوں کی کمی محسوس نہ ہوگی اسلامیہ کالج پشاور کے طالب علم اس زبان کو تحائل

میں پھیلانے کا سب سے بڑا کام کر رہے ہیں۔ ضلع ہزارہ کے بعید ترین شمال مشرقی گوشوں میں وادیٔ کاغان واقع ہے جو گلگت اور چلاس تک چلی جاتی ہے بہت سے لوگوں کے لئے یہ امر موجب حیرت ہوگا کہ اس وادی میں بعض لوگوں کی مادری زبان اردو (گوجری) ہے۔ یہ لوگ گوجر ہیں۔ پرانے زمانے میں گجرات سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ ان کا کام بھیڑ بکریاں چرانا ہے۔ یہ وادی کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ گرمیوں میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنے ریوڑوں کو لے جاتے ہیں۔ اس موسم میں درۂ کاغان اور وتہ پھر گرمنگ تک کے دشوار گزار راستوں پر چلئے اور اپنے کانوں سے گوجری اردو کے گیت اور بول سنئے اور لطف اٹھائیے۔ ہزارہ میں اردو کی جڑیں بہت مضبوط ہیں اور تو اور صوبہ سرحد میں سب سے زیادہ ہزارہ کے لوگ اردو سے قریب ہیں۔ مگر باقی اضلاع میں اردو کا خاصا چرچا ہے

اب پاکستان میں اردو کے سب سے بڑے مرکز کی طرف آیئے۔ یہ پنجاب ہے جسے اردو کا وطن ثانی کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اردو سے پنجاب کا تعلق بہت پرانا، بہت گہرا اور بہت مضبوط ہے محققین کی یہ رائے ہے کہ اردو کا ابتدائی ڈھانچہ لاہور اور ملتان کی پنجابی کے خمیر سے تیار ہوا۔ لہٰذا مرکزِ ہے کہ اردو کی تعمیر کی پہلی منزل اس کی حدود میں طے ہوئی یہاں سے اردو کا لشکر دہلی اور وہاں سے خلجیوں اور تغلقوں کی مظفر و منصور فوج کے ساتھ دکن اور گجرات میں پہنچا۔ اردو کا پہلا ادب انھیں صوبوں میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد عرصے تک پنجاب ان ادبی تحریکات سے بے خبر رہا جس کی لہر خود اس کے دریاؤں سے اٹھی تھی۔ پنجاب میں اردو کی دوسری لہر اورنگ زیب کے زمانے میں ہریانہ کے علاقے میں نمودار ہوئی۔ عین اس زمانے میں جب کہ اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد دہلی تک طالب سلیم کلیم و سلیم کے قند پارسی کا مزاح اور عاشق تھا۔ اور اہلِ دہلی کے کام و دہن فارسی سے لذت گیر ہو رہے تھے۔

ہریانہ کے علاقے میں نظم و نثر کے رسالے اردو میں بہ تعداد کثیر لکھے جاتے ہیں۔ جن میں سے بعض کو قدیم اردو ادب کا بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے

پنجاب میں اردو کی تیسری لہر ۱۸۴۹ء کے بعد اٹھی اب کی بار اس کے محرک انگریز تھے۔ جنھوں نے اپنی سیاسی اغراض کے ماتحت ہندوستان میں وحدتِ زبان پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۵۶ء میں پنجاب کا محکمۂ تعلیم قائم ہوا اس زمانے سے لے کر اس وقت تک برابر اردو پنجاب کی ادبی، علمی، تعلیمی اور سرکاری زبان ہے پنجاب نے اس عرصہ میں اردو زبان اور ادب کی جو خدمت کی ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کا حال تمام اہلِ علم جانتے ہیں یہاں تک کہ اہلِ اردو نے پنجاب کو اردو کا تیسرا مرکز قرار دیا ہے۔ بسمل الہ آبادی نے اسی وجہ سے کہا تھا؎

مرکزِ زبان اردو کا لاہور ہو گیا
دہلی و لکھنؤ کو پکارا کرے کوئی

البیرونی ہندوستان پنجاب میں داخل ہوتے ہیں یہاں وہ جس عوامی زبان سے دوچار ہوتے ہیں اسے وہ الہندیہ کہتے ہیں مگر ان کی کتابوں (خصوصاً اردو یہ کی کتاب الصیدنہ) کے بیشتر الفاظ پنجابی ہیں۔ اسی زبان کو وہ ملک کے عوام کی زبان کہہ رہے ہیں۔ غرض پنجاب کا یہ دعویٰ

اس تجزیئے سے یہ بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ پاکستان میں اردو کا مستقبل پنجاب کی کوششوں پر منحصر ہے۔ اس لئے میرا عقیدہ ہے کہ پنجاب میں اردو کے مسائل پر غور و فکر کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ آئندہ اردو کی ترقی کے وسائل پنجاب ہی میں مہیا ہو سکتے ہیں۔ اور اسی سرزمین میں اردو کی عمارت مضبوط بنیادوں پر کھڑی کی جا سکتی ہے۔ پنجاب میں اردو کو کیسے ترقی دی جائے اس کی تفصیل میں کسی دوسرے موقع پر بیان کروں گا۔ اس جگہ مختصراً ان اقدامات کی فہرست پیش کرتا ہوں جن پر پاکستان اور پنجاب میں اردو کی ترقی موقوف ہے۔

۱۔ اردو کو انگریزی کی بجائے اعلیٰ سرکاری زبان بنایا جائے اور سارا دفتری کام اسی زبان میں انجام دیا جائے۔
۲۔ عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کی زبان اردو ہو۔
۳۔ نشر و اشاعت اور دفتری مراسلت کی زبان اردو ہو۔
۴۔ ریڈیو کی زبان علی العموم اردو ہو۔ اسمبلیوں میں تقریریں اردو میں ہوں۔
۵۔ یونیورسٹی میں اردو کو سب مضامین کا ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔
۶۔ یونیورسٹی میں اردو کو لازمی مضمون بنایا جائے
۷۔ اردو میں ریسرچ اور تصنیفی کام کے لئے آسانیاں مہیا کی جائیں۔
۸۔ اردو کی لائبریری کی توسیع کی جائے۔
۹۔ اردو میں نصاب تیار کرنے کے لئے دار الترجمہ اور دار التصنیف قائم کئے جائیں۔
۱۰۔ اردو میں انعامی تقریروں اور مباحثوں کے لئے عطیات طلب کئے جائیں۔
۱۱۔ تعلیم بالغان کی مہم جاری کی جائے۔
۱۲۔ اردو بولو تحریک کو وسعت دی جائے۔
۱۳۔ فلم کی زبان کا ادبی معیار عوامی نقطۂ نگاہ سے بلند کیا جائے۔
۱۴۔ عوام میں اردو کو مقبول بنانے کے لئے اعلیٰ عوامی ادب پیدا کیا جائے۔
۱۵۔ یہ چہاردہ نکات اردو کی آئندہ ترقی کی ضامن ہیں۔ اس پروگرام کو پیش نظر رکھا جائے تو مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے ارباب اقتدار اپنے فرض کو پہچانیں گے۔ اور اردو کی ترقی کے اس پروگرام پر عمل کریں گے۔ کیونکہ اس سے قبل ہمارے راستے میں جو رکاوٹیں تھیں وہ سب دور ہو گئی ہیں۔ اگر اب بھی لیت و لعل اور اگر مگر کا عالم رہا تو پھر اردو کے لئے اس ملک میں کوئی جگہ نہیں۔ اور اس کے خوشگوار مستقبل کے بارے میں ہم جو امیدیں لگائے بیٹھے ہیں وہ سب نقش بر آب ثابت ہونگی۔

سید عبداللہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

اُردو کے نفاذ کا مسئلہ

(خطبۂ استقبالیہ جو قومی زبان کانفرنس کراچی میں ۲۷ جون ۱۹۸۰ء کو پیش کیا گیا۔)

مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے میں اپنی اور مجلس استقبالیہ کے سب اراکین کی جانب سے آپ کو خلوص و عقیدت کے ساتھ "قومی زبان کانفرنس" میں شریک ہونے پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ جناب صدر! آپ کی شرکت سے نہ صرف اس کانفرنس کی اہمیت بڑھ گئی ہے بلکہ اس اردو تحریک کو بھی تقویت ملی ہے جس کے روحِ رواں ہمارے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب ہیں۔ اردو تحریک شروع ہی سے تحریکِ پاکستان کے ساتھ رہی ہے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے اس تحریک میں حصہ لیا ہے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اردو زبان کا تحفظ مسلمانوں کے ایک عظیم اجتماعی و تہذیبی و روحانی ورثے کے طور پر تحریکِ پاکستان کے بنیادی مطالبوں میں سے ایک مطالبہ تھا۔ صدر محترم! مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے چونکہ آپ کا عملی تعلق تحریکِ پاکستان سے رہا ہے۔ اس لئے آپ اس بات کے شریک شاہد ہیں کہ تحریکِ پاکستان میں اردو نے کیا کردار ادا کیا اور کس طرح برعظیم کے مسلمانوں کو متحد و متفق کر کے نہ صرف تحریکِ پاکستان کو تقویت بہم پہنچائی بلکہ اس ملک عزیز کے وجود میں لانے کا سبب بھی بنی۔ اردو کسی ایک علاقے کی نہیں بلکہ برعظیم کے سارے مسلمانوں کی واحد قومی زبان ہے۔ جس کے ذریعے مختلف زبانیں بولنے والے ایک دوسرے سے معاشرتی، تہذیبی و معاشی سطح پر معاملات کرتے اور دل کی بات زبان پر لاتے ہیں۔ اس زبان کو چونکہ ہمارے مذہبی و تہذیبی ثقافتوں نے پروان چڑھایا ہے۔ اس لئے اس کے ذخیرۂ الفاظ میں، اس کے طرزِ اظہار میں اس کی اصطلاحات، علامات اور محاوروں میں سارے برعظیم کے مسلمانوں کی تہذیبی و دینی روح شامل ہے۔ مثلاً قرآن پاک کو لیجئے قرآن پاک میں کم و بیش اسی ہزار الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جن سے تقریباً دو ہزار الفاظ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دو ہزار الفاظ میں سے تقریباً اسی فیصد الفاظ اردو زبان کا حصہ ہیں۔ پھر قرآن پاک کے زیرِ اثر جو محاورات و روزمرہ خود اردو زبان نے وضع کئے ہیں۔ وہ ان کے علاوہ ہیں۔

یہ بات میں نے صرف اس لئے عرض کی ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس زبان پر ہماری دینی و فکری چھاپ کتنی گہری ہے ۔

یہ ہماری بدقسمتی اور ہمارا قومی المیہ ہے کہ ہم نے اپنی ذات پر اپنے تہذیبی ورثے پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا ہے ۔ اور آج اپنے مسائل کے حل کے لیے کاسۂ گدائی لے کر قدم قدم پر غیروں کی طرف دیکھتے ہیں اور چونکہ اپنے مسائل کا حل ہم اپنے مخصوص قومی حالات و ملی پس منظر سے الگ ہو کر تلاش کرتے ہیں ۔ اس لئے ہر روز جب نئی صبح کا سورج طلوع ہوتا ہے ۔ نئے نئے مسائل میں الجھ جاتے ہیں ۔ اس وقت ہماری حالت ریشم کے اس کیڑے کی طرح ہے جو خود اپنے خول میں محصور ہو جاتا ہے ۔ آج صورت حال تو یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہم مسلمان ایک قوم تھے ۔ اور آج اپنی حماقتوں، غلطیوں اور فروگزاشتوں کی وجہ سے ایک قوم کے بجائے کئی قومیں بننے کی تیاری میں سرگرم عمل ہیں ۔ ملک کے دانشوروں کا یہ فرض ہے کہ وہ آنے والے وقت کے بارے میں قوم کو پہلے سے آگاہ کرتے رہیں ۔ اور یہ نیازمند جو دانشور تو نہیں البتہ دانشوروں کا ایک ادنیٰ خادم ہے یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہے کہ اگر اس طرف فوراً توجہ نہ دی گئی ۔ اور اس کے اسباب دریافت کر کے ان کا مداوا نہ کیا گیا تو زمانہ قیامت کی چال چل جائے گا ۔

ہواؤں کا رخ دیکھئے جو بادل اٹھ رہے ہیں ۔ ان پر نظر رکھئے تو میری بات آسانی سے سمجھ میں آجائیگی ۔ پاکستان میں ایک عظیم اور مضبوط قوم بننے کے سارے امکانات موجود ہیں ۔ یہ بات میری طرح آپ سب جانتے ہیں کہ قوم بننے کے لئے چار چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور ضروری ہے کہ یہ چاروں چیزیں بیک وقت اس قوم کے اندر جاری و ساری ہوں ایک یہ کہ اس کا ایک جغرافیہ ہو جس کے مقررہ حدود ہوں ۔ اس ملک میں رہنے والی آبادی کی اکثریت کا ایک مذہب ہو تیسرے یہ کہ اس آبادی کی اپنی مشترک قومی تاریخ ہو ۔ اور چوتھے یہ کہ اس کی اپنی قومی زبان ہو ایک ایسی زبان جسے سب بولتے اور سمجھتے ہوں ۔ اور جس کے ذریعے مختلف زبانیں بولنے والے ایک دوسرے سے ابلاغ کرتے ہوں ۔ یہ چاروں چیزیں بفضل تعالیٰ ہمارے پاس موجود ہیں ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم اب تک پورے طور پر ایک قوم نہیں بن سکے ہیں ۔ اگر غور کیا جائے تو ہم نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہم نے ان چاروں عناصر کو پورے طور سے اپنی زندگیوں میں اپنی روح اور نئی نسل کی تربیت کرتے ہوئے ان کی فکر کو اپنے تہذیبی ورثے سے قریب لانے کے بجائے دور کیا ہے ہم نے قومی زبان کو اپنی زندگی میں اس طور پر داخل نہیں کیا ہے ۔ جس سے تہذیبی، معاشرتی، معاشی و سیاسی سطح پر ہم اور ہماری نئی نسلیں یکجہتی کے رشتے میں پیوست ہو سکیں ۔ گارساں دتاسی نے جو انیسویں صدی کا ایک مشہور فرانسیسی مستشرق تھا ۔ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ قوموں میں کوئی چیز اس قدر اختلاف پیدا نہیں کرتی ۔ جتنا یہ کہ ان کی زبانیں مختلف ہوں اور کوئی چیز اتنا اتحاد و یگانگت پیدا نہیں کرتی ۔ جتنی کہ ایک مشترک زبان ۔ یہ حقیقت اس قدر عیاں ہے کہ اس کیلئے کسی مثال کی ضرورت نہیں نہ ہمارے

قومی انتشار اور منافرت کا اور اسباب کے علاوہ ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے۔

اردو کے سلسلے میں ہم ایک ایسے احساس کمتری کا شکار رہے جس نے ہمارے قومی اعتماد کو ڈھا دیا ہے۔ ہمارے بچے انگریزی پڑھتے ہیں ابتدائی جماعتوں سے لے کر انتہائی جماعتوں تک ہمارے بچوں کی تخلیقی توانائیوں کا بڑا حصہ انگریزی سیکھنے میں صرف ہوتا ہے۔ اس عمل پر ذرا غور فرمایئے ایک طالب علم کی صلاحیتوں اور قوتوں کا بڑا حصہ صرف انگریزی کتاب میں لکھی ہوئی بات کو سمجھنے اور اس زبان کی اجنبیت کو اپنے ذہن سے دور کرنے کے عمل پر صرف ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ اتنی ہی بات سمجھ پاتا ہے جو کتاب میں لکھی ہے۔ نقل اور پیروی اس کے مزاج کا حصہ بن کر اس کی اپج کو کند کر دیتی ہے۔ وہ اس طرح تعلیم پا کر اضافہ کرنے یا کوئی نئی بات دریافت کرنے کی صلاحیت گنوا بیٹھتا ہے۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ انگریزی زبان میں ساری تعلیم کے باوجود سوچ نہیں سکتا، محسوس نہیں کر سکتا سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت کو پروان چڑھا کر ہی قوم کی تخلیقی توانائیوں کو ابھارا جا سکتا ہے۔

طالب علموں کی اکثریت اسی لسانی جبر اور اسی تعلیمی تضاد کا شکار ہے۔ پاکستان شاید دنیا میں ایک ایسا عجوبہ معاشرہ ہے۔ جہاں بیک وقت دو نظام تعلیم رائج ہیں۔ ایک نظام تعلیم انگریزی کے ذریعے تعلیم دیتا ہے۔ اور دوسرا نظام تعلیم اردو کے ذریعے تعلیم دیتا ہے۔ ملک کے سارے مقابلے کے امتحانات اور انٹرویو انگریزی زبان میں لئے جاتے ہیں اسی لئے وہ طالب علم جو اردو کے ذریعے تعلیم پاتے ہیں اپنی ساری خداداد صلاحیتوں اور ذہانت کے باوجود آگے بڑھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ وہ طالبعلم جسے اپنے مضامین پر پورا عبور حاصل ہے اور جس نے امتحانات میں اول پوزیشن بھی حاصل کی ہے۔ وہ جب مقابلہ کے لئے سامنے آتا ہے تو یہاں انگریزی اس طرح نہ بولنے کی وجہ سے جس طرح انگریزی اسکول کا طالب علم بولتا ہے وہ زندگی میں ناکام رہ جاتا ہے۔ اسی لئے آزادی کے بعد سے انگریزی اسکولوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ نظام تعلیم کے اس تضاد کی وجہ سے وہ اسکول جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ رعیت اور محکوم پیدا کر رہے ہیں اور وہ اسکول جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ حاکم اور حکمراں پیدا کر رہے ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ یہاں قابلیت اور صلاحیت معیار نہیں ہے۔ بلکہ صرف انگریزی زبان سے زیادہ واقفیت ہے جب انگریزی اسکول کے پڑھے ہوئے طالب علم حاکم بن کر کرسی اقتدار پر بیٹھتے ہیں تو ایک طرف وہ اپنی تعلیم و تربیت کی وجہ سے اپنی تہذیبی روایت اور اپنے قومی ورثے سے نابلد ہوتے ہیں۔ اور دوسری طرف انہوں نے انگریزی اور انگریزی تعلیم پر غیر معمولی زور دے کر نہ صرف ہماری نئی نسلوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو حد درجہ زخمی کیا ہے بلکہ انہیں قوم کے فکر و شعور کے لئے ناکارہ بنا دیا ہے۔

اردو کے بارے میں گزشتہ ۳۲ سال سے یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ ہر حکومت اسے آئین میں جگہ دے کر ایک کمیشن بنا دیتی ہے۔ جس میں آٹھ دس سال آگے کی تاریخ ہوتی ہے۔ اور اس ادارے یا کمیشن

کے سپرد یہ کام کیا جاتا ہے کہ وہ اس عرصہ میں ایسے کام کرے کہ اردو کو قومی و دفتری سطح پر اختیار کیا جاسکے۔ یہ ادارہ کیا کام کرتا ہے۔ کیسے کرتا ہے یہ تو ارباب حل و عقد کو معلوم ہوگا۔ لیکن ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ دس سال بعد وہ تاریخ آتی ہے۔ اور پھر گزر جاتی ہے اور کچھ عرصہ بعد ایک نیا ادارہ وجود میں آجاتا ہے جس کے سپرد اسی قسم کے مقاصد کر کے فراغت حاصل کر لی جاتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ عمل عمداً کیا جاتا ہے۔ یا محض بھولپن سے کیا جاتا ہے مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ کیا جاتا ہے اور اب تک اس کا نتیجہ وہی نکلا ہے جو نکلنا چاہیئے تھا۔ یعنی ڈھاک کے تین پات۔ ہم نے بے وجہ قومی زبان کو ایک مسئلہ بنا لیا ہے۔ اور مسئلہ بنا کر قومی انتشار کو پیدا کر کے اپنے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کئے ہیں ملک کی ۸۵ فیصد آبادی انگریزی نہیں جانتی۔ باقی ۱۵ فیصد خواندہ آبادی میں سے صرف ایک فیصد ایسی ہے جو انگریزی جاننے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود انگریزی کو قوم کے ذہن پر سوار کر کے ساری قوم کو مسائل میں الجھا کر اعصابی مرض میں مبتلا کر دیا ہے۔ جیسے اعصابی مریض کوئی اعلیٰ درجے کا تخلیقی کام نہیں کر سکتا یہی صورت ہماری پوری قوم کے ساتھ ہے ایک آدمی کویت سے اپنے پاکستانی بینک کو کسی انگریزی دان عرضی نویس کو معاوضہ ادا کر کے ایک چٹھی لکھواتا ہے کہ اس نے فلاں بینک کا چیک بھیجا تھا۔ وہ اب تک اس کے متعلقین کو نہیں ملا ہے وہ بات جو دوسروں سے لکھواتا ہے اسے اردو میں بیان کرتا ہے۔ لکھنے والا اسے سن کر انگریزی میں ڈھالتا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے اور یہ بات مجھے ایک بینک کے ذمہ دار افسر نے بتائی کہ وہ لکھواتا کچھ ہے لکھنے والا لکھتا کچھ ہے۔ یا اس طور پر انگریزی میں لکھتا ہے کہ اس کا مطلب کچھ اور ہو جاتا ہے ہمارے ایک بینک نے یہ دیکھ کر اپنے موکلوں کو یہ سہولت بہم پہنچائی کہ اب بینک کے نام وہ اپنی چٹھی اردو میں بھی لکھ سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موکل کی بات نہ صرف واضح طور پر لکھ کر آنے لگی بلکہ مسائل کا حل بھی آسان ہو گیا۔ یہ ایک معمولی سی عام سی مثال میں نے دی ہے۔ ورنہ عام طور پر ہر درخواست دینے والے کے ساتھ یہی ہوتا ہے اور عوام کی مشکلات میں اضافہ ہوتا ہے۔ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ عدالتیں پہلے عرضی دعویٰ، جواب دعویٰ بحثیں، اجراح سب اردو میں کرتی تھی۔ اب آخر انگریزی ہی میں کیوں کرتی ہیں؟ میں خود باتہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آخر ابتدائی جماعتوں سے لے کر انتہائی جماعتوں تک یہ سب کچھ انگریزی میں کیوں ہوتا ہے۔ مثلاً اگر آپ فرانسیسی زبان سیکھنا چاہیں تو اس کے لئے بیس سال کی ضرورت تو نہیں ہے کہ جب تک آپ پہلی جماعت سے لے کر ایم اے تک فرانسیسی نہیں پڑھیں گے۔ آپ کو فرانسیسی نہیں آئے گی۔ وہ طالب علم جو باہر جاتے ہیں چھ ماہ میں وہ زبان اتنی سیکھ لیتے ہیں کہ ان کا کام آسانی کے ساتھ چل جاتا ہے۔ انگریزی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی تعلیم اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر باہر کی دنیا سے رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ کیا جرمنوں اور فرانسیسیوں کا باہر کی دنیا سے

رشتہ اس لئے منقطع ہے کہ انہیں انگریزی نہیں آتی وہاں بھی انگریزی ان لوگوں کو آتی ہے جنہیں اس کی ضرورت ہے۔ اور اس کام کے لئے انگریزی داں رکھے جاتے ہیں. لیکن ساری قوم کو فرانس یا جرمنی سے باہر کی دنیا سے رشتہ قائم رکھنے کے لئے انگریزی نہیں پڑھائی جاتی پھر آپ یہ دیکھیے کہ ساری عمر انگریزی پڑھ کر آپ نے باہر کی دنیا سے کیا رشتہ قائم کیا ہے۔ جس کا رشتہ اپنی قوم سے اپنے ملک سے گہرا نہیں ہوتا۔ اس کا رشتہ باہر کی قوموں سے، باہر کے ملکوں سے بھی اوپر سطحی اور مصنوعی ہوتا ہے۔ باہر کی دنیا سے انگریزی کے ذریعے رشتہ قائم کرنے کا کلیہ ایک ایسا مہمل کلیہ ہے۔ جو ہم نے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے لئے نادانی میں قبول کر لیا ہے۔ آخر چین جا کر ہمارے صدر مملکت نے اردو میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تو کیا چینی قوم سے ہمارا رشتہ منقطع ہو گیا؟ کیا اردو میں سالانہ بجٹ پیش کرنے سے بجٹ ساری قوم کے ادنیٰ و اعلیٰ تک نہیں پہنچا؟

ہماری قومی زبان کا پاکستان کی ساری علاقائی زبانوں سے گہرا دینی، معاشرتی و فکری رشتہ ہے۔ انگریزی کو باقی رکھنے کے لئے ملک میں بعض عناصر اصل مسئلہ کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لئے قومی زبان اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے سے متصادم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اردو انگریزی کی نہیں بلکہ علاقائی زبانوں کی حریف ہے۔ اور ان کی جگہ لینے والی ہے حالانکہ یہ صورت ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ اردو اور علاقائی زبانیں سوکنیں نہیں ہیں۔ بلکہ سگی بہنیں ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انگریزی کی جگہ اردو کو دی جائے۔ تاکہ قوم کی فکری، ذہنی، تخلیقی صلاحیتیں پروان چڑھ سکیں جب تک یہ نہیں ہوگا کہ ہماری تخلیقی و فکری صلاحیتیں اسی طرح پارہ پارہ رہیں گی۔ اردو کے سلسلے میں جو کہا جاتا ہے کہ اس میں ابھی انگریزی کی جگہ لینے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔ تو عرض یہ ہے کہ جب آپ کسی زبان کو استعمال ہی نہیں کریں گے۔ اس میں اپنی صلاحیتوں کو شامل ہی نہیں کریں گے تو اس میں وہ صلاحیت کیسے پیدا ہوگی۔ آخر چلتی گاڑی میں پہیہ کیسے بدلا جا سکتا ہے؟

خواتین و حضرات!

ایک گزارش اور کرتا چلوں۔ وہ سرکاری یا نیم سرکاری ادارے جو اردو کی ترقی کے لئے کام کر رہے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ فوراً ایسے منصوبوں پر عمل کریں جن سے فوری دفتری و قومی ضروریات پوری کی جائیں مثلاً اردو ٹائپ رائٹرز تیار کرائے جائیں۔ ان کی تیاری میں ۳۳ سال کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ صرف چھ ماہ کا کام ہے۔ اردو کا جو ٹائپ رائٹر مروج ہے اسے ہی تیار کرا لیا جائے۔ اور اس کے لئے کسی زرمبادلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ملک کے اندر ایسے تجارتی ادارے موجود ہیں۔ جو ٹائپ رائٹرز یہاں بنا کر باہر بھیجتے ہیں۔ اور ہم کیسے لوگ ہیں باہر سے ٹائپ رائٹر منگواتے اور درآمد کرتے ہیں۔ اسی طرح سارے ملک میں اردو مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) اور اردو ٹائپنگ کی تعلیم و تربیت کے لئے اسکولوں اور اداروں کا جال بچھا دیا جائے تاکہ آئندہ چند ماہ میں اردو اسٹینو ٹائپسٹ تیار ہو جائیں۔ وہ لوگ

جو برسر ملازمت ہیں انہیں اردو ٹائپنگ اور مختصر
نویسی کی ترغیب دی جائے۔ اخبارات کے لئے ٹیلی
پرنٹر سروس اردو میں شروع کی جائے۔ اور یہ
کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اب دنیا میں ایسے
ٹیلی پرنٹر استعمال ہو رہے ہیں جو بیک وقت
بائیں سے دائیں اور دائیں سے بائیں لکھی جانے
والی زبانوں کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی
ہمارے ملک میں تیار ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری
ہے کہ اردو اخبارات کو صرف ٹائپ میں شائع کرنے
کا پابند کیا جائے۔ یہ صرف عادت کا مسئلہ ہے جب
سب اخبار اردو ٹائپ میں شائع ہونے لگیں گے۔ تو
چند ماہ میں ہماری آنکھیں اس کی عادی ہو جائیں
گی۔ اس طرح فن کتابت کے لئے اسکول، ادارے
کھولنے کی ضرورت ہے۔ جس میں ہزاروں کی
تعداد میں لڑکے لڑکیاں فن کتابت سے واقف
ہو کر نکلیں۔ کتابت کا معیار اخبارات کی ضرورت کا
حصہ لے جس طرح گر رہا ہے۔ اس سے نہ صرف ہمارا
احساس جمال متاثر ہوا ہے بلکہ کتابوں کی اشاعت
بھی شدت سے متاثر ہوئی ہے۔ اس بات کی ضرورت
ہے کہ ایک ایسی لغت فوراً مرتب کی جائے جس
میں وہ الفاظ و اصطلاحات شامل ہوں جو آج
کی جدید دنیا کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہیں
ایسے لفظوں اور اصطلاحوں کی تعداد پانچ چھ ہزار
سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اخبارات وغیرہ انہیں الفاظ
اصطلاحات کو اپنے ہاں استعمال کریں تاکہ یہ عام ہو
جائیں۔ اور ترجموں کا موجود تضاد دور ہو جائے۔
اردو کو دفتر اور تعلیمی اداروں میں فوراً اختیار
کرنے کی ضرورت ہے۔ جس قسم کی انگریزی وسرکاری
غیر سرکاری دفتروں میں لکھی جا رہی ہے اور بیس
سال انگریزی پڑھ کر ہمارا نوجوان جس قسم کی
انگریزی لکھ رہا ہے۔ اس سے ہماری آنکھیں کھل
جانی چاہئیں۔ ان سب باتوں کو اخبارات، ریڈیو
ٹیلی ویژن اور ابلاغ عامہ کے دوسرے ذرائع کے
واسطے سے قوم کو بتانے اور سمجھانے کی ضرورت
ہے قومی زبان کو آج نافذ کر کے چند سال میں
اس کے مثبت نتائج دیکھئے ملک کی قسمت بدل
جائے گی۔

قومی زبان اور اس کا نفاذ۔ ایک جائزہ

تحریر: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

مقتدرہ قومی زبان نے چند مہینے پہلے قومی زبان کے نفاذ اور اس کے مسائل کے سلسلے میں ایک جائزہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں پاکستان کے مختلف علاقوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اصحاب سے خطوط کے ذریعہ دریافت کیا تھا کہ وہ اپنے علم، مشاہدے اور تجربہ کی روشنی میں بتائیں کہ قومی زبان کے نفاذ کے سلسلے میں اصل رکاوٹیں اور واقعی موانع کیا ہیں؟ اور اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ خطوط کے علاوہ نجی ملاقاتوں میں اصحاب علم و عمل سے تبادلۂ خیال سے اور بہت سے اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین، مراسلات وغیرہ میں اہلِ قلم کے افکار سے استفادہ کیا گیا۔ خطوط، ملاقاتوں اور مضامین، مراسلات کے مختلف ذرائع سے جن حضرات کے خیالات سے یہ جائزہ مرتب کیا گیا ہے ان کی تعداد دو ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔

اس جائزہ میں جو افکار اور تجاویز پیش کی گئی ہیں ان میں سے بعض کے بارے میں حکومت پہلے ہی فیصلہ کر چکی ہے۔ عدلیہ، تعلیم کے ادارے بھی اردو کے نفاذ اور رواج کے سلسلے میں بعض اہم اور بنیادی فیصلے کر چکے ہیں۔ دفتری زبان کی حیثیت سے سرکاری دفاتر میں اردو کے عام رواج میں اردو کے ٹائپ رائٹر کے کلیدی تختہ کے بارے میں کسی قومی فیصلے کا نہ ہونا بیان کیا جاتا تھا۔ لیکن گذشتہ ماہ وفاقی حکومت نے کلیدی تختہ کو منظور کر کے اس رکاوٹ کو دور کر دیا ہے۔ اور توقع یہ ہے کہ ۱۹۸۱ء کے وسط تک یہ عذر باقی نہ رہے گا۔ بلکہ حکومت نے اردو ٹیلی پرنٹر کے کلیدی تختہ کو منظور کر کے علم و ادب، تعلیم و اشاعت اور صحافت و ابلاغ عامہ کے شعبوں میں قومی زبان کے رواج میں نہ صرف رکاوٹوں کو دور کر دیا ہے بلکہ اس کے قبولِ عام کے دروازے کھول دئے ہیں۔ لوگوں نے ابھی اس فیصلے کی اہمیت پر غور نہیں کیا۔ لیکن اردو ٹیلی پرنٹر کے رواج کے بعد اندازہ ہوگا کہ قومی زبان کے حق میں اردو کی تاریخ کا یہ عظیم الشان اور بہت دور رس فیصلہ ہے۔ اسی طرح اردو یونیورسٹی کے قیام کا فیصلہ نہ صرف اشاعت تعلیم اور امتحانات کے بہترین نتائج کے باب میں ایک انقلاب آفریں فیصلہ ثابت ہوگا بلکہ اردو زبان کی عام ترویج اور اس کی مقبولیت کی راہ کی رکاوٹوں کو دور کر دینے کا باعث ہوگا۔

ثانوی درجات تک ذریعہ تعلیم کا فیصلہ اور امتحانات کی زبان کے سلسلے میں محکمہ تعلیم کی جانب سے رعایت موجود ہے۔ عدالتوں میں قومی زبان کے استعمال اور رواجِ عام کے بارے میں ایک نہایت مسرت افزا خوش خبری پچھلے دنوں پاکستان کے رئیس عدالت عالیہ کی زبان سے سن چکے ہیں۔ اسی طرح متعدد فیصلے، مشورے اور ہدایات پہلے سے موجود ہیں ان پر صرف عمل درآمد کرانے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہاں ہم نے کسی ایسی تجویز کو بھی جس کے بارے میں پہلے ہی کوئی فیصلہ

۔۔۔ ہو سکا ہے ۔ معلوم نہیں کیا ہے تاکہ جائزہ میں شریک اصحابِ فکر و نظر اور اہلِ علم و دانش کے خیالات عوام تک بے کم و کاست پہنچ جائیں ۔ یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ اس جائزہ میں شامل تجاویز سے متعلق بعض منصوبے مقتدرہ قومی زبان میں پہلے ہی سے زیرِ تکمیل اور بعض زیرِ غور ہیں ۔ اور ایسی تجاویز جنہیں حکومت ہی زیرِ غور لا سکتی ہے ۔ ان کی جانب حکومت کو توجہ دلائی جا رہی ہے ۔

اب آپ یہ جائزہ ملاحظہ فرمائیں

۱۔ اس جائزے میں جن حضرات نے اپنے خیالات سے ہمیں استفادہ کا موقع دیا ہے ان میں سے ۸۶٪ کی رائے ہے کہ قومی زبان کے نفاذ و رواج کے راستے میں کوئی واقعی مانع نہیں ۔ اصل رکاوٹ نوکر شاہی کا مزاج ہے وہ ایسے پسند نہیں کرتا کہ انگریز پرستی کی اپنی روایت کو چھوڑ کر اردو کو اپنائے ۔ ممکن ہے بعض نوکر شاہی ایسے اپنے لئے عزتِ نفس کا مسئلہ بھی سمجھتے ہیں ۔ ان اہلِ علم کے خیال میں اردو ٹائپ رائٹر کے استعمال و رواج سے کارِ دفتری کی ایک سطح پر آسانی اور تیز رفتاری ضرور پیدا ہو جائے گی ۔ لیکن دفتروں میں بھی ایک خاص سطح تک تو تمام کام تحریری ہوتا ہے اس لئے ان کے نزدیک دفتری اصطلاحات کی کمی یا عدم دستیابی اصل مسئلہ نہیں ہے ۔ اول تو ہر جگہ اصطلاح کی ضرورت پیش نہیں آتی اور اگر کسی اصطلاح کا استعمال ناگزیر ہو تو اُسے انگریزی میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے ۔

ان اہلِ علم نے غیر مبہم اور واضح الفاظ میں اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ صدرِ مملکت کو چاہئے کہ وہ ایک آرڈیننس کے ذریعہ ایک مقررہ تاریخ سے تمام سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر میں قومی زبان میں کام کرنے کا حکم جاری فرما دیں ۔ قومی زبان کا نفاذ و رواج ہو جائے گا اور کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی ۔ نوکر شاہی کو جب تک اوپر سے ڈھیل ملتی رہے گی یہ مختلف بہانوں سے قومی زبان کے نفاذ کو ٹالتی رہے گی ۔ ان اصحاب کی رائے میں اصطلاحات مہیا ہو جانے اور اردو ٹائپ رائٹر آ جانے کے بعد بھی نوکر شاہی کے بہانوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا مثلاً وہ ایک مدت تک اردو ٹائپ کاروں کی عدم دستیابی اور پھر ان کی سست رفتاری اور کبھی ان کی غلط ٹائپ کاری کے بہانے قومی زبان کے نفاذ و رواج کو کھٹائی میں ڈالے رکھیں گے ۔ یا کم از کم اس کوشش میں ضرور مصروف رہیں گے ۔

۲۔ اہلِ علم میں سے ۷۹٪ حضرات نے انگلش میڈیم اسکولوں کی بندش، حوصلہ شکنی، قومی زبان کی تدریس ذریعہ تعلیم، قومی زبان میں امتحانات اور تحقیقی مقالات کی تیاری اور قومی زبان کے نصاب میں لائق اساتذہ سے مشوروں کی اہمیت پر زور دیا ہے ۔

(الف) ان میں سے بعض حضرات کا اصرار ہے کہ تمام انگلش میڈیم اسکول فوراً بند کر دئے جائیں ۔ بعض کا خیال ہے کہ اگر انہیں بند نہ کیا جائے تو یہ ضروری ہے کہ ان کا ذریعہ تعلیم اردو کر دیا جائے ۔ ان کے امتحانات اردو میں ہوں اور کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ ان کی نگرانی ہوتی رہے اور اس سلسلے میں مشنری اسکولوں کو بھی مستثنیٰ نہ کیا جائے ۔

ب ۔ بعض حضرات کا مطالبہ ہے کہ تمام گزیٹڈ اسامیوں کے لئے "دفتری اردو" کا امتحان لازم قرار دیا جائے ۔

ج ۔ متعدد اہلِ علم نے مشورہ دیا ہے کہ ملازمت کے لئے ہر جگہ اور ہر سطح پر بالمشافہ ملاقات (انٹرویو) میں

تبادلۂ خیالات، قومی زبان میں کیا جائے اور مقابلے کے تحریری امتحانات بھی اردو میں ہوں۔

(د) اس ضمن میں بعض اہلِ علم کی رائے ہے کہ پاکستان کی تمام جامعات میں تحقیقی مقالات (ایم۔اے، ایم فل، پی ایچ ڈی) قومی زبان میں پیش کرنے کی پابندی لگائی جائے۔ بعض خاص صورتوں میں انگریزی میں ان کا ترجمہ یا خلاصہ قبول کیا جائے۔ البتہ پاکستان کی صوبائی اور علاقائی زبان و ادب کے متعلق تحقیقی مقالات کو انھی زبانوں میں پیش کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

ھ۔ اس سلسلے میں یہ مشورہ بھی سامنے آیا ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ تک تمام مضامین کے اردو نصاب کی تیاری میں جہاں ان مضامین کے ماہرین سے استفادہ کی ضرورت ہو وہاں اردو زبان و ادب کے ماہرین سے بھی مشورہ کیا جائے تاکہ علمی و فنی نصابی کتابوں میں زبان و بیان کے لحاظ سے بھی کوئی نقص باقی نہ رہے۔

۳۔ اربابِ علم و مشاہدہ میں سے ۳۸ بزرگ حضرات نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اندرونِ ملک شائع ہونے والے اشتہارات، سڑکوں اور گلیوں کے نام، تمام اشتہاری نشان (بورڈ) ڈائرکٹریاں، ڈائریاں، کیلنڈر اور ملکی مصنوعات کا تعارفی ادب قومی زبان میں ہو۔ ان کے دیگر مطالبات یہ ہیں۔

(الف) ڈاک خانہ، ریلوے، سینما کے ٹکٹ اور موٹر گاڑیوں کے شناختی عدد قومی زبان میں ہوں۔

(ب)، دوائیں اور دیگر مصنوعات بنانے والے تمام غیر ملکی اداروں پر پابندی لگائی جائے کہ وہ اپنی جو اشیا پاکستان برآمد کریں ان کے نام، ان کی خصوصیات اور ان کے استعمال کی تراکیب ہماری قومی زبان میں ہوں۔ اگر یہ ادارے اس حکم کی پابندی نہ کریں تو انھیں اپنی مصنوعات پاکستان میں برآمد کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

ج۔ ملکی اداروں کو بھی آرڈی نینس کے ذریعے اس امر کا پابند کیا جائے کہ وہ اپنی ہر قسم کی مصنوعات کے نام قومی زبان میں لکھیں۔ اور ان کے تعارف اور ان کے استعمال کی تعلیم پر مشتمل اشتہارات اور کتابچے قومی زبان میں چھاپیں البتہ جو مصنوعات برآمد کریں ان کا تعارفی ادب قومی زبان کے ساتھ انگریزی یا اس ملک کی زبان میں شائع کر سکتے ہیں جہاں وہ برآمد کی جائیں۔ ایسے اداروں کے لئے ابتداءً انکم ٹیکس میں رعایت کا اعلان بھی کرنا چاہیئے۔

۴۔ ۳۰ بزرگ اہلِ علم نے دفتری اصطلاحات کی تدوین اور علوم و فنون کی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی ضرورت پر زور دیا جائے۔ اس سلسلے میں متعدد اہلِ علم کی سفارشات کی یہ دفعات بنتی ہیں۔

(الف) دفتری اصطلاحات کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ تمام اصطلاحات یکجا کر کے چھاپی جائیں اور اس ضمن میں سب سے ضروری بات یہ ہے کہ انھیں ارزاں اور سہل الحصول بنایا جائے۔

ب۔ مختلف علوم و فنون اور سائنسی کتابوں کا ترجمہ کرایا جائے اور وسیع پیمانے پر ان کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ ان کی زبان و بیان سادہ اور آسان ہو۔ ان کتابوں کا ترجمہ تو اصحابِ فن ہی سے کرایا جائے لیکن ان پر نظرِ ثانی اور زبان و بیان کی اصلاح کا عمل زبان و ادب کے ماہرین سے کرایا جائے۔

ج۔ اس سلسلے میں اردو صرف و نحو کے دونوں اجزا پر مشتمل ایک جامع اور تحقیقی قواعد کی کتاب کی ضرورت کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اسلوب میں پیچیدگی نہ ہو اور تفہیم آسان طریقے پر کرائی گئی ہو اور ایسی ہو کہ

طلبہ [illegible] کی . . . .

مادری زبان اردو نہیں ہے۔ وہ بھی بآسانی سمجھ سکیں
اس اہتمام کے باوجود کتاب جامع ہو اور ایسی ہو کہ اس
کے بعد قواعد کی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہ رہے۔

۵ - ۲۹ ہزار اہلِ علم نے دو مطالبے کئے ہیں۔

(الف) تمام سرکاری حکام اور اعلیٰ شخصیات پر یہ لازم کیا جائے کہ وہ سرکاری اور غیر سرکاری، رسمی اور غیر رسمی تقریبات اور ملاقاتوں میں قومی زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنائیں۔ اور کسی شدید ضرورت اور مجبوری کے بغیر انگریزی زبان استعمال نہ کریں۔

ب - مختلف محکموں، صوبوں اور مرکز کے مابین رابطہ کے لئے زبان اردو قرار دی جائے۔

۶ - ۱۹ ہزار اصحابِ علم نے یہ دو مطالبات کئے ہیں

(الف) ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ عدالتوں تک کارروائی اور فیصلوں میں اور اس سے متعلق اور ماتحت تمام دفتروں میں اردو کا استعمال کیا جائے۔

ب - ٹیلی ویژن سے انگریزی فلموں کا فوری طور پر خاتمہ کیا جائے۔ البتہ تعلیمی اور معلوماتی فلموں کو اردو میں ڈب کر کے) پیش کیا جائے۔

۷ ہزار اہلِ علم و اصحابِ قلم نے مطالبہ کیا ہے کہ حکومت کو چاہئے کہ وہ اردو کے ادبی اداروں اور ادیبوں مصنفوں اور شاعروں کی سرپرستی کرے۔

۸ - ۴ ہزار اصحابِ فکر و نظر نے مندرجہ ذیل مطالبات کئے ہیں۔

(الف) ملک کے تمام شہروں میں تفریح کے مقامات پر، بسوں کے اڈوں، ریلوے اسٹیشنوں وغیرہ پر قومی زبان کے استعمال کے لئے رغبت دلانے کے بورڈ آویزاں کئے جائیں۔ جن پر اردو پڑھو، اردو بولو۔ اردو لکھو وغیرہ کے جملے لکھے ہوں۔

ب - اردو ٹائپ رائٹر کا تمام سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر میں رواج عام کیا جائے۔

ج - اردو ٹائپ اور اردو مختصر نویسی کے تربیتی ادارے کھولے جائیں۔

د - قومی زبان کے نفاذ اور اس کے مسائل پر غور کرنے کے لئے حامیانِ قومی زبان کی ایک کل پاکستان قومی زبان کانفرنس بلائی جائے۔

ھ - قومی زبان کے نفاذ کیلئے تحریک چلائی جائے اور اس میں پریس کا تعاون حاصل کیا جائے۔

مرزا ظفر الحسن

اردو ہے جس کا نام

جب تک معاشرے میں انکل اور آنٹیوں ڈیڈی اور ممیوں کی تعداد بڑھتی رہے گی اردو کی ترقی کی رفتار گھٹتی رہے گی اور ایک وقت آئے گا جب بظاہر یہ تیز گام زبان واضح طور پر سست رو ہو جائے گی۔

جب تک تعلیمی انقلاب نہیں لایا جائے گا اور اولین مکتب سے جامعہ کی سطح تک اردو میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع نہیں کیا جائے گا نظری اور عملی اعتبار سے اردو ایک باوقار زبان نہیں بنے گی۔

جب تک ذرائع ابلاغ کو صدق دل کے ساتھ اردو کی اہمیت کا احساس نہیں ہوگا اور اس احساس کی بنا پر وہ ضروری اقدام نہیں کریں گے اردو وہیں رہے گی جہاں آج ہے ـــ اور آج وہ کہاں ہے ؟ ـــ بلکہ اندیشہ ہے کہ اس کا حلیہ اور مسخ ہوتا جائے گا۔

اردو بہت وسیع موضوع ہے جسے اس جیسے ایک مضمون کیا ایک ضخیم کتاب میں بھی سمیٹیں تو تمام اہم امور کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا۔ اس لئے ایک تو میں صرف تین عنوانات پر گفتگو کروں گا ـــ معاشرہ، تعلیمی انقلاب اور ذرائع ابلاغ ـــ دوسرے اس گفتگو میں بھی اختصار اور اشاروں سے کام لوں گا ورنہ یہ مضمون طویل ہو جائے گا۔

معاشرہ کوئی ٹھوس اور جامد شے نہیں ہے مختلف عوامل اس میں ردو بدل کرتے رہتے ہیں۔ اس تبدیلی کا اثر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں پر پڑتا رہتا ہے مجھے اپنا وہ زمانہ یاد ہے جب ٹیلی فون استعمال کرنے کی عمر کو پہنچا اور چاروں طرف اردو ہی اردو رائج دیکھی تو میں اور اس زمانے کے مجھ جیسے تمام نوعمر اور معمر ٹیلی فون کے نمبر اردو میں بتایا کرتے تھے آج آپ اگر ٹیلی فون نمبر انگریزی میں بتائیں تو دفتر کا چوکیدار اور گھر کا خانساماں سمجھ لے گا۔ اور لکھ لے گا۔ اور اگر اردو میں بتائیں تو اسے سمجھنے میں کافی الجھن ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ معاشرے کے دیگر افراد نے شروع ہی سے انگریزی نمبر رائج کر رکھے تھے اس لئے چوکیدار اور خانساماں انگریزی نمبروں سے آشنا اور اردو سے نابلد ہو گئے

مانا کہ پتلون انگریز کا لایا ہوا لباس ہے اور وہ اپنی زبان میں پینٹس کہتا ہے خواص اور عوام نے اردو گفتگو میں بھی لفظ پتلون کا استعمال ترک کر دیا تو ہر طرف پینٹس کہا جانے لگا۔ بلکہ اب تو پینٹ کہتے ہیں۔ درزی بھی وہی کہنے لگا۔ درزی پر یاد آیا۔ اب وہ حضرت ٹیلر یا

ٹیلر ماسٹر کہلاتے ہیں یا اصرار کرتے ہیں کہ انہیں ٹیلر کہا جائے ان کے نزدیک درزی کے مقابلے میں ٹیلر کوئی زیادہ محترم مخلوق ہے۔

میں انگریزی کا بالکل مخالف نہیں ہوں۔ مجھے مکمل احساس ہے کہ انگریزی بہت بڑی اور بین الاقوامی زبان ہے نہ اسے ترک کرنا ممکن ہے نہ مفید۔ مسئلہ انگریزی کا نہیں اردو کا ہے کہ ہم کیوں اور کس طرح اردو سے دور ہوتے جارہے ہیں اور یہ دوری کتنا عظیم قومی نقصان ہے۔

گھر میں ہونے والی گفتگو پر غور کیجئے۔ کیسی ملغوبہ زبان بولی جاتی ہے۔ ہر تیسرا چوتھا لفظ انگریزی کا ہوگا۔ ننھے بچوں کو "ٹاٹا" کہنا سکھایا جاتا ہے۔ خدا حافظ کہو تو ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ مجھے تسلیم ہے کہ انگریزی کا یہ چار حرفی لفظ خدا حافظ کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ مگر انگریزی لفظ میں جو معنویت اور خدا حافظ میں جو متبرکیت اور ہماری تہذیب وروایت ہے وہی تو اصل معاملہ ہے سہولت کی خاطر غیر اردو الفاظ قبول اور رفتہ رفتہ مشکل اردو الفاظ ترک کرتے جارہے ہیں۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا جارہا ہے اور اس کی زد میں پوری زندگی آرہی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اب انگریزی کی ضرب سے اردو کا بچنا بہت مشکل ہے۔

غور کرنے کے لئے ایک اور پہلو بھی ہے یہ کہ آخر چینی، جاپانی، روسی، انڈونیشیا، افغان، ترک، ایرانی اور عرب بچوں کو "ٹاٹا" کیوں نہیں سکھایا گیا اور وہ کیوں نہیں بولتے؟ اگر اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ڈیڑھ سو سال تک انگریزی کے زیر اثر رہے تو میں پوچھتا ہوں ہمارے اسی فیصد دیہاتی بھائی بھی تو اسی انگریز کے زیر تسلط رہے جس نے انگریزی رائج کی انکے بچے ٹاٹا کیوں نہیں کہتے اور سیکھتے؟ بچوں کے معاملات کو بچوں کا کھیل سمجھ کر نظر انداز کرتے رہنا ہمارا مزاج ہوگیا ہے۔

گھر سے نکل کر ذرا بازار کی سیر کیجئے۔ سیر سے پہلے اپنے گھر کے پھاٹک پر آویزاں اپنے نام کی تختی دیکھئے کس زبان میں لکھی ہوئی ہے؟ چند قدم آگے جاکر اپنے گھر کا نام ملاحظہ کیجئے۔ حفیظ منشن۔ تراب ولا۔ ہیپی ہوم۔ قرب وجوار کے شادی خانوں کے اسمائے گرامی پر نظر ڈال لیجئے۔ میرج گارڈن۔ ویڈنگ ولا اور ایسے ہی دوسرے نامعقول نام۔ دوکانوں کے بورڈ دیکھئے دوکانوں کے نام دیکھئے۔ "پلمبر" کی بیٹھک پر غور کیجئے "واشنگ کمپنی" کا مقابلہ "دھلائی گھر" سے کیجئے ٹھیلے پر "چاٹ سینٹر" لکھا ہوا دیکھئے۔ "بیوٹی پارلر" کا مقابل "آرائش جمال" یا "آرائش گیسو" سے کیجئے۔ معاشرے میں پڑھے لکھے لوگ بھی ہیں اور ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے بھی۔ ان میں بیشتر کی ذہنیت یہ ہے کہ انگریزی کا استعمال بہتر کاروبار کا سبب ہوگا۔ یا انگریزی شائستگی اور علمیت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسی معاشرے میں ایسے احباب بھی ہیں جنھوں نے کتاب محل، دانش کدہ، سہاگ گھر، پاپوش، پوشاک، نشیمن جیسے نام رکھے ہیں۔ نہ ان میں کوئی احساس کمتری ہے نہ ان کے کاروبار میں اردو کی وجہ سے کوئی خسارہ۔ کچھ لوگ کہتے ہیں نام میں کیا دھرا ہے!

پاکستان کے ابتدائی برسوں میں ایک ادارہ پاکستان ایمپلائز کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے نام سے بنایا گیا جس نے ایک بستی بسائی۔ بستی کا نام متذکرہ سوسائٹی کے انگریزی مخفف پی ای سی ایچ سوسائٹی پر رکھا گیا۔ نہ صرف انگریزی کا مشکل بلکہ لمبا نام ہونے کی وجہ سے لوگ صرف سوسائٹی کہنے لگے۔ سوسائٹی کے نام پر اور بھی بستیاں ہیں۔ جیسے سندھی مسلم سوسائٹی۔ ڈیفنس کوآپریٹو سوسائٹی، مگر صرف سوسائٹی کہیں تو لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ مراد پی ای سی ایچ سوسائٹی ہے۔ سابق وزیر اعلیٰ پیر الٰہی بخش کے نام پر ایک بستی آباد کی گئی پیر الٰہی بخش کالونی مروجہ نام سے اس کا نام پی آئی بی کالونی ہو گیا۔ اور اب تو صرف کالونی کہیں تو پی آئی بی یا پیر الٰہی بخش کالونی کا استعمال جاتا ہے تو جناب نام میں یہ دھرا ہے۔

ایک مرتبہ محترم ذوالفقار علی بخاری صاحب نے مجھے بتایا کہ پولیس والوں یا بلدیہ کے لوگوں نے ان سے کہا "یہاں گاڑی کھڑا کرنا منع ہے"۔ پورا ایک جملہ ہے آپ اسے کس طرح مختصر کریں گے؟ بخاری صاحب نے جواب دیا۔ "پارکنگ بند" مناسب ہوگا۔ مجھ سے رائے دریافت کی تو میں نے کہا اگر پیش نظر صرف اختصار ہے تو ٹھیک ہے مگر مجھے ڈر ہے کہ اختصار کی بیساکھی کی وجہ سے اردو لولی لنگڑی نہ ہوتی جائے پھر میں نے کہا اپنی طرف متوجہ نہ ہونے یا دلچسپی سے کوئی بات نہ سننے کو آجکل تو جوان "نو لفٹ" کہتے ہیں یعنی ہماری بات کو یا ہمیں "نو لفٹ کر دیا"۔ اس پر بخاری صاحب بہت ہنسے۔

مولوی عبدالحق صاحب کا نظریہ یہ تھا کہ انگریزی یا کسی اور زبان کا ایسا لفظ قبول کر لینا چاہیئے جو اردو کے مزاج کے مطابق ہے۔ اور اردو میں اس کا متبادل یا مترادف ثقیل اور مشکل ہے۔ جن دنوں حیدرآباد دکن میں اصطلاحات کے تراجم کا بڑا چرچا تھا اور اردو دانوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو کسی قیمت پر غیر اردو لفظ کو اور خاص طور سے انگریزی لفظ کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ لاؤڈ اسپیکر کے ترجمے "آلہ مکبر الصوت" پر مصر تھا۔ لاؤڈ اسپیکر اردو دانوں کے لیے کوئی آسان لفظ نہ تھا۔ مگر آلہ مکبر الصوت تو اس سے زیادہ ثقیل ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج اگر کوئی آلہ مکبر الصوت کہے تو ڈکشنری کی تلاش ہوتی ہے اور لاؤڈ اسپیکر کہیں تو عام لوگ بھی سمجھ جاتے ہیں۔ مولوی صاحب نے اپنی ڈکشنری میں لاؤڈ اسپیکر کے دو ترجمے دیئے ہیں۔ آواز رساں اور بھونپو۔ پہلا عام نہیں ہوا بھونپو کا مطلب سب سمجھتے اور استعمال کرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے ریڈیو کے ابتدائی دنوں میں میں نے "ساؤنڈ ایفکٹس" کا ترجمہ "صوتی اثرات" کیا اور حضرت نیاز فتحپوری کے نگار میں شائع ہونے والے اپنے کسی مضمون میں استعمال کیا تھا۔ ہر چند کہ آج ریڈیو کی اردو دنیا میں ساؤنڈ ایفیکٹس بھی کہا جاتا ہے مگر صوتی اثرات زیادہ مستعمل ہے۔ نشریاتی زبان کے لفظ اناؤنسر کا ترجمہ کرنے یا مترادف تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ لفظ اردو کے مزاج سے لگا کھاتا اور لکھنے اور بولنے میں آسان ہے اسی

طرح اور بہت سے الفاظ ہیں جو اردو کی ملکیت ہو گئے ہیں۔ اعتراض اور نقصان کی بات تو اس وقت کہی جاتی ہے اور کی جانی چاہیئے جب ہم اپنی زبان کو دھکا دیں اور غیر کی بولی سے محض شان، تساہل یا ہٹ دھرمی کی بنا پر پیار کریں۔

معاشرہ بھی بہت وسیع موضوع ہے ہماری معاشرتی زندگی کے جس پہلو پر آپ نظر ڈالیں تو آپ کو احساس ہوگا ——— اور احساس ضرور ہونا چاہیئے ——— کہ اردو کو ترک کر کے ہم ایسا نقصان کر رہے ہیں کہ آئندہ نسلیں اس کی تلافی نہیں کر سکیں گی۔ ہمارے دوست اور ممتاز افسانہ نگار سید انور ابھی حال ہی کی ایک ملاقات میں کہنے لگے آپ کو میرے تازہ ناول پر بہت اعتراض ہوگا۔ میں نے پوچھا کیوں یہ کہنے لگے میں نے اس میں انگلش ورڈز بہت یوز کئے ہیں۔ میں نے جواب دیا انگریزی الفاظ استعمال کرنے کی خاص ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ فرمایا۔ وائی ناٹ انگریزی تو انٹرنیشنل لینگویج ہے میں نے عرض کیا۔ بین الاقوامی زبان ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ضرورت بلا ضرورت ہم انگریزی الفاظ ہی استعمال کریں۔ اگر کوئی مفہوم ادا کرنے کے لئے اردو میں لفظ نہ ہو یا بہت مشکل لفظ ہو اور ہم انگریزی لفظ استعمال کر لیں تو وہ بات الگ ہے۔ میری بات کاٹ کر انور صاحب کہنے لگے نو نو نو آپ میری بات انڈر اسٹینڈ نہیں کر رہے ہیں۔ ان فیکٹ اردو میں انگلش مکس کی جاتی تو اس کا امپیکٹ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ مثلاً جہاں میں "شٹ اپ" لکھنا چاہتا ہوں آپ اردو میں کیا لکھیں گے میں نے کہا بک بک بند کرو۔

الفاظ اپنے ساتھ معنی ہی نہیں ذہنیت، پس منظر وغیرہ بھی لاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی آل اولاد بھی آتی ہے میری مراد لفظ کے مشتقات اور متعلقات دونوں سے ہے۔

اب درس و تدریس کی باتیں کریں۔ میں نے جس مکتب میں اپنے اولین درس لئے اسے مدرسہ وسطانیہ کہتے تھے۔ آج کی طرح ان دنوں پری پرائمری، پرائمری، وِیر سکینڈری اور ہائر سیکنڈری اسکول نہیں بلکہ مدرسہ تحتانیہ، مدرسہ وسطانیہ اور مدرسہ فوقانیہ کہلاتے تھے ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ ہم پہاڑے یاد کرتے اور کہانیاں سناتے تھے۔ آج کی طرح کوئی یہ نہ کہتا کہ دو کا ٹیبل سناؤ یا جیک اینڈ جِل کی اسٹوری سناؤ۔

مجھے احساس ہے کہ نظام تعلیم کو ہائر سکینڈری کے نقطے تک پہنچا دینے کے بعد اب مدرسہ فوقانیہ کی حیثیت سراب سے زیادہ بے یقینی ہو گئی ہے مگر فکر کی بات یہ ہے کہ اس سلسلے کا انجام کیا ہوگا۔ ہم نے تاریخ پڑھی ہے اب بچے ہسٹری پڑھ رہے ہیں۔ ہم جغرافیہ کہتے ہیں اور بچوں کی زبان پر نہ صرف جیاگرفی ہے بلکہ وہ پوچھتے ہیں یہ جغرافیہ کیا چیز ہے۔ غم اس کا ہے کہ یہ بچے انگریزی میں ٹھیک طرح جیاگرفی لکھ نہیں سکتے اور اردو میں جغرافیہ سمجھ نہیں پاتے۔

ہم جب جامعہ عثمانیہ پہنچے تو ہماری زبان اور ذہن کی پوری طرح تربیت ہو چکی تھی۔ ہم نے اردو

"گرامر" موجود ہی نہیں تو وہ کیا خاک "انگلش میڈیم" کا اسکول چلا سکتا ہے۔ اسی طرح کنڈرگارٹن اور مانٹی سوری طریق تعلیم کا بیڑہ غرق کیا گیا ہے۔ کوئی تعجب نہیں جو نام نہاد مانٹی سوری اسکول چلانے والوں کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ مانٹی سوری کسی مقام کا نام ہے یا کسی مرد یا خاتون کا۔ کنڈرگارٹن کو کنڈر گارڈن لوبتے ہوں گے۔

گرامر اسکول ہی کا ستیاناس نہیں مار گیا بلکہ اب اکیڈمی کی وبا پھیل گئی ہے۔ ننھے اور چھوٹے بچوں کے لئے اکیڈمی کراچی کا کارنامہ ہے۔ جس شہر یا شہروں میں ڈھلنے والے کھوٹے سکے کی ایک جانب "گرامر" اور دوسری طرف "اکیڈمی" کندہ ذریعہ تعلیم اور نظام تعلیم کی کیا بات کریں۔

انڈے اور چوزے کے سلسلے میں یہ خیال ستاتا ہے کہ انڈہ پہلے پیدا ہوا کہ چوزہ۔ اگر انڈہ پہلے پیدا ہوتا تو مرغی کہاں سے آئی۔ اگر چوزہ پہلے نکلا تو انڈہ کہاں اور کس کا تھا۔ ایسا ہی ایک مسئلہ اردو ذریعہ تعلیم کے باب میں پیدا ہوتا ہے۔ کچھ کہتے ہیں پہلی جماعت سے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اور جب پہلی جماعت کے صاحبزادے پڑھ چکنے اور ایم اے ایم ایس کی ڈگری لے چکے کے بعد اردو میں درس دینے کے لائق ہوں تو تب کالج اور جامعہ میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ دوسرے مکتب خیال کے لوگ کہتے ہیں سر دست تعلیم انگریزی میں دی جائے۔ البتہ طالب علموں کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ امتحان کے پرچوں کے جواب انگریزی میں دیں یا اردو میں۔

میں تعلیمی انقلاب کو فرار کی باتوں، لیت و لعل اور مصلحتوں وغیرہ کا واحد علاج سمجھتا ہوں۔ انقلاب اس طرح کہ زیادہ سے زیادہ ایک سال کی مدت میں تمام علوم و فنون کے اساتذہ اردو میں پڑھانے کی استعداد پیدا کر لیں اور پڑھانے لگیں ورنہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر لیں۔

زبان کے معاملے میں مدت میں جتنی توسیع کی جائے گی زبان اتنی ہی کمزور اور مخلوط ہوتی چلی جائے گی۔ جس طرح بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں پیدا ہونے والے بچے جو آج نوجوان ہیں اردو اور انگریزی دونوں میں کمزور ہیں۔ اسی طرح آٹھویں دہائی کے بچے ان نام نہاد "انگلش میڈیم" کے "گرامر" اسکول اور اکیڈمی میں پڑھ کر نہ گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے۔ مدرسوں، جامعات، نصابی کتب اور تدریس کے تمام متعلقہ امور میں جب تک فوری انقلابی اقدامات نہیں کئے جائیں گے زبان اسی طرح بگڑتی اور اس کے بولنے والے کو بگاڑتی رہے گی۔ توسیع اور تجربے کی پالیسی محض ایک دھوکہ ہے جو ہم دیتے رہے اور کھاتے رہے ہیں۔ یہ وہ نو من تیل ہے جو کبھی فراہم نہ ہوگا۔ اور اردو کی رادھا کبھی نہ ناچ سکے گی۔ جامعہ عثمانیہ کے اقدامات انقلابی تھے۔ اس کا تجربہ نہایت کامیاب رہا اس کے فارغ التحصیل اور خصوصاً انجنیئری اور طب کی اردو میں تعلیم حاصل کرنے والے انجنیئر اور ڈاکٹر اپنے اپنے پیشوں میں نہایت نامور اور محترم مانے گئے۔ ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی۔

اردو سے تعلق خاطر کا نہ یہ مطلب ہے کہ

انگریزی پر خطِ تنسیخ پھیر دیا جائے۔ نہ یہ مراد ہے کہ
پاکستان کی علاقائی زبانوں کو پروان نہ چڑھایا جائے پنجابی
سندھی، بلوچی اور پشتو کی ترقی نہ صرف ان زبانوں
بلکہ اردو کے لئے بھی ضروری ہے۔

ابلاغِ عام کے ذرائع میں اخبارات، ریڈیو
اور ٹی وی پر لکھنے کی بہت گنجائش ہے اور یہ گنجائش
وہ ذرائع ہی مہیا کر رہے ہیں۔ اکتوبر کے تیسرے ہفتے
کی کسی تاریخ کے ایک کثیر الاشاعت اردو روز نامے
کے صرف چار صفحوں پر میں نے ایسے پچاس انگریزی الفاظ
گنے جن میں سے بیشتر کے استعمال کا کوئی جواز نہیں تھا
مثال کے طور پر فور اسٹار جنرل، نمبر ون، نمبر ٹو، کرنسی
جج فلائٹ، آرمی، نیوی، ایئر فورس، سوانگ مشین، ڈیوٹی
پائیلٹ، میٹنگ، واٹر ٹینک، ٹیکس سسٹم، زونل ہیڈ،
اسکرپٹ، فارن برانچیں وغیرہ۔

ان پر تفصیل سے گفتگو کروں ان کے مترادفات
یا تراجم بتاؤں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اس کی
یوں بھی ضرورت نہیں ہے کہ مندرجہ بالا انگریزی الفاظ
کے مترادفات اور تراجم سے ہر اخبار ہی واقف ہے
جو اخبارات روزانہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتے
ہیں کیا یہ ان کی قومی ذمے داری نہیں ہے کہ انگریزی الفاظ
کے استعمال کے سلسلے میں وہ اپنے عملے کو متوجہ کریں اور
بتائیں کہ یہ بد مذاقی بھی ہے۔ اور اردو کی بدقسمتی بھی۔
اسلامی موضوعات پر جو خبریں اداریئے اور مضامین
اخبارات میں شائع ہوتے ہیں ان میں انگریزی الفاظ
استعمال کیوں نہیں ہوتے۔؟ اس کی وجہ صرف موضوع
نہیں بلکہ قلمکاروں کی حد درجہ احتیاط ہے۔ ہمارے
ممتاز کالم نگار، اپنی تحریروں میں اسی بے رحمی کے
ساتھ انگریزی کیوں نہیں استعمال کرتے۔؟ میں اس نتیجہ
پر پہنچا ہوں کہ قاری اور قلمکار دونوں انگریزی آمیزی کے
عادی ہو گئے ہیں۔ وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ جلد سے جلد
انہیں اردو کے ٹیکے لگائے جائیں اور ٹکیاں کھلائی
جائیں۔

ریڈیو کے پروگرام سن کر رائے دینے کے لئے مجھے
فراغتِ وقت نصیب نہیں پھر بھی تھوڑی بہت
فرصت نکال کر چند پروگرام اور خبریں سن لیتا ہوں
خبروں میں ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں کہ لاکھوں
کروڑوں اور اربوں کے حساب کو ملین میں تبدیل کر دیا
گیا ہے۔ پہلے تو یہ سوچنا ہے کہ کیا یہ ملین اور بلین کا
حساب ہمارے قومی مزاج کے مطابق ہے۔؟ پھر اس پر
غور کرنا ہے کہ ٹرانزسٹر کی ایجاد سے اب نشریات چھوٹے
چھوٹے دیہاتوں اور قصبوں میں بھی سنی جاتی ہیں۔ اس
لئے کیا وہ سامعین اس ملین کا حساب سمجھ سکتے ہیں۔ یہ
سامعین ایک دس اور پچاس کروڑ کی بات بھی سمجھ لیتے ہیں
مگر جب ایک کروڑ کو سو ملین دس کروڑ کو ایک ہزار ملین
اور پچاس کروڑ کو پچاس ہزار ملین کیا جائے گا تو کیا ان کی
سمجھ میں آ جائے گا۔؟ مجھے نہیں معلوم کہ ریڈیو اس
ملین کے چکر میں کیوں پڑا۔ انگریزی کی خبروں میں
تو خیر اس کا جواز نکال لیا جا سکتا ہے مگر اردو کی خبروں
کا یہ گورکھ دھندہ میری عقل قبول نہیں کرتی کہیں ایسا
نہ ہو کہ آج ایک ہزار ملین کہہ رہے ہیں اور کل یہ بجائے سرسام

کی صورت اختیار کرے تو "لے تھاؤ زنڈ ملین" کہنے لگیں۔ بخاری صاحب مرحوم نے ریڈیو کی اردو کو اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ اب ریڈیو کی رگوں میں جو خون دوڑایا جا رہا ہے وہ بخاری کے خونِ جگر کی طرح پاک نہیں ہے ریڈیو اور ٹی وی ایک ہی وزارت کے تحت ہیں مگر ٹیلی ویژن ریڈیو کی طرح ملین بلین کی باتیں نہیں کرتا دونوں میں کس کی پالیسی صحیح ہے؟ پردے پر اردو کی تائید میں دو تین فقرے لکھ کر زبان کو فروغ نہیں دیا جا سکتا۔

آل انڈیا ریڈیو اور بی بی سی سے نہایت دقیق اور سنسکرت آمیز ہندی میں خبریں نشر کی جاتی ہیں۔ اور جب ان اداروں کو بعض صورتوں میں ہندی الفاظ نہیں ملتے تو وہ انگریزی کا نہیں اردو کا سہارا لیتے ہیں۔ ہم یا تو ملین کی بات کرتے ہیں یا کہتے ہیں "زکواۃ چھ سو ہزار مستحقین میں تقسیم کی گئی۔" اس کے مقابلے میں آل انڈیا ریڈیو اور بی بی سی، "چھ سو ہزار نہیں بلکہ چھ لاکھ کہے گا۔ ہندی ہی نہیں ان نشری اداروں سے فارسی نشریات سنیئے آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ انگریزی سے کتنے دور ہیں۔

ہندوستان میں ٹیلی وژن کو "دوردرشن" کہتے ہیں۔ عام بول چال اور تحریر میں بھی اہل ہند ٹیلی وژن کے مقابلے میں دوردرشن ہی استعمال کرتے ہیں اور ہم ہیں کہ پاک ٹی وی یا پی ٹی وی کی رٹ لگائے ہوئے ہیں ہر چند کہ ترکیب "ریڈیو پاکستان" انگریزی ہے مگر جب سے یہ ادارہ کارپوریشن بنا ہے اس کا نام پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن قرار دیا گیا ہے اور مائکروفون پر اکثر یہی نام یا اس کا انگریزی مخفف "پی بی سی" لیا جاتا ہے جس کے مقابلے میں میں نشرگاہ کراچی یا نشرگاہ لاہور وغیرہ کہنا چاہوں گا۔

اس سے پہلے میں نے گھروں اور دوکانوں کے بورڈوں کا ذکر کیا ہے پرانے ناموں کی تبدیلی بہت بڑا کام ہے مقتدرہ قومی زبان یا کوئی اور ادارہ صرف اتنا کر دے کہ تمام سرکاری کالجوں اور ہزاروں اسکولوں کے ناموں کے بورڈ اردو میں لکھوا دے۔ بظاہر یہ ایک معمولی کام ہے مگر اس کا غیر معمولی نفسیاتی اثر پڑے گا اور بعد کے دنوں میں بورڈ اردو ہی میں لکھوائے جائیں گے۔ یہ مرحلہ طے ہو جائے تو پھر بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں، بینکوں اور بیمہ کمپنیوں سے کہا جائے کہ وہ اپنے نام نہ بدلیں صرف اپنے بورڈ اردو میں لکھوائیں جن میں وہ دیو قامت بورڈ بھی شامل ہیں جو عمارتوں کی چھتوں پر اور سڑکوں کے کنارے نصب کیے گئے ہیں۔

ہمارے ریڈیو سننے والوں اور ٹی وی دیکھنے والوں میں ایسے لوگوں کی تعداد کتنی ہے جو صرف انگریزی جانتے ہیں اور جن کے لئے انگریزی میں اشتہار نشر کئے جاتے ہیں مسئلہ زبان کا نہیں ذہنیت کا ہے۔ جسے جلد سے جلد بدلنے کی ضرورت ہے مجھے ٹی وی کا یہ اشتہار زیادہ عزیز ہے اور زیادہ عزیز کسی شخصیت کی وجہ سے نہیں زبان کی وجہ سے ہے کہ یہ میرے ملک کی زبان ہے انگریزی نہیں ہے۔

"بروک بانڈ کی گولڈ لیبل چا
خوشبو والی تے لذت والی"

معاشرے میں آنکھ کھولی اور اسی میں ہوش سنبھالا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کا تجربہ بہ قریب قریب کامیاب ہو چکا تھا قریب قریب میں نے اس لئے کہا کہ بیشتر اساتذہ ایسے تھے جنکی پوری تعلیم انگریزی میں ہوئی مگر وہ اردو میں درس دیتے تھے۔

پنجاب سے قاضی محمد حسین صاحب حیدرآباد تشریف لائے۔ اس وقت کے غیر منقسم ہندوستان میں قاضی صاحب جیسے کتنے مسلمان رینگلر تھے؟ پہنچنے کے دوسرے ہی دن سے بی ایس سی اور ایم ایس سی کے طالب علموں کو اردو میں ریاضی کے درس دینے لگے انہوں نے ایسے درس دے کر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی جیسا شاگرد پیدا کیا جو استاد کی طرح رینگلر ہوا اور حیدرآباد اور پاکستان کی چار جامعات کے وائس چانسلر کے منصب پر فائز ہوا۔ لاہور ہی سے دو اور لائق اصحاب بلوائے گئے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب اور ڈاکٹر مظفرالدین قریشی صاحب خلیفہ صاحب نے فلسفے اور قریشی صاحب نے کیمیا کی پوری تعلیم انگریزی میں حاصل کی تھی۔ مگر جامعہ کے اساتذہ مقرر ہوتے ہی یہ مضامین اردو میں پڑھانے لگے۔ دارالترجمہ کی کتابیں اس وقت تک تیار نہیں ہوئی تھیں مگر یہ بزرگ اردو میں پڑھاتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ اور ان کے ساتھی اساتذہ دیانت داری سے یہ محسوس کرتے تھے کہ مضمون کا حق انگریزی میں نہیں اردو اور صرف اردو ہی میں ادا کیا جا سکتا ہے انہوں نے اردو میں سوچا، محنت کی، اصطلاحات کے خود ترجمے کئے اور آسانی کے ساتھ درس دینے لگے۔ نہ ان کے پاس جادو کا کوئی ڈنڈا تھا اور نہ پاکستان کی طرح نام نہاد انگریزی کا ماحول۔ سیدھا سادہ اردو کا معاشرہ تھا۔ ہر طرف اردو کا راج تھا سرکاری زبان اردو تھی خود ان بزرگوں کا مزاج بھی مشرقی تھا اردو سے قریب، انگریزی سے دور اس لئے نہ انہیں پڑھانے میں کوئی جھجک ہوئی اور نہ پڑھنے والوں کو سمجھنے میں کوئی زحمت

تحتانی سطح سے لے کر جامعاتی سطح تک ہر مضمون کی اردو میں تدریس آج لوگوں کو کوئی معجزہ یا عقل کو حیران کر دینے والی بات محسوس ہو گی مگر میں اس دور میں تعلیم حاصل کر چکا ہوں اس لئے جانتا ہوں کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

کراچی میں چھوٹے بچوں کے بعض مدارس کے نام نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ مکتب نہیں تجارت کے مرکز ہیں مثال کے طور پر عیسائی راہبوں اور مذہبی شخصیتوں سے موسوم مدارس۔ سنیٹ میری۔ سنیٹ جوزف۔ یا دوسری نوعیت کے جیک اینڈ جل، للی پاپ، بابسیئے، ہوم سویٹ ہوم قسم کے مدارس۔ غیر منقسم ہندوستان میں سنیٹ جارجز گرامر اسکول نام کے مدارس مختلف شہروں میں تھے۔ ذریعہ تعلیم انگریزی تدریس سنیئر کیمبرج کے درجے تک، مدرسین انگریز یا تعلیم یافتہ اینگلو انڈین اور ہندوستانی عیسائی ہوتے امتحانات کے پرچے انگلستان میں تیار ہوتے۔ اور ان کی جانچ بھی بیشتر صورتوں میں وہیں ہوتی۔ اس شہر میں بھی ایک قدیم گرامر اسکول ہے۔ پیش نظر اس کے اعلیٰ معیار تعلیم نہیں بلکہ بھاری فیس تھی اس لئے تعلیم کے تاجر ولئے گرامر یا آل سنیٹس یا کسی دوسرے عیسائی راہب کا نام استعمال کر کے اسکول بنا ڈالے اور یہ سمجھے کہ یہ لیبی نام مقناطیس کا کام کرے گا۔ اسکول کے بورڈ پر "انگلش میڈیم" لکھ دیا تو والدین سمجھے کہ ان کے بچے واقعی انگریزوں کی انگریزی سیکھ جائیں گے۔ حال ہی میں ایک بورڈ پر نظر پڑی۔ اسکول کے نام میں "گرائمر" لکھا ہوا دیکھا جب اسکول چلانے والا گرامر اور گرائمر میں تمیز نہ کر سکے اور اسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ انگریزی میں کوئی لفظ

محمد یوسف زمان خان
بی ایس سی (پاس) فائنل

کہتے ہیں جسے اُردو

ایک تو ریختہ ہے سہل زبان
دوسرے جبکہ ہو شوخئ زبان !!!

زبان وہ ذریعہ ہے جس کی مدد سے انسان اپنی ذات اور اپنے ماحول کے تقاضے کے مطابق اظہار و اخذ کرتا ہے۔ خواہ یہ اظہار و اخذ کا عمل خاموشی سے علامات کی صورت میں لکھ کر کیا جائے یا آواز سے کلمات کی صورت میں بول کر کیا جائے۔ گویا زبان وہ بامعنی آوازیں یا علامتیں ہیں۔ جن کی وساطت سے انسان بصورت تقریر یا بصورت تحریر اپنے خیالات کا اظہار کرتا اور دوسرے سے بذریعہ سماع یا مطالعہ معلومات اخذ کرتا ہے۔

زبان انسان کا امتیازی وصف ہے۔ جبکی بنا پر وہ جمادات، نباتات اور حیوانات میں اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہے۔ اسی امتیازی وصف کی بنا پر اسے "حیوان ناطق" بھی کہا گیا ہے۔ جس کے لفظی معنی ہیں "بولنے والا جانور" اگرچہ دنیا کا ہر جانور کسی نہ کسی طرح بولتا اور آواز نکالتا ہے لیکن انسان کا نطق دوسرے جانوروں کی آواز کے مقابلے میں نہایت اعلیٰ معیار پر ہے۔ اس میں تخلیقی عقل کو دخل ہے۔ انسان کا بول بامعنی اور حجت و دلیل سے استوار ہوتا ہے۔ انسان آوازوں سے مافی الضمیر ادا کرتا ہے۔ تبادلۂ خیال کرتا ہے۔ اور تصورات قائم کرتا ہے۔ انسان کی زبان کسی دوسرے کی زبان سے معنوی، خیالی، عقلی، تخلیقی اور لفظی محاسن کی بنا پر ہر طرح فوقیت رکھتی ہے یہی اسکا شرف اور امتیاز ہے۔

انسان کا روز مرہ کے امتیازی کام نوشت و خواند، تحریر و تقریر، خط و کتابت اور تبلیغ وغیرہ ایسے افعال ہیں کہ جن کا زبان کے بغیر تصور ہی لغو ہے زبان نہ ہو تو تقریر و تحریر کیا معنی ہے؟

خط و کتابت و مراسلت کیا ہے؟
زبان کی آمد و رفت!
تقریر کیا ہے؟
چلتی ہوئی زبان!
تحریر کیا ہے؟
قلم و دوات کی امداد سے صفحہ قرطاس پر زبان کے نقوش!

تبلیغ کیا ہے؟
پرچار کرنے والی زبان!

زبان کو مٹا لیجئے۔ مراسلت کا وجود رہے گا۔ نہ نوشت و خواند کا، تحریر رہے گی نہ تقریر۔ تبلیغ بھی معدوم اور ہر قسم کے دعوے ختم۔

"زبان" زبان سے پیدا ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کی پیدائش کا وقت مقام اور فروغ پانے کی مدت مقرر نہیں ہوتی۔ مدتوں مختلف عناصر کام کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کی ترکیب تدریجی نشو و نما پاتی رہتی ہے جس سے نئی زبان کا جسم تیار ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کی پیدائش کا وقت، مقام اور اس کے فروغ پانے کی مدت کا تعین متعین طور پر نہیں کیا جا سکا۔ تاہم جو بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ اردو سرزمین پاک و ہند کی سب سے قدیم دیسی زبان پراکرت سے پیدا ہوئی ہے۔ مدتوں پراکرت مختلف عناصر سے متاثر ہوتی رہی۔ اور یہ تاثر بتدریج نشو و نما پا کر ایک نیا قالب تیار کرتا رہا۔ اس مدت کے بعد جب یہ نیا قالب تحریر و ادب کے سانچے میں ڈھل ڈھل کر نمایاں ہونے لگا۔ تو اس زبان کے وجود کا شعور ابھرا۔ اس کے بعد اسے لسانی قوت حاصل کرنے کے لئے کافی عرصہ لگا۔ گویا اردو پراکرت کی وہ ترقی یافتہ شکل ہے۔ جو پاک و ہند میں خارجی حملہ آوروں کی متعدد زبانوں کے ساتھ خلط ملط ہو کے پیدا ہوئی۔

سرزمین پاک و ہند میں سب سے پہلے آریہ آئے۔ اور اپنے ہمراہ سنسکرت لائے۔ بدھ مت کی تبلیغی ضرورت نے سنسکرت اور پراکرت میں میل جول پیدا کر دیا۔ بعد ازاں ترکی، عربی، ایرانی اور افغانی مجاہدین اسلام پہنچے۔ ان کے اختلاط سے اہل ہند و پاک کی زبان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافے ہوئے۔ اسلوب بیان متاثر ہوا۔ ترکیبوں میں جدتیں رونما ہوئیں۔ اور رفتہ رفتہ اس زبان کی صورت جدید رنگ اختیار کرنے لگی۔ اور یہی جدید رنگ مستقل صورت اختیار کر کے اس زبان کو "اردو" کا رنگ نام دینے کا باعث ہوا۔

اسلامی دور میں یورپی اقوام سے پرتگالی، انگریز اور فرانسیسی تاجروں کی حیثیت سے آئے۔ آہستہ آہستہ انگریز تخت و تاج پر قابض ہو گئے۔ ان کی زبان (انگریزی) حاکمانہ طرز عمل سے متاثر ہوئی۔ اور اردو کے ذخیرۂ الفاظ اور انداز تحریر میں بڑی حد تک اس کا رنگ جھلکنے لگا۔ مختصر یہ کہ موجودہ "اردو زبان" دراصل سرزمین پاک و ہند میں قدیم ملکی زبان ہے۔ جس نے یونانی، عربی، ترکی، ایرانی، افغانی، پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی تمدنوں کے اختلاط و اثر سے موجودہ صورت اختیار کی۔ اس زبان میں پاک و ہند کی تمام زبانوں کے الفاظ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زبان ہند و پاک کے کسی صوبے یا مقام میں اجنبی محسوس نہیں کی جاتی۔

"اردو" ترکی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی "لشکر" کے ہیں۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ اردو ایک لشکری زبان ہے۔ جو مسلمان بادشاہوں کے لشکروں یا لشکری بازار میں پیدا ہوئی۔ غلط ہے۔ اس کا سب سے قدیم نام ہندوی ہے[1] جسے آج کل "ہندی" کہا جاتا ہے۔ اور جو بھارت کی قومی اور سرکاری زبان ہے ہندی اور ہندوی کے علاوہ اس کا ایک قدیم نام ریختہ بھی ہے۔ ے

[illegible]

ایک تو ریختہ ہے سہل زباں　　ہے زبان ایک بے شمار مزے
دوسرے جبکہ ہو شوخئ بیاں　　اس کی ہر بات میں ہزار مزے

ریختہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں محمد حسین آزاد اپنی "آب حیات" میں فرماتے ہیں: "اس زبان کو ریختہ کہتے ہیں۔ کیوں مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا، سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی پریشان چیز۔ چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں۔ اس لئے اسے ریختہ کہتے ہیں"۔

زبان کے علاوہ ریختہ، اردو غزل کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اور یہ اس کا قدیم نام ہے ؎

کہنے لگے ریختہ جو کوئی سوداؔ کی طرح
اس پہ زمین سے ہوتا لوح و قلم واہ واہ

اردو کا ایک قدیم نام "زبان ہندوستان" یا "ہندوستانی" بھی ہے۔ ملاوجہی اپنے مشہور قصے "سب رس" کے آغاز میں فرماتے ہیں: "آغاز داستان، زبان ہندوستان" اردو کے لئے "اردوئے معلی" کا نام سب سے پہلے میر تقی میر کے نکات اشعار میں ملتا ہے۔ اور اسے اردو کہنے کی سند سب سے پہلے مصحفی کے اس شعر سے ملتی ہے ؎

خدا رکھے زبان ہم نے سنی ہے میرؔ و میرزاؔ کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفیؔ کہ اردو ہماری ہے

بعد میں یہ نام اس طرح رائج اور مقبول ہوا کہ اس کے تمام قدیم نام ترک ہوگئے اور اب اس کو اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

اردو بڑی اہم زبانوں کے سرچشموں سے سیراب ہوئی ہے۔ اس لئے اس کے اندر وہ تمام خوبیاں جمع ہیں جو ان زبانوں میں پائی جاتی ہیں ؎

اس میں فارسی کی شیرینی، عربی کی جامعیت، اور شان اور شوکت اور انگریزی کی روانی ہے۔ فرانسیسی کی طرح یہ جذبات کے اظہار میں مکمل ہے۔ اور جرمنی کی طرح اس میں رعب وجلال اور زور بھی موجود ہے۔ اور سب سے بڑھ کر خوبی یہ ہے کہ اسے کسی زبان سے بیر نہیں یہ تمام زبانوں کی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے یہی اس کی ہمہ گیری اور یہی اس کی مخصوص ادا ہے۔

اردو ایک عالمگیر زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ کیونکہ یہ دنیا کی متمدن ترین اقوام کی زبانوں سے تعلق رکھنے کے علاوہ ہر قسم کے خیال اور ہر نوع کی ذہنیت کی ترجمانی کرنے کے لئے صلاحیت اور موزونیت رکھتی ہے۔ اردو زبان میں اعلیٰ معیار کی تینوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہ زبان فصیح بھی ہے، سلیس بھی اور وسیع بھی۔ فصیح اس طور پر کہ اس زبان میں لطیفہ گوئی اور انشاء پردازی ہو سکتی ہے۔ متکلم، سامع اور قاری مزے لے سکتے ہیں۔ اور اس کے الفاظ سماعت پر گراں نہیں گزرتے۔ سلیس اس لئے کہ اس لفظ میں طبعاً کوئی لفظ ثقیل اور مشکل نہیں۔ اس کے اپنائے ہوئے الفاظ نہایت سادہ اور سہل ہیں۔ سمجھنے اور سمجھانے میں دقت نہیں ہوتی۔ مفہوم الفاظ کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوتا۔ اور مطلب نہایت آسانی اور سہولت سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ وسیع اس لحاظ سے کہ اس میں ہر قسم کے خیال کو ادا کرنے کے لئے بکثرت اور غیر محدود الفاظ میں موجود ہیں۔ اس کا دامن کوتاہ نہیں۔ بحالت مجبوری دوسری زبانوں کے الفاظ اپنا سکتی ہے۔ اردو دلچ

فنی حقائق کو واضح طور پر بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس میں ہر قسم کے مضمون کو بہ سہولت سپردِ قلم و زبان کیا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ ایک سیدھی سادی پرشوکت، درخشاں اور مکمل زبان ہے جو دیگر زبانوں کی خامیوں سے یکسر مبرا ہے۔

اردو کا موجودہ رسم الخط "خطِ نستعلیق" ہے۔ تاہم اردو ٹائپ رائٹر میں نستعلیق کی جگہ "نسخ" ہی استعمال ہوتا ہے۔ ان دونوں کی اصل وہ عربی رسم الخط ہے جو خود فنیقی رسم الخط سے ماخوذ ہے۔

ایک مکمل رسم الخط میں چار خوبیاں ہوتی ہیں۔ زبان کی ہر آواز کے لئے ایک مخصوص علامت ہوتی ہے۔ ہر آواز واضح طور پر ادا ہوتی ہے۔ صورت کے لحاظ سے وہ رسم الخط جاذبِ نظر ہوتا ہے۔ اور عملی لحاظ سے سہل ہوتا ہے۔ اردو رسم الخط میں چاروں خوبیاں موجود ہیں۔ اس لئے ایک مکمل رسم الخط ہے۔ اس میں پچاس حروف تہجی ہیں۔ جس میں سے ۳۵ مفرد اور ۱۵ مرکب حروف ہیں۔ مرکب حروف دراصل مفرد حروف کے ساتھ ہائے مخلوطی شامل کر کے مختلف آوازوں کی ادائیگی کے لئے بنائے گئے ہیں۔ مثلاً بھ، پھ، تھ، ٹھ وغیرہ

اردو رسم الخط کی چند منفرد خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

اردو کے رسم الخط میں دوسری زبانوں کی تمام مخصوص آوازیں صحیح طور پر ادا کر سکتے ہیں۔

اردو کے حروفِ تہجی نہایت احتیاط کے صحت کے ساتھ آوازوں کی ترجمانی اور نمائندگی کرتے ہیں۔

اردو کے بیشتر حروف پر صرف چند نقاط کی کمی بیشی کر کے مختلف حروف کی شکلیں بنائی جا سکتی ہیں یعنی اس میں شکلوں کی بھرمار نہیں ہے۔

اردو زبان میں تین اعراب اور تین حروفِ علّت (ا و ی) سے سارا ترکیبی کام بڑی خوش اسلوبی سے چلتا ہے۔ اور ان کے ساتھ عربی سے تنوین و تشدید لینے کی وجہ سے اردو رسم الخط میں حد درجہ جامعیت اور اختصار پیدا ہو گیا ہے۔

اردو رسم الخط نے قریب المخرج آوازوں کا امتیاز مختلف حروف سے قائم رکھا ہے۔

لفظ میں حروف کے سرے ملا کر لکھے جاتے ہیں۔ جن سے الفاظ مختصر ہو جاتے ہیں۔ جگہ تھوڑی گھیرتے ہیں اور لکھنے میں وقت بھی زیادہ صرف نہیں ہوتا۔

اردو الفاظ کو قریب قریب ملا کر بھی لکھا جائے تو پڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

تمت بالخیر

سیما فتح محمد خان
سالِ اوّل

تحریک بقائے اردو

قصرِ پاکستان کی بنیاد میں پہلی اینٹ اردو نے رکھی۔ (بابائے اردو مولوی عبدالحق)

پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ کا آغاز وہاں سے شروع ہوا جہاں سے اردو کے تحفظ کی مہم کا آغاز ہوا اردو برصغیر کے تمام رہنے والوں کی ایسی مشترک زبان رہی ہے۔ جو ان کی مشترک تہذیب کی علامت سمجھی جاتی ہے اور اتحاد کے قیام کا سب سے اہم ذریعہ بھی ہے۔ اگر مسلم لیگ کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جب بھی اردو کے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس کے رہنما اور زعما اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ آگے آتے رہے۔ اس طرح اردو مسلم ثقافت کی واضح علامت بنتی گئی۔ اور جب اس ثقافت کی حفاظت کے لئے نظریۂ پاکستان وجود میں آیا تو اسی اردو نے تحریک کو سہارا دیا۔ مسلم لیگ اور اردو لازم و ملزوم بن گئے۔ اجلاس عام کو چھوڑ دیا جائے تب بھی اس کے خصوصی سالانہ اجلاس کی کاروائیاں اردو میں ہوتی رہیں۔

قائدِ اعظم اپنے مخصوص پس منظر کی وجہ سے اردو سے زیادہ واقفیت نہ رکھتے تھے۔ لیکن انہیں یہ زبان کسی سے کم عزیز نہ تھی۔ اردو زبان مسلمانوں کی تحریکات اور مسلم لیگ کی جان رہی۔ جہاں اس کا لوہا منوانے کے لئے ہندو اور انگریزوں سے جنگ کرنی پڑی وہاں کبھی کبھی اپنوں سے بھی نوک جھوک ہوئی۔

میں اردو زبان کی تعریف میں یہ کہنا چاہوں گی کہ اردو کے علاوہ کوئی عنصر ایسا نہیں جس نے قومی جذبات اور افکار کی تہذیب میں اتنا بڑا کردار ادا کیا ہو۔ یہی وہ واحد زبان ہے۔ جو ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ طبقوں کے درمیان بولی جاتی ہے۔ اردو زبان کی موجودگی میں دوسری زبان تلاش کرنا بہتی گنگا کے ہوتے ہوئے پیاس بجھانے کے لئے دوسرا کنواں کھودنے کے مترادف ہے۔ اردو زبان مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ زبان ہے۔ ہندوؤں نے بولنے اور سمجھنے کے لئے اردو کو مسلمانوں کی طرح استعمال کیا بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کی جسارت کروں گی کہ ہندوستانی آبادی کے ان قابل لحاظ عنصر کے باہمی اشتراک کا نتیجہ ہی اردو زبان ہے اردو زبان کو اگر بین الاقوامی زبان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ زبان ہمالیہ سے لے کر کیپ کامرون تک اور ستلج سے لے کر گنگا کے دہانے تک ہی نہیں بلکہ اور بھی دور افتادہ علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

دراصل مجھے ایسے موضوع پر تحریر کرنا ہے جو عرصہ دراز سے تنازعہ کا سبب ہے اور اپنی اہمیت اور دور رس نتائج کی بنا پر پاکستان کے تعلیم یافتہ ذہنوں کو سب

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

اردو اور علاقائی زبانوں کا مسئلہ

زبان، انسان کی سماجی اور معاشرتی ضرورتوں کی ایجاد ہے۔ ہر زبان اپنی ارتقائی منزلیں سماجی زندگی ہی کے سہارے طے کرتی ہے اور اس کے زیرِ اثر اس کی صورت و معنی میں یہ تمام تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ کسی زبان کے عروج و زوال کی داستان کو دراصل کسی قوم کے عروج و زوال کی تاریخ سمجھنا چاہیئے۔ بات یہ ہے کہ زبان بھی اپنے بولنے والے کی طرح اپنے سماجی محرکات و عوامل کی پابند ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جس طرح افراد یا کسی قوم اور ملک کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ہمسایہ ملکوں یا قوموں سے بلکہ دور دراز کے ملکوں اور قوموں سے بھی زیادہ سے زیادہ تعلقات و روابط قائم کرے۔ بلکہ اسی طرح کسی زندہ رہنے والی زبان کے لئے بھی ضروری ہے کہ دوسری زبانوں سے اس کا ربط و ضبط بڑھتا رہے اور ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ اور ترجمے کی راہیں کشادہ ہوتی رہیں۔ اس کے بغیر نہ کوئی قوم بین الاقوامی مسائل میں اپنا کردار ادا کرسکتی ہے اور نہ کوئی زبان۔ اس کے لئے زبانوں کا ایک دوسرے سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ترقی سے ترقی یافتہ زبان بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ دوسری زبانوں کے اثرات یا الفاظ سے یکسر خالی ہے۔ اردو زبان بھی اس قانونِ فطرت سے مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ اس کی تو بنیاد ہی آس پاس کی مختلف زبانوں یعنی پنجابی، شورسینی، سندھی، پشتو، بلوچی اور سرائیکی وغیرہ کے اشتراک پر رکھی گئی ہے۔ بعد میں اس نے عربی، فارسی، انگریزی اور ترکی کے بھی بے شمار الفاظ اپنے اندر جذب کر لئے اور آج وہ اپنے مزاج اور اپنی ساخت کے لحاظ سے زبانوں کی ایک ایسی انجمن ہے جس میں شرکت کے دروازے ہر زبان کے الفاظ پر یکساں کھلے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر پاکستانیوں کے لئے اردو کی سبھا ایک ایسی سبھا ہے جس میں ہر علاقے کی زبان کے بول صاف پہچان میں آجاتے ہیں۔ اور ہر شخص کلی طور پر نہ سہی جزوی طور پر سہی یہ ضرور محسوس کرنے لگتا ہے کہ اردو کا خمیر جن اجزاء سے تیار ہوا ہے اس میں بعض اجزا اس علاقے کے بھی شامل ہیں۔ جزو کل کا یہ تعلق معمولی نہیں ہے غیر معمولی ہے بقول خواجہ میر درد۔

ہر جزو کو کل کے ساتھ بہ معنی ہے اتصال
دریا سے وہ جدا ہے پہ ہے، غرقِ آب میں

اردو اور علاقائی زبانوں کا رشتہ دراصل ایک ہی خون ایک رنگ و نسل، ایک ہی آسمان، ایک ہی زمین، ایک انداز فکر، اور ایک ہی طرز ادا کا رشتہ ہے۔ دورِ حاضر سے لے کر قدیم تر زمانے تک سُراغ لگائے چلے جایئے یہ رشتے پوری طرح واضح ہوتے چلے جائیں گے۔ صاف اندازہ ہوجائے گا کہ اردو اور علاقائی زبانیں ایک دوسرے کی حریف و رقیب نہیں بلکہ عزیز و رفیق ہیں۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے یا اردو نے کسی علاقائی زبان کے پیٹ سے جنم لیا ہے اور نہ کوئی علاقائی زبان اس کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ لسانی نقطۂ نظر سے ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔ زبان سے زبان جنم نہیں لیتی بلکہ سماجی، علاقائی اور معاشرتی ضرورتوں سے کبھی ایک اور کبھی بیک وقت کئی زبانیں وجود میں آجاتی ہیں۔ پاکستانی علاقے کی صورتِ حال بھی یہی ہے یعنی اردو اور دوسری علاقائی زبانیں ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہیں۔ ایک ہی قسم کے

ماحول میں انہوں نے یکے بعد دیگرے جنم لیا اور ایک ہی قسم کی فضا میں پروان چڑھی ہیں۔ ان میں جو مشابہت اور مماثلت نظر آتی ہے وہ اسی خاص رشتے کے سبب ہے۔

اردو کے بارے میں ایک غلط فہمی کو بہت ہوا دی گئی ہے وہ یہ کہ اردو کا رشتہ مقامی یا علاقائی زبانوں سے اتنا استوار نہیں جتنا کہ بعض بیرونی زبانوں سے ہے۔ یہ بات کسی نقطۂ نظر سے بھی صحیح نہیں ہے۔ اردو کا اصولی نظام اس کے جملوں کی ساخت، قواعد کے بیشتر اصول اور بول چال کا لب ولہجہ، سب پر مقامی اثرات کا غلبہ ہے۔ اردو کے بعض علمی و ادبی شعبوں پر یقیناً فارسی اور عربی کا گہرا اثر ہے لیکن ان اثر و تاثیر کا تعلق اردو زبان کے مزاج یا باطن سے نہیں بلکہ اس کی اوپری سطح سے ہے۔ اردو شاعری نے وزن بحر اور بعض اصنافِ سخن یقیناً عربی فارسی سے لی ہیں۔ لیکن اپنے اثر لب ولہجہ اور موضوع کے اعتبار سے اردو کا رنگ و آہنگ عربی فارسی سے بہت الگ رہا ہے حتیٰ کہ اس علاقے میں عربی و فارسی میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اسے بھی سبک ہندی کا نام دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ اردو پر عربی و فارسی کے اثرات، مقامی زبانوں کے اثرات سے علاقائی زبانوں کے اثرات سے قوی تر ہیں صحیح نہیں ہے۔ اردو زبان کا کینڈا شروع ہی سے مقامی یا دیسی رہا ہے، اس نے عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی سب سے حسب ضرورت فائدہ اٹھایا ہے یا ہر زبان کے بے شمار الفاظ اپنے اندر جذب کر لیے ہیں لیکن ان انجذاب، کیفیت کے اعتبار سے ہمیشہ علاقائی یا مقامی زبانوں سے متاثر رہا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات قابلِ توجہ ہے اردو میں جو الفاظ دوسری زبانوں سے آئے ہیں وہ صرف اسما تک محدود ہیں۔ ایک وقت تھا کہ مختلف علوم وفنون کے بہت سے اسم عربی فارسی سے لیے گئے تھے۔ آج ریڈیو۔ ٹی وی۔ ہوائی جہاز اور دوسری مشینوں کے توسط سے ایسے بے شمار الفاظ انگریزی سے آ گئے ہیں ان الفاظ سے صرف پڑھے لکھے لوگ ہی نہیں بلکہ ایک معمولی میکینک اور ٹیکنیکل اداروں کا مزدور بھی بخوبی واقف ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اردو میں دخیل الفاظ کا یہ سلسلہ صرف اسما تک محدود رہا ہے۔ دوسرے قسم کے الفاظ یعنی فعل و حرف (verb and Preposition) وغیرہ سارے کے سارے مقامی ہیں

اسما کے سلسلے میں بھی ایک وضاحت ضروری ہے۔ عربی و فارسی کے جو الفاظ مستعمل ہیں ان میں بھی بیشتر کا تعلق مخصوص سطح کی علمی و ادبی زبان سے ہے۔ روزمرّہ کی گفتگو میں خواہ اس کا تعلق عام آدمیوں سے ہو یا خاص سے، زیادہ تر مقامی الفاظ ہی استعمال ہوتے ہیں۔

بطور مثال شکم، انگشت، چشم، گوش اور دست کے الفاظ ہی کو لے لیجئے۔ یہ فارسی سے آئے ہیں اور اردو میں مستعمل ہیں لیکن ان کا مصرف صرف علمی و ادبی زبان میں ہوتا ہے۔ روزمرّہ کی بات چیت میں عام خاص سب شکم کی جگہ پیٹ انگشت کی جگہ انگلی چشم کی بجائے آنکھ، گوش کی جگہ کان اور دست کے بجائے ہاتھ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے اردو میں مفرد بولے ہی نہیں جا سکتے۔ ان کو استعمال کرنے کے لیے انہیں اسی قسم کے دوسرے الفاظ سے مرتکب کرنا پڑتا ہے جیسے شکم سیر، انگشت بدنداں، گوش وہوش، چشم عبرت اور دست کرم

وغیرہ ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مرکبات کی تخلیق اور ان کا استعمال ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اردو نے عربی و فارسی یا انگریزی و ترکی سے جو اسماء لئے ہیں ان میں سے جو اردو کے مزاج کے موافق نہیں تھے انہیں خراد پر چڑھا کر مزاج کے موافق بنا دیا گیا ہے۔ راؤنٹر اور لکشمن اردو میں راون اور لچھمن ہو گئے ہیں۔ آرڈلی اور بیرنگ کو اردلی اور بیرنگ کر لیا گیا ہے۔ سعید اور جدید کا تلفظ سید اور جدید ہو گیا۔ تاریخ یا اردو بنا لینے کا یہ عمل صرف تلفظ تک محدود نہیں بلکہ الفاظ کے معنی، املا، واحد جمع اور تذکیر و تانیث کے اصول سب میں اسی طرح کا تصرف کیا گیا ہے۔ حروف تہجی سے لے کر الفاظ کی ساخت، جملوں کی بناوٹ، صرف و نحو کے قاعدے، الفاظ کے استعمال اور فصاحت و بلاغت تک سب میں اردو کا اپنا ایک منفرد اصول اور مخصوص لب ولہجہ ہے۔ وہ کسی بیرونی زبان کی مقلد یا تابع نہیں ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا کہ اردو کا تعلق کسی بیرونی زبان سے ہے یا اس کی جنم بھوم، علاقائی زبانوں سے الگ کہیں اور ہے کسی طرح درست نہیں ہے اردو نے بھی اس سرزمین میں جنم لیا ہے اس لحاظ سے اسے بھی بدیسی نہیں علاقائی کہنا چاہیئے۔ یہ ضروری ہے کہ اردو کے اثر و نفوذ کا علاقہ، علاقائی زبانوں کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔ اس کی یہی بڑائی اردو کو دوسری بین زبانوں یعنی بلوچی، سندھی اور پشتو وغیرہ سے بڑا بنا دیتی ہے۔ اس بڑائی پر اردو کو فخر کرنے اور علاقائی زبانوں کو رشک کرنے کا حق ہے۔ لیکن اس فخر و رشک کی بنیاد، نفرت و تعصب پر نہیں اخوت اور محبت پر ہونی چاہیئے۔

میں نے عرض کیا کہ اردو اور دوسری علاقائی زبانوں کی جنم بھوم ایک ہی ہے۔ اردو۔ بلوچی، سندھی۔ پنجابی، پشتو سرائیکی سب ایک ہی قسم کی تہذیبی زندگی، ایک ہی قسم کی معاشرت اور ایک ہی قسم آب و ہوا کی زائیدہ پروردہ ہیں۔ ان کے ظاہری خدوخال ایک دوسرے سے کچھ الگ سہی لیکن باطن میں ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ ان سب کی روحوں پر اسلامی تہذیب و تمدن اور صوفیائے کرام کے احساس کا سایہ ہے۔ ان کے سرمایہ علم و ادب اور مزاج و اسلوب میں بھی ایسی قدریں مشترک ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض مفاد پرست حلقوں کی طرف سے اردو اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور انہیں ایک دوسرے کا حریف و رقیب ثابت کرنے کی شعوری کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ کوشش چونکہ ساری زبانوں کے حق میں غیر مفید اور غیر فطری ہیں اس لیے کامیاب نہ ہونگی۔ علاقائی زبانیں اردو سے بہت کچھ لے رہی ہیں اور اردو علاقائی زبانوں کی اثر پذیری کی رفتار بھی روز بروز تیز ہوتی جا رہی ہے۔

اردو اور علاقائی زبانوں کو باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے قریب تر آنے کا موقع دراصل اس جمہوری نظام نے دیا ہے جس میں عوام خود اپنے تقدیر خالق و مالک حکمران عوام کی خواہشوں کے تابع بنتے جا رہے ہیں۔ لیکن سبھی زبانوں کے ارتقاء کی راہ میں کسی فرد یا ادارے کی حاکمیت کبھی حائل نہیں ہو سکتی ہے۔ زبانوں کا تاریخی مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں زندگی کے تقاضوں کے مطابق

بنا بر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کا لب و لہجہ عہد بہ عہد بدلتا رہتا ہے۔ بہت سے الفاظ متروک و مردود ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی جگہ نئے جاندار الفاظ خود بخود جگہ پا لیتے ہیں۔ یہ سارا عمل عوامی سطح پر انجانے طور پر ہوتا ہے۔ زبان کی تراش خراش اور حذف و اضافہ میں کسی خاص شخص گروہ یا علاقے کی حاکمیت کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ ناسخ نے بعض الفاظ متروک قرار دیئے تھے اور اپنے شاگردوں کے ذریعہ ایک طرح کی تحریک بھی چلائی تھی لیکن یہ تحریک چونکہ غیر فطری تھی اس لئے کامیاب نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ جن الفاظ کو انہوں نے متروک قرار دیا تھا ان میں سے کئی لفظ خود انہیں کے کلام میں لاشعوری طور پر داخل ہو گئے۔ دوسروں پر تو اس کا بہت ہی کم اثر ہوا۔ بعض شہنشاہوں کی طرف سے شراب کو رام رنگی اور سنگترہ کہنے کا حکم صادر ہوا لیکن عوام نے اسے پسند نہ کیا۔ سنگترہ اردو کے مطابق سنترہ کر لیا گیا۔ رام رنگی اور رنگترہ کہنے پر رضامند نہ ہوئے۔

پاکستان کے سابق صدر محمد ایوب خان مرحوم نے صبح و شام ریڈیو سے نشر کرایا مغربی پاکستان کو پچھمی پاکستان اور مشرقی پاکستان کو پوربو پاکستان کہا جائے لیکن کسی نے ایک دسنی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زبان پر کسی کی اجارہ داری اور حکمرانی کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ آج کے جمہوری دور میں جیسے جیسے ایک عام شہری کو وزیر اعظم سے، ایک ہاری کو زمیندار سے، ایک مزدور کو کارخانے کے مالک سے، اور ایک کسان کو جاگیردار سے ملاقات کرنے کے امکانات روشن ہوتے جا رہے ہیں اردو اور علاقائی زبانوں کے ملاپ اور باہمی اشتراک کی راہیں بھی ہموار ہوتی جا رہی ہیں۔ علاقائی زبانوں کا حلقۂ اثر بڑھ رہا ہے۔ ان کے ذخیرہ الفاظ، موضوعات اور اسالیب بیان سب پر اردو کا اثر بہت نمایاں نظر آ رہا ہے۔ اردو پر علاقائی زبانوں کے اثرات پوری طرح رونما ہو رہے ہیں۔ اس کے اسلوب لب و لہجہ میں خاص تبدیلی آ چکی ہے۔ یہ تبدیلی کسی کو گوارا ہو یا ناگوار عوام کی حاکمیت اس کی پرواہ نہیں کرتی۔ سمجھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ زبان اور اس کے لب و لہجہ میں عہد بہ عہد اور مقام بہ مقام تبدیلی ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہی تبدیلیاں جب مقبول عام حاصل کر لیتی ہیں تو پھر یہ معیاری زبان کا جزو بن جاتی ہیں۔

اردو زبان موجودہ سماجی زندگی اور علاقائی زبانوں کے زیر اثر کیا رنگ و روپ اختیار کر رہی ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے چند جملے دیکھیے۔

۱. اس نے آج بہت بور کیا۔
۲. حامد کی تقریر نے جلسے میں بے سبب بوریت بپا کر دی۔
۳. آیا بڑا ڈلّا کہیں کا۔
۴. میں آپکی واداگیری نکال دوں گا۔
۵. اس نے خواہ مخواہ پھڈا کھڑا کر دیا ہے۔
۶. ایک روپے کا کھلا چاہیے۔
۷. اس جگہ محمود کے بازو میں حامد کی دکان ہے
۸. کاغذ کے بیوپاری نے کہا مال خلاص ہو گیا۔
۹. اس نے ایک جھوٹا بیان داغ دیا اور کہا سیاست میں سب چلتا ہے۔

ان جملوں میں بور، بوریت، ڈلّا، واداگیری، پھڈا، کھلا، بازو، خلاص اور چلتا ہے۔ ایسے الفاظ ہیں جو

آئے دن سُنے اور بولے جاتے ہیں۔ اب محض اس بنا پہ کہ یہ الفاظ اردو میں پہلے سے موجود نہ تھے یا فلاں علاقے یا فلاں طبقے میں استعمال نہیں ہوتے۔ کون ہے جو انہیں غیر اردو قرار دے گا۔ ان الفاظ نے معاشرتی زندگی میں پوری طرح جڑ پکڑلی ہے۔ اور اب انہیں عام و خاص سبھی استعمال کر رہے ہیں۔ نئے الفاظ کے ساتھ ساتھ پرانے الفاظ بھی نئے معنوں کے ساتھ اردو میں جگہ پا رہے ہیں۔ چند جملے دیکھئے

۱۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے تسلی سے کام کرو۔
۲۔ آرام آرام سے چلو ورنہ ٹھوکر کھا کر گر و گے۔
۳۔ میرا دوست آج کل فلاں جگہ کمشنر لگا ہوا ہے۔
۴۔ آپ نے بہت کم کھایا کچھ اور لیجئے۔
۵۔ محمود صاحب آپ کو ساتھ والے کمرے میں مل جائیں گے۔

ان جملوں میں تسلی۔ آرام، کمشنر لگا ہوا ہے۔ کچھ اور لیجئے اور ساتھ والے کمرے میں، کے الفاظ اور فقرات پر غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ یہ اپنے معنی کس طرح بدل رہے ہیں۔ اس طرح کے اور نہ جانے کتنے الفاظ و فقرات اور محاورات اور اسالیب میں جو مقامی زندگی اور علاقائی زبانوں کی ہے اردو کی معرفت ان کا دامن وسیع سے وسیع تر اور ان کا سرمایہ وقیع سے وقیع تر بنتا جا رہا ہے۔

باہم اخذ و استفادے کا یہ نیا سلسلہ چونکہ آزادانہ ماحول میں شروع ہوا ہے اس لیے یقین ہے کہ کسی طبقے کی اجارہ داری اب زیادہ عرصے تک باقی نہ رہے گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ علاقائی زبانیں اور اردو اپنے باہمی رشتوں کو سمجھیں اور اپنے اپنے منصب کو پہچانیں۔ ساری علاقائی زبانیں اپنی اپنی جگہ ہم ہیں اور ان سب کا اپنا اپنا حلقۂ اثر ہے لیکن ان کا یہ حلقۂ اثر اپنے اپنے علاقے تک ہی محدود ہے۔ اس کے برعکس اردو ہر علاقے اور ہر خطے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کا علمی و ادبی سرمایہ بھی علاقائی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اسی لئے اسے قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ قومی زبان کسی خاص علاقے یا گروہ کی زبان نہیں پوری قوم اور پورے ملک کی زبان ہوتی ہے۔ اس لئے اس پر پشاور سے لے کر کراچی تک سب کا یکساں حق ہے۔ اردو کا تصادم کسی علاقائی زبان سے نہیں بلکہ انگریزی زبان سے ہے۔ اس کا حق انگریزی زبان غصب کر رہی ہے۔ ملک آزاد ہو گیا انگریز کی غلامی سے قوم نجات پا گئی لیکن انگریزی کی غلامی سے نجات اب تک نہیں مل سکی۔ جب تک قوم و ملک کو اس غلامی سے نجات نہ مل سکے گی اردو اور علاقائی زبانیں سب حبس بے جا میں رہیں گی۔ ان کا دم گھٹتا رہے گا اور زبانوں کے دم گھٹنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والے حقیقی معنی میں کبھی اس ملک میں آزادی کا سانس نہ لے سکیں گے۔ اس لئے اردو، سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتو اور سرائیکی بولنے والوں کو اپنے اصل دشمن کو پہچاننا چاہیئے۔ انہیں ایک دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ انگریزی کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیئے۔ جب تک اس سلسلے میں متحدہ کوششیں نہ کی جائیں گی ہمارے فروعی اختلافات کو بہانہ بنا کر انگریزی ہم پر مسلط رکھی جائے گی۔ اس تسلط بے جا سے قومی زبان کو بھی نقصان پہنچے گا اور علاقائی زبان کو بھی۔ یہ وقت آپس میں لڑنے کا نہیں انگریزی کی بند ربانٹ سے جان چھڑانے کا ہے۔

ادھر ہے دو گز یہ ہاتھ نے مسکیں ادھر ہے انصاف لیز نائی
نہ یہ ملے گا نہ وہ ملے گا جو بیش و کم پہ لڑا کریں گے۔

حسن وقار گل

اردو کی بین الاقوامی حیثیت

عام طور پر زبانوں کے نام یا تو ملکوں اور علاقوں کی نسبت سے ہوتے ہیں، یا پھر نسلوں اور قوموں کے تعلق سے۔ مثلاً اطالوی، عربی، فارسی، چینی، جاپانی وغیرہ یا آریائی اور سامی وغیرہ لیکن اردو نہ کسی علاقے کا نام ہے نہ کسی ملک کا نہ کسی قوم یا نسل کا۔ اصلاً یہ لفظ خود تو ترکی الاصل ہے لیکن ترکی میں بھی اس کے معنی زبان کے نہیں ہیں۔ اور نہ زبان سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ اگرچہ اس کے بولنے والوں کی اکثریت برصغیر پاک و ہند میں پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر برصغیر پاک و ہند کی کوئی زبان اس خطے سے زیادہ باہر سب سے زیادہ سمجھی، بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہے تو وہ اردو ہی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی یہ کسی خاص علاقے کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ مختلف صوبوں اور علاقوں میں ان کی اپنی اپنی زبانیں اور بولیاں ہیں جو علاقائی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں لیکن اردو ان سب علاقوں میں رابطہ کی عام زبان ہے اور شاید کوئی علاقہ ہو جہاں اس کے بولنے والے موجود نہ ہوں۔ پھر یہ کسی خاص مذہب یا عقیدہ رکھنے والوں کی مخصوص زبان بھی نہیں۔ اس کے بولنے والوں میں مسلمان، ہندو، عیسائی، سکھ، جین، بدھ اور دیگر مذاہب و عقائد رکھنے والے شامل ہیں۔ اسی طرح یہ کسی خاص تہذیب، ثقافت یا کلچر کی زبان بھی نہیں۔ ہاں اس کا اپنا ایک مزاج، ایک طبیعت، ایک رنگ و آہنگ اور ایک کلچر ہے جسے اردو کا مزاج اور اردو کا کلچر کہنا چاہیئے۔ یہ مزاج مختلف عناصر سے ترکیب پاکر بنا ہے۔ جو اس مرکب میں الگ الگ نظر نہیں آتے بلکہ مل کر اس طرح یک جان ہو گئے ہیں کہ اب ان کا اصلی رنگ و روپ پہچاننا بہت مشکل ہے۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اردو میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ کچھ سنسکرت سے مختلف پراکرتوں کے واسطے آئے ہیں کچھ عربی، فارسی، ترکی، سے آئے ہیں۔ بہت سے الفاظ برصغیر کی غیر آریائی زبانوں اور مقامی عناصر سے لئے گئے ہیں یورپ کی زبانوں کے الفاظ بھی اس میں شامل ہیں۔ فرانسیسی اور خاص طور پر انگریزی الفاظ اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ اور یہ عمل اب بھی جاری ہے۔ اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو اپنی ساخت میں کس قسم کی زبان ہے۔ اور پھر یہ کہ ان عناصر کے بارے میں اردو کے مشہور ماہر لسانیات انشا اللہ خان انشا نے کوئی دو سو سال قبل یہ لکھا تھا کہ ہر وہ لفظ جو اردو میں آگیا اردو ہے اور اسی طرح صحیح اور درست ہے جس طرح اردو میں ہے چاہے از روئے اصل غلط ہو اور اگر اردو میں غلط ہے تو غلط ہے چاہے از روئے اصل درست ہو اور یہ اصول

آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور اس طرح اردو کے سرمایہ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو کی اس حیثیت کا اندازہ سب سے پہلے صوفیائے کرام کو ہوا جو برصغیر پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں اعلائے کلمۃ الحق اور مخلوق خدا کی خدمت کے لیے پہنچے۔ ان کی اپنی مادری زبان یا علاقے یا ملک کی زبان کچھ بھی رہی ہو، انہوں نے اس زبان کو جسے اس وقت ہندوی اور ہندی کے نام سے پکارتے تھے اختیار کیا چنانچہ اردو کے ابتدائی قدیم ترین نمونے ان ہی کے ملفوظات اور ارشادات، تصانیف اور تعلیمات میں ملتے ہیں۔ اور ان کا سلسلہ بھی برصغیر پاک و ہند کے تمام علاقوں میں خواہ وہ مغربی شمالی سرحد ہو، پنجاب یا سندھ ہو دوآبہ کی سرزمین ہو یا دکن کا علاقہ یا بنگلہ دیش ہو پھیلا ہوا تھا۔ اور آج تک ان کا یہ فیض جاری ہے۔

اسی طرح جب مغربی سفارت کار اور مشنری برصغیر میں داخل ہوئے تو انہوں نے بھی اس زبان کو جسے انہوں نے کبھی مور، کبھی ہندوستانی اور کبھی دوسرے ناموں سے پکارا اس ملک کی اکثریت کی زبان کی حیثیت سے اختیار کیا۔ اور اسے اس ملک میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا ذریعہ بنایا اور ان مشنریوں کے ذریعے سے ہی یہ زبان یورپ کے مختلف ممالک میں روشناس ہوئی۔ سولھویں صدی کے اوائل میں جیرونیموزاویر (JERONIMO XAVIER) نے جس کا تعلق حضرت عیسیٰ کے حواریوں (COMPANIONS OF JESUS) کی جماعت سے تھا اور جو جہانگیر کے دربار میں بھی پیش ہوا تھا۔ اور وہ آگرہ میں ۱۵۸۶ اور ۱۶۱۵ کے درمیان موجود تھا۔ اس نے فارسی ہندوستانی لغت مرتب کی تھی۔ اس کے بعد ان مصنفین کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں لاطینی، فرانسیسی، پرتگالی، اطالوی، ڈچ، جرمن اور انگریز وغیرہ میں اردو سے متعلق مصنفین یورپ لغت، قواعد صرف و نحو اور مذہبی امور پر کتابیں رسالے اور کتابچے تصنیف و تالیف کرتے رہے جس سے نہ صرف اردو بین الاقوامی حیثیت سے متعارف ہوئی بلکہ جگہ جگہ اس کی تعلیم و تدریس اور تحقیق کے مرکز قائم ہوئے۔ اور بعض مستشرقین نے تو اس کو ہی اپنی تحقیق و تصنیف کا موضوع اور اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا جس کی ایک مثال موسیو گارساں دتاسی کی ہے جس کے خطبات اور مقالات اب اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ اس نے ہندوستانی ادبیات کی ایک ضخیم تاریخ بھی مرتب کی۔ اس کا ترجمہ بھی فرانسیسی سے اردو میں ہو چکا ہے۔ اور اس موضوع پر ایک فرانسیسی خاتون للیان نذرو کراچی یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی لے چکی ہیں۔ یہ پہلی غیر ملکی خاتون ہیں جنہوں نے کسی پاکستانی یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔

اس دور کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں اردو کی تعلیم و تدریس پر خاصی توجہ تھی چنانچہ ۱۸۶۰ء میں انگلستان کی قدیم اور مشہور یونیورسٹی کیمبرج میں اردو کی پروفیسری قائم ہوئی اور اس پر میجر اسٹیفنز کا تقرر ہوا اسی زمانے میں شاہی فوجی اکیڈمی میں اردو کا پروفیسر مقرر ہوا ۱۸۸۲ء میں کنگز کالج لندن میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ ۱۸۵۶ء میں ڈبلن میں فارسی اور عربی کے ساتھ اردو کی تعلیم کا بھی انتظام ہوا۔ لندن یونیورسٹی میں اس کا بندوبست تھا ۱۸۶۱ء گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ اس زبان کی اہمیت کا لوگوں کو احساس ہوتا جا رہا ہے اور آکسفورڈ میں اردو کی مسند قائم ہو گئی ہے۔

یہ باتیں تو تاریخ کا حصہ ہیں اور اس مختصر سے جائزے میں اردو کی بین الاقوامی حیثیت سے متعلق تفصیل کی گنجائش نہیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ دنیا کا کوئی ملک

ایسا نہیں جہاں اردو بولنے، لکھنے، پڑھنے، سمجھنے اور اس میں درس و تدریس اور تعلیم و تحقیق کرنے والے موجود نہ ہوں۔ انگلستان میں لندن اور کیمبرج میں اردو کی اعلیٰ ترین تعلیم کا انتظام ہے۔ جس میں خود اس ملک کے اساتذہ اور ان کے ساتھ بعض اردو کے مددگار موجود ہیں۔ اور متعدد حضرات لندن یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے کر آ چکے ہیں۔ امریکہ میں بھی اردو کی تعلیم کی اہمیت پوری طرح محسوس ہوئی ہے اور بہت سے مرکز قائم ہیں جن میں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ امریکہ میں کولمبیا یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اردو کی کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ جو ۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کوششوں سے جمع ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبدالمعید نے امریکہ کے کتب خانوں کے اردو ذخیروں پر ایک تعلیمی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ اس مقالے سے اندازا ہوتا ہے کہ امریکہ میں کہاں کہاں اردو کی تعلیم و تدریس کا انتظام اور اہتمام ہے۔ اس کے علاوہ شکاگو یونیورسٹی میں بھی اردو کی تدریس کا بندوبست کیا گیا ہے۔ جہاں ایک پاکستانی پروفیسر نعیم چوہدری اردو زبان کے استاد ہیں۔ اسی طرح انٹرنیشنل یونیورسٹی کیلیفورنیا میں ڈاکٹر الفرڈ جیمز ولی اردو اور فارسی کی تدریس سے وابستہ ہیں۔

میک گل یونیورسٹی (کناڈا) سے اردو کے متعلق بعض اعلیٰ درجے کے تحقیقی کام شائع ہوئے ہیں۔ جن کے لئے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر قابل ذکر ہیں۔ ان کی تصانیف میں اردو کی تعلیم کے لئے نصاب، اردو کی اخباری زبان کی لغت، شعاری لعبد اردو کی اخباری زبان کے علاوہ جدید اردو شاعری کا ایک انتخاب بھی شامل ہے۔ بقیہ نمبر ۳۲۱

ادھر یورپ میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے جس میں خاص طور پر نیپلز کے اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ کا ذکر کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ یہاں اردو کی تعلیم و تدریس اور تحقیق کے کام کا سہرا ڈاکٹر الیساندرو بوسانی کے سر ہے جنہوں نے خود بھی غالب، اقبال اور نظیر اکبرآبادی وغیرہ پر عالمانہ مقالات لکھے ہیں اور اردو ادب کی ایک تاریخ بھی اطالوی زبان میں تصنیف کی ہے۔ اسی ادارے سے متعلق ایک پاکستانی استاد اقتدار حسن نے کلیات جرات تین جلدوں میں مرتب کر کے ادارہ سے شائع کی ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق بعید میں اردو کی اہمیت اور اس کی بین الاقوامی حیثیت اسی طرح مسلم ہے۔ جاپان میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ آج سے کوئی نصف صدی قبل برلاس مرحوم نے شروع کیا ہے اور ان کے شاگردوں نے اسے اب بھی جاری رکھا ہے۔ ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے استاد تاکیشی سوزوکی ہیں جنہوں نے اپنی اردو کی تعلیم کراچی یونیورسٹی سے مکمل کی ہے۔ اور جنہوں نے کئی پاکستانی اور ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کا جاپانی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ جن میں منشی پریم چند اور فیض احمد فیض کا نام سرفہرست ہے اوساکا یونیورسٹی میں بھی بیرملکی زبانوں کی تدریس ہوتی ہے جامعہ کراچی کے استاد ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے بھی کئی سال اس یونیورسٹی میں اردو کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دی ہیں۔ حال ہی میں اوساکا یونیورسٹی نے وزارت تعلیم حکومت جاپان کے تعاون سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب "آج کا اردو ادب" کا جاپانی ترجمہ شائع کیا ہے یہ ترجمہ اوساکا یونیورسٹی کے پروفیسر کان کاگایا نے کیا ہے۔ چین میں اردو کی تعلیم کا مستقل بندوبست ہے

جناب ظفر اقبال

اُردو زبان کے ادارے

کسی بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے اپنے وزیر کو گراں قدر رقم فوج جمع کرنے کے واسطے دی۔ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے استفسار کیا کہ فوج تیار ہوگئی۔ وزیر نے اثبات میں جواب دیا۔ جب بادشاہ نے معائنہ کیا تو اُسے وزیر نے کئی درس گاہیں دکھا دیں۔ بادشاہ سخت ناراض ہوا کیونکہ اس کے احکام کی تعمیل نہیں ہوئی تھی۔ وزیر نے اُسے سمجھایا کہ ان درس گاہوں سے جو لوگ تعلیم پاکر نکلیں گے وہ نہایت اعلیٰ درجے کے فوجی ہوں گے۔ کیونکہ یہاں صرف فنونِ حرب کی تعلیم ہی نہیں ہوگی بلکہ دیگر علوم و فنونِ مفیدہ سے بھی روشناس کرایا جائے گا۔ پھر ایسے تعلیم یافتہ نوجوان ملک کا ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کا سرمایہ ہوں گے۔ بادشاہ کے ذہن میں وزیر کی بات آگئی اور اس نے وزیر کو خاصے انعام و اکرام سے نوازا۔

جب ہم تعلیم کی بات کرتے ہیں تو لامحالہ ہمارے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ ذریعہ تعلیم کس زبان میں اپنی یا غیروں کی۔ اگر تعلیم غیروں کی زبان میں ہے تو پھر وفاداریاں اور ہمدردیاں بھی ان ہی کے ساتھ، اور اگر اپنی زبان میں تعلیم تو پھر وفاداریاں اور ہمدردیاں اپنی مملکت کے ساتھ۔

ہماری قوم کا المیہ ہے کہ اس ملک کو آزاد ہوئے ۳۲ سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ہنوز ہم اپنی تعلیم کے لئے دوسری زبان کے محتاج ہیں۔ معدودے چند ادارے اور اشخاص آج بھی دردمندانِ قوم کے لئے روشنی کی کرن ہیں کہ اردو کا اس حد

زبان کی ترقی و ترویج میں شخصی کاوشیں بھی ہوئیں اور اجتماعی بھی۔ دونوں کی جدوجہد نے ادب اور علوم کو نہ صرف برگزیدگی بخشی بلکہ اس قابل بھی کیا کہ دیگر السنۂ عالم کے ہمدوش ہو سکیں۔

اردو سے متعلق چند پاکستانی اداروں کی مختصر کیفیت آئندہ اوراق میں بیان کی گئی ہے۔ مختصر اس لئے کہ ان میں سے چند ادارے تو اس پائے کے ہیں (مثلاً انجمن ترقی اردو) کہ جن کی ایک نہایت مبسوط تاریخ لکھی جاسکتی ہے لیکن اس مجلہ کی ضخامت اس درجہ طوالت کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ کام تو بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔ جس پر کارپردازانِ انجمن ترقی اردو کو توجہ دینی چاہیئے۔ میری معلومات کا بنیادی ماخذ ان اداروں کے فراہم کردہ مطبوعہ اعداد و شمار و حقائق ہیں۔ علاوہ ازیں نیشنل کالج کراچی کے مجلہ علم و آگہی بابتہ ۱۹۷۸ء سے بھی خصوصی مدد ملی جس کے لئے میں اس کالج کے اربابِ اختیار کا ممنون ہوں۔

تک ترویج ان ہی کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ یہ ایک تاریخی تسلسل اور حقیقت ہے کہ اچھے اور بلند پایہ امور فردِ واحد کی ذات سے شروع ہوکر کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ کسی بھی سچائی اور نظریہ کو عام کرنے کے لئے ایک گروہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ صرف ابتدا اس کا مسئلہ ہوتا ہے بعد از آں شریکِ سفر آتے رہتے ہیں اور کارواں بنتا جاتا ہے۔ اردو

۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے ذریعے ایوب خاں برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے جہاں زندگی کے دیگر شعبوں میں ترقیاتی امور کی نگرانی کی وہاں ایک تعلیمی کمیشن بھی قائم کیا تاکہ وہ علمی میدان میں اصلاحات تجویز کرے۔ اس کمیشن نے اردو کی ترقی کے لئے ایک بورڈ کے قیام کی سفارش کی۔ لہٰذا ۲۲ مئی ۱۹۶۲ء میں وزارت تعلیمات کے زیرِ انتظام ایک ادارہ قائم کیا گیا اس کا نام مرکزی اردو بورڈ تجویز کیا گیا اور اس کا مرکزی دفتر لاہور منظور کیا گیا۔ اس کے سرپرست ایوب خاں نے جسٹس ایس۔ اے رحمان مجلس منتظمہ کے صدر اور سیکرٹری و بورڈ کے ڈائریکٹر کرنل مجید ملک مقرر ہوئے۔ اور پاکستان کے تمام مشہور اہلِ قلم پر مبنی ایک مجلس منتظمہ تشکیل دی گئی۔ ان دونوں بورڈ کے ڈائریکٹر مشہور افسانہ و ڈرامہ نگار اشفاق احمد ہیں۔

مرکزی اردو بورڈ کے تین مقاصد تھے۔

۱۔ پاکستان میں اردو کی بنیادوں کی اس حد تک توسیع کہ وہ پورے مغربی پاکستان میں تعلیمی گفتگو کی مشترک زبان بن سکے۔

۲۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم میں اردو کی ترقی تاکہ اردو ان کی اعلیٰ ترین تعلیم کا کامیاب ذریعہ بن سکے۔

۳۔ اردو کی ترقی کے دوسرے اداروں سے اشتراک و ربط و ضبط قائم رکھنا تاکہ کسی بڑے علمی منصوبے کو تقسیم کار کے اصول پر بہتر اور سہل بنایا جاسکے۔

اب تک بورڈ کے قیام کو اٹھارہ سال گذر چکے ہیں اس مدت میں بورڈ نے اردو کی ترقی و ترویج کے لئے متعدد اقدامات کئے۔ اور اس میں کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے بورڈ کے لئے بنیادی اردو کے عنوان سے پندرہ سو الفاظ کی ایک فہرست مرتب فرمائی جس کا بعد ازاں سندھی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اردو پشتو لغت۔ ہفت زبانی لغت احسان دانش کی اردو مترادفات ایسی کتب ہیں کہ جن کے بغیر یہ موضوعات نامکمل رہتے۔ اردو کی ترویج کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسا ٹائپ رائٹر ہو جس کے تختے میں اردو کی تمام لسانی خصوصیات سما سکیں۔ مرکزی اردو بورڈ کے کارپردازوں نے اس دشواری پر قابو پایا کہ ایک ایسا کلیدی تختہ بنا لیا جو کام ٹائپ رائٹروں سے یکسر مختلف اور علیحدہ ہے لیکن اس کی ایک خامی نے اس کی وقعت کم کردی یعنی اس میں اردو کے بجائے انگریزی ہندسوں کو استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بورڈ نے اردو مختصر نویسی ([illegible]) کے لئے بھی خاصی کوششیں کی ہیں۔

چونکہ ہماری تاریخ کا بڑا حصہ فارسی میں رقم کیا گیا ہے۔ لہٰذا گوناگوں مسائل کی وجہ سے لوگ اس سے استفادہ کرنے کی صلاحیت سے محروم تھے بورڈ نے اس وقت کو سمجھتے ہوئے معتبر تواریخی کتب کو اردو میں ترجمہ کرا دیا۔ جس میں چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔ طبقات ناصری۔ سیر العارفین۔ معاثر الامرا

شاہجہاں نامہ، بلوغ الادب۔ خلاصۃ التواریخ۔ الاعلان بالتوبیخ۔ ہارون الرشید۔ تاریخ فیروز شاہی۔ تاریخ خان جہانی۔ تاریخ مبارک شاہی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

بورڈ نے پاکستان کے مختلف علاقوں میں بسنے والوں کے درمیان اک ذہنی اور لسانی رابطہ پیدا کرنے کے لئے اور انھیں ایک دوسرے سے قریب لانے کے لئے سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب کے متعلق جو تالیفات پیش کی ہیں۔ ان میں بلوچستان میں اردو۔ بلوچی نامہ۔ پنجابی نامہ۔ پنجاب پشتو زبان اور ادب کی تاریخ۔ سندھ میں اردو، مطبوعات سندھ میں اردو مخطوطات وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

بورڈ نے سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے نہ صرف نئی اصطلاحات وضع کیں۔ بلکہ ان اصطلا سے بھی خاصا کام لیا جو کہ عثمانیہ یونیورسٹی، انجمن ترقی اردو کراچی و پنجاب یونیورسٹی نے وضع کی تھیں، کوئی بھی اصطلاح اس وقت تک مردہ رہتی ہے۔ جب تک کہ اسے عام طور پر استعمال نہ کیا جائے۔ لہذا بورڈ نے اپنی سائنسی کتب میں ان اصطلاحات کو بخوبی برتا ہے۔ اور ترجمہ کو زیادہ عام فہم بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بورڈ نے اب تک

طبیعات، کیمیا، حیاتیات۔ جغرافیہ۔ حیاتیاتی کیمیا۔ خردحیاتیات، زرعی حشریات۔ حیاتیاتی جغرافیہ۔ اخلاق شماریات۔ شماریات۔ فلکیات۔ حیوانیات، نباتات اور ٹیکنالوجی کے موضوعات پر بے شمار کتب شائع کی ہیں۔ سائنسی علوم کے علاوہ بورڈ نے قواعد، سوانح، لغات اور دیگر معاشرتی علوم پر بیش بہا کتب شائع کرکے پاکستان کے علمی حلقوں سے داد تحسین پائی ہے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے ضمن میں بورڈ مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے منصوبوں پر بھی کام کر رہا ہے۔ اس وقت اس نے پاکستان میں (R.C.D) نژاد کی شاخ کے طور پر کام کرنے کا اہم ذمہ داری بھی سنبھالی ہوئی ہے۔ حال ہی میں بورڈ نے مشفق خواجہ کی مایہ ناز تالیف مخطوطاتِ اردو شائع کی ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اردو مخطوطات پر اس قدر تفصیل و توضیح کے ساتھ آج تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ آئندہ کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ کتاب آج تک کی شائع شدہ کتب میں شاہکار ہے۔ اردو بورڈ کے لئے باعثِ نازش و افتخار ہے۔

ترقی اُردو بورڈ کراچی

دنیا کی کسی بھی زبان کی اعلیٰ ترین خصوصیت اس کا قواعد و لغات کی رو سے منظم و منضبط ہونا ہوتی ہے۔ انگریزی زبان کی شوکت و عظمت کی کشف حال آکسفورڈ ڈکشنری ہے۔ اردو زبان میں بھی عرصہ دراز سے ایک ایسی ہی لغت کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ جو نہ صرف کسی بھی لفظ کی شارح ہو۔ بلکہ اس کا اشتقاق، مفاہیم مطالب اور اس کے ارتقائی مدارج اور مختلف مقامات پر اس کے استعمال کی تاریخی ترتیب اس کا مقام بلحاظِ قواعد، املا، کی اغلاط سے مبرا ہو۔ اس مقصد و نیع کے لئے حکومت پاکستان نے ایک قرارداد مورخہ ۱۳ جون ۱۹۵۸ء کے ذریعہ ترقی اردو بورڈ کے

نام سے ایک خود مختار ادارے کے قیام کی تجویز کو منظور کیا۔ اس کے دو مقاصد تھے (اول) آکسفورڈ ڈکشنری (کلاں) کی طرز پر اردو کی ایک عظیم الشان لغت کی تدوین (ب) ایسے اقدامات جو اردو زبان کی ترقی کے لئے مفید ہوں۔ لیکن بعد ازاں اس کے مقصدِ اول پر مقصد دوم کو قربان کر کے اس کا مقصد حقیقی اردو لغت کی تدوین قرار پایا۔ مارچ ۱۹۵۸ء میں اس مقصد کے حصول کے لئے مختصر عملہ کا تقرر کیا گیا۔ اور مولوی عبدالحق کو مدیر اعلیٰ اور جناب شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی کو مشیر ادبی مقرر کیا گیا۔ ترقی اردو بورڈ علمی و انتظامی دو مجالس پر مشتمل ہے۔ ایک مجلس اعلیٰ کہلاتی ہے جو بورڈ آف ڈائرکٹرز کی قائم مقام ہے دوسری مجلس انتظامی ہے۔ دونوں مجلسوں کے چیئرمین اور سیکرٹری وزارت تعلیمات نامزد کرتی ہے۔ مجلس اعلیٰ کے اولین صدر ڈاکٹر ممتاز حسین مرحوم تھے ان کے انتقال کے بعد سے تا حال جناب محمد ہادی حسین اس عہدہ پر فائز ہیں۔ محترمہ شائستہ اکرام اللہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء نائب صدر کے عہدہ پر فائز رہی ہیں۔ مجلس اعلیٰ کے اراکین میں مولوی عبدالحق ڈاکٹر شہید اللہ مرحوم۔ ابواللیث صدیقی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ رازق الخیری۔ ڈاکٹر سید شاہ علی ڈاکٹر عبدالقیوم۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی۔ جوش ملیح آبادی ڈاکٹر حسام الدین راشدی۔ شان الحق حقی۔ سید فضل کریم فضلی۔ قدرت اللہ شہاب۔ پروفیسر حمید احمد خاں جمیل الدین عالی۔ حمید ملک مرحوم حفیظ ہوشیارپوری مرحوم۔ سید ہاشم رضا۔ پروفیسر وقار عظیم مرحوم۔ محمد ہادی حسین۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (رکن مدیر اعلیٰ و معتمد) کے نام نامی شامل رہے۔

مجلسِ انتظامی :-

محمد ہادی حسین (صدر)

پیر حسام الدین راشدی۔ سید ہاشم رضا۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (معتمد و مدیر اعلیٰ)

مجلس اعلیٰ و مجلس انتظامی کے معتمد

عبدالحفیظ کاردار۔ شان الحق حقی۔ ابواللیث صدیقی

مدیرانِ اعلیٰ :-

ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

مدیرانِ اوّل :-

ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم نسیم امروہوی

مدیران :-

ہاشمی فرید آبادی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم ڈاکٹر شہید اللہ مرحوم۔ اختر حسین رائے پوری۔ عبدالخلیق نقوی۔

مشاورتی مجلس ادارت :-

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ ڈاکٹر شاہ علی ڈاکٹر عبدالقیوم۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان۔ ڈاکٹر قاضی محمد مرتضیٰ۔ ڈاکٹر سید یحییٰ احمد ہاشمی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ پروفیسر وقار عظیم۔ ڈاکٹر وحید قریشی محمد طاہر فاروقی۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی۔ محمد شادانی مرحوم۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی۔ نسیم امروہوی

نیاز فتح پوری مرحوم۔ شریف الحسن، حفیظ ہوشیار پوری، مجنوں گورکھپوری۔

ان کے علاوہ گیارہ نائب مدیران ۱۲۱ معاون مدیران۔ اور سترہ نائب معاونین اس عظیم الشان لغت کے سلسلے سے متعلق رہے۔

ترقی اردو بورڈ نے اپنی مرتبہ لغت کا نام محیط اردو رکھا ہے۔ تا حال اس کی دو جلدیں زیر طبع سے آراستہ ہو کر مارکیٹ میں آ چکی ہیں۔

لغت ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ جبکہ ۱۳ ویں جلد حوالہ و حواشی اشاریہ کتب مصنفین پر مشتمل ہوگی۔ یہ عظیم الشان لغت اردو میں تمام علوم و فنون کی اصطلاحات۔ محاورات۔ الفاظ۔ کہاوتوں اور ضرب الامثال کا ذخیرہ ہوگی۔ کسی بھی لفظ کی پوری تاریخ بالتصریح ترک و اختیار۔ اک اک لفظ کے معنی پہ سے ہو ان کی امثال۔ اس وقت کی منظومات و نثری جواہر پاروں سے دی گئی ہیں۔ اور اس امر کا بطور خاص التزام رکھا گیا ہے کہ ایک لفظ مختلف علاقوں میں مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے تمام الفاظ کو اس کی نسل و خاندان کے شجرے اور محاسن و معائب کے ساتھ رقم کیا گیا ہے۔ لغات نگاری میں اشتقاق کی بہت بڑی اور مرکزی اہمیت ہوتی ہے۔ محیط اردو میں ہر لفظ کے ماخذ کی تحقیق کر کے اس کی اصل اشتقاقی حیثیت متعین کی گئی ہے۔ لغت کی تدوین میں جدید ترین اصولِ تدوین سے کام لیا گیا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ جسے صرف ماہرین فن ہی سمجھ کر داد دے سکتے ہیں۔ کسی بھی زبان کے قواعد ایک مرتبہ متعین ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس طریقہ کار کی پیروی کی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر روز بروز السنہ کے قواعد میں تغیر و تبدل رونما ہوتا رہے تو زبان کا ڈھانچہ زمین پر آ رہے گا۔

ظاہر ہے جس زبان کی بنیاد مستحکم نہ ہو اسے معیاری اور مستقل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارے ہاں قواعد اور املاء کے صحیح اصولوں کے دوش بدوش بہت سے ایسے اصول مروج رہے ہیں جن کی اصلاح خاصا دقت طلب کام تھا۔ لیکن چونکہ محیط اردو جدید ترین معیارات اور قوانین کو مدنظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ لہذا ارباب حل و عقد نے مجتہدانہ بصیرت سے کام لے کر تمام اغلاط اور طریقہ کار کو تبدیل کر کے نئے اور منطقی اصول وضع کئے اور ان ہی کی پابندی محیط اردو کی تدوین میں کی گئی ہے۔ کوئی بھی لغت حتمی اور حرفِ آخر قرار نہیں دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ زندہ زبانوں کا وطیرہ رہا ہے کہ وہ معاشرتی میل جول کی وسعت اور ہمہ گیری کے زیر اثر نت نئے الفاظ قبول کرتی رہتی ہیں۔ اس طرح اس زبان کی وسعت اور معنی آفرینی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کلیہ کا اطلاق محیط اردو پر بھی کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ لغت اور زبان دونوں ترقی کرتی رہیں گی۔ لیکن دنیائے اردو ڈاکٹر عترت حسین زبیری کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ اس لغت کا تصور اول اول ان کے ذہن میں پیدا ہوا اور اس کے ابتدائی آثار و نقوش بھی انہیں کے مرہونِ احسان ہیں۔

مجلس ترقی اردو بورڈ

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ خدا جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو وہ کسی سے بھی اس کام کو کروا لیتا ہے۔ اس میں عقیدے، مذہب، فرقے یا رنگ و نسل کی قید نہیں۔ ایک عرصہ گزرا کہ عربی اور علوم دینیہ کی مشہور کتب ہندوستان میں تقریباً ناپید ہو چکی تھیں معلوم خداوندی کے تحت منشی نولکشور نے نولکشور پریس لگایا اور اس میں تقریباً تمام ہی کتب ایسی شائع ہوئیں کہ جن کی دستیابی امر محال تھی۔ یہی واقعہ مجلس ترقی ادب پر بھی درست اترتا ہے۔ اردو زبان کی کلاسیکی کتب تو اس نے حسن کاری اور ترتیب کے ساتھ شائع کر کے ہمارے کلاسیکی ادب کو از سر نو زندہ کر دیا۔ مئی ۱۹۵۰ء میں پنجاب کے محکمہ تعلیم نے اردو زبان کی بقا ترقی و ترویج کے لئے ایک لاکھ روپے کی امداد سے مجلس ترجمہ کی بنیاد رکھی۔ اس وقت اس ادارے کے فرائض منصبی صرف یہ تھے کہ مشرق و مغرب کی بلند پایہ علمی کتب منتخب کر کے ان کے تراجم شائع کئے جائیں ون یونٹ کی تشکیل کے بعد مغربی پاکستان کے محکمہ تعلیم نے اس غیر فعال ادارے کو فعال بنانے کے لئے اس میں تبدیلیاں کیں اور اس کا نام مجلس ترقی ادب رکھا۔ اس کے اغراض و مقاصد اور آئین کو از سر نو ترتیب دیا گیا۔ اور نئے ارکان کی سربراہی میں ایک باقاعدہ بورڈ کی تشکیل کی گئی۔ وزیر تعلیم کو صدر اور جسٹس ایس۔ اے رحمان کو نائب صدر مقرر کیا۔ اور مجلس ادب کے طریقہ کار، حدود کار اور اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل مقرر کئے گئے۔

۱۔ اردو کے کلاسیکی ادب کی اشاعت۔
۲۔ عربی اور فارسی کی بلند پایہ علمی کتابوں کے تراجم اور حسب ضرورت (متون) کی اشاعت۔
۳۔ بلند پایہ تحقیقی اور تنقیدی ادب کی اشاعت۔
۴۔ مغربی زبانوں کے بلند پایہ علمی کتب کے تراجم

مجلس ترقی ادب حقیقتاً فعال اور متحرک اس وقت ہوئی جب کہ ۱۹۵۸ء میں مغربی پاکستان کے محکمہ تعلیم نے اس کا علیحدہ بورڈ بنا دیا۔ ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک ۔۔۔۔! بائیس کتب آٹھ سال کے عرصہ میں شائع ہوئیں۔ جبکہ ۱۹۵۸ء سے لے کر تاحال تقریباً ۵۰۰ کتب شائع ہو چکی ہیں۔

اس کے علاوہ مجلس ترقی ادب ایک ادبی رسالہ صحیفہ بھی شائع کرتی ہے جس کے آج تک تقریباً ۴۰۰۰۰ ہزار صفحات شائع ہو چکے ہیں۔ "صحیفہ" نے معروف ادبی شخصیات پر ۱۱ خاص نمبر نکالے جن میں غالب نمبر، تاج نمبر، ادبیات فارسی نمبر اقبال نمبر قابل ذکر ہیں۔ آج کل مجلس ادب کے ناظم مشہور شاعر احمد ندیم قاسمی ہیں۔

ناظمین:۔

۱۔ مجلس ترقی ادب کے پہلے ناظم سید امتیاز علی تاج تھے۔ ڈرامہ میں ان کی خدمات محتاج تعارف نہیں۔
۲۔ امتیاز علی تاج کے انتقال (۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء) کے بعد مجلس کا دوسرا ناظم پروفیسر حمید احمد خاں کو مقرر کیا گیا۔ اس عہدے سے قبل وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ ادب اور خصوصاً غالب پر ان کی تحریریں غالبیات کا قابل قدر حصہ ہیں۔

حمید احمد خاں کے انتقال کے بعد خاصے عرصہ تک ناظم کا عہدہ خالی رہا۔ لیکن کچھ عرصہ ہوا کہ حکومت نے

احمد ندیم قاسمی کو اس عہدہ پر مقرر کر دیا ہے۔ "صحیفہ" جو ۱۹۶۲ء سے بند تھا احمد ندیم قاسمی نے اس کا دوبارہ اجرا کیا۔ اور اس کے معیار کو بلند کیا۔ "صحیفہ" کا دوبارہ اجراء جنوری ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ یہ جریدہ سہ ماہی کے بجائے دو ماہی ہو گیا ہے۔

مجلس کے رفقائے علمی میں سید عابد علی عابد۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ کلب علی خاں فائق رامپوری، گوہر نوشاہی وغیرہ اس زبردست علمی ادبی حیثیت کے مالک ہیں جنھیں ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے۔

مجلس نے جن کتب کو شائع کیا اور خاص طور پر کلاسیکل ادب، تو ان میں بطور خاص یہ التزام رکھا ہے کہ ان کے متون معیاری اور کئی نسخوں کی باہمی تطبیق کے بعد مدون کئے گئے ہوں نیز یہ کہ ان پر حواشی وغیرہ تحریر کرائے۔ پھر جدید طریقِ تدوین کے مطابق ان کی تدوین کی گئی اور اہم بات اس پر مقدمہ ہے جس میں اس کتاب کی علمی، ادبی، تاریخی حیثیت کا تعین اور اہمیت بیان کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مقالات سرسید ۱۶ جلدیں میں حالی کی نثر کا مجموعہ، شبلی و آزاد کے مقالات وغیرہ بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ تاریخ و سوانح میں سوانح مولانا روم حیاتِ سعدی، قصص ہند، شاہ جہان نامہ، سفرنامہ حکیم ناصر خسرو، آرائشِ محفل، تاریخِ پنجاب، تاریخ لاہور، تزکِ جہانگیری مطالعہ تاریخ ٹائن بی: تذکرے ہمارے ادب کا نہ صرف قابلِ قدر حصہ ہیں، بلکہ انھیں میں ہمیں اپنی تنقید کے اولین نقوش کا سراغ ملتا ہے۔ خواہ تاریخ ادب ہو یا تحقیق سوانح ہوں یا تقابلی مطالعہ، تذکروں کے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ تذکرے عدم اشاعت کی وجہ سے کم یاب ہوتے جا رہے تھے۔ چونکہ ان کی اشاعت سے زیادہ مالی فائدہ ممکن نہیں۔ لہٰذا پرائیویٹ پبلشروں نے ان کی اشاعت کو درخورِ اعتنا گردانا چھوڑ دیا۔ اس صورتِ حال میں مجلس ترقی ادب نے تذکروں کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی۔ اور گلستانِ سخن دو حصے، مخزن نکات، طبقات الشعراء، بہارستانِ ناز، خوش معرکہ زیبا، گلشن بے خار اور کئی تذکرے شائع کئے ہیں شعراء کے کلیات اور دواوین کی طرف بھی مجلس نے توجہ مرکوز کی اور داغ، آتش، مومن، ذوق، امانت، قائم چاندپوری، سالک، نسیم، تعشق، نظام، شیفتہ، شاہ نصیر، مصحفی، جلال، انشا، جرأت، سودا وغیرہ کے کلیات کو مختلف قلمی نسخوں کے باہمی ... کے بعد ان کے صحیح ترین متن کی تدوین کر کے طباعتی آرائش کے ساتھ شائع کیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج نے اردو کی ترقی میں جو کردار سرانجام دیا وہ محتاج بیان نہیں۔ اور اس کی اہمیت بھی احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ مجلس نے فورٹ ولیم کالج کے مصنّفین کے ادبی سرمائے کو اس کی اہمیت کے پیش نظر شائع کیا ہے۔ شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، شیخ حفیظ الدین احمد، میر بہادر علی حسینی، کاظم علی جوان، مظہر علی ولا، للو لال جی وغیرہ نے اپنی کاوشوں سے اردو کو جو ادبی، علمی اور تاریخی سرمایہ فراہم کیا اس کا معتدبہ حصہ ہنوز منتظرِ اشاعت تھا۔ مجلس نے اسے شائع کر کے اردو زبان پر احسان کیا ہے۔

تحقیقی نادرات کسی بھی زبان کی ثروت اور کسوٹی ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں بڑے بڑے محققین گزرے لیکن اشاعتی اداروں نے ان کی تحقیقی سرمائے کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ سرسید، شبلی، آزاد، مولوی شفیع، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں وغیرہ اعلیٰ پایہ کے محققین ہیں، جن کے تذکرے کے بغیر فنِ تحقیق علمی

مقتدرہ قومی زبان

اردو زبان کی نشوونما اور ارتقا میں انفرادی کردار بے حد نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن کسی بھی زبان کی حقیقی کامیابی وہ ہوتی ہے جبکہ اس کو کسی مخصوص خطۂ ارض میں رائج و نافذ کیا جائے۔ چونکہ یہ سائنسی دور نت نئے مسائل کا دور ہے۔ لہٰذا اگر کوئی زبان اس جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر اس کے دوش بدوش چلتی ہے تو وہ کامیاب و کامران گردانی جا سکتی ہے۔ جب ہم اردو پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے ہر حکومت نے اردو کے نعرے کو محض اپنی کامیابی کا زینہ تو بنایا لیکن اس کے عملی نفاذ کی طرف سے حامل بے اعتنائی و منافقت کا ثبوت دیا۔ موجودہ حکومت کے صدر نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ ہم لوگ صرف اردو کا نعرہ لگاتے ہیں سرکاری سطح پر اس کے نفاذ سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ لہٰذا آپ نے ایک حکم نامے کے ذریعے اردو کے نفاذ کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام "مقتدرہ قومی زبان" قرار دیا۔ اور اس کے اولین صدر ملک کی مشہور شخصیت ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کو اور سیکرٹری میجر آفتاب حسن صاحب کو مقرر کیا۔ مقتدرہ قومی زبان کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

قومی زبان کے نفاذ اور ترویج میں حائل موانع و مشکلات کو دور کر کے قومی ترقی اور قومی یکجہتی کی راہ ہموار کر دی جائے۔ اور قومی ترقی کے ہر شعبے میں جہاں جہاں انگریزی زبان کا عمل دخل ہے وہاں اردو کو جلد از جلد جاری کر دیا جائے۔ اس عمل کے لئے جو ضروریات مثلاً تصنیف و تالیف و ترجمہ اور لغات و دیگر مطبوعات ہیں انھیں مہیا کیا جائے اور جو موانع مشکلات اور رکاوٹیں مشینوں مثلاً ٹائپ رائٹروں، ٹیلی پرنٹروں کے سلسلے میں حائل ہیں ان کو دور کیا جائے۔

مقتدرہ نے اپنے کام اور پروگرام کو دس حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جو ان تمام معاملات پر حاوی ہے جن کا تعلق قومی زبان سے ہے۔ اور ان پر مقتدرہ کو کام کرنا ہے۔ ماہرین پر مشتمل دس ذیلی مجالس کی تشکیل کی گئی ہے جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ پہلی ذیلی مجلس کے داعی ڈاکٹر سید عبداللہ ہیں۔ اور اس کام کا مستقر لاہور ہے۔ یہ مجلس سرکاری دفتری اور عدالتی زبان سے متعلق ہے اور اس کا کام زندگی کے تمام مسائل سے متعلق لوازم میں اردو کے عملی نفاذ کے متعلق سفارشات پیش کرنا ہے۔

۲۔ دوسری مجلس کے داعی ڈاکٹر سید محی الدین شیخ الجامعہ اسلام آباد یونیورسٹی ہیں۔ اس کا مستقر اسلام آباد ہے۔ اس مجلس کا کام اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا اور اس کا ر گراں کی راہ میں حائل دشواریوں کو حل کرنا ہے۔

۳۔ تیسری مجلس کے داعی شیخ منظور الٰہی رکن وفاقی پبلک سروس کمیشن ہیں یہ مجلس مقابلے کے امتحانات سے متعلق ہے اس کے فرائض میں صوبائی پبلک سروس کمیشنوں کے ساتھ رابطہ پیدا کر کے مقابلے کے امتحانات اور دیگر دفتری امتحانات کا ذریعہ اردو مقرر کرنا ہے۔

۴۔ چوتھی مجلس کے داعی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ہیں۔ یہ مجلس طباعتی مشینوں، رسم الخط اور خطاطی سے متعلق ہے۔ اس وقت اردو کے ٹائپ رائٹروں کی کیفیت یہ ہے کہ ہر مشین پر ٹائپ کرنے والا دوسری مشین پر ٹائپ نہیں کر سکتا کیونکہ کلیدی تختہ ہر کمپنی اپنے ٹائپ رائٹر کا خود متعین کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ان ٹائپ رائٹروں میں بہت سے حروف علامات اور ہندسوں

کی عدم موجودگی ان کے نامکمل ہونے پر دال ہیں۔ مجلس نے اس سلسلہ میں کافی کام کیا اور ایک ایسا کلیدی تختہ تیار کر لیا ہے جس سے نہ صرف بیک وقت ٹیلی پرنٹر اور ٹائپ رائٹر دونوں کا کام لیا جا سکے گا۔

۵۔ پانچویں مجلس کے داعی کراچی یونیورسٹی کے شعبہ حیوانیات کے صدر ڈاکٹر سید حامد محمود ہیں۔ یہ مجلس قومی زبان میں کام کرنے والے اداروں میں رابطہ قائم کرنے کا کام کرے گی۔ تاکہ مختلف اداروں میں ایک ہی وقت میں یک ماں موضوعات کا ٹکراؤ نہ پیدا ہو اور ہر ادارے کا کام بھی سہل ہو جائے۔

۶۔ چھٹی مجلس کے داعی پروفیسر اسد اللہ بھٹو ہیں۔ اس مجلس کا عارضی دفتر سکھر میں ہے۔ اس مجلس کا کام صوبائی رابطہ پیدا کرنا ہے۔ اور یہ جائزہ لینا ہے کہ قومی زبان کس طرح صوبوں میں بھی انگریزی کی جگہ لے سکتی ہے۔

۷۔ ساتویں مجلس کے داعی ڈاکٹر منظور احمد صدر کلیہ فنون کراچی یونیورسٹی ہیں۔ یہ مجلس ابلاغ عامہ سے متعلق ہے۔ اس مجلس کا کام یہ ہے کہ وہ ابلاغ عامہ کے اداروں مثلاً خبر رساں ایجنسیوں اور اخبارات وغیرہ میں زبان و بیان اور اصطلاحات کے متعلق جو فاش غلطیاں پائی جاتی ہیں انھیں دور کر کے اور انگریزی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کر کے ایسی مستند لغت تیار کرے جو سب کے لئے سند ہو۔

۸۔ آٹھویں مجلس کے داعی ڈاکٹر محمد ایوب قادری ہیں۔ جو صدر شعبہ اردو، اردو کالج کراچی ہیں۔ یہ مجلس طباعت واشاعت سے متعلق ہے۔ اس مجلس کے ذمے مقتدرہ کی ضروری مطبوعات کی فراہمی، دوسرے اداروں کے ایسے کام کہ جو اردو کے نفاذ اور اس کی ثروت سے متعلق ہوں لیکن رقم کی عدم فراہمی کی بنا پر التوا میں ہوں ان کی طباعت واشاعت نیز "اخبار اردو" کے نام سے مقتدرہ کے ایک ماہنامے کا اجراء بھی شامل ہے۔ جو مقتدرہ کے مقاصد اور امور کا علمبردار بھی ہو گا۔

۹۔ نویں مجلس کے داعی ڈاکٹر محمد اسلم فرخی ناظم شعبہ تصنیف و تالیف کراچی یونیورسٹی ہیں۔ یہ مجلس "ترجمہ" سے متعلق ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ ایسی کتب و رسائل اور تحریروں کی نشان دہی کرنا کہ جو اردو کی ترقی میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں اور اس کے علاوہ پاکستان بھر کے اعلیٰ مترجمین کی فہرست مرتب کرنا بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہے۔

۱۰۔ دسویں مجلس کے داعی ڈاکٹر رضی الدین ہیں۔ یہ مجلس اصطلاحات و لغات کے متعلق ہے۔ اردو میں فنی و علمی اصطلاحات کا سلسلہ گذشتہ ڈیڑھ سو برس سے جاری ہے اور زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ جاری ہی رہے گا۔ اس مجلس کا بنیادی کام مختلف اداروں کی وضع کردہ اصطلاحات میں یکسانیت پیدا کرنا اور انھیں استعمال کرنا نیز یہ دیکھنا کہ آیا زندگی کے کسی گوشہ سے متعلق اردو میں اصطلاحات کا دامن تنگ تو نہیں ہے۔

انجمن ترقی اردو

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی گو کہ افراتفری انتشار اور بد نظمی کا شکار ہو گئی۔ اور بظاہر اہل ہند یہ جنگ ہار گئے لیکن اس کے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ اور ان کے گہرے اثرات سیاستِ ہند پر مرتب ہوئے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے دل میں آزادی کی تڑپ اور لگن کی شمع روشن ہو گئی۔ آزادی حاصل کرنے کے کئی طریقے تھے۔ یا تو جنگ کی جاتی یا سیاسی طور پر انگریزوں کو شکست دی جاتی۔ یا مصالحت اور فریب کی راہ اختیار کی جاتی۔

تو پہلی کوشش کا نتیجہ منظر عام پر آ ہی چکا تھا۔ دوسری کوشش کے لئے ہندوستانیوں کے پاس کوئی پس منظر نہیں تھا لہٰذا تیسرا طریقہ اختیار کیا گیا یعنی مصالحت اور فریب۔ اس کا طریقۂ کار اس طرح سے متعین کیا گیا کہ پہلے تو قوم کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا جائے۔ جب یہ کچھ ہو جائے تو اہلِ ہند کو اعلیٰ عہدوں پر جانے کی ترغیب دی جائے۔ فوج میں بھی ملکی اشخاص کی اسی طریقۂ کار کے تحت اکثریت پیدا کرنا مقصود تھا۔ غرض کہ جب انتظامیہ کے معتدبہ حصے پر ملکی تو تیں غلبہ پالیں تو آزادی کی تمام کاوشیں روبہ عمل لائی جائیں۔

سرسید نے اسی خیال کو ذہن میں رکھ کر مسلمانوں کے لئے علاوہ اوران کی مادری زبان یعنی اردو میں نبرد لیت کیا۔ چنانچہ غازی آباد سائنٹفک سوسائٹی و علی گڑھ کالج اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ انگریز یہ بات خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ کہ جب تک مسلمانوں کی وابستگی اردو زبان کے ساتھ رہے گی وہ کبھی بھی انگریز کی حاکمیت کو خلوص قلب کے ساتھ قبول نہیں کریں گے۔ لہٰذا اس نے اردو کی اہمیت و حیثیت کی تصغیر کی غرض سے ہندی اور سنسکرت کی حوصلہ افزائی کی۔

حورج کیمبل گورنر بنگال نے ۱۸۷۱ء میں صوبہ بنگال میں ہندی کو لازمی قرار دے دیا۔ اور دیگر کئی صوبوں میں جب یہ تحریک چلی کہ ہندی کو لازمی قرار دیا جائے تو سرسید نے ۱۸۷۳ء میں الہ آباد میں ایک جلسہ کیا جس میں اردو زبان کی حفاظت اور ہندی و ناگری کی خواہ مخواہ ترویج کو روکنے کی غرض سے ایک مرکزی مجلس بنائی جس کی شاخیں تمام ضلعوں میں بنائی گئیں گو کہ سرسید کی جوابی تحریک سے حامیانِ ہندی وقتی طور پر دب گئے لیکن درپردہ کوششیں کرتے رہے۔ تاآنکہ ۱۸۷۹ء میں علی گڑھ میں "بھاشا سمردھنی سبھا" قائم کی جس کے اجلاس میں اردو کو خاص مسلمانوں کے ساتھ مخصوص کر کے اردو دشمنی کو مسلمان دشمنی کی بنیاد بنایا۔ انہی دنوں صوبۂ متحدہ کے گورنر میگڈونل کہ جو اپنے پیش رو حورج کیمبل سے بھی زیادہ متعصب اردو زبان تھے۔ صوبۂ متحدہ کی عدالتوں میں ناگری رسم الخط کو بھی اردو کے ساتھ لازمی قرار دے دیا گیا۔

سرسید کی وفات کے بعد ان کے جانشین محسن الملک اور مولوی بشیر الدین ایڈیٹر "البشیر" نے اپنے قلم سے میکڈونل کا مقابلہ شروع کیا۔ اسی سلسلے میں لکھنؤ میں ایک "مجلس تحفظ اردو" قائم ہوئی۔ ۸ اگست ۱۹۰۰ء میں اس کا جلسہ ہوا جس میں محسن الملک نے اپنی تقریر کے سحر سے تمام حاضرین کو مسحور و مبہوت کر دیا۔ میکڈونل بھلا "تحفظ اردو کی تحریک کو" ...

نواب سلطان جہاں والیٔ بھوپال سے ۶۰۰ روپیہ سالانہ بعد ازاں ۳۰۰۰ روپے سالانہ امداد ملی۔ مطبوعات و رسائل کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب اپنے اصل مقصد یعنی اردو میں علمی مضامین کی تعلیم کا پرچار بھی کرتے رہے۔ لیکن سب سے بڑی رکاوٹ جو اردو کتب کی راہ میں حائل تھی وہ یہ کہ اردو میں جدید علوم کی اصطلاحات ناپید تھیں تمام مفاہیم و مطالب ادا کرنے سے قاصر رہتی تھیں۔ مولوی صاحب نے اصطلاحات علمیہ کی لغت مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔

۱۹۲۰ء سے انجمن نے نئے نئے منصوبے بنانے شروع کئے بعض ایسی کتب شائع کیں کہ جن کا آج بھی جواب نہیں۔ ان کے منصوبوں میں اصطلاحات، پیشہ وراں، اصطلاحات علم جدید۔ اردو کی جامع و ضخیم لغت کی ترتیب اور اردو انگریزی لغت کی طباعت شامل ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں ہی وحید الدین سلیم کا مشہور مقالہ وضع اصطلاحات طبع ہوا۔ ادا اسی سال

عبدالرحمٰن بجنوری کا مقالہ محاسنِ کلامِ غالب شائع ہوا۔ اب انجمن کی کتب نے اپنی خصوصیات کی بناء پر خود کو اہلِ علم کی نگاہوں میں وقیع بنالیا تھا۔ مولوی صاحب نے ۱۹۲۱ء جنوری میں رسالہ اردو جاری کیا تھا۔ اردو کے اجراء کو تقریباً ۵۹ برس گزر چکے ہیں لیکن اہلِ علم بخوبی جانتے ہیں کہ جس قدر وقیع، علمی، لسانی، اور ادبی مضامین و مقالات اس رسالہ میں شائع ہوئے آج تک کسی بھی رسالے کو اس ذیل میں اس سے دعویٰ ہمسری نہ ہوسکا۔ اردو میں مطبوعہ مقالات میں سے بیشتر ایسے تھے جنہیں بعد ازاں کتابی صورت میں علاحدہ شائع کیا گیا۔ اور آج بھی یہی کیفیت جاری ہے۔ مولوی صاحب کی کاوشِ پیہم سے ۱۹۲۲ء تک انجمن کی سالانہ آمدنی ۲۰ ہزار کے لگ بھگ ہوچکی تھی۔ لہٰذا اس کے حسابات کی باقاعدہ تنقیح سرکاری عہدہ داروں سے کرائی جانے لگی ۱۹۲۴ء میں انجمن ترقی کا نیا آئین بنا اور اک باقاعدہ مجلسِ نظما قائم کی گئی۔ جس کے حسبِ ذیل اراکین مقرر کئے گئے۔

۱۔ نواب عماد الملک بلگرامی (صدر) ۲۔ سر راس مسعود
۳۔ نواب صدر یار جنگ شیروانی ۴۔ نواب قدر یار جنگ
۵۔ مولوی غلام یزدانی ۶۔ سید ہاشمی فرید آبادی
۷۔ حکیم اجمل خاں ۸۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال (لاہور)
۹۔ مولانا عبدالحلیم شرر (لکھنؤ) ۱۰۔ مولانا ابوالکلام آزاد (کلکتہ) ۱۱۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (ڈھاکہ)
۱۲۔ مولوی عبدالحق (معتمد)

اسی سال یعنی ۱۹۲۴ء میں ہی مولوی صاحب کی اقامت گاہ کے قریب ایک مکان لے کر اس میں انجمن ترقی کا پہلا مطبع کھولا گیا جو کہ ٹائپ کے حروف پر مشتمل تھا۔ گو کہ اس خط کی پذیرائی خاطر خواہ نہ ہوئی لیکن اسے وقت کی اہم ضرورت سمجھ کر اختیار کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں انجمن کے صدر نواب عماد الملک بلگرامی کا انتقال ہوگیا۔ دیگر معاملات کو چھوڑ کر ان کی خدمات کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے عہدِ صدارت میں انجمن کی سالانہ آمدنی ۵۰ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ نواب عماد الملک کے بعد سر راس مسعود کو مجلسِ نظما نے انجمن کا نیا صدر منتخب کیا وقت کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انجمن نے ۱۹۲۸ء میں رسالہ "سائنس" جاری کیا جس میں یورپ کے جدید ترین علمی انکشافات اور فنی اختراعات کو صحت کے ساتھ اردو خواں طبقے سے متعارف کرایا جاتا تھا۔ اس کام میں جامعہ عثمانیہ کے لائق اساتذہ کرام نے بڑی معاونت کی۔

مولوی عبدالحق ۱۹۳۰ء میں اورنگ آباد کالج کی صدارت سے سبکدوش ہوئے تو حکومت حیدر آباد نے انہیں جامعہ عثمانیہ کا صدر شعبہ اردو مقرر کردیا۔ نیز اردو زبان کیسے پھلتا پھولتا دیکھ سکتے تھے۔ فوراً علی گڑھ پہنچ گئے اور ٹرسٹیوں کو دھمکی دی کہ اگر کالج کا سیکرٹری ایسی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث رہا تو کالج کو سرکاری امداد نہیں دی جائیگی۔ محسن الملک "مجلس تحفظ" کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ عہدہ تو نہیں چھوڑا البتہ اردو کے کام سے دست کش ہوگئے۔

ٹکسٹو کی مجلس صدر کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔ لیکن علی گڑھ میں دو ڈھائی برس بعد تعلیمی کانفرنس میں ایک شعبہ علمیہ قائم کیا اور جنوری ۱۹۰۳ء کے اجلاس دہلی میں اس کا نام "انجمن ترقی اردو" رکھا گیا۔ اس کے پہلے صدر پروفیسر ٹامس آرنلڈ اور سیکرٹری شبلی نعمانی منتخب ہوئے۔ انجمن کے ابتدائی دور میں مغربی سائنس اور فلسفہ کے تراجم کی طرف زیادہ زور دیا گیا۔ شبلی کی عظیم الشان شخصیت کا یہ اثر ہوا کہ بے شمار مسلمان اس نوزائیدہ انجمن کے

معاونت اور رکنیت کے لئے تیار ہو گئے۔ شبلی کے استعفیٰ کے بعد حبیب الرحمٰن شیروانی کو دسمبر ۱۹۰۵ء میں سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اس وقت انجمن کی حالت کا اندازہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں کراچی کی ایک رپورٹ سے ہوتا ہے۔ جس میں انجمن کا کل سرمایہ ۱۲۹۱ روپے ۱۰ آنے ۴ پائی ظاہر کیا گیا ہے۔ انجمن کی انتظامی مجلس کے پہلے صدر پروفیسر آرنلڈ اور نائب صدور میں حالی۔ ڈپٹی نذیر احمد ذکا اللہ جیسے نامی گرامی اہلِ قلم شامل تھے۔ اسی طرح اس دور کے کئی محترم اربابِ صحافت اور اکابر مصنفین بھی انجمن سے وابستہ تھے۔ لیکن ان سے مشورہ بیشتر خط و کتابت کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ کیونکہ ان میں سے ہر شخص علاوہ مقام پر اقامت گزیں تھا۔ حبیب الرحمٰن شیروانی کے دور میں تقریباً ۵ کتب انجمن کی طرف سے شائع ہوئیں۔ جن میں نپولین کی سوانح حیات ۵ جلدوں میں قابلِ ذکر ہیں۔

سنہ ۱۹۰۹ء کے اواخر میں حبیب الرحمٰن شیروانی نے سیکرٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ان کے بعد مولوی عزیز مرزا کو جو اسی سال حیدرآباد سے ریٹائرڈ ہو کر آئے تھے اور بڑے قابل اور ذی علم انسان تھے۔ انجمن کا سیکرٹری منتخب کیا گیا یکالی داس ناٹک اور وکرم اروسی کا ترجمہ انہیں کی یادگار ہے۔ انجمن نے سنہ ۱۹۰۳ء تا سنہ ۱۹۱۲ء کے دوران صرف ، کتابیں شائع کیں۔

انجمن ترقی اردو ابھی تک لشتم پشتم چل رہی تھی۔ اور اس کے جسدِ جامد میں تحریک کے کوئی آثار نہیں تھے کہ ایک عظیم الشان واقعہ رونما ہوا۔ اور وہ واقعہ مولوی عبدالحق کا سیکرٹری مقرر کیا جانا تھا۔ چونکہ مولوی صاحب کا قیام اورنگ آباد میں تھا۔ لہٰذا انجمن کا تمام دفتر اورنگ آباد منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت تک انجمن محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ذیلی ادارے کے طور پر کام کر رہی تھی۔ لیکن حیدرآباد آنے کے بعد انجمن نے خود اتنی ترقی کر لی

کہ اب وہ کانفرنس سے آگے نکلنے لگی۔ علی گڑھ میں انجمن کی کوئی مجلس انتظامی نہیں تھی۔ اراکین کی تین قسمیں قرار دی گئی تھیں۔

۱۔ سرپرست :۔ وہ حضرات جو انجمن کو یک مشت ایک ہزار روپے عطا فرمائیں۔

۲۔ ارکان دوامی :۔ وہ حضرات جو پانچ سو روپے یک مشت عطا فرمائیں۔

۳۔ ارکان شوریٰ :۔ جن سے علمی مسائل میں مشورہ لیا جائے علی گڑھ کے دور میں اولین دو مدیں تو بالکل خالی رہیں تیسری قسم میں بہت سارے نام تھے لیکن ان سے علمی مشورہ شاذ ہی لیا جاتا تھا۔

مولوی عبدالحق نے انجمن کی تنظیم نو کی اور ایسے ۴۱ اراکین کی مجلس انتظامی بنائی کہ جو واقعی انجمن کے کام میں معاونت کر سکیں انجمن کے نئے صدر کے لئے نواب عماد الملک (سید حسین بلگرامی) کو منتخب کیا گیا۔ انہی کی کاوشوں سے انجمن کو نظام حیدرآباد سے ۱۲۰۰ روپے سالانہ بعد ازاں ۵۰۰۰ روپے سالانہ۔ کی ایک وسیع، جامع اور اشتقاقی لغت کی تدوین کے لئے ۴۰۰۰ روپے کی امداد بھی جاری کی۔ ۔۔۔ جس کی ابتدائی مدت ۱۰ برس مقرر ہوئی۔ اس وقت اردو میں فیلن پلیٹ، نور اللغات اور فرہنگ آصفیہ وغیرہ مستعمل تھیں۔ مولوی امیر مینائی نے ایک بڑی لغت کا آغاز ہی کیا تھا کہ وہ راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ مولوی عبدالحق نے جدید لغت کی ترتیب و تدوین کا کام بڑے زور و شور سے شروع کیا۔ اور اپنا نائب مولوی احتشام الدین حقی کو مقرر کیا۔ استنا د وغیرہ کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، پنڈت دتاتریہ کیفی۔ ہاشمی فرید آبادی، پنڈت ونشی دھر وغیرہ تھے۔ دس

بارہ برس میں لغت کا بہت سا سرمایہ فراہم ہوگیا۔ اس کے چند اجزاء بطور نمونہ حیدرآباد کے سرکاری مطبع میں چھپے بھی تھے۔ کہ آزادیٔ ہند کی تحریک نے سب کچھ منتشر کردیا۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں سر راس مسعود کا انتقال ہوا اور صدارت کے لئے سر تیج بہادر سپرو کو منتخب کیا گیا۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں انجمن کو دہلی منتقل کردیا گیا۔

دہلی آکر انجمن کے اک نئے دور کی ابتدا ہوئی۔ اگر ہم گذشتہ ۲۵ سالوں پر روشنی ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ انجمن فی الواقعی اک آزاد اور خود مختار ادارہ اورنگ آباد سے منتقل کے بعد ہی بنی۔ وگرنہ اس سے قبل تو وہ علی گڑھ کانفرنس کا ایک ذیلی ادارہ تھی۔ ۲۵ برس میں ایک سو کے قریب نئی کتب شائع کی گئیں۔ اور دو رسالے "اردو" اور سائنس کا اجرا کیا گیا۔

انجمن ترقی اردو ہمیشہ ایک علمی اور ادبی ادارہ رہی لیکن سنہ ۱۹۳۶ء سے چند شر پسندوں۔ کچھ کانگریسیوں اور کچھ کٹر متعصب ہندوؤں نے اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کی کوشش شروع کیں۔ کانگریس اور گاندھی کی طرف سے کبھی اُردو کا نام ہندی، ہندوستانی تجویز کیا جاتا تھا۔ کبھی وردیا مندر اسکیم شروع کی جاتی تھی۔ غرض کہ ایک مسلسل جہاد تھا جو مولوی عبدالحق کو اردو کے مخالفین سے کرنا پڑ رہا تھا یہ تحریک اور اس کا جواب بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے لہٰذا اس سے قطع نظر ہم آگے چلتے ہیں۔

انجمن کی دہلی منتقلی نئی دہلی کی ایک کوٹھی "القریش" میں ہوئی جو کہ انجمن کے لئے کرائے پر لی گئی تھی۔ لیکن چند ماہ بعد ڈاکٹر آزاد انصاری کی کوٹھی "دریا گنج" کو کرائے پر لے کر انجمن کا صدر دفتر وہاں منتقل کردیا گیا جو کہ سنہ ۱۹۴۷ء تک وہیں پر رہا۔ مولوی صاحب نے سنہ ۱۹۳۹ء میں انجمن کا ایک نیا اخبار سہ روزہ "ہماری زبان" جاری کیا۔ یہ فل اسکیپ تقطیع کے ۱۶ صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ اس کی غایت اردو سے متعلق ہر قسم کے مباحث کا احاطہ تھا اس وقت اس کی قیمت ایک روپیہ سالانہ مقرر کی گئی۔ اسی سال انجمن کی طرف سے کل ہند اجتماع کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا اس عظیم الشان علمی اجتماع میں ہندوستان بھر سے بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ صرف ۲۰۰ کے قریب مختلف علوم کے عالموں اور شاعروں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا صدر مہدی یار جنگ کو مقرر کیا گیا۔ مولوی عبدالحق نے اپنی تقریر میں بتایا کہ انجمن کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ تمام ہندوستان میں اس کی ۱۸۰ شاخیں باضابطہ کام کررہی ہیں۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ یونیورسٹی نے بابائے اُردو کو ان کی علمی اور ادبی خدمات کے سلسلے میں ڈی لٹ (D. Litt) کی ڈگری عطا کی اس سے قبل سنہ ۱۹۳۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے مولوی عبدالحق کو ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی تھی۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں انجمن نے ایک نیا ماہنامہ "معاشیات" شائع کرنا شروع کیا۔ جس میں معاشی یا اقتصادی مضامین و معلومات ہوتی تھیں۔ تقسیم پاکستان سے قبل انجمن کے پاس تقریباً ایک لاکھ روپیہ "محفوظ" میں اور ایک لاکھ روپیہ بلڈنگ فنڈ میں موجود تھا۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں مولوی صاحب نے ۷۴ ہزار روپے کہ جو ان کی تمام عمر کا اندوختہ تھا انجمن کے عشق میں اس کی نذر کردیا۔ صرف اردو کے عشق میں ایسا ایثار آج تک عدیم النظیر ہے۔ مولوی صاحب نے ہندوستان بھر کے طول و عرض کے طویل طویل دورے کئے۔ جگہ جگہ انجمن کی شاخیں قائم کیں۔ اردو اسکول کھولے۔ تقریریں کیں۔ کانفرنسیں بلائیں غرضیکہ تقریباً ساٹھ ہزار میل کا سفر اردو کی ترقی و ترویج

کے لئے گیا۔ مولوی صاحب نے ۱۹۱۴ء میں کراچی میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی۔ جو ابتداء میں فعال نہ تھی لیکن ۱۹۲۲ء میں سیٹھ فدا علی علی بھائی کی مالی اعانت سے اس میں نئی جان پڑ گئی کراچی میں انجمن کا کتب خانہ بھی ان ہی کی امداد سے وجود میں آیا۔ ۱۹۲۷ء میں افسر صدیقی امروہوی (جو کہ ماشاء اللہ ابھی بقید حیات ہیں اردو کے نہایت نامور مورخ، محقق اور ماہر مخطوطات ہیں۔ کراچی منتقل ہو گئے۔ افسر صدیقی انجمن کی کراچی شاخ کے سیکرٹری بھی رہے اور انھوں نے اپنی معتمدی کے دوران انجمن کی بے پناہ تشہیر کی۔ اور لوگوں میں متعارف کرایا۔ اس دوران کچھ شرپسند عناصر نے سندھی زبان کو اردو کا مقابل بنانے کی کوشش کی لیکن انجمن کی بروقت تدابیر سے یہ فتنہ چنگاری کی صورت میں ہی ختم ہو گیا۔ ستمبر ۱۹۲۶ء میں کراچی میں ایک عظیم الشان کانفرنس ہوئی جس کا افتتاح مولوی عبدالحق اور صدارت چودھری خلیق الزماں نے فرمائی۔

پنجاب یونیورسٹی میں السنہ شرقیہ کے مختلف امتحانات ہوتے تھے اور ان کی اسناد بھی دی جاتی تھیں لیکن ان کی تعلیم کا کوئی سرکاری انتظام نہ تھا۔ لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے کے لئے سید اخلاق احمد دہلوی نے انجمن کی سرپرستی میں "اردو کالج" ۱۹۴۹ء قائم کیا۔ جہاں اس کی کلاسیں رات میں ہوتی تھیں۔ اس کے صدر پنڈت دتاتریہ کیفی اور اخلاق احمد دہلوی کی مسلسل کاوشوں نے اس کالج کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ۱۹۵۰ء میں انجمن کے صدر دفتر نے خود بھی اردو کی تعلیم و اشاعت کے سلسلے میں تین معیاری امتحانات (واقف اردو۔ قابل اردو۔ فاضل اردو) کا انعقاد شروع کیا بعد ازاں یہ سلسلہ مختلف صوبائی مراکز تک پھیل گیا۔ ۱۹۴۸ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کا جدید آئین مرتب کرا کے اس کی رجسٹری کرا دی گئی اور انجمن ترقی اردو پاکستان کا پہلا صدر شیخ عبدالقادر کو منتخب کیا گیا۔ لیکن سال بھر کے اندر ہی ان کا انتقال ہو گیا لہٰذا ۱۹۵۰ء میں مجلس نظما نے مولوی عبدالحق کو ہی انجمن کا صدر مقرر کر دیا۔ ۱۹۵۱ء میں انجمن نے پاکستان میں پہلی بار ایک عظیم الشان اردو کانفرنس بمقام کراچی منعقد کی جس کے ذیلی اجلاسوں میں کئی قراردادیں منظور کی گئیں۔ جو کہ اُردو کی ترقی، پاکستان کی سرکاری زبان۔ علمی امور میں معاونت وغیرہ پر مبنی تھیں اس کانفرنس کا افتتاح خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان نے فرمایا۔

پاکستان آ کر انجمن نے "ترقی اردو کالج" کی تاسیس کی۔ ویسے تو دہلی میں بھی انجمن کی زیر نگرانی ترقی اردو کالج قائم ہو چکا تھا۔ لیکن جیسے کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس کی کوئی سرکاری حیثیت نہ تھی۔ نیز فارسی کے علاوہ کسی بھی مضمون کی تدریس کا انتظام نہ تھا۔ اس کے برخلاف کراچی میں جو کالج قائم کیا گیا اس میں دوسرے سرکاری کالجوں کی طرح بی۔ اے اور ایم۔ اے تک کے مدارج کی جملہ جدید علوم کی تدریس کا مکمل انتظام تھا۔ لیکن خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ذریعہ تعلیم انگریزی کے بجائے اردو تھا۔ اس کے نتائج بہت حوصلہ افزا ہے۔ لہٰذا انجمن نے کالج کا الحاق سندھ یونیورسٹی سے کرنا چاہا۔ لیکن پہلے تو سندھ یونیورسٹی نے الحاق کی درخواست مسترد کر دی بعد ازاں کافی جانچ پرکھ کے بعد جولائی ۱۹۵۹ء میں اردو کالج کو اپنے ساتھ ملحق کر لیا۔ ۱۹۵۳ء میں سائنس کی کلاسیں شروع کی گئیں اور اولین صدر کلیہ سائنس میجر آفتاب حسن کو مقرر کیا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں مولوی عبدالحق کا انتقال ہو گیا۔ مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد اختر حسین صاحب کو صدر اور جمیل الدین عالی کو اعزازی سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ دونوں حضرات تاحال انہی عہدوں پر فائز ہیں۔ مشفق خواجہ کی علیحدگی کے بعد پروفیسر شبیر علی کاظمی کو رسالہ "اردو" اور "قومی زبان" کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

کیا۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان رسائل کی بقا اور ان کے معیار کو برقرار رکھنے میں جو کاوشیں اور جدوجہد پروفیسر شیخ عیسیٰ کاظمی نے کی ہے وہ انہی کا حصہ ہیں۔

اردو کی تاریخ میں انجمن ترقی اردو پہلا ادارہ ہے کہ جس نے اردو زبان و ادب کے فروغ کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اب اس کے قیام کو تقریباً ۸۸ برس ہونے والے ہیں لیکن آج بھی انجمن کا تعمیری کام اردو کی ترقی کے دیگر اداروں کے ہجوم میں منفرد اور نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ انجمن کی بے بہا خدمات کو دانستہ نظر انداز کرنے کے باوجود بھی ہم یہ بات ہرگز فراموش نہیں کر سکتے کہ انجمن وہ ادارہ ہے جس نے برصغیر میں علم کی فضا پیدا کی۔ ادب کا ماحول تخلیق کیا۔ تصنیفات کا شوق اور تالیفات کا ذوق ابھارا۔ تحقیق کا معیار بلند کیا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انجمن نے مسلمانانِ پاک و ہند میں تحقیقی مذاق کی نشوونما کی، لوگوں کو اپنی زبان پر فخر کرنا سکھایا اور اپنی زبان و ادب سے محبت کا سلیقہ پیدا کیا۔ انجمن نے ہی لسانی اور ادبی تحریکات کو وسعت دی۔ اور عوام الناس کی شمولیت سے اس کی قوت کو اساس فراہم کی۔ اردو میں تنقید اور تنقیدی نظریات کو روشناس کرایا۔ فرمائش سے لوگوں کو کام کرنے پر اکسایا تصنیفات کرائیں اور پھر انہیں شائع کرکے علمی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ غرض کہ اپنی جہدِ مسلسل سے اردو کو وہ وقعت و شان عطا کی کہ جس کی بنا پر ہم اسے دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے سامنے فخر یہ پیش کر سکتے ہیں۔

انجمن کی مطبوعات کو ہم مندرجہ ذیل عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

مخطوطات۔ تذکرے، قواعد و لغت۔ قاموس الکتب و اشاریہ جات۔ تاریخ و شخصیات۔ غالبیات۔ مجموعہ مقالات و مضامین۔ فلسفہ، سائنس اور علاقائی ادبیات وغیرہ۔

مخطوطات :۔

بابائے اردو نے اردو زبان کی اصل اور تاریخ پر کافی کام کیا۔ دورانِ کار انہیں ایسے مخطوطات دستیاب ہوئے کہ جن کے وجود نے اردو زبان کی قدامت میں اضافہ کیا بابائے اردو نے نصرتی۔ وجہی اور دکن کے بہت سے قدیم شعراء کے کلام کو مدون کرکے شائع کیا۔

قواعد و لغت :۔

اردو کی ترقی کے لئے ضروری تھا کہ لغات و قواعد کو باقاعدہ اور منظم طریقے سے مرتب کیا جاتا۔ نئے علوم و فنون کے لئے مناسب اصطلاحات تو ہر دور کی بنیادی ضرورت رہی ہیں۔ لہٰذا انجمن نے مولوی ظفر الرحمٰن دہلوی سے "فرہنگ پیشہ وراں" چار جلدوں میں مرتب کراکے شائع کی۔ اس کے علاوہ علوم و فنون کی مصطلحات مرتبہ محی الدین اجمیری بھی قابلِ قدر کام ہے۔ علاوہ ازیں انجمن نے نباتات، فلکیات کیمیا، جغرافیہ اور سائنس کے دیگر علوم کی اصطلاحات وضع کرکے شائع کیں۔ لغات میں انجمن کی اسٹوڈینٹس ڈکشنری، لغتِ کبیر اور اسٹینڈرڈ پاپولر ڈکشنری قابلِ ذکر ہیں۔

تذکرے :۔

تذکرے اردو زبان کے شعراء و ادباء سے متعلق معلومات کا قدیم ترین ذریعہ ہی نہیں بلکہ ہماری تنقید کے ابتدائی نقوش بھی انہی میں ملتے ہیں۔ شعراء کے حالات و کلام کی تحقیق کا بنیادی ماخذ آج تک نہ صرف تذکرے ہی ہیں۔ لہٰذا انجمن نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے بہت سے قابلِ قدر معروف اور گوشۂ گمنامی میں دھندلائے ہوئے تذکروں کو مشہور اہلِ قلم

اور محققین حضرات سے مرتب کرا کے شائع کیا ہے۔ اِن میں چند ایک تذکرے یہ ہیں۔ نکات الشعراء۔ تذکرہ ریختہ گویاں شامِ غریباں۔ عقد ثریا۔ گلشن ہمیشہ بہار۔ تذکرہ آزردہ تذکرہ قطعہ منتخب۔ عروس الاذکار۔ تذکرہ میرحسن۔ تذکرہ گوکل پرشاد۔ تذکرہ ہندی۔ ریاض الفصحاء۔ تذکرہ اہلِ دہلی مدائح الشعراء۔ مخزن نکات۔ چمنستان الشعراء۔ گل عجائب مخزن الشعراء۔ گلزار ابراہیم وغیرہ۔

قاموس الکتب :-

اہلِ تحقیق اس دشواری سے ضرور واقف ہیں کہ جو کسی بھی موضوع پر تحقیق کے دوران انھیں پیش آتی ہے۔ ہمارے یہاں تحقیق کا نظام نہایت ہی غیر منظم اور ناقص بنیادوں پر استوار ہے۔ ایک محقق سب سے پہلے تو موضوع پر کتب تلاش کرتا ہے اس کام میں اسے اتنا عرصہ گذر جاتا ہے کہ تحقیق اس کے لئے کارِ محال ثابت ہونے لگتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قاموس الکتب کا منصوبہ پیش کیا تھا۔ علاوہ ازایں ان کے پیشِ نظر اردو کی مطبوعہ کتب کی موضوع وار فہرست اور تعداد کا اظہار بھی تھا۔ اس سلسلے کی پہلی جلد مولوی صاحب نے اپنی نگرانی میں مرتب کرا دی تھی۔ جو مذہبیات پر مشتمل ہے۔ اس کی ضخامت ۱۴۰۰ صفحات کے قریب ہے اور اس میں مختلف مذاہب پر تقریباً ۱۲ ہزار کتب کے حوالے موجود ہیں۔ قاموس الکتب کی جلد دوم تاریخ و سوانح کے موضوع پر ہے۔ گو کہ جلد دوم میں خاصی اغلاط موجود ہیں لیکن ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد زِ اوّل۔ قاموس الکتب کی تیسری جلد بھی شائع ہو چکی ہے یہ جلد عمرانی علوم کے موضوع پر ہے۔ تیسری جلد کے مواد کی تلاش و تحقیق میں زیادہ تفحص سے کام نہیں لیا گیا۔ لہٰذا اس میں بعض مقامات پر خامی و تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

تاریخ و شخصیات :-

انجمن ترقی اردو کی اولین ترجیحات میں گو کہ تاریخ کا شمار نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انجمن تاریخ کی اہمیت سے منکر نہیں۔ لہٰذا اس نے تاریخ و شخصیات پر حسبِ ذیل کتب شائع کر کے اپنی تاریخ پروری کا ثبوت دیا ہے۔ جنوبی یورپ پر بربروں کے حملے۔ ہندوستان پسِ منظر و پیشِ منظر تاریخ مسلمانانِ روس۔ جغرافیہ قرآن۔ سلطنت عثمانیہ کی انقلابی تحریکیں۔ تاریخ یونان و روما۔ تاریخ عرب (قبل مسیح) کا مشاہداتِ کابل و باغستان۔ مرزا غازی بیگ ترخان۔ لکھنؤ اس کی بزمِ ادب۔ جلال لکھنوی۔ محمد حسین آزاد۔ حیات آثار سودا از شیخ چاند وغیرہ۔

غالبیات :-

غالب ہماری شاعری اور نثر کے ایسے ستون ہیں کہ جن کے تذکرے کے بغیر تاریخ نظم و نثر ادھوری رہ جاتی ہے مرزا کی نثری تحریریں یعنی ان کے خطوط اہلِ علم کے لئے ہمیشہ نمونۂ عمل اور ان کی شاعری اہلِ فکر کے لئے دعوتِ مبارزت ثابت ہوتی ہے۔ انجمن نے غالب پر کئی کتب اور مقالات شائع کئے ہیں۔ چند ایک بطورِ نمونہ درج ذیل ہیں۔ فلسفہ کلام غالب۔ غالب ایک مطالعہ۔ نگار خانۂ آشوب غالب نامہ آور۔ ترجمہ تاریخ مہر نیمروز۔ گل رعنا۔ آئینۂ کمالات۔ رسالہ اردو اور قومی زبان کے غالب نمبر علمی حلقوں میں بار پا چکے ہیں۔

انجمن نے پاکستان کے علاقائی ادب پر بھی توجہ دی ہے۔ اور اس سلسلے میں سندھی، پنجابی، پشتو اور بلوچی کی مشہور کتب اردو میں ترجمہ کرا کے شائع کی ہیں۔ تا کہ اہلِ

اردو علاقائی اثرات کے رنگ کو بھی اردو میں استعمال کر کے اس کی خوبصورتی اور ثروت میں اضافہ کر سکیں۔ لہٰذا پشتو شاعری ابیات سلطان باہو۔ پنجابی کے پانچ قدیم شاعر۔ مرچ مرچ مہران حالات و افکار وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

انجمن کے رسائل :-

بابائے اردو نے اردو کی ترویج اور نشو و نما نیز اردو داں طبقے میں مذاقِ تحقیق پیدا کرنے کی غرض سے ایک رسالہ "اردو" کے نام سے جنوری ۱۹۲۱ء میں جاری کیا تھا۔ درمیان کے دو مختصر وقفوں کو چھوڑ کر یہ رسالہ آج تک جاری ہے۔ اردو زبان و ادب اور ادبی رسائل کی تاریخ میں اردو کی اہمیت و حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں شائع ہونے والے ادبی رسائل کی تاریخ میں بہت سے مقالات ایسے تھے کہ جو بعد ازاں کتابی صورت میں طبع ہو کر بے حد مقبول ہوئے۔ اردو میں آج تک تہذیب، تاریخ، فلسفہ، تنقید، تحقیق اور تخلیق ادب پر اعلیٰ درجے کے مقالات و مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس رسالے نے ہمارے فکری دھارے کو جس طرح متاثر کیا۔ وہ عدیم النظیر ہے

قومی زبان کا اجراء انجمن ترقی اردو کے ترجمان کی حیثیت سے ہوا تھا۔ لیکن اس جریدے نے اتنی ترقی کر لی کہ اُسے آج اردو زبان کے موقر مجلہ ہائے تحقیق و تنقید میں گردانا جاتا ہے۔ قومی زبان کی خدمات کا دائرہ بھی رسالہ اردو کی طرح وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری پروفیسر نیشنل کالج کراچی "نئے خزانے" کے عنوان سے مختصر موقر مجلہ ہائے علم و ادب میں مطبوعہ مقالات و مضامین کی فہرست بلحاظ موضوع مع تعداد ماہ و سال تحریر کر کے قومی زبان میں شائع کراتے ہیں۔ قومی زبان کی وقعت و مرتبہ کا انحصار صرف یہی سلسلہ مضامین سرانجام دیتا ہے

بقیہ ۳۲۳ پر

اس کام کے سلسلے میں ابو سلمان شاہجہانپوری کی خدمات احاطہ تحریر سے باہر ہیں۔

ہم محترمی شبیر علی کاظمی کو بے نظیر خدمات اور اعلیٰ مدیرانہ صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ کہ جن کی مساعی جمیلہ سے ہی قومی زبان اور اردو کے قالب میں روح اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ متحرک ہے۔

محفل میں جگہ نہیں پا سکتی۔ شبلی اور آزاد کا انداز نگارش بھی اس قدر اچھوتا اور پرکشش تھا کہ ان کی تصانیف ان کی حیات میں ہی طبع ہو کر مشہور و مقبول ہو گئیں۔ سرسید کے عظیم الشان علمی سرمائے کو مجلس نے ۱۶ جلدوں میں دیدہ زیب طریقہ سے شائع کیا ہے۔ اس میں ان کے مقالات، خطبات، مکتوبات اور دیگر تصانیف کا احاطہ کیا گیا ہے۔

حافظ محمود شیرانی جدید تحقیق کے بانی قرار دئیے جاتے ہیں۔ مجلس نے ان کی تمام تصانیف و مضامین کو ان کے پوتے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی سے مدون کروا کر کئی جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اس طرح مولوی محمد شفیع مرحوم کے علمی نقوش کو مجلس نے ان کے فرزند احمد ربانی سے مدون کرائے۔ چار جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ مجلس نے نفسیات فلسفہ، ڈرامہ، سیاسیات، تنقید، ملفوظات۔ تواریخ اور عمرانیات، تعلیمات، سائنس، ثقافت، اسلامیات، اقبالیات، غالبیات، مطالعہ قرآنی۔ مذہبیات، داستانیں، قواعد السنہ، منظومات، مراثی، حکایات، قصص، امثال، اخلاق و معاشرت، سفرنامے، مکتوبات، خطبات، سوانح وغیرہ کے موضوعات پر نہ صرف ملکی مصنفین کی تحریر کردہ کتب شائع کیں۔ بلکہ ان موضوعات پر عالمی شہرت یافتہ مصنفین کی کتب بھی اردو میں ترجمہ کرا کے شائع کیں

رحمٰن کیانی

اردو، ہندسے، اوزان اور اعشاریائی نظام

جس دن سے حکومت نے نئی تعلیمی تجاویز پیش کی ہیں اہل الرائے حضرات، اخبارات، اساتذہ اور طالب علم انگریزی کی بالادستی کے خلاف اظہارِ رائے کرتے رہے ہیں۔ ردّ و کد کے بعد معلوم ہوا کہ راعی اپنی رعایت کو اس حد تک رعایت دینے پر تیار ہو گئے ہیں کہ اگلے تعلیمی سال سے انگریزی کے مکتبوں میں بھی یعنی کچی پہلی سے اردو کو باریابی مل جائے گی۔ اس طرح اگلے بارہ سال میں دسویں جماعت تک اور اٹھارہ سے بیس سالوں میں اگر ترویج میں کوئی ہیر پھیر نہیں ہوئی تو جامعہ کی سطح تک اردو ذریعۂ تعلیم رائج ہو جائے گا۔

اردو کے متعلق پچھلی حکومت نے جو طریقِ کار اپنایا اس پر غالب کا شعر

ع تیرے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔

صادق آتا ہے۔ اور موجودہ صورتِ حال پر بھی غالب ہی کا ایک اور شعر یاد آتا ہے۔

ع دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

کیونکہ معاملہ سیدھا اور صاف ہے۔ اردو کسی علاقائی زبان کی حریف نہیں۔ مغربی سامراج اور دورِ غلامی کی یادگار انگریزی کی مخالف ہے۔ پاکستان میں اردو کا قومی اور سرکاری مقام ہماری تاریخ، ثقافت اور نظریۂ پاکستان کا ایک جزوِ لازمی ہے، اس لئے مسئلۂ کشمیر کی طرح اردو کے معاملے کو مزید کھٹائی میں ڈالے رکھنا اور ۹۵ فیصد عوام کو ع

آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

کی حالت میں گرفتار رکھنا ممکن ہے اقوامِ متحدہ اور مغربی

طاقتوں کی پالیسی سیاست میں جائز ہو۔ اسلامی طرز فکر اور عدل و انصاف کے تقاضوں کے سراسر خلاف ہے۔

ہم بھی فلسفہ "دیر آید درست آید" پر عمل کر لیتے اگر یہ یقین ہوتا کہ اب انگریزی کے غیر فطری فروغ کو روک دیا گیا ہے۔ اور اردو کو اب آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کئے جا رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں ان شعبدہ بازیوں کو چھوڑ کر جو ہمارے سیاستدان اور سابق سرکاری حکام کرتے رہے ہیں۔۔

پچھلے بیس سالوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو آج تک مندرجہ ذیل عملی اقدامات کے ذریعے اردو کو ناکارہ اور مجہول بنا کر پاکستان بدر کرنے کی ماضی میں جو کوشش ہوتی رہی وہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے۔

اردو کو مجہول بنانے کی پہلی باقاعدہ کوشش اسوقت ہوئی جب ایک سرکاری حکم کے ذریعے اردو ذریعہ تعلیم کی تمام درسگاہوں اور درسی کتابوں سے اردو ہندسوں کو کان پکڑ کر نکال دیا گیا اور انگریزی ہندسوں کو زبردستی رائج کیا گیا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ ہندسوں کا موجد ہندوستان ہے۔ عربوں نے علم ہندسہ ہندوستان سے سیکھا اور ہندی ہندسوں کی شکل کو آسان اور غیر مبہم بنا کر اختیار کیا۔ یورپ میں یونانیوں نے ہندسے ایجاد کیے تھے جو بعد میں رومن ہندسوں کے نام سے معروف ہوئے۔ رومن ہندسوں کو اپنی سادگی کے باوجود ریاضی میں استعمال کرنا ناممکن تھا اسلیئے مغربی اقوام نے تھوڑے سے ردّ و بدل کے بعد عربی ہندسوں کو اختیار کیا۔ اور انکو عربی ہندسے ہی کہتے ہیں۔ عربی، ہندی اور فارسی کی طرح اردو کا ایک جز ہے ہمارے بزرگوں کے سامنے ہندی اور عربی دونوں ہندسے تھے لیکن انہوں نے بھی ہندی کے مقابلے میں عربی ہندسوں کو زیادہ واضح ہونے کی بنا پر معمولی سی تبدیلی کے بعد اردو میں اختیار کیا۔ اس جگہ پر مختلف ہندسوں کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھنے سے بات سمجھ میں آجائے گی۔

ہندسے اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں

رومن ہندسے خارج از بحث ہیں۔ باقی ہندسوں کی اصل ہندی ہندسے ہے۔ جنکو ترقی دے کر عربوں نے اختیار کیا اور ان ہی کی نوک پلک سنوار کر اردو کے ہندسے بنائے گئے۔ ہماری مشرقیت، عربی سے لگاؤ، اسلامی دنیا سے تعلق اور قومی انا کے تو یہ تقاضے ہیں کہ ہم اپنے ہندسوں کو برقرار رکھتے۔ زیادہ سے زیادہ افغانستان، ایران اور عرب ممالک جہاں ہم شکل ہندسے رائج ہیں۔ گفت و شنید کے بعد مراکش سے پاکستان تک یکساں ہندسے استعمال کرنے کا انتظام کرتے۔

کیا اچھا ہو کہ موجودہ حکومت جو اللہ کے فضل و کرم سے قومی نظریہ حیات، تشخص اور کردار کی طرف مائل ہے۔ ماضی کی اس غلطی کا ازالہ کرے اور درسی کتابوں، درسگاہوں، ڈاک کے ٹکٹوں، سکوں، کرنسی نوٹوں، گاڑیوں کی تختیوں اور تمام متعلقہ جگہوں پر اردو کے ہندسے استعمال کرنے کے احکامات صادر کرے اور بالخصوص ابلاغ عامّہ کے اداروں اور اشتہاری اداروں پر زور دے کہ وہ اردو ہندسے استعمال کریں۔

اردو کو ناکارہ بنانے کی دوسری کوشش سابق حکومت کے دور میں شروع ہوئی اور ماضی قریب میں تکمیل کو پہونچی۔ یہ اعشاریائی نظام کو رائج کرنے کے بہانے اردو اور علاقائی زبانوں کے تمام ناپ تول کے پیمانوں کی منسوخی تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ اعشاریائی نظام بہتر ہے لیکن اس کا

ہندی	१	२	३	४	५	६	७	८	९	१०
عربی	١	٢	٣	٤	٥	٦	٧	٨	٩	١٠
اردو	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
انگریزی	1	2	3	4	5	6	7	8	9	10
رومن	I	II	III	IV	V	VI	VII	VIII	IX	X

مطلب یہ نہیں کہ ہم ناپ تول کے پیمانوں کو قدر و قیمت کے ساتھ انکے نام بھی اپنی زبانوں سے خارج کردیں۔ اور زبان کو صدیوں پرانے محاوروں، کہاوتوں اور اشعار سے محروم کردیں۔ اب کوئی بتائے کہ پل میں تولہ پل میں ماشہ، سیر کا سوا سیر، گز بھر کی زبان، چھٹنکی پہلوان، وغیرہ وغیرہ محاورے آج سے دس بیس سال بعد کسی کی سمجھ میں آئیں گے۔

اس سلسلے میں لطف کی یہ بات ہے کہ لوگوں کو انگریزی کا گرین یعنی دانہ اور گرام یعنی چنا تو منظور ہے لیکن اردو کا چاول اور رتی نامنظور ہیں۔ اگر پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگوں کی طرح اعشاریائی نظام رائج کرنا ہوتا تو ہم اعشاریائی نظام کی چھوٹی سے چھوٹی مقدار کو ایک سرسئی کا نام دیتے اور دس سرسئی برابر ہے* ایک رتی اور دس رتی برابر ہے ایک ماشہ، دس ماشہ برابر ہے ایک تولہ، دس تولہ برابر ہے ایک چھٹانک، دس چھٹانک برابر ہے ایک سیر اور سو سیر برابر ہے ایک من، سو من برابر ہے ایک میٹرک ٹن غور کرلیتے اور اپنی زبان کو نقصان پہونچائے بغیر اعشاریائی اوزان رائج ہوجاتے۔

اسی طرح ناپ کے سلسلے میں ہم اگر بال، سوت، گرہ، گز، جریب اور کوس کو اعشاریائی نظام کے برابر مقرر کردیتے تو مسئلہ حل ہوجاتا۔ اور پلی، چلو، ڈول اور پیر وغیرہ ایسے پیمانے موجود ہیں کہ جنکو لیٹر وغیرہ کے ہم وزن بناکر قومی اور علاقائی زبانوں کے لیے مسائل پیدا کئے بغیر اعشاریائی نظام رائج کرسکتے ہیں۔

اردو کے ہندسے اور ناپ تول کے پیمانوں کو زبان سے سرکاری طور پر خارج کرنے کے بعد اب اسکو قومی کاروبار سے بالکل خارج کرنے کے لئے گنتی کو بھی منسوخ کردیا گیا ہے۔ پچھلے چند ہفتوں سے ریڈیو، ٹیلیویژن اور انگریزی اخباروں نے لاکھ، کروڑ اور ارب وغیرہ کا استعمال یکسر بند کردیا ہے۔ مان لیا کہ ہمارے رتی، ماشہ، تولہ، سوت، گرہ، گز وغیرہ غیر مساوی اور غیر اعشاریائی تقسیم کی بنا پر ملک بدر کردیئے گئے۔ لیکن ہماری گنتی تو اکائی، دہائی، سینکڑے ہزار کے بعد بھی اعشاریائی تقسیم کے عین مطابق لاکھ، کروڑ، ارب، کھرب، پدم، نیل اور سنکھ تک جاتی ہے۔ آخر اسکو منسوخ کرکے چار سو ہزار اور پیر ملین، بلین کا اوٹ پٹانگ طریقہ اختیار کرنے کا کیا تک ہے۔

آدمی حیران ہوجاتا ہے جب ہمارے اربابِ اقتدار ایک طرف یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم قومی زبان کو اسکا جائز مقام

* ایک چاول اور ڈیڑھ چاول برابر ہے

دے رہے ہیں اور اسکو ایک طویل عمل کے سپرد کر کے
اٹھارہ (۱۸)، بیس (۲۰) سال تک ٹال دیتے ہیں اور دوسری
طرف زبان کے ضروری اجزاء کو ایک بعد ایک بحر معطل اور
فوری طور پر خارج کر دیتے ہیں۔

اس صورت حال سے ایک بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے
کہ ارباب اقتدار اگر چاہتے تو ہماری تاریخ، تہذیب، ثقافت،
نظریہ پاکستان اور فرمودات قائد اعظم اور قوم کی امنگوں،
جذبات اور اکثریت کا خیال کر کے پہلی جگہ پر نئی تعلیمی
تجاویز میں انگریزی کی بالادستی برقرار نہ رکھی جاتی، نہ دوسری
جگہ پر معاملے کو کم از کم بارہ سال تک ٹالنے کی کوشش کی
جاتی۔ نہ قومی اور علاقائی زبانوں کے بندھنوں، اوزان اور
گنتی کا اس بے دردی سے قتل عام کیا جاتا۔

جدیدیہ غزبور کے حامی یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے طرفدار نہ
بین الاقوامی تقاضوں سے واقف ہیں اور نہ صنعتی، تجارتی،
اور سائنسی ضروریات کا کوئی علم رکھتے ہیں۔ یہ وہی بات
ہے کہ قوم بے وقوف ہے اور اسکے لئے جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ
قوم کے مستقبل کے لیے ٹھیک ہے۔

بات یوں نہیں ہے قوم جانتی ہے کہ ان نام نہاد بین الاقوامی
تقاضوں کے پیچھے مغربی استعمار کا بھیانک چہرہ چھپا ہوا ہے
اشتراکیت اور سرمایہ داری مغربی مادہ پرست استحصالی
طاقت کے بہروپ ہیں۔ اور انکا اصل مقصد ایشیائی
اور افریقی اقوام کو اپنا غلام بنائے رکھنا ہے۔

مغرب اپنی تہذیب، اپنی فکر، اپنی زبان اور سفید اقوام
کو دنیا میں سب سے اعلیٰ و ارفع سمجھنے کے خبط میں مبتلا ہے
مادی برتری اور ٹیکنالوجی ایجادات کی بنا پر وہ تمام بین الاقوامی
اداروں پر اقلیت میں ہونے کے باوجود انتہائی بے شرمی
سے مسلط ہے۔ ان اداروں کے ذریعے انکی کوشش ہے کہ
دنیا کی تمام تہذیبوں، مذہبوں، ثقافتوں اور زبانوں کو مٹا کر
خود مسلط ہو جائے اور تا قیامت مسلط رہے۔

ان نام نہاد بین الاقوامی اداروں کے ذریعے پاکستان میں بھی
کوشش ہو رہی ہے کہ ہم اپنی زبان، تہذیب، ثقافت
اور مذہب سے دست بردار ہو کر بڑی طاقتوں کے غلام
بن جائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک طرف ہمارے ملک میں بے
پردگی، عریانی، فحاشی، شراب نوشی اور ہر قسم کی تمام
بداخلاقی پھیلانے کے لیے سر توڑ کوشش کی جا رہی ہے
دوسری طرف ہمارے درمیان بد اعتقادی، لادینیت،
لسانی، علاقائی اور نسلی منافرت کو فروغ دینے کے لئے
پورا زور لگایا جا رہا ہے۔

بدقسمتی سے یہ ہی عناصر ہر جگہ موجود ہیں۔ کلیدی عہدوں،
ابلاغ کے ذرائع اور بیشتر سیاسی تنظیموں پر مسلط
ہے۔ یہ لوگ جیسا کہ پہلے عرض کیا پاکستان کے بنیادی تشخص
کو ختم کرنے کے لیے نت نئے اقدامات کرتے رہتے
ہیں۔ قرارداد مقاصد کو منظور کرانے میں مولانا
شبیر احمد عثمانی اور انکے ساتھیوں کو کن صبر آزما
مرحلوں سے گزرنا پڑا سب جانتے ہیں! جونا گڑھ
اور مشرقی پاکستان کو پاکستان سے کس طرح الگ
کیا گیا۔ ہمارے سامنے کی بات ہے۔ بین الاقوامی اداروں نے
ان حصوں کو الگ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا لیکن کشمیر
کی بازیابی میں آج تک ان اداروں نے ہماری مدد نہ کی بلکہ
روڑے ہی اٹکائے۔

یہ ہی بین الاقوامی ادارے اور ان کے منظور نظر پاکستان
میں اسلامی نظام کے نفاذ کو روکتے رہے اور جب ہم

اس کارِ خیر پر تل گئے ہیں تو ایک کے بعد ایک اڑنگے لگا رہے ہیں۔ یعنی پہلے اردو کے ہندسے غائب کیے گئے پھر ناپ تول کے پیمانے اور اب اردو کی گنتی کا بھی جھٹکا کر دیا گیا۔ یہ ہی بین الاقوامیت کل ہم سے تقاضہ کرے گی کہ اپنے حروفِ تہجی سے دست بردار ہوجائیں اسکے بعد زبان کی باری ہے۔ لیکن جسطرح اس نام نہاد بین الاقوامیت یعنی مغربی ابلیسیت کے علی الرغم ہم نے اسلامی نظام نافذ کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہمیں ان کی اور ان کے حواریوں کی مرضی کے خلاف نہ صرف اپنی زبان، بلکہ تہذیب، ثقافت اور لباس کی نگہداشت کرنا پڑے گی۔

اردو کو باقاعدہ طور پر نقصان پہونچانے میں ایک مخصوص طبقے کے علاوہ بالعموم تجارتی اداروں اور بالخصوص اشتہاری اداروں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ امریکی امداد کے لازمی نتیجے ارتکازِ زر اور افراطِ زر نے ہمارے تجارتی طبقے کو باپ دادا کے بتائے ہوئے اصولوں کو چھوڑ کر امریکی یہودیوں کے گُر اور طریقے اپنانے پر مائل کیا۔ کچھ نے خود اور کچھ نے اپنی اولاد کو یہ ہتھکنڈے سیکھنے کے لیے امریکہ بھیجا۔

یہ عبرتناک مگر دلچسپ حقیقت ہے کہ پاکستان میں بننے اور بکنے والی اشیاء کا بھی انگریزی نام رکھنا بھی ضروری ٹھہرتا ہے۔ یعنی ماچس ہوگی تو فلائنگ ہارس یا ڈبل ایلی فینٹ۔ سلوائی شاید ہی کوئی ہو سب سویٹ میٹ مرچنٹ ہیں۔ درزی کوئی بھی نہیں ہے سب ٹیلر ماسٹر ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسکو عام آدمی محسوس نہ کرتا ہو۔ آپ روز اخباروں میں، ریڈیو پر، ٹی۔ وی پر ان اشتہارات کا مشاہدہ کرتے ہونگے۔ کیا واقعی اس صورتِ حال کا سدِّباب ممکن نہیں ہے۔

قوم کے درد مندوں، قائدِاعظم کے پیروکاروں، نظریۂ پاکستان کے دعوے داروں اور عوام کے غمخواروں سے عرض ہے کہ ہمارے قومی تشخص کا تقاضہ اور علم و عقل کا حکم ہے کہ ہم اپنی قومی زبان کو ہر سطح پر جلد از جلد نافذ کریں۔ اردو کے ہندسوں، اوزان اور گنتی کو برقرار رکھیں، تاجروں کو غیرت دلائیں، اشتہاری اداروں کا احتساب کریں اور حکومت سے ان جائز مطالبات کو پورا کرائیں۔

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

اُردو میں سائنسی ادب کا اجمالی تذکرہ

اردو میں سائنسی ادب ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کم اظہارِ خیال کیا گیا ہے حالانکہ یہ اپنی قدامت اور اہمیت کے اعتبار سے دوسری اصنافِ ادب سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ہماری زبان کے محققوں اور اہلِ قلم اصحاب نے سائنسی موضوعات پر کتابوں کی تلاش و جستجو اور ان پر لکھنے کی طرف بہت کم توجہ کی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ اردو میں سائنسی مسائل پر لکھنا زیادہ محنت اور وقت کا متقاضی ہے

اردو زبان کے علم برداروں نے اپنے آپ کو شعر و شاعری، افسانہ نگاری، انشا پردازی اور تنقید کی حد تک محدود رکھا۔ اور علم و فن کے دیگر شعبوں سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ناواقف اور بے بہرہ رہے۔

شاید یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہو کہ ادب اور سائنس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب سے اردو زبان میں مذہبی اور ادبی موضوعات پر لکھا جانے لگا تھا، اس کے قریب تر زمانے کی سائنسی موضوعات پر قدیم تحریریں ملتی ہیں۔ اردو زبان میں سائنسی ادب کے اولین کارناموں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اس زبان میں شروع ہی سے یہ صلاحیت موجود تھی۔ جب وہ منطق و فلسفہ اور تصوف و معرفت کے مسائل کی گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے اور حسن و عشق کی رنگین داستانیں نظم و نثر کے پیرائے میں پیش کر سکتی ہے تو علمی و فنی اور سائنسی موضوعات کے رموز و نکات کو بیان کرنے کی بھی اس میں صلاحیت موجود ہے۔

اردو زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس میں شعر و ادب کی جملہ اصناف کی تخلیق کے ساتھ ساتھ معاشرتی، سماجی اور سائنسی علوم و فنون بھی پروان چڑھتے رہے۔

طب، موسیقی، جنسیات، حیوانیات، فلکیات، ہندسہ اور طبعیات و کیمیا پر نثر و نظم میں قدیم ترین اردو مخطوطات دستیاب ہو چکے ہیں۔ سلطنتِ دکن کی بہمنی شاہی حکومت کے دور کے ایک شاعر شہاب الدین قریشی نے "بھوگ بل" (۱۵۰۳ تا ۱۵۴۳ء) کے نام سے ایک طویل مثنوی لکھی تھی۔ جس میں جنسیاتی مسائل کو بیان کیا گیا تھا۔ اس مثنوی کے دو

مخطوطے کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد دکن اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہیں۔ یہ دونوں مخطوطے میری نظر سے گذر چکے ہیں۔ اس مثنوی کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

بہت بھید بھاری ہیں ناری کیرے
ہنر بھوک ہیں اور نزاکت بھرے
ہنر ہیں کھیتی دھات ایک ایک رُت
کیتی جنس آسان ہور یا پرت
سو دار دو رمز اہے بھوک کے
لکھے ہیں پرک نار کی روک کے

مثنوی "بھوک بل" کے ساتھ ایک منظوم طبّی رسالہ بھی ہے جس میں مختلف بیماریوں کے علاج کے منظوم نسخے درج ہیں۔ مثلاً دفع خارشِ چشم کے عنوان کے تحت یہ نسخہ ہے۔

نیمو ستیں افیون لائے   انکھیاں کھجلانا جائے
انکھیاں اوپر لادے نیل   جادے سکلا کھجلانا

مذکورہ بالا حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے قدما اس راز سے بخوبی آگاہ تھے کہ زبان کی ترقی اور وسعت اس امر پر موقوف ہے کہ اس کے لکھنے والے کائنات کے گوناگوں مظاہر کی تفصیلات کو ضبطِ تحریر لائیں۔ انہوں نے یہ بھی اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ دنیا کے بیشتر علوم و فنون کو جو دوسری زبانوں میں ترویج پا چکے ہیں ان کو اردو زبان میں حتی الوسع منتقل کرنے کی کوشش کی جانی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے اس مقصد کو حاصل کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی تھی۔

کسی ملک و قوم کی علمی ترقی کے لئے ادبی تصنیفاتِ و اور تراجم کے پہلو بہ پہلو فنی اور سائنسی کتابوں کی تالیف و ترجمہ کا کام بھی بے حد لازمی ہے۔ آپکو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ اس خصوص میں اردو زبان برصغیر پاک و ہند میں کسی زبان سے پیچھے نہیں ہے۔ ۱۵۹۱ء سے لے کر اب تک سائنسی مضامین کی تالیف و ترجمہ کا کام اطمینان بخش رہا ہے۔ اور ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان کو نہ تو کبھی اپنی تنگ دامنی کا شکوہ رہا اور نہ اہلِ اردو نے اپنی زبان کی تہی دامانی کی شکایت کی۔ بدقسمتی سے گزشتہ ربع صدی سے بعض لوگوں کے ذہنوں پر یہ خام خیالی مسلّط ہو گئی ہے کہ سائنسی علوم و فنون کو اردو زبان میں منتقل کرنا نہ صرف، دشوار بلکہ بے سود ہے۔ ایسی ذہنیتوں کو اور کوئی الزام تو نہیں دیا جا سکتا البتہ ان کی سادہ لوحی، لاعلمی اور کوتاہ اندیشی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

دنیا میں زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اردو دوسرے نمبر پر ہے۔ (اور اگر اس کے ساتھ ہندی کو بھی برائے نام شریک کر لیا جائے) تو اس کے بولنے والوں کی تعداد ۲۸ کروڑ ہے اور چینی زبان بولنے والوں کی تعداد ۷۰ کروڑ ہے۔

یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں اردو کو Lingua . Franca کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ جب اسے یہ منصب عطا ہوا تو اس نے "جیو اور جینے دو" کے اصول پر کاربند رہ کر علاقائی اور مقامی زبانوں سے معاندانہ سلوک نہیں کیا بلکہ بڑے خلوص اور پیار سے ہر زبان کو اپنے گلے لگا لیا۔ چنانچہ اردو کے ساتھ ساتھ تمام علاقائی زبانیں بھی برابر ترقی کر رہی ہیں۔

اردو زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بڑی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ اردو زبان میں نہ صرف پاکستان اور ہندوستان کی زبانوں بلکہ عربی، فارسی، ترکی اور تقریباً تمام یورپی زبانوں کے بے شمار الفاظ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان پر غیریت اور بیگانگی کا گمان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ایک مخلوط اور کھچڑی زبان ہے۔ اس کا انوکھا پن اپنی مثال آپ ہے۔ چونکہ اس نے ہر زبان سے کچھ نہ کچھ الفاظ کو اپنایا ہے اس لئے اس کی فطرت میں بڑی ہم آہنگی ہے اور اس کا مزاج گنگا جمنی ہے۔

غیر منقسم ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں جہاں بھانت بھانت کی زبانیں اور بولیاں صدیوں سے رائج ہیں، فکر و خیال کی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے تقریباً گزشتہ پانچ صدیوں سے اردو زبان نے بہت اہم اور صحت مند کردار ادا کیا ہے۔ اردو زبان علاقائی حدود سے بلند و بالا ہے اس لئے برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے میں پہنچ کر نہ صرف وہاں کی زبانوں پر اپنا اثر ڈالا بلکہ خود بھی ان زبانوں کے اثرات کو قبول کیا۔ اس طرح یہ اردو زبان بہت جلد عوام کی بولی بن گئی اور تیس سالوں تک یہ عمل جاری رہنے سے اسے ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

اس دور کے تراجم اور تالیفات اردو زبان کی گذشتہ عظمت اور آئندہ ترقی کے امکانات کی آئینہ دار ہیں چنانچہ شمس الامراء (۱۸۳۲ء تا ۱۸۷۷ء) شاہ آف اودھ (۱۸۴۳ء تا ۱۸۵۳ء) دہلی کالج (۱۸۴۱ء تا ۱۸۵۷ء) سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ (۱۸۶۲ء تا ۱۸۷۷ء)، رڑکی انجینئرنگ کالج (۱۸۵۶ء تا ۱۸۸۸ء) انجمن پنجاب (۱۸۸۰ء تا ۱۹۰۰ء) اور دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ (۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۸ء) نے جو کتابیں شائع کی ہیں ان کی وجہ سے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک شاندار باب کا اضافہ ہوا ہے۔

شمس الامراء کی سرپرستی میں ریاضت، ہیئت، کیمیا، طبعیات اور طب مغربی پر تقریباً ۴۰ کتابیں شائع ہوئیں۔ شاہانِ اودھ، دہلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی، رڑکی کالج اور انجمن پنجاب کی طرف سے بھی ۵ سے زائد کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کے علاوہ انفرادی کوششوں سے ۱۹۰۰ء تک ۱۰۰ (سو) سے زائد کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ بالخصوص شمس العلماء منشی محمد ذکاء اللہ نے ریاضت اور جغرافیہ پر متعدد کتابیں لکھیں۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے تو مختلف سائنسی علوم پر ۴۰ سے زائد کتابیں شائع کی ہیں۔

قدیم مطبوعہ کتابوں میں "ٹریٹائز آف مینرل پائزنس" Treatise on Mineral Poisons سب سے پہلی کتاب ہے جس کا اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ یہ کتاب ۵" × ۹" کی تقطیع کے ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور لیتھو میں طبع ہوئی ہے۔ مترجم اور مقام کا کہیں بھی اندراج نہیں ہے۔ البتہ سرورق پر انگریزی میں کتاب، مصنف، مطبع اور تاریخ و سن طباعت ۱۵ر جولائی ۱۸۲۶ء درج ہے۔ اس کتاب کا رسم الخط لکھنے کی دوسری کتابوں جیسا ہے جو لیتھو میں طبع ہوئی ہے۔ کتاب کے صفحہ ۷ کی عبارت کا نمونہ۔

"آرسنک" انگریزی لفظ ہے اور معنی اس کے زہر جہے کا ہے۔ اس چیز کو عربی زبان میں سم الفار

بولتے ہیں اور اس کے معنی بھی زہر چوہے کے ہے لیکن سم الفار صرف اس چیز کی صفت ہے۔ اور سنسکرت میں سنکھیا اور شلا بولتے ہیں۔ فارسی زبان میں زرنیخ سفید بولتے ہیں اور شاید کہ زرنیخ لفظ (آرسنک) سے نکالی گئی ہے مگر تلفظ میں فرق ہوا ہے۔ ہندوستان کے لوگ کہتے ہیں کہ سم الفار کے عوام اس کو سنبل کھار کہتے ہیں"

اس کتاب میں طب مغربی کے اکثر اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کر دیا گیا تھا جن میں سے چند یہ ہیں۔

ورید Vein۔ اعصاب Nerves۔ پارا Mercury۔ مستقیم Rectum۔ پچکاری Injection۔ بطنِ الیسیر Left Vertical۔ بطنِ ایمن۔ Right Vertical۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام ۱۹۱۸ء کے ایک سال بعد ہی اردو زبان میں سائنسی اور دیگر علوم کی درس و تدریس کا آغاز ہوا۔ نصابی کتب کی تیاری کے لئے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس محکمے کے تحت ایک مجلس وضع اصطلاحات بنائی گئی جس نے مختلف علوم و فنون کی ہزاروں اصطلاحیں وضع کیں۔ موزوں اور مترادف الفاظ وضع کرنے کے لئے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی مجلس وضع اصطلاحات نے صوتی، لسانی اور ادبی خصوصیات کو پیش نظر رکھا اور ایسے الفاظ ہی وضع کئے جو اردو کے مزاج اور لب و لہجہ سے ہم آہنگ تھے۔ وضع اصطلاحات مجلس نے ایسے قابل افراد اور باکمال مترجمین کو دارالترجمہ میں یکجا کیا اور مختلف علوم و فنون میں کامل دستگاہ رکھتے تھے

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے ۳۰ سال کی مدت میں تقریباً ۵۰۰ علمی و فنی کتابوں کے تراجم کئے۔ جامعہ عثمانیہ کے طلبا انہی کتابوں سے استفادہ کر کے اپنی زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ طبعیات، کیمیا، ارضیات، نباتیات، حیوانیات، انجنیئرنگ، طب وغیرہ پر تقریباً ڈیڑھ سو کتابوں کے تراجم شائع ہوئے تھے۔

، جامعہ عثمانیہ غیر منقسم ہندوستان کی پہلی جامعہ تھی جس نے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر ایک کامیاب تجربہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا لیکن حیدرآباد پر پولیس ایکشن کے بعد جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم انگریزی کر دیا گیا جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ پاکستان میں اب اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا ہے۔ پاکستان کی تمام جامعات جامعہ عثمانیہ کے نقشِ قدم پر چل کر بہت جلد وہ مقام حاصل کر سکتی ہیں جو دنیائے تعلیم میں جامعہ عثمانیہ کے لئے طرۂ امتیاز تھا۔

بقیہ ۳۱۴

اور اس طرح اس نے اردو زبان و ادب و علم کے ارتقا میں جو کوششیں کی ہیں وہ کسی بھی ادارے کے لئے مشعل اور افراد کے لئے منبع نور و ہدایت ہو سکتی ہیں۔

ڈاکٹر اے ایچ کوثر

اردو میں علمی و سائنسی ادب کے فروغ میں دہلی کالج کا حصہ

زبان کی ترقی و فروغ کے لئے سازگار ماحول، حکومت وقت کی سرپرستی زمانے کی فضا کچھ ایسے عوامل و عناصر درکار ہوتے ہیں۔ جن کے تعاون سے وہ آگے بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ لیکن اردو کے ساتھ عجیب اتفاق یا زمانہ کی ستم ظریفی کہیے کہ نہ تو اس کو مناسب ماحول میسر آیا اور نہ ہی صحیح طریقے سے حکومت وقت کی سرپرستی حاصل ہوئی بلکہ اس نے اس وقت پھلنا پھولنا شروع کیا جب ایک طرف تو مسلمانوں کی حکومت کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف انگریز ہر قسم کے ذرائع و وسائل کو بروئے کار لاکر ہندوستان میں اقتدار حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ مسلمان انتہائی نامساعد حالات و گرداب کا شکار تھے۔ لیکن اس کے باوجود اردو اپنی ترقی کی راہیں بتدریج ہموار کرتی چلی جا رہی تھی۔ عام بول چال اور روزمرہ کی حد سے نکل کر علمی و سائنسی مواد کو اردو میں منتقل کرنے کی روایت کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس کی مقبولیت خاص و عام میں روز بروز بڑھ رہی تھی۔

اردو کی علمی و سائنسی ترقی کا نقطۂ آغاز

سولھویں صدی کا عشرۂ آخر کہا جا سکتا ہے ابتدا میں تو انفرادی کوششوں کی صورت میں کام ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں تحلیقات و تصنیفات کے ساتھ ہی علمی و سائنسی موضوعات پر بھی کام شروع ہو گیا تھا۔ اس کی ترقی و فروغ کے سلسلے میں شمس الامراء کی سرپرستی، ان کی علم دوستی اور علم پروری نے اس پر علم کی راہیں کھول دیں۔ شاہد صاحب کا کہنا ہے کہ "فخر الدین شمس الامراء کو ترقی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی۔ مغربی علوم و فنون خصوصاً ریاضی وغیرہ کی کتابیں اردو میں مغربی علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی پہلی اور منظم کوشش تھی"۔ [1]

مغربی علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنے کی اس قابل قدر سعی کے نتیجے میں کئی ایک سائنسی و علمی کتب اردو میں ترجمہ و تصنیف کی گئیں جن کے

---

[1] اردو میں سائنسی ادب، خواجہ حمید الدین شاہد حسن ۶۵ باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی
۲۱ اگست ۱۹۶۹ء

طفیل اردو کے بھی دامن میں علم وحکمت کے خزانے داخل ہونے شروع ہوئے۔ شاہان اودھ نے بھی مغربی علوم وفنون کو اردو میں منتقل کرنے میں خصوصی دلچسپی لی۔ آخری شاہان اودھ کو ان علوم اور بالخصوص علم ہیئت سے اس قدر دلچسپی تھی کہ انھوں نے انگریزی زبان سے مختلف سائنسی علوم کی کتابوں کے ترجمے کرائے اور مطبع سلطانی سے شائع کئے گئے۔ ل۱

اس کے بعد اردو کی علمی وسائنسی ترقی کے ذریعے کے لئے باقاعدہ منظم موثر اور باعمل کردار دہلی کالج اس کے اساتذہ اور ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی (Vernacular Translation Society) نے ادا کیا اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ دہلی کالج کی سب سے بڑی خصوصیت جو اس کو دوسرے اداروں اور مدرسوں سے ممتاز و ممیز کرتی ہے۔ وہ اس کا اردو ذریعہ تعلیم تھا جس کی داغ بیل یہیں سے پڑی دہلی کالج صرف ایک تدریسی ادارہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ نشاۃ الثانیہ کا بڑا علمبردار اور اردو کی علمی وسائنسی ترقی کا بہت بڑا محرک بھی تھا کیونکہ لغاب ضروریات کے پیش نظر مغربی علوم وفنون کی کتب کا اردو میں ترجمہ ہونا بہت ضروری تھا

غرضکہ یہ مدرسہ غازی الدین کے نام سے مشرقی تعلیم وتدریس کا مرکز رہا۔ یہاں عربی فارسی، قرآن تفسیر وحدیث، فقہ، نجوم اور ہیئت وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی)۔ اقتصادی وسیاسی بدحالی کی وجہ سے اس کی تعلیمی حالت بتدریج خراب ہوتی گئی۔ دہلی ایک طویل مدت تک مسلسل بدنظمی اور سیاسی انتشار کا شکار رہی۔ مسٹر آرجے ٹیلر کی تعلیمی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے "دہلی میں تعلیم کی توسیع کی فوری ضرورت ہے۔ پرانے مدرسے بے توجہی کا شکار ہیں۔ عوام کی حالت اس قدر خستہ ہے کہ اچھے اچھے خاندانوں کے بچے تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ دہلی میں کئی مدرسے ایسے ہیں جو مالی امداد کے ضرورتمند ہیں۔ اس کے علاوہ دہلی میں کئی صاحب ذوق اور ... بھی موجود ہیں جو تعلیم دینے کے فرائض بخوبی انجام دے سکتے ہیں" مسٹر ٹیلر نے غازی الدین خان کے مدرسہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "یہ مدرسہ بھی غفلت کا شکار ہے۔ مولوی عبداللہ بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ اور طلبار کی کل تعداد ۹ ہے"۔ ۲

مسٹر ٹیلر کی اس رپورٹ کو کمیٹی نے منظور کیا اور نئی تعلیمی پالیسی مرتب کی۔ مدرسہ غازی الدین کی عمارت کو مرمت کروا کر اسی میں دہلی کالج کھولا گیا۔ ۶۰۰ روپیہ ماہانہ برطانوی عطیہ کے نتیجے میں اس کا افتتاح عمل میں آیا۔ مسٹر ٹیلر ۷۵ اروپیہ ماہوار مشاہرہ پر اس کے مہتمم مقرر ہوئے۔

ل۱۔ اردو میں سائنسی ادب۔ ص ۱۱۹

۲ دہلی کالج اردو میگزین قدیم دلی نمبر ۲۰ راپریل ۱۹۵۳ء۔ Educational Despatch From The Governer General To The court of Directors, EIC Dated, 27, January

کالج کے ممتاز اساتذہ کرام میں مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور، مولوی مملوک علی، مولوی امام بخش صہبائی، مولوی سبحان بخش، ماسٹر رام چندر، ماسٹر وزیر علی، ماسٹر امیر علی، مولوی ذکاء اللہ، مولوی ڈاکٹر ضیاء الدین، ماسٹر پیارے لال آشوب، موتی لال، پنڈت رام کشن دہلوی، ماسٹر حسینی، ماسٹر نور محمد، پنڈت جودھیا پرشاد، محمد حسین آزاد، نذیر احمد اور مولوی احمد علی وغیرہ جنرل کمیٹی نے تعلیمی ہدایات میں قدیم علوم، فقہ، حدیث، تفسیر، فارسی، عربی اور اردو کے علاوہ ریاضی، تاریخ، جغرافیہ کی تدریس پر بھی زور دیا۔ طالب علموں کی اعلیٰ کارکردگی پر وظائف بھی مقرر ہوئے۔ بعد میں سر چارلس مٹکاف کی سفارش پر انگریزی شعبہ بھی کھولا گیا جس کیلئے ڈھائی سو روپیہ ماہوار مزید امداد کا اضافہ ہوا۔ دہلی میں پہلی بار انگریزی زبان اور مغربی علوم کی طرف توجہ دی گئی۔ مدرسہ غازی الدین دہلی میں نئے علوم کے دور کا پہلا باب ثابت ہوا۔

۱۸۲۹ء میں نواب اعتماد الدولہ وزیر لکھنؤ نے مدرسے کے مشرقی علوم کے شعبہ کے لئے ایک لاکھ ستر ہزار روپے کی رقم وقف کردی۔ کالج میں مشرقی و مغربی دونوں شعبے یکساں اہمیت کے حامل تھے۔ اس کالج کی نمایاں خوبی یہی تھی کہ تمام علوم مغربی، ریاضی، سائنس ہیئت، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم بذریعہ اردو دی جاتی تھی۔ اردو ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے مشرقی شعبے کے طالب علموں کو مغربی علوم سے مستفید ہونے کی سہولت حاصل ہوگئی تھی۔ دونوں شعبوں کے طالبعلم آپس میں خوب گھل مل کر کام کرتے ہوئے ترقی کی جانب گامزن تھے۔ مشرقی و مغربی شعبے کے اساتذہ اور طلبا ایک دوسرے کی مدد سے مختلف علوم کی کتابوں کو انگریزی سے ترجمہ اردو میں کرتے تھے۔ یہ ترجمے مشرقی شعبے کے نصاب میں بھی شامل کئے جاتے تھے۔ اس طرح اردو میں مغربی علوم کا اضافہ بتدریج ہو رہا تھا۔ تعلیمی رپورٹ سے یہ اندازہ ہوا کہ مشرقی شعبہ کے طلبا مغربی شعبہ کے مقابلے میں بہت نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

۱۸۴۱ء میں فلیکس بوترون (FLEX BO-UTROS) ایک فرانسیسی ماہر تعلیم دلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے وہ ایک دوراندیش و وسیع النظر انسان تھے۔ ان کی علمی قابلیت مسلمہ تھی ان کی بدولت کالج کی علمی ترقی میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔ مشرقی شعبہ جس میں مغربی علوم کی تدوین و ترویج کی طرف توجہ کرکے کالج کا نام بلند کیا انہوں نے دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی (Verna-cucar TransLation Society) بھی قائم کی۔

ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی مغربی علوم و فنون اور مغربی تہذیب و تمدن سے روشناس کرانے کے لئے عمل میں لائی گئی تھی۔ یہ سوسائٹی ہندوستان بھر میں انیسویں صدی کی سب سے مشہور و سرگرم انجمن تھی۔ جس کی بدولت اردو کی علمی و سائنسی تحریک انتہائی لگن اور شوق کے ساتھ جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے آگے بڑھی اس سوسائٹی کے ممبران نے پوری سرگرمی و ذوق و شوق کے ساتھ نہ صرف خود کام کیا بلکہ دیگر اہل علم

اصحاب کو اس طرف مائل کیا اور عوام کو بھی جدید علوم سے آگاہ کرنے کا بیڑا اٹھایا مغربی علوم و فنون جدیدہ کو اردو میں ترجموں کے ذریعے منتقل کرنے کے سلسلے میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ تصنیف و تالیف اور تراجم کے اصول متعین کئے گئے۔ تاکہ اردو زبان میں زیادہ سے زیادہ مغربی علوم کے تراجم شائع کر کے اس کی علمی حیثیت کو منوایا جائے۔ اس کی بنیاد کو ٹھوس اور مضبوط بنا کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن کیا جائے۔ گارساں دتاسی نے بھی اپنے خطبات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی ایک قابل تعریف جماعت ہے جس نے ادبی تعلیمات اور تحقیق گرانی کی اشاعت میں بہت بڑا کام کیا ہے اس انجمن کا سکریٹری ہمارا ہم وطن موسیو بوتروس تھا جو اس وقت دلی کالج کا پرنسپل تھا[1] اس سوسائٹی کا نام The Society for the Promotion of the Knowledge in India through the Medium of [VER]NACULAR Languages.

اس سوسائٹی کے سرپرست و معاون ہندوستانی اور انگریز دونوں ہی تھے۔ انتظامیہ کمیٹی مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھی۔

(۱) ٹی ٹی مٹکاف (۲) سی گرانٹ (۳) اے سی ریلزنشا (۴) ڈبلیو سیلن کونش (۵) دوارکا ناتھ ٹیگور اور پرنسپل دہلی کالج مسٹر بوترو فیلکس تھے۔

یہی سب سے سرگرم کارکن تھے۔ مغربی علوم بہترین اور بلند پایہ معیاری کتب کا ترجمہ اردو میں کرنا طے پایا اور درسی کتب کی اشاعت کا کام بھی ساتھ ہی جاری کیا گیا۔ مسٹر فلیکس بوترو اور رام چندر کا علمی تعاون بہت سی علمی، سائنسی کتابوں کے ترجمے اور تخلیق کا باعث ہوا۔ حساب اور فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کی جاتیں۔ جس کی اصلاح و نظر ثانی کا کام مسٹر فلیکس بوترو ہی کرتے۔ انگریزی کے طلبا سے بھی انگریزی کتابوں کے ترجمے اردو میں کرائے جاتے اور ان کی حوصلہ افزائی کے طور پر ان کتابوں کے طبع ہونے پر انہیں انعام بھی دیا جاتا۔ انجمن کا پروگرام تو یہ تھا کہ انگریزی، عربی، فارسی اور سنسکرت کی اعلیٰ و بلند پایہ کتب کے ترجمے ہندی اور بنگالی میں پیش کرے مگر اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں ترجمے کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

اس انجمن کے توسط سے سو سوا سو کے قریب کتابیں شائع ہوئیں جن میں سب سے زیادہ تراجم تھے۔ اس میں علم ریاضی، الجبرا جیومیٹری، سائنس جراحی، تاریخ، جغرافیہ، سوانح عمری، تذکرے، قانونی کتب اردو کے ادب کے نادر نسخے، حفظان صحت، علم نباتیات، معدنیات، گرامر، لغات، طب، مذہب، فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، مختلف النوع موضوعات شامل ہیں۔ اس سوسائٹی کا یہ بڑا قابل قدر کارنامہ ہے کہ اس نے جدید علمی و سائنسی ذخائر کو اردو میں داخل کیا اور مغربی تہذیب و تمدن سے روشناس کرایا ہمارے اندر سیاسی سماجی و ادبی اور سب سے زیادہ جدید علمی شعور پیدا

---

[1] خطبات گارساں دتاسی پانچواں خطبہ ص ۹۷، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سنہ اشاعت ۱۹۳۵ء

کیا۔ ہمارا ادب فرسودہ وکہنہ روایات کو چھوڑ کر نئے تقاضوں، نئی قدروں اور نئے میلانات سے آشنا ہوا۔ اس سوسائٹی کی بدولت زبان میں وسعت پیدا ہوئی۔ قصے کہانیوں اور داستانوں کی بجائے علمی، تحقیقی و سائنسی علوم کی طرف زیادہ توجہ دی گئی نئی اور اچھوتی درسی کتب تیار کی گئیں یہ حقیقت ہے کہ پورے ہندوستان میں اس وقت یہ واحد ادبی جماعت تھی جس نے مغربی علوم کو اردو میں ڈھالنے کی منظم و کامیاب سعی کی۔

دہلی کالج اپنی علمی و سائنسی انفرادیت اور اردو ذریعہ تعلیم کی وجہ سے ایک حسین و شاداب گلستان بن چکا تھا۔ اور یہ سوسائٹی مثل زرخیز و سرسبز پودے کی مانند تھی جس میں ترو تازہ کونپلیں اور ہرے ہرے پتے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ جن کی تازگی و نمو سب علم دوست احباب کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ہندوستان کے عوام میں نئے علمی مذاق کا شعور پیدا ہو رہا تھا۔ جدید علم کی کرنیں ان کے دلوں کو منور کر رہی تھیں۔ بقول مولوی عبدالحق مرحوم "اردو زبان و ادب کو سنوارنے اور بنانے میں جو خدمت (اس سوسائٹی) نے کی ہے وہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتی"[1]

مسٹر فلیکس بوترو کے بعد ۱۸۴۵ء میں ڈاکٹر شپرانگر دہلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے انہوں نے بھی اس سوسائٹی کے کاموں میں بھرپور دلچسپی لی۔ مشرقی علوم السنہ سے گہرا شغف اور لگاؤ رکھتے تھے۔ جو کتابیں کالج کی تعلیم کے لئے ضروری تھیں۔ اور ہندوستان میں نایاب تھیں وہ یورپ سے منگوا کر سوسائٹی کے ذریعے ترجمہ کرائیں ڈاکٹر اشپرانگر مذہبی، ملکی یا قومی تعصب کے روادار نہ تھے۔ علمی تحقیق اور سائنسی علوم سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ اس لگن اور شوق کو دوسروں میں بھی منتقل کرتے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ:

"میں نے اس سرچشمہ پر پہنچ کر پیاس بجھائی ہے اپنی تحقیق و تلاش کی سرزمین کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خود اپنے نقطۂ نظر سے اسے جانا پہچانا ہے۔ اور شاید میری طرح کسی دوسرے یورپ زاد کو یہ بات نصیب نہ ہوئی ہو"۔[2]

انہوں نے مطبع العلوم کے نام سے پریس قائم کیا۔ ۱۸۴۵ء میں پہلا علمی ہفت روزہ رسالہ قرآن السعدین کے نام سے نکالا۔

مسٹر کارگل بھی دہلی کالج کے پرنسپل رہے انہوں نے ۱۸۵۲ء کی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ "مشرقی شعبہ کا طالب علم اپنے مغربی شعبے کے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے"۔[3]

مسٹر کر ناظم تعلیمات احاطۂ بنگال نے بھی اپنے تعلیمی تبصرہ بابت ۱۸۵۳ء میں لکھا کہ "ایک مدت سے دہلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آ رہی ہے جو اسے بالائی و زیریں صوبہ جات کے دوسرے کالجوں

---

[1] مرحوم دہلی کالج مولوی عبدالحق مرحوم صد۹۷ اشاعت سوم ۱۹۶۲ء انجمن ترقی اردو پاکستان

[2] مرحوم دہلی کالج مولوی عبدالحق مرحوم صد۲۵

[3] دلی کالج اردو میگزین قدیم دلی نمبر صد۱۲۳

سے ممتاز کرتی ہے۔ اور یہ وہ ہے وہاں دیسی زبان اردو کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ اور امتیازی خصوصیت خاص طور پر ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم و بیش تاریخ اخلاق اور فلسفہ (مارل سائنس) کی تعلیم سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس طریقہ تعلیم پر مسٹر بٹروس نے اپنے زمانہ پرنسپلی میں استقلال کے ساتھ عمل درآمد کیا اور ان کے جانشین ڈاکٹر اشپرانگر نے اسی جوش کے ساتھ جاری رکھا یہ اب دہلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جزو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اسے آزادی کے ساتھ بڑھنے اور پھولنے پھلنے دیا جائے[1]

دہلی کالج نے ممتاز اساتذہ رام چندر، ڈاکٹر مسٹر فیلیکس، اشپرانگر، محمد حسین آزاد، پیارے لال کی بدولت صحافت، سائنس، ناول، تاریخ و تنقید، تحقیق کے جدید تقاضوں کا احساس پیدا ہوا۔ اس کالج نے تعلیمی تاریخی، سائنسی اور معاشرتی میدان میں بڑا اہم کردار ادا کیا جدید علمی فضا پیدا کرنے جدید علمی قدروں سے روشناس کرانے جدید سائنسی علوم کو اردو میں داخل کرنے اور اردو ذریعہ تعلیم کی کامیاب روایت کا آغاز دراصل اردو کی علمی و سائنسی ترقی کے حق میں ایک ایسا عظیم راستہ اور کارنامہ ہے۔ جس کی افادیت مسلم ہے۔ جس نے آنے والی نسلوں کو نئی راہ سجھائی بقول خواجہ احمد فاروقی غالب کے یہاں جو مغربی تمدن کی خیر و برکت کا احساس اور انگریزوں کے علم و آئین دانش و داد کی تعریف ملتی ہے۔ وہ بھی دراصل اس فضا کی پروردہ ہے۔ جو دہلی کالج نے پیدا کی تھی۔

[1] مرحوم دہلی کالج مولوی عبدالحق مرحوم صـ ۳۵

غالب کے یہاں جو چیز ایک مبہم احساس کی صورت میں تھی سرسید کے یہاں ایک واضح اصلاحی پروگرام بن گئی[1]

اس کالج کے اساتذہ نے جو علمی و سائنسی کتب ترجمہ و تالیف کیں اور ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے ذریعہ جو کتابیں اردو میں منتقل ہوئیں۔ ان کی فہرست درج ذیل ہے جو مطبع دہلی سے شائع ہوئیں[2]

[1] دہلی کالج اردو میگزین قدیم دلی نمبر شذرات۔

[2] نوٹ:۔ اس فہرست کی تیاری میں پاکستان کی لائبریریوں کے علاوہ زیادہ تر مدد میں نے انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ، برٹش میوزیم کیٹلاگ اور اورینٹل کالج اسکول آف سٹڈیز کیٹلاگ لندن سے لی ہے۔ کراچی میں جو مواد میسر آیا وہ مکمل نہ تھا۔

بقیہ صفحہ نمبر ۳

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اردو کو نافذ کرنے کے لئے صرف ایک سرکاری حکمنامہ کے اجراء کا کام باقی رہ گیا ہے۔ یہ کام اگر آج ہو جائے تو کل سے ہر طرف بلا تکلف آپ کو اردو ہی اردو نظر آئے گی۔ پھر اس کے نفاذ کے لئے مزید کسی جدوجہد کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

خدا وہ وقت جلد لائے۔

	تصنیف	مصنف، مترجم	مطبع	سن اشاعت	صفحات
۱	اردو لغت	دہلی کالج	دہلی	یہ کتاب لکھی گئی لیکن چھپ نہ سکی	
۲	اصول پولیٹیکل اکانومی (الف)(۲)	مترجم وزیر علی	"	۱۸۴۴ء	۱۸۴
۳	اصول جبر و مقابلہ (الف)	ماسٹر رام چند	"	۱۸۴۵ء	۴۷۸
۴	اصول [illegible]	سرجن نارٹن	"	۱۸۴۵ء	۱۵۵
۵	اصول علم انتظام بدن (الف)	مترجم دھرم نارائن مصنف فرانس دے لینڈ	"	۱۸۴۶ء	۳۳۰
۶	اصول علم حساب و جزئیات (الف)	مترجم ماسٹر رام چندر مصنف جے ایل بیچریٹش	"	۱۸۴۵ء	۶۱۷
۷	اصول کچہری اور اصول قوانین گورنمنٹ (الف)	مترجم پنڈت رام کرشن	"		
۸	اصول علم حیات (الف)	مترجم پنڈت الیودھیا پرشاد اور رام چندر		۱۸۴۸ء	۳۲۵
۹	اصول علم طبعی (الف)	مترجم الیودھیا پرشاد اور شیا پرشاد	"	۱۸۵۰ء	۱۶۹
۱۰	اصول قانون (الف)	مترجم رام کرشن	"	۱۸۴۵ء	۴۴۰
۱۱	اصول قوانین ممالک (الف)	مترجم رام کرشن مصنف الیف بتردس	"	۱۸۴۴ء	۳۶۰
۱۲	اصول علم ہیئت (الف) نجوم و ہیئت	مترجم ماسٹر رام چندر مصنف ہرشل ولیلی کیسل	"	۱۸۴۸ء	
۱۳	اصول علم ہندسہ پریکٹیکل جیومیٹری (الف)	مصنفہ ماسٹر رام چندر	"	۱۸۴۴ء	
۱۴	اصول قواعد اخلاق (الف)	مترجم ماسٹر رام چندر مصنف الیف بتردس	"	۱۸۴۵ء	۳۶۰

نوٹ :-
الف سے مراد انگریزی سے ترجمہ کی گئیں جبکہ ع سے مراد عربی میں، ف سے مراد فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔

۱۵	اصول سرکاری محاصل (الف)	مترجم ماسٹر رام چندر مصنف ایف بٹروس	"	۱۸۴۵ء		
۱۶	اصول علم مثلث (الف)	مترجم ماسٹر رام چندر مصنف مسٹن، بجراٹ اور سمسن	" "	۱۸۴۴ء	۳۱۷	
۱۷	اصول قوائد مایعات (الف)	مترجم ایودھیا پرشاد مصنف تھامس ویجیز	"	۱۸۵۰ء		
۱۸	اصول قوانین دیوانی و فوجداری (الف)	پنڈت رام کرشن	"			
۱۹	اصول قوانین محمدی	ترجمہ علمائے دہلی کالج	"	۱۸۴۳ء	۴۱	
۲۰	اصول منطق (الف)	ترجمہ مولوی سید محمد	"	۱۸۴۴ء	۵۳	
۲۱	بیاگرافیکل ہسٹری آف محمڈن جیورس پروڈس (الف)	سبحان بخش	"	۱۸۴۸ء		
۲۲	پیمائش خطوط (الف)	مترجم دہاری لال مصنف ایلبٹ	"	۱۸۵۰ء	۱۱۵	
۲۳	تاریخ ابن خلکان	سبحان بخش	"			
۲۴	تاریخ ابوالفدا تین جلدوں میں (الف)	مترجم کریم الدین	"	۱۸۴۷ء	۲۶۰	
۲۵	تاریخ انگلستان (الف)	حسن علی خان و پنڈت دھرم نرائن	"			
۲۶	تاریخ ایران (الف)	منشی حسین	"	۱۸۴۵	۲۵۰	
۲۷	تاریخ بری و بحری (الف)	مترجم شیو پرشاد	"	۱۸۴۵ء		
۲۸	تاریخ بنگال (الف)	مترجم نور محمد مصنف مارشمین	"	۱۸ ۴ء	۲۹۰	
۲۹	تاریخ پنجاب (الف)	مترجم منکارا داس	"	۱۸۴۶ء	۲۰۶	
۳۰	تاریخ روم (الف)	مترجم شیو پرشاد ڈاکٹر گولڈ اسمتھ	"	۱۸۴۵	۳۴۰	
۳۱	تاریخ شعرائے اردو	مولوی کریم الدین و ایف فیلن	"	۱۸۴۸ء	۵۰۴	

نمبر	نام کتاب	مصنف / مترجم		سنہ	صفحات
۳۲	تاریخ شعرائے عرب	مولوی کریم الدین		۱۸۴۷	۴۴۰
۳۳	تاریخ کشمیر (ف)	مترجم اشرف علی مصنف محمد اعظم	٭	۱۸۴۶ء	۳۵۸
۳۴	تاریخ مغلیہ	مترجم نور محمد اور منشی حسین	٭	۱۸۴۷ء	۱۳۰
۳۵	تاریخ ہند (الف)	جاسج کلارک مارش مین	٭	۱۸۴۳ء	۲۸۴
۳۶	تاریخ یونان (الف)	مترجم وزیر علی اور شیو پرشاد مصنف ڈاکٹر گولڈ اسمتھ	״ ٭	۱۸۴۶ء	۴۰۳
۳۷	تحریر اقلیدس مقالہ (ف) ایک تا چھ، گیارہ، بارہ	مولوی مملوک علی مترجم	٭	۱۸۴۳ء	۳۶۸
۳۸	تذکرۂ حکماء	سبحان بخش	٭		
۳۹	تذکرۂ مسو (الف)	مترجم موتی لال	״	۱۸۴۷ء	۱۱۲
۴۰	تذکرۂ سکندر اعظم (الف)	مترجم شیو نارائن	٭	۱۸۴۷ء	۱۵۳
۴۱	تذکرۂ مفسرین	سبحان بخش	״	۱۸۴۸ء	
۴۲	تشریح الاجسام	ڈاکٹر میر فضل علی	٭	۱۸۴۷ء	۱۸۴
۴۳	تزک تیموری	سبحان بخش	״	۱۸۴۵ء	۸۸۴
۴۴	جغرافیہ ہند (الف)	مترجم شیو روپ نارائن اور سیو نارائن مصنف مرے	״	۱۸۴۸ء	۱۲۲
۴۵	حدائق البلاغت (ف)	منشی شمس الدین فقیر مترجم امام بخش صہبائی	״	۱۸۴۲ء	
۴۶	خلاصۃ التواریخ (الف)	مترجم شیو نارائن مصنف مارشمین	״	۱۸۴۴ء	
۴۷	رسالہ اصول حساب (الف)	مترجم ہردیو سنگھ مصنف ڈی مورگن	״	۱۸۴۷ء	۳۴
۴۸	رسالہ پیمائش زمین	ہردیو سنگھ	״	۱۸۴۸ء	۴۷
۴۹	رسالہ قواعد اردو	امام بخش صہبائی	״	۱۸۴۵ء	۲۸۶
۵۰	رسالہ آلات مستعمل رصد خانہ	پنڈت اجودھیا پرشاد	״	۱۸۴۴ء	
۵۱	رسالہ مقناطیس (الف)	سید کمال الدین	״	۱۸۵۰ء	
۵۲	رہنمائے اصول قوانین مالگزاری (ف)	علمائے دہلی کالج	״	۱۸۴۶ء	
۵۳	سریع الفہم	مصنف رام چندر مدرس	״	۱۸۴۹ء	۴۴

۵۴	طبیعات (الف)	مصنف ارناٹ	〃	۱۸۴۷ء	۱۹۸
۵۵	عجائبات روزگار	مصنف ماسٹر رام چندر	〃	۱۸۴۷ء	
۵۶	علم الجبرا (الف)	مترجم ماسٹر رام چندر مصنف برجز	〃	۱۸۴۴ء	
۵۷	علم طب	پنڈت رام کشن	〃	۱۸۴۷ء	۱۲۴
۵۸	عمل جراحی (الف)	مترجم ہنری ٹیلر مصنف کوپنر	〃	۱۸۴۸ء	۱۱۹
۵۹	قانون دیوانی کا خلاصہ (الف)	مترجم حسینی مصنف پرنسپ	〃	۱۸۴۵ء	
۶۰	قانون فوجداری کا خلاصہ (الف)	ماسٹر حسینی مصنف سکیپ وڈ	〃	۱۸۴۵ء	
۶۱	قانون محمدی فوجداری قانون محمدی وراثت کا (الف)	ماسٹر حسینی مصنف میگناٹن	〃	۱۸۴۵ء	
۶۲	قواعد المبتدی	مولوی کریم الدین	〃		
۶۳	قواعد صرف و نحو (الف)	مترجم پنڈت رام کرشن ڈاکٹر اسپرانگر کی مدد سے ترجمہ کی۔	〃		
۶۴	قواعد اردو (چشمہ فیض)	مولوی احمد علی	〃	۱۸۴۵ء	
۶۵	کھیت کرم (ہندوستان میں زراعت)	کالی رائے	〃	۱۸۴۶ء	۸۹
۶۶	گلستان	موتی لال	〃	۱۸۴۷ء	۹۲
۶۷	محاورات ہند	سبحان بخش	〃		
۶۸	مخزن فوائد	مرزا نیاز علی نکہت	〃	۱۸۴۵ء	۳۵۷
۶۹	فریدالاحوال باسلام الاحوال علم زراعت (ع)	پنڈت رام کشن	〃	۱۸۴۵ء	
۷۰	مفتاح اللغات	سید محمد	〃	۱۸۵۱ء	
۷۱	مکتب نما		〃	۱۸۵۰ء	۹۰
۷۲	الجواہر	قطب الدین	〃	۱۸۴۲ء	۸۷
۷۳	ہدایت نمائے کام پیمائش	کالی رائے	〃	۱۸۵۰ء	۲۴

جناب رئیس احمد ہمدانی

اردو میں سائنسی و فنی ادب

اردو زبان کو بجا طور پر سائنسی و فنی زبان ہونے کا شرف حاصل ہے جس کا ثبوت اردو زبان میں شائع ہونے والی وہ بے شمار مطبوعات ہیں جو سائنسی و فنی موضوعات پر شائع ہوئی ہیں تاریخ کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ اردو زبان برصغیر پاک و ہند کی وہ واحد زبان ہے جس نے سائنس کے ارتقاء کا خوش اسلوبی سے ساتھ دیا ہے اس زبان میں وہ تمام صلاحیتیں اور خصوصیات موجود ہیں جو کسی زبان کی مقبولیت اور افادیت کیلئے لازمی ہیں۔

تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سلطنت روما کے زوال کے بعد تقریباً چار سو سال تک علوم و فنون کی ترقی کا سہرا مسلمانوں کے سر رہا۔ مسلمانوں نے سائنسی و فنی علوم کی ترقی کے لئے مساعی جمیلہ کیں۔ اور انہیں قابل تقلید بنایا۔ یورپ کی موجودہ سائنسی و فنی ترقی مسلمان سائنسدانوں کی رہین منت ہے۔ لیکن انگریز نے سائنسی نقطہ نظر سے اردو کو پس منظر میں رکھا انہوں نے ایک طرف تو نظام تعلیم میں انگریزی کو لازمی قرار دیا دوسرے دیگر زبانوں کو بہ نسبت اردو زبان کے اظہار کے بہتر مواقع فراہم کیے۔ اگرچہ اردو زبان کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے مناسب میدان نہیں ملا۔ تاہم نجی طور پر اردو میں سائنسی و فنی موضوعات پر تصنیفات کی طباعت مسلسل ہوتی رہی۔

خواجہ حمید الدین شاہد اپنی کتاب "اردو میں سائنسی ادب" میں لکھتے ہیں کہ "اردو میں پندرہویں صدی کی ابتدا سے سائنسی تصنیفات کا سراغ ملتا ہے" ۱۸۳۵ میں نواب شمس الامراء نے حیدر آباد دکن میں سائنسی کتابوں کے ترجمے کی داغ بیل ڈالی۔ اور ان کے نامور فرزند نواب رفیع الدولہ عمدۃ الملک نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دی۔ اور جدید مغربی علوم و فنون کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا ایک جامع منصوبہ بنایا۔ چنانچہ دو سال کی قلیل مدت میں میکانیات، فلکیات، بصریات، برقیات، مقناطیس اور کیمیا پر کافی کتابیں طبع ہوئیں۔ دہلی کالج کے قیام سے امید کی نئی جھلک پیدا ہوئی۔

انیسویں صدی تک اردو کی علمی حیثیت اتنی متعین اور واضح ہو چکی تھی کہ دہلی کالج کے علاوہ بکثرت اشخاص اور ادارے اس کی صلاحیتوں سے

مستفید ہوتے رہے۔ ماسٹر رام چندر داس اور شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ نے اردو میں علمی و فنی کتب کے جو تراجم اور تالیف بہم پہنچائیں۔ ان سے ایک اچھا خاصہ کتب خانہ تشکیل پا سکتا ہے۔

اسی طرح سر سید احمد خان نے ورنیکولر یونیورسٹی کی تجویز پیش کی اور اسی سے یہ امید پیدا ہوئی کہ اس ادارے کے ذریعے اردو میں سائنسی و فنی مطبوعات نمایاں مقام حاصل کر لیں گے لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ بن سکا۔ تاہم سر راس مسعود کی کوشش سے "جامعہ عثمانیہ" نے ایک اردو ادارے کے روپ میں جنم لیا۔

حیدر آباد دکن سے اردو تصنیفات کا ایک نیا اور عہد آفریں دور شروع ہوا۔ سینکڑوں کی تعداد میں سائنسی و فنی کتب ترجمہ اور تالیف ہوئیں نیز اصطلاح وضع کرنے کے لئے ایک باقاعدہ دارالترجمہ قائم ہوا۔ جامعہ عثمانیہ کے اس دارالترجمہ نے اردو میں اصطلاحات کو فروغ دینے کا کام انتہائی تیزی اور انہماک سے کیا۔ آج اردو زبان میں سائنسی و فنی اصطلاحات جو مروج ہیں۔ ان میں سے بیشتر اس دارالترجمہ کا فیضان ہے۔

"۱۸۰۹ء سے ۱۹۴۷ء تک سائنسی مضامین پر تصنیف، تالیف اور ترجمہ کا کام قابل اطمینان طریقے پر ہوتا رہا۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، سر سید کی سائنٹیفک سوسائٹی، جامعہ عثمانیہ، جامعہ پنجاب اور انجمن پنجاب اور دیگر درس گاہوں سے باغبانی، زراعت، ٹکنالوجی پر جتنی کتابیں شائع ہوئیں انکو پیش کیا جائے تو اردو کا دامن کسی موضوع سے خالی نظر نہیں آئے گا۔"

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد کئی سال تک اردو زبان میں سائنسی و فنی موضوعات پر کتابوں کا سراغ نہیں ملتا حالانکہ ماہرین زبان اردو اور مفکرین کی ایک بڑی تعداد ہندوستان سے نقل مکانی کے بعد یہاں سکونت پذیر ہوئی۔ تاہم رفتہ رفتہ اس جانب توجہ دی گئی اور کئی اداروں نے سائنسی و فنی موضوعات پر کتابیں شائع کیں مختلف تعلیمی اداروں میں شعبہ جات تصنیف و تالیف و ترجمہ قائم کئے گئے اور حکومت نے بھی اس اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مرکزی اردو بورڈ جیسا ادارہ قائم کیا۔

پاکستان میں معیار تعلیم پر عرصہ دراز سے بحث و مباحثہ جاری ہے۔ اس سلسلے میں کئی کانفرنسیں ہوئیں۔ اور مختلف ماہرین نے اپنی آراء نذر سامعین کیں۔ تمام ماہرین نفسیات و تعلیم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مادری یا قومی زبان میں تعلیم کے ذریعے ہی معیار تعلیم کو بلند کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں پست معیار تعلیم کی وجہ انگریزی ذریعہ تعلیم بھی ہے۔ اپنی زبان میں بات آسانی سے بیان کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح قاری اپنی زبان میں پڑھ کر جلد سمجھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی فرماتے ہیں کہ:

"اگر اردو پڑھنے اور پڑھانے والے دونوں کی اپنی زبان ہو۔ اور وہ اس سے اچھی طرح واقف ہوں تو اس کو ذریعہ تعلیم بنانے سے وہی فوائد حاصل ہوں گے جو ایک انگریز کو انگریزی زبان

میں یا ایک جرمن کو جرمنی زبان میں تعلیم دینے سے حاصل ہوتی ہے۔ میجر آفتاب حسن جو پہلے شعبہ تصنیف و تالیف ترجمہ کے ناظم اور اب مقتدرہ قومی زبان کے معتمد ہیں فرماتے ہیں کہ

"میں اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف انٹرمیڈیٹ میں بلکہ بی ایس سی اور ایم ایس سی میں بھی اردو سائنسی تعلیم کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اپنی زبان ہو تو پڑھانے والے کیلئے سمجھانا اور پڑھنے والے کے لئے سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ کم وقت میں وہ کام ہو جاتا ہے۔ جو غیر زبان کے ذریعے زیادہ وقت میں بھی نہیں ہو سکتا"

اس کا ایک بہت ہی واضح ثبوت یہ ہے کہ آج تک کسی مشہور سائنسداں یا مصنف نے اپنی کامیاب تخلیق اور بہترین تصانیف اپنی ہی زبان میں لکھی کسی غیر زبان میں نہیں۔ لہٰذا علمی پسماندگی دور کرنے اور سائنسی ترقی میں ہمیں اپنی قومی زبان ہی سے مدد مل سکتی ہے۔

برصغیر کی تقسیم سے قبل کئی اداروں نے اس بات کی سعی کی کہ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم رائج کیا جائے۔ اور وہ ادارہ اپنے نیک مقصد میں بڑی حد تک کامیاب اور کامران ہوئے۔ بلکہ آج اردو زبان کو یہ مقام انہی اداروں کی انتھک کوشش اور محنت کا نتیجہ ہے۔ ان اداروں میں دہلی کالج سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ نواب شمس الامرا ثانی کے مدرسہ فخریہ (حیدرآباد دکن) مدرسہ طبابت حیدرآباد، انجینئرنگ کالج رڑکی اور جامعہ عثمانیہ سرفہرست ہیں۔ ان اداروں نے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کیا جس کے اس قدر حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے کہ اردو کے عدم تعین دم بخود ہو کر رہ گئے۔

قیام پاکستان کے بعد اس تحریک کو انجمن ترقی اردو نے اردو کالج کراچی قائم کر کے زندہ جاوید بنایا اور جامعہ عثمانیہ کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کرنے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی بے پناہ صلاحیتوں اور انتھک کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ اردو کالج کے بعد ملک کے کئی تعلیمی اداروں نے جن میں جامعات بھی شامل ہیں۔ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا۔

راقم السطور نے ۱۹۷۲ء میں اپنا ایم۔ اے کا تحقیقی مقالہ بعنوان "اردو میں سائنسی و فنی ادب" پیش کیا تھا۔ جو ۱۹۷۵ء میں بعنوان پاکستان میں سائنسی و فنی ادب" شائع ہوا اس میں اردو زبان میں سائنسی و فنی ادب کی توضیحی کتابیات مرتب کی گئی تھی۔ اس وقت کے مطابق اعداد و شمار درج ذیل ہیں

موضوع	تصانیف کی کل تعداد	ترجمہ شدہ تصانیف
عام سائنسی و فنی کتب (حوالجاتی کتب)	۳۸	۱۷
علم ریاضی	۱۷	۱
علم ہیئت	۲۰	۸
علم طبیعات	۳۱	۹
علم کیمیا	۱۸	۸

علم الحیات	۷	۲
علم نباتیات	۲۰	۳
علم حیوانات	۳۸	۲
علم طب	۲۵۹	۷
انجینیرنگ	۴۱	۱۳
علم زراعت	۲۷	۱
سوانح	۱۷	۶
کتابیات	۳	-
رسائل و جرائد	۱۷	-
کل مطبوعات	۵۵۴	۷۷

یہ پانچسو چوّن مطبوعات دو سو انسٹھ مصنفین کی تخلیقات و تراجم پر مبنی تھیں انہی میں تین خواتین مصنفہ بھی شامل ہیں۔

پاکستان سے جاری ہونے والے رسائل و جرائد کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں تاہم مایوس کن بھی نہیں ہے۔

کراچی: ساخبار طب، جدید سائنس، ہمدرد صحت، ہمارا ڈاکٹر ہومیو پیتھ، زراعت پاکستان، سائنس، سائنس بچوں کے لیے، کاروان، المہدس

لاہور:۔ سائنس و زراعت

راولپنڈی:۔ تندرستی

لائلپور:۔ ہومیوپیتھک لائٹ، رہنمائے صحت، زندگی ڈائجسٹ۔

حیدرآباد:۔ ہومیو ڈاکٹر، طبی ڈائجسٹ وغیرہ

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سائنسی و فنی ادب کی رفتار اشاعت کیا ہے۔

پاکستانی جامعات میں بھی اب رفتہ رفتہ قومی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جا رہا ہے جامعہ کراچی سے اس کی ابتداء ہوئی وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اردو زبان میں علمی و سائنسی و فنی اصطلاحات کی تیاری، تدوین، ترتیب و اشاعت کا کام پوری یکسوئی سے کیا جائے۔ چنانچہ مختلف جامعات میں شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ قائم کئے گئے۔ اب ان اداروں کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے جو اردو میں سائنسی و فنی کتب و رسائل کی تالیف و تصنیف و ترجمہ کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

(۱) شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے ضروری نصابی مواد قومی زبان میں مہیا کرنا اس شعبہ کی ذمہ داری ہے۔ اس شعبہ نے درسی کتب کے تراجم درس پارے مختلف علوم و فنون کی لغات کافی تعداد میں شائع کی ہے۔ ان میں فلکیات، طبعیات، ریاضی اور کیمیا کی لغات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ارضیات، جغرافیہ، حیاتیات، نفسیات، عمرانیات کی لغات شائع ہو چکی ہیں اور لائبریری سائنس کی لغت زیر طبع ہے۔ اسی طرح یہ شعبہ اردو زبان میں سائنسی مطبوعات کی اشاعت میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ "جریدہ" کے نام سے ایک رسالہ شائع ہوتا ہے۔

سائنٹفک سوسائٹی پاکستان
جامعہ کراچی

یہ سوسائٹی حسب ذیل مقاصد کے لئے کوشاں ہے

سائنسی معلومات کو عام فہم زبان میں خواص و
عام تک پہنچانا۔
سائنسی تحقیقات کو فروغ دینا اور انکو شائع کرنا
سائنسی تحقیقات اور ترقیوں کو ملک کے فنی
اور اطلاقی مسائل سے ہم آہنگ کرکے دونوں کو
فائدہ پہنچانا۔
یہ سوسائٹی اردو میں دو رسائل شائع کرتی ہے
ایک "جدید سائنس" سہ ماہی اور "سائنس بچوں
کے لیئے" ماہانہ اس کے علاوہ ہر سال سوسائٹی
کی جانب سے کانفرنس کا انعقاد کیا جاتا ہے اس
کی تمام کاروائی اردو میں ہوتی ہے اور مقالات
شائع کیئے جاتے ہیں۔

مرکزی اردو بورڈ

مرکزی اردو بورڈ ۱۹۶۲ء میں وزارت
تعلیمات کے تحت قائم کیا گیا وزارت تعلیم کی
قرارداد کے مطابق بورڈ کا رہنما اصول قومی قدروں
کو فروغ دینا اور اردو کو اس مقام تک پہنچانا
ہے جہاں وہ درس و تدریس کی اعلیٰ سطح پر
ذریعہ تعلیم بن سکے۔ اس کے مقاصد حسب ذیل ہیں
(۱) پاکستان میں اردو کی بنیادوں کی توسیع و
ترقی تاکہ وہ ذریعہ تعلیم بن سکے۔
(۲) اردو زبان کی ان خامیوں کو دور کرنا جو
بالخصوص سائنسی و ٹکنالوجی کے مضامین کی تدریس
میں رکاوٹ ہوں۔
(۳) ادبی اور علمی ترقی میں کوشاں اردو کے
دیگر اداروں سے اشتراک کار ان مقاصد کے
حصول کے لیئے بورڈ نے اہم اقدامات کیئے خصوصاً
سائنس و ٹکنالوجی کی ضرورت کے پیش نظر بورڈ نے
اہم اور معیاری سائنسی کتب شائع کیں جو کالجوں
اور جامعات کی نصابی ضروریات کو بڑی حد تک
پورا کرتی ہیں۔

اردو اکیڈمی سندھ (کراچی)

اردو اکیڈمی سندھ کے کارپردازان فن کتاب
سازی میں موروثی تجربہ رکھتے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم
سے قبل بھی اس فن سے متعلق تھے۔ یہ مرکز ابتدائی
طور پر لاہور میں قائم کیا گیا تھا۔ اس ادارے نے
دیگر مضامین کے علاوہ سائنسی و فنی کتب کافی
تعداد میں شائع کیں۔ جن میں انگریزی کتب
کے تراجم بھی شامل ہیں۔ اور بیشتر کتب ابتدائی
سائنس سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس ادارہ کی شائع
شدہ کتب کی تعداد خاصی ہے۔

ٹیکسٹ بک بورڈ

یہ پاکستان کے دونوں حصوں یعنی مشرقی
پاکستان "بنگال" اور مغربی پاکستان میں قائم کیئے
گئے تھے۔ مغربی پاکستان میں قائم شدہ ٹیکسٹ
بک بورڈ اب پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ کہلاتا ہے
اس بورڈ کے فرائض میں جماعت اول سے
بارھویں جماعت تک کی نصابی کتب کا انتخاب اور
ان کو اپنے ذرائع سے شائع کروانا شامل ہے
بورڈ نے سائنسی و فنی کتب کی اشاعت کی طرف
خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ بمقابلہ دیگر مضامین کے
چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنسی و فنی
نصابی کتب کی اشاعت کے لیئے ایک علیحدہ بورڈ
قائم کیا جائے۔ جسکی ذمہ داری یہ ہو کہ ٹکنالوجی

اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لئے سائنس و فنی کتب کی اشاعت کا بندوبست کرے۔ اس بورڈ میں ملک کے نامور ماہرین تعلیم سائنسداں اور فنکار شامل ہوں۔ جو اپنے اپنے مضمون میں معیاری مواد کا انتخاب کر سکیں۔

قومی کتاب مرکز پاکستان

۱۹۶۲ء میں حکومت پاکستان نے یونیسکو کے تعاون سے یہ ادارہ قائم کیا۔ اس ادارہ کا مقصد لوگوں کی عادات مطالعہ اور ضروریات کتب کا جائزہ لے کر مصنفین، ناشرین کتب فروش اور لائبریرین حضرات کے تعاون سے سستی اور معیاری کتابوں کی اشاعت کرنا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں اس کا نام بدل کر نیشنل بک کونسل آف پاکستان کر دیا گیا یہ امر باعث افسوس ہے کہ اب ادارے نے سماجی، انسانی علوم و لسانیات و ادب پر تو کتابیں شائع کی ہیں لیکن سائنسی و فنی مضامین پر چنداں توجہ نہیں کی گئی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ ادارے ایک سروے کریں کہ پاکستان میں مختلف درجات میں کتنے طلبا و طالبات اردو میں سائنسی و تکنیکی مضامین پڑھتے ہیں۔ اور ان کے مسائل کیا ہیں سائنسی و فنی مضامین میں کس قسم کے مواد کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد اساتذہ، ماہرین تعلیم اور ماہرین کے تعاون سے نصابی سائنسی و فنی ادب نیز تحقیقی مقالات کی اشاعت کا بندوبست کیا جائے۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن

قومی زبان میں کتابیں نہ ہونے کے باعث غیر ملکی مواد پر انحصار کرنا پڑا۔ کتابوں کے حصول اور زر مبادلہ کی کمی کے مسائل کے پیش نظر حکومت نے یہ ادارہ قائم کیا۔ اور غیر ملکی کتابیں پاکستان میں شائع ہونے لگیں۔ اس میں بہت سی بنیادی سائنسی کتب کو بھی دوبارہ شائع کیا گیا۔ اور مختلف سائنسی و فنی مضامین پر نصابی کتب تقریباً ایک چوتھائی قیمت پر دستیاب ہونے لگیں یہ ایک مفید منصوبہ ہے جو سلیقہ سے جاری رہا تو انشاء اللہ اس کے بڑے مثبت نتائج مرتب ہوں گے۔

انجمن ترقی اردو

انجمن ترقی اردو کا قیام اردو زبان و ادب اور اردو میں علمی سائنسی و فنی ادب کے فروغ کے پیش نظر ہوا۔ اس ادارے نے اردو کی لسانی، ادبی، علمی ترقی میں جو بیش بہا خدمات انجام دیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ ماہنامہ قومی زبان کے ہر شمارہ میں اردو مضامین کا اشاریہ شائع ہوتا ہے جس میں سائنسی و فنی موضوعات پر مضامین کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی انجمن نے سائنسی کتب شائع کی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد محدود ہے۔ اگر اس طرف توجہ مزید دی جائے۔ تو مثبت نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔

مقتدرہ قومی زبان

مقتدرہ قومی زبان کا قیام ابھی حال ہی میں ہوا ہے۔ اردو زبان میں غیر ملکی کتابوں کے ترجمے کا ایک شعبہ بھی اس میں قائم کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ ادارہ سائنسی و فنی مطبوعات کی طرف خصوصی

تو جہ دے گا تاکہ سائنسی و فنی ادب کی آبیاری ہو سکے

اردو سائنس کالج

علی گڑھ یونیورسٹی کا خیال کرتے ہوئے سر سید احمد خاں کا خیال آنا لازمی ہے۔ اردو زبان کی ترقی اور فروغ کا ذکر ہو تو ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اردو کا ذکر لازمی ہوتا ہے۔ اور جب انجمن ترقی اردو کی کارگزاریوں پر روشنی ڈالی جائے تو اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کرانے اور اردو کی لسانی اہمیت اور افادیت کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ "اردو کالج" کا قیام انجمن کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔

انجمن ترقی اردو نے اردو کالج کے قیام اور اسے ترقی دینے میں اپنے محدود وسائل کے باوجود بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اردو کالج کے قیام سے دراصل جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) کی روایت کو آگے بڑھانے کا موقع ملا۔ اردو کالج کو دراصل "اردو جامعہ" کی صورت اختیار کرنا تھا۔ کالج میں شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ بھی قائم کیا گیا۔ جس نے سائنسی و فنی موضوعات کی کئی کتابیں شائع کیں ابھی یہ منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچنا باقی تھا کہ حکومت وقت نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا اور اب یہ کالج وفاقی حکومت اردو کالج کے نام سے قائم ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے یعنی وفاقی حکومت اردو سائنس کالج اور اردو آرٹس کالج دونوں کالج انتظامی امور میں قطعاً علیحدہ ہیں۔

دیگر کالجوں کے مقابلے میں اس کالج کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں کئی مضامین میں ایم اے اور ایم ایس سی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

اردو سائنس کالج جو اپنی نئی تعمیر شدہ عمارت میں واقع ہے۔ کتب خانے کے لئے علیحدہ عمارت کا منصوبہ ہے جو عنقریب عملی صورت اختیار کرنے والا ہے۔

تمام معاملات میں یہ کالج خود مختار ادارہ ہے

ان اداروں کے علاوہ بعض نجی اداروں نے بھی سائنسی و فنی موضوعات پر تصانیف شائع کیں۔ ان میں ہمدرد اکیڈمی، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، فیروز سنز، شیخ غلام علی سنز وغیرہ شامل ہیں۔

پاکستان کی تمام جامعات میں شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ قائم ہیں۔ جامعہ پنجاب کا شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ سائنسی و فنی موضوعات پر متعدد کتابیں شائع کر چکا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت اس جانب خصوصی توجہ دے وہ ادارے جو اس مقصد کے حصول کے لئے پہلے سے کام کر رہے ہیں انہیں مزید فعال بنایا جائے۔ بعض ادارے مثلاً نیشنل بک فاؤنڈیشن جس کا قیام سائنسی و فنی مطبوعات لغوی نصابی کتب کی طباعت تھا اسی ادارے کو نئے سرے سے منظم کیا جائے۔ اس ادارے میں ایک شعبہ سائنسی و فنی موضوعات انگریزی و دیگر زبانوں کی کتابوں کا اردو ترجمہ کر کے شائع کرنے کا اہتمام ہو۔

مرکزی بورڈ جس نے اپنے قیام سے اب تک کئی کتابیں شائع کیں اس ادارے کو مزید مستحکم بنایا

جائے تاکہ رفتارِ کتب اشاعت تیز تر ہو سکے۔
ساتھ ہی حکومت تمام جامعات میں قائم شدہ تصنیف و تالیف کو خصوصی مالی امداد دے۔ تاکہ سائنسی و فنی موضوعات پر کتابوں کی طباعت کا اہتمام ہو سکے۔
جامعات، کالجوں، اسکولوں کے اساتذہ اور ماہرین جو سائنسی و فنی موضوعات پر اردو زبان میں تصنیف و تالیف و ترجمہ کا ذوق رکھتے ہوں۔ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ان اقدامات سے یقیناً حوصلہ مند نتائج برآمد ہوں گے۔ اور اردو زبان میں سائنسی و فنی موضوعات پر تصانیف و تالیفات کے طبع ہونے کی رفتار تیز تر ہو سکے۔

بقیہ صفحہ نمبر ٢٩٧

اور ہر سال طالب علم چین سے اردو کی تعلیم مکمل کرنے ابتدائی تعلیم چین میں حاصل کر کے کراچی یونیورسٹی آتے ہیں۔ پیکنگ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں چینی اور پاکستانی موجود ہیں۔ ان میں محترمہ شان یون بھی ہیں جو پچھلے سال کراچی یونیورسٹی میں دو سال کے قیام کے بعد پیکنگ واپس گئی ہیں۔ وہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب "اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ" کا چینی ترجمہ کر رہی ہیں۔ پیکنگ یونیورسٹی میں چینی اردو لغت کی تدوین و ترتیب کا بھی کام ہو رہا ہے۔
جو حضرات غیر ملکی نشریات سنتے ہیں انہیں اندازہ ہوگا کہ کم و بیش دنیا کے تمام اہم ریڈیو اسٹیشن پاکستان اور بھارت کے لئے اپنی نشریات اردو میں کرتے ہیں۔ کیونکہ اردو بولنے اور سمجھنے والے صرف برصغیر پاک و ہند میں ہی نہیں بلکہ آج دنیا کے تمام ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں پچھلے چند سالوں میں عرب ممالک اور مشرق وسطیٰ میں پاکستانیوں اور بھارتی اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد پہنچ گئی ہے اور یہ سب بڑے شوق سے اردو کی نشریات سنتے ہیں یہی حال اردو کے اخبارات کا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے علاوہ اب انگلستان اور امریکہ وغیرہ میں بھی اردو کے اخبارات اور اخبارات کے خاص نمبر ملکی ایڈیشن شائع ہونے لگے ہیں۔
اس مختصر جائزے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو جو پاکستان کی قومی زبان ہے اس کے بولنے اور سمجھنے والے اس میں تعلیم و تدریس کرنے والے اس کی تحقیق، تالیف، تصنیف اور ترجمے سے دلچسپی رکھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ اور اردو میں سائنسی، ادبی، تاریخی، تکنیکی ہر قسم کے مضامین کی تدریس کا ایک کامیاب سلسلہ بھی جاری ہے۔ جو کسی زبان کی کامیابی اور عظمت کی دلیل ہے اور یہی اردو زبان کی اپنی اہمیت اور اس کی بین الاقوامی حیثیت کا نتیجہ ہے۔

ختم شد
بحمت بالخیر

پروفیسر حفیظ الرحمٰن صدیقی

اردو میں سائنسی اصطلاحات

ایک جائزہ

جب کبھی کسی مجلس میں انگریزی کی جگہ پر اردو کو ملک کی سرکاری زبان بنانے کا تذکرہ چھڑتا ہے تو بعض لوگوں کی طرف سے ایسی ایسی امکانی مشکلات کا اظہار کیا جانے لگتا ہے جیسے اردو کو سرکاری زبان بنانے کی خواہش رکھنے اور اس خواہش کو روبہ عمل لانے کے درمیان مشکلات کے ناقابل عبور سمندر حائل ہوں۔ اردو کے نفاذ کی راہ میں جن موانعات کا اظہار کیا جاتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ انگریزی ہماری جسد قومی میں سرتاپا خون گرداں کی طرح رواں ہے۔ اردو اس کا متبادل کس طرح بن سکتی ہے؟ دوسری یہ کہ اردو تو شعر و شاعری کی زبان ہے۔ یہ آج کے ترقی یافتہ سائنسی دور کی لسانی ضروریات کس طرح پوری کر سکتی ہے؟

اس نوع کے اعتراضات، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اطراف و اکناف کی زندگی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے کی جاتی ہیں۔ اس قسم کے اعتراض صادر کرنے سے پہلے اگر اپنی قومی زندگی پر اور اس میں استعمال کی جانے والی زبان پر ایک سرسری سی نگاہ بھی ڈالی جائے تو اعتراض صادر کرنے کی چنداں گنجائش نظر نہ آتی کیونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اردو برسہا برس سے عملاً انگریزی کی جگہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ آپ کسی بھی ادارے کی جس کو عوام الناس سے سروکار ہوتا ہے، لسانی ذریعے (MEDIUM) پر نگاہ ڈالیں۔ آپ کو انگریزی ملے یا نہ ملے اردو ضرور نظر آئے گی۔ ریلوے میں پلیٹ فارموں پر اسٹیشنوں کے نصب شدہ نام اردو میں نظر آئیں گے۔ ٹکٹ پر منزل مقصود کا نام اردو میں ضرور چھپا ہوگا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر یا طعام خانے اور انتظار گاہوں کے دروازوں پر آویزاں تختیاں اردو میں نظر آئیں گی۔ اسی طرح سے اسپتالوں کو لے لیجئے۔ بیشتر تختیاں اردو میں نظر آئیں گی۔ بلدیاتی اداروں کی بیشتر مطبوعات اور اعلانات انگریزی کے بجائے یا انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ہوتے ہیں۔ محکمہ زراعت کے کتابچے اردو میں طبع ہوتے ہیں۔ محکمہ صحت کا لٹریچر اردو میں ہوتا ہے۔ سینما گھروں کے اشتہارات اردو میں ہوتے ہیں۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر کاروباری اشتہارات اردو میں ہوتے ہیں۔ سرکاری اشتہارات اور ٹینڈر نوٹس اکثر اردو میں ہوتے ہیں۔ ڈاکخانے میں منی آرڈر کی ترسیل

کا قیام، قومی سٹاف کالج، الیکشن کے رائے دہندگان کی فہرستیں اردو میں ہوتی ہیں۔ تھانے میں رپورٹوں کا اندراج اور بیان نویسی اردو میں ہوتی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بیشتر سامعین اردو کی خبریں سنتے ہیں عوام الناس کی غالب اکثریت اردو اخبارات اور اردو خبریں پڑھتی ہے۔ ان سب شواہد سے جو حقیقت بیّن طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ملک کی سرکاری اور کاروباری زبان عملاً اردو ہی ہے اور انگریزی اپنی جگہ چھوڑتی جا رہی ہے۔ خود حکومت کی جانب سے عوامی رابطے کے لئے انگریزی کے بجائے اردو کا استعمال اردو کے آگے اس کی ذہنی پسپائی کا نہایت بیّن ثبوت ہے انگریزی زبان صرف سرکاری دفاتر میں خط و کتابت اور حاشیہ نویسی (NOTING) کے لئے رہ گئی ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو انگریزی کو قومی زندگی کے اس ایک تنہا دائرے میں صرف انگریزی ٹائپ رائٹروں کے ذریعے چلایا جا رہا ہے۔ کیونکہ انگریزی ٹائپسٹ اور انگریزی ٹائپ رائٹر اردو ٹائپسٹ اور اردو ٹائپ رائٹروں کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے دستیاب ہیں۔

تعلیمی اداروں میں بھی، جہاں کسی زبان کی اہلیت تعلیم و تعلم کی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے نہایت خوش گوار اور سنسنی خیز حقیقت یہ ہے کہ بیشتر کتابیں، خواہ سائنس کی ہوں، اردو زبان میں تصنیف کی گئی ہیں۔ اس کے مقابلے میں انگریزی میں تصنیف کی جانے والی کتابوں کی تعداد بعض مضامین میں ایک چوتھائی سے بھی کم ہے۔ حیوانیات میں، نباتیات میں، طبیعیات میں اور کیمیا میں گزشتہ برسوں میں اردو زبان میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ پاکستان میں انگریزی زبان میں لکھی جانے والی کتابوں سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ انسانیات (آرٹس) کے مضامین میں اردو زبان کی درسی کتابوں کا تناسب اس بھی زیادہ ہے۔ یہ بات شاید مبالغہ آمیز نہیں کہ انسانیات کے بعض مضامین مثلاً معاشیات، سیاسیات، نفسیات، تعلیم اور اسلامی تاریخ میں کوئی طالب علم اردو زبان کی تصنیفات کے مقابلے میں انگریزی زبان کی کتابوں کو ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کرتا۔ ان حقائق کی روشنی میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری قومی زندگی کی رگوں میں خون کی گردش کی طرح کون سی زبان رواں ہے۔ اردو یا انگریزی؟

اب دوسرے الزام کی حقیقت ملاحظہ فرمایئے کہ اردو محض شعر و شاعری کی زبان ہے۔ یہ آج کے ترقی یافتہ سائنسی دور کی لسانی ضرورت پوری نہیں کر سکتی ایک عامی آدمی تو بے شک اس زبان کو فرومایہ زبان سمجھے گا جو شعر و شاعری کی زبان کہلاتی ہو لیکن کسی ماہر لسانیات کے سامنے کسی زبان پر مذکورہ بالا "الزام" دھرا جائے تو وہ اس کا جواب یہ دے گا کہ چونکہ وہ زبان شعر و شاعری کی زبان ہونے کی اہل ہے لہٰذا وہ سائنس کی لسانی ضروریات کو سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ پوری کر سکتی ہے۔ اور وہ اپنے اس جواب کی تشریح یہ کرے گا کہ سائنس مادی علم کا نام ہے۔ اور سائنسی لٹریچر مادی علوم کی تشریح کرتا ہے۔ اس کے برعکس شعر و شاعری غیر مادی عناصر زندگی یعنی خیالات اور محسوسات کو الفاظ کا جامہ پہناتی ہے۔ خیالات اور محسوسات کو الفاظ کا جامہ پہنانا مادی علوم کی تشریح کرنے کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ مشکل کام ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا جو زبان خیالات و محسوسات

کو بیان کرنے پر قادر ہو اس کے لئے مادی علوم کی تشریح کرنا چنداں مشکل امر نہیں رہتا۔ آپ اس بات کو ایک تمثیل کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں۔ کوئی شیر خوار بچہ اپنے اطراف کی زندگی کی مادی چیزوں کو پہلے سیکھتا ہے۔ غیر مادی اور غیر مرئی چیزوں کو بہت بعد میں۔ وہ اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں کپڑے، جوتے، کنگھی کھانا اور دودھ وغیرہ جیسی مادی چیزوں کو سمجھنے اور پہچاننے پر قادر ہوتا ہے۔ بچہ کے اس مرحلے میں درد، سوزش، دوران سر، رنج اور خوشی وغیرہ جیسی غیر مادی چیزوں کو جو جذبات اور احساسات سے تعلق رکھتے ہیں سمجھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ غیر مادی چیزوں کو سمجھنا اور سمجھانا مادی چیزوں کو سمجھنے اور سمجھانے سے مشکل تر کام ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی زبان اگر غیر مادی چیزوں کو بیان کرنے پر قادر ہو تو مادی چیزوں کو بیان کرنا اس کے لئے کیا مشکل ہے۔؟

سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا وہ عقلی نکتہ ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اس حقیقت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جتنے مروجہ علوم ہماری درس گاہوں میں پڑھائے جاتے ہیں ان کی انگریزی اصطلاحات کے اردو مترادفات بغیر کسی دشواری کے وضع کر لئے گئے۔ اور ان اصطلاحوں کو نوک زبان پر لانا انگریزی اصطلاحیں استعمال کرنے کے مقابلے میں چنداں مشکل تر کام نہیں مثلاً انگریزی اصطلاح ARTERY کے لئے اردو میں شریان کا مترادف استعمال کرنے میں کسی کو کیا دقت پیش آ سکتی ہے؟ اسی طرح سے CARDIAC کے لئے قلبی یا GOBLET کے لئے ساغر نما، ANALYSIS کے لئے تجزیہ، SHOOT کے لئے کونپل یا FIRE EXTINGUISHER کے لئے آتش فرو، ایسے مترادفات ہیں جن کا ادا کرنا بھی آسان ہے اور معنی سمجھنا بھی۔

اردو زبان اپنی جس لسانی خوبی کی بنا پر اس صلاحیت کی حامل ہے کہ انگریزی کی تمام اصطلاحوں کے مترادفات پیش کر سکے وہ یہ ہے کہ اس کی گرامر مشتقات (DERIVATIVES) اور ترکیبات بنانے کی بڑی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے۔ اتنی بڑی کہ شاید دنیا کی کسی دوسری زبان میں اتنی صلاحیت نہ ہو۔ انگریزی اور عربی میں بھی نہ ہو۔

اردو کے برعکس دوسری زبانوں کو انگریزی اصطلاحوں کے مترادفات پیش کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ان میں سے ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ ان زبانوں کے پاس اتنے حروف تہجی ALPHABETS نہیں ہوتے جو انگریزی زبان کی ہر اصطلاح کا تلفظ ادا کر سکیں۔ مثال کے طور پر ایسے الفاظ یا ایسی اصطلاحوں کو لے لیجئے جن میں P.T , D,G وغیرہ حروف آتے ہیں۔ ان میں سے کسی حروف سے بننے والے لفظ کا تلفظ ادا کرنے کے لئے بہت سی زبانوں مثلاً عربی میں حروف نہیں ہوتے۔ لہٰذا اگر انگریزی کی کوئی اصطلاح ایسی ہو جس میں ان کا کوئی حرف شامل ہو اور اس کا عربی مترادف عربی زبان میں پہلے سے موجود نہ ہو تو عربی زبان اس لفظ کا مترادف پیش کرنے سے معذور ہو جاتی ہے اور ناچار اس لفظ کو اپنے حروف تہجی کے سانچے میں ڈھال کر اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً ٹیلی فون کے لئے "تلفون" یا ڈاکٹر کے

لئے دکتور وغیرہ یا سنسکرت زبان میں خ، ذ، غ
ق وغیرہ کا تلفظ ادا کرنے والے حروف بھی نہیں ہوتے
لہٰذا کسی دوسری زبان کا کوئی ایسا لفظ آجائے جس میں
ان حروف میں سے کوئی حرف استعمال ہوا ہو اور
سنسکرت زبان کے پاس اس لفظ کا کوئی مترادف
نہ ہو تو ایسی صورت میں سنسکرت زبان اس لفظ
کا نہ مترادف پیش کرسکتی ہے اور نہ اسے اپنی زبان میں
اختیار کرسکتی ہے۔ اردو کے ماسوا دوسری زبانوں کی
لسانی کمزوری کا نقصان اسے یہ اٹھانا پڑتا ہے کہ وہ
دوسری زبانوں کے تمام الفاظ کے مترادفات پیش
کرنے سے معذور ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کی
روشنی میں اگر سنسکرت زبان کے لئے یہ کہا جائے کہ
وہ انگریزی کی جملہ اصطلاحوں کے مترادفات پیش نہیں
کرسکتی تو یہ الزام بجا ہوگا۔ اسی طرح سے عربی زبان
کے لئے، اسی طرح سے فارسی کے لئے، اور اسی طرح
سے دوسری زبانوں کے لئے۔

دوسری زبانوں کی اس کمزوری پر مستزاد
یہ امر ہے کہ اگر اسے مرکب الفاظ یا مرکب اصطلاحوں
کے مترادفات پیش کرنے کو کہا جائے تو ان پر ہمالیہ
پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ مثلاً 'TELEGRAPH,
ELECTRO CARDIO GRAM,
PHOTOSYNTHESIS جیسی مرکب اصطلاحوں کو لیجئے
اور سنسکرت یا عربی یا فارسی زبان سے فرمائش کیجئے
کہ وہ اپنی زبان میں اس کے مترادفات، پیش کردیں
۔ وہ لاچار نظر آئیں گی۔ ہاں عربی تھوڑی سی مرکب
اصطلاحوں کے مترادفات ضرور پیش کردے گی ایسی
اصطلاحوں کے مترادفات جنہیں حروف "الف" اور "لی" کے ذریعے

آپس میں جوڑنا ان کے یہاں ممکن ہو مثلاً AQUA
REGIA کے لئے ماء الملوک یا ATMOSPHE
RE۔ کیلئے الجوار الہوا وغیرہ۔ ایسا کرنا اس کے لئے
اس وجہ سے ممکن ہے کہ اس زبان کے پاس AQUA
کے لئے ماء اور REGIA کے لئے ملوک کا لفظ پہلے
سے موجود ہے۔ یا ہوا اور پانی کے لئے ہوا اور جوا کے
الفاظ موجود ہیں اس کے برعکس اسے انگریزی کی کسی
ایسی مرکب اصطلاح کا مترادف پیش کرنے کے لئے کہا
جائے جس کے لئے عربی زبان کے پاس پہلے سے الفاظ
موجود نہ ہوں یا ان میں سے صرف ایک لفظ کا مترادف
موجود ہو دوسرے کا نہ ہو تو عربی زبان اس
مرکب اصطلاح کا مترادف پیش کرنے سے لاچار نظر آئیگی مثلاً
[illegible]
یا انگریزی زبان کی کسی مفرد اصطلاح کی ان کے پاس
مفرد کے بجائے مرکب اصلاح ہو تو وہ بسا اوقات اس
قدر بھاری بھرکم ہوتی ہے کہ اسے زبان سے ادا کرنا
گراں بار اور کانوں سے سننا گراں گوش معلوم ہوتا ہے۔
مثال کے طور پر انگریزی کی اصطلاح MICROSC
OPE۔ کو لے لیجئے۔ اس کے لئے عربی میں آلتہ
المقرد سکوب وضع کیا گیا ہے۔ اندازہ لگائیے کہ یہ
لفظ کس قدر ثقیل ہے۔ اسی طرح سے ASTRONO
MER۔ کے لئے عارف بعلم الفلک HERBAR
IUM۔ کو مجموع نباتات میبسہ کہا جاتا ہے۔ ان الفاظ
کو ہم اردو میں خوردبین، فلکیات داں اور بوٹی خانہ
کہتے ہیں۔ اب فیصلہ کیجیے کہ ان میں سے کس زبان کی
اصطلاحیں زیادہ روانی رکھتی ہیں۔ یہی کیفیت فارسی زبان
کی ہے۔ ایسی مرکب اصطلاح جس کے دونوں الفاظ کے

مترادفات اس کے یہاں پہلے سے موجود ہوں، یہ
زبان اس کا مترادف پیش کر دے گی

اس کے برعکس ایسی مرکب اصطلاحات جس کے الفاظ کے
مترادفات اس زبان میں موجود نہ ہوں ان کا
متبادل اپنی زبان میں پیش کرنے سے یہ بھی عربی کی
طرح قاصر نظر آئے گی، عربی اور فارسی تو بڑی زبانیں
ہیں، ان کی لاچاری کا یہ عالم ہے تو دوسری زبانوں
سے کیا توقع؟

اس کے برعکس اردو زبان میں مذکورہ بالا
تمام چیلنجوں کا جواب موجود ہے۔ اس کی پہلی وجہ
یہ ہے کہ اس کے حروف تہجی دنیا کی تمام بڑی زبانوں
یعنی انگریزی، عربی، فارسی اور سنسکرت کے الفاظ
کو ادا کرنے کے لئے اپنے یہاں حروف تہجی رکھتی ہے
T۔ P۔ G۔ D وغیرہ کا تلفظ رکھنے والے الفاظ کے
لئے بھی، خ، ظ، ح۔ اور ق کا تلفظ رکھنے والے الفاظ
کے لئے بھی اور ٹ، ڈ، ڑ، بھ، پھ، ٹھ، ڈھ، جھ،
گھ کا تلفظ رکھنے والے الفاظ کے لئے بھی اور پ، چ اور
ژ کا تلفظ رکھنے والے الفاظ کے لئے بھی صرف چینی زبان
ایسی ہوگی جس کے بعض الفاظ کا تلفظ ادا کرنے کے لئے
اس زبان میں حروف شاید نہ ہوں مگر ان کے لئے
حروف شامل کرنے کی گنجائش پوری طرح موجود
ہے۔ حروف تہجی کی اس وسعت کا فائدہ اس زبان
کو یہ پہنچتا ہے کہ یہ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی
زبان کے تمام الفاظ کو بلا تعرف اپنی لغت میں
شامل کر سکتی ہے۔

دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی لفظ کی
تصغیر (DIMINUTIVE) عربی قاعدے سے
بھی بنا سکتی ہے اور فارسی قاعدے سے بھی، مثلاً
حیوان کی تصغیر عربی قاعدے سے حوین بنائی جا سکتی
ہے اور فارسی قاعدے سے حیوانچہ یا دماغ کی
تصغیر عربی قاعدے سے دمیغ بنائی جا سکتی ہے اور
فارسی قاعدے سے دماغچہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ عربی اور
فارسی دونوں زبانوں میں سے جس زبان کے گرامر کے
بموجب بنائی ہوئی تصغیر زبان پر آسانی سے رواں نظر
آئے یا سننے میں سہل تر نظر آئے اردو زبان
اسے اختیار کر لیتی ہے۔

تیسری خوبی یہ ہے کہ یہ انگریزی (یا کسی اور بدیسی
زبان کی) کسی مرکب اصطلاح کے لئے اردو زبان میں
ایسا مرکب مترادف پیش کرنے کی مجاز ہے جس کا
ایک لفظ عربی کا ہو اور دوسرا فارسی یا سنسکرت کا
مثلاً CONJUGATING CELL
کے لئے سنجوگی خلیہ جس میں کا لفظ سنجوگ سنسکرت
زبان کا ہے اور خلیہ عربی زبان کا۔ اسی طرح سے
CELL WALL کے لئے خلوی دیوار، CHAIN
REACTION کے لئے زنجیری تعامل PHOTO
ELECTRIC EFFECT کے لئے ضیا برقی
اثر وغیرہ۔ ان میں سے ہر مرکب اصطلاح کے دونوں
اجزاء دو مختلف زبانوں سے ماخوذ ہیں۔

اصطلاح سازی کا کام تو اب شروع کیا گیا
ہے۔ پہلے سے اردو زبان میں بے شمار ایسے الفاظ
موجود ہیں جن کا ایک جزو کسی ایک زبان سے آیا
ہے اور دوسرا کسی دوسری زبان سے مثلاً سیلاب
دو الفاظ کا مرکب ہے، جس میں سے لفظ سیل

عربی زبان سے آیا ہے جس کے معنی بہاؤ کے ہیں اور آب فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی پانی کے ہیں یا قیام پذیر، تخم ریزی، عمل انگیز، ذخیرہ اندوز وغیرہ دو مختلف زبانوں کے الفاظ کے مرکبات ہیں۔

چوتھی بڑی خوبی اس زبان کی یہ ہے کہ دو مختلف الفاظ کو عربی قاعدے سے، درمیان میں الف اور لٗ لاکر بھی جوڑ سکتی ہے مثلاً NEWTON'S LAW کے لئے قانون النیوتن (اسی طرح جیسے ہم حکیم الامت یا شیخ الاسلام کے الفاظ بولتے ہیں) اور فارسی قاعدے سے اضافت کے ذریعے قانون نیوتن اور ہندی قاعدے سے دونوں الفاظ کے درمیان حرف ربط (PREPOSITION) کے ذریعے بھی یعنی نیوٹن کا قانون

پانچویں بڑی خوبی اس زبان کی یہ ہے کہ کسی زبان کو مثبت سے منفی بنانے کے لئے یہ اس لفظ سے پہلے کم سے کم چار مختلف لاحقے استعمال کر سکتی ہے جو، نا، بے، لا اور غیر ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ان چاروں میں سے جس لاحقے کے ذریعے مثبت سے منفی بنایا ہوا لفظ زبان پر رواں نظر آتا ہے، بلا تکلف استعمال کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً لفظ تعداد کا منفی بنانا ہو تو (لا) کے لاحقے کی مدد سے لاتعداد کا لفظ غیر تعداد نا تعداد اور بے تعداد کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ رواں نظر آئے گا۔ اسی طرح سے کہیں (بے) کا لاحقہ مناسب معلوم ہوتا ہے مثلاً بے حد، بے فائدہ، بے حیا وغیرہ کہیں (غیر) کا لاحقہ موزوں نظر آتا ہے۔ مثلاً غیر متوازن، غیر معمولی، غیر اخلاقی وغیرہ اور کہیں (نا) کا مثلاً ناممکن، ناموزوں، نامکمل وغیرہ

چھٹی بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی لفظ سے مشتقات عربی قاعدے سے بھی بنائے جا سکتے ہیں اور فارسی قاعدے سے بھی مثلاً لفظ عصا (بمعنی لاٹھی) سے عربی قاعدے پر لفظ عصیہ (بمعنی چھوٹی لاٹھی) بنایا جا سکتا ہے جبکہ لفظ برگ (بمعنی پتا) سے جو فارسی زبان کا لفظ ہے، فارسی قاعدے کے بموجب برگچہ (چھوٹا پتا) کا لفظ مشتق کیا جا سکتا ہے۔

ساتویں خوبی یہ ہے کہ کسی ایک زبان کے لفظ سے دوسری زبان کے قاعدے پر بھی مشتقات بنائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً لفظ موسم سے جو فارسی زبان کا لفظ ہے عربی قاعدے پر موسمیات یا ہوا سے (CLIMATE) سے ہوابیات (CLIMATOLOGY) بنایا جا سکتا ہے۔

اس قدر متنوع خوبیوں کا حامل ہونے کی بنا پر اردو زبان میں اس امر کی صلاحیت پائی جاتی ہے کہ یہ انگریزی کی اور دنیا کی زیادہ سے زیادہ علمی زبانوں کی تمام کی تمام اصطلاحوں کے مترادفات پیش کر سکے۔

ہاں اگر کبھی صورت حال ایسی ہو کہ انگریزی زبان کی اصطلاح کا اردو مترادف حروف کی تعداد کے اعتبار سے بڑا ہو یا صوتی اعتبار سے گراں بار ہو تو انگریزی اصطلاح کو بجنسہٖ اختیار کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً سائنس، پولیس، ڈاکٹر، ریل، کار، موٹر، سیلون اور فلم وغیرہ جیسے الفاظ مگر یہاں پر یہ امر واضح رہے کہ جب ان میں سے کسی لفظ سے مشتقات بنانے ہوں یا جمع بنانا ہو تو ہم اردو گرامر کے طریقے پر بنائیں گے۔ اس اصول کے بموجب سائنس کی مشتقات

سائنس، سائنٹسٹ، اور سائنٹیفک نہیں ہوں گی
بلکہ سائنسیں، سائنسداں، اور سائنسی ہوں گی۔

اصطلاح سازی کے بارے میں یہ چند بنیادی باتیں اس غرض سے بتائی گئیں کہ اردو زبان کی وسعت کے بارے میں ذہنوں میں جو ابہام ہے وہ دور ہو جائے اور اس امر کا تیقن پیدا ہو کہ آئندہ بھی انگریزی زبان میں جتنی اصطلاحیں بنیں گی اردو زبان بلاتکلف ان کے مترادفات وضع کر دے گی۔

اور امر واقعہ یہ ہے کہ اس امر کے باوجود کہ انگریزی اصطلاحوں کے مترادفات تیار کرنے کے لئے حکومت کی جانب سے اب تک کوئی قابل ذکر ہمت افزائی یا مدد نہیں کی گئی ہے۔ پاکستان میں اردو اصطلاحات وضع کرنے کا اس قدر غیر معمولی کام ہوا ہے کہ اسے آگے چل کر تاریخی اہمیت حاصل ہو گی ہم ذیل میں اس کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف نے صرف ۱۲۔۱۵ سال کی قلیل عرصہ میں اپنے محدود وسائل کے ساتھ مختلف مضامین کی تقریباً ۳۵ ہزار اصطلاحیں وضع کرائی ہیں۔ جن کی مضمون وار تفصیل درج ذیل ہے :۔

حیاتیات	۱۹۰۰۰
ریاضی، فلکیات و طبیعات	۶۷۰۰
کیمیا	۸۴۰۰
شماریات	۱۹۰۰
ارضیات و جغرافیہ	۲۰۰۰
عمرانیات	۳۴۰۰
فلسفہ	۲۵۰۰
معاشیات، تجارت و بنکاری	۸۵۰۰

قانون اور امور دفتری کی کئی ہزار اصطلاحیں ان کے علاوہ ہیں جن کی طباعت ابھی عمل میں نہیں آئی ہے۔

یہ اصطلاحیں جو یونیورسٹی کے ماہرین مضمون اور ماہرین لسانیات پر مشتمل جدا جدا مضمون وار کمیٹیوں نے دنیا کی مشہور لغات اور فرہنگوں کی مدد سے برسہا برس کی محنت شاقہ کے بعد تیار کی ہیں۔ مترادفات کی یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اردو زبان کی بڑی سے بڑی ادبی لغت میں درج شدہ الفاظ کی تعداد سے بھی متجاوز ہے مثلاً فرہنگ عامرہ میں جو ایک معیاری لغت سمجھی جاتی ہے۔ الفاظ کی تعداد صرف ۳۴ ہزار ہے۔

کراچی یونیورسٹی کے علاوہ یہ کام ملک کے اور بھی بہت سے افراد اور اداروں نے کیا ہے۔ پشاور یونیورسٹی کے ایک فاضل اجل شیخ منہاج الدین مرحوم نے جملہ علوم سائنس کی ایک جامع فرہنگ موسوم بہ قاموس الاصطلاحات شائع کی ہے۔ جس میں الفاظ کی کل تعداد پینسٹھ ہزار سے متجاوز ہے۔ ان کی یہ فرہنگ سو فیصد خلقی تصنیف (ORIGINAL WORK) نہیں ہے۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ اور دیگر اداروں کی وضع کردہ اصطلاحات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مگر اتنی بڑی فرہنگ کی تدوین بجائے خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور اردو زبان کا بیش بہا سرمایہ ہے۔

حکیم غلام نبی نے طب و جراحت کی فرہنگ موسوم بہ طبی لغت تیار کی ہے۔ جس میں جدید طبی اصطلاحوں اور امراض کے اردو نام

دیئے گئے ہیں۔ یہ بھی بڑی جامع فرہنگ ہے۔
جس میں اصطلاحوں کی تعداد کم وبیش ۳۲ ہزار
ہے طب کی ایک اور لغت مرکزی اردو بورڈ لاہور
کے زیر اہتمام حکیم محمد شریف جامعی مرتب فرما رہے
ہیں۔ ایک جلد جو حروف "A" تا "E" کے الفاظ پر
مشتمل ہے۔ شائع ہو چکی ہے۔ یہ ۲۲ ہزار
اصطلاحوں کی حامل ہے۔ یہ حکیم غلام نبی کی فرہنگ
سے زیادہ ضخیم ہے۔ کیونکہ اس میں انگریزی اصطلاحوں
کے مترادفات کے علاوہ ان کی تشریحات بھی دی
گئی ہیں۔ جو انسائیکلو پیڈیائی طرز کا کام ہے اور
نہایت قابل قدر کام ہے۔

امور دفتری کی نہایت جامع فرہنگ حکومت
پنجاب نے شائع کی ہے۔ جس میں اٹھارہ ہزار مترادفات
ہیں۔ یہ کثیر تعداد ہماری روزمرہ کی دفتری ضروریات
پوری کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔

مرکزی اردو بورڈ جملہ مضامین کی ایک
جامع فرہنگ مرتب کر رہی ہے۔ حروف "A" تا "K"
تک کی تختیاں سات جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں
جو ۲۰۴۴ صفحات پر محیط ہیں۔ اس میں مترادفات
کی تعداد ۶۲ ہزار ہے۔

یہ ہے فرہنگوں کا ایک اجمالی جائزہ۔

اردو مترادفات کے بارے میں ایک خیال بہت
عام ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اردو اصطلاحوں کے معنی اور
مطلب سمجھ میں نہیں آتے جبکہ انگریزی اصطلاحوں کو
سن کر اس کا مفہوم فوراً سمجھ میں آ جاتا ہے۔

یہ خیال، خیال باطل ہے۔ اصطلاح دنیا کی کسی
بھی زبان کی ہو۔ اس کے معنی و مفہوم سے خود اس
زبان کے جاننے والے بھی نابلد ہی رہتے ہیں۔ انہیں
ان اصطلاحوں کے مفہوم سے جتنی کچھ بھی آگہی ہوتی
ہے۔ وہ ان اصطلاحوں کے تکرار استعمال
سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کوئی موٹر میکانک
جب کاربوریٹر، پائنٹ، پسٹن، سلنڈر اور پلگ
کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو اسے ان میں سے
ایک لفظ کا بھی لغوی معنی معلوم نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ
وہ موٹر کے انجن میں ہر روز ان پرزوں کو دیکھتا رہتا
ہے۔ اس لئے ان اصطلاحوں کے مفہوم کو اچھی طرح
سمجھتا ہے۔ ورنہ یہی اصطلاحیں اگر کسی یونیورسٹی
گریجویٹ کے سامنے دہرائی جائیں۔ اور اس سے ان
کا معنی و مفہوم پوچھا جائے تو وہ ان میں سے ایک کا
مفہوم بھی بیان نہ کر سکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام
کی تمام اصطلاحیں خواہ وہ انگریزی کی کیوں نہ ہوں
عام فہم نہیں ہو سکتیں وجہ اس کی بہت واضح ہے وہ
یہ کہ عام آدمی صرف ان الفاظ کے معنی و مفہوم کو جانتا
اور سمجھتا ہے۔ جنہیں وہ روزمرہ کی بول چال میں
استعمال کرتا ہے۔ ایسے الفاظ کی تعداد ہزار پانچ سو
سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جبکہ اصطلاحوں کی تعداد ایک
ایک مضمون میں کئی کئی ہزار ہوتی ہے۔ آپ انگریزی
کی اصطلاحوں کو لے لیجئے جملہ مضامین میں ان کی تعداد
ایک لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ کیا انگریزی زبان کا کوئی
بڑے سے بڑا فاضل ان تمام اصطلاحوں کے معنی بتا
سکتا ہے؟ معنی کو تو چھوڑیئے ۹۰ فیصد اصطلاحوں
سے تو اس کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے ہوں گے۔
لہٰذا اردو زبان کی اصطلاحوں سے یہ توقع کرنا کہ اس کا
مفہوم کبھی سمجھ میں آ جائے۔ ایک فرمائش بے جا ہے

ان کے معنی ومفہوم ان کے تکرار استعمال سے سمجھ میں آنا شروع ہوتے ہیں۔

اس موقع پر ایک سوال ضرور ذہن میں ابھرے گا۔ وہ یہ کہ اگر اردو اصطلاحیں بھی معنی و مفہوم کے اعتبار سے اس قدر دشوار گزار ہیں جتنی انگریزی کی تو پھر اردو اصطلاحات وضع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ انگریزی کو ہی کیوں نہ لینے دیا جائے جن سے کان پہلے سے آشنا ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دو باتوں کی وجہ سے ایسا کرنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اگر ہمیں ذریعہ تعلیم کو تبدیل کرکے اردو کو اختیار کرنا ہے تو اصطلاحوں کو بھی اردو میں تبدیل کرنا ضروری ہو گا۔ کیونکہ اردو عبارت کے درمیان میں انگریزی اصطلاحیں موزوں نہیں ہوتیں۔ دنیا میں ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ جس زبان میں کتاب لکھی ہوئی ہے، اسی زبان میں اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ جرمنی میں بھی، فرانس میں بھی، جاپان میں بھی، چین میں بھی اور ہر جگہ یہ اور بات ہے کہ قوسین کے درمیان انگریزی کی اصطلاحیں بھی درج کردی جائیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی اصطلاح سے بہت سے مشتقات بھی نکلتے ہیں مثلاً ENTOMOLOGY، PALAEONTOLOGY وغیرہ جیسے الفاظ۔ اگر ان بدیسی الفاظ کو بجنسہٖ برقرار رکھیں گے تو ان کے مشتقات بھی بجنسہٖ برقرار رکھنا پڑے گا۔ جیسے ENTOMOLOGIST, ENTOMOPHILOUS، ENTOMOPHOBIA وغیرہ مگر اس نوع کی بے راہ روی کوئی بھی زبان گوارا نہیں کر سکتی۔ ہر زبان کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی لفظ خواہ کسی بھی زبان سے مستعار لے اسے اپنے گرامر کے قالب میں ڈھال کے استعمال کرتی ہے۔ اردو زبان بھی اب تک یہی کرتی آئی ہے کہ ENTOMOLOGY کیلئے حشریات کا مترادف استعمال کرتی ہے اور اس سے اپنی زبان کے بموجب ENTOMOLOGIST کے لئے ماہر حشریات، ENTOMOPHILOUS کے لئے حشرات پسند اور ENTOMOPHOBIA کے حشرات ترس وغیرہ مشتقات بنالی ہے۔ اس قاعدے سے انحراف کرکے وہ اپنا حلیہ کسی کو بگاڑنے نہ دے گی۔ ایسا کرے تو پھر وہ اردو کب رہے گی؟

اصطلاحوں کے بارے میں اس اجمالی بیان کے بعد اب درسی کتابوں کے بارے میں بھی مختصراً چند معروضات ملاحظہ فرمایئے:۔

مقتدرہ قومی زبان نے پاکستان میں لکھی جانیوالی سائنس کی درسی کتابوں کا جائزہ لیا تو یہ خوشگوار حقیقت منکشف ہوئی کہ اردو میں لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد انگریزی میں لکھی جانیوالی کتابوں سے چار گنا زیادہ ہے انسانیات (آرٹس) کے مضامین کے بارے میں تو عام آدمی بھی جانتا ہے کہ اردو کی درسی کتابوں کو اجارہ داری حاصل ہے۔ انگریزی کی کتابوں کو بمشکل ہی ہاتھ لگایا جاتا ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونیوالے طلباء کی تعداد میں ہر سال روزافزوں اضافہ اردو زبان کی درسی کتابوں کی ہی دستیابی کی مرہون منت ہے ورنہ کتابیں صرف انگریزی میں ہوتیں تو اتنی بڑی تعداد میں گریجویٹوں کا فارغ التحصیل ہونا ناممکن تھا

اس جائزے کے بعد قدرتی طور پر ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ اردو کو نافذ کرنے کے لئے کیا کچھ کرنا باقی رہ گیا ہے؟

تسلیم محمود

سائنس اردو کے آئینے میں

ادب اور سائنس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب سے اردو زبان میں ادبی تخلیقات نے جنم لینا شروع کیا بالکل اسی وقت یا اسکے قریب تر زمانے ہی سے سائنسی موضوعات بھی اردو زبان میں پھلنے پھولنے لگے۔ اردو زبان میں سائنسی ادب کے اولین کارناموں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ در پردہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اردو زبان میں اسکے دورِ آغاز ہی سے یہ صلاحیت موجود تھی کہ اگر وہ منطق و فلسفہ اور تصوف و معرفت کے لاینحل اور پیچ در پیچ مسائل کی گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے ـــ اور حسن و عشق کی رنگین داستانوں کو نظم و نثر کے پیرائے میں پیش کر سکتی ہے تو علمی و فنی اور سائنسی موضوعات کے رموز و نکات کی بھی آئینہ دار ہو سکتی ہے

ادب کے میدان سے ہٹ کر دیگر علوم و فنون کو اردو سے متعارف کرانے کا سلسلہ سولہویں صدی عیسوی ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ اردو میں موسیقی کی سب سے قدیم کتاب "راگ بلاول" ہے جو ۱۵۹۱ء کے لگ بھگ تصنیف کی گئی۔ اسی دور کا ایک منظوم طبی رسالہ بھی ہے جس میں مختلف بیماریوں کے علاج کے منظوم نسخے ہیں۔ مثال کے طور پر "دفع خارشِ چشم" کے تحت درج ذیل نسخہ درج ہے۔

نیبو تستیں افیون لائے   آنکھیاں اوپر لادے نیل
آنکھیاں کھلانہ جاوے   جاوے سیلا کھلانا

سائنسی علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنے کا یہ سلسلہ انیسویں صدی عیسوی میں معراجِ کمال کو پہنچ گیا۔ اس صدی میں علوم و فنون کی تالیف و ترجمے کی رفتار بہت تیز رہی۔ اردو کے لکھنے والوں نے جو سائنسی علوم و فنون کی تالیف میں مہارت رکھتے تھے، اپنی ساری توانائیاں مغربی علوم کے ترجموں اور بالخصوص سائنس کی کتابوں کی تالیف و ترجمے پر مرکوز کر دیں۔ اس دور کے تراجم اردو زبان کی گذشتہ عظمت اور آئندہ ترقی کے امکانات کی آئینہ دار ہیں۔ چنانچہ شمس الامراء شاہانِ اودھ، دہلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ، انجمنِ پنجاب، رڑکی انجینئرنگ کالج، انجمن ترقیٔ اردو وغیرہ نے جو کتابیں شائع کی ہیں انکی وجہ سے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔

اردو میں سائنسی علوم و فنون کو داخل کرنے کی پہلی باقاعدہ کوشش حیدرآباد دکن کے ایک علم دوست امیر و کبیر نواب محمد فخرالدین خان شمس الامرائے ثانی کی سرپرستی میں چلی۔ اور ۱۸۴۵-۱۸۳۳ء تک کے دوران ریاضیات، ہیئت، کیمیا، طبیعات اور مغربی طب پر تقریباً تیس کتابیں شائع ہوئیں۔ چند کتابوں کے نام مع سنہ

اشاعت کے درج کیے جاتے ہیں۔ رسالۂ کیمسٹری (۱۸۴۵ء) خلاصۃ الادویہ (۱۸۴۶ء) رسالۂ حیوانات مطلق (۱۸۴۸ء) ترجمہ شمس الہندسہ (۱۸۳۹ء)، نافع الامراض (۱۸۴۶ء) اور علم ہئیت (۱۸۴۰ء) وغیرہ۔

مغربی علوم کے ترجموں کی دوسری کوشش شاہانِ اودھ کی سرپرستی میں کی گئی۔ اس دور کے آخر کے زمانے میں جتنی بھی اردو میں کتابیں لکھوائی گئی تھیں وہ زیادہ تر سائنسی مضامین اور مغربی علوم و فنون پر مبنی ہیں۔ آخری شاہانِ اودھ کو ان علوم اور بالخصوص علم ہئیت سے اس قدر دلچسپی تھی کہ انہوں نے انگریزی زبان سے مختلف سائنسی علوم کی کتابوں کے ترجمے کروائے اور مطبع سلطانی سے شائع کیا۔

فروغِ اردو کی پہلی منظم کوشش دہلی کالج کی مرہونِ منت ہے۔ یہ کالج صحیح معنوں میں مشرق و مغرب کا سنگم تھا۔ اسے ۱۸۹۲ء میں قائم کیا گیا۔ اسکی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ یہاں تمام مغربی علوم اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ چونکہ اس کالج کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اسلئے نصابی ضروریات کے پیشِ نظر سائنس اور دیگر مغربی علوم کی کئی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ خوش قسمتی سے اسکو ایسے ذی علم اصحاب مل گئے تھے جنہوں نے اردو کے تہی دامن کو مغربی علوم کے جواہر پاروں سے مالا مال کر دیا۔ اسکے فیض یافتوں نے بھی اپنے طور پر اس قسم کی کتابیں تالیف کیں۔ مختلف علوم اور سائنس کی اشاعت کیلئے ۱۹۳۱ء میں دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس نے پہلی مرتبہ ترجمے کے اصول مرتب کیے۔ خاص خاص قواعد ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ با محاورہ اردو میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

۲۔ سائنس کا کوئی ایسا لفظ جسکا مترادف اردو میں نہ ملے تو ایسے لفظ کو اردو میں لینے میں کوئی قباحت نہیں۔ مثلاً کلورین، سوڈیم وغیرہ تاہم جہاں مترادف الفاظ موجود ہوں، اردو ہی کو استعمال کیا جائے۔ جیسے آئرن کیلئے لوہا اور سلفر کیلئے گندھک وغیرہ۔

۳۔ جہاں تک ممکن ہو انگریزی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے اور ترجمہ کرتے وقت وہ ہی اردو الفاظ و اصطلاحات استعمال کی جائیں جو ان سے پہلے کہ مترجمین کر چکے ہوں۔

۴۔ کیمسٹری کی اصطلاحات کو بجنسہ اردو میں لے لیا جائے البتہ کیمیائی عناصر جنکے نام اردو میں موجود ہیں انہیں برقرار رکھا جائے تاہم مرکبات کے نام انگریزی ہی میں محدود رہیں۔ جیسے ہائیڈروکلورک ایسڈ اور سلفیورک ایسڈ وغیرہ۔

کالج کے اساتذہ میں مولوی مملوک علی، ماسٹر رام چندر، پنڈت اجودھیا پرشاد اور بابو ہر دیو سنگھ نے ریاضی، سائنس اور طب پر مختلف کتابیں لکھیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اس کالج کے بارے میں کہتے ہیں۔ "اس نے تعلیم کا وہ صحیح طریقہ اختیار کیا تھا جس سے بہتر کوئی اور ہمارے ملک کے حق میں ہو نہیں سکتا"

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کو ترقی کی جانب گامزن کرانے کا بیڑا سر سید احمد خان نے اپنے سر لیا۔ آپ کا خیال تھا کہ مسلمان جب تک خود کو مغربی علوم سے آشنا نہیں کرینگے، اسوقت تک وہ ترقی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ آپ نے اردو میں مغربی علوم و فنون کی اشاعت کیلئے ایک انجمن قائم کرنے کا خاکہ تیار کیا۔ اور اسے عملی جامہ پہنایا۔ اسطرح ۱۸۶۳ء

میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں جب سرسید احمد خان کا تبادلہ علیگڑھ ہوگیا تو سوسائٹی بھی اپنے جملہ سامان اور کارپردازوں کے ساتھ علیگڑھ منتقل ہوگئی۔ سرسید نے ہزاروں روپے کے اخراجات سے سوسائٹی کیلئے ایک عمدہ عمارت تعمیر کرائی جو اب تک موجود ہے۔ تنخواہ دار مترجمین اور ملازمین سوسائٹی کے کام پر متعین کیے۔ سوسائٹی کے زیر اہتمام ہر مہینے کئی علمی جلسے منعقد ہوتے تھے۔ جس میں جدید موضوعات پر تقریریں ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر مکلکی نامی ایک سائنسدان ہر مہینے ایک تقریر کرکے مختلف سائنسی تجربوں کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس ۴۰ علمی و تاریخی کتب کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا۔

جنگ آزادی کے بعد سرسید کی تحریک کے علاوہ علم سائنس کو اردو میں فروغ دینے کی ایک اور منظم کوشش رڑکی انجنیئرنگ کالج کی رہین منت ہے۔ جس نے فن انجنیئرنگ کی اردو میں تعلیم دینے کیلئے نہ صرف ایک انجنیئرنگ کالج قائم کیا بلکہ انجنیئرنگ کی اردو میں نصابی کتابیں بھی تالیف و ترجمہ کرائیں ۱۸۸۸ — ۱۸۵۶ء تک اس کالج کی طرف سے متعدد کتابیں شائع کی گئیں جن میں استعمال جر ثقیل ، بیان لوگارثم ، اور استعمال ٹیبل لوگارثم ، قواعد حساب متعلقہ فن انجنیئرنگ اور مجموعہ سامان عمارت قابل ذکر ہیں۔

انجمن پنجاب نے بھی اس سلسلے میں اپنا کردار احسن طریقے سے انجام دیا۔ یہ دراصل ایک علمی انجمن تھی جو میجر فلسوز ڈائریکٹر سررشتہ تعلیمات پنجاب کی زیر نگرانی لاہور میں ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو میں مفید کتابیں لکھی جائیں اور انگریزی سے ترجمہ کی جائیں۔ انجمن کے ماتحت میجر فلسوز کے جانشین کرنل ہالرائڈ کی زیر سرپرستی اور مولانا آزاد کی تحریک پر ایک ماہانہ مشاعرے کی بھی بنیاد پڑی جس میں بجائے غزلوں کے نیچرل اور قومی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ انجمن کی کتابوں میں مفتاح الافلاک ، معلم المساحت ، اور مساحت کی ہدایت وغیرہ شامل ہیں۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے ماتحت ایک علمی شعبہ "انجمن ترقی اردو" قائم تھا۔ جسکا صدر دفتر علیگڑھ ہی میں تھا مولانا شبلی اور حبیب الرحمن شیروانی کے بعد مولوی عبدالحق ۱۹۱۲ء میں اسکے سیکرٹری منتخب ہوئے وہ انجمن کا دفتر اپنے ساتھ اورنگ آباد لے گئے۔ برصغیر کے ہر بڑے شہر میں انجمن کی شاخیں قائم کیں۔ اردو مرکزوں سے دور دراز صوبوں کے سرکاری تعلیمی اداروں میں حکومت سے اردو میں تعلیم کا انتظام کرایا گیا۔ اردو کی بکثرت نادر کتابوں کو تلاش کرکے طبع کیا گیا۔ ڈیڑھ لاکھ سے زائد جدید علمی و فنی اصلاحات کا دوسری زبانوں سے ترجمہ کیا گیا۔ دو ماہی رسالے اردو اور سائنس جاری کئے گئے جنمیں اعلیٰ علمی و ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ انجمن ہی کی کوششوں سے حیدرآباد دکن کے سابق ناظم میر عثمان علی خان کے ذریعے حیدرآباد دکن ہی میں جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی جس میں جملہ مضامین کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ ایک دارالترجمہ کی بھی بنیاد پڑی جہاں سینکڑوں علمی کتابیں تصنیف و ترجمہ کی گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں انقلاب میں انجمن کے معتمد اعلیٰ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ انہوں نے کراچی منتقل ہوکر کل پاکستان "انجمن ترقی اردو" قائم کی۔ اور انجمن کا رسالہ "قومی زبان" جاری کیا۔ قیام پاکستان کے بعد انجمن نے اردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مولوی عبدالحق نے اردو کے فروغ کی خاطر ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی اردو کالج کی ابتدا کی۔ آپ نئی مملکت میں ایسی یونیورسٹی کے قیام کے طالب تھے جو صحیح معنوں میں دہلی کالج، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور جامعہ عثمانیہ کی جانشین

ادیبہ اقبال

اردو زبان کے قومی، مذہبی اور سیاسی رجحانات

کسی ملک میں رہنے والے تمام لوگ خواہ وہ کسی بھی تعلق رکھتے ہوں ایک قوم کہلاتے ہیں اور ان میں رابطہ قائم کرنے کیلئے کوئی ایک ایسی زبان موجود ہوتی ہے جسے ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ قومیت کے بنیادی عوامل میں زبان ایک اہم عامل ہے یعنی کسی علاقے میں رہنے والے افراد ایک قوم اس وقت کہلاتے ہیں جب انہیں دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ زبان بھی مشترک ہو۔ پاکستان میں بھی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن سوائے ایک کے دیگر زبانوں کو تمام لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ چونکہ جغرافیائی اعتبار سے بھی اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی ہم ایک قوم ہیں اور ہمارا وطن ایک مسلم ملک ہے۔ آپس میں تعلقات قائم رکھنے کیلئے بھی ضروری تھا کہ کوئی ایسی زبان ہو جو ہر فرد کی سمجھ میں آسکے۔ یہ فرض اردو نے انجام دیا۔ اردو کسی مخصوص علاقے کی پیداوار نہیں بلکہ مختلف زبانوں کے ملاپ سے وجود میں آئی۔ اور اسے جہاں کہیں سے اچھے اچھے اور بلیغ الفاظ ملے انہیں اس زبان نے اپنا لیا۔ اسکے علاوہ غیر قومیں بھی برصغیر میں آکر آباد ہو

گئیں اور انکے بھی بعض الفاظ اردو میں شامل ہو گئے۔ اسی وجہ سے اردو میں ہمیں عربی، فارسی، سنسکرت، ترکی، فرانسیسی، انگریزی، پرتگیزی اور ہندو پاک کی تمام زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں۔

قومی زبان کو اپنانے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ تمام افراد کو آپس میں ہموطن ہونے کا رشتہ قائم رکھنا آسان ہوتا ہے۔ پھر وہ ایک دوسرے کے خیالات کو بھی سمجھ سکتے ہیں اسکے علاوہ قومی زبان اپنانے کا سب سے بڑا فائدہ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اسکی اہمیت اسلئے بھی ہے کہ اس زبان کے ذریعے لوگوں کو ہر طرح کی تعلیم خواہ وہ سائنسی ہو یا مذہبی یا قومی دی جاسکتی ہے۔ انہیں ہر میدان میں ترقی کے مواقع فراہم کئے جاسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں قومی زبان کو اپنانے کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایک متحد اور منظم قوم بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کوئی بھی قوم اپنی قومی زبان کو اپنائے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ہم اگر اپنی زبان سے بے بہرہ ہو گئے تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اپنی

زبان سے منہ موڑنے کا یہ مطلب ہے کہ ہم میں وطن پرستی کا جذبہ ختم ہو گیا۔ اور جب ہم وطن پرست نہیں بن سکتے تو پھر بھلا مذہب پرست کسطرح ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ انگریزی کی وجہ سے ہم اردو زبان سے دور ہوتے گئے۔ اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے ہم میں وطن پرستی کا جذبہ ختم ہو گیا اور پھر اسی وجہ سے ہم مذہب سے بھی دور ہوتے گئے۔

یہ صحیح ہے کہ انگریزی بہت وسیع زبان ہے۔ ہر قسم کے علم اور ہر شعبہ سے متعلق کتابیں اس زبان میں موجود ہیں۔ لیکن انگریزی اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اب تک اپنے آپ کو انگریزوں کی غلامی سے ذہنی طور پر آزاد نہیں کر سکے۔ جبکہ ایسے بہت سے ترقی یافتہ ممالک ہیں جہاں ذریعہ تعلیم انکی قومی زبان ہے اور تمام دفتری و سرکاری کام انکی اپنی زبان میں انجام دیئے جاتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں قومی زبان کو اسکا اصل مقام حاصل نہیں ہے۔ سر سید احمد خان نے انگریزی زبان کی حمایت میں جو تحریک چلائی تھی اسکا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم انگریزی تعلیم حاصل کر کے انگریزوں کے قریب آئیں۔ تاکہ انکی سازشوں اور انکے عزائم کا ہمیں علم ہو سکے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندو انگریزی تعلیم حاصل کر کے تمام شعبوں میں ذمہ دار عہدوں پر فائز ہو کر ترقی کر رہے تھے لہذا اگر اسوقت مسلمان انگریزی نہ سیکھتے اور خدانخواستہ پاکستان کا قیام عمل میں نہ آتا تو اسکا نتیجہ یہ نکلتا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی غلامی بھی قبول کرنی پڑتی اور جبکہ مسلمانوں کی انتھک کوششوں سے پاکستان بن گیا اور ہم کسی کے غلام بھی نہیں تو پھر ہمارے ذہن اب تک غلامانہ سوچ کیوں اپنائے ہوئے ہیں۔ جو انگریزی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ کسی بھی قوم کو ترقی کرنے کیلئے قومی زبان میں تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔ مشہور فلسفی ٹالسٹائی کا قول برحق ہے۔

"کوئی قوم غیر ملکی زبان کے ذریعے اپنی
قومی روح دریافت نہیں کر سکتی"

یہ قول اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ بدیسی زبان میں ہم ترقی نہیں کر سکتے اور سر سید احمد خان کا بھی یہی خیال تھا کہ:

"جب تک مغربی علوم لوگوں کو اپنی زبان
میں حاصل نہ ہونگے اسوقت تک ملکی ترقی
ممکن نہیں۔"

قیام پاکستان کی کوششوں میں اردو نے ایک اہم کردار انجام دیا ہے۔ ہمارے دانشوروں، ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں وغیرہ نے اپنی قوم کو بیدار کرنے کیلئے ہر طرح کی کوشش کی۔ رسالے نکالے، کتابیں اور مضامین لکھے اور یہ تمام مضامین رسائل وغیرہ اردو میں ہوتے تھے اسلیئے ہر شخص تک انکا پیغام پہنچ جاتا تھا اور وہ ایک نئے عزم کے ساتھ آزادی کی راہ پر گامزن ہوتے تھے۔ اسکے برخلاف اگر یہ سب کچھ انگریزی یا کسی دوسری زبان میں ہوتا تو یہ کام اتنی آسانی سے انجام نہ پاتا بلکہ ناممکن تھا۔ اردو میں بے شمار ایسی کتابیں موجود ہیں جن میں مسلمانوں کیلئے آزادی کا پیغام ہے، وطن سے محبت موجود ہے۔ جنکے ذریعے مسلمانوں کو غفلت سے جگا کر ان میں جوش و خروش پیدا کیا گیا ہے۔ بہت سی ایسی کتابیں بھی موجود

ہیں جنمیں قیامِ پاکستان کی جدوجہد اور مسلمانوں کی قربانیوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور اردو میں ہونے کی وجہ سے ہر پاکستانی انہیں آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔

جسطرح قومی لحاظ سے اردو کی خدمات قابلِ قدر ہیں اسی طرح مذہب سے محبت و دلچسپی قائم رکھنے میں بھی زبان کا بڑا ہاتھ ہے ہر شخص کیلئے اپنے مذہب سے متعلق ضروری معلومات کا حاصل ہونا ضروری ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ درس و تدریس کیلئے قومی زبان استعمال میں لائی جائے۔ ہر مذہب میں اسکے ماننے والوں کیلئے ایک راہِ عمل موجود ہے۔ اور یہ سبق انہیں پیغمبروں نبیوں اور آسمانی کتابوں کے ذریعے دیا جاتا رہا ہے۔ ہماری مذہبی کتاب قرآن شریف ہے جسمیں زندگی کے ہر پہلو کو پیش کیا گیا ہے اور انسانی زندگی گزارنے کے تمام اصول، ہر طرح کے مسائل اور انکے حل اسمیں موجود ہیں۔ لیکن قرآن شریف عربی زبان میں ہے لہذا اسکا سمجھنا بہت مشکل ہے اردو زبان کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اسکی وجہ سے ہمیں قرآن پاک کو سمجھنے کا موقعہ ملا۔ ان تراجم کے علاوہ مذہب سے متعلق بے شمار کتابیں ہیں جنمیں زمانۂ جاہلیت سے لیکر اب تک کے تمام واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ مثلاً "طبقات ابنِ سعد" جسکی آٹھ جلدیں ہیں۔ ان میں سے دو میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور حالات زندگی کا ذکر ہے اسکے علاوہ اسمیں حضور کے زمانے کے تمام حالات، خلفائے راشدین اور تمام صحابۂ کرام کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح ابنِ خلدون کی پہلی دو جلدیں مقدمۂ خلدون پر مبنی ہیں۔ اگلی دو جلدوں میں قبل از اسلام کے واقعات ہیں اور باقی دس جلدوں میں بالترتیب رسول اور خلفائے رسول، خلافتِ بنو امیہ، خلافتِ عباسیہ، امیرانِ اندلس، خلفائے مصر اور غوری

غزنوی اور غوری سلاطین، سلجوقی و شاہی سلاطین، زنگی صلاح الدین ایوبی اور سلاطین ممالک بحریہ مصر وغیرہ کے حالات ہیں۔ چند کتابیں ایسی ہیں جن میں اولیائے کرام کے حالات زندگی پیش کیئے گئے ہیں۔ اسلام اور سیاست کے موضوع پر ساتویں صدی ہجری کے نامور سیاستدان شیخ اسلام امام ابنِ تیمیہ کی "سیاستِ شرعیہ" ہے جس میں اس دور کے تمام حالات کو پیش کیا گیا ہے جب پورا عالم اسلام اپنا سیاسی استحکام کھو چکا تھا اسکے علاوہ "اجتماع ملتِ اسلامیہ" "اصول فقہ" وغیرہ غرض مذہب سے تعلق رکھنے والی ہر کتاب اردو میں موجود ہے اور ان سب کتابوں تک ہر شخص کی پہنچ صرف اردو زبان کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ سب کچھ عربی یا کسی اور زبان میں ہوتا تو مسلمانوں کا حال بھی عیسائیوں جیسا ہوتا۔ اور انہیں اپنی آسمانی کتاب کو سمجھنے کیلئے بھی ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی جو عربی سے واقف ہوں۔ اسکے علاوہ سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا کہ جسطرح انجیل صرف پادریوں کے پاس رہ سکتی ہے اور وہ ہی لوگوں کو پڑھ کر سنا سکتے ہیں یہی حال قرآن پاک کے ساتھ بھی ہوتا کہ وہ ایک محدود طبقے یا کچھ مخصوص لوگوں کیلئے وقف ہو جاتا۔ وہ اپنی من مانی کرتے اور اپنی مرضی کے مطابق اسمیں تبدیلیاں کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتے جیسا کہ پچھلے زمانوں میں ہوتا رہا ہے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے یہ الفاظ کہ

"کسی قوم کو اگر علم سے محروم رکھنا ہو
تو سہل طریقہ یہ ہے کہ اسے غیر زبان کے ذریعے
تعلیم دیجائے"۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کیلئے یہ الفاظ کافی ہیں اردو زبان کی قومی اور مذہبی حیثیت سے تو کسی کو انکار نہیں

لیکن آج کے سائنسی دور میں اردو زبان کی سائنسی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ تمام قومیں سائنس و ٹیکنالوجی کی دوڑ میں ایکدوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اور ہر شخص کیلئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ سائنسی تعلیم حاصل کرے۔ ہمارے ہاں بھی سائنس اب ابتدائی جماعتوں کے نصاب میں ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل ہے لیکن سائنسی ترقی صرف قومی زبان کے ذریعے ہی ممکن ہے کیونکہ تعلیم سائنس کی ہو یا کسی اور مضمون کی قومی اور مادری زبان میں جتنی اچھی طرح دیجا سکتی ہے اتنی اچھی طرح کسی اجنبی زبان میں نہیں دیجا سکتی۔ اس مسئلے میں پاکستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اگر تعلیم کسی اجنبی زبان میں دیجائے تو طالبعلم کو پہلے تو اس زبان کو سمجھنا پڑے گا تب کہیں وہ علم جو کہ طالبعلم حاصل کرنا چاہتا ہے اسکی سمجھ میں آئیگا۔ آج کل ہمارے ہاں کے بہت سے طالبعلموں کیلئے یہ بات مسئلہ بنی ہوئی ہے کہ کیونکہ ابتدائی جماعتوں سے لیکر میٹرک تک تو وہ اردو کے ذریعے پڑھتے چلے آئے ہیں لیکن جب وہ انٹرمیڈیٹ میں پہنچتے ہیں تو سال کا کچھ عرصہ تو اسی تذبذب میں گزر جاتا ہے کہ امتحان اردو میں دینا ہے یا انگریزی میں۔ تقریباً سارا سال لیکچر انکے سر پر سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن اگر یہی تعلیم انہیں اردو میں دی جائے تو انہیں ان مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک میں ذریعہ تعلیم انکی قومی زبان ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ روس اور چین جیسے ممالک جنکا کوئی مقابلہ نہیں وہ بھی اپنی قومی زبان کو اپنائے ہوئے ہیں اسی طرح جاپانی انگریزی کو پسند نہیں کرتے، فرانس اور جرمنی میں بھی انکی مادری زبان رائج ہے تو پھر ہمارے ملک میں انگریزی کی پرستش کیوں کی جا رہی ہے۔ ہم انگریزی کو اپنائے بغیر کیوں ترقی نہیں کر سکتے؟ جبکہ ترقی تو ہمیشہ اپنی زبان کے ذریعے ہوتی رہی ہے۔۔۔ مسلمانوں نے جب یونانی علوم کو سیکھنا چاہا تو انہیں پہلے اپنی زبان میں منتقل کیا یا اہل یورپ نے مسلمانوں کے ذخیرۂ علم سے فیض اٹھانا چاہا تو پہلے اسے عربی زبان سے اپنی زبان میں منتقل کیا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہموطن اپنی قومی زبان کو اپنانے کی کوشش نہیں کرتے جبکہ بقول مولوی عبدالحق

"جس قوم کی کوئی ایک زبان نہیں وہ قوم نہیں اور جس ملک کی کوئی ایک زبان نہیں وہ مملکت نہیں"۔ اردو زبان کو اپنانا تو درکنار بہت سے لوگ تو اسکی مخالفت کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اردو زبان میں اتنی صلاحیت موجود نہیں ہے کہ وہ سائنسی اور جدید علوم کو واضح کر سکے۔ اور شاید ایسے ہی لوگوں کیلئے بابائے اردو نے یہ کہا ہے کہ:

"زبان کی مخالفت بولنے والوں کی مخالفت ہے
کیونکہ انکی زندگی کے تمام شعبوں یعنی سیاست، معاشرت،
تہذیب و تمدن کا سرمایہ اسی میں محفوظ ہے۔"

یہ بات بڑی قابلِ تحسین اور موجبِ طمانیت ہے کہ ملک میں کچھ لوگ اور ادارے ایسے موجود ہیں جو قومی زبان کو سرکاری سطح پر رائج کرنے کے حامی ہیں۔ مثال کے طور پر سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان بھی اسی قسم کا ایک ادارہ ہے۔ ہمارے کالج کے بھی چند اساتذہ کرام اس سے منسلک ہیں۔ اور سائنسی تعلیم کو اردو زبان میں عام کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔ اپنے کالج کے ایک استاد سے ہم نے یہ پوچھا کہ سائنسی ترقی میں اردو زبان کی کیا اہمیت ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا:۔

"اگر کسی اجنبی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے۔

تو وہ طالبعلم اور مضمون کے درمیان ایک پہاڑ بنکر حائل ہو جاتی ہے جسے عبور کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی اسکے برخلاف تعلیم اگر اپنی زبان میں دی جائے تو طالبعلم کو مضمون تک رسائی میں کسی قسم کی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی اسی وجہ سے پاکستان میں انگریزوں کے جانے کے بعد ذریعۂ تعلیم کو بدلنے کا مطالبہ کیا گیا جو لوگ اس نظریئے کے قائل نہیں تھے کہ اردو میں تمام جدید علوم کی تعلیم دی جاسکتی ہے انہیں قائل کرنے کیلیئے اردو کالج قائم کیا گیا۔
اردو کو سائنس کی تعلیمی زبان بنانے کیلیئے جتنی کچھ تیاری ہونی چاہیئے تھی قریب قریب مکمل ہو چکی ہے مثال کے طور پر ہم صرف دو باتوں کا تذکرہ چاہتے ہیں ایک یہ کہ اتنی بڑی تعداد میں درسی کتابیں اردو زبان میں لکھی جاچکی ہیں کہ پاکستان میں انگریزی زبان میں لکھی جانے والی کتابیں انکا ایک چوتھائی بھی نہیں ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ سائنس کی تقریباً تمام اصطلاحات کے اردو مترادفات تیار ہو چکے ہیں مثلاً حیاتیات کی اصطلاحات کی جو فرہنگ تیار ہوئی ہے اسمیں اصطلاحات کی کل تعداد آٹھ ہزار ہے جبکہ تدریسی ضروریات میں مشکل سے ڈیڑھ دو ہزار اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ تیسری حقیقت یہ ہے کہ اردو کو تحقیقاتی مقالے پیش کرنے والی زبان کی حیثیت سے بھی منوایا جاچکا ہے اور جو زبان تحقیقی مضامین کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اسکی ابلاغ کی صلاحیت منوانے کیلیئے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ [illegible]ء سے سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کی سالانہ کانفرنسوں میں ہمارے ملک کے سائنسدان اردو زبان میں سائنسی مقالے پیش کر رہے ہیں۔ اور سامعین کی تعداد سائنس کی دوسری کانفرنسوں کے مقابلے میں یہاں زیادہ ہوتی ہے۔ اردو کی اہمیت باور کرانے کیلیئے اور کیا ثبوت چاہیئے؟"

اسی طرح محترمہ مہر افشاں عثمانی صاحبہ نے ہمارے اس سوال کے جواب میں کہ سائنٹفک سوسائٹی پاکستان اردو زبان کیلیئے کیا خدمات انجام دے رہی ہے کہا کہ۔

" سائنس کی ترقی ہمارے ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری درسگاہیں حکومت کے سائنسی و فنی محکمے اور دوسرے ادارے اپنے اپنے دائرہ کار میں قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مزید جدّ و جہد کی نہ صرف اشد ضرورت ہے بلکہ اسکے لئے بے شمار مواقع دستیاب ہیں۔
قومی تعمیر نو اور ترقی کے میدان میں سائنس سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کیا گیا ہے جسکے سبب قومی زندگی اور سائنس کے درمیان ایک خلیج اور بھی وسیع ہو جائے گی۔ تعلیمی اور ثقافتی اداروں میں بھی وقت کا مطالبہ ہے کہ سائنسی افکار کو ملک کے عام باشندوں کی زندگی سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔
انہی اسباب کی بنا پر پاکستان کے چند سائنسدانوں نے سر سید احمد خاںؒ کی قائم کردہ سوسائٹی کے طرز پر ایک سوسائٹی قائم کی اور سر سید کے اقدام کی تاریخی اہمیت اور مقاصد کی مماثلت کے مدِنظر اس سوسائٹی کا نام سائنٹفک سوسائٹی پاکستان رکھا۔ اس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد میں سائنسی معلومات کو عام فہم زبان میں ہر خاص و عام تک پہنچانا شامل ہے
سائنٹفک سوسائٹی پاکستان دراصل سر سید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی ہے۔ سر سید کا کہنا تھا کہ جب تک ہم سائنسی علوم کو اپنی زبان میں نہیں حاصل کریں گے

اسوقت تک کامیابی کے دروازے ہم پر نہیں کھلیں گے۔
سائنٹفک سوسائٹی پاکستان بھی اسی مقصد کو لیکر گزشتہ ۲۵ برس سے سائنسی علوم کو قومی زبان میں منتقل کرنے کی سعی میں مصروف ہے اسکے لیئے وہ ہر سال سائنس کانفرنس منعقد کرتی ہے اس سائنس کانفرنس میں تمام مقالے اردو زبان میں پڑھے جاتے ہیں اسکے علاوہ ایک رسالہ "دو ماہی" جدید سائنس" جوکہ دقیق اور دلچسپ مضامین پر مشتمل ہوتا ہے شائع کرتی ہے۔ بچوں اور جوانوں کیلیئے ایک خوبصورت رسالہ "سائنس بچوں کیلیئے" شائع کرتی ہے۔ جو طلباء و طالبات کے ساتھ ساتھ بزرگوں میں بھی خاصا مقبول ہے۔ گزشتہ نو ۹ برس سے یہ رسالہ شائع ہو رہا ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے اردو کے سائنسی ادب پر بہت احسان ہیں۔ ان رسائل کے علاوہ اس نے پانچ کتابیں بھی شائع کی ہیں۔

۱۔ کیوں اور کیسے سائنس سے پوچھیئے۔
۲۔ جدید سائنس کی کامرانیاں
۳۔ فتوحاتِ سائنس
۴۔ برقیات نوجوانوں کیلیئے
۵۔ زعمائے سائنس

انکے علاوہ "ثروت پاکستان" کے نام سے پاکستان کی سائنسی انسائیکلو پیڈیا تیار کی جارہی ہے اور کراچی میں ایوانِ سائنس کے نام سے ایک سائنسی مرکز بھی قائم کر رہی ہے۔

سائنسی میدان میں ترقی اور نئی نئی دریافتوں کیلیئے یہ ضروری ہے کہ ملک کے ہر شخص کو تعلیم سے آشنا کیا جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص سائنسی ترقی میں صرف اسلیئے مددگار ثابت نہیں ہوسکتا کہ وہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ اسکے لیئے میں ایک مثال یہ دونگی کہ ہمارے ٹی۔ وی پر پروگرام فروزاں میں ایک ایسے لڑکے کا تعارف کرایا گیا تھا جس نے مشینری کے سلسلے میں کچھ نئی دریافتیں کی ہیں اس لڑکے کا تعلق لاہور سے ہے اور اس نے زیادہ تعلیم بھی حاصل نہیں کی اور انگریزی تو اسکو بالکل ہی نہیں آتی۔ سائنس ہو یا کوئی اور علم وہ اسی وقت مفید ثابت ہوسکتا ہے جبکہ اسکو اچھی طرح سمجھا جائے۔ یہ انگریزی تو ایک اضافی مسئلہ ہے۔ ویسے بھی کچھ حاصل کرنے کیلیئے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ انگریزی سے ہمیں کوئی بیر نہیں بلکہ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ زیادہ سے زیادہ زبانیں سیکھی جائیں۔ تاکہ غیر قوموں کے علوم سے ہمیں فائدہ ہوسکے۔ اور یہی مسئلہ انگریزی کے ساتھ بھی ہے کہ ہمیں انگریزی کا سہارا لینا پڑتا ہے کیونکہ ۱۹۴۷ء کے بعد ذریعہ تعلیم کو بدلا نہیں گیا۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں اردو میں نصابی اور دوسری اہم کتابوں کی کمی ہوگئی اور اب تو کچھ لوگ یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ:

"دنیا سائنسی ایجادات کر رہی ہے اور ہم ابھی تک سائنسی اصطلاحات کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں"

انکا کہنا بھی ایک طرح سے ٹھیک ہی ہے کیونکہ ہمارے ہاں اردو کتابوں کی کمی ہے۔ اور بعض مضامین مثلاً ارضیات، حیاتی کیمیا کی کوئی کتاب اردو میں موجود نہیں۔ کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جنکی کوئی ایک آدھ کتاب اردو میں موجود بھی ہے تو انکی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے لہذا ایک عام آدمی کی رسائی تو ان تک ممکن ہی نہیں۔ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان کو حکومت کی سرپرستی حاصل نہیں ہے اور ہمارے دفاتر اور سرکاری اداروں میں سرکاری حیثیت انگریزی کو ہی حاصل ہے جبکہ یہ تمام کام اردو میں انجام دینے چاہئیں۔ ویسے بھی

اردو حروف تہجی میں بہت زیادہ وسعت موجود ہے کیونکہ
اردو بہت سی زبانوں کے ملاپ سے بنی ہے اور اس میں مختلف
زبانوں کے الفاظ و حروف شامل ہیں۔ اسکے برعکس کسی اور زبان
میں اسقدر وسعت موجود نہیں۔ مثلاً فارسی زبان میں ٹ۔
ڑ۔ ڈ وغیرہ نہیں ہیں۔ لیکن ہم اردو زبان کے ذریعے انہیں
ادا کر سکتے ہیں۔ اور ہم فارسی کے بھی کچھ الفاظ مثلاً خورشید،
گل وغیرہ بولتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی کے الفاظ اسٹیشن،
ڈاکٹر وغیرہ بھی اب ہماری زبان کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ اور
جب ہم انکو جمع بناتے ہیں تو اسٹیشنوں، ڈاکٹروں وغیرہ
کر دیتے ہیں۔ عربی کو لیں تو اسمیں پ۔ ٹ۔ چ۔ ڈ۔
ڑ۔ گ وغیرہ نہیں لیکن اردو زبان کے ذریعے انہیں ادا
کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً پانی۔ پاکستان۔ ٹوپی۔ گدھا وغیرہ۔
اور انگریزی زبان کو لیجئے تو اسمیں ث۔ ح۔ ط۔ ص وغیرہ
نہیں ہیں لیکن ہم انہیں ادا کر سکتے ہیں مثلاً طوطا۔ صراحی اسی
طرح اور بہت سی زبانوں کے حروف اردو حروف تہجی میں
موجود ہیں جسکی وجہ سے دوسری زبانوں کا تلفظ بھی ہم بڑی
سہولت کے ساتھ بیان کر لیتے ہیں۔ ہندی زبان کو دیکھیں
تو اس سے لئے گئے حروف۔ دھ۔ چھ۔ بھ وغیرہ کے
ذریعے ہم دھوبی۔ ڈھول۔ گھوڑا وغیرہ کے الفاظ استعمال
کرتے ہیں۔ فی الحال یہ پھ۔ جھ۔ چھ۔ تھ وغیرہ ہمارے
حروف تہجی میں شامل تو نہیں ہیں لیکن وہ اردو حروف تہجی کا
ایک حصہ ضرور ہیں۔ اور آئندہ کچھ عرصے بعد شاید یہ بھی حروف
تہجی میں شامل ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کے
ذریعے ہر طرح کا علم با آسانی لوگوں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔
پاکستان بننے سے پہلے ہی سے اسکے لیے کوششیں ہو رہی ہیں۔
اردو زبان کی ترقی کیلئے جدوجہد کرنے والوں کی فہرست
بہت طویل ہے لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق کو ہم اردو
زبان کا بانی کہتے ہیں۔

اردو سائنس کالج کا قیام بابائے اردو مولوی عبدالحق کا
مرہون منت ہے جسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بابائے
اردو کا وہ مقصد جسکے تحت انہوں نے یہ کالج قائم کیا تھا
اب پورا ہو گیا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ اردو
زبان سائنسی ترقی کیلئے بھی بہت اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
ہمارے کالج کو اور کالجوں کے مقابلے میں فوقیت دیجاتی
ہے۔ اور زیادہ سہولتیں حاصل ہیں اسکے علاوہ ہمارے
ہاں مضامین بھی زیادہ ہیں غرض تمام سائنسی علوم اردو
میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اور ہر طالبعلم انہیں بغیر کسی دشواری
کے سمجھ لیتا ہے کیونکہ وہ اسکی مادری زبان میں ہوتے ہیں
جسے وہ ماں کی آغوش سے ہی سنتا آیا ہے۔ کوئی بھی مضمون
اسی وقت فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے جبکہ وہ اچھی طرح
سمجھ میں آجائے اور جب وہ سمجھ میں آجائے گا تو اسے کسی
بھی زبان میں جو کہ ہمیں آتی ہو بیان کرنا مشکل نہیں ہوتا
ہمارے کالج کا ہی ایک واقعہ ہے کہ جب سب سے پہلے بیچ
کے کچھ طلبا میڈیکل کالج میں پہنچے تو وہ چند ہی روز
بعد ہمارے کالج کے اساتذہ کے پاس آئے کہ صاحب ہمارا
تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تمام لیکچرز سر پر سے گزر جاتے ہیں
ہم لیکچرز کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتے جسکے نتیجے
میں ہمیں شرمندگی ہوتی ہے آپ لوگ تو ہمیں اردو میں پڑھا
کرتے تھے لیکن اب ہمیں پریشانی ہو رہی ہے۔ شاید اسوقت
کوئی اور ہوتا تو خود بھی اس صورتحال سے پریشان ہو
جاتا لیکن ہمارے ایک استاد محترم نے ان سے کہا کہ بھئی
اسمیں اردو زبان یا اردو سائنس کالج کا کیا قصور ہے اصل د

یہ ہے کہ آپ انگریزی میں کمزور ہیں اسلیئے آپ بات کو
سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن اب آپ ایسا کریں کہ دو تین مہینے
تک کالج نہ جائیں اور گھر بیٹھ کر صرف انگریزی پڑھیں۔
ان طالبعلموں نے ایسا ہی کیا اور جب وہ اپنے میڈیکل
کالج پہنچے تو وہ اب اس قابل تھے کہ ٹیچرز کے تمام
سوالوں کا جواب دے سکتے تھے۔ اور انکے جواب باقی تمام
طلباء کے مقابلے میں زیادہ واضح اور جامع ہوتے تھے کیونکہ
انہوں نے وہ سب کچھ اردو میں سیکھا تھا اسلیئے زیادہ وضاحت
کے ساتھ اسکو سمجھا سکتے تھے۔ کوئی بھی علم جو ہم
نے اپنی مادری زبان میں سیکھا ہوا سے کسی دوسری زبان
میں منتقل کرنا چاہیں تو اس زبان کو سمجھ کر ہم اس علم کو
زیادہ وضاحت اور سہل طریقے سے بیان کر سکتے ہیں پھر
کچھ حاصل کرنے کیلیئے قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں جدید
علوم کو حاصل کرنے کیلیئے انگریزی ہی کیا باقی زبانیں بھی
ہمیں آنی چاہئیں اسطرح ہم غیر قوموں کے علوم سے بھی فائدہ
اٹھا سکتے ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب غیر قوموں کے
علوم کو ہم اپنی زبان میں منتقل کریں اسکے لئے ہمارے اہل
علم حضرات کو میدان میں آنا پڑے گا اور سائنسی ترکیبات
و اصطلاحات کو اردو میں ڈھالنا ضروری ہے اس طرف
تو کوئی دھیان نہیں دیتا لیکن سائنسی دوڑ میں حصہ لینے کی
فکر ضرور ہے اگر قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی اردو کا نفاذ
عمل میں آجاتا تو ہمیں یہ نہ کہنا پڑتا۔

ترقیوں پہ زمانے کی سوچتے ہیں ہم۔
شعور اگر اے کہئے تو بے حسی کیا ہے
شعار مہر کو کہہ رہے ہیں سب تاریکی
ہمیں یہ فکر دلچسپ ہے روشنی کیا ہے

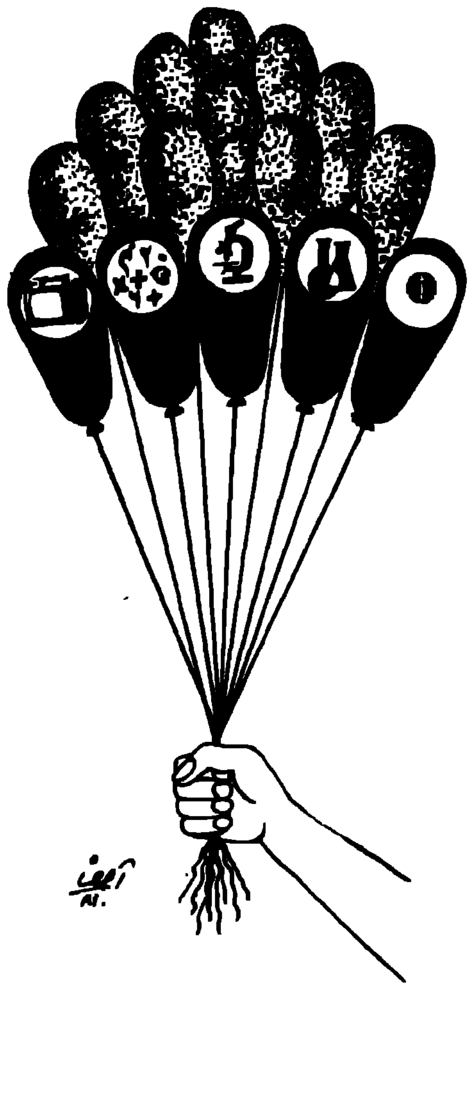
اب بھی وقت ہے کہ ہم اردو کو اسکا صحیح مقام دلا دیں جو
کہ ہر شعبے اور ہر میدان میں ہمارے لیئے ضروری ہے۔ لیکن
طلباء کیلیئے اسکی اہمیت اور بھی زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ
ہمارے کالج میں طالبعلموں کی تعداد روز بروز بڑھتی
جا رہی ہے

کالج میں طلباء کی تعداد بڑھنے کی وجہ بالکل واضح ہے کہ یہاں
تمام سائنسی علوم اردو میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اسلیئے زیادہ
سے زیادہ طلباء یہاں داخلہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس
سال بھی گنجائش سے کہیں زیادہ داخلے ہوئے ہیں پھر بھی بہت
سے خواہشمند محروم رہ گئے ہیں۔ طبیعیات و کیمیا سے لیکر ریاضیات
و شماریات، نباتیات و حیوانیات اور حیاتی کیمیا ہو یا خورد
حیاتیات یا جغرافیہ تمام علوم کی تعلیم ہمارے ہاں اردو میں
دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال کالج کی کارکردگی
نمایاں رہتی ہے۔ لیکن صرف اردو کالج کے ذریعے ہی یہ کام
انجام نہیں دیا جا سکتا ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو
زبان کے فروغ کیلیئے تمام اداروں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو
اور اسے سرکاری و دفتری سطح پر نافذ کیا جائے۔
اردو کالج کو اردو یونیورسٹی بنانے کا جو فیصلہ کیا گیا ہے
یہ بہت اچھا قدم ہے۔ اسطرح زیادہ سے زیادہ طلبہ کو اردو
میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ لیکن اسکے ساتھ ساتھ
یہ مسئلہ پیدا ہو جائیگا کہ کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ ایس سی
کرنے والوں کو اردو یونیورسٹی سے ایم۔ ایس سی کرنے
والوں پر ترجیح دی جائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ اردو کالج

کے علاوہ بھی تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں پر بھی اس فیصلہ کا اطلاق ہو آجکل لوگوں میں یہ رجحان بہت زور پکڑتا جا رہا ہے۔ انکا ایسا سوچنا اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے لیکن جیسا کہ حکومت نے نئی پالیسی کے تحت یہ اعلان کیا ہے کہ بہت جلد اردو زبان سرکاری سطح پر نافذ کر دی جائیگی۔ اگر یہ کام ہو جائے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے ورنہ ایسا سوچنا بھی بیکار ہے ویسے بھی بہت عرصے سے ہم یہ دیکھتے آ رہے ہیں کہ حکومت کی طرف سے اردو کی حمایت و ترقی کیلئے اعلان ہوتے ہیں اردو تنظیموں کو تسلیاں بھی دی جاتی ہیں۔ لیکن نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اسکے برعکس انگریزی اسکولوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہ اسکول انگریزی کے نام پر والدین سے آئے دن پارٹیوں اور فنکشن کی صورت میں رقم بٹورتے ہیں۔ اور فیسوں میں الگ اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں اور والدین انکے مطالبات ماننے پر مجبور ہیں کیونکہ اس سے انکار کی صورت میں انکے بچوں کا نام اسکول سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے بچوں کو گورنمنٹ اسکولوں میں داخل کراتے ہیں تو انہیں یہ بھی ڈر ہے کہ آگے چلکر یہ اردو انکے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی۔۔ اسکے علاوہ ان اسکولوں کی پڑھائی پرائیوٹ اسکولوں سے بھی...... گئی گزری ہے جبکہ گورنمنٹ اسکولوں کے ٹیچرز کو زیادہ مراعات حاصل ہیں۔ لہذا تعلیم کا معیار روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ والدین اپنے بچوں کو تو گورنمنٹ اسکولوں میں پڑھا کر مطمئن ہیں اور نہ ہی پرائیوٹ اسکولوں سے۔ پھر بھی انگریزی اسکولوں پر کسی حد تک انحصار کیا جا سکتا ہے کہ وہاں تھوڑی بہت پڑھائی تو ہو ہی جاتی ہے لہذا مجبوراً انہیں اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں شریک کرنا پڑتا ہے اور حکومت اسکی طرف

کوئی توجہ نہیں دیتی ہے جو کہ بہت سے مسائل کی بنیاد ہے یہی وجہ ہے کہ انگریزی کی بالادستی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ پھر بھی اردو تنظیمیں لگاتار جدوجہد کر رہی ہیں مگر اردو کو اسکا اصل مقام اسی وقت مل سکتا ہے جبکہ اسکو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو اور سرکاری دفتری تمام کام اردو میں انجام دیئے جائیں۔ کیونکہ حکومت کے ذمہ دار قسم کے لوگ اردو کی حمایت تو کرتے ہیں لیکن خود انگریزی اپنائے ہوئے ہیں۔ انکے بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ جس دن اردو زبان سرکاری سطح پر نافذ ہو جائے گی اسکے دوسرے دن سے ہی اردو پہلی جماعت سے لیکر یونیورسٹی کی سطح تک خود بخود سائنسی تعلیم کی زبان بن جائے گی جسکے لئے مزید کسی کاوش کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں خود ایک طالبعلم ہوں اور یہ دیکھتی ہوں کہ اردو میں جو طالبعلم اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اتنی اچھی طرح انگریزی میں جواب دینے والے طالب علم نہیں کر سکتے کیونکہ انکے پاس صرف رٹی رٹائی باتیں ہوتی ہیں۔ اسکے علاوہ اگر وہ کچھ کہنا چاہیں تو الفاظ انکا ساتھ نہیں دے پاتے ہمیں چاہیئے کہ تمام لوگ ملکر اردو کی ترقی کیلئے کام کریں اور جس احساسِ کمتری میں ہم مبتلا ہیں اس سے نکلکر سوچیں۔ مشکل یہ ہے کہ لوگ حقیقت کا سامنا کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے اہلِ قلم حضرات کوشش تو کر رہے ہیں۔ اگر اردو زبان کو پہلے ہی حکومت کی سرپرستی حاصل ہو جاتی تو وہ سرکاری حیثیت سے کب کی رائج ہو گئی ہوتی اور بقول مولوی عبدالحق۔

”ہر شخص اور ہر قوم کو یہ حق ہے کہ
وہ اپنی زبان کی اشاعت و ترقی کیلئے ہر
جائز ذریعے کو استعمال کرے اور جہانتک ممکن
ہو اسکی بہتری کیلئے کوشش کرے“۔



پروفیسر حشمت اللہ لودھی

مسلمانوں کا ایجادات میں حصہ

بیسویں صدی اپنے سائنسی کارناموں اور طرح کی ایجادات کی وجہ سے تاریخ کا ایک الگ تھلگ دور نظر آتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ لاکھوں من بلکہ لاکھوں ٹن روایتی ایندھن سے اتنی توانائی حاصل نہیں کی جا سکتی جتنی تابکار مادے سے حاصل ہو سکتی ہے یا جب ہم غور کرتے ہیں کہ سست رفتار ریل گاڑیوں پر سفر کرنے والا انسان ۲۰۰۰۰ میل گھنٹے کی رفتار سے سفر کرتے ہوئے آن کی آن میں کرۂ ارض کی کشش سے باہر جاتے ہوئے اپنے ساتھ کئی ٹن وزنی آلات بھی لے جا سکتا ہے تو ہمارا یہ تصور یقین میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ کہ دورِ حاضر انسان کی ان کاوشوں سے وجود میں آیا ہے جو انسان نے آج سے سو پچاس سال پہلے شروع کی تھیں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تہذیب ایک مسلسل عمل کا نام ہے جس میں صدیاں اور ادوار تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ ہم ایک صدی کو دوسری صدی سے جدا نہیں کر سکتے اور نہ کسی ایک دور کو دوسرے دور سے علیحدہ تصور کر سکتے ہیں

پتھر کے زمانے میں انسان کے تجربات نے اسے کانسی کے دور میں داخل کر دیا اور اگر کانسی کا دور نہ آیا ہوتا تو شاید انسان آج غیر متمدن اور نیم وحشیانہ زندگی بسر کر رہا ہوتا۔

پس مغرب کے بعض کوتاہ نظر علماء کا یہ کہنا کہ موجودہ دور کی ترقی کا انحصار یورپ کے مفکرین کی ان کاوشوں کا نتیجہ ہے جو تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی تھیں سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ بلکہ یہ نظریہ ان کے [illegible] تعصب اور علمی بددیانتی پر مبنی ہے۔ یونانی تہذیب جو موجودہ دور کا سرچشمہ قرار دی جاتی ہے۔ اپنا یا سا [illegible] حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کچھ عرصہ بعد زوال [illegible] جالینوس اس تہذیب کا آخری چراغ تھا۔ [illegible] کے بعد رومیوں نے اس علم و فضل کے چراغ کو جلائے رکھنے کی کوشش کی لیکن یہ نئی تہذیب بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور بالآخر ۴۷۶ء میں جسٹینین کی وفات کے ساتھ یہ بھی ماند پڑ گئی۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ دنیا میں ہر طرف آسمان علم پر گہرے بادل چھانے لگے۔ تاریکی بڑھتی گئی بڑھتی گئی حتیٰ کہ تمام دنیا جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوب گئی۔ ارسطو اور دوسرے یونانی حکماء کا علم باطل قرار دیا جانے لگا۔ ان کی تعلیمات کو قانوناً ممنوع قرار دیا گیا۔ کتب خانے جس میں ان علماء اور مفکرین کی بیش قیمت تصنیفات محفوظ تھیں نذرِ آتش کر دیے گئے یا ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سربمہر کر دیا گیا لیکن کوتاہ نظری اور تنگ [illegible] کو اس کے بعد بھی چین نہ آیا۔ تو تلوار کا سہارا لیا جانے لگا جن علماء کے متعلق یہ شبہ ہو جاتا کہ ان کے قبضے میں یونانی حکماء کی کوئی تصنیف موجود ہے یا ان کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں۔ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ گویا آگ اور تلوار جاہلوں کا مقصد بن گیا۔

اس بھیانک تاریکی اور جہالت کے اس اندھیرے میں دفعتاً نور کا نیا سیلاب امڈا۔ مشرقی افق پر عرب کے دہکتے ہوئے صحراؤں سے ایک کرن پھوٹی۔ اور کہ آن کی آن میں یہ کرن مہرِ تاباں کی شکل اختیار کر گئی

ایک نئی تہذیب نے جنم لیا۔ نئی راہیں متعین ہونے لگیں اور خورشیدِ اسلام تمام انسانیت کے لئے نیا اور لازوال پیغام لے کر طلوع ہوا۔ جہالت کے تاریک بادل روئی کے گالوں کی طرح چھٹ گئے۔ تلاش اور جستجو کی جو راہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسدود ہو چکی تھیں۔ ان میں نئی نئی راہیں پیدا ہونے لگیں۔ اور [illegible] اسلام کا وہ دور تہذیب وجود میں آیا جس کی علمی [illegible] کے بغیر نہ تو یورپ کی نشاۃ ثانیہ ممکن تھی اور نہ ان کا صنعتی انقلاب

ساتویں صدی عیسوی سے لیکر ۱۳ ویں صدی عیسوی تک مسلمان حکماء اور مفکرین نہ صرف ہر علم کی آبیاری کرتے رہے بلکہ وہ اس جستجو کی اس تابناکی کو بھی برقرار رکھتے رہے جو [illegible] [illegible] کی جا سکے گی اور جس کا مطالعہ کئے بغیر تہذیب [illegible] کا جائزہ بھی نامکمل رہے۔

مسلمان حکماء اپنے یونانی اور ہندی پیشروؤں کی طرح زیادہ دلچسپی علم کیمیا، طب، ریاضی اور علم ہیئت [illegible]


غذائیت سے بھرپور
لذت میں لاجواب
rcp ڈبل روٹی
خالص ترین غذائی اجزا سے حفظانِ صحت کے اصولوں کے
مطابق تیار کی جاتی ہے۔
آر سی پی کی تمام مصنوعات، عمدہ لذت اور بہترین غذائیت
کی بدولت ہر جگہ مقبول ہیں۔
rcp روٹی کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ
trends

سے رکھتے تھے۔ اوران میدانوں میں انہوں نے جابر بن حیان بوعلی سینا، قاسم زہراوی الرازی ابن الہشام اور الزرازی جیسے اولوالعزم اور مایۂ ناز سائنسدان پیدا کئے لیکن سائنس کی ان بنیادی شاخوں کے علاوہ مسلمان حکمار نے دوسری شاخوں مثلاً باغبانی، کاشتکاری، حیوانات، نباتات، سرجری اناٹامی جغرافیہ دانی و جہازرانی طبیعات و سیاحت جیسے مضامین میں بھی بیش بہا اور قابل قدر اضافے کئے ہیں۔

سائنس کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا ہر طالب علم آج ثابت بن قرہ الوالقاسم اندلسی، احمد کبیر خرقانی، ابن رشد ابن بیطار ابن نفیس و ابن حرناس اور ایسے ہی سینکڑوں ناموں سے بخوبی واقف ہیں۔

یوں تو مسلمان حکمار نے سائنس کے میدان میں بیشمار کارنامے انجام دیئے ہیں اور کبھی نہ مٹنے والے لاتعداد نقوش چھوڑے ہیں۔ لیکن اہم کارناموں میں سب سے بڑی خدمت جو انہوں نے انجام دی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان حکمار نے یونان کے اس علمی خزانے کو جو نیم مہذب یورپی اقوام کے ہاتھوں بری طرح پامال ہو رہا تھا نہ صرف کتب خانوں میں محفوظ کرلیا بلکہ ان کے اصولوں میں ترمیم تبدیلی اور اختراع پیدا کر کے انہیں پہلے سے زیادہ مرلوط اور کارآمد بنادیا۔

یونانی سائنسدان تجربات کے مقابلے میں فکری اور نظری سائنس کے قائل تھے۔ لہذا جن مشاہدات کا انہوں نے ذکر کیا۔ ان کو صرف فلسفیانہ استدلال کے ساتھ پیش کیا گیا۔ انہوں نے اپنے مشاہدات کو عملی طور پر تجربات کی روشنی میں پرکھنے اور جانچنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

گویا یونانیوں کی سائنس محض نظری سائنس تھی جبکہ مسلمان حکمار اپنے مشاہدات کو تجربات سے ثابت کرنے کے قائل تھے اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ سائنس کے میدان میں تجربات اور عملی سائنس کی داغ بیل صرف مسلمان حکمار کے ہی ہاتھوں سے پڑی تھی اور یہ ان ہی کا حصہ تھی۔

اس حقیقت کا ثبوت کوفہ کے نزدیک کھدائی میں نکلنے والی اس تجربہ گاہ سے ملتا ہے جس کی بنیاد حضرت امام جعفر صادق کے لائق شاگرد جابر بن حیان نے آٹھویں صدی عیسوی میں ڈالی تھی۔ جابر بن حیان کی اس تجربہ گاہ سے کیمیا کے جو آلات برآمد ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیمیا کے تمام تجرباتی عملوں سے مثلاً حل کرنا، تقطیر کرنا filtration تا اکشید کرنا، عمل تصعید یعنی قلماؤ یعنی crystallization سے نہ صرف بخوبی واقف تھا بلکہ اپنے کیمیائی تجربوں میں انہیں بکثرت استعمال کرتا تھا۔ وہ اپنی ایک کتاب میں لکھتا ہے کہ کیمیا میں سب سے ضروری شے تجربہ ہے جو شخص اپنے عمل کی بنیاد تجربہ پر نہیں رکھتا وہ ہمیشہ غلطی کھاتا ہے۔ جابر بن حیان کی یہ بات اس اپنے دور میں بھی نہ صرف علم کیمیا کے لئے درست مانی جاتی ہے۔ بلکہ اس کا اطلاق آج سائنس کی تمام شاخوں پر ہوتا ہے اور اگر یہ کہا جائے۔ تو غلط نہ ہوگا تجربہ آج بھی سائنس کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی اہمیت رکھتا ہے۔

جابر دھاتوں کو کشتہ بنانے یعنی ان کے (OXIDES) آکسائیڈز بنانے کے طریقے سے بھی اچھی طرح واقف تھا چنانچہ اس نے بھی اس عمل پر ایک جامع کتاب تصنیف کی ہے۔

اس نے اپنی کتابوں میں فولاد بنانے چمڑے کو رنگنے دھاتوں کو صاف کرنے، موم جامہ بنانے، عام لوہے کو زنگ سے بچانے اس پر وارنش کرنے، بالوں کو سیاہ کرنے اور اسی قسم کی بیسیوں مفید اشیا رتیار کرنے کے طریقے بیان کئے ہیں۔ اور یہ وہ تمام چیزیں ہیں جن کے بنانے کے طریقوں سے اور ان کے استعمال سے یونانی حکمار بھی پوری طرح واقف نہ تھے۔

ان چیزوں کے علاوہ جابر نے اپنی تصانیف میں سفیدہ یعنی Lead Carbonate سنکھیا یعنی ARS اور کبھی ان کے کل سے حاصل کرنے کے طریقوں کی بھی وضاحت کی ہے ...mical سرکہ ACETIC ACID جیسا کیمیائی تیزابوں سے بھی بخوبی واقف تھا

لیکن جابر کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ تین معدنی ترشوں کی دریافت ہے جن کو جابر نے دنیا میں پہلی بار تیار کیا تھا۔ جابر نے تین معدنی ترشے تیار کئے یا دریافت کئے۔ ان میں سب سے پہلا شورے کا ترشہ ہے۔ اور دوسرا گندھک کا ترشہ جو اس نے پھٹکری پر آکسی اور قلمی شورے جیسی معمولی اشیاء کے ذریعے حاصل کئے تھے۔

ایک ترشہ جسے ہم آج Aglliaregia کہتے ہیں۔ اور جو دراصل شوریکی اور نمک کے ترشوں کا آمیزہ ہے۔ یہ بھی جابر بن حیان نے دریافت کیا تھا۔ موجودہ دور کے سائنس دان اور حقیقت اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ یہ ترشہ آج بھی ہماری صنعت میں منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ اور ابھی چند سال پہلے تک کسی ملک کی ترقی کا پتہ اس ملک میں استعمال ہونے والے Sulpheoric Acid یعنی گندھک کے ترشے کی مقدار سے لگایا جاتا رہا ہے اس حقیقت کے پیش نظر جابر بن حیان اپنے وقت کا سب سے بڑا کیمیا داں ہے۔ بلکہ وہ دنیا کا سب سے بڑا کیمیا داں بھی ہے۔

مسلمان حکماء صرف کیمیا ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم و فنون میں بھی اپنے ہم عصروں سے بہت آگے تھے سائنس کی ایک خاص نئی شاخ مساحت ہے۔ یعنی انگریزی میں جس کو Surreging کہتے ہیں۔ اس میں مکانات، شہر اور سڑکیں تعمیر کرنے سے پہلے زمین کے خطے کی اچھی طرح چھان بین کی جاتی ہے۔

عباسی حکمران منصور کے دور میں بغداد کو جب دارالخلافہ بنانے کی تجویز پیش ہوئی تو اس علاقہ کی مساحت کا کام وقت کے سب سے بڑے انجینئر نوبخت کے سپرد کیا گیا جس نے برسوں کی محنت اور کمال ہنر مندی سے ایک ایسا شہر تعمیر کیا جس کی مثال اس سے پہلے کبھی نہ ملتی تھی۔

مساحت کے اس پیچیدہ کام میں نوبخت کا رفیق کار ماشاء اللہ بھی اپنی مہارت کی وجہ سے آخر دنیا میں مشہور رہے۔

آٹھویں صدی کے ان ماہر تعمیرات و ماہر مساحت کی وجہ سے صدیوں تک بغداد کو عروس البلاد کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اور مشرق و مغرب سے آنے والے سیاح عباسیوں کے اس عظیم دارالسلطنت کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں۔

علم ہیئت سائنس کی ان شاخوں میں سے ایک ہے جو نہایت قدیم ہونے کے ساتھ آج سب سے زیادہ اہمیت حاصل کرتی جا رہی ہے۔ سائنس کی اس اہم شاخ کو قائم رکھنے اور اس میں قابل قدر اضافہ کرنے میں مسلمان حکماء دیگر تمام اقوام میں پیش پیش رہے ہیں۔

حالانکہ مسلمانوں سے پہلے یونان و روم کی سلطنتوں میں بہت سی رصدگاہیں موجود تھیں لیکن یہ سب کی سب بہت ہی چھوٹی ہونے کے علاوہ عمدہ اور اعلیٰ قسم کے آلات سے لیس تھیں۔

دنیا کی سب سے پہلی عظیم اور ترقی یافتہ رصدگاہ جس میں عمدہ قسم کے آلات نصب تھے مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بغداد کے قریب نویں صدی عیسوی میں قائم کی گئی۔ لیکن اس کی ایک شاخ دمشق کے قریب قاسیون کی پہاڑیوں پر قائم کی گئی تھی۔ اس رصدگاہ میں استعمال ہونے والے اسطرلاب اور دوسرے آلات اسی رصدگاہ میں تیار کئے جاتے تھے اسطرلاب وہ آلہ ہے جس کے ذریعے ۲ ستاروں کا درمیانی زاویہ یا ایک ستارے اور اُفق کے درمیانی زاویہ کو ناپا جاتا ہے۔ اس کی ایک ترقی یافتہ شکل سدس یا Sextant کہلاتی ہے۔ جو آج بھی جہاز رانی اور Navigation میں بکثرت استعمال ہوتی ہے

مسلمان حکماء کے وضع کردہ سدس یا Sextant کے ذریعے زاویوں کی پیمائش ڈگری اور منٹوں تک میں کی جا سکتی تھی۔ اس آلہ کی عمدہ کارکردگی اس حقیقت سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ مغربی دنیا کے سائنسدان اس آلہ کا مدِ مقابل جو مسلمان حکماء آٹھویں اور نویں صدی میں استعمال کرتے تھے۔ اُن کے آٹھ سو سال بعد یعنی سولہویں صدی میں پیدا کر سکے۔

Sextant اور اسطرلاب کے بنانے اور استعمال کرنے والوں میں سند بن علی، خالد بن عبدالملک اور علی بن عیسیٰ اسطرلابی بہت معروف ہیں علم ہیئت کے مسلمان حکماء میں احمد کثیر فرغانی کا نام بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ یہ دھوپ گھڑی کی ایک ترقی یافتہ قسم کا موجد تھا۔ اور اس نے دریاؤں میں طغیانی ناپنے کا ایک آلہ بھی ایجاد کیا تھا۔ لیکن احمد کثیر کا سب سے بڑا کارنامہ کرۂ ارض کے گھیر کی پیمائش کا ہے۔ اس نے اسطرلاب سدس جیسے آلات کی مدد سے سین جار اور کوفہ کے درمیان دجلہ و عریض میدانی علاقہ میں دوسرے ہیئت دانوں کی جماعت کے ساتھ کرۂ ارض کے گھیر کی پیمائش کی ہے وہ حیرت انگیز حد تک آج کی پیمائش کے تقریباً برابر ہے۔ موجودہ دور کے سائنس دان دنیا کا گھیر ۲۴۸۵۸ میل قرار دیتے ہیں جبکہ احمد کثیر فرغانی کے مطابق یہ گھیر ۲۵۰۰۹ میل تھا یعنی موجودہ گھیر سے صرف ۱۵۱ میل زیادہ ہے جو محض ۰.۶ فی صد کی غلطی ہے۔ احمد کثیر فرغانی کے مقابلے میں اہل ہند کے ماہر نجومیوں نے دنیا کے گھیر نکالنے میں ۱۵ سے لیکر ۵۰ فی صد تک کی غلطی کی ہے۔ رومیوں کے اعداد و شمار اس سلسلے میں بہت ہی درست مانے گئے ہیں۔ ان میں بھی اصل شمار سے ۹ر فیصد کی غلطی کی گئی ہے۔ ہم اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ علم ہیئت اور ریاضی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور یہ بھی علم ہیئت کی طرح قدیم اور علوم میں سے ایک ہے۔ ریاضی کے ساتھ مسلمانوں حکماء کا طبعی میلان رہا ہے۔ اور یہ ہی وجہ ہے کہ مسلمان حکماء نے نہ صرف علم ریاضی کے مشکل ترین مسئلوں کے آسان اور نئے حل پیش کئے۔ بلکہ اس علم میں متعدد نئی باتوں کے اضافے کئے جن سے دنیا پہلے کبھی واقف نہ تھی علم ریاضی کے میدان میں یوں تو سینکڑوں مسلمان حکماء گذرے ہیں لیکن اُن میں الخوارزمی، ابو موسیٰ، عمر خیام، ابو الکامل، ابو الوفا اور نصیر الدین طوسی اعلیٰ مقام رکھتے

ہیں۔ موسیٰ الخوارزمی کی کتاب الحساب سے اہل مغرب نے گنتی کے عربی طریقہ کو اخذ کیا۔ اور پیچیدہ اور مشکل رومن طریقہ سے نجات حاصل کی۔ لیکن الخوارزمی کا سب سے بڑا کارنامہ گنتی میں صفر کی ایجاد ہے جس نے علم ریاضی میں ایک تہلکا مچا دیا۔ اور اس کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔

مسلمان حکماء نے ریاضی علم ہیئت اور کیمیا کے علاوہ علم طب میں بھی ان گنت کارنامے انجام دیئے ہیں علم طب میں زکریا الرازی اور بوعلی سینا کو معقولیت کو ساتھ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ رازی فن طب میں یگانہ روزگار تھے۔ اور پیچیدہ امراض کے علاج میں ذاتی اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ علاج کے نئے طریقے معلوم کئے اور اُن کو اپنی شہرہ آفاق کتاب "حاوی" میں درج کیا۔

رازی دنیائے طب کے اُن مایہ ناز فرزندوں میں سے ایک ہے جنہوں نے انسانیت کی خاطر اپنی عمر گذار دی۔ مشرق کے علوم سے دلچسپی رکھنے والے بعض یورپی تاریخ دان اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ چیچک کا ٹیکہ دنیا میں سب سے پہلے رازی نے ایجاد کیا۔ اس کے علاوہ زکریا الرازی نے اپنی کیمیادانی کی بدولت نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا کی ترقی کا راستہ کھول دیا۔

حسین بن عبداللہ جو حکمت کے میدان پر شیخ الرئیس بوعلی سینا بن کر شمع علم کی ضو فشانیاں صدیوں تک ایک عالم کو منور کرتی ہیں۔ تقریباً ۸ سو برس بوعلی سینا کی تصانیف مغرب کی درسگاہوں میں نصاب کی مستند کتابوں کی حیثیت سے شامل رہی ہیں۔

اس کی کتاب القانون جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے دراصل علم العلاج کا ایک مکمل انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس کتاب میں تشریح الاعضاء یعنی Anatomy نظری اور عملی علم العلاج یعنی Theory & practice of medicine اور مختلف بیماریوں کے لئے نسخوں کا تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

موجودہ دور میں طب کی ایک نہایت اہم شاخ جراحی تصور کی جاتی ہے۔ اور یہ خیال بہت عام ہے جراحی خاص یورپ کا ایجاد کردہ عطیہ ہے۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ جراحی یورپ کے سائنسدانوں کی نہیں بلکہ مسلمان حکماء کی ایجاد ہے۔

جراحت یا سرجری کے علم سے یوں تو دسویں صدی عیسوی کے بہت سے مسلمان حکماء واقف تھے۔ لیکن اُن میں ابوالقاسم زہراوی علم جراحت کا موجد اور بانی مانا جاتا ہے۔

اُسے اپنی کتاب التصریف میں دانت نکالنے آنکھوں کا آپریشن کرنے حلق کا کوا کاٹنے مثانے میں سے پتھری نکالنے بواسیر کے مسوں کو کاٹنے پیچیدہ قسم کے پھوڑوں کے آپریشن کرنے ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑنے اُترے ہوئے جوڑوں کو بٹھانے کی پوری تفصیلات دی ہیں۔

اس نے اپنی اُسی کتاب میں زچگی کے بارے میں تفصیلات بیان کرتے ہوئے پیدائش سے پہلے مر جانے کی حالت میں مردہ جنین کو باہر نکالنے کے فن کی تفصیلات دی ہیں الغرض جراحت میں ۹۰

نیصد جن اعمال سے ایک سرجن کو گذرنا پڑتا ہے
اُن میں سے کسی کی تفصیل اس تصنیف میں چھوڑی
نہیں گئی ہے۔ ان اعمال جراحت کے لئے جن آلات کی
ضرورت پڑتی ہے۔ ان کی تشریح بھی نہایت عمدہ تصاویر
کے ذریعے کی گئی ہے۔ اُن آلات میں پیشاب خارج
کرنے کا آلہ دانت نکالنے کے آلے اور مختلف قسم کے
چاقو قینچی، زخموں کو سینے کی سوئیاں بھی شامل ہیں۔

اسی طرح ثابت بن قرہ نے انسانی جسم کی
اندرونی ساخت یعنی . . . . بیان کی ہے
اور ابن نفیس نے انسانی جسم کے دوران خون کا پتہ
چلایا۔ حالانکہ مغربی سائنس دان اس کا سہرا ہاروے
کے سر باندھتے ہیں۔ اسی طرح طاعون کا علاج دنیا
میں سب سے پہلے ابن قطینہ نے دریافت کیا۔

طبیعات کے میدان میں آج کون ہے جو ابن
الہیثم جیسے اولو العزم سائنسدان اور موجد کی ذات سے
واقف نہیں۔ ابن الہیثم تصویر کشی کے علم سے واقف
تھا۔ اور اُس علم کا موجد بھی تصور کیا جاتا ہے۔ اُس
نے Pinhole Camera ایجاد کیا۔
اس نے انسانی آنکھ کی اندرونی ساخت دریافت
کر کے یہ بتایا کہ انسانی آنکھ میں جو تصویر اُبھرتی ہے
وہ دراصل ایک چھوٹے سے عدسے کی وجہ ہوتی ہے۔
اس طرح ابوالحسن ان ماہر طبیعات میں شمار کیا جاتا ہے
جس نے دنیا کی سب سے پہلی دوربین بنائی تھی۔
ابن یوسف نے گھڑی میں چلنے والا پنڈولم ایجاد کیا۔

اور یہ بات عام ہے عہد عباس میں گھڑی
ایجاد ہو چکی تھی۔ اُنہیں گھڑیلوں میں سے ایک گھڑی
. . . . . ہارون الرشید نے شاہ فرانس کو
بھیجی تو یہ تحفہ عجائبات زمانے میں تصور کیا گیا۔
کیونکہ اہل یورپ اس وقت تک گھڑی کے بنانے یا
اُس کے استعمال اور نام سے واقف بھی نہ تھے۔

الغرض جب دنیا کے دوسرے ممالک بالخصوص
یورپ تعصب اور جہالت کے گھرے بادلوں میں گھرا
ہوا تھا۔ اور اِن کی اقوام نیم وحشیانہ زندگی گذار رہی تھیں۔
اس وقت مسلمان حکمار نے دنیا کی رہنمائی کی انہیں
راہیں دکھائیں۔

چوتھی صدی عیسوی تک سے لے کر ۱۲ویں صدی
عیسوی تک کے زمانے کو یورپ میں آج بھی تاریک زمانہ
. . . . کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
دراصل یہ زمانہ ان کے لئے تو واقعی تاریک دور
تھا یہی وہ دور ہے جسے مسلمانوں کا سب سے زریں
اور روشن دور ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمان حکمار
کا خورشید علم اپنی پوری تابانی کے ساتھ نصف
النہار پر تھا۔

یہ ہی وہ زمانہ ہے جب جس میں یورپ کی
نشاۃ الثانیہ نے جنم لیا۔ یہی وہ دور ہے جس کی تابانیوں
اور تابناکیوں کے سبب ۱۸ صدی کا انقلاب برپا
ہوا۔ اور یہی وہ دور ہے جس میں ان تمام کارناموں کی
بنیاد پڑی جو انسان آج انجام دے رہا ہے یا آئندہ جدید
سائنس کے نام پر دیتا رہے گا۔

پروفیسر اکرام الرحمٰن

اتحادِ عالمِ اسلامی اور جغرافیائی ربط

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تاریخ انسانی کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ آپ نے صحرائے عرب کی خالص، غیر مہذب اور غیر منظم قوم کو پرچم توحید کے سایہ میں تہذیب و تمدن کا ایسا سبق سکھایا کہ وہ لوگ تبلیغ و تلقین کے سلسلے میں جہاں کہیں بھی گئے وہاں کی اجتماعی زندگی کے لئے ابرِ رحمت ثابت ہوئے۔ یہی نہیں کہ ان کو نورِ ابدی کا صحیح راستہ دکھایا بلکہ اپنے اخلاق اور اوصافِ حمیدہ سے لوگوں کے دل مسخر کر لئے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان رسول کریمؐ کی وفات کے سو سال کے اندر سرحد چین سے لے کر ہسپانیہ تک چھا گئے اور جہاں بھی گئے ان کے ذاتی کردار کو دیکھ کر ملحدین بھی حلقۂ اسلام میں آتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں مسلمان موجود ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ آبادی ستر کروڑ سے زائد ہے۔ براعظم ایشیا و افریقہ کا تقریباً نصف علاقہ مسلم ممالک پر مشتمل ہے۔

مملکتِ انڈونیشیا کے وسیع اور گھنے جنگلات ملائشیا کے خوبصورت بحری ساحل، پاکستان کے زرخیز میدان دریائے دجلہ و فرات کی سرسبز وادیاں، عرب کے نخلستان دریائے نیل کا آبِ رواں، البرز کی برفانی چوٹیاں اب بھی عظمتِ اسلام کی گواہی دیتی ہیں۔ اسلام جغرافیائی حد بندیوں سے مبرا ہے۔ اگر ہم صحرائے عرب کے نقشے پر نظر ڈالیں تو یہ صاف عیاں ہوتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب ایسی جگہ واقع ہے جہاں دنیا کے تین عظیم براعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ ملتے ہیں۔ بحرِ قلزم اور خلیج فارس کے درمیان ایک مثلث نما جزیرہ واقع ہے جو بیابان سنسان، بنجر اور خشک علاقوں پر مشتمل ہے۔ اس کو عرب کا ریگستان کہتے ہیں۔ باوجود یہ کہ یہ خطہ انتہائی غیر دلچسپ، غیر مزروعہ اور پُرخطر ہے لیکن تاریخِ عالم میں اس کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ یہ وہی صحرائے عرب ہے جہاں پر مذہبِ اسلام کے پیغمبرؐ انسانوں کے محسنِ اعظم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے

جغرافیائی لحاظ سے مسلمانوں کی آبادی کا بڑا حصہ ریگستانوں میں واقع ہے۔ یہ علاقے عموماً مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا کے بیشتر ریگستانی علاقوں پر مسلمان قابض ہیں اور ان کے حلقۂ اثر میں جزیرہ نما عرب، شام، لبنان، اردن فلسطین، عراق، بحرین، قطر، کویت، [illegible] عدن، عمان، یمن اور متحدہ عرب امارات شامل ہیں۔ اور اس کو عالمِ اسلام میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ جو مشرق میں ایران، ملیشیا، پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈونیشیا کو، شمال میں افغانستان، روسی ترکستان اور چین کی مسلم آبادی کے خطوں اور ترکی کو، مغرب میں مصر، سوڈان، لیبیا، الجیریا، مراکش، ٹیونیشیا اور افریقہ کے دیگر ممالک مثلاً مارٹینیہ، چاڈ، گنی، نائجیریا، سنیگال، سیرالیون، کیمرون، مغرب میں ارٹیریا، سومالیہ مشرقی افریقہ کے ممالک کو ملاتا ہے۔ یہ وسیع علاقہ ۱۰ درجہ مغربی طول البلد سے ۱۲۵ درجہ مشرقی طول البلد تک اور ۱۵ درجہ جنوبی عرض البلد سے ۵۵ درجہ شمالی عرض البلد کے درمیان پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ وسیع خطہ کرہ ارض کے تقریباً ایک چوتھائی حصہ پر مشتمل ہے۔

دنیا کی دیگر متحدہ قوموں کا موازنہ کرتے ہوئے یہ کہنا درست ہے کہ اسلامی ممالک کے مابین قریب ترین جغرافیائی

ربط پایا جاتا ہے۔ مختلف نسلی، سیاسی اور مروجہ زبانوں کے اختلاف و امتیاز کے باوجود اسلامی ممالک ثقافتی تمدنی، سماجی اور جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔

مغرب میں پاکستان سے مراکش تک مسلسل ایسے ممالک پائے جاتے ہیں جن کے قدرتی مناظر آب وہوا، خدوخال، ارضی و جغرافیائی ماحول میں یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ سلسلہ وار اور تہہ دار کوہستانی سلسلے عقدہ پامیر سے مغرب کی جانب پھیلے ہوئے ہیں۔ جو ایران، عراق، ترکی اور بہت سے یورپی ممالک سے ہوتے ہوئے شمال مغربی افریقہ میں اٹلس کے کوہستانی سلسلے کے نام سے دوبارہ نمودار ہوتے ہیں۔ ان مسلم ممالک کی آب وہوا خشک ہے اور یہ علاقے عموماً ریگستانی اور بنجر ہیں۔ بارش بہت کم ہوتی ہے اور زراعت صرف نخلستانوں، ساحلی پٹیوں یا دریاؤں کی موجودگی تک محدود ہے۔ چند دریاؤں کے علاوہ جو برفانی پہاڑوں سے نکلتے ہیں، بقیہ دریا عموماً خشک نالوں کی طرح ہیں، یا ان کا پانی ریت میں جذب ہو جاتا ہے۔ سطح زمین پر پانی کی عدم موجودگی اور بارش کی کمی کی وجہ سے یہ علاقے بنجر اور ریتلے ہیں۔ یعنی بہت کم علاقوں میں سبزہ نظر آتا ہے۔ ریگستان کے بیشتر علاقوں میں چھوٹی چھوٹی گھاس یا ببول کے درخت نظر آتے ہیں۔ ان علاقوں کا خاص بار برداری کا جانور اونٹ ہے جس کو روائتی طور پر ریگستانی جہاز کہتے ہیں۔ جہاں زرخیز نخلستان ہیں اور زمین دوز پانی میسر ہوتا ہے۔ وہاں کچھ اناج اور کھجور پیدا ہوتا ہے

وہاں کے باشندے گھوڑے، بھیڑیں اور بکریاں پالتے ہیں ریگستانی علاقوں میں جہاں قدرتی وسائل موجود نہیں ہیں انسان خانہ بدوشوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور چراگاہوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرتے ہیں۔ ان کی کوئی مستقل قیام گاہ نہیں ہے۔ عالم اسلام کے مشرقی حصہ میں بنگلہ دیش، ملائشیا، انڈونیشیا کے ممالک شامل ہیں ان تینوں ممالک میں جغرافیائی ماحول تقریباً یکساں ہے آب وہوا گرم اور مرطوب ہے۔ گرمی اور بارش کی کثرت کی وجہ سے گھنے اور سدا بہار جنگلات عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ مشرقی حصہ میں بھی مغربی حصہ کی طرح تہہ دار کوہستان پائے جاتے ہیں۔ مغرب کے ریگستانی علاقوں میں آب بھی انسانی زندگی مشقت سے بھری ہوئی ہے۔ محدود وسائل کی بنا پر وہاں کے باشندوں کو اپنی زیست کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ بڑے بڑے دریاؤں سے آب رسانی کے لئے نہریں نکالی گئی ہیں جن کی بدولت خشک زمین کو قابلِ کاشت بنایا گیا ہے۔ ان علاقوں میں گیہوں، دالیں، کپاس پھلی، تمباکو، چاول، جوار، باجرہ اور کھجور پیدا ہوتا ہے مغربی حصہ میں جہاں عموماً ریگستان ہیں آبادی بہت کم ہے۔ معاشی ذرائع محدود ہیں۔ گلہ بانی پیشہ ہے۔ آب رسانی کے لئے مسلم ممالک میں دنیا کا بہترین نہری نظام پایا جاتا ہے۔ مشرق کے مسلم ممالک جو جنوبی ایشیا کے خطہ میں واقع ہیں بہت سے استوائی پیداوار کے لئے مشہور ہیں۔ یہ ممالک بہت سے بیش قیمت خام مال پیدا کرتے ہیں جن کی امریکہ اور مغربی یورپ کے ممالک میں بہت زیادہ کھپت ہے۔ دنیا کا ۹۵ فیصد خام ربر، ۷۵ فیصد جوٹ، ۳۵ فیصد ٹین

۲۵ فیصد کوپرہ تیسرز گنا جنوبی مشرقی ایشیا کے مسلم ممالک میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ممالک خوردنی تیل استوائی پھل اور چائے بھی پیدا کرتے ہیں۔

مسلم ممالک کے مابین صرف قدرتی ماحول ہی کی یکسانیت نہیں ہے بلکہ ان کے مابین ثقافتی، مذہبی، سماجی، تاریخی اور انسانی یکسانیت بھی پائی جاتی ہے۔

مذہب اسلام میں رنگ و نسل، زبان کا امتیاز نہیں ہے بلکہ تمام مسلمان چاہے کسی خطہ یا ملک یا علاقہ کے ہوں اسلامی اخوت میں منسلک ہیں۔ اسلامی ممالک میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ہر ملک کا مسلمان قرآنی تعلیم کی وجہ سے عربی زبان بخوبی پڑھ سکتا ہے۔ بیشتر مسلم ممالک جن میں پاکستان شامل ہے عربی رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔ اس عربی زبان کی وجہ سے مختلف نسلی گروہوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

مسلم ممالک میں سب سے زیادہ جغرافیائی ربط انسانی مشغولات اور اقتصادی ترقی کے معاملات میں پایا جاتا ہے۔ تقریباً تمام مسلم ممالک مختلف قدرتی وسائل اور مخفی و امکانی ذرائع سے مالا مال ہیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ دنیا کا تقریباً تیل کا ذخیرہ مشرق وسطیٰ میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں بہت سے بیش قیمت پتھر اور دھاتیں بھی پائے جاتے ہیں جو اقتصادی ترقی میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ چند ملکوں کو چھوڑ کر جو صنعتی زرعی اور معدنی وسائل کی موجودگی سے خوشحال ہیں بیشتر مسلم ممالک میں انسانی معیار زندگی پست ہے کیونکہ مسلم ممالک بہت عرصہ تک مغربی ممالک کے محکوم رہے ہیں جنھوں نے سوائے ان ممالک کے خام مال سے استفادہ کرنے یا ان کے معاشی استحصال کرنے کے وہاں کے عوام کی بہبود کے لئے کچھ نہیں کیا۔ مسلم ممالک میں زرعی، معدنی، صنعتی اعتبار سے ترقی کے بہت سے مواقع موجود ہیں۔ ان میں افرادی قوت اور کام کرنے کی صلاحیتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ قدرت نے انھیں بیش بہا وسائل سے نوازا ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے ملک کے وسائل کو کام میں لاکر اقتصادی ترقی کی راہ ہموار کرسکتے ہیں۔ جو خام مال دوسرے ملکوں کو برآمد کرتے ہیں، اپنی صنعتیں قائم کرکے خود استعمال کرسکتے ہیں۔ مسلم ممالک میں پیدا ہونے والے صنعتی سامان کا آپس میں تبادلہ کرسکتے ہیں۔ اس کے لئے بری، بحری، ہوائی ذرائع نقل و حمل بہتر بنانے ہوں گے بہتر ذرائع نقل و حمل کی موجودگی میں مسلم ممالک ایک دوسرے کے قریب تر ہو جائیں گے۔ موجودہ عالمی نقطۂ نظر سے بہت سے مسلم ممالک اہم اور نازک مقامات کے حامل ہیں۔ ان کا باہمی اتحاد "تیسری عالمی قوت" کی حیثیت سے دو بڑے بلاکوں کے درمیان طاقت کا توازن قائم رکھ سکتا ہے۔ موجودہ دور میں دو مختلف نظریات کے امکانی تصادم کے پیش نظر اسلامی ممالک عالمی امن برقرار رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اسلامی ممالک کا اتحاد وقت کا اہم تقاضا ہے۔ مسلمانوں کے ثقافتی اور جغرافیائی ارتباط سے اقتصادی اشتراک اور تعاون کی راہیں ہموار ہونگی جو اُن کے دفاعی نظام کو مؤثر بنانے میں مددگار ثابت ہوسکیں گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی قومیت کا تصور ہی عالم اسلام کو متحد کرسکتا ہے۔ اور اس سے اسلامی ممالک کی عظمت قائم رہ سکتی ہے۔ دنیائے اسلام فی الوقت جن مسائل سے دوچار ہے

ان سے فطری طور پر تحریکات کی یہ درجہ بندی وجود میں آتی ہے۔

۱۔ ایسے ممالک جو پوری طرح آزاد اور خود مختار ہونے کے باوجود اپنی زیست کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

۲۔ ایسے نیم خود مختار ممالک جو کسی نہ کسی سامراجی قوت کے محور کا طفیلی سیارہ بنے ہوئے ہیں۔

۳۔ ایسے مسلمان جو بے وطن کر دیئے گئے ہیں۔ جو دوسرے ممالک میں پناہ لینے پر مجبور کئے گئے ہیں۔

۴۔ ایسی مسلم اکثریت جو غیر مسلم اقلیت کے جبر و تسلط میں زندگی بسر کر رہی ہے۔

۵۔ اپنی آزادی یا بقاء یا خود ارادیت کے لئے غیر مسلح یا مسلح تحریکیں چلانے والی آبادیاں۔

انیسویں صدی عیسوی کے اوائل اور وسط میں پیش آنے والے واقعات نے مسلمانوں کے اتحاد فکری و نظری یگانگت اور سیاسی و اقتصادی وسائل کے مشترک استعمال کی اہمیت کو پوری طرح واضح کر دیا ہے اور وہ دنیا کی تیسری بڑی قوت، اسلامی بلاک یا مسلم دولت مشترکہ کی حیثیت سے ابھر رہے ہیں۔ الجزائر۔ رباط، ریاض، جدہ، قاہرہ، لاہور، کوالالمپور کی اسلامی کانفرنسیں مسلمانوں کے ان عزائم کی آئینہ دار ہیں۔ یہ اسلامی کانفرنسیں نہ صرف بین الاسلامی اتحاد کی جانب مائل کر رہی ہیں بلکہ آپس کے سیاسی، معاشی، سماجی مسائل پر غور و خوض کر کے متفقہ طور پر ان کے حل تلاش کر رہی ہیں۔ باہمی ربط اختلاف ختم کرتے اور متحدہ ہونے کا بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن یہ اس وقت ممکن ہے کہ مسلمانان عالم علاقائی، لسانی اور نسلی مفاد سے بالاتر ہو کر محض وحدت ملی کے لئے سوچنے اور عمل کرنے کا شعور پوری طرح بیدار کریں اس وقت کوئی ملک یا کرہ ارض کا کوئی ایسا خطہ یا علاقہ نہیں ہے جہاں کی آبادی کلمہ توحید پڑھنے والوں سے خالی ہو لیکن افسوس ہے کہ لسانی، قومیت یا جغرافیائی وطنیت کے نام پر ملت عظمیٰ منتشر اور منقسم ہے۔

آذر بائیجان، تاجکستان، ترکمانیہ، ازبکستان، قازقستان میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت آباد ہے۔ اریٹیریا میں جو فی الوقت ایتھوپیا کے زیر تسلط ہے، مسلمانوں کی آبادی ۹۵ نیصد سے زائد ہے۔ جزیرہ مالدیپ، پرتگیزی گنی۔ صحرائے اسپین۔ فلسطین۔ مقبوضہ کشمیر میں مسلمان غالب اکثریت میں موجود ہیں۔

ان ممالک کی تفصیل درج ہے

جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ یا تاریخی انقلاب نے ان کو حاکم سے محکوم بنا دیا ہے۔ یا کسی دوسرے علاقے یا خطے سے نقل سکونت کر کے وہاں آباد ہو گئے ہیں۔

نمبر شمار	نام ملک	مسلمانوں کی آبادی
۱	انگولا	۲۵ نیصد
۲	آرمینیہ	۱۴ ٫٫
۳	باسوتولینڈ	۱۵ ٫٫
۴	بھوٹان	۴ ٫٫
۵	بلغاریہ	۱۴ ٫٫
۶	برما	۱۰ ٫٫
۷	برونڈی	۲۰ ٫٫
۸	سری لنکا	۷ ٫٫

۹	چین	۷ فیصد
۱۰	کانگو	۵ "
۱۱	جنوبی قبرص	۳۳ "
۱۲	گبون	۴۰ "
۱۳	گھانا	۳۰ "
۱۴	بھارت	۱۲ "
۱۵	کینیا	۱۹ "
۱۶	لائبریا	۳۰ "
۱۷	جمہوریہ ملاگاس	۲۰ "
۱۸	مالٹا	۱ "
۱۹	موزمبیق	۲۵ "
۲۰	نیاسالینڈ	۲۰ "
۲۱	شمالی رہوڈیشیا	۱۵ "
۲۲	فلپائن	۱۰ "
۲۳	تھائی لینڈ	۴ "
۲۴	پولینڈ	۲ "
۲۵	پرتگیزی تیمور	۲۰ "
۲۶	یوگنڈا	۳۲ "

وہ ممالک جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

نام ملک	رقبہ (مربع میل میں)	آبادی	آبادی فی مربع میل	طرز حکومت	دارالخلافہ	سکہ	مروجہ زبان
افغانستان	۲۵۰،۰۰۰	۱۸۰۷۰،۰۰۰	۷۲	جمہوریت	کابل	افغانی	پشتو، فارسی
البانیہ	۱۱،۰۰۰	۲،۳۳۰،۰۰۰	۲۱۰	جمہوریت	تیرانہ	لیک	البانی
الجیریا	۹۱۹،۵۹۵	۱۵،۱۵۵،۰۰۰	۱۶	جمہوریت	الجیریا	دینار	عربی، فرانسیسی
بحرین	۲۳۱	۲۲۵،۰۰۰	۹۷۴	شیخ	المنامہ	دینار	عربی، فرانسیسی
بنگلہ دیش	۵۵،۱۲۶	۷۲،۶۳۰،۰۰۰	۱۳۵۴	جمہوریت	ڈھاکہ	ٹکا	بنگالی۔
چاڈ	۴۹۵،۸۰۰	۳،۸۲۰،۰۰۰	۸	جمہوریت	فورٹ لیمی	فرینک	ہیمٹیک، عربی، فرانسیسی
مصر	۳۸۶،۹۰۰	۳۵،۳۳۰،۰۰۰	۹۱	جمہوریت	قاہرہ	پاؤنڈ	عربی
انڈونیشیا	۷۳۵،۲۷۱	۱۲۸،۶۵۰،۰۰۰	۱۷۵	جمہوریت	جکارتہ	روپیہ	بہاسا، انگریزی، چینی
ایران	۶۳۶،۲۰۰	۳۱،۳۰۰،۰۰۰	۴۹	جمہوریت	تہران	ریال	فارسی، کردی، ترکی
عراق	۱۶۷،۹۲۵	۱۰،۲۱۰،۰۰۰	۶۱	جمہوریت	بغداد	دینار	عربی، کردی۔
اردن	۳۷،۷۳۸	۲،۴۹۰،۰۰۰	۶۶	بادشاہت	عمان	دینار	عربی
کویت	۶،۲۰۰	۹۲۰،۰۰۰	۱۵۲	شیخ	کویت	دینار	عربی۔
لبنان	۳،۹۵۰	۳،۰۰۰،۰۰۰	۷۵۹	جمہوریت	بیروت	پاؤنڈ	عربی، فرانسیسی، انگریزی
لیبیا	۶۷۹،۳۶۲	۲،۱۲۰،۰۰۰	۲۸	جمہوریت	ترپولی	دینار	عربی۔
ملائیشیا	۱۲۸،۴۳۰	۱۰،۹۲۰،۰۰۰	۸۵	جمہوریت	کوالالمپور	ڈالر	ملائی، چینی، انگریزی۔
مالدیپ	۱۱۵	۱۲۰،۰۰۰	۱۰۴۳	جمہوریت	مالی	روپیہ	عربی

وہ ممالک جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

نام ملک	رقبہ مربع میل میں	آبادی	آبادی فی مربع میل	طرز حکومت	دارالخلافہ	سکہ	مروجہ زبان
ماریطانیہ	۳۹۷،۹۵۰	۱،۲۵۰،۰۰۰	۳	جمہوریت	نواکچوٹ	فرینک	عربی
مالی	۴۷۸،۶۵۵	۵،۳۲۰،۰۰۰	۱۱	جمہوریت	باکو	فرینک	عربی
مراکش	۱۷۲،۴۱۵	۱۵،۹۵۰،۰۰۰	۹۳	بادشاہت	رباط	درہم	عربی
نائجر	۴۲۸۹،۲۰۰	۴،۲۹۵،۰۰۰	۹	جمہوریت	نیامے	فرینک	ہوسہ
نائجیریا	۳۵۶،۶۶۹	۵۸،۶۲۰،۰۰۰	۱۶۴	جمہوریت	لاگوس	پاؤنڈ	ہوسہ
عمان	۸۲،۰۳۰	۷۱۰،۰۰۰	۹	سلطان	مسقط	ریال	عربی
پاکستان	۳۲۵،۷۵۳	۶۲،۳۰۰،۰۰۰	۱۸۰	وفاقی جمہوریت	اسلام آباد	روپیہ	اردو
قطر	۸،۵۰۰	۱۶۰،۰۰۰	۱۹	شیخ	الدوحہ	ریال	عربی
سعودی عربیہ	۸۳۰،۰۰۰	۸،۱۱۵،۰۰۰	۱۰	بادشاہت	ریاض	ریال	عربی
صومالیہ	۲۴۶،۲۰۱	۲،۹۴۵،۰۰۰	۱۲	جمہوریت	مقدیشو	شلنگ	کالی
سوڈان	۹۶۷،۵۰۰	۱۶،۴۸۰،۰۰۰	۱۷	جمہوریت	خرطوم	پاؤنڈ	عربی
شام	۷۱،۲۹۸	۶،۷۵۰،۰۰۰	۹۴	جمہوریت	دمشق	پاؤنڈ	عربی
تیونیشیا	۶۳،۳۷۹	۵،۵۰۰،۰۰۰	۸۷	جمہوریت	تیونس	دینار	عربی
ترکی	۳۰۱،۳۸۲	۳۶،۵۳۰،۰۰۰	۱۲۵	جمہوریت	انقرہ	لیرا	ترکی
متحدہ عرب امارات	۳۲،۳۰۰	۲۰۵،۰۰۰	۶	متحدہ خود مختار ریاستیں	ابوظہبی	ریال	عربی
یمن	۷۵،۳۰۰	۶،۱۶۰،۰۰۰	۸۲	جمہوریت	صنعاء	ریال	عربی

اس کے علاوہ دیگر ممالک میں مسلمانوں کی آبادیاں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	نام ملک	مسلمانوں کی آبادی۔
۱	ارجنٹائن	۳ لاکھ
۲	آسٹریلیا	۱۲ ہزار
۳	کناڈا	۲۰ ہزار
۴	جزیرہ فجی لینڈ	۴۰ ہزار
۵	فن لینڈ	۴۰ ہزار
۶	فرانس	۲۷ لاکھ ۶۱ ہزار
۷	جرمنی	۳۷ ہزار
۸	ہانگ کانگ	۸½ ہزار
۹	ہنگری	۸۰ ہزار
۱۰	اٹلی	۲۵ ہزار
۱۱	جاپان	۵۰ ہزار
۱۲	نیپال	۳ لاکھ ۵۶ ہزار
۱۳	نیاسالینڈ	۵ لاکھ ۹۰ ہزار
۱۴	یوگوسلاویہ	۷ لاکھ
۱۵	یونان	۱۰ لاکھ
۱۶	رومانیہ	۲۵ ہزار

اتحادِ عالم اسلامی میں پاکستان نے ہمیشہ نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان نظریاتی اور آئینی اعتبار سے اسلامی مملکت ہے جو اپنے آپ کو ان کوششوں سے ہرگز الگ نہیں رکھ سکتا جن کا تعلق عالمِ اسلام کی سربلندی۔ اتحاد و بقاء مسلمانوں کی خود مختاری اور خوشحالی سے ہے۔ پاکستان عالمِ اسلام کو متحد و منظم کرنے، ان کے سیاسی و اقتصادی مسائل کو مجتمع کرنے اور ان وسائل سے باہمی استفادہ کرنے کی جدوجہد میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہ کانفرنس اور ۴۰ اسلامی ممالک کے وزراء کا حالیہ اجتماع اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کے مسلمان عالمی سیاست میں زبردست اور موثر قوت بن کر اُبھرے ہیں۔ اس قوت سے ایشیاء اور یورپ کے مسلمانوں کو بھی ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔

پاکستان کا استحکام، معاشرت، مذہب، اقتصادیات تاریخی حیثیت سے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک سے وابستہ ہے۔ لہٰذا ان ممالک سے باہمی اشتراک و تعاون ہمارے ملک کے تابناک مستقبل کا ضامن ہوگا۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

٭ ٭ ٭

ڈاکٹر حفیظ الرحمن صدیقی

نظریہ ارتقا حقائق کے آئینے میں

نظریہ ارتقاء کو حیاتیات کی دنیا میں ایک حقیقت کی طرح مانا جاتا ہے۔ مفروضے کے طور پر نہیں۔ ہر ماہر حیاتیات اس پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی حقانیت کا انکار رد قیانوسیت اور تنگ نظری سمجھا جاتا ہے۔ خود حیاتیات کے لیے اس کی حیثیت روحِ جسم کی ہے آج کی حیاتیات کی پوری عمارت اسی نظریے پر اٹھائی گئی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ مذہبی عقیدے کی رو سے اسے برملا غلط سمجھتے ہیں وہ دلائل اور شواہد کے ذریعے اس کی تکذیب کرنے سے عاجز نظر آتے ہیں اس لیے صرف دل سے غلط سمجھنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اپنی تحریروں میں اور کمرۂ تدریس کی تقریروں میں حیاتیات کا جو سبق ان کی زبان سے ادا ہوتا ہے وہ سب کا سب نظریہ ارتقا پر مبنی ہوتا ہے۔

یہ ایک عجیب و غریب صورت حال ہے۔ عجیب و غریب اس وجہ سے کہ سائنس کا ایک بھی نظریہ نہیں جو ابدی ثابت ہوا ہو۔ ہر نظریہ چند دہائیوں یا صدیوں کے بعد از کار رفتہ ہو گیا خواہ وہ گردش زمین و سیارگان کے بارے میں ہو یا مادہ و توانائی کے بارے میں یا تخلیق حیوانات کے بارے میں یا تخلیق کائنات کے بارے میں یا کسی اور مسئلے کے بارے میں مثال کے طور پر نظریہ جوہر (THEORY OF ATOM) کو ہی لے لیجیے اس کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ یہ ناقابل شکست ہوتا ہے آج کی پوری جدید کیمیا اسی نظریے پر مدون کی گئی ہے مگر مادے سے توانائی کے اخراج کی توجیہہ کرنے کا جب وقت آیا تو اسے قابل شکست ماننا پڑا اور آج کوئی نہیں جو اسے قابل شکست نہ مانتا ہو نہ ماننے والا سائنسدان نہیں کہلائے گا۔

پھر کیوں نظریہ ارتقا کو ایک ابدی حقیقت مانا جائے؟

بہرکیف! جس ارتقاء پر یہاں گفتگو کی جا رہی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمام جاندار اقسام یعنی حیوانات اور پودے ایک یا صرف چند جانداروں سے ماخوذ ہیں اسے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ایک یا (چند) بہت ہی سادہ قسم کے نامیے (ORGANISMS) یا نامیوں نے بے شمار پیچیدہ

اور ترقی یافتہ قسم کے جانداروں کو نسلاً بعد نسلاً جنم دیا۔ حیوانیات کے حوالے سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پروٹوزوا والے حیوانات نے کثیر خلوی بے ہڈی دار جانوروں (INVERTEBR-ATES) کو اور بے ہڈی دار جانوروں نے ہڈی دار جانوروں (CHORDATES) کو اور پس ماندہ قسم کے ہڈی دار جانوروں نے ترقی یافتہ قسم کے ہڈی دار جانوروں کو جنم دیا۔

ماہرین کے مابین اختلاف صرف اس مسئلے میں ہے کہ یہ ارتقا ہوا کس طرح؟ اس کے بارے میں دو نظریات کو نہایت وقیع مانا جاتا ہے۔ ایک ڈارون کا پیش کردہ ہے۔ اس کے بموجب نئے نئے حیوانات اتفاقات و حوادث کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں پہلے سے طے شدہ کوئی منصوبہ یا طرز عمل دخیل نہیں ہوتا اسے حیاتیات کی اصطلاح میں فطری انتخاب (NATURAL SELECTION) کہا جاتا ہے۔ دوسرا نظریہ لیمارک کا پیش کردہ ہے جس کے بموجب ماحولی حالات کی اثر اندازی نئی قسم کے حیوانات کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنتی ہے اسے حیاتیات کی اصطلاح میں نظریۂ کثرت کار و ترک کار (THEORY OF USE & DISUSE) کہا جاتا ہے بعد کے آنے والے ماہرین ارتقا میں سے ڈارون کے ایک فکری شاگرد نے اپنے استاد کے نظریے میں تھوڑی سی ترمیم کی ہے وہ یہ ہے کہ اتفاقات و حوادث کے ذریعہ حیوان کی جس نئی قسم کو وجود میں آنا ہوتا ہے وہ کئی نسلوں تک اتفاقات و حوادث کا ہدف بننے کے بعد وجود میں نہیں آتی بلکہ ایک ہی نسل کا گذرنا اس کے لئے کافی ہوتا ہے ان شاگرد کا نام ڈی ویریز ہے۔ لیمارک کے فکری شاگردوں نے بھی جنکے نام سمنر (SUMNER) اور ہسلوپ ہریسن (HASLOP HARRISON) وغیرہ ہیں اپنے استاد کے نظریے میں ترمیم کی ہے وہ یہ ہے کہ ماحولی عوامل کی جو اثر اندازی حیوانوں کی نئی قسم پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے وہ حیوان کے جسم پر وقوع پذیر نہیں ہوتی بلکہ اس کے تولیدی خلیات پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ انہوں نے مذکورہ ترمیم کے ذریعے لیمارک کے نظریہ کی زندگی کچھ دنوں کے لئے بڑھا دی ہے وہ یہ کام نہ کرتے تو معمل (لیبارٹری) کے تجربات کب کے اسے مسترد کر چکے ہوتے۔ ماحول کی اثر اندازی والا نظریہ بڑا دلکش نظر آتا ہے کیونکہ اس نظریے کے بموجب زمینی زندگی نے گھوڑے کے پیروں میں کھر پیدا کئے فضائی ماحول نے پرندوں میں پر پیدا کئے اور آبی زندگی نے مچھلیوں میں زعنفے (FINS) پیدا کئے ورنہ اصل میں ان سب کے جوارح ایک ہی منصوبے پر بنائے گئے تھے۔ ماحولی تقاضوں نے ان میں جدا جدا قسم کی ترمیمیں کر ڈالیں۔ اس نظریے کو جو ظاہر میں دل کو بہت بھاتا ہے آپ غور سے دیکھیں تو بہت مضحکہ خیز نظر آئے گا۔ یہ بات ویسی ہی ہوئی جیسے کسی سیارے سے کوئی مخلوق زمین پر اتر آئے اور اس کارگہہ عالم کو دیکھنے کے بعد یہ رائے دے کہ سڑکوں نے موٹر کاریں اور گاڑیاں بنا ڈالیں سمندر اور دریا نے جہاز اور کشتیاں بنا ڈالیں اور ہوا نے طیارے اور ہیلی کاپٹر بنا ڈالے اس کی یہ بات آپ کو کیسی لگے گی؟ ظاہر ہے کہ آپ اس نووارد مخلوق کی بات سن کر ہنس پڑیں گے اور اس کا جواب یہ دیں گے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان تمام چیزوں کے

بنانے والوں نے سڑکوں پر چلنے کے لئے پہیوں والی گاڑیاں بنائیں۔ پانی کی سطح پر تیرنے کے لئے کارینادار یا کشتی نما جہاز بنائے اور فضا میں اڑنے کے لئے پنکھوں والے طیارے بنائے کیوں کہ اس کے بغیر گاڑیاں سڑکوں پر دوڑ نہ سکتی تھیں۔ جہاز پانی کی سطح پر تیر نہ سکتے تھے اور طیارے فضا میں اڑ نہ سکتے تھے۔ آپ اپنی بات کے حق میں دلیل یہ دیں گے کہ دوڑنے کی صلاحیت سڑکوں کے اندر نہیں ہوتی بلکہ گاڑی کے پہیوں کے اندر ہوتی ہے۔ سڑک تو دوڑنے کے لئے صرف سازگار مواقع فراہم کرتی ہے اسی طرح سے تیرنے کی صلاحیت پانی میں نہیں ہوتی بلکہ جہاز کی کارینادار بناوٹ میں ہوتی ہے جو اسے اس لائق بناتی ہے کہ وہ پانی میں تیر سکے اسی طرح سے اڑنے کے لئے طیارے کی بناوٹ ہوتی ہے لہذا ان حیوانات کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ پانی میں زندگی گذارنے کے لئے مچھلی کے جوارح کو زعنفوں (FINS) کی شکل میں بنایا گیا یا فضا میں اڑنے کے لئے جوارح کو پروں کی شکل میں اور زمین پر دوڑنے کے لئے گھوڑے کو کھروالی ٹانگوں کی شکل میں بنایا گیا تو کون سی عجیب و غریب یا خلاف عقل بات ہوگی جس سے بچنے کے لئے کوئی نیا نظریہ پیش کرے کہ ماحولی تقاضوں نے اثرانداز ہو کے ان تینوں قسم کے حیوانوں میں جدا جدا قسم کے جوارح پیدا کر دیئے۔

غرض یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ نظریہ ارتقا کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ارتقاء کا نظریہ پیش کرنے والوں نے اس کے حق میں جو دلیلیں اور شواہد پیش کئے ان کا جائزہ لیا جائے اور حیوانات میں ارتقا کا نظریہ پیش کئے جانے کے بعد سے حیوانیات میں معلومات کا جو عظیم الشان ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اس کی روشنی میں ارتقا کے نظریے کی صحت و عدم صحت کو پرکھا جائے۔ نئی معلومات کی روشنی میں اب ذرا ارتقا کے شواہد کو ایک ایک کر کے لیجئے اور پرکھ کر دیکھئے:-

● رکازیاتی مواد (PALAENTOLOGI-CAL RECORDS) کی مدد سے دلیل دی جاتی ہے کہ پہلے صرف پس ماندہ قسم کے حیوانات وجود میں آئے اور پھر بتدریج، عہد بہ عہد، ترقی یافتہ حیوانات وجود میں آتے چلے گئے۔

رکازی مواد کی وجہ سے یہ بات تو ضرور ثابت کی جا سکتی ہے کہ آج دنیا میں جتنی قسم کے حیوانات موجود ہیں وہ سب کے سب ایک ساتھ وجود میں نہیں آگئے بلکہ رفتہ رفتہ عہد بہ عہد وجود میں آئے مگر یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ پہلے صرف پسماندہ حیوانات وجود میں آئے اور بعد میں صرف ترقی یافتہ حیوانات۔ اس وقت پائے جانے والے ایسے حیوانات جو ترقی یافتہ حیوانات کے جسم میں طفیلی (PARA-SITE) کی حیثیت سے زندگی گذارتے ہیں اس دعوے کی کھلی تکذیب کرتے ہیں مثال کے طور پر انسان کے پیٹ میں پائے جانے والے کیڑوں کو لے لیجئے کدو دانہ (TAPE WORM) نامی طفیلی اپنے دورِ حیات کا ایک حصہ انسان کے جسم میں مکمل کرتا ہے۔ اور دوسرا سور کے جسم میں۔

اس سے کیا ثابت ہوا؟ اس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ

کیڑا انسان اور سؤر کی تخلیق کے بعد یا اس کا ہم عصر بن کے نمودار ہوا ان سے پہلے وجود میں نہ آیا تھا اگر آیا تھا تو اپنے ان دو میز بانوں کے بغیر کس طرح زندگی گزار رہا تھا؟ اسی طرح سے گول رودا (ROUND WORM) ملیریائی طفیل، ٹرپنوسوما، اینٹ امیبا ہسٹولی ٹیکا، جیارڈیا اور بے شمار دیگر طفیلیوں کو دیکھ لیجئے یہ سب کے سب زندگی گزارنے کے لئے انسانی جسم کے محتاج ہیں۔ انسان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اس حقیقت کی موجودگی میں یہ دعویٰ کتنی دیر تک درست ٹھیر سکتا ہے کہ ترقی یافتہ حیوانات بعد میں پیدا ہوئے اور پسماندہ حیوانات پہلے ارتقاء کے ماننے والے اس صورت حال کی توجیہہ یہ کریں گے کہ طفیلی حیوانات پہلے آزاد باش (FREE LIVIN'S) پیدا ہوئے تھے بعد میں وہ طفیلی بن گئے۔ مگر اس توجیہہ کو ثابت کرنے کے لئے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ ان میں سے ہر طفیلی کی سابقہ شکل کیا تھی؟ یہ بتانا اس وجہ سے ضروری ہے کہ ارتقا کے ماہرین جب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پرندے ہوام (REP TILES) سے ماخوذ ہیں تو انہیں اس کے حق میں "عملی شہادت" بھی پیش کرنی پڑتی ہے کہ آرکیوپیٹرس (ARCHAEOPTERYX) اور آرکیورنس (ARCHAEORNIS) نام کے دو رکازی حیوان ملے ہیں جن میں آدھی خصوصیات ہوام کی ہیں اور آدھی پرندوں کی یا جب وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پستانئے ہوام سے ماخوذ ہیں تو انہیں یہ شہادت بھی فراہم کرنی پڑتی ہے کہ ابتدائی درجہ کے پستانیئے جن کے نام پلیٹی پس (PLATYPUS) اور ایکیڈنا ہیں ہوام کی طرح انڈے دیتے ہیں اس کے برعکس مذکورہ طفیلیوں میں تدریجی مراحل کا کوئی پتہ نہیں ملتا پھر اس توجیہہ کا کیا اعتبار؟

کچھ دوسری قسم کی مثالیں بھی اس دعوے کی تکذیب کرتی ہیں مثال کے طور پر ہڈی دار جانوروں کے عائلہ کارڈیٹا کے بعض جانوروں مثلاً اسیڈیا (ASCIDIA) بیلنا گلاسس یا ڈولیولم میں ہڈی نام کو نہیں پائی جاتی جب کہ سیپیا (SEPIA) نامی حیوان میں جو غیر ہڈی دار جانوروں کے عائلے سے تعلق رکھتا ہے۔ (CARTILAGE) ہڈی موجود ہوتی ہے جو اس کے دماغ کا خول بناتی ہے یا ایمفی اکسس میں جو عائلہ کارڈیٹا کا نمائندہ ہے۔ اخراج کے لئے گردینی نالیاں (SOLENOCYETE) پائی جاتی ہیں جب کہ ان جیسی نالیوں کو جنہیں گردینے (NEPHRIDIA) کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ تر حیوانات عائلہ اینیلڈا میں ہی چھوڑ آئے۔

● جنینیات (EMBRYOLOGY) سے دلیل دی جاتی ہے کہ کوئی حیوان، ماہرین ارتقاء کے دریافت کردہ جن مدارج سے گزرا تھا مثلاً پستانیہ بننے کے لئے یہ مچھلیوں سے مینڈکوں، مینڈکوں سے ہوام (REPTILES) ہوام سے پستانیوں کے مدارج تک پہنچا، پستانیئے کا جنین بھی اپنے زمانہ نمو میں ان مدارج کو دہراتا ہے پہلے وہ مچھلیوں کی سی شکل اختیار کرتا ہے پھر مینڈکوں کی سی، پھر ہوام کی سی اور آخر میں پستانیوں کی سی۔ اسے بڑی مضبوط دلیل سمجھا جاتا ہے اور اسے RECAPITULATION THEORY

کا نام دیا گیا ہے۔

اس دلیل کو اگر کوئی کمہار سن لے تو وہ ہنس پڑے گا۔ کیونکہ وہ جب برتن بنانے بیٹھتا ہے تو وہ ہر گول برتن کے لئے خواہ وہ ہانڈی ہو یا گھڑا یا مثلاً یا صراحی، مٹی کے لوندے کی اپنے چکے پر ابتدا میں ایک ہی طرز پر صورت گری کرتا ہے۔ پھر بتدریج اس کو اس برتن کے خطوط پر MOULD کرتا چلا جاتا ہے جو اسے تیار کرنا ہوتا ہے یہ کون سی عجیب اور خلاف عقل بات ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ قدرت بھی ایک گروہ یعنی عائلہ کارڈیٹا کے حیوانات کی جو دیگر حیوانات کے مقابلے میں آپس میں ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے ہیں، ان کی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں ایک ہی طرز پر صورت گری کرتا چلا گیا اور بعد کے مراحل میں اس نے ہر ایک کی جدا جدا طریقہ پر صورت گری کی تاہم اگر اس دلیل کو سنجیدگی سے لیا جائے تو یہ دلیل اپنی تکذیب خود آپ کرتی نظر آتی ہے۔ عائلہ کارڈیٹا کو چھوڑ کر جہاں سے یہ دلیل حاصل کی گئی ہے، عالم حیوانات کے باقی ماندہ عائلوں پر یہ دلیل درست ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس دلیل کو جھٹلاتی ہے۔ مثال کے طور پر مچھر، مکھی اور تتلی کے سرودں (LARVAE) کا تقابل کر کے دیکھ لیجئے۔ یہ تینوں حیوانات ایک ہی عائلہ کی ایک ہی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ان تینوں کے سرودں میں دور کی نسبت بھی نظر نہیں آتی۔ مچھر کا سروہ ایسی شکل و صورت کا ہوتا ہے کہ پوری جماعت بلکہ پورے عائلہ میں دور دور تک اس سے مشابہت رکھنے والا کوئی بالغ یا سروہ نہیں پایا جاتا یہی صورت حال تتلی اور مکھی کے سرودں کے ساتھ ہے۔ باقی تینوں حشرات کے سروے اپنے والدین کی شباہت سے بھی اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ ان دونوں کے اندر دور دراز کی بھی کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔ مچھر کا سروہ تقلب کے مدارج سے گزرتا ہے جب جا کے بالغ شکل حاصل کرتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس جماعت کے بہت سے دیگر حشرات مثلاً تل چٹے (COCKROACH) یا ٹڈے کا بچہ اپنے والدین سے ۹۰ فیصد سے بھی زیادہ مشابہہ ہوتا ہے بس یوں سمجھئے کہ صرف پر غیر موجود ہوتے ہیں

● دلیل دی جاتی ہے کہ زراف اپنے سے مشابہہ گھوڑے نما حیوانات کے مقابلے میں لمبی گردن کا حامل اس وجہ سے ہو گیا کہ بدلے ہوئے ماحول نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یا آبی طرز زندگی اختیار کرنے کی وجہ سے بعض پرندوں مثلاً بطخوں اور مرغابیوں کی ٹانگوں کی انگلیوں کے درمیان جھلیاں (WEBS) پیدا ہو گئیں وغیرہ وغیرہ

بہت سے دوسرے حیوانات اس دلیل کو بھی جھٹلاتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ اعضائے جسم میں تبدیلی ماحولی جبر کا نتیجہ نہیں بلکہ ہر حیوان کی اپنی انفرادی ضرورت کا نتیجہ ہے اگر اعضائے جسم میں تبدیلی ماحولی جبر کا نتیجہ ہوا کرتی تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ مثال کے طور پر مچھر کی نر اور مادہ کو تولیدی اعضا کے فرق کے ماسوا ہر اعتبار سے یکساں ہونا چاہئے تھا مگر ایسا نہیں ہے بلکہ مچھر کی انوفیلس کی مادہ کے دہنی ضمیمے (MOUTH PARTS) نر کے ضمیموں سے اتنے زیادہ مختلف ہوتے ہیں کہ مادہ انسانی جسم

کا خون چوسنے پر قادر ہوتی ہے مگر نر نہیں ہوتا ۔ انوفلیس کی طرح سے کیولیکس مچھر میں بھی مادہ کے ذہنی منیجے اپنے نر سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے بیک کی مادہ اپنے نر سے بعد المشرقین رکھتی ہے۔

● دلیل دی جاتی ہے کہ بعض حیوانات میں کچھ ایسے اعضاء پائے جاتے ہیں جو اس حیوان کے لئے عضو ناکارہ (VESTIGEAL ORGAN) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر گائے یا گھوڑے کے کھر کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے انگلی نما ابھار پائے جاتے ہیں جو ان حیوانوں کے لئے اعضاء ناکارہ کی حیثیت رکھتے ہیں گائے یا گھوڑے میں ناکارہ اعضاء کی موجودگی سے یہ دلیل اخذ کی جاتی ہے کہ یہ دونوں حیوانات پنج انگشتی حیوانات سے ماخوذ ہیں۔ یہ دلیل اگر حیوانات کے ارتقا کی دلیل ہے تو اس بات کی کیا توجیہہ کی جائے گی کہ دودھ پلانے حیوانوں کی جماعت MAMMALS میں نر حیوانوں میں بھی پستانی غدود عضو ناکارہ کی حیثیت سے موجود ہوتے ہیں یا پروٹوپٹیرس (PROTOPTERUS) نامی ایک مچھلی کے نر میں بیض نالی اور مادہ پستانی حیوانوں میں نالکہ قناة (VASDEFERENS) اعضائے ناکارہ کی حیثیت سے موجود ہوتے ہیں اس کا کیا مطلب ہوا ؟ کیا نر ماداؤں سے یا مادائیں نر سے ارتقاء پزیر ہوئیں ؟

● دلیل دی جاتی ہے کہ روس میں بعض انسان ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کے پورے چہرے پر کتے کی مانند بال ہوتے ہیں اسی وجہ سے ایسے انسان کو سگ نما انسان (DOG MAN) کہا جاتا ہے یا بعض انسانی بچوں میں ریڑھ کی ہڈی کا آخری سرا ترقی پاکر ۹ را نچ تک کی دم بنالیتا ہے ان حوادث کی توجیہہ یہ کی جاتی ہے کہ انسان کے اجداد سگ نما بھی تھے اور دم دار بھی لہذا یہ جدی خصوصیات جو انسان کی ارتقاء پزیری کی وجہ سے دب گئی تھیں پھر سے عود کر آئی ہیں اور ارتقاء کو ثابت کرتی ہیں اس کیفیت کے لئے بازنمود (ATAVISM) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

یہ حوادث اگر ارتقاء پزیری کی دلیل ہیں تو اس امر کی کیا توجیہہ کی جائے گی کہ بعض عورتوں کے چہروں پر مردوں کی طرح بال اگ آتے ہیں یا بعض انسانوں کے ہاتھ یا پیر میں چھ انگلیاں ہوتی ہیں ؟ کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ عورت مرد سے یا انسان، چھ انگلیوں والے حیوانات سے ماخوذ ہے ؟

مختصر یہ کہ آپ ارتقاء کے حق میں پیش کی جانے والی دلیلوں کو ایک ایک کر کے لیتے جائیے اور اس کی تنقیح کرتے جائیے۔ ان میں سے ہر دلیل خود اپنے اندر سے اسے جھٹلاتی ہوئی ملے گی اور ان میں سے کوئی دلیل ایسی نظر نہ آئے گی جسے آپ ارتقا کے حق میں اٹل پاسکیں جب آپ ایک ایک کر کے تمام دلائل کی تنقیح کرنے کے بعد اسے بے حقیقت پاچکے ہوں گے تو قدرتی طور پر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ پھر ارتقاء کا نظریہ لیمارک یا ڈارون کے ذہن میں آیا کیوں ؟ اس نظریے کی تخلیق کا جو نفسیاتی اور تاریخی پس منظر ہے اس پر ہم یہاں گفتگو کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ممکن ہے کہ آپ اسے غیر سائنسی

بات یا غیر متعلق بات سمجھ لیں لہٰذا ہم سائنسی استدلال کی زبان میں اس کا جواب یہ دیں گے کہ ارتقا کا نظریہ اس وجہ سے ذہن میں آیا کہ حیوانات کو محض ایک نامیاتی کل (ORGANI WHOLE) سمجھ لیا گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ حیوانات محض اعضائے جسمانی کے وجود کا نام ہیں یہ خیال فی نفسہٖ غلط اور خلاف حقیقت ہے۔ کسی بھی حیوان کا وجود محض نامیاتی کل کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک سے زیادہ عناصر کا مرکبہ (COMPLEX) ہے۔ ان کی حتمی تعداد کا تعین ابھی سے نہیں کیا جا سکتا مگر معلومات کے بارے میں جتنا کچھ ہم جان چکے ہیں اس کی بنیاد پر کم سے کم تین عناصر کی نشاندہی ضرور کر سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک اس کا نامیاتی وجود ہے دوسرا اس کی جبلت (INSTINCT) اور تیسرا اس کا وہ شعور ہے جسے وہ غیر شعوری طور پر استعمال کرتا ہے۔ جس کے لئے ہم سردست ماورائے شعور کی اصطلاح استعمال کریں گے۔ کسی بھی حیوان کی زندگی کم سے کم ان تینوں عناصر کی مدد سے قائم رہتی ہے۔ اسے آپ ایک عام فہم مثال کے ذریعے سمجھئے۔

کوئی کبوتر کسی دودھ پلانے والے جانور کے برعکس بچے جننے کے بجائے چونکہ انڈے دیتی ہے اسلئے اس کے اندر نسل سازی کا طریقہ یہ ہے کہ یہ مجامعت (COPULATION) کے لئے اپنے اعضائے جسمانی کو استعمال کرتی ہے۔ اس کے بعد اس کی بعض نالی کسی دودھ پلانے والے جانور کے برخلاف اس کے انڈوں کے گرد سخت خول بناتی ہے۔ پھر جب انڈے باہر نکلنے والے ہوتے ہیں تو اس سے پہلے کبوتر تنکے چن کر گھونسلا بناتی ہے انڈے وہ گھونسلے میں دیتی ہے۔ جسے وہ پھر سیتی ہے اور بچے نکالتی ہے۔ اس پورے کام میں کم سے کم تین عناصر نے کارکردگی دکھائی۔ ایک کبوتر کے نامیاتی وجود نے جس نے مجامعت کی۔ دوسرے اس کے ماورائے شعور نے جس نے کبوتر کی کسی شعوری کوشش یا خواہش کے علی الرغم انڈوں کے گرد سخت خول بنایا اگر خول نہ بنایا جاتا تو یہ انڈے سالم حالت میں مادہ کے پیٹ سے باہر نہ نکل سکتے اور ان سے بچے نہ نکل پاتے۔ تیسری چیز تھی کبوتر کی جبلت جس نے اسے انڈے دینے سے پہلے گھونسلے بنانے اور انڈوں کو سینے کا سلیقہ سکھایا یہ تینوں عوامل اگر برسرِ کار نہ ہوتے تو کبوتر نئی نسل تیار نہیں کر سکتی تھی۔ اسطرح کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور ہر حیوان کے حوالے سے پیش کی جا سکتی ہیں مگر ہم خواہ مخواہ طوالت کا بوجھ مار کر کے آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے البتہ ایک مثال اور دینا چاہتے ہیں درخت پر رہنے والا ایک شجر باش مینڈک (TREE FROG) ہوتا ہے جس کا نام (PHYLLOMEDUSA HYPOCHONDRIALIS) ہے۔ یہ درخت کے پتوں پر انڈے دیتا ہے مگر یہ انڈے دینے کیلئے ایسے درخت کا انتخاب کرتا ہے۔ جو تالاب کے کنارے واقع ہو مزید قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ اپنے انڈے درخت کے ان پتوں پر دیتا ہے جس کی ٹہنیاں تالاب پر جھکی ہوں اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انڈوں سے جب بچے (TADPOLES) نکلتے ہیں تو وہ اپنے پتوں سے چھوٹ کر تالاب میں گرتے جہاں وہ اپنی نمو کے بقیہ مدارج طے کر کے بالغ درجے کو پہنچتے ہیں۔ مینڈک اگر انڈے درخت کے بجائے

زمین پر دیتا یا درخت کے ایسے پتوں پر دیتا جن کی ٹہنیاں تالاب کی حدود سے باہر ہوتی ہیں تو اسکی نسل وہیں ختم ہو جاتی کیونکہ اس کے بچوں کو بقیہ مدارج زندگی کی تکمیل کے لئے پانی میسر نہیں آتا۔ مینڈک انڈے دینے کے لئے صرف پانی میں جھکی ہوئی ٹہنیوں کا جب انتخاب کرتا ہے تو اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے یہ عمل اس کی جبلت بھی نہیں کہلائے گی کیونکہ جبلی صلاحیت استعمال کرنے والے حیوان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس مقصد کے لئے یہ کام کر رہا ہے۔ یہ مینڈک کا ایسا ایک شعوری کام ہے جسے وہ غیر شعوری طور پر انجام دے رہا ہے اور جس کے لئے ہم نے ماورائے شعور کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ آپ اس کے لئے کوئی اور اصطلاح بھی استعمال کر سکتے ہیں مگر واضح کرنا یہ مقصود ہے کہ مینڈک کی نسل رانی صرف اس کے نامیاتی وجود کی نہیں بلکہ نامیاتی وجود کے علاوہ دیگر عوامل کی بھی مرہون منت ہے۔

اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر آپ نظریہ ارتقاء کے اس دعوے کو دہرائیے کہ ترقی یافتہ حیوانات پس ماندہ حیوانات سے وجود میں آئے۔ اس دعوے کو دہرانا آپ کے دل میں از خود یہ سوال پیدا کر دے گا کہ اگر ایک نامیاتی وجود دوسرے نامیاتی وجود سے پیدا ہوتا ہے تو پھر جبلت اور ماورائی شعور کس چیز سے وجود میں آتا ہے؟ اگر شجر باش مینڈک زمین باش مینڈک سے وجود میں آیا تو شجر باش مینڈک میں وہ ماورائی شعور کس طرح پیدا ہوا جس نے اس میں انڈے دینے کے لئے تالاب پر جھکی ہوئی ٹہنیوں کا انتخاب کرنے کا سلیقہ سکھایا؟ اگر آپ ان خطوط پر غور کرتے چلے جائیں تو ارتقاء کا نظریہ آپ کو ایک خیال خام کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا اب رہا یہ سوال کہ مختلف قسم کے حیوانات پھر کس طرح وجود میں آئے؟ تو خصوصی تخلیق کا ہی عقیدہ آپ کو مطمئن کر سکے گا۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر حیوان جو نامیاتی وجود، جبلت اور ماورائی شعور اور نہ معلوم کتنے دیگر عوامل کے مجموعے کا نام ہے، اپنی جدا جدا منفرد ضروریات کی تکمیل کے لئے جدا جدا طور پر تخلیق کئے جانے سے وجود میں آسکا ہوگا۔

بہر کیف! نظریہ ارتقاء کی عدم صحت تو رہی ایک طرف، اگر آپ حیوانیات پر اس کے فکری مضرات پر غور کریں تو یہ نظریہ آپ کو جدید حیوانیات کا سب سے بڑا المیہ نظر آئے گا۔ حیوانیات نے عالم حیوانات کی رنگا رنگی، جبلی ذہانت، حسن نفاست، نزاکت، خوش نما سماجی طرز رہائش، میل جول، انس و محبت، مادرانہ شفقت اور بود و باش کے متنوع طریقوں کے بارے میں معلومات دریافتوں اور انکشافات کا جو خزانہ دریافت کیا ہے اسکے لئے قدرت کی صناعی کی قدر و ستائش کرتے ہے اس نے انسان کو روک دیا ہے۔ کیونکہ یہ نظریہ ان تمام بوقلمونیوں کو قدرت کی صناعی کا حیران کن کرشمہ قرار دینے کے بجائے محض اتفاقات و حوادث کا نتیجہ یا ماحولی جبر کا شاخسانہ قرار دیتا ہے اور مظاہر قدرت کے مشاہدات کا جو نتیجہ انسان کی ایمان پروری کی صورت میں رونما ہونا چاہیئے وہ رونما نہیں ہوتا اسکی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسے دنیا کے بہترین مصور کی بنائی ہوئی تصویروں کا البم کسی شخص کے ہاتھ لگ جائے مگر وہ اپنے تماشبینوں کو ہر تصویر الٹی کر کے دکھاتا ہے تو آپ کیا کہیں گے؟

عبدالاعلیٰ جمیل فیصل

اعمالِ تحقیق اور منصوبہ بندی

معاشیات، صنعت، تجارت، نقل و حمل اور زندگی کے دوسرے تقریباً تمام ہی شعبوں میں منصوبہ سازی اور لائحہ عمل کی تیاری ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اس کام میں ریاضی کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ زیرِ غور مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ایک ریاضیاتی نمونہ تیار کرتے ہیں جو تفاعلات (FUNCTION)، مساوات اور قالبوں (MATRICES) پر مشتمل ہوتا ہے۔ ریاضیاتی نمونہ (MODEL) کے مطالعہ و تجزیہ سے اخذ کردہ نتائج کی وضاحت متعلقہ منصوبہ کی ضروریات کی روشنی میں کی جاتی ہے۔

منصوبہ سازی کے کام (جس میں کئی علوم کے ماہرین کا اشتراک شامل ہوتا ہے) کو مندرجہ ذیل مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ منصوبہ کے مقاصد اور ضروریات کو غیر مبہم انداز میں سمجھنا اور تفصیلات کا واضح علم حاصل کرنا۔

۲۔ ریاضیاتی نمونہ (ماڈل) کی ایسی تشکیل جو منصوبہ کے تمام پہلوؤں کی بخوبی نمائندگی کرتا ہو۔

۳۔ ریاضیاتی تجزیہ کے بعد انسب (OPTIMAL) حل کا انتخاب۔

۴۔ جانچ پڑتال۔

۵۔ ریاضیاتی نتائج کی تشریح۔

پروگرام بندی یا منصوبہ سازی کا سارا زور اس بات پر ہوتا ہے کہ دیئے ہوئے محدود وسائل (RESOURCES) سے کم از کم لاگت پر زیادہ سے زیادہ منفعت کیونکر حاصل ہو۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران امریکہ اور برطانیہ میں اس سمت میں بہت کام ہوا۔ کیوں کہ حالتِ جنگ میں قدرتی طور پر قومی وسائل پر بہت زیادہ دباؤ پڑا اور ان کی فراہمی کے امکانات محدود ہوتے چلے گئے۔ مطالعہ و تحقیق کے اس کام کو اعمالی تحقیق (OPERATIONS RESEARCH) کا نام دیا گیا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد حکمتِ عملی طے کرنے کے ریاضیاتی طریقوں (DEVICES) اور نمونوں کا اطلاق صنعت و معیشت کے بے شمار دائروں میں کیا جانے لگا۔ دراصل اعمالی تحقیق

کا ہدف کسی مسئلہ میں موزوں ترین حل کی دریافت یا امثلیت کی تلاش (SEARCH OF OPTIMALITY) ہے۔ اور یہی چیز صنعت و پیداوار کی بنیادی ضرورت بھی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ دنیا میں اگرچہ چاروں طرف ہزاروں، لاکھوں مسائل نظر آتے ہیں لیکن مطالعہ و تجزیہ کرنے والوں کے لئے یہ بات قدرے اطمینان بخش ہے کہ بے شمار مسائل کو چند واضح نوعیتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ گویا مسائل و معاملات کے الگ الگ مشتملات (CONTENTS) پر نظر ڈالی جائے تو ہر مسئلہ اپنی جگہ منفرد اور جداگانہ نظر آئے گا لیکن نوعیت (FORM) کے اعتبار سے وہ چند ہی ہوں گے۔ چنانچہ پروگرام بندی (PROGRAMMING) کے لئے جو مسائل پیش ہوتے ہیں انھیں چند معروف درجوں (CATEGORIES) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مثلاً مسائل تفویض (ALLOCATION PROBLEMS)، خطی پروگرام بندی (LINEAR PROGRAMMING)، حرکی پروگرام بندی (DYNAMIC PROGRAMMING) وغیرہ۔ اسی طرح بہت سے مسائل نظریہ مقابلہ (GAME THEORY)، نظریہ مقدار اشیاء (INVENTORY THEORY) اور نظریہ قطار بندی کے اصولوں سے حل کئے جاتے ہیں۔ ان سب کے لئے الگ الگ ریاضیاتی نمونے اور علیحدہ تجزیاتی طریقہ کار موجود ہیں۔

مسائل وابستگی

(ASSIGNMENT PROBLEMS)

مسائل وابستگی دراصل مسائل تفویض کی ایک شاخ ہیں۔ وسائل کی لاتعداد کو مقاصد کی لاتعداد سے ایک اور ایک کی مطابقت میں، موزوں ترین مفاد کے حصول کے لئے کس طرح وابستہ کیا جائے، مسئلہ وابستگی کہلاتا ہے۔ مسئلہ کو مربع قالب (SQUARE MATRIX) کی شکل میں تحریر کیا جاتا ہے جسے قالب تاثیر (EFFECTIVENESS MATRIX) کہا جاتا ہے۔ مسئلہ وابستگی کو مسئلہ نقل و حرکت (TRANSPORTATION PROBLEM) کا ایک خصوصی انداز بھی کہا جا سکتا ہے جس میں وسائل کی لاتعداد کو منازل مقصود (DESTINATIONS) کی ما تعداد سے منسلک کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کسی مسئلہ وابستگی کو خطی پروگرام بندی کے نمونہ پر بھی ڈھالا جا سکتا ہے۔ ان سطور میں بہرحال صرف مسئلہ وابستگی کا براہ راست تعارف پیش کرنا مقصود ہے۔ ریاضیاتی طریقہ کار کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ قارئین خود بھی سوالات کو کاغذ پر ساتھ ساتھ حل کریں۔

ریاضی میں ترتیب و انتخاب (PERMUTATIONS & COMBINATIONS) کے مسائل معروف ہیں، مثلاً اس سادہ سے مسئلہ کو لیجئے کہ تین کتابوں کو تین خانوں میں کتنے طریقوں سے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ ضرب جزوی (FACTORIAL) عام قاعدہ سے مطلوبہ تعداد آسانی سے معلوم ہو جاتی ہے یعنی:

تین کتابوں کی تین خانوں میں ترتیبوں کی تعداد

= ۳!

= ۳×۲×۱

= ۶

ترتیب کے مختلف طریقوں کا عملی اظہار نقشہ ذیل یا چارٹ،

جدول یا درخت نما شکل (TREE DIAGRAM) سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ا، ب اور ج تین کتابیں ہیں تو ان کی ممکنہ ترتیبیں یہ ہوں گی :

اب ج ، اج ب

ب اج ، ب ج ا

ج اب ، ج ب ا

ظاہر ہے کہ اسی اصول پر ہم ۴ یا ۵ کتابوں کی ترتیب کا مسئلہ بھی حل کر سکتے ہیں۔ یعنی

۴ کتابوں کی ۴ خانوں میں ترتیبوں کی تعداد

= ۴!

= ۴ × ۳ × ۲ × ۱ = ۲۴

گویا ۴ کتابوں کو ۴ خانوں میں ترتیب دینے کے ۲۴ مختلف انداز ہو سکتے ہیں۔ اگر کتابوں کے نام ا، ب، ج، د ہوں تو ترتیبوں کا مظاہرہ ایک چارٹ بنا کر کیا جا سکتا ہے جس طرح تین کتابوں کے معاملہ میں ہم اوپر کر چکے ہیں۔ ان ترتیبوں کو آپ خود لکھیئے۔

(اب ج د، اب د ج، اد ب ج، اد ج ب وغیرہ)

اسی طرح ۵ کتابوں کے ۵ خانوں میں ترتیب دینے کے

طریقے = ۵!

= ۵ × ۴ × ۳ × ۲ × ۱

= ۱۲۰

آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ کتابوں کی تعداد میں اضافہ سے ان کی ترتیبوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ چنانچہ دس کتابوں کو دس خانوں میں ترتیب دینے کے۔

۱۰! = ۱۰ × ۹ × ۸ × ۷ × ۶ × ۵ × ۴ × ۳ × ۲ × ۱

= ۳۶،۲۸،۸۰۰) چھتیس لاکھ سے زائد طریقے ہیں۔ وہ طریقے کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب چارٹ، نقشہ، شجر، تصویر یا جدول کی مدد سے دینا بہت مشکل کام ہے کیوں کہ لاکھوں کی تعداد میں ترتیبوں کی نشاندہی کا کام بے حد وقت طلب اور طویل ہے۔

کتابوں کی ترتیب کے اس سادہ سے مسئلہ کو بہت آسانی سے عملی زندگی کے بہت سے دوسرے معاملات تک توسیع دی جا سکتی ہے مثلاً مختلف ہندسوں سے اعداد کی تیاری، اشیا کی ترتیب سے ڈیزائن بنانا، کانفرنس ہال میں مندوبین کے نشستوں کا تعین وغیرہ۔ اس قسم کے مسائل میں "موزوں ترین حل" گویا موزوں ترین ترتیب ہے۔ جو اسی وقت نظر آئے گی جب تقابل کے لئے تمام ممکنہ ترتیبیں موجود ہوں۔ اوپر کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک کام کو انجام دینے کے مختلف طریقوں کا حقیقی مظاہرہ اس انداز پر ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا جس طرح چار یا تین کتابوں کے معاملہ میں ہوتا ہے اس عملی دشواری سے نمٹنے کے لئے متبادل ریاضیاتی طریقے دریافت کئے گئے۔ جن میں سے ایک طریقہ وابستگی ہے جس کی وضاحت درج ذیل میں دی گئی مثالوں سے ہوتی ہے:

مثال ۱: خالد، اکرم، نسیم اور محمود کو چار مختلف کاموں میں سے ایک ایک کام تفویض کرنے کا موزوں ترین طریقہ دریافت کرو جبکہ ہر شخص کی چاروں کاموں کو انجام دینے کی الگ الگ مدت تکمیل (ہفتوں میں) مندرجہ ذیل مربع قالب کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے۔

کام / افراد	خالد	اکرم	نسیم	محمود
ا	۸	۲۶	۱۷	۱۱
ب	۱۳	۲۸	۴	۲۶
ج	۳۸	۱۹	۱۸	۱۵
د	۱۹	۲۶	۲۴	۱۰

(گویا خالد ا کام کو ۸ ہفتوں میں، ب کام کو ۱۳ ہفتوں میں مکمل کرے گا، علیٰ ہٰذا القیاس)

حل ۱: ۴ کارکنوں میں ۴ کاموں کی تقسیم (ایک کام فی کس)

۴! = ۴ × ۳ × ۲ × ۱ = ۲۴ طریقوں پر ہو سکتی ہے۔ ان میں سے قابل قبول موزوں ترین صورت وہ ہوگی جس میں مجموعی وقت کم از کم صرف ہو اور یہی مطلوب حل ہے۔ مطلوبہ حل تلاش کرنے کا طریقہ یہ ہوگا:

(۱) قالب (۱) کی ہر قطار میں سے اس کے سب سے چھوٹے عدد کو گھٹا دو (مثلاً پہلی قطار میں سے ۸ گھٹایا گیا ہے) پس ہمیں مندرجہ ذیل قالب حاصل ہوگا۔

قالب (۲)

صفر	۱۸	۹	۳
۹	۲۴	صفر	۲۲
۲۳	۴	۳	صفر
۹	۱۶	۱۴	صفر

(۲) اگر کسی قسم کا الجھاؤ نہ ہو تو صفر پر چوکور نشان ( ) گویا علامتِ وابستگی ہے۔ قالب (۲) میں کاموں کی تقسیم مکمل نہیں ہے کیوں کہ چوتھے کالم میں دو صفر آگئے اور یہ طے نہیں ہو سکا کہ ج اور د کاموں کو کس طرح تقسیم کیا جائے۔

(۳) عمل (۱) کی طرح قالب (۲) کے دوسرے کالم کے سب سے چھوٹے عدد یعنی ۴ کو کالم کے تمام اعداد میں سے گھٹا دو، چنانچہ ہمیں قالب (۳) حاصل ہوگا اور اب معمولی غور و فکر سے تمام وابستگیاں مکمل کی جا سکتی ہیں۔

قالب (۳)

	خالد	اکرم	نسیم	محمود
ا	صفر	۱۴	۹	۳
ب	۹	۲۰	صفر	۲۲
ج	۲۳	صفر	۳	صفر
د	۹	۱۲	۱۴	صفر

قالب (۳) سے ہمیں یہ معلوم ہوگیا کہ چاروں کام (ا، ب، ج، د) بالترتیب خالد، نسیم، اکرم اور محمود کو سپرد کئے جانے چاہئیں اور قالب (۱) کی رو سے اس طرح مجموعی طور پر چاروں افراد کے ۸ + ۱۹ + ۴ + ۱۰ = ۴۱ ہفتے صرف ہوں گے۔

اس طرح ۴ کارکنوں میں ۴ کاموں کی تقسیم کے ۲۴ طریقہ

میں مذکورہ طریقہ اس لحاظ سے انسب (OPTIMAL)
ہے کہ اس صورت میں وسائل (وقت بھی وسائل ہی کی ایک قسم
ہے) کا صرف کم از کم ہوگا۔ چنانچہ اس حل کے برعکس اگر چاروں
کاموں کو بالترتیب محمود، خالد، اکرم اور نسیم میں تقسیم کیا جائے تو مجموعی
وقت ۶۷ ہفتے بنتا ہے (۱۱ + ۱۳ + ۱۹ + ۲۴ = ۶۷) جو
ہمارے دریافت کردہ انسب حل سے بقدر ۲۶ ہفتے زیادہ ہے
اسی طرح دوسرے حل بھی بہتر نہیں ہو سکتے۔

مسائل وابستگی کو حل کرنے کے مذکورہ طریقے کی بنیاد
اس ثابت شدہ ریاضیاتی نظریہ پر مبنی ہے کہ اگر قالب تاثیر کے
کسی کالم یا قطار میں کوئی عدد جمع کر دیا جائے (یا گھٹا دیا جائے)
تو جو وابستگیاں پہلے قالب کی تاثیر کو قلیل ترین بناتی ہیں وہی
وابستگیاں دوسرے قالب کی تاثیر کو بھی قلیل ترین بنائیں گی۔

مثال ۲: ذیل میں دیئے گئے قالب سے وابستگیاں
معلوم کرو

۱۱	۱۳	۸	صفر	۵
۳	صفر	۱۵	۴	صفر
صفر	صفر	صفر	۵	۸
۷	۳	۲	۶	صفر
۸	صفر	۶	۵	۳

حل ۲: دیئے ہوئے قالب کے اگرچہ ہر کالم اور
ہر قطار میں صفر موجود ہیں مگر وابستگیاں واضح نہیں ہیں
ایسی صورت میں ہمارا یہ عمل ہوگا۔

عمل ۱: ایسی قطار دیکھو جس میں صرف ایک ہی صفر
ہو۔ اس صفر پر علامت وابستگی (☐) لگا دو۔ یہ صفر
جس کالم میں واقع ہو، اس کالم کے باقی تمام صفروں پر (اگر
ہوں تو) علامت تنسیخ (×) لگا دو ـــــ بالکل اسی طرح ایسے
کالم دیکھو جن میں صرف ایک صفر ہو۔ اس صفر پر نشان
(☐) لگا دو اور یہ صفر جس قطار میں واقع ہو اس
قطار کے بقیہ تمام صفروں پر (اگر ہوں تو) علامت (×)
لگا دو۔ اس طرح ہمیں مندرجہ ذیل قالب حاصل ہوگا۔

داہنی طرف سے پڑھیں

۱۰	۸	☐صفر	۵
×صفر	۱۵	۶	×صفر
×صفر	☐صفر	۵	۸
۲	۴	۶	☐صفر
☐صفر	۴	۵	۳

(وضاحت: پہلی قطار، چوتھی قطار اور پانچویں قطار
میں ایک ایک صفر ہیں، ان پر علامت (☐) لگا دی
گئی۔ یہ صفر چوتھی قطار کے پہلے کالم میں ہے، اس کالم میں
موجود دوسرے صفر پر علامت (×) لگا دی گئی ہے۔ اس
طرح پانچویں قطار کے چوتھے کالم میں دو زائد صفروں کو منسوخ
کر دیا گیا ـــــ اسی انداز پر تیسرے کالم میں صرف ایک
ہے، اس پر علامت (☐) لگانے کے بعد، اس صفر
قطار (جو تیسری ہے) کے زائد صفر کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قالب ۲ میں بھی وابستگیاں مکمل نہ
ہو سکیں چنانچہ اب یہ عمل کرنا ہوگا:

عمل (۲): ان قطاروں پر صحیح کا نشان (✓)
جن میں علامت (☐) موجود نہ ہو۔
(قطار ۲ ایسی ہے)، اُن کالموں پر بھی نشان (

لگادو جن میں نشان (✓) رکھنے والی قطاروں کے صفر موجود ہوں (کالم ۱، کالم ۴ ایسے ہیں)۔

اب ان قطاروں پر بھی نشان (✓) لگادو جن میں علامت وابستگی (▭) ایسے کالموں میں پڑتی ہو جن پر نشان (✓) ہو۔ چنانچہ ایسی قطاریں چوتھی اور پانچویں ہیں کیونکہ ان میں موجود علامت (▭) کالم ۱ اور کالم ۴ میں موجود ہیں جن پر نشان (✓) لگا ہوا ہے۔

ایسی قطاروں پر جن پر نشان (✓) نہ لگایا گیا ہو اور ایسے کالموں پر جن پر نشان (✓) لگایا گیا ہو، لکیریں کھینچو۔ (دیکھو قالب ۳)

(عمل ۳) : لکیروں کی زد سے بچنے والے اعداد میں سب سے چھوٹا عدد کو بچنے والے تمام اعداد میں سے تفریق کر دو اور ان اعداد میں جمع کرو جو لکیروں کے نقاط تقطیع (POINTS OF INTERSECTION) پر پڑتے ہوں۔ سب سے چھوٹا عدد ۳ ہے (بقیہ اعداد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی)۔

حل ۔ ۳ (اشارہ)

۶ شہروں میں ۶ ٹیموں کو (ایک ٹیم فی شہر) ضرب جزی کے اصول سے ۷۲۰ طریقوں سے روانہ کیا جا سکتا ہے (۶! = ۶×۵×۴×۳×۲×۱ = ۷۲۰) ان میں سے مناسب ترین حل دریافت کرنے کے لئے مسئلہ وابستگی کے طریقہ کار سے استفادہ کیجئے۔ مثال ۱ اور مثال ۲ کے عمل کو سامنے رکھئے جو اب یہ ہوگا۔

میڈیکل ٹیم	۱	۲	۳	۴	۵	۶
شہر	م	ب	ا	ج	ل	ن
فاصلہ	۲۵	۲۹	۲۷	۲۸	۲۶	۳۰

= ۱۸۵

اب تک جو مسائل زیر بحث آئے ہیں، ان سے پروگرام بندی کے اہم کام میں ریاضی کے طریقوں کی غیر معمولی ضرورت اور افادیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے ـــ سوال یہ ہے کہ سائنس کے "تسخیر کائنات" کے منصوبہ میں ریاضی کے خدمات سے کس حد تک استفادہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ استفادہ لامحدود ہے؟

"تسخیر کائنات" کا ایک عام مفہوم تو یہ ہے کہ انسان مادی اشیا کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے اور فائدوں کی نئی نئی راہیں تلاش کرے لیکن سائنس کی محیر العقول کامیابیوں' مصنوعی انسان کی تخلیق کے تجربات اور چاند ستاروں تک رسائی کے بعد گویا لامحدود کامیابی کا دروازہ کھل گیا، چنانچہ تسخیر کائنات کے منصوبہ کی تعریف اور اس کے مقاصد میں یہ تاثر بھی شامل ہو گیا ہے کہ ایک دن انسان موت و زندگی، بارش، چاند سورج، ہواؤں اور سمندروں کا کنٹرول خود سنبھالنے کے لائق ہو جائے گا کیا ایسا ممکن ہے؟ منصوبہ سازی کے جن بنیادی مراحل کا ذکر ہم نے مضمون کے آغاز میں کیا ہے، ان کی روشنی میں اس سوال کا جواب "نفی" میں ہے۔ دلائل بہت سادہ اور واضح ہیں:

(۱) کائنات پر موثر کنٹرول کے لئے تفصیلی علم ضروری ہے جبکہ حال یہ ہے کہ ۲۰ اشیاء کی ۲۰ خانوں میں ترتیب کی مختلف صورتوں کے تقابلی مشاہدہ (COMPARATIVE STUDY) کی استطاعت بھی میسر نہیں ہے۔

یوں کہ ان ترتیبوں کی تعداد تقریباً ڈھائی ملین ملین ملین ہے (۲۰! = ۲,۴۳۲,۹۰۲,۰۰۸,۱۷۶,۶۴۰,۰۰۰)۔ ان ترتیبوں کی الگ الگ وضاحت کے لئے ایک برقی حاسب (کمپیوٹر) کو تقریباً ڈھائی لاکھ سال کی مدت درکار ہوگی۔[1] منصوبہ سازی کے طریقہ کار میں پہلی بنیادی ضرورت منصوبہ کے مقاصد اور تفصیلات کا مکمل علم ہے۔ ایک انتہائی معمولی مسئلہ میں کثرت اختلاف کی یہ کیفیت ہے تو ظاہر ہے کائنات کے بکثرت مختلف عناصر، اسباب، مظاہر (PHENOMENA) اور نظاموں (SYSTEMS) کا تفصیلی مشاہدہ و علم انسان اپنی محدود صلاحیتوں سے حاصل نہیں کر سکتا۔

(۲) دراصل منصوبۂ تسخیر کائنات کی ریاضیاتی تشکیل کے لئے لامحدود علم کی ضرورت ہے اور اس راہ میں سب سے بڑی اور اولین رکاوٹ انسان کی "موت" ہے۔ غیر معمولی صلاحیتوں کے افراد کی تعداد پہلے ہی بہت کم ہوتی ہے اور یہ لوگ بھی اپنی عمر کا اچھا خاصہ حصہ حروف تہجی سیکھنے، دریافت شدہ علوم و حقائق سے واقفیت حاصل کرنے میں گذارنے کے بعد جب کچھ نئے حقائق دریافت کرتے ہیں تو موت جلد ہی ان کے کام کو منقطع کر دیتی ہے اور یوں علم، بصیرت اور مہارت کا ایک امکانی راستہ مسدود ہو جاتا ہے کیونکہ بسا اوقات دوسرے افراد تحقیق و تلاش کے اس کام کو امکانی راستہ مسدود ہو جانے یا افراد تحقیق و تلاش کے اس کام کو پوری رفتار سے آگے بڑھانے کے لائق نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کے بہت سے علوم و فنون عملاً معدوم ہو چکے ہیں اور ان علوم کی بنیاد پر اگر کوئی عملی کام کر لیا گیا تھا تو وہ آج عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ بہت سے علوم کو تاریخی حوادث اور قدرتی آفات کی لہریں بہا لے گئیں۔ آج اگرچہ علوم کی حفاظت و اشاعت کا غیر معمولی اہتمام ہے لیکن علوم کے لامحدود سلسلوں میں باہمی ربط ایک مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔

(۳) اگرچہ سائنس کی ایجادات غیر معمولی اور زبردست نظر آتی ہیں لیکن کائنات کی وسعت کے اعتبار سے ان کی اضافی حیثیت و اہمیت (RELATIVE POSITION) بہت حقیر ہے۔ چنانچہ "بکفایت" اور "بحفاظت" پرواز کا جو معیار ایک چڑیا کو حاصل ہے وہ ہوائی جہاز کو حاصل نہیں ہے۔ یہی حال دوسری ایجادات اور انکشافات کا ہے۔

(۴) اشیاء کے تفصیلی علم کے حصول کی راہ میں ایک رکاوٹ یہ بھی ہے کہ مقداروں کی سو فیصد درست پیمائش (MEASUREMENT) کے وسائل میسر نہیں ہیں چنانچہ مرکب اشیا کے اجزاء کے صحیح تناسب کا علم ناممکن ہے۔ بہت سے اجزائے ترکیبی کا وجود تو اتنا خفیف ہوتا ہے کہ ان کا ادراک بھی مشکل ہے علاوہ ازیں بنیادی عناصر اور مادہ (MATTER) کی تخلیق سے سائنس عاجز ہے۔

ان حالات میں تسخیر کائنات کے کسی ایسے منصوبہ کی تشکیل میں، جس کا مقصد کائنات پر کلی (ABSOLUTE) اختیار اور کنٹرول حاصل کرنا ہو، ریاضی کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا یہ منصوبہ ناقابل عمل ہے۔ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسی ہستی کا اعتراف کیا جائے جس کا علم لامحدود ہے:

"زمین میں جتنے درخت ہیں، اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے مزید سات سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی

اللہ کی باتیں (کلمات اللہ) لکھنے سے ختم نہ ہوں گی۔ بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ زندہ اٹھانا (اللہ کے لئے) بس ایسا ہے جیسے ایک متنفس کو! حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔" (القرآن، سورہ ۳۱)

تسخیر کائنات کی کوششوں میں انسان کس حد تک آگے جا سکتا ہے، اس کا تعین اسی وقت ہوگا جب انسان اس کائنات میں اپنے مقام، دائرہ اختیار اور حدود کار کا شعور حاصل کرے۔ اس طرح اس کی توانائیاں غلط رُخ میں ضائع نہ ہوں گی۔ مثلاً اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ موت و زندگی پر انسان کا کنٹرول ناممکن ہے تو پھر حیات انسانی پر ریسرچ کا انداز دوسرا ہوگا۔ چنانچہ شیشہ کی نلکی میں تخلیق انسانی سے متعلق تجربات کی غرض و غایت تخلیقی مراحل کا مطالعہ و مشاہدہ اور اس کی بنیاد پر علاج معالجہ کے نئے طریقوں کی دریافت قرار پائے گی نہ یہ کہ انسانوں کی پیدائش پر ایسا کنٹرول کہ ان کی کھیپ کی کھیپ کارخانوں میں تیار ہونے لگیں۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن کی کیمیائی ترکیب سے پانی بنتا ہے۔ اس تجربہ کو محدود پیمانے پر ہمیشہ کیا جا سکتا ہے لیکن کیا یہ تجرباتی حقیقت ہمیں بارش، دریا، چشموں سے پانی کے حصول سے بے نیاز کر سکتی ہے؟ اسی طرح شیشہ کی نلی میں انسانی تخلیق کے تجربات اور چاند تک کا سفر ہمیں اس دعویٰ کا اہل نہیں بناتے کہ ایک نہ ایک دن ہم مطلوبہ صلاحیتوں کے انسان مطلوبہ تعداد میں سائنسی کارخانوں میں تیار کر سکیں گے اور چاند ستاروں پر ہماری ایسی ہی عملداری ہوگی جیسی زمین پر ہے۔ یہ غلط فہمی دراصل "محدود" اور "لامحدود" کے فرق کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔

تسخیر کائنات کی کوششوں کو ہم دو سمتوں میں پھیلا سکتے ہیں، مطالعہ و مشاہدہ اور وسائل کائنات سے استفادہ کی نئی راہیں تلاش کرنا علاوہ ازیں محدود مقاصد رکھنے والے منصوبے ہی قابل عمل ہو سکتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کائنات ایک وسیع درسگاہ ہے۔ اس درسگاہ پر اصل اقتدار اور اختیار اس کے خالق کا ہے اور وہی معلم بھی ہے، اس کا علم لامحدود ہے اور انسانوں کو ان کی استعداد کے مطابق محدود علم عطا ہوتا ہے۔ انسان کو درسگاہ کے قواعد کے مطابق مختلف شعبوں میں مطالعہ و مشاہدہ اور درس گاہ کی سہولتوں سے استفادہ کی اجازت ہے۔ کامیاب انسان وہ ہیں جو اپنی مہلت عمر کو درسگاہ کی پابندی کرتے ہوئے گذارتے ہیں اور ان کا مطالعہ و مشاہدہ کائنات کے خالق کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا موجب ہوتا ہے۔ ان کا علم عجز و انکسار کا سبب بنتا ہے اور وہ اپنے محدود علم سے اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم اور لامحدود قوت و اختیار کو چیلنج نہیں کرتے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

محمد سعید مددگار پروفیسر
شعبہ طبیعات

نظریہ
ڈاکٹر عبدالسلام

۱۹۴۲ء میں آئن اسٹائن نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر ہانز موہسم Hans Muhsam کو لکھا کہ "مجھے ایک بڈھے آدمی کو ... اکثر لوگ خبطی سمجھتے ہیں جو اپنی جرابیں پہننا پسند نہیں کرتا۔ لیکن میں پہلے سے زیادہ مجنونانہ انداز میں وحدانی طبعی فیلڈ Unified Physical Field کے پرانے مسئلہ پر کام کر رہا ہوں اور ابھی تک پر امید ہوں کہ اسے حل کر لوں گا اس طرح لگتا ہے کہ میں آسمان میں ایک اڑنے والی مشین میں بیٹھا ہوا ہوں۔ لیکن زمین پر واپس اترنے کے متعلق کم ہی جانتا ہوں"۔

اس خط میں آئن اسٹائن نے جس مسئلہ کا ذکر کیا ہے اس پر اس نے اپنی زندگی کے آخری قیمتی ۳۵ سال صرف کر دیئے لیکن اسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہر طبیعات داں اور ریاضی داں کی یہ دلی آرزو ہوگی کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرے جبکہ شواہد یہ پیش گوئی کر رہے ہیں کہ اس سلسلے میں سہرا پاکستان کے ڈاکٹر عبدالسلام کے سر بندھے گا ڈاکٹر عبدالسلام کو طبیعات میں دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل پرائز اس مسئلے کے حل کی جانب قدم بڑھانے کے سلسلے میں ملا ہے۔

یہ مسئلہ کیا ہے؟ یہ مسئلہ بنیادی طور پر وحدتِ کائنات کا مسئلہ ہے۔ جو قبل از مسیح یونان کے فلسفیوں سے لے کر اب تک مختلف مراحل سے گزرتا ہوا ایک نئے موڑ پر آپہنچا ہے۔ سائنس اپنے مشاہدات اور دریافتوں سے یہی ثابت کرتی ہے۔ کہ کائنات اپنے تنوع (DIVERSITY) میں ایک وحدت ہے۔ جس میں موجود تمام مختلف مظاہر اور مادی اشیاء ایک دوسرے میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اشکال تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ان تبدیلیوں کی وجوہات اسی کائنات میں موجود ہوتی ہیں۔ یعنی کائنات میں بظاہر مختلف اور الگ تھلگ اشیاء، قوانین کے رشتوں میں ایک اکائی ہیں۔

حیاتیات میں ڈارون کا نظریہ اور ارتقاء کے دوسرے سائنسی نظریات (غیر نامیاتی سے نامیاتی اشکال، نامیاتی اشکال سے امینو ترشے AMINO ACIDS اور مرکزائی ترشے Nucleic Acids اور پھر ان سے زندگی کا آغاز) طبیعات میں آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت، کوانٹم میکانیات، مادے کے مہین ذرات پر تحقیق، فلسفے میں جدلیاتی، مادیت اور دوسری سماجی سائنس ایک ہی صداقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ کائنات ایک وحدت ہے جس کا وجود تبدیلی اور ارتقاء کا مرہون منت ہے۔

ناکامی کا مسئلہ تھا۔

تشاکل دراصل جوہری ذرات کی باہمی تبدیلی، باہمی عمل اور مادے کے بقا کے اصول کی کارفرمائی کی صورت ہے۔ تشاکل کو عام طور پر تناسب، موزونیت، باقاعدگی، تنظیم اور ترتیب کے نام دیئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سلام نے تشاکل کی ایک نئی شکل دریافت کی۔ متذکرہ بالا دونوں میدانوں کو ایک میدان قرار دینے کے نظریے کی بنیاد پر انہوں نے نیوٹرینو ذرے اور دوسرے ذرات کے مخصوص عمل جسے نیوٹرل کرنٹس NEUTRAL CURRENTS کا نام دیا جاتا ہے۔ کی پیش گوئی کی جس کی تصدیق تقریباً ۴ سال پہلے روس اور امریکہ میں جوہری ذرات کی توانائی بڑھانے والی مشینوں (ACCELERATORS) میں ایک ساتھ ہوئی اس طرح سلام وینبرگ نظریئے کا ثبوت مل گیا۔ جس کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام کو ۱۹۷۹ء کا طبیعیات کا نوبل انعام دیا گیا۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے اس نظریے کو مزید آگے بڑھایا ہے اور اب یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مضبوط میدان اور برقی کمزور میدان ایک ہی میدان کے دو نام ہیں۔ اس نظریئے کے ذریعے انہوں نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ پروٹان کے ٹوٹنے سے روشنی کے ذرات فوٹان وجود میں آتے ہیں۔ اس پیش گوئی کا عملی طور پر مشاہدہ کرنے کے لئے امریکہ میں ایک تجربہ کیا جا رہا ہے۔ جس میں ہزاروں ٹن پانی زمین میں بہت نیچے دبا دیا گیا ہے۔ ۴، ۵ سال میں کم از کم ایک پروٹان کے ٹوٹنے کا امکان ہے۔ (پروٹان کی زندگی 10^{30} سالوں سے بھی زیادہ ہے) پانی کے ساتھ ایسے آلات (PHOTOMULTIPLIERS) لگا دیئے گئے ہیں۔ جو فوٹان کی پیدائش کی اطلاع دیں گے۔

ڈاکٹر عبدالسلام آخری مرحلے میں تجاذبی میدان کو بھی ان تینوں میدانوں کے ساتھ ایک ہی میدان ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ ڈاکٹر عبدالسلام اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں۔ ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آئن اسٹائن کے دور کے مقابلے میں اس وقت سائنس نظری اور عملی لحاظ سے بہت آگے بڑھ چکی ہے اس لئے پرانے مسائل کے حل کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔

طبیعیات میں عملی تجربہ گاہ کے ساتھ ساتھ ریاضی نظری تجربہ گاہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ریاضی کے والی گروپ کے نظریئے کے اطلاق کے ذریعے Gell-Man گیل مین نے اومیگا منفی ذرہ دریافت کیا۔ عملی طور پر تجربہ گاہوں میں بعد میں دریافت کیا گیا۔ ریاضی طبیعیات کا ایک اہم حصہ بن چکی ہے۔ ایٹمی ذرات پر ریسرچ کے سلسلے میں گروپ تھیوری کا استعمال اور تشاکل کے نئے تصورات نے پرانے طریقہ کار ہی کو بدل ڈالا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نظری طبیعیات کے ماہر ہونے کے ساتھ اپنے تعلیمی ماحول میں ریاضی کے مضمون میں ہمیشہ نمایاں پوزیشن حاصل کرتے رہے ہیں۔ اور اب بھی ان کی گرفت اس پر مضبوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظری طبیعیات میں ان سے کامیابی کی امید قائم کی جا سکتی ہے۔

چاروں میدانوں کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی اہمیت آئن اسٹائن کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ طبیعیات کی نئی بنیادیں منظر عام پر آنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جو کئی مظاہر کی جانب ہمارے رویئے میں بنیادی تبدیلی لائے گی۔ اس نظریے کے مادی فوائد کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن یقیناً یہ کوشش غیر سودمند نہیں رہے گی فی الحال یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس کائنات کے مختلف مظاہر کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ انہیں اپنے لئے کر سکیں گے۔ اور اس طرح

آئن اسٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت میں زمان و مکان (TIME AND SPACE) کو باہم مربوط و متحد کر دیا اور تجاذبی میدان (GRAVITIONAL FIELD) کو مکان (SPACE) کا انحنا (CURVATURE) قرار دے کر ان کے اس طرح وابستہ کر دیا کہ یہ ایک اکائی کے مختلف پہلو بن گئے اس کے بعد برقی مقناطیسی میدان (ELECTROMAGNETIC FIELD) کو ایک ساتھ زمان و مکان کا حصہ ثابت کرنے ۔ دوسرے کو بھی زمان و مکان کی ایک خاصیت ظاہر کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی مختلف میدانوں کو ایک ثابت کرنے کے نظریئے کو وحدانی میدان کا نظریہ کہا جاتا ہے ۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اس وحدانی میدان کے نظریئے کی جانب ایک کامیابی حاصل کی ہے ۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے نظریئے سے پہلے چار وجود رکھتے تھے ۔

۱۔ تجاذبی میدان ۲۔ مضبوط میدان ۳۔ کمزور میدان

۴۔ برقی مقناطیسی میدان ۔

تجاذبی میدان کمیت (MASS) رکھنے والے اجسام کا میدان ہے جس کی وجہ سے زمین مختلف اشیا کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور سورج کے گرد چکر لگاتی ہے ۔ تمام ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کی باہمی کشش اور حرکت اسی میدان کا نتیجہ ہے ۔

مضبوط میدان مرکزائی جوہر میں موجود پروٹان اور نیوٹران ذرے سے متعلق ہے بلکہ کچھ دوسرے بھاری جوہری ذرات کا باہمی عمل ہو اس کی تعریف کے دائرہ میں آتا ہے اس کا وجود پروٹان اور نیوٹران ذرات سے بہت ہی کم فاصلے (۱۰⁻¹³ سم) تک رہتا ہے ۔

کمزور میدان تابکاری سے متعلق ہے یہ میدان ایک چھوٹے سے مگر زبردست توانائی کے حامل بے بار "NEUTRAL" ذرے نیوٹرینو ( ) کے ذریعے اپنے وجود کا اظہار کرتا ہے ۔

برقی مقناطیسی میدانی بار سے متعلق ہے ۔ اور برقیہ کا میدان اسی میدان کا براہِ راست اظہار ِ عام روشنی، لاشعاعوں، گاما شعاعوں، ریڈیو، ٹی وی ۔ کی لہروں میں ہوتا ہے ۔

اگر ریاضی کی ایک مساوات یا ایک نظریئے سے چاروں میدانوں کو ظاہر کر دیا جائے یا دوسرے الفاظ میں ان میدانوں کو ایک وحدت ثابت کر دیا جائے تو اس نظریئے کی گرفت میں کائنات کے ستاروں اور کہکشاؤں سے لے کر جوہر کے ذرات اور روشنی کی لہروں تک آجاتے ہیں ۔ اور ایک ایسے نظریئے ہی سے دنیا کے اکثر مظاہر کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے ۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے چند سال پہلے وائن برگ کے ساتھ مل کر یہ نظریہ پیش کیا کہ برقی مقناطیسی میدان اور کمزور میدان دراصل ایک ہی میدان ہے جسے کمزور برقی میدان کا نام دیا گیا ہے ۔

برقی مقناطیسی میدان اور کمزور میدان کے ایک ہونے کا نظریہ ایک مسئلے کے حل کے نتیجے میں وجود آیا ۔ یہ کچھ جوہری ذرات کے باہمی عمل میں دائیں بائیں کے تشاکل ( ) کے اصول جسے آئینے کے برعکس سے تشبیہہ دی جاتی ہے ۔ کی

بقیہ صفحہ نمبر ۴۱۴

محمد اشفاق خان
استاد شعبہ جغرافیہ

وسائل کے شعور کا ارتقاء

انسان صدیوں سے معاشرے کے فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا چلا آرہا ہے۔ انسان کی یہ زندگی بادشاہوں، فوجی آمروں اور مذہبی پیشواؤں کی جائز و ناجائز سختیوں اور مظالم سے گذرتی رہی ہے تاریخ تہذیب کے مختلف زمانوں میں اکثر انسان کے صرف چند گروپ کو آزادی حاصل ہوا کرتی تھی اس کی بہترین مثال رومی حکومت کے رومی شہریوں اور برصغیر میں ہندوؤں کی طبقاتی تقسیم ہے، ان حکومتوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ عوام کی بڑی تعداد غلاموں، محکوم انسانوں اور مجبور رعایا پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔

انسان اپنی تہذیب کا قافلہ آگے بڑھاتا رہا لیکن انسانیت کا چہرہ بگڑتا گیا، اس انسانیت کے بگڑتے ہوئے چہرے کو سنوارنے کے لئے ساتویں صدی عیسوی میں ہادی اسلام کی تعلیم نے شعور انسانیت بخشا، اصول زندگی اور عوام الناس کے حقوق کا صحیح معنوں میں پہلی مرتبہ عملی تصور عطا کیا، اس اصول زندگی میں خلیفہ وقت پر عام آدمی کو گرفت کرنے کا حق ملا، ہر شخص کو اپنے حق کے لئے خلیفہ وقت تک رسائی حاصل ہوتی، اسلام کی روشنی نے بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں کے آسمانی ہونے کے تصور کو پاش پاش کر دیا، یونانیوں کے تصوراتی علم کو مسلمانوں نے محفوظ کر کے ان پر تنقیدی نظر ڈالی اور علوم جدید کی راہیں ہموار کریں علما نے مفکرین نے سسکتی ہوئی انسانیت کو علمی شعور بخشا، اور یورپ کی ولادت ثانی کی بنیاد رکھی، مسلمانوں نے جو علم کی شمع روشن کی تھی اس نے انسان کو آہستہ آہستہ دریافت و ایجادات کی منزل کی طرف رہنمائی کے فرائض انجام دیئے جس کی بدولت انسان کو قدرتی ماحول کے مختلف عناصر کو کنٹرول کرنے کے طریقوں سے واقفیت ہوتی گئی، اور قدرتی وسائل کو پوری طرح اپنے استعمال میں لانے کا شعور پیدا ہوتا گیا، سائنسی علوم کی ترقی کے ساتھ قدرتی وسائل کی اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور دور جدید کے مختلف طریق استعمال کی دریافت نے قدرتی وسائل کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے انسان جس قدر اشیاء کے مختلف استعمالات سے واقف ہوتا رہا ہے اس کے ذہن میں انفرادی حقوق اور طاقت کا عقیدہ اس قدر پختہ ہوتا گیا۔ اور انسان آہستہ آہستہ ارتقائی و انقلابی عوامل کی حقیقت کو تسلیم کرتا گیا، اور اسی کے ساتھ ساتھ معاشی میدان میں بھی شخصی آزادی کی اہمیت بڑھتی گئی اور تجارت پر سے سرکاری تسلط ختم کر دیا گیا لیکن اصول اسلام سے ہٹ کر مختلف اقوام نے مختلف نظام فکر کی راہیں کھولیں اور معاشی میدان میں احتراز تجارت LAISES FAIR کا تصور پیدا ہوا اور آزاد تجارت و سرمایہ کاری Free Enterprise نے جگہ لینی شروع کی۔

عام آدمی نے سخت محنت کرنا شروع کی۔ ذاتی مفادات کی جستجو نے محنت اور کوشش کے ذریعہ معاشی مصروفیات میں حیرت انگیز توسیع کی اور نئے نئے معاشی دروازے کھولے، اس کی بدولت معیار زندگی میں غیر معمولی ترقی ہوئی اور یہ یقین کیا جانے لگا کہ عوامی بہبود کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ نجی تجارت اور سرمایہ کاری کی اجازت ہونی چاہیئے تاکہ بے خود غرضانہ مفادات کی مزید کوشش ہو سکے اس طرح تقابلی قوت خود بخود معاشرتی و نجی مفادات کے درمیان توازن پیدا کر دے گی۔ یہ مغربی تصور اگرچہ بہت معقول نظر آتا ہے لیکن اس نے طبقاتی کشمکش کو جنم دیا اور حکومت سرمایہ کار اور محنت کار کے نئے طبقے پیدا کئے۔

ان معاشی نظریات نے انیسویں صدی کے آخر تک ترقی یافتہ دنیا پر تسلط جمائے رکھا، ۱۸۹۰ء کے قریب مشہور ماہر معاشیات الفریڈ مارشل

نے اس رجحان کو توڑا اور بعد میں بیگو ماہر معاشیات نے بہبود معاشیات کا نظریہ دیکر مارشل کے مقصد کو آگے بڑھایا لیکن سب سے زیادہ پر اثر تنقید جان مینارڈ کینز نے کی۔

مارشل نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ شخصی مفاد معاشرتی اور حکومتی مفادات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں شخصی مفاد کا پیشہ عوامی بہبود کی ضمانت نہیں دے سکتا کیونکہ شخصی مفادات کا فرق صرف قدرتی وسائل میں پنہاں ہوتا ہے یہ سوسائٹی کے اساسی املاک میں خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے مثلاً تراب SOIL جنگل، معدنیات اور آبی وسائل وغیرہ جب کہ تجارت بازار کاری کے رجحان پر مبنی ہوتی ہے اس کا مفاد محدود ہوتا ہے، اس کی عرض مختصر مدت اور فوری منافع پر منحصر ہوتی ہے، اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ ایک لکڑی کے تاجر کا مفاد اس میں ہوتا ہے کہ وہ بلا امتیاز پٹہ شدہ جنگل سے لکڑی زیادہ سے زیادہ درختوں کو کاٹ کر حاصل کرے وہ مشکل ہی سے یہ سوچے گا کہ بلا امتیاز درختوں کو کاٹنے سے تراب اور آب و ہوا پر کیا اثرات ہو سکتے ہیں اور درختوں کے کی صفائی سے پورے علاقے کی معیشت پر کون سے اچھے یا برے اثرات مرتب ہوں جب کہ اساسی املاک تراب جنگل، معدنیات، پانی، صحت اور تعلیم کی دیکھ بھال کے لئے منصوبے اور پروگرام زیادہ ضروری ہوتے ہیں، ایسے منصوبے زیادہ تر بڑے ہوتے ہیں اور کئی سالوں پر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں یہ کثیر اخراجات کے طالب ہوتے ہیں جبکہ ایسے منصوبوں سے فوری فائدہ حاصل نہیں ہو پاتا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کے پروگرام مرتب کرنے میں فرد واحد کی کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی جب کہ ایسے منصوبے سوسائٹی کی بہبود سے تعلق رکھتے ہیں اسلئے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ آزاد اور تقابلی تجارت میں سوسائٹی کے بنیادی اثاثے لازماً ناقص استعمال کا شکار ہونگے یا نظر انداز کئے جائینگے

مارشل نے دلائل کی روشنی میں اس بات پر زور دیا کہ حکومت کو باقاعدہ عوام الناس کے لئے پالیسی تشکیل دینی چاہئیے اور معاشی میدان میں اس کا دخل ہونا چاہیئے تاکہ عوام کے معاشرتی مفادات کی نگہبانی اور معاونت ہو سکے اور حکومت کو یہ ذمہ داری خود لینی چاہیئے مارشل کے اس نظریہ نے قدیم احترازی تقابلی OLD ECONOMIC DOCTRINE OF LAISES FAIRE کے خلاف قوموں میں بیداری پیدا کی اور یہ اصول تسلیم کیا گیا جس کی وجہ سے ہر حکومت وسائل کے متعلق باشعور ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کے علاوہ مارشل کے فوراً بعد دو عالمی جنگوں نے مادی وسائل کے احساس کو مزید تقویت دی۔ جدید دور میں جنگ کا انحصار ملک کے وسائل کو بہتر اور مکمل استعمال میں لانے پر ہوتا ہے۔ اور جنگ کے دوران فوجی تعداد اور معاشی استعداد اہم معنی ہوتے ہیں لیکن زمانہ امن میں معاشی مسائل کو حل کرنا اہم ترین قومی تحفظ کی ضمانت سمجھا جاتا اب اسلئے قوم کو وسائل کا شعور لازمی ہونا چاہیئے۔ آج کی دنیا میں عوام الناس کا حکومت کی ذمہ داریوں کے متعلق طرز فکر بالکل تبدیل ہو چکا ہے، ہر حکومت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ عوام کے معاشی اور معاشرتی مفادات کا تحفظ کرے اور عوام کی بہبود کے لئے منصوبے بنائے۔ چاہے نظام حکومت کوئی بھی ہو مفاد عامہ کی حفاظت اولین فرض ہوتا ہے:

جمہوری طرز حکومت میں ایک طرف بڑی بڑی کاروباری کارپوریشنیں وجود میں آتی ہیں تو دوسری طرف اسی کے ساتھ مزدور انجمنوں کا ارتقا بھی عمل میں آتا ہے جو تقابلی رجحان کو کم کرتے ہیں۔ آج کے معاشرے میں آزاد تجارتی تقابل شاذ و نادر ہی ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ تقابل نے اپنی قوت شعار کافی حد تک ضائع کر دی ہے جس کے باعث معاشرہ کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے، اس لئے سوسائٹی کے تحفظ کے لئے حکومت کو وسائل سے متعلق شعور اور احساس رکھنا ضروری ہوتا ہے، سوشلزم میں ذاتی کاروبار کی اجازت نہیں ہوتی اس لئے حکومت قابل ترقی وسائل کو استعمال میں لانے کی خود ذمہ داری لیتی ہے، عوام کو سوشلزم میں اپنی خواہش کے مطابق معاشی زندگی اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اور نہ ہی ضرورت کو ذاتی بنایا جا سکتا ہے اس لئے حکومت عوام کی ضرورت کا خود فیصلہ کر کے وسائل کو کام میں لاتی ہے جب کہ جمہوریت میں فرد اور حکومت دونوں پر کچھ حقوق اور فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اور وسائل کے استعمال کے مواقع فراہم کرنا جمہوری حکومت کا فرض

ہوتا ہے بہرحال آج کی دنیا میں کوئی بھی حکومت ہو منصوبوں کی تشکیل اور وسائل کے متعلق احساس ضروری ہوتا ہے اور منصوبے وسائل کے احساس کی عکاسی کرتے ہیں۔

وسائل کی تعریف: ٹسیرمان

وسائل کی تعریف یوں کرتا ہے کہ مقررہ مقاصد کو حاصل کرنے کے ذرائع کو وسائل کہتے ہیں۔ مثلاً انفرادی طلب اور اجتماعی اغراض وغیرہ، جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ وسائل انسان کی احتیاجات کو مطمئن کرتے ہیں چاہئے وہ ایک شخص کی طلب ہو یا پورے معاشرے کی احتیاجات چونکہ یہ احتیاجات کو مطمئن کرتے ہیں اسلئے ان میں اپنی افادیت ہوتی ہے، پانی، ہوا، روشنی، زمین، جنگلات، کوئلہ اور شنری وغیرہ قابل استعمال اشیاء ہیں اس لئے یہ تمام وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وسائل کا انسان سے تعلق ہوتا ہے اور یہ وظائفی Function ہوتے ہیں۔ یہ صرف مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور یہ مقاصد انسانی احتیاجات کو مطمئن کرتے ہیں۔ کوئی بھی چیز جو انسان کی طلب کو جب تک پورا کرنے کی سبب ہوتی ہے وہ وسائل کی حیثیت رکھتی ہے دوسرے الفاظ میں اسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب کوئی بھی چیز انسان سے اپنا وظائفی تعلق پیدا کر لیتی ہے تو اسے وسائل کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اسے مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئلے کا وسائل میں اسلئے شمار ہوتا ہے کیونکہ یہ انسان کی ایک مطلوبہ خواہش کو پورا کرتا ہے تاکہ اسلئے کہ اس کا رنگ اجزائے ترکیبی اور شکل مخصوص قسم کا ہے، قبل از تاریخ کے انسانوں کے لئے زمین میں دبے ہوئے عظیم معدنی ذخائر مثلاً پٹرول، کوئلہ اور لوہا وغیرہ کی کوئی اہمیت نہ تھی کیونکہ وہ ان کے استعمال سے ناواقف تھے اور ان کی وقوع پذیری OCCURENCE ان کے لئے مثبت یا منفی اثرات سے خالی تھی اس وقت ان کے لئے یہ غیر استعمالی اشیاء تھیں اس لئے یہ وسائل کی حیثیت نہیں رکھتے تھے لیکن آج یہ چیزیں انسان کے لئے کتنی ناگزیر شیاء ہو گئی ہیں اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے یہ تمام اشیاء آج کے معاشرے میں اپنے وظائف کی وجہ سے انسان کی بہبود کی ذمہ دار ہیں۔ یہ انسان کی احتیاجات کو پوری کرتی ہیں اسلئے یہ سب وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اب تک کی بات چیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اشیاء کے وظائف ہی ہیں جو ایک غیر متعلق شے کو وسائل میں تبدیل کر دیتے ہیں اور وسائل کا یہ وظائفی یا عملی پہلو غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اس لئے اس بنیاد پر وسائل کے دو بنیادی کوائف واضح ہوئے ہیں

(۱) افادی Utility

(۲) وظائفی Function - Ability

ہم وسائل کی زیادہ صاف تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ کسی مخصوص وقت اور مقام پر وہ تمام قابل العمل استعمالی ذرائع جو انفرادی یا معاشرتی ضرورت کو پورا کرتے ہیں وہ وسائل کہلاتے ہیں

وظائفی پہلو کی تشریح

وسائل کی تشریح مثال سے یوں کی جا سکتی ہے کہ فرض کیجئے پاکستان میں کوئلے کی قسم ایک ہزار ملین ٹن ہے جو پاکستان کے مختلف علاقوں میں منقسم ہے اور چند ذخائر سے صرف ڈیڑھ ملین ٹن سالانہ کوئلہ نکالا جاتا ہے لیکن دوسرے بہت سے معلوم ذخائر پر کوئی کام نہیں ہو رہا لیکن ضرورت پڑنے پر انہیں استعمال میں لایا جا سکتا ہے، ان حالات میں پاکستان میں کوئلہ کے ذخائر صرف ڈیڑھ ملین ہی نہیں ہیں اور نہ ہی صرف کانکنی والی کانیں وسائل ہیں بلکہ وہ کل ایک ہزار ملین ٹن کا شمار وسائل میں ہوگا جو اب تک معلوم کئے جا چکے ہیں لیکن فی الحال تکنیکی معلومات کی کمی یا سماجی اور سیاسی وجوہات کی بناء پر صرف چند کوئلہ کی کانوں پر کام کیا جا سکتا ہے، ایسی صورت میں باقی ذخیرے مجہول مواد NATURALSTUFFS کہلائیں گے نہ کہ وسائل، اس مثال سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ وسائل میں صرف حقیقی وظیفہ Function ہی نہیں ہوتا بلکہ وظائفی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔

یہ وظائفی صلاحیت Function Ability وقتاً فوقتاً مختلف ہو سکتی ہے اور یہ فرق مقاماتی تفرق کے باعث واضح ہو سکتا ہے مثلاً پاکستان میں دریائے سندھ، چین میں دریائے زرد متحدہ امریکہ میں

ٹینسی اور بھارت میں دمودر چند سال پیشتر تک اپنی تباہ کاری کی بدولت ایک بھیانک تصور پیش کرتے تھے لیکن ان پر ڈیموں کی تعمیر نے معاشی، سیاسی اور تمدنی مثبت اثرات مرتب کرکے انہیں زیادہ اہم بنا دیا ہے، ان دریاؤں پر انسان نے کنٹرول حاصل کرکے توانائی اور زرعی مقاصد حاصل کئے ہیں اور ماہی پروری اور دیگر فوائد حاصل کر لئے گئے ہیں، اس وجہ سے ان دریاؤں کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے اس بنا پر مذکورہ دریا اپنے اپنے ملک کے لئے عمدہ وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ انسان نے ان کی وظائفی خصوصیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ ایک ہی چیز ایک جگہ بحیثیت وسائل وظائفی ہو لیکن دوسری جگہ وہی چیز مجہول مواد یا غیر وسائلی حیثیت رکھتی ہو مثلاً نیاگرا آبشار جو دریائے نیاگرا پر واقع ہے اور اسٹینڈلے آبشار جو کانگو دریا پر ہے لیکن نیاگرا آبشار سے حاصل ہونے والی بجلی نیو انگلینڈ کے بہت سے ٹیکسٹائل اور کاغذ کے کارخانوں کے لئے وسائل اہمیت رکھتی ہے جب کہ اسٹینڈلے آبشار سے پندرہ ہزار ملین پاور بجلی کی صرف نظری THEORITICAL اہمیت ہے چونکہ زائر کے موجودہ معاشی و معاشرتی حالات اسے تصرف میں لانے کی اجازت نہیں دیتے اس لئے اس پر وسائل کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

وسائل اور دولت کا تقابل:۔

وسائل اور دولت میں چیزوں کی مماثلت ملتی ہے، معاشیات میں کوئی بھی چیز جس میں تبادلہ کی قدر VALUE IN EXCHANGE پائی جائے وہ دولت کہلاتی ہے یہ مادی اور غیر مادی اشیاء ہو سکتی ہیں، اس کی تین اہم خصوصیات ہوتی ہیں۔

(۱) یہ افادیت رکھتی ہے۔

(۲) یہ کمیاب یا اس کی سپلائی محدود ہوتی ہے۔

(۳) یہ قابل انتقال یا بازار کار ہوتی ہے۔

زمین، عمارت، مشینری، حقوق رہن، اسٹاک اور حصص وغیرہ دولت میں شمار ہوتے ہیں لیکن سورج کی روشنی، ریت، ہوا اور پانی وغیرہ پر دولت کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ یہ کمیاب نہیں، تعلیم، معاشرتی ادارے، عمدہ حکومت اور علم وغیرہ کو دولت اس لئے نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ قابل انتقال نہیں ہوتے یا ان کی بازار کاری نہیں کی جا سکتی ہے، ایم، کینز کے الفاظ میں انسان کی احتیاجات کی تشفی کرنے والی وہ تمام رائج چیزیں جو تبادلہ کی استعداد رکھتی ہوں دولت ہوتی ہیں اسلئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ دولت کا تعلق انسان سے ہوتا ہے اس کے استعمال سے افادیت پیدا ہوتی ہے جیسے ایک ان پڑھ کے لئے کتابیں دولت نہیں ہو سکتیں چنانچہ وسائل کی طرح دولت کا بھی وظائفی پہلو ہوتا ہے

وسائل کا حصار SCOPE بالنسبت دولت کے زیادہ وسیع ہوتا ہے کیونکہ وہ تمام مادی اور غیر مادی ذرائع جو انسانی یا سماجی احتیاجات پوری کرتے ہوں وہ وسائل کہلاتے ہیں، اس کی دو اہم خصوصیات ہوتی ہیں۔

(۱) افادیت

(۲) وظائفیت

اس اعتبار سے زمین، عمارت، مشنری، حقوق رہن، حصص اور اسٹاک وغیرہ وسائل ہیں اس کے ساتھ ہی روشنی، زینت، ہوا، پہاڑ دریا، پانی، تعلیم، مفید سماجی ادارے، اچھی حکومت، صحت عامہ، علم، عمدہ قومی کردار اور ثقافت وغیرہ بھی وسائل کے زمرے میں آتے ہیں۔ کیونکہ ان سب میں وسائل کی خصوصیات پائی جاتی ہیں ان میں افادیت ہوتی ہے اور ان کے وظائف انسان کی بہبود سے تعلق رکھتے ہیں۔

وسائل کے ساتھ کمیابی، بازار کاری یا تبادلہ قدر کی خصوصیت نہیں لگائی جا سکتی اس کا اطلاق صرف دولت پر ہوتا ہے اور ماہرین معاشیات دولت کی تعریف کرتے وقت کمیابی اور تبادلہ قدر پر مخصوص زور دیتے ہیں، لیکن وسائل کے لئے ان خصوصیات کا ہونا ضروری نہیں۔ وسائل میں اس کے وظائفی پہلو پر زور ہوتا ہے کیونکہ افادیت استعمال میں پوشیدہ ہوتی ہے اس لئے کوئی ضروری نہیں کہ اس میں تبادلہ کی قدر واقع ہوئی ہو جو بھی چیز تبادلہ کی قدر رکھتی ہوگی وہ دولت ہوگی جب کہ کوئی بھی چیز ایک وقت اور ایک مقام پر انسانی احتیاجات کی تشفی کے لئے وظائفی حیثیت

رکھتی ہے وہ وسائل میں شمار ہوگی، وسائل انسان کے لئے مفید ہوتے ہیں لیکن دولت کے مفید یا نقصان کے دونوں پہلو ہو سکتے ہیں اس کا انحصار اثرات پر ہوتا ہے۔

وسائل مزاحمت اور مجہول مواد

Resourses, Resistance and neutral stuffs

علم اور جہالت، بلندی و پستی، نفع و نقصان اثاثے اور قرضے وغیرہ ایسے الفاظ کے جوڑے ہیں جو آپس میں منطقی رشتہ رکھتے ہیں اس طرح ذرائع اور مزاحمت کا بھی ایسے الفاظ ہیں جنہیں جدا نہیں کیا جا سکتا اس لئے جہاں کہیں وسائل ہوں گے وہاں مزاحمت بھی ہوگی قدرت ہمیں ایسی اشیاء فراہم کرتی ہے جو وسائلی وظائف رکھتی ہیں مثال کے طور پر زمین سے فصلیں، کوئلہ سے توانائی اور بارش سے نباتاتی نمو حاصل ہوتی ہے اور یہ سب ذرائع میں شمار ہوتے ہیں، قدرت کچھ نقصان دہ اور مزاحمتی طاقتوں کا بھی مظہر ہوتی ہے۔ مثلاً آندھی، ہر یکین، سیلاب اور بیماریاں وغیرہ یہ سب انسان کو نقصان پہنچاتے اور رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ ایسے عوامل کا شمار مزاحمت میں ہوتا ہے اس نقطۂ نظر سے انسان کا شمار بھی وسائل اور مزاحم میں ہوتا ہے تعلیم و تربیت، بہتر صحت، قومی اور سماجی رجحانات، اضافہ آبادی اور معاشرتی اخلاقیات وغیرہ وسائل ہوتے ہیں جب کہ جہالت، لالچ، کم یا زیادہ آبادی، نسلی ٹکراؤ، طبقاتی جدوجہد اور جنگ وغیرہ مزاحم سے تعلق رکھتے ہیں۔

ثقافت کے نقطۂ نظر سے آلات، مشینیں، اچھی حکومت، تجارتی سہولتیں اور مالیات، سائنسی تعلیم وغیرہ وسائل سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ قدیم آلات، ذاتی مفاد، کساد بازاری اور ناقص پالیسیاں وغیرہ مزاحم میں شمار ہوتے ہیں۔

کوئی بھی چیز جو انسان کو فائدہ پہنچاتے یا کوئی بھی چیز جو انسان کو بہبود کی طرف رہنمائی کرے اس پر وسائل کا اطلاق ہوتا ہے اس کے برعکس کوئی بھی چیز جو انسان کو نقصان پہنچائے یا اس کی راہ میں رکاوٹ بنے اسے مزاحم کہا جائے گا انسان کا اشیاء سے اپنی احتیاجات کی تسکین حاصل کرنے کو وسائل کا وظیفہ کہتے ہیں اس صدی کے انسان کا سب سے بڑا کارنامہ جوہری توانائی کی دریافت ہے جسے انسان نے خود حاصل کر کے وسائل کا درجہ عطا کیا ہے لیکن عالمی سیاسی سرد جنگ اس وسائل کی مزاحم بنی ہوئی ہے اس لئے جوہری توانائی کی افادیت کا انحصار مزاحم کے معیار سے تعلق رکھتا ہے۔

انسان پر وسائل کے جو مثبت یا منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ وسائل کی بہری منفرد قسم کی قدرتی خصوصیت ہے ایسی اشیاء مجہول ہوتی ہیں اسے ہم مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ قبل از تاریخ کا انسان کوئلہ کے استعمال اور اس کی افادیت سے بالکل واقف نہیں تھا اور اس قسم کے مواد کے واقع ہونے سے وہ بالکل بے خبر تھا چنانچہ اس کے لئے زیر زمین کوئلہ کا ذخیرہ نہ ہی وسائل تھے اور نہ ہی مزاحم، اس پر کوئلے کا کوئی اثر نہیں تھا اسلئے کوئلے کے ذخیرے مجہول مواد کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح لوہے کے ضخیم ٹکڑے جو سطح زمین پر پڑے ہوتے تھے انسان کی نظر میں ان کی کوئی وسائل کی حیثیت نہ تھی، اور جب تک انسان نے شکر کی تیاری کے طریقے سے واقفیت حاصل کرلی اس وقت تک دراب کو مجہول حیثیت حاصل رہی لیکن جب انسان نے ان اشیاء کی استعمالی افادیت معلوم کرلی تو یہی چیزیں وسائل کا درجہ حاصل کرگئیں، اسی طرح سمندری حرکات اور مدوجزر میں توانائی کی بہت بڑی مقدار پوشیدہ ہے مگر حصول کے طریقوں سے ناواقفیت ہونے کی بنا پر یہ صرف مجہول مواد کی حیثیت رکھتے ہیں

وسائل کی خصوصیات:۔

وسائل مادی اور غیر مادی ہوتے ہیں، وسائل محسوساتی اور غیر محسوساتی قسم کے ہوتے ہیں۔ کوئلہ، لوہا، پٹرول اور تانبا وغیرہ محسوساتی اشیاء ہیں بحیثیت وسائل ان کے کردار بہت اہم ہوتے ہیں اسی طرح غیر محسوساتی اشیاء صحت، سماجی یکجہتی، عمدہ پالیسیاں، علم اور آزادی وغیرہ وسائل میں اور ان سب کا بھی بحیثیت وسائل کردار بہت اہم ہوتا ہے کسی ایک وسیلے کو الگ کر کے مطالعہ ممکن نہیں ہوتا کیونکہ وسائل و ذرائع عاملین کے فعالی ردعمل

سکڑ جاتے ہیں جو انسان فطرت اور ثقافت کی شکل میں موجود ہوتے ہیں

محرک نظریہ وسائل
Dynamic Concept of Resources

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیارۂ زمین کا تمام مادہ مستقل ہے اور یہ موضوع قدرتی سائنس سے تعلق رکھتا ہے اس کی تشریح سے ہمیں کوئی تعلق نہیں لیکن اس زمین کا وہ مختصر حصہ جو انسان کے وسائل سے تعلق رکھتا ہے ہمیشہ تبدیل پذیر نظر آتا ہے کیونکہ وسائل پھیلتے اور سکڑتے رہتے ہیں، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وسائل وظائفی اور عاملی operational ہوتے ہیں، انسان کے علم اور صلاحیتوں میں اضافے کے ساتھ اشیاء کے وظائف بھی بڑھتے رہتے ہیں اور ان میں وسعت ہوتی رہتی ہے، درحقیقت اشیاء کے متعلق علم میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے اسلئے انسان مسلسل جبلی مادہ کو ایک کے بعد ایک وسائل میں تبدیل کرتا رہتا ہے اس طرح وہ اپنے وسائل کے خزانے کو بڑھاتا رہتا ہے انسان اپنے مفاد میں مسلسل کائنات کے پوشیدہ راز معلوم کرنے میں مصروف رہتا ہے جس کے باعث وسائل میں وسعت ہوتی جاتی ہے اور انسان کی ہر دریافت اور ایجاد وسائل میں اضافے کا باعث ہوتی ہے ابتدائی زمانوں میں دریا کو بحیثیت قدرتی مواصلات کے وسائل سمجھا جاتا تھا، لیکن جب انسان کو زراعت کیلئے آبپاشی کی ضرورت پیش آئی تو اس نے دریا سے زرعی مقاصد پورے کرنے شروع کئے اور جب علم میں مزید اضافہ ہوا تو انہیں دریاؤں سے توانائی بھی حاصل کی جانے لگی اس طرح جب ہم غور کرتے ہیں تو دریا کی حیثیت میں طبعی وسائل بہت زیادہ اضافہ نظر آتا ہے اور یہ صرف ایک وسائل کی وسعت پذیری کی مثال ہے مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی احتیاجات اور اس کی صلاحیتوں کو وسائل کی وسعت پذیری سے کسی طرح بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔

وسائل استعمال میں آنے سے سکڑتے ہیں اور لاپرواہی سے استعمال کرنے کے نتائج خراب نکلتے ہیں، اہم معدنی ملطوحات کو استعمال کر کے ہم ختم کرتے جا رہے ہیں اور پاکستان میں ہزاروں ایکڑ زمین محض غلط استعمال کی وجہ سے برباد ہو گئی ہے بلا سوچے سمجھے جنگلات کے استعمال نے صوبہ پنجاب اور سندھ میں زرعی زمین کو بڑے پیمانے پر نقصان پہنچایا ہے، اسی طرح جب مزاحمت میں اضافہ ہوتا ہے تو وسائل سکڑتے ہیں اور جنگ کے دوران وسائل ہمیشہ سکڑ جایا کرتے ہیں، طبقاتی اور نسلی کشمکش سے وسائل سکڑتے ہیں اس لئے جب کسی معاشرے میں طبقاتی اور نسلی کشمکش موجود ہوتی ہے تو وہاں وسائل محدود ہوتے چلے جاتے ہیں اور بہت سے وسائل اپنے فعالی کردار کھو دیتے ہیں۔

وسائل کی درجہ بندی Classification of Resources

وسائل کی درجہ بندی مندرجہ ذیل طریق پر کی جاتی ہے

(۱) ذاتی وسائل

(۲) قومی وسائل

(۳) عالمی وسائل

(۱) کسی بھی شخص کے نجی اثاثوں کو ذاتی وسائل کہتے ہیں یہ اثاثے نقدی، بینک بیلنس اور جائیداد کی مختلف شکلوں میں ہو سکتے ہیں ذاتی وسائل سے شخص کا اپنا کردار علم، ہنر اور صحت بھی وسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۲) قومی وسائل میں وہ انفرادی اور ذاتی وسائل شمار ہوتے ہیں جن کے کسی ایک ملک کے شہری مالک ہوتے ہیں، اس کے ساتھ قوم کی مجموعی ملکیت مثلاً عوامی پارک، سرکاری ریلوے، جنگلات، معدنی ملطوحات Mineral Deposits برقاب کی گنجائش Hydal Power capacity دریائی وادیوں پر سرکاری پروجیکٹ اچھی آب و ہوا، تراب، مفید نظام دریا، پہاڑ، اعلیٰ قومی کردار اور اچھی حکومت وغیرہ قومی وسائل کی اہمیت رکھتے ہیں اور وہ تمام چیزیں جو ملک کی ترقی اور بہبود کیلئے ممکن ہو سکتی ہیں قومی وسائل کے زمرے میں آتی ہیں۔

(۳) عالمی وسائل میں دنیا کے تمام وسائل شامل سمجھے جاتے ہیں اور وہ تمام مادی اور غیر مادی اشیاء جو انسان کی بہبود کے لئے ممکن ہو سکتی ہیں ان کا عالمی وسائل میں شمار ہوتا ہے اور جہاں کہیں وسائل ہوں گے وہاں مزاحمت بھی ہوگی اور انسانی بہبود انہیں عوامل کے باہمی تفاعل Interations کا نتیجہ ہوتے ہیں چنانچہ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وسائل میں انفرادی قومی اور عالمی مزاحمت ہو سکتی ہے

وسائل اور وسائل کے تخلیقی عاملین
Resource and Resource Creating Factors

اب تک کے بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وسائل

انفرادی اور سماجی بہبود کے حصول کے ذرائع ہیں اور فطری ماحول (NATURAL ENVIRONMENT) خود انسان اور انسان کی تخلیق کردہ ثقافتی مسائل ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک انسان کی بہبود کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اب ہم ان کے باہمی رشتے کو سمجھنے کے لئے ان کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں۔

فطری ماحول:۔ فطری ماحول خود وسائل ہوا کرتے ہیں اور بسا اوقات یہ تخلیق وسائل کے عامل بھی ہوتے ہیں فطری ماحول میں کرۂ ارض کی تمام چیزیں اس وقت شامل سمجھی جاتی ہیں جب تک وہ انسان کے اثرات سے محفوظ ہوتے ہیں مثال کے طور پر ہوا، پانی، قدرتی نباتات، معدنی ذخائر کوری تراب (VIRGIN SOIL) اور دریا وغیرہ فطری ماحول کے اجزاء ہیں یہ اپنی اصلی حالت میں بحیثیت وسائل قدرتی وظائف کا حصہ ہوتے ہیں وسعت کے اعتبار سے یہ محدود ہوتے ہیں۔ ہوا سے انسان کو آکسیجن ملتی ہے سورج سے انسان کا جسم فائدہ اٹھاتا ہے۔ پانی سے جنگلی پھل اور دیگر فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہ سب قدرتی وسائل کا حصہ ہوتے ہیں۔ قدرتی ماحول کے عناصر حیوانات اور پرندے بھی ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔

جب انسان اپنے ثقافتی ورثے میں کام لینا شروع کرتا ہے تو وہ فطری ماحول پر اپنے کام کرنے کی ابتدا کرتا ہے اس وقت وہ فطری ماحول سے مفید چیزیں حاصل کرتا ہے۔ کوئلہ اگرچہ قدرتی حالت میں ملتا ہے۔ لیکن اسے وسائلی وظائف میں شمار کرنے کے لئے انسان کو کان کھودنا اسے نکالنا اور بھٹی میں ڈالنا وغیرہ ضروری مراحل ہوتے ہیں۔ یہی کچھ زرعی فصلوں جنگلاتی پیداوار اور برقاب وغیرہ پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ اور اس میں انسان کی طلب اور مہارت کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قدرتی وسائل کا بہت کم حصہ آزادانہ وظائف کا حصہ ہوتا ہے درحقیقت قدرت طبعی اساس فراہم کرتی ہے۔ جس پر انسان اپنی جدوجہد کے فن کا مظاہرہ کرتا ہے

انسان:۔ ہم انسانی وسائل، انسانی طاقت اور محنت کش کی گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ لیکن حقیقت پر نظر نہیں ڈالتے کہ انسان توانائی اور مہارت کا نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔ اس لئے انسان خود ایک بہت بڑا وسائل ہے لیکن انسان بذات خود وسائل کی تخلیق کا زیادہ فعال عامل ہے۔

انسان کا وجود دو معیار پر واقع ہوا ہے اول حیوانی معیار زندگی دوم انسانی معیار زندگی حیوانی معیار زندگی میں انسان ثقافت سے فائدہ اٹھائے بغیر زندگی گزارتا ہے۔ مثلاً علم، مہارت اور آلات وغیرہ جو ثقافت کا ورثہ ہوتے ہیں اس سے حیوانی معیار زندگی میں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اس کی طلب فطری حد تک محدود ہوتی ہے اور انسان کا پرداز جزو قدرتی ماحول کے تابع رہتا ہے۔ وہ ہوا میں سانس لیتا ہے پانی اور قدرتی پھلوں سے زندگی گزارتا ہے وہ دراصل قدرتی وسائل کی مدد کا محتاج رہتا ہے۔ اس معیار زندگی میں بیماریاں اور جنگلی جانور انسان کے لئے مزاحمتیں ہوتی ہیں اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے قدرتی وسائل کی حیثیت مجہولی مواد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جنگل کے دوسرے حیوانوں کی طرح وہ بھی فطرت کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ لیکن آج کی دنیا میں ایسے انسان کا کوئی پتا نہیں ملتا انسان کی اپنی جدوجہد نے اسے انسانی معیار زندگی عطا کی ہے اس معیار زندگی میں ثقافت سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے یعنی وہ علم اور آلات اور مہارت کے ورثے کو استعمال میں لاتا ہے اس معیار زندگی میں انسان کی احتیاجات مختلف النوع ہوتی ہیں۔ اس کی ضرورتیں اپنے طبعی وجود کے لئے ہوتی ہیں۔ لیکن اسے راحت، آسائش اور تفریح بھی درکار ہوتی ہے۔ اس معیار پر اسے ثقافتی مدد بھی حاصل ہوتی ہے اس لئے وہ وسائل کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ اور انہیں اپنے تصرف میں بھی لاتا ہے۔ انسان قدرت کے فراہم کردہ وسائل سے وسائل کی تخلیق کرنے میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ اپنی ثقافت کی مدد کی بدولت قدرتی مزاحمتوں کا مقابلہ کر کے انہیں ختم کرتا ہے اور اپنی ثقافت کی مدد کے ذریعے مجہول مواد کو وسائل میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اس لئے

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اپنی احتیاجات اور ثقافت کی وجہ سے انسان وسائل کی تخلیق کا بہت بڑا عامل ہے۔ لیکن یہ ذہن نشین ہونا چاہئے کہ انسان کو تخلیق وسائل کے لیئے بڑی حد تک ثقافت اور فطرت پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ ثقافت انسان کا ہتھیار ہے اور فطرت اس کی اساس ہوتی ہے۔

ثقافت : (CULTURE) انسان کی تمام دریافت اور ایجادات ثقافت کے دائرے میں آتی ہیں۔ اسے زیادہ صحیح اور واضح الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان اور طبعی حالات کے مشترک عمل کے نتیجے کو ثقافت کہتے ہیں۔ علم، انسانی مہارت، آلات، مشین مواصلات اور سماجی ادارے وغیرہ ثقافت کی مثالیں ہیں۔ ہر ثقافتی چیز وسائل ہوتی ہے۔ اور یہ مزید وسائل کی تخلیق میں مدد کرتی ہے۔ یہ دراصل وسائل کا تخلیقی عمل ہوتا ہے۔ وسائل کی تخلیق اور ترقی کی رفتار کا انحصار ثقافت کی وسعت پر ہوتا ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ اعلیٰ انسانی ثقافت طبعی حقیقتوں کے وظائف پر مشتمل ہو۔ اس لیئے انسان اور اس کی ثقافت کے لیئے ضروری ہے کہ تخلیق وسائل کے لیے کوئی طبعی پس منظر موجود ہو اور یہ طبعی پس منظر قدرتی ماحول فراہم کرتا ہو۔ فطرت، انسان اور ثقافت کے باہمی تعامل سے وسائل تخلیق پاتے ہیں اور وہ انسان کے لیئے وظائفی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان، فطرت اور ثقافت تخلیق وسائل کے تین لازم وملزوم عوامل ہیں۔

مذکورہ بالا حقیقت کو مثال سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم زرعی پیداوار کے فصلی وسائل پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس کے لیئے ضروری ہے کہ فطرت نے زمین، آب وہوا اور پانی وغیرہ فراہم کر رکھا ہو یہ سب فطری ماحول کے اجزاء ہوں گے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی عنصر بھی بذات خود وظائف نہیں رکھتا ہے۔ لیکن جب انسان زمین کو تیار کرکے پانی کی رسد میں باقاعدگی پیدا کرلیتا ہے۔ اور اسے کاشت کے قابل بنا لیتا ہے تو اس میں وظائف کی خصوصیت پیدا ہوجاتی ہے اور یہ وسائل میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ کاشت کے لیئے ضروری ہوتا ہے کہ انسان بیج، بیل، آلات اور اپنے تجربات کو کام میں لائے جو اس کا ثقافتی ورثہ ہوتا ہے۔ اس لیئے زراعت کا بڑا حصہ انسان کی اپنی کارکردگی پر منحصر ہوتا ہے۔ اس مثال سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ثقافت انسان کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ اس لیئے زرعی پیداوار کے لیئے فطرت، انسان اور ثقافت تینوں ضروری ہوتے ہیں۔ ثقافت ایک ایسا مسلسل عمل ارتقا ہے۔ جو ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن جس قوم کی ثقافت کا ارتقا جہاں ٹھہر جاتا ہے۔ وہاں سے اس قوم کا زوال شروع ہوجاتا ہے اور ثقافت جس قدر ارتقائی منزلوں سے دور ہوگی وہ قوم اسی قدر پسماندہ ہوجائے گی۔

وسائل کے وظائف جگہ جگہ متفرق ہوتے ہیں

مندرجہ بالا مثال سے ہم بخوبی یہ محسوس کرسکتے ہیں کہ تینوں عوامل میں سے کوئی بھی عامل الگ الگ اپنا وظیفہ مکمل نہیں کرسکتا بلکہ یہ تینوں آپس میں منسلک ہوتے ہیں ان میں سے کسی ایک کو الگ کرکے کوئی مطالعہ مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کسی طبعی ماحولیات کے وظائف کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ تو اس میں انسان اور ثقافت کا حوالہ ضروری ہوتا ہے اسی طرح جب وسائل کے وظائف کی تخلیق کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو فطری ماحول اور ثقافت کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ کیونکہ وسائل کے وظائف، ماحول، ثقافت اور انسان کے اشتراک کا نتیجہ ہوتے ہیں یہ ایک قدرتی بات ہے کہ یہ اشتراک جگہ جگہ مختلف وقت میں مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیئے یہ قدرتی امر ہے کہ وسائلی وظائف تبدیل ہوتے رہتے ہیں اسی بنا پر معاشی معروفیات میں فرق پایا جاتا ہے۔

وسائل بحیثیت ایک الگ مطالعہ شاخ کے۔

معاشیات کی محدودیت :۔

(LIMITATIONS OF - ECONOMICS)

انسان، ثقافت اور فطرت کے عمل اشتراک کا نتیجہ

وسائل ہوتا ہے۔ اس اشتراک کو تکونیات کہتے ہیں۔ (TRINITY) کہہ سکتے ہیں اور فطری معاشیات (ECONOMIC THEORY) میں بھی یہ تکونیات زمین، مزدور، اور سرمایہ کی صورت میں نظر آتا ہے جنہیں عاملین پیدائش کہتے ہیں ایک زمانے تک وسائل کا مطالعہ عاملین پیدائش تک محدود رکھا جاتا تھا۔ اور انسان کی معاشی زندگی اور معروفیات کو سمجھنے کی غرض سے معیشت کے مطالعہ کے لئے چھوڑ رکھے گئے تھے لیکن معاشیات میں سرمایہ کار کے لئے یہ عوامل صرف آلات کی حیثیت سے زیر مطالعہ آتے تھے جہاں تک ان کی قیمتوں اور قدروں پر اثرات کا تعلق ہوتا تھا۔ ان کا مطالعہ مختصر مدت کے لئے محدود معنوں میں کیا جاتا تھا کیونکہ نجی سرمایہ کاران کا مطالعہ نفع بخش پیداوار کے نقطہ نظر سے کرتا تھا۔ اور اس نے وسائل کا انسان، فطرت اور ثقافت کے تناظر میں کبھی مطالعہ نہیں کیا۔ جبکہ انسانی معیشت کی معروفیات کا وسیع معیار انہیں پر ہوتا ہے۔ اور نہ ہی محدود معنوں میں ان عوامل کا اچھی طرح مطالعہ کیا گیا تاکہ فطرت اور اس کے کردار کو اچھی طرح سمجھا جا سکے۔ معاشیات ان عوامل کا محدود تناظر میں مطالعہ کرتی ہے۔ اور اس کا وسیع تر حصہ دوسرے طبعی و معاشرتی علوم کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔ مثلاً جغرافیہ، ارضیات، سماجیات اور سیاسیات، وغیرہ اس لئے عاملین پیدائش کے متعلق نامکمل اور محدود علم کی وجہ سے انسان کی معاشی معروفیات کے وسیع حصار کو سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔

روائتی معاشی جغرافیہ کی محدودیت :

(LIMITATION OF TRADITIONAL ECONOM-IC JEOGRAPHY)

معاشی جغرافیہ میں ہم دنیا کے مختلف حصوں میں وقوع پذیر ہونے والی انسان کی معاشی معروفیات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ کہاں اور کیوں انسان کی معاشی زندگی واقع ہوئی ہے۔ ماہر معاشی جغرافیہ کے لئے یہ بنیادی مواد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ماہر معاشی جغرافیہ انسان کی معاشی زندگی کو طبعی حقیقتوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انسان کی معاشی زندگی اور معروفیات کو وسائل کے مطالعہ سے سمجھنا چاہتا ہے وہ وسائل کا تجزیہ کرنے اور جائزہ لینے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے اور دنیا میں مختلف قسم کی پائی جانے والی معاشی معروفیات کے مثبت اور منفی عوامل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا مطالعہ مکمل نہیں ہوتا۔ کیونکہ معاشی جغرافیہ اس قدر قدامت پسند ہوتا ہے کہ وہ طبعی اساس سے باہر نہیں نکلتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ طبعی حقیقتوں کے خواص اور کردار کا بہت گہرا مطالعہ کرتا ہے کیونکہ جب وہ قدرتی اشیاء کو زیر بحث لاتا ہے مثلاً تراب وغیرہ تو وہ تراب کی زرخیزی، نقوشات (TOPOGRAFHY) اجزائے ترکیبی نباتات اور بہت سی اشیاء کا مطالعہ کرتا ہے لیکن وسائل کے کس حد تک وظائف ممکن ہو سکتے ہیں صرف طبعی خصوصیات پر ہی منحصر نہیں ہوتے بلکہ وسائل کے وظائف بہت سے دوسرے پیچیدہ عوامل سے مشروط ہوتے ہیں۔ مثلاً طلب، علم، تکنیک، سرمایہ، سماجی ادارے اور سرکاری پالیسیاں وغیرہ مختصر یہ کہ وسائل کے وظائف انسان اور ثقافت سے مشروط ہوتے ہیں وسائل کے وظائف ہمیشہ، فطرت، انسان اور ثقافت کے گرد گھومتے ہیں۔ اس لئے معاشی جغرافیہ میں وظائف کے پورے کوائف کی تشریح نہیں ہو پاتی۔

وسائل کا مطالعہ بحیثیت الگ ایک علمی شاخ کہ :

آج کل وسائل کا مطالعہ بحیثیت الگ مضمون کے ترقی پذیر ہے۔ یہ مطالعہ مختلف علمی شاخوں سے استفادے کی کوشش کرتا ہے۔ وسائل کا مطالعہ خصوصاً دو مقاصد کے تحت ترقی کر رہا ہے۔

(۱) دور حاضر میں ہر ملک یا قوم اپنے سیاسی حدود کے اندر وسائل میں گہری دلچسپی رکھتی ہے۔

(۲) ہر ملک اپنے وسائل کو انفرادی اور اجتماعی بہبود کے لئے ترقی دینا چاہتا ہے۔

اس قسم کے مطالعے سے دنیا کے مختلف حصوں میں پائی جانے والی معیشت اور معروفیات کو زیادہ واضح اور بہتر معیار پر سمجھا

بقیہ صفحہ ۴۰۱

محمد قادر حسین
لکچرار شعبہ طبیعیات

برہان بین السالماتی گرفت (مکمل نیا نظریہ)

خلاصہ

خلاصہ:-

سالمات کی درمیانی قوتوں کا علم مکمل نہیں ہے اس سلسلے میں ایک نیا تصور پیش کیا جا رہا ہے یہ فرض کیا گیا ہے کہ بین السالماتی قوت کشش الیکٹرونوں کی مخصوص گرفت کا نتیجہ ہے اس قوت کشش کا نام برہان بین السالماتی گرفت تجویز کیا گیا ہے اس کی تعریف درج ذیل ہے۔

"دو دی ہوئی نمکیات کے آمیزہ میں دو غیر ہم جنس سالمات کے درمیان بین السالماتی گرفت درج ذیل شرائط کے تحت وجود میں آتی ہے"

(۱) دونوں نمکیات کے سالمات کا ایسے دھاتی آئنوں پر مشتمل ہونا چاہیے جن کے بیرونی مدار غیر مستحکم ہوں

(۲) وہ دھاتیں جو ان نمکیات کی ترکیب میں موجود ہوں آزادانہ مائع حالت میں ایک دوسرے میں حل ہو جاتی ہوں

مثلاً $FeCl_3$ ... $CuCl_2$ کے جوڑے کو استعمال کرتے ہیں جس کے ذریعے برہان بین السالماتی گرفت کی نظری بنیاد پر تصدیق کی جاتی ہے۔ مذکورہ بالا مالیکیولس کے آئنوں میں پائے جانے والے الیکٹرونوں کی ترتیب کو تصویر (۱-۸) کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے Cu^{++} اور Fe^{++} آئنوں کے بیرونی مدار غیر مستحکم ہیں کیونکہ Fe بائی والنٹ (Bi Valent) اور ٹرائی والنٹ ہے اور Cu مونو والنٹ اور بائی والنٹ ہے اس لئے Fe^{++} اور Cu^{+} مزید ایک الیکٹرون کم کر کے Fe^{+++} اور Cu^{++} میں تبدیل ہو سکتے ہیں

یہ ایک عام اصول ہے کہ کسی ایٹم کے بیرونی مدار میں دو الیکٹرون ہوتے ہیں اگر اس سے پہلے کا مدار غیر مستحکم ہو کیونکہ Fe^{++} اور Cu^{++} آئنوں کے ایسے ہی مدار غیر مستحکم ہیں اس لئے ایٹموں کی طرح ان آئنوں کے بیرونی چوتھے مدار میں دو الیکٹرون واقع ہونے چاہیئں ایسے دو الیکٹرون جن میں سے ہر ایک Fe^{++} اور Cu^{++} کے تیسرے غیر مستحکم مدار --- حاصل ہوتا ہے ان کے چوتھے مدار میں اشتراک کرتے ہیں شکل (۸-۱) میں اس کو واضح کیا گیا ہے یہ فرض کیا گیا ہے کہ الیکٹرون کا یہ مشترک جوڑا غیر ہم جنس مائع $FeCl_3$ اور $CuCl_2$ کو باہم جوڑے ہوئے رکھتا ہے جب کہ یہ مائع حالت میں پائے جاتے ہیں اگرچہ قدرتی طور پر برہان بین السالماتی گرفت کیمیائی ہے تاہم یہ اتنی کمزور ہے کہ اسے صحیح معنی میں کیمیائی گرفت تصور نہیں کیا جاتا۔

اس گرفت کو درج ذیل فارمولے سے ظاہر

کیا جاتا ہے

$S.Fe \sim Cu.S.Cu$ جہاں الیکٹرونی گرفت کو ~ کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے

حقیقتاً ہمارا مقصد نیا نظریہ آمیختگی اور غیر آمیختگی کی تشکیل تھا تاکہ مختلف مائعات کے جوڑوں کے درمیان آمیختگی اور غیر آمیختگی کی نظری پیش گوئی کی جا سکے یہاں پر میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کا مختصر تذکرہ کیا جائے کیونکہ مذکورہ بالا گرفت اس نئے نظریہ کی بنیاد ہے جس کی پیشگوئی عملاً صحیح ثابت ہوئی ہیں جو نظریہ برہان بین السالماتی گرفت کا جواز ہے۔

یہ عام طور پر معلوم ہے کہ دو مختلف مائعات آمیختہ Miscible ہوں گے اگر دو غیر ہم جنس مالیکولس کی درمیانی قوت کشش اتنی مضبوط ہو کہ وہ ان کو نیز دل Phases میں علیحدہ ہونے کے عمل کو روک سکے۔

سابقہ نظریہ کے مطابق بین السالماتی قوتیں ۔

Inter molecular Forces

درج ذیل ہیں۔

i Attraction between Permanent Dipoles

ii Dispersion Forces

iii Co-ordinate Bonds

سالمات کے درمیان قوتوں کا علم کامل نہیں ہے اس لئے بین السالماتی قوتوں کے موجودہ علم کی بنیاد پر نئے نظریہ آمیختگی کی تشکیل ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہم نے مذکورہ بالا "بین السالماتی گرفت" کو فرض کیا ہے جس کی بنیاد پر نیا نظریہ آمیختگی تشکیل پاتا ہے

وضع نظریہ آمیختگی

یہ ذہن نشین ہونا چاہئے کہ یہ نیا نظریہ ایسے دھاتی مرکبات کے لئے استعمال ہو سکتا ہے جو دو دھاتی عناصر سے بنے ہوں مثلاً دیتر ر ۱۱/ اور UF_4 وغیرہ

آمیختگی کا نیا نظریہ درج ذیل ہے

دو مختلف دھاتی مرکبات برہان بین السالماتی گرفت کے باعث آمیختہ ہوں گے جو غیر ہم جنس مالیکولس کو جوڑے رکھنے کی طرف مائل رکھتی ہے۔

نظری پیش گوئیاں اور ان کی تجرباتی تصدیق۔

اب ہم اس نظریہ کی تصدیق کرتے ہیں کہ آیا اس کی نظریاتی پیش گوئیاں تجربات سے صحیح ثابت ہوتی ہیں یا کہ نہیں۔

مثال کے طور پر ہم دوبارہ دونوں مرکبات Cu_2S اور FeS پر غور کرتے ہیں جو ایسے دھاتی آئنوں Fe^{+2} اور Cu^{+2} سے بنتے ہیں جن کے بیرونی الیکٹرونی مدار غیر مستحکم ہیں جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے علاوہ ازیں آزاد حالت میں Fe اور Cu جو FeS اور Cu_2S کی بناوٹ میں موجود ہیں اور الگ الگ(?) مائع حالت میں آمیختہ Miscible ہیں، اسلئے FeS اور Cu_2S مائع حالت میں بڑھوالی بین السالماتی گرفت پانے کی وجہ سے آمیختہ ہوں گے۔ یہ پیش گوئی تجربے کے عین مطابق ہے اور نتیجتاً بین السالماتی گرفت کے فروغ کی تصدیق ہوتی ہے

بطور دوسری مثال دو مرکبات UO_2 اور

PuO_2 پر غور کرتے ہیں۔ ان کے دھاتی آئن U^{++++} اور Pu^{++++} کے بیرونی مدار غیر مستحکم ہیں کیونکہ یہ الیکٹرون کم کر کے U^{++++++} اور Pu^{++++++} میں تبدیل ہو سکتے ہیں اور آزادانہ حالت میں یورینیم اور پلوٹونیم جو UO_2 اور PuO_2 کی حالت میں موجود ہیں ایک دوسرے میں مائع حالت میں آمیختہ ہیں اس لئے UO_2 اور PuO_2 برہان بین السالماتی گرفت کے وجود میں آنے کے باعث آمیختہ ہوں گے یہ پیش گوئی تجربے عین مطابق ہے کیونکہ مذکورہ مرکبات نہ صرف مائع حالت میں بلکہ ٹھوس حالت میں بھی عملاً آمیختہ پائے گئے ہیں اس نتیجہ سے بھی برہان بین السالماتی گرفت کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ برہان بین السالماتی گرفت کے مفروضے کا صحیح جواز ہے۔ کیونکہ اس گرفت کی بنیاد پر کی گئیں پیش گوئیاں تجربات عین مطابق واقع ہوتی ہیں یہ مطابقت مذکورہ مفروضے کی ایک قوی تصدیق ہے۔

وضع نظریہ غیر آمیختگی

یہ یاد رہنا چاہیئے کہ اس نظریہ کا اطلاق ایسے دھاتی مرکبات پر ہوتا ہے جو دو عناصر پر مشتمل ہوتے ہیں مثلاً — Na_2S ، UF_4 ، PuO_2 وغیرہ نیا نظریہ آمیختگی حسب ذیل ہے

برہان بین السالماتی گرفت کی غیر موجودگی میں دو مرکبات مائع حالت میں غیر آمیختہ ہوں گے اگر غیر ہم جنس مالیکیولس کی درمیانی قوت کشش ثقلی یا سنٹری فیوگل قوت یا ان مرکبات کے ہم جنس مالیکولس کی درمیانی قوت کشش سے کم ہو۔

وہ تصورات جن پر نظریہ غیر آمیختگی قائم ہے بجائے خود واضح حقائق ہیں اس لئے ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی بنیاد پر دھاتی مرکبات کی غیر آمیختگی کے وجود کی پیش گوئیاں کی جا سکتی ہیں جن کی مزید تصدیق تجربات سے کی جا سکتی ہے

پیش گوئیاں اور تجرباتی تصدیق۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آیا نظری پیش گوئیاں تجربات کے عین مطابق ہیں کہ نہیں ہم Na_2S-Na_2S کے جوڑے کو بطور مثال استعمال کرتے ہیں سوڈیم سلفائیڈ Na_2S ان دو دھاتی آئنوں سے بنا ہے جن کا بیرونی الیکٹرونی مدار مستحکم ہے چونکہ Na^+ آئن کا Electronic configuration غیر عامل گیس ول Neon کے عین مطابق ہے اس لئے Na_2S اور NiS مائع حالت میں برہان بین السالماتی گرفت کے ذریعے جڑے نہیں رہ سکتے۔ اس کے علاوہ Na_2S نان پولر اور NiS پولر ہے اس لئے غیر ہم جنس ذریعے Na_2S - Na اور NiS — NiS کی درمیانی قوت کشش سے کم ہے اسطرح یہ جوڑا نظریہ آمیختگی کی دوسری شرط بھی پوری کرتا ہے اس لئے نظریہ کی پیش گوئی ہے کہ NiS اور Na_2S مائع حالت میں غیر آمیختہ ہوں گے یہ پیش گوئی بھی تجربے کے عین مطابق ہے کیونکہ یہ عملاً غیر آمیختہ پائے گئے ہیں۔

Uranium - 235 کا حصول اور نئے نظریات کا اطلاق:۔

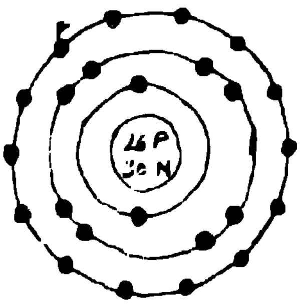
مذکورہ بالا نئے نظریات کے اطلاق سے بعض مرکبات کی نئی خاصیتیں دریافت ہوتی ہیں جن سے ایک ایسے نئے طریقہ کی نشاندہی ہو چکی ہے جو کہ Uranium 235 کو قدرتی یورینیم سے علیحدہ کرتا ہے راست اور انتہائی حساس تجربات سے تصدیق ہو چکی ہے

کہ اس طریقے سے یورینیم باآسانی علیحدہ ہو جاتی ہے ماہرین اور سائنسدان بھی اس حقیقت سے اتفاق کرتے ہیں۔ یہ طریقہ آسان، قابل عمل اور ارزاں ترین ہے۔ دیگر **gaseous diffusion** اور gaseous ultra **centrifuge** جیسے پرانے طریقوں سے بدرجہا اعلیٰ ترین نئی تکنیک سے مکمل اور صد فیصد خالص U-235 ایک ہی مرحلے میں علیحدہ ہوتی ہیں جبکہ پرانے طریقوں سے کئی ہزار مرحلے درکار ہوتے ہیں آلات بھی مارکیٹ میں دستیاب ہیں، جس سے U-235 تجارتی پیمانے پر حاصل ہو سکتا ہے۔ اندازاً ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے کے خرچ پر ۱۸ کلوگرام صد فیصد خالص یورینیم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کا نیا دور شروع ہوگا جہاں علیحدہ شدہ یورینیم U-235 سے سستی برقی توانائی پیدا کی جائے گی

نوٹ:۔

مذکورہ نظریات پر مشتمل مقالہ سو ستمبر ۱۹۷۹ء کو سالانہ کل پاکستان سائنس کانفرنس قائداعظم یونیورسٹی۔ اسلام آباد کے کیمیا کے شعبہ جاتی اجلاس میں پیش کیا گیا جس میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی جی تشریف فرما تھے جنہوں نے اسے اتفاق کرتے ہوئے پسندیدگی کا اظہار کیا۔

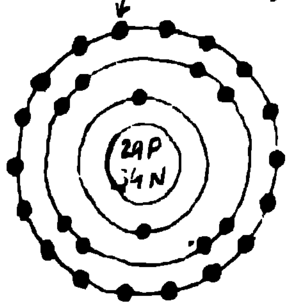
Third orbit (Unstable) Containing 14 electrons



(1·a)

F^{++} (Ferous ion) in —— FeS

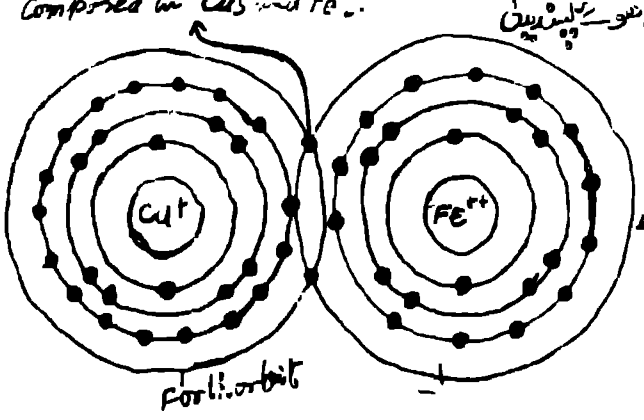
Third orbit (unstable) Containing 18 electrons



(1·a)

Cu^{+} (Cuperous ion) in Cu_2S

Pair of electrons being shared between the two ions, Cu^{+} and Fe^{++} composed in CuS and Fe..



Fourth orbit

Forth orbit

(1·b)

ممتاز بیگم
لکچرار شعبۂ نباتیات

الجی کی معاشی اہمیت

الجی کو عام اصطلاح میں کائی کہا جاتا ہے۔ یہ (THALLOPHYTA) سے تعلق رکھتی ہے۔ عالم نباتات کا تیسرا حصہ اس میں (THALLAPHYTE) پر مشتمل ہے۔ پودوں کا یہ گروہ سب سے ادنیٰ خیال کیا جاتا ہے الجی کے پودے دنیا میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ یعنی سمندر کی گہرائیوں سے لیکر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر بھی اس گروہ کی مختلف اقسام مل جاتی ہیں۔ تھیلس (THALLUS) دراصل پودوں کے ایسے جسم کو کہتے ہیں جس میں جڑوں۔ تنوں اور پتوں جیسے اعضاء کی تفریق نہ پائی جائے۔ ان میں کچھ پودے یک خلوی ہوتے ہیں جبکہ زیادہ تعداد کثیر خلوی پودوں ہی کی ہے۔ الجی (کائی) دراصل آبی پودے ہیں جو کثیر تعداد میں سمندروں، جوہڑوں اور ندیوں کے علاوہ یا گندے پانی میں پائے جاتے ہیں،

درختوں کی سایہ دار اور نم جگہوں پر، پھولوں کے گملوں، پرانے گھروں کی دیواروں، نم زمینوں یا چٹانوں پر بھی ان کی وجہ سے سبز رنگ کی تہہ بن جاتی ہے۔ دوسری انواع ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح پر سبز بالائی (SCUMS) سی بنا دیتی ہیں جو سمندر کے کنارے ہزاروں (SEA - WEEDS) دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سمندر کا بیشتر نباتاتی ذخیرہ الجی ہی پر مشتمل ہے۔

الجی میں اعلیٰ پودوں کی طرح سبز مایہ پایا جاتا ہے لہٰذا یہ بھی اعلیٰ پودوں کی طرح شعاعی تالیف کے ذریعہ اپنی غذا خود تیار کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر الجی کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

سائی اینوفائیسی (CYANOPHYCEAE)
نیلگوں سبز الجی

۲۔ کلوروفائیسی (CLAROPHYCEAE).
سبز الجی

۳۔ فی اوفائیسی (PHAEDPYHYCEA)
بھوری الجی

۴۔ رھوڈوفائیسی (RHODOPHYCEA)
سرخ الجی

اس کے علاوہ مختلف مصنفین نے مختلف مخصوص خصوصیات کی بنیاد پر اپنے اپنے طور پر بھی الجی کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر لیا ہے۔

نیلگوں سبز الجی کی معاشی اہمیت

یہ الجی کا بہت پرانا گروہ ہے۔ اور یہ ایسی جھیلوں وغیرہ میں اگتی ہے، جہاں چونے کے ذرات تہہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس گروہ کے بہت کم پودے جانوروں کی خوراک ہیں جب یہ دوسرے پودوں کے ساتھ اگ رہی ہوں تو مچھلیاں بھی اس کو شاذو نادر ہی بطور غذا استعمال کرتی ہیں اسطرح سے خوراک کے طور پر کم ہی استعمال ہوتے ہیں۔ زمین پر اگنے والی مختلف قسمیں زمین میں نامیاتی مرکبات کا اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ جس سے اس زمین کی زرخیزی بڑھ جاتی ہے۔ اور ایسے مقامات پر دوسرے جانداروں اور بیکٹیریا کو بہتر مواقع مل جاتے ہیں۔ اگر شہر کو مہیا کئے جانے والے پانی میں الجی سی ہو جائے تو اسمیں بکی بدبو آنے لگتی ہے۔ اس لئے پینے والے پانی میں الجی کی افزائش کو قابو میں رکھنا پڑتا ہے۔ تاکہ پانی پینے کے قابل رہے۔ اس گروہ کی چند انواع انسانی صحت کیلئے بھی نقصان

ہوتی ہیں۔ اگر ایسے پانی کو جانور پی لیں تو وہ ہلاک ہوجاتے ہیں۔
جمع شدہ پانی میں اس الجی پر قابو رکھنے کے لئے نیلے تھوتھے کی
تھوڑی سی مقدار کو حل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح تمام سبز خورد بینی
اجسام ختم ہوجاتے ہیں۔

سبز الجی

ماہرین نباتیات کے خیال کے مطابق تمام اعلیٰ پودے
سبز الجی سے ترقی کرکے موجودہ مقام تک پہنچے ہیں۔
معاشی طور پر سبز الجی کی اہمیت یہ ہے کہ یہی الجی
تمام آبی جانوروں کے لئے بہترین خوراک اور آکسیجن کا ذریعہ بنتی
ہے۔ یہ پودے شعاعی ترکیب کے دوران آکسیجن خارج کرتے ہیں۔
جس کو دوسرے آبی جانور سانس لینے کے لئے استعمال کرتے ہیں
یہی آکسیجن پانی میں حل ہوجاتی ہے۔ پھر وہاں سے آبی جانوروں
کے جسم میں جذب ہوجاتی ہے۔ دنیا کے تمام مچھلی کے فارموں
میں سبز الجی مچھلیوں کو خوراک اور آکسیجن مہیا کرتی ہے۔ سبز
الجی کی بعض انواع کو لوگ بلاواسطہ خوراک کے طور پر استعمال
کرتے ہیں۔ مثلاً الوا (ULUA) سپائیروگائیرا
(SPYROGYRA) اور اوڈوگونیم (OCE—
DOGONUEM —) وغیرہ سبز الجی بعض اوقات نیلگوں
سبز الجی کے ساتھ مل کر انسان کے لئے نقصان دہ بھی ہوجاتی
ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب پانی میں شامل ہوجائے ایسے
پانی کو صاف کرنا ضروری ہوتا ہے۔ زمین پر اگنے والی سبز الجی بھی
زمین پر رہنے والے جانوروں کے لئے خوراک کا ذریعہ بنتی ہے۔ پھر
ان کے گلنے سڑنے سے زمین میں نامیاتی مرکبات کی مقدار بھی بڑھ جاتی
ہے۔ جو اس زمین کی زرخیزی پر بھی اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

بھوری الجی

کیلپس کو انسانی خوراک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔
کیونکہ اسمیں بہت سے معدنی نمکیات ضروری وٹامن اور کاربوہائیڈریٹ
ز بھی اچھی خاصی مقدار ہوتی ہے۔ اسے سبزی کے طور پر بھی استعمال
کیا جاتا ہے۔ اور گوشت اور مچھلی کے ساتھ پکایا جاتا ہے۔ خاص کر
چین اور جاپان میں جہاں پر باقاعدہ گہرے پانی میں بانس گاڑ کر اگایا
جاتا ہے اور باقاعدہ فصل حاصل کی جاتی ہے مثال کے طور پر کامبو
(KAMBU) لیمینیریا (LAMINARIA)
سے حاصل کردہ خوراک جاپان میں خاص طور پر استعمال کی جاتی ہے
دوسری طرف صابن بنانے کے لئے بھی اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔

سرخ الجی

اگر اگر AGAR-AGAR جو کہ ایک جیلی نما واسطہ
(MEDIUM) ہے اور فنجائی اور بیکٹیریا کی مصنوعی
فصلوں میں بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے سرخ الجی ہی کی بہت سی
انواع سے تیار کیا جاتا ہے۔ عموماً اسے GELIDIUM کی مختلف
انواع سے حاصل کیا جاتا ہے، ان پودوں کو پانی کے ساتھ اُبالا جاتا ہے
جس سے ان کی جیلی علیحدہ ہوجاتی ہے۔ جیلی کے اس محلول کو چھان
کر علیحدہ کرلیا جاتا ہے جب یہ محلول ٹھنڈا ہوکر جم جاتا ہے۔ تو اس کے ٹکڑے
کاٹ لئے جاتے ہیں۔ جو خشک ہونے کے بعد بازار میں بھیج دیئے جاتے
ہیں۔ اگر کی سب سے زیادہ مقدار جاپان میں بنائی جاتی ہے۔
ایگر کو خوراک کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے اور ریشم
کو سخت کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ شراب کی صنعت
میں بھی کام آتی ہے۔ اکثر آئس کریم وغیرہ بنانے میں اور کپڑوں

کو کلف دینے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ سرخ الجی کے ایک اور پودے کینڈرس کرسپس (CHANDRUS CRISPOS) سے۔ ایک جیلی نما مادہ تیار کیا جاتا ہے۔ جو جوتوں کی پالش، ناخن پالش اور صابنوں کی صنعت میں استعمال ہوتا ہے۔ امریکہ میں اسے پڈنگ (---- PUDDING) بنانے کے کام میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

پارفائرا PARPHYRA کو یورپ اور جاپان کے بہت سے حصوں میں صابن سازی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

امریکہ میں سٹیران (SEATRON) ایک ایسی خوراک ہے جو نیری ڈاکسٹس (NEREOTYO TIS) کی ڈنڈلوں اور ہوائی تھیلوں سے تیار کی جاتی ہے اور بڑا مقبول ہو رہی ہے کیونکہ سمندری الجی میں اشعائی ترکیب کی کل مقدار زمین پر موجود پودوں میں اس عمل کی مقدار سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اسلئے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ بڑھتی ہوئی خوراک کا مسئلہ سمندری فصلوں سے حل ہو سکتا ہے۔ امریکہ میں ڈاکٹر این ملے، اوڈنیل (A.N.DONEIL) نے لیمنن (LAMINAN) سے جو کہ وہاں کے (KELPS) کیلپس میں بہت زیادہ مقدار میں ملتا ہے۔ (HEPANIS) سے ملتے جلتے چند مرکبات تیار کئے ہیں۔ یہ ایسا کیمیاوی مادہ ہے۔ جو آجکل ڈاکٹر اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کسی مریض کے دل کا یا خون کی نالی کا اپریشن کیا جاتا ہے (KELPS) میں چونکہ ایوڈین اور پوٹاشیم کی خاصی مقدار موجود ہوتی ہے۔ اس لئے یہ چیزیں ان سے بڑے پیمانے پر نکال لی جاتی ہیں۔ چونکہ دنیا میں زمین میں پوٹاشیم کی مقدار کافی کم ہے۔ اس لئے KELPO سے کھاد بھی بنائی جاتی ہے ان پودوں کی بہت سی اقسام سمندری جہازوں کے پیچھے سے لگ کر اس کی رفتار میں بے ترتیبی کا سبب بن جاتی ہیں۔

غرضیکہ الجی اپنی بے شمار خوبیوں کی وجہ سے دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے میں خاص مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اس پر مزید تحقیق جاری ہے اور مستقبل قریب میں نئے نئے انکشافات اس کی اہمیت کو بڑھاتے چلے جائیں گے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے افادی پہلو پر زیادہ سے زیادہ وقت صرف کر کے اُسے انسانیت کی خدمت کے لئے استعمال کیا جائے۔

بقیہ

فطرت پر قابو پانے کی جدوجہد۔ جو سائنس کی حقیقی معنوں میں جدوجہد ہے، ہمیں کامیابیاں حاصل کر سکیں گے نئی دریافتوں، نظریات اور تصورات تک پہنچنے میں وحدانی میدان کا نظریہ کئی رکاوٹوں کو دور کرے گا۔

یہ نظریہ کوئی حرف آخر نہیں ہوگا نئے مسائل نئے میدان، نئے مشاہدات، نئی دریافتیں سائنس کے بہتر سے بہتر ہوتے ہوئے اوزار اور نئی ایجادات اس سے زیادہ عمومی اور بہتر نظریئے پیش کرتے رہیں گے۔ انسان کی ذہنی اور عملی محنت کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتی رہے گی۔

وسیم احمد لیکچرار
حیاتی کیمیا

لحمیات

لحمیات کو ۱۸۳۹ء میں سب سے پہلے ملڈر نے دریافت کیا اس کا نام PROTEIN - یونانی زبان کے لفظ PROTEIOS سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ابتدائی ہے۔ لحمیات کثیر الارکان پیچیدہ مرکبات ہیں جن میں کثیر پیپٹائیڈ بندوں کے ذریعے مختلف کثیر امینو ترشے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں۔ لحمیاتی سالمے نشاستے اور گلائیکوجن کی طرح بہت بڑے ہوتے ہیں اور لسوئیت کے درجے میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا سالمی وزن تقریباً ۶ ڈالٹن سے ۶۰۰۰۰۰۰۰ ڈالٹن تک ہوتا ہے۔ پانی، ہلکے تیزاب اور اساس، ہلکے تعدیلی نمکیاتی محلول، یوریا اور گلیسرین میں حل پذیر ہیں، حرارت سے کچھ لحمیات کے سالمے غیر حل پذیر ہو کر منجمد DEAGULATE ہو جاتے ہیں

ایشیا میں خصوصاً پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش وغیرہ میں افلاس اور ناخواندگی کی وجہ سے غذا کی طرف توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ جبکہ صحت اور تندرستی کیلئے غذا میں توازن ضروری ہے۔ ایک صحت مند آدمی کی غذا میں تقریباً ... گرام لحمیات .. گرام شحمیات اور تقریباً ۴۶۵ گرام شکریات ہونا چاہئے یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب مختلف اشیاء میں لحمیات، شحمیات اور شکریات کی کل مقدار معلوم ہو۔ انڈوں میں ٪۱۲ر۷ سے ٪۱۷ر۰ تک سرسوں ٪۲ر۳، مولی میں ٪۱ر۲، چقندر میں ٪۱ر۶ فیصد، گاجر میں ٪۱ر۲ سے ٪۵ر۶ تک، مرغی میں ٪۲۰ سے ٪۳۰ تک، ہری مرچ میں ٪۱ر۲، مٹر میں ٪۴ر۲ سے ٪۶ر۷ تک، خشک مٹر میں ٪۲۲ر۵، سویابین میں ٪۳۵، پھول گوبھی میں ٪۴ر۳، الطخ ٪۱۶، گوشت میں ٪۲۲ - ۲۷، سیم میں ٪۶ر۶، آلو میں ٪۱ر۱، شلغم میں ٪۲ر۷، چاول میں ٪۷ر۵، گیہوں کے آٹے میں ٪۱ر۷، ڈبل روٹی میں ٪۸ر۴، دودھ میں ٪۳ر۳، ٹماٹر ٪۱، پالک ٪۵ر۱، بند گوبھی میں ٪۸ر۱، کیلا ٪۱ر۱ لحمیات موجود ہوتی ہے۔

لحمیاتی مرکب بیس مختلف قسم کے امینو ترشوں سے مل کر بنتا ہے۔ امینو ترشے کے یہ سالمے مختلف لحمیات میں کئی سو سے کئی ہزار سالمے تک موجود ہوتے ہیں۔

لحمیات کے طبعی اور کیمیائی خواص کو مدنظر رکھ کر ان کی درجہ بندی تین گروہوں میں کی گئی ہے:

الف۔ سادہ لحمیات: وہ لحمیات جن کی آب پاشیدگی میں صرف امینو ترشے حاصل ہوتے ہیں۔ سادہ لحمیات کہلاتی ہیں مثلاً انڈوں کا البیومن، خون کے گلوبیولن

ب۔ سنجوگی لحمیات (Conjugated proteins)

وہ لحمیات جن کی آب پاشیدگی سے امینو ترشے کے علاوہ
شکریات، شحمیات، مرکزائی ترشے، فاسفورس ترشے
وغیرہ حاصل ہوں، سنجوک لحمیات کہلاتی ہیں۔ مثلاً
ہیموگلوبن دودھ کی کیسین (Casein)
(۳) ماخوذ لحمیات (Derived Protein) وہ لحمیات
جو لحمیات کے آب پاشیدہ ہو کر امینو ترشے میں
تبدیل ہونے کے مراحل کے دوران حاصل ہوتی ہیں
ماخوذ لحمیات کہلاتی ہیں مثلاً پیپٹون، لحمیات کا ہر
گروہ کئی درجوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

غذا میں موجود لحمیات منہ سے گزر کر
معدے میں پہنچتی ہے جہاں خامرہ پیپسن (Pepsin)
کو لحمیات کو پروٹیوزز (Proteose) اور پیپٹون
میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اب لحمیات، پروٹیوزز اور
پیپٹون معدے سے نکل کر آنتوں میں پہنچتے
ہیں جہاں لبلبے سے آنیوالا خامرہ ٹرپسن اور کیموٹرپسن
(Chymotrypsin) عمل کر کے کثیر پیپٹائیڈ اور
دو پیپٹائیڈ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لبلبے سے آنیوالا
ایک اور خامرہ کاربوا پیپٹائڈیز (Carboxy - Peptidase)
کاربوکسلک گروپ رکھنے والے
کثیر پیپٹائیڈ پر عمل کر کے انہیں زیریں پیپٹائیڈ اور
امینو ترشے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جبکہ چھوٹی آنتوں
سے موجود خامرہ امائنو پیپٹیڈیز (Amino Peptidase)
اور ڈائی پیپٹیڈیز (Dipeptidase) آزاد امائنو
گروہ والے کثیر پیپٹائیڈ اور ڈائی پیپٹائیڈ پر عمل
کر کے ان کو آزاد امینو ترشے میں تبدیل کر دیتا ہے
یہ امینو ترشے آنتوں سے خون کی چھوٹی چھوٹی نالیوں
میں جذب ہو کر جسم کے ہر خلیے میں پہنچ جاتے ہیں۔

جہاں یہ جسم کی ضروریات کے مطابق مختلف اقسام
کی لحمیات کی تیاری میں استعمال ہوتے ہیں۔
بچوں میں لحمیات کی ضروریات بڑوں کے مقابلے میں زیادہ
ہوتی ہے کیونکہ ان کے مختلف اعضاء کی نشوونما میں لحمیات
اہم کردار ۔۔۔۔ ادا کرتی ہے جبکہ خواتین میں
دودھ پلانے کے دوران لحمیات زیادہ مقدار میں
ہونی چاہیئے۔ لحمیات انسانی جسم میں خلیے کی ساخت
بنانے میں استعمال ہوتیں ہیں۔ کیونکہ بافتوں کی ٹوٹ
پھوٹ جسم میں ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اور لحمیات کے
بغیر نئی بافتیں نہیں بنتی ہیں۔ لحمیات انسانی جسم میں بطور
کئی فعل انجام دیتی ہے۔ اور بحیثیت خامرے
کئی حیاتی کیمیائی تعاملات لحمیات کی مدد سے مکمل
ہوتے ہیں لحمیات خون میں ایلبومن ۷.۵-۷.۴/۱۰۰ ملی لیٹر
سیرم گلوبیولن ۲.۵-۱.۳/۱۰۰ ملی لیٹر سیرم فائبر
نوجن (Fibrinogen) ۰.۶۴-۰.۴ ۶/۱۰۰ ملی لیٹر
پلازما ہیموگلوبن میں ۱۸-۱۲ گرام/۱۰۰ ملی لیٹر
موجود ہوتی ہے۔ جہاں یہ بطور (Carrier) متعلقہ
چیزوں کی نقل و حمل میں، بحیثیت (Antibody)
مختلف بیماریوں کی روک تھام میں، بحیثیت (Coagulant)
(Factor) زخمی ہونے کی صورت میں اس حصے کے خون
کو جما کر خون کے بہنے کی روک تھام میں اور بحیثیت
(Respiratory pigment) کے نظام تنفس
کے عمل میں استعمال ہوتی ہے۔ شکریات اور شحمیات
کی کمی کی صورت میں لحمیات توانائی پہنچاتی ہے
اسکے علاوہ لحمیات انسانی جسم میں غیر لحمیاتی نائٹروجن
(Non-proteinic Nitrogenous compound)
مثلاً کریٹین، میلانین (Melanin) کریٹنین اور

اور کریٹینن پیورین اور پائس اساسی (Bound Guanidine base) کو ٹا تھا یون اور ہم قا مرسے (KOENZY MIES) بناتی ہے۔ یہ سب چیزیں انسانی صحت کیلئے بے حد ضروری ہیں اور ان کی کمی سے صحت اور تندرستی متاثر ہوتی ہے۔ بچپن میں لحمیات کی کمی سے قد چھوٹا رہ جاتا ہے۔

غذا میں لحمیات کی کمی سے کوالشور کار (Kwashiorkor) ہو جاتی ہے۔ جس کے دوران خون میں فولاد کی کمی (Anaemia) اور بگڑ پڑا (EDEMA) ہو جاتا ہے۔ غذا میں لحمیات کی کمی سے جگر کے خلیے کے ٹوٹنے کا عمل (Liver cell damage) اور بعض حالات شش تپ دق ہو جاتی ہے۔ بیک وقت لحمیات اور شکریات کی کمی سے، اسمس (MARASMUS) نامی بیماری ہو جاتی ہے جسمیں جگر کچھ بڑھ جاتا ہے اور بالوں اور جلد میں تبدیلی ہونے لگتی ہے تھکاوٹ (Fatigue)، وزن میں کمی، ذخموں کا دیر میں بھرنا بیماری کے بعد کافی عرصے میں صحت مند ہونا، بے چینی اور غذا میں لحمیات کی کمی کی ابتدائی علامات ہیں۔ پیشاب میں عام طور سے لحمیات نہیں ہوتی ہے۔ (NEPHROTIC Syndrome) میں پیشاب میں لحمیات موجود ہوتی ہے۔ ایک گرام لحمیات سے تقریباً ۴ء۱ حرارت توانائی ایک گرام شحمیات سے ۴ء۱ حرارت توانائی اور ایک گرام شحمیات سے تقریباً ۹ء۲ حرارت توانائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک عام مرد کو ۲۷ ـــ ۳۰۰۰ حرارت توانائی اور ایک نوجوان عورت کو ۲۲ ـــ ۲۷۰۰ حرارت توانائی درکار ہوتی ہے اور اس توانائی کو حاصل کرنے کیلئے متوازن غذا کھانا بے حد ضروری ہے۔

بقیہ

جا سکتا ہے درحقیقت انسان کی معاشی زندگی تخلیق وسائل اور اس کے استعمال کی مصروفیات کو ظاہر کرتی ہیں لیکن تخلیق وسائل اور وسائل کے وظائف تکوینیات کے نتائج ہوتے ہیں اور ان تکوینیات میں مقاماتی اور وقتی تفرق ہوتا ہے۔ جس سے معاشی مصروفیات کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے کسی بھی مقام کے معاشی مصروفیات کے مطالعہ دراصل اس جگہ وسائل، وظائف اور عمل کا مطالعہ ہوتا ہے۔

وسائل کے مطالعہ سے ہمیں بنیادی وسائل کی خصوصیت کردار، اور وظائفیت کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہے۔ مثلاً قدرتی وسائل، انسانی وسائل اور ثقافتی وسائل وغیرہ یہ سب ترقیاتی منصوبہ بندی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ یہ مطالعہ ہمیں فطرت انسانی اور ثقافت کے متفرق اشتراک کے نتائج سے واقف کرتا ہے اور دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کی معاشی زندگی اور مصروفیات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

شاہد جمال لیکچرار شعبہ شماریات

شُماریات

عہدِ قدیم سے ـــــــ عہدِ جدید تک

تاریخی لحاظ سے شماریات انگریزی لفظ (STATISTICS) یا لاطینی لفظ (STATUS) یا اطالوی لفظ (STATISTA) یا جرمن لفظ (STATISTIK) سے اخذ کیا گیا ہے۔ ان تمام الفاظ میں اپنی اپنی زبان میں ایک ہی مطلب ہے۔ اور وہ ہے "سیاسی ریاست" (POLI-TICAL STATE)

شماریات بحیثیت مضمون کے بہت قدیم نہیں لیکن اس علم کے استعمال کی سوجھ بوجھ اس وقت سے پائی جاتی ہے۔ جب سے دنیا عالم وجود میں آئی ریاست کا تصور لوگوں کے ذہن میں آیا۔

درحقیقت شماریات کا ماخذ پرانے زمانے کے بادشاہ ہیں کیونکہ سب سے پہلے یہ بادشاہوں کے علم کے طور پر پیدا ہوا۔ بادشاہ اپنی مادی اور افرادی قوت کا اندازہ کرنے کے لیے حقائق دریافت کرتے اور انہیں اعداد و شمار کے ذریعے ظاہر کرتے تھے۔ جنگ یا ہنگامی صورت میں ان اعداد کی روشنی میں فیصلہ کر لیتے تھے کہ وہ کتنی فوج اور دیگر قوت اکٹھی کر سکتے ہیں۔ اور انہیں کس طرح بہترین طریقے پر استعمال کر سکتے ہیں اور آئندہ کی منصوبہ بندی اسی لحاظ سے کرتے تھے۔

دنیا میں دولت اور مردم شماری (POPUL-ATION CENSUS) کا قدیم ترین اندازہ مصر میں ۳۰۵۰ ق۔م میں کیا گیا تھا۔ کیونکہ اہرام مصر کی تعمیر کے وقت اس وقت کے فراعنہ نے اعداد و شمار اور دیگر حقائق اس غرض سے اکھٹے کیے کہ اہرام تعمیر کیے جا سکیں۔ اس غرض سے انہوں نے فنی ماہرین، غیر تربیت یافتہ لوگوں کی تعداد افرادی قوت، مطلوبہ سامان کی مقدار، تعمیر پر اٹھنے والے اخراجات کا الگ الگ جائزہ لیا۔ اور اس کے لیے مجموعی طور پر اعداد و شمار اکٹھے کیے گئے۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ ROMES II نے ۱۴۰۰ ق۔م میں ملک بھر کی زمین (CENSUSES) کی۔ اس قسم کی مردم شماری قرون وسطیٰ میں انگلستان، جرمنی اور دیگر یورپی ممالک میں بھی کی گئی۔ ایسی مردم شماری کا مقصد افرادی قوت، ملک کے قدرتی ذرائع کا اندازہ اور زمین کی تقسیم ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں شمارات CENSUSES ٹیکس نافذ کرنے اور جنگ کی منصوبہ بندی کرنے اور زمین کی تقسیم کرنے کے لیے کیے جاتے تھے مگر کوئی منظم طریقے پر نہیں۔

اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ

غیر منقسم ہندوستان شماریات کے شعبہ میں کافی ترقی
یافتہ تھا۔ ملک کے انتظامی امور کے متعلق اعداد و شمار
اکٹھا کرنے کا طریقہ ہندوؤں کے عہد میں خصوصاً
خاندان موریہ کے دور میں کافی ترقی کر چکا تھا۔ مغل
بادشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں تقسیم زمین اور انتظامی
امور کی بجا آوری کے لئے اعداد و شمار کا ایک وسیع اور
مفصّل طریقۂ کار اختیار کیا گیا تھا۔ جس کا ثبوت ہمیں
عہدِ اکبری کی مشہور تصنیف "آئینِ اکبری" سے ملتا
ہے۔ یہ مشہور کتاب دراصل ہندوستان کا ایک شماریاتی
جائزہ ہے۔ اکبر اور شیر شاہ سوری کے عہد میں زمین
کا مالیہ۔ اس کی مجموعی پیداوار اور قیمتوں کے تناسب
سے وصول کیا جاتا اور اس کا انحصار قیمتوں اور فصلوں
کی پیداوار کے شماریاتی گوشواروں پر ہوا کرتا تھا۔
سولہویں صدی میں ہیئت داں، ستاروں
STARS سیّاروں PLANETS اور دیگر
اجرامِ فلکی کی حرکات کا اندازہ لگایا کرتے تھے تاکہ وہ
ان کے محل وقوع اور گرہن وغیرہ کے متعلق پیشین
گوئی کر سکیں۔ دراصل اس صدی میں ہیئت دانوں
نے شماریات سے بڑا فائدہ حاصل کیا ہے۔ اور بڑے
عجیب انکشاف کئے ہیں اس سلسلے میں ٹائیکو برا
TYCHO BRAHE (۱۵۴۶ تا ۱۶۰۱) کا حوالہ
بالخصوص ضروری ہے۔ جس نے سیاروں کی گردش
کے اعداد و شمار اکٹھے کئے اور ان کو جوہانس کیپلر
نے بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کر کے سیاروں کی
گردش کا مطالعہ کیا اور گردش سیارگان کے تین اہم اصول
بیان کئے۔ سر آئزک نیوٹن نے یہ تینوں اصول اپنی
تحقیق کے دوران پیشِ نظر کئے اور اس طرح شماریات

کے اپنے شہرۂ آفاق "قوانین کشش" LAW
OF GRAVITATION پیش کئے اور اس طرح
شماریات نے سائنس والوں اور ہیئت والوں کو ان
کے اپنے اپنے شعبوں میں بڑی مدد بہم پہنچائی۔
سترہویں صدی کے دوران کیپٹن جون گرانٹ
(۱۶۲۰ تا ۱۶۷۴) پہلا شخص تھا جس نے اموات و
پیدائش کا مطالعہ کیا۔ اسی لئے اسے حیاتی اعداد و
شمار کا موجد کہا جاتا ہے۔ اس صدی کے دوران دیگر
کئی لوگوں نے بھی اموات و پیدائش اور شادی وغیرہ
کے بارے میں اعداد و شمار جمع کیا۔ کیپر نیومن نے
۱۶۹۱ء میں بریسلو کے رجسٹر پیدائش و اموات
سے اموات کے اعداد و شمار تیار کئے۔ ایڈمنڈ ہیلی
نے ان اعداد و شمار سے استفادہ کیا اور جدول زندگی
مرتب کیا۔ جس میں اس نے ہر عمر کے طبقے میں زندگی
کے اندازے پیش کئے۔ بعد ازاں سر ولیم پیٹی ۱۶۲۳ تا ۱۶۸۷ء
نے بھی اموات کے اعداد و شمار سے فائدہ اٹھاتے
ہوئے جدول شرح اموات و حیات اور جدول
توقع حیات EXPECTANAY TABLE
OF LIFE) مرتب کیا۔ اور عمر کے مختلف
حصوں میں زندگی کی توقع حیاتیات کا حساب لگایا
ان تمام علوم کے علاوہ جو شماریات کے دائرہ
اثر میں پہلے سے تھے اٹھارویں صدی میں شماریات
اور ریاضی میں گہرا رابطہ قائم ہوا۔ دراصل شماریات
کی ترقی کا انحصار ریاضی کی امداد و معاونت پر ہے۔
اور یہ بات کون نہیں جانتا کہ ریاضی اور اعداد کا آپس
میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جی کارڈینو ۱۵۰۱ء تا
۱۵۷۶ء ایک مشہور ریاضی دان اور مشہور قمار باز تھا

اس زمانے میں قمار بازی بڑی مقبول تھی۔ اور اسے غیر قانونی حرکت نہیں گردانا جاتا تھا لہٰذا قمار بازی پر بڑی بڑی رقمیں لگا دی جاتی تھیں کارڈینو نے مختلف قسم کے داؤ لگانے وقت بار جیت کے مواقع معلوم کرنے کے لئے حساب کی مدد لی تھی۔ اس نے کچھ اصول مرتب کئے جن کی مدد سے جوا ہارنے کے امکانات کم ہو جاتے تھے۔ اور اس بات کا خطرہ نہیں رہتا تھا کہ کوئی شخص دھوکے سے داؤ جیت جائے گا۔ یہ قوانین بعینہٖ وہی قوانین ہیں جنہیں ہم آج "نظریۂ احتمال" THEORY OF PROBABILITY کہتے ہیں جیکب برنولی اور اس کے بھتیجے ڈینیل برنولی ۱۷۹ء تا ۱۸۲۸ء نے احتمال کا نظریہ تیار کیا اور اخلاقی توقع NORMAL EXPECTATION کا تصوّر پیش کیا۔

بلجیم کے مشہور ہیئت داں اور ریاضی داں ایل اے جے کولیٹ ۱۷۹۶ء تا ۱۸۷۴ء کے جدید شماریات کے نظریے کی بنیاد قائم کی اور اس کے ابتدائی اصول قانون اعداد کبیر THE LAW OF CONSTANCY OF GREAT NUMBER کی خصوصیات کا اندازہ کیا بیمہ کمپنیاں اسی اصول کی بنیاد پر اپنے پریمیئم کا حساب لگاتی ہیں اس کے علاوہ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمارے مشاہدے میں جو غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ وہ ثنائی قانون (BINOMIAL LAW) کے تحت آتی ہیں جی الیف نیپ ۱۸۴۲ء تا ۱۹۲۶ء اور کیلیس ۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء جو کہ جرمن نسل تھے کولیٹ کے اصول کی بنا پر اموات وحیاتیات کا شماریات میں قابل قدر اضافہ کیا۔

مشہور معیشت دان الفرڈ مارشل کا قول ہے کہ شماریات کا علم اور اس کا عملی اطلاق معاشی مسائل کے حل دریافت کرنے کے لئے ایک ناگزیر چیز ہے پوریٹو ۱۹۴۸ء تا ۱۹۳۶ء کا بھی خیال تھا کہ علم معیشت کا انحصار شماریات کے مجرب اور مصدق قوانین پر ہے اس کی کتاب "سیاسی معاشیات" میں شماریات کے اعداد و شمار بڑے جامع انداز میں اکٹھے کئے گئے ہیں۔

ایج ورتھ ۱۸۴۵ء تا ۱۹۲۶ء نے اشاری اعداد و شمار اور ہم ربطی کے مسائل PROBLEMES OF CORRELATION پر کام کیا کینس کی رائے میں شماریات اولاً تو ایسے مجرب قوانین مہیا کرتے ہیں جو بعد ازاں تشریحات کرنے میں معاون ومددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ تاریخی جائزے کے بعد یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیا شماریات کا مختلف علوم اور شعبوں سے کیا تعلق ہے۔

شماریات دراصل اس سائنسی طریقے کو کہتے ہیں جس سے کسی خاص مقصد کے تحت متعلقہ شعبے میں مواد کو جمع کیا جاتا ہے اس کی جماعت اور جدول بندی کی جاتی ہے۔ اور پھر اس میں سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ کچھ مصنف شماریات کو انسانی خوشحالی کے حل کا ذریعہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے ذریعہ متعلقہ انسانی مسائل حل کئے جاتے ہیں شماریات کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اعداد و شمار کو مناسب جدول یا نقشوں کی صورت میں پیش کیا جائے جو کہ عام فہم ہوں اور ان کے ذریعے تجزیہ

باآسانی ہوسکے ہم شماریات کی مدد سے ان حالات
کا فیصلہ کرتے ہیں جن کے متعلق ہم کو علم نہیں
ہوتا۔ بہت سے سائنس داں شماریات کو سائنسی
نتائج حاصل کرنے کا آلہ کہتے ہیں۔ اور
سماجی SOCIAL ، طبعی
PHYSICAL حیاتیاتی BIOLOGICAL اور
قدرتی NATURAL نظری علوم میں ان اعداد
وشمار کا استعمال بدرجہا کارآمد ہوتا ہے۔
آج کل کی دنیا میں شماریات کا علم اور
استعمال کھانے میں نمک کی حیثیت رکھتا ہے
اور ہر میدان سے تعلق رکھنے والا انسان اس کو بلا
جھجک استعمال کرنے اور شوق سے مطالعہ کرنے
کی کوشش کرتا ہے اس علم کو خدا کی طرف سے انسان
پر ایک انعام تصور کیا جائے تو کم نہ ہوگا۔ ہم اس کا
فیصلہ خود کریں کہ انسان کے پاس شماریات کے علاوہ
کوئی دوسرا علم ایسا نہیں ہے جو وقت سے پہلے
ہونے والے وقوع پذیر واقعات کے بارے میں ان کے
وقوع پذیر ہونے سے پہلے سب کچھ بتائے۔ عام زندگی
میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہمیں مستقبل
میں ہونے والے واقعات کے بارے میں سب کچھ
بتادے تو ہم اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور یہ
اس علم کو بھی کمال اور اہمیت حاصل ہے اور میں تو
یہ کہتا ہوں کہ جہاں اور جس مسئلہ پر انسانی ذہن کام
کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ وہاں شماریاتی فارمولے کام کر
جاتے ہیں میں سوال کرتا ہوں کہ اگر ۸ کروڑ آدمی
ایک وقت میں ہاتھ ملانا شروع کریں تو وہ کل کتنے
ہاتھ ملائیں گے۔ آپ سوچ لیں کیا یہ عملی طور پر ممکن

ہے اور کیا اس سلسلے میں دوسرے علم کی مدد لی جا سکتی
ہے؟ عام طور پر اس کے حساب کا انسان تصور بھی
نہیں کر سکتا۔ اور شماریات کے بہت چھوٹے
آسان اور تیز تر نتائج دینے والے فارمولوں سے بہت
جلدی نتیجہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔
فرض کریں کہ آپ کو مجھ سے کسی ۱۰۰۰ کھیل
کھیلنے ہیں آپ کے پاس کل رقم ۵۰ روپے اور میرے
پاس ۷۵ روپے ہے ہر کھیل پر ہارنے والا جیتنے والے
کو ایک روپیہ ادا کرتا ہے۔ اور برابری پر کوئی ادا
نہیں کرتا۔ میں کھیل شروع کرنے سے پہلے یہ معلوم
کرنا چاہتا ہوں کہ آیا میں کتنے کھیل کھیلنے کی استعداد
رکھتا ہوں مزید یہ کہ کیا آٹھ سویں کھیل پر میرے
پاس سو روپے ہوں گے۔ اس کا کیا امکان ہے تو یہ
ہمیں شماریات کی ایک شاخ نظریہ احتمال بتاتی
ہے نظریہ احتمال شماریات میں دل کی حیثیت رکھتی
ہے اور ہر شعبۂ زندگی میں استعمال کی جا سکتی ہے۔
شماریات کا مختلف سائنسی علوم سے گہرا
تعلق ہے پروفیسر الفرڈ مارشل شماریات کا معاشیات
سے تعلق کے بارے میں کہتے ہیں "شماریات ایسے تنکوں
کی مانند ہے جن کی مدد سے ہی ہر معیشت داں کو علم
معاشیات کا آشیانہ تیار کرنا پڑتا ہے"۔ آجکل کے ترقی
یافتہ دور میں شماریات اور معاشیات میں قربت
پیدا ہونے کی دو اہم وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ شماریات
کے طریقے مثلاً احتمال PROBABILITY ، نمونہ
بندی SAMPLING ، ہم ربطی CORREL-
ATION ، اشاری اعداد INDEX NUMBER
وغیرہ ترقی یافتہ شکل میں موجود ہیں اور دوسرے یہ کہ

شماریاتی مواد بڑی وسعت اختیار کر چکا ہے۔
ریاضی کو تمام علوم کا امیر کارواں تصور
کیا جاتا ہے۔ تمام شعبہ ہائے علوم میں ریاضی کا
استعمال ناگزیر ہے علم ریاضی کا استعمال شماریات
میں اتنے وسیع پیمانے پر ہوتا ہے کہ شماریات کے
ایک شعبہ کو ریاضیاتی شماریات MATHMATI
-CAL STATISTICS کہا جاتا ہے پروفیسر جیکس
برنیولی نے ریاضی کی مدد سے احتمال کا نظریہ پیش
کیا۔ جو بلاشبہ شماریات کی ترقی میں بڑا اہم تھا۔ دراصل
بیمہ اور طبعی اختلاف کا قانون NORMAL
LAW OF ERROR سب کا انحصار نظریہ
احتمال پر ہے۔

شماریات اور فلکیات میں بھی گہرا ربط
پایا جاتا ہے دراصل ہیئت دانوں نے شماریات کی ترقی
میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ شماریات کا مشہور طریقہ
METHOD OF LEAST SQUARES
ایک ہیئت داں ہی نے پیش کیا۔ اس نے مختلف
سیارگان کی گردش کا مواد اکٹھا کیا اور وہ اس کی مدد
سے مختلف تجربے کر کے سیاروں کے بہترین محل وقوع
کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ ہیئت دانوں نے
زمین سے مختلف سیاروں کی مسافت کا اندازہ لگانے
کی کوشش کرتے رہے اس کو حل کرنے کے لئے انہوں
نے حدود کا تعین کیا۔

موسمیات سے بھی شماریات کا خاص تعلق
ہے کیونکہ شماریات حرارت، نمی اور آلہ بارنما کے دباؤ
کے متعلق مواد کا اوسط معلوم کرنے میں ماہرین موسم
کی مدد کرتا ہے۔ موسمی پیشین گوئیاں اور علم موسمیات
میں مختلف قسم کے مقابلے کے لئے اعداد کی اوسط نکالی
جاتی ہے تاکہ ان کے رجحانات اور نشیب و فراز کا پتہ
چل سکے۔

زراعت کو بھی شماریات سے بے حد فوائد
حاصل ہوتے ہیں (ANALYSIS OF
VARIACE جو کہ شماریات کا ایک اہم طریقہ ہے
زراعت میں اس کا استعمال بہت ہی ضروری ہے
تاکہ مواد کے مختلف گروہوں میں متجانس عناصر
کے اختلاف معلوم کئے جا سکیں۔ اسی طرح
METHOD OF COPRELATION
بھی ان کا پتہ چلانے میں مدد کرتا ہے۔ جو فصلوں
کی مقدار اور خاصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس
طریقے سے حرارت، بارش، کھاد اور سورج وغیرہ
کے فصلوں پر جو اثرات ہوتے ہیں ان کا بھی پتہ
چل جاتا ہے۔

پچھلی صدی کے دوران میں شماریات کی
ترقی کی وجہ سے شماریات اور ریاضیات میں گہرا
تعلق پیدا ہو چکا ہے مگر ان دونوں شعبہ ہائے علوم
سے علم معاشیات بھی منسلک ہو چکا ہے اب یہ
تینوں علوم آپس میں اسطرح منسلک ہو چکے
ہیں کہ سائنس (ECONOMETRICS
بھی پیدا ہو چکی ہے جس کی بنیاد امریکہ میں دسمبر
۱۹۳۰ میں رکھی گئی اور ایک سوسائٹی کا قیام عمل
میں آیا۔ اس نئے علم کا مقصد معاشیات کے نظریات
کو شماریات اور ریاضی کی مدد سے ترقی دینا ہے۔
کہا جاتا ہے کہ شماریات تاجروں کے لئے
مشعل راہ ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ گذشتہ

مواد کو دیکھ کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ سال کے مختلف
حصوں میں اشیار کی کتنی طلب ہوتی ہے تاکہ اس کے
مطابق وہ اپنی پیداوار کو گھٹا بڑھا سکیں۔ ایسے
تجارت پیشہ لوگ جو گذشتہ اعداد وشمار کا مطالعہ نہیں
کرتے اکثر خسارے میں رہتے ہیں۔ مثلاً کرش کولا
فیکٹری والوں کو گذشتہ اعداد وشمار سے معلوم ہو
جاتا ہے کہ گرمیوں میں سردیوں کی نسبت کرش کولا
کی زیادہ طلب ہوتی ہے اس لئے وہ گرمیوں میں
طلب کے مطابق کرش کولا مہیا کرنے کے انتظامات
کر لیتے ہیں۔

شماریات تحقیق RESERCH کیلئے
ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا استعمال
RESERCH میں روز بروز بڑھتا جا رہا ہے
مثلاً فصل پر مختلف اقسام کی کھاد کا اثر معلوم
کرنے کے لئے شماریاتی طریقوں کو استعمال کیا جاتا
ہے۔ اسی طرح صنعت وحرفت میں مختلف اقسام
کی تحقیق کے لئے شماریاتی طریقوں کا استعمال
کیا جاتا ہے۔ مثلاً (QUALITY CONTROL)
کا طریقہ عام استعمال کیا جاتا ہے جو کہ شماریاتی
طریقہ ہے۔ بہر کیف تحقیق کسی بھی شعبہ کے
متعلق کیوں نہ ہو اس میں شماریاتی طریقوں
کا استعمال نہ صرف مفید ہے بلکہ لازمی ہے

جب بھی کسی مسئلے کے متعلق مطالعہ کرنا
ہوتا ہے تو یہ لازم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے بارے
میں تمام گذشتہ پہلوؤں کے متعلق صحیح معلومات
جمع کرنی چاہیئے اس کام کو سرانجام دینے کے لئے
صرف شماریات کا ہی ایک واحد طریقہ ہے مثلاً
غربت، بے روزگاری، ٹی بی، گداگری وغیرہ جیسے مسائل
کا مطالعہ کرنے کے لئے سماجی تحقیق کرنی ہوتی ہے
جس میں شماریاتی طریقوں کا اطلاق کیا جاتا ہے

اگر شوہروں اور بیویوں کی عمروں کا مواد
جمع کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ ان دو سلسلوں
میں (CASUAL RELATION —
SHIP) پایا جاتا ہوگا۔ اس قسم کا (CASUAL
RELATIONS SHIP) طلب و
رسد میں پایا جاتا ہے۔ پس شماریات ایک ہی قسم
کے حقائق کے درمیان (CASUAL REL
— ATION SHIP) بتاتی ہے۔

شماریات ماہرین عمرانیات کے لئے نہایت
سود مند ہے مثلاً اگر ماہرین عمرانیات غربت اور
خودکشی میں باہمی تعلق معلوم کرنا چاہیں تو وہ
اس قسم کا موزوں مواد جمع کریں گے۔ اور پھر شماریاتی
طریقوں کی مدد سے اس کا تجزیہ کر کے غربت اور
خودکشی میں باہمی ربط معلوم کریں گے۔

شماریات منصوبہ بندی میں مددگار
ہے۔ موجودہ دور میں ملکی ترقی کے لئے منصوبے
تیار کئے جاتے ہیں۔ جب ہم منصوبہ تیار کرتے ہیں
تو اس کے ساتھ ہی ہم شماریات کے متعلق بھی
سوچتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ پاکستان میں ہر
شعبہ میں ترقی کے لئے منصوبے تیار کئے گئے ہیں
جن میں ہر شعبہ سے متعلق اخراجات اور نتائج
برآمد ہونے کے اعداد وشمار ملتے ہیں۔

حقیقت میں شماریات انسانی فلاح و
بہبود کا حساب رکھتی ہے۔ قدیم زمانے میں شماریات

بادشاہوں اور حکمرانوں کے لئے نہایت ہی سود مند تھی۔ کیونکہ ان کو ان کے ملک کے مادی و قدرتی وسائل اور باشندوں کی تعداد کے اعداد شمار بتائی تھی۔ جو کہ ان کو اپنے ملک کی معاشی اور فوجی پالیسیاں مرتب کرنے میں مدد دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اسے بادشاہوں کی سائنس بھی کہا جاتا ہے۔

انتظامی امور میں شماریات کی اہمیت آنکھ کی سی ہے ماہرین اس وقت تک کسی مسئلے کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے جب تک شماریاتی مطالعہ کر کے پوری واقفیت حاصل نہ کر سکیں مثلاً کسی ملک میں جرائم کے بڑھنے کا سبب معلوم کرنے کے لئے اس مسئلے کے متعلق معلومات حاصل کر کے اور پھر شماریاتی مطالعہ کرنے کے بعد ہی جواب دیا جا سکتا ہے۔

بنکوں کا شماریاتی معلومات پر کافی انحصار ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں اپنی پالیسی مرتب کرنے کے لئے یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ ہر ایک قسم کے اکاؤنٹ کے تحت کسقدر روپیہ جمع ہے۔ اور ہر روز کس قسم کی طلب ہے اور بنک کو زر کی طلب کو پورا کرنے کے لئے کتنی رقم اپنے پاس رکھنی چاہئے اور کسقدر روپیہ بنک بطور قرض دے سکتا ہے یہ تمام شماریاتی معلومات بینک کے لئے لازمی ہے جن کی روشنی میں بینک پالیسی مرتب کرتے ہیں۔

یہ بات کون نہیں جانتا کہ شماریات کا بیمہ کمپنیوں میں اہم کردار ہے۔ بیمہ کمپنیوں والے پریمیم PREMIUM کا فیصلہ کرنے سے پیشتر ہر عمر کے جماعتی وقفہ میں زندگی اور موت کی شرح زندگی میں اوسط حادثات، مختلف جماعتوں کے لوگوں کی بچت کی قوت وغیرہ کے متعلق پوری معلومات جمع کرتے ہیں۔ اور ان معلومات کی بنیاد پر وہ ربط زندگی اور موت، حادثات اور اموات وغیرہ کے درمیان (CAFFICIENT OF CORRELA-TION) نکالتے ہیں۔ اور ان نتائج کی روشنی میں وہ پریمیم قسط مقرر کرتے ہیں۔

تحقیق کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا۔ جہاں شماریات کی سائنس کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ شماریاتی طریقوں کا استعمال فلکیات، حیاتیات حیوانیات، معاشیات، زراعت، ریاضیات، عمرانیات وغیرہ میں کثرت سے ہوتا ہے۔ چنانچہ شماریات نے ان سائنسی علوم کو وسیع پیمانے پر استفادہ کیا ہے اگر ہم غور سے مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ شماریات نے زندگی کے عام شعبوں میں ناگزیر قسم کا افادہ کیا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ شماریات نے خاص طور پر سائنسی اور معاشیاتی تحقیق میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ خاص کر ماہرین عمرانیات، ماہرین معاشیات، ماہرین فلکیات، تجارت پیشہ لوگ، بینک اور بیمہ کمپنیاں، ماہرین تعلیم، سائنسدان عوامی ادارے، شعبہ ہائے تحقیق، حکومت کے شہری اور عسکری محکمے جیسے موسمیات، زراعت، محکمہ خوراک صنعت و حرفت، محنت اور رسل، ترقیاتی منصوبوں کا شعبہ وغیرہ وغیرہ سب شماریات شماریاتی طریقوں کو اپنے شعبوں میں بکثرت استعمال میں لاتے ہیں۔

بقیہ صفحہ نمبر ۴۳۹

محمد ظہیر خان
بی ایس سی سال اول

سرطان
(ریڈیائی مذاکرہ)

شرکاء: محمد ظہیر خان - محمود رضوی - میر اقبال - خرم بن محمود - محسن صدیقی

عزیز طالب علم ساتھیوں!

پروگرام ہماری پیشکش حاضر ہے آج ہم وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کی جانب سے سائنسی فیچر پیش کر رہے ہیں جسکا موضوع ہے کینسر...!

سرطان یا کینسر جسکا نام سنتے ہی جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں

کینسر جو اس صدی کی سب سے زیادہ مہلک بیماری ہے۔

یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ کینسر نے موجودہ صدی میں جنم لیا لیکن شاید یہ ممکن نہ ہو کہ ہم کینسر کے تاریخی مطالعے میں کوئی حتمی اور قطعی رائے قائم کر سکیں کینسر کی تاریخ بتاتے ہیں میر اقبال علی عثمان۔

کینسر ایک قدیم بیماری ہے اور ممکن ہے کہ اتنی ہی قدیم ہو جتنے کہ خود حضرت انسان کینسر کی تباہ کاریوں کے لئے موجودہ صدی شاید ہمیشہ سے زیادہ سازگار رہی ہے چونکہ اس صدی میں شاید ہمیشہ سے زیادہ سائنسی انکشافات ہوئے ہیں اور سائنسدانوں نے ہر میدان کی طرح طب کے میدان میں بھی حیرت انگیز انکشافات اور اکتشافات کا مظاہرہ کیا ہے۔

کینسر اس صدی کی سب سے مہلک و خطرناک بیماری تصور کی جاتی ہے۔ اس کا جغرافیائی مطالعہ ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اس کرۂ ارض کا کوئی حصہ کینسر کی دست برد سے نہیں بچا ہے۔ دنیا بھر کے سائنسدان اور ماہرین طب اس کھوج میں لگے ہوئے ہیں کہ کینسر کا صحیح سبب، اصل وجہ اور اس کا علاج معلوم کر لیا جائے مگر بدقسمتی کہ اب تک ہر کوشش نے ناکامی کا منہ دیکھا ہے۔

اگر ہم کینسر کے تاریخی پس منظر کی جانب نگاہ ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اب سے صدیوں پہلے تقریباً تیسری صدی ق م میں جگر کی رسولیوں کو عمل جراحی کے ذریعے سے نکالنے کا کام اراسس ٹراٹس (ERASIS TRAT) نے انجام دیا تھا جو کہ سکندر اعظم کا تشریح کار اور طبیب

تھا اس کے باپ نے اسے میٹرو ڈورس (METRODORUS) سے علم طب سیکھنے اسکندریہ بھیج دیا۔ یہ ارسطو کا داماد تھا اراسسٹراٹس نے جسم انسانی کے مطالعے میں جس ذہانت اور ندرت کا ثبوت دیا اسکی بناپر اسے علم الاعضاء اور تقابلی امراضیاتی تشریح کے بانی کی حیثیت حاصل ہوگئی اس کا نظریہ تھا کہ "ہوا پھیپھڑوں کے ذریعے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ اور وہاں سے دل میں پہنچ جاتی ہے۔ دل میں وہ روح رواں (VITAL SPIRIT) بن کر شریانوں سے تمام جسم میں پھیل جاتی ہے"۔

کینسر کی تاریخ میں تھیوڈورک بورگو گینونی (TEODORICO BORGOGNONI) کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے اسے کینسر کے مریضوں سے بہت واسطہ پڑا تھا لیکن وہ جلد یا مخاطی جھلی کینسر پر چہرے کے کینسر کا گمان کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ مرض متعدی ہے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے علاج میں کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے افیون میں ڈبوئے ہوئے اسفنج کے استعمال سے مریض کی تکلیف میں کمی پیدا کرنے اور عمل جراحی کے زخموں پر شراب کو بطور جراثیم کش استعمال کرنے کا طریقہ رائج کیا۔

جنڈرون (C.DEEND RON) ایک ایسا طبیب تھا جسکو کینسر سے بڑی دلچسپی تھی۔ جنڈرون نے کینسر کے علاج اور اس مرض کے بارے میں زیادہ تر وہی طریقہ اختیار کیا جو اس کے چچا کا تھا۔ اس نے ۱۷۰۰ میں مرض کینسر پر ایک کتاب لکھی تھی اس میں اس نے غلط اور علاج کے سلسلے میں کئے جانے والے بعض نہ ہونے والی باتیں بتائی ہیں اس کا خیال تھا کہ کینسر کی ابتدا بافت کی تبدیلی سے ہوتی ہے اور اس کا مداوا کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ عمل جراحی کے قابل ہو۔ اور محدود ہو رسولیوں کا پھیلنا اس کے خیال میں مرض کی توسیع کا موجب تھا اور مادے کے جم جانے کے بعد مریض کا صحت یاب ہونا محال تھا۔

ڈنمارک کے ایک سائنسداں کو کینسر کا طفیلیاتی سبب معلوم کرنے کے سلسلے میں ۱۹۲۶ء میں نوبل انعام ملا اس نے ۱۹۰۷ء میں تین جنگلی چوہوں کا بعد از مرگ معائنہ کر کے ان کے معدے میں رسولی کی نوعیت کی متاثرہ بافتیں دریافت کیں۔

امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے رسالے میں اموات کی جو خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں ان میں سے ۳۴۶۲۶ خبروں کے مطالعے سے یہ واضح ہوا کہ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۴ء کے درمیانی دس سال میں ۲۰۵ لاشعاعی علاج کرانے والوں میں خون کے

کینسر کی شرح ۹ر۳۰ فیصد تھی
علاج نہ کرانے والوں کی شرح ۴۴ر۷۰ فی
صد سے آٹھ گنا زیادہ تھی۔
یہ نمایاں فرق اس بات کا بین ثبوت
ہے کہ لاشعوری کے زیر اثر آنا خون کے کینسر
کا ایک اہم سبب ہے۔

کینسر ایک ایسا دشمن ہے جو خاموشی
سے حملہ کرتا ہے۔ ابتدائی درجوں میں
کینسر کے مریض کو درد بھی محسوس نہیں
ہوتا۔ لیکن بعد کے درجوں میں درد اور
بے آرامی ہو سکتی ہے۔
کینسر کیوں ہوتا ہے؟ اس کی علامتیں
کیا ہیں؟ کینسر کن چیزوں سے ہو
سکتا ہے؟ بتا رہے ہیں محمود عالم!

کینسر کی علامات:-

جسم کی ایک ایسی حالت ہوتی ہے
جس کو عمومی سوئے مزاج کہتے ہیں۔ اس
حالت میں جسم کی اصلی و اساسی طاقت
کمزور ہو جاتی ہے۔ وزن گھٹ جاتا ہے
قلت خون کی شکایت ہو جاتی ہے اس
کیفیت کو سرطان کا لوازمہ سمجھا جاتا
ہے ہماری موجودہ معلومات سے ظاہر
ہوتا ہے کہ یہ تصور صحیح نہیں ہو سکتا پہلی
بات تو یہ ہے کہ مریض کا یہ علم و احساس
کردہ ایک سنگین حالت سے دوچار ہے
اس میں ایسی نفسیاتی کیفیت پیدا کر
دیتا ہے۔ جس سے اس کی اشتہا اور قوت
ہاضمہ متاثر ہو جاتی ہے۔ اور بہت سے
مریضوں میں اس کیفیت سے وزن کے کم
ہو جانے کی توجیہہ ہو سکتی ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ بعض اوقات سرطان
زخم کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور سمی
فاسد مادہ زخم کی سطح سے جسم میں جذب
ہونے لگتا ہے جس سے جسم میں ایک حد
تک خون کی قلت کی شکایت پیدا ہو سکتی
ہے اور جسم کی طاقت کم ہونے لگتی ہے۔
تیسری بات یہ ہے کہ جسم میں
سرطان کی موجودگی اکثر جسم کے
بعض اہم اعضاء کے افعال میں خلل
انداز ہوتی ہے مثلاً معدے کا سرطان
رطوبت معدی کے ترشح اور معدے کی
حرکات میں خلل انداز ہوتا ہے۔ جگر اور
لبلبے کا سرطان ذیابیطس کا مرض پیدا
کر دیتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی ثابت کرنا ممکن
نہیں ہو سکا کہ کس قسم کا خمیر یا زہریلا مواد
سرطان سے پیدا ہوتا ہے اس قسم کا مواد
نارمل خلیات سے پیدا نہیں ہوتا۔
سوئے مزاج کا دماغی کیفیات پر جو شدید
اثر مرتب ہوتا ہے۔ وہ اب مہلک سرطان
کے ایکسرے اور ریڈیم کے علاج سے ظاہر
ہوتا ہے۔ جواب اس قدر عام ہو
چکا ہے۔

اس امر کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ وہ مریض جن میں بار بار سرطان کا اعادہ ہوتا ہے ایک مرتبہ افاقہ کے بعد بالکل تندرست ہو جاتے ہیں اور ان کا وزن کافی بڑھ جاتا ہے اور مہینوں ان کی یہ حالت برقرار رہتی ہے یہاں تک کہ سینہ میں ہوا کی نالی پر مرض کا اعادہ ہو جاتا ہے اور اس کا دباؤ پڑتا ہے یا آنت بالکل مسدود ہو جاتی ہے اور چند دنوں یا چند ہفتوں میں مر جاتے ہیں۔

کینسر کے خطرات

ضروری نہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی سرطان کی علامت ہو سکتی ہے اس لئے معالج سے جلد مشورہ کر لینا چاہئے۔

۱:۔ کوئی پھوڑا جو اچھا نہ ہوتا ہو۔
۲:۔ کوئی رسولی، گلٹی یا گٹھیلا پن
۳:۔ غیر معمولی خون بہنا یا کوئی اور اخراج
۴:۔ مسے یا تل میں کوئی تبدیلی
۵:۔ متواتر بدہضمی
۶:۔ حلق کی متواتر خرابی یا آواز کی تبدیلی
۷:۔ رفع حاجت کے معمولات میں کوئی تبدیلی

تشخیص

اگر مہلک رسولی کی ابتدائی حالت ہی میں معلوم ہو جائے تو ان رسولیوں کو آپریشن کے ذریعے خارج کیا جا سکتا ہے کینسر کی تشخیص بعض عمومی علامات پر مبنی ہے جو اگرچہ قطعی نہیں ہیں۔ لیکن معقول حد تک کینسر کی موجودگی کے امکان کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ اس لئے اگر ایک شخص جس کی عمر ۴۰ سال سے زائد ہو اور وہ معدہ اور آنتوں کی تکالیف میں مبتلا ہو اس کا وزن گھٹ رہا ہو یا قلت خون کی شکایت ہو اپنے آپ کو معائنہ کے لئے پیش کر کے اس بات کا اطمینان کر لینا چاہئے کہ کہیں اس کو کینسر تو نہیں۔

اس امکان کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ابتدا ہی میں اور ٹھیک طور پر تشخیص ہر مرض خصوصاً کینسر کے علاج کے باب میں بہت زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔

بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ معدہ سے خون آنے کو امتحان کے بغیر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور معدہ کے کنارے پر بواسیری رسولی کی موجودگی سمجھ لی جاتی ہے لیکن بعد میں تحقیقات کی جاتی ہیں تو معدہ کے کینسر کا انکشاف ہوتا ہے

جیسے ہی مہلک مگر جراحی کے قابل کینسر کی تشخیص معقول طریقے سے ہو جائے تو کینسر پر بلاناغہ عمل جراحی کر ڈالنا چاہئے۔

خون کے کینسر کی کئی قسمیں ہیں ان

میں سے بعض انسانوں اور جانوروں کو وائرس کے ذریعے سے ہوتے ہیں اس بارے میں امریکہ کے قومی ادارے کے خون کے کینسر کے خصوصی پروگرام کی تحقیقی سرگرمیاں بڑی امید افزا ہیں انسان میں خون کا کینسر بیان کر رہے ہیں خرم بن محمود

کینسر ایک چونکا دینے والی خطرناک بیماری ہے کیونکہ اس میں آدمی کی موت تقریباً یقینی ہو جاتی ہے کینسر کے لفظی معنی کیکڑے کے ہیں اور جس طرح ہر سمت اس کے پیر پھیلے ہوتے ہیں اسی طرح کینسر کا مرض بھی پھیلتا ہے۔ اس مرض کے اندر جسم کے کسی بھی حصے سے خلیوں کی بے ہنگم سی افزائش شروع ہو جاتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح خون کے کینسر میں بھی سفید خلیوں کی تعداد بے ہنگم طریقہ سے بڑھتی ہے۔ تاہم یہ سب کو معلوم ہے کہ سفید خلیے ہمارے جسم کے لئے انتہائی ضروری ہیں اور مدافعاتی عمل میں یہ زبردست کردار ادا کرتے ہیں کینسر زدہ سفید خلیے ان عام خلیوں سے مختلف ہوتے ہیں اس سے مریض کی مدافعاتی قوت بہت کم ہو جاتی ہے دوسرے کینسر کی طرح خون کے کینسر کی وجہ بھی دریافت نہیں ہو سکی تاہم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یا تو یہ وائرس کی وجہ سے یا کوئی اجسام کی خرابی یا پھر تابکاری شعاعوں کی وجہ سے ہوتا ہے یہ عمر کے کسی بھی حصہ میں ہو سکتا ہے اس کے علاوہ مرد و عورت دونوں میں یکساں پایا جاتا ہے تاہم چھوٹوں میں اس کا رد عمل جلدی ہوتا ہے۔ اور بڑوں میں اس کا رد عمل کسی قدر تاخیر سے ہوتا ہے۔

بچوں میں عموماً یہ پانچ سال کی عمر میں پایا جاتا ہے اس کی خاص علامتوں میں کمزوری، کاہلی بھوک کی کمی اس کے علاوہ ہڈیوں اور جوڑوں میں درد شامل ہے۔ مریض کو بخار رہتا ہے، رنگ پیلا ہو جاتا ہے۔ ذرے بڑھ جاتے ہیں چوٹ وغیرہ سے خون عموماً زیادہ خارج ہوتا ہے اور بعض اوقات میں دماغ (HEM-ORRHAGE) ہو جاتا ہے۔ اور اس کے علاوہ سرایت بھی بہت بڑھ جاتی ہے جو کہ مریض کو موت کے اور قریب کر دیتے ہیں بڑوں کے اندر بھی تقریباً یہی کیفیت ہوتی ہے۔

صرف امریکہ میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء کے عرصہ میں خون کے سرطان کے باعث مردوں کی اموات کی شرح میں ۱۵ فیصد اور عورتوں میں اموات کی شرح میں ۵ رفیصد اضافہ ہوا ہے اب تک ۶۰ سے زیادہ ایسے سمیالیوں یا وائرسز کا علم

ہو چکا ہے جوانالوں سے لے کر ہر طرح کے حیوانات میں کینسر کا موجب ہو سکتے ہیں یہ مفروضہ درست ہے کہ جانوروں وائرسسز کے ذریعے ہونے والے کینسر کی بہت سی خصوصیات انسان کے خون کے کینسر سے ملتی جلتی ہیں اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ "C" قسم کے وائرسی ذرات جو عام اساس امراض کے موجب ہوتے ہوں اور پرندوں کے خون کے سرطان سے وابستہ ہیں مشتبہ وائرس کی انسان کو کینسر میں مبتلا کرنے والی سرگرمیوں کا تعین چونکہ وائرس کی انواع کے اندر نہیں کیا جا سکتا اس لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا موثر نظام قائم کیا جائے جس سے ان سرگرمیوں کا تعین ہو سکے ۔

انسان کو وائرس کے ذریعے ہونے والے کینسر کے ویکسین کے ذریعے انسداد میں ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ نہ صرف وہ وائرس طبعی بلکہ کیمیائی سرطانی عوامل کے ساتھ مل کر کسی مہلک رسولی کا موجب ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک اس سے بچاؤ کا طریقہ ہے وہ اب تک ناممکن سمجھا جاتا ہے اور اسی لئے اس کا علاج کم و بیش نامکمل ہے۔

ہاں اگر اس بیماری کا پتہ ابتداء میں ہی لگ جائے تو کچھ بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں لیکن یہ بھی کینسر کی خصوصیت ہے کہ اس کا پتہ عموماً اس وقت چلتا ہے کہ جب یہ ناقابل علاج کی حد تک پہنچ چکا ہو ۔ بالخصوص ہمارے ملک میں جہاں کسی بڑی بیماری کے بغیر معمول کے مطابق طبی معائنہ کا کوئی رواج نہیں ہے جبکہ کوشش یہ ہونا چاہیئے کہ جیسے ہی پہلے بیان کی گئی کوئی بھی علامت محسوس ہو تو فوری ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیئے اور خاص طور سے اس صورت میں جبکہ ان کے خاندان میں پہلے ہی کینسر کے واقعات ہو چکے ہوں کیونکہ یہ بھی شبہ کیا جا رہا ہے کہ شاید سرطان بھی منتقل ہونے والی بیماری ہے۔

جیسا کہ پہلے میں نے عرض کیا کہ کینسر ایک خطرناک بیماری ہے۔ اس لئے صحت یابی کے امکان بہت کم ہوتے ہیں عام طور سے مریض ایک سال، دو سال یا زیادہ سے زیادہ تین سال کے اندر فوت ہو جاتا ہے اس لئے اس کے علاج کا طریقہ کار (PALLIATIVE) کہلاتا ہے جس میں مریض کو اس کی تکالیف سے نجات دلانے کی کوشش کرتے ہیں اس کے علاج کے مختلف طریقے ہیں جس میں دوائیں بھی دی جاتی ہیں انہیں (CYTOTOXIC DRUGS)

کہتے ہیں اس کارِ عمل بے جا خلیوں کو تباہ کرنے کی طرف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تلی اور جگر وغیرہ کو ایکس ریز بھی دی جاتی ہے جبکہ بعض صورتوں میں آپریشن سے جس میں کہ تلی کو نکال دیتے ہیں صورت حال کچھ بہتر ہو جاتی ہے

اس بات سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ کینسر جلد میں ہو سکتا ہے اگر خدانخواستہ ہو جائے تو یہ بھی کینسر کی دوسری قسموں کی طرح خطرناک اور مہلک ہو سکتا ہے۔
تفصیل سے بتائیں گے۔ محسن صدیقی

اس بات سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ کینسر جلد میں بھی ہو سکتا ہے اگر خدانخواستہ ہو جائے تو یہ بھی کینسر کی دوسری قسموں کی طرح ہی خطرناک اور مہلک ہو سکتا ہے۔ مغربی ملکوں کے باشندوں میں جن کی رنگت قدرتاً ہلکی ہوتی ہے اس مرض کی وجہ سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد سالانہ ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اگر مرض اور اسکی ہلاکت خیزی کے بارے میں معلومات عام ہوں اور لوگوں کو اس سے حفاظت کی تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے تو جلد کے کینسر کے امکانات کم ہو سکتے ہیں

جلد کے کینسر کی علامات

جلد کا کینسر زیادہ تر ایک آہستہ آہستہ مندمل ہونے والے زخم کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے لیکن ہر زخم کو کینسر قرار نہیں دینا چاہئے بعض اوقات جلد کا کینسر جلد پر ابھار کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا ہر ابھار بھی کینسر نہیں ہوتا۔

جلد میں کینسر کی موجودگی ان علامات سے بھی ظاہر ہوتی ہے جلد کی طبعی ساخت اور اس کے رنگ میں فرق آجاتا ہے۔ کینسر کے ابھار عام طور پر بدوضع شکل اور بے ہنگم ہوتے ہیں متاثرہ حصہ کی جلد کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے بعض اوقات جلد سرخ بھی ہو جاتی ہے اس پر چھلکے سے جمنے لگتے ہیں لیکن اسمیں نہ تو کسی قسم کی خارش ہوتی ہے اور درد ہوتا ہے۔

اگر جلد کے کینسر کی صحیح تشخیص ہو جائے تو پھر علاج میں تاخیر یا کوتاہی خطرناک نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے علاج کی طرف فوراً توجہ دینی چاہئے جلد کے کینسر کے خلیہ بھی کینسر کی دوسری قسموں کی طرح جسم کے دیگر اعضاء کو متاثر کر سکتے ہیں اگر ہڈی

تک اثر پہنچ جاتے تو ان خلیوں کو یہاں
سے دماغ تک جانے کا راستہ مل جاتا ہے
ناک، آنکھ وغیرہ جیسے اعضاء ضائع ہو سکتے
ہیں اور بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے
کہ جلد کا کینسر قریب سے گذرنے
والی کسی بڑی شریان یا ورید کو متاثر
کر دیتا ہے اگر یہ صورت واقع ہو جائے
تو اتنی بڑی مقدار میں خون نکلے گا کہ انسان
کی فوری موت واقع ہو سکتی ہے۔

سورج کی تیز روشنی میں ماورا
بنفشی شعاعیں موجود ہوتی ہیں لیکن
انسانی جلد میں ایک رنگین
مادہ ہوتا ہے یہ مادہ ان شعاعوں
کو جسم کے اندر داخل ہونے سے روکتا
ہے ایسے لوگ جن کی جلد میں یہ مادہ
بہت کم یا برائے نام ہوتا ہے شعاعوں
سے متاثر ہونے کے بہت زیادہ امکانات
ہوتے ہیں۔

ایسے لوگ جنہیں مسلسل
دھوپ میں رہنا پڑتا ہے مثلاً ملاح،
ڈاکیے، اور کھلاڑی وغیرہ سورج کی
شعاعوں کی وجہ سے زیادہ متاثر ہوتے
ہیں۔ دوسری طرف سفید چمڑی اور نیلی
آنکھوں والے مرد اور عورتیں سورج کی
شعاعوں کی وجہ سے جلد کے کینسر
کا شکار ہو سکتے ہیں۔

آج کل کینسر کا علاج ان طریقوں
سے ہو رہا ہے۔

برقی جراحی کا عمل:۔ یہ عمل ایک
سوئی کے ذریعے کیا جاتا ہے جو حرارت
کی وجہ سے کینسر کے خلیوں کو ضائع کر
دیتے ہیں۔

انجمادی طریقہ:۔ اس میں کینسر
کے خلیوں کو منجمد کر کے مردہ کر دیا جاتا ہے۔

عام جراحی عمل:۔ جس میں کینسر
کی ساختوں کو نشتر کے ذریعے جسم
سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

کیمیائی جراحی:۔ جس میں تیز
کیمیائی عامل کے ذریعے سے کینسر زدہ
حصے کو صحت مند حصوں سے الگ
کر دیا جاتا ہے۔

لیکن ایسی صورت میں جب
جلد کے کینسر کی گلٹیاں تعداد
میں اتنی زیادہ ہوں کہ ان پر جراحی
کا عمل ممکن نہ ہو تو ان پر ایک دوا
FU 5 بیرونی سطح پر لگائی جاتی ہے۔
یہ دوا صرف غیر طبعی خلیوں کو نقصان
پہنچاتی ہے اور انہیں تباہ کر دیتی ہے۔
یہ دوا عام حالات میں ۲ سے ۱۲
مہینوں کے عرصے میں عمل کرتی ہے

سورج کی شعاعوں سے متاثر
ہونے والے لوگ اگر صبح سورج کے بلند
ہونے سے قبل اور شام کو سورج
ڈھل جانے کے بعد کے اوقات کے

علاوہ دھوپ سے بچیں تو کینسر کا خطرہ تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح گہرے رنگ کے ڈھیلے لباس کے ذریعے بھی دھوپ سے بدن کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔

خلاصہ

جدید تحقیقات

محمد ظہیر خان

کینسر کی تباہ کاریوں کے لئے موجودہ صدی ہمیشہ سے زیادہ سازگار رہی ہے حالانکہ موجودہ صدی میں جتنی ترقی سائنس نے کی ہے وہ اس سے پہلے نہیں کر سکی لیکن تمام تر کوششوں کے بعد انسان اب تک کینسر پر قابو نہ پا سکا۔

کینسر کے بارے میں اب تک جو بات یقین سے کہی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ کینسر انسانی جسم کا ذاتی اور داخلی مرض ہے۔ جدید تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ کینسر صرف انسانوں ہی کی بیماری نہیں ہے بلکہ یہ دودھ پلانے والے اور رینگنے والے جانوروں، پرندوں، بعض کیڑوں اور نباتات میں بھی ہو سکتا ہے۔

کینسر کے بارے میں اب تک مکمل طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بنیادی طور پر کس طرح ہوتا ہے؟ لیکن چند چیزوں کے متعلق یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان سے کینسر ہو سکتا ہے ان میں بہت تیز دھوپ، بہت تیز روشنی، شدید قسم کی رگڑ اور کچھ کیمیائی چیزوں سے کسی فرد کا ارتباط بھی شامل ہے۔ زیادہ گرم خوراک استعمال کرنے سے بھی کینسر ہو سکتا ہے۔

عالمی ادارہ صحت کی رپورٹ کے مطابق کینسر کا سب سے بڑا ذمہ دار ماحول ہے جس میں ہر قسم کی کیمیائی اور جرثیمی آلودگیاں شامل ہیں، جو ہوا، پانی اور غذا کے ذریعے جسم میں داخل ہو کر مرض کا باعث بنتے ہیں۔

کینسر کا شکار ہونے والوں میں مرد اور عورتیں دونوں تقریباً یکساں شامل ہوتے ہیں البتہ عورتیں نسبتاً کم عمری میں کینسر سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔

کینسر کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ ۱۹۰۰ء سے اب تک کینسر کی شرح تین گنا بڑھ گئی ہے۔ ابتدا میں اندازاً ہر سال ایک فیصد شرح سے اضافہ ہوتا تھا۔ لیکن ۱۹۷۵ء سے یہ اضافہ چار فی صد تک پہنچ گیا ہے۔

نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ اور امریکن کینسر انسٹی ٹیوٹ نے کینسر کو

ایک حد تک وبائی مرض قرار دیا ہے۔ اور اس کے متعلق ٹھوس حقائق پر مبنی ۴۴۵ صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ "کینسر ایک وبائی بلا" اور "عوام کینسر کے پنجے میں" کے عنوان سے شائع کی ہیں جس میں اس مرض کے وبائی طور پر پھیلنے کا غذا، دوا، فیکٹریوں اور کارخانوں کے ماحول سے تعلق واضح کیا ہے۔

غذا میں چربی اور چکنائی کی زیادتی سینہ اور پستان اور آنتوں کے کینسر کی پیدائش کا ذریعہ بنتی ہے ان کے استعمال سے آنتوں کا کینسر بکثرت ہوتا ہے جاپان میں معدہ کے کینسر کی وجہ مچھلی ہے کیونکہ جاپان کے لوگ مچھلی بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں جبکہ امریکہ میں آنتوں کا کینسر چربی اور چکنائی کے بہت زیادہ استعمال کی وجہ سے ہوتا ہے۔

رائل کالج آف فزیشنز کے ماہرین نے بتایا ہے کہ ایک سگریٹ پینے پر انسانی زندگی ساڑھے پانچ منٹ کم ہو جاتی ہے سگریٹ پینے سے بہت سے امراض لاحق ہو جاتے ہیں ان امراض میں کینسر سرفہرست ہے پھیپھڑوں کا کینسر اور مثانے کا کینسر اسی سے ہوتا

امریکن کینسر ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر ہینشر کہتے ہیں کہ سب سے مہلک کینسر پھیپھڑوں کا ہوتا ہے۔ اس کے اسباب قابل اصلاح ہیں۔ یعنی ماحول کے اثرات، ایک طویل عرصہ تک تمباکو نوشی کی عادت وغیرہ تحقیق کے دوران یہ پتہ چلا ہے کہ سگریٹ پینے والوں کی شرح اموات سگریٹ نہ پینے والوں کی شرح سے دوگنی ہے۔

کیلی فورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر بر لیوس ایمس نے انکشاف کیا ہے کہ ولایتی خضاب میں ایسے کیمیائی اجزا شامل ہوتے ہیں جو کینسر کا ذریعہ بنتے ہیں۔ پروفیسر ایمس کے مطابق کینسر بہت آہستہ آہستہ یعنی دس سے بیس سال کے عرصے میں نمودار ہوتا ہے۔

تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ جب خضاب سر پہ لگایا جاتا ہے۔ تو وہ ایک فی صد سر کی جلد میں جذب ہو کر جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور پھر کیمیائی اجزاء باقاعدہ خضاب لگانے والوں کے پیشاب میں شامل ہو کر جسم کے کسی بھی حصے میں کینسر کا سبب بن سکتے ہیں۔

برٹش ایسوسی ایشن آف ریسرچ کی ایک میٹنگ میں ڈاکٹر اسٹینلے نے اپنے تجربات کے نتائج بتاتے ہوئے کہا ہے کہ انہوں نے سولہ اقسام کے

خضابوں کا امتحان کیا اور وہ سب کے سب خطرناک پائے گئے۔ اندازہ لگایا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ میں ہر پانچ میں سے ایک خاتون خضاب استعمال کرتی ہے۔ امریکہ میں ایسی عورتوں کی تعداد ۳ کروڑ ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امریکی خواتین میں کینسر کی وبا عام ہے۔

جدید تحقیق سے ثابت ہوچکا ہے کہ دھوئیں سے بھی کینسر ہوسکتا ہے جبکہ ہمارے شہر کراچی کا یہ حال ہے کہ شاید ہی کوئی بس ایسی ہو جو کثیر مقدار میں دھواں نہ چھوڑتی ہو ایک بس جو صدر سے دھواں چھوڑتی ہوئی ملیر تک جاتی ہے تو راستے میں نہ جانے کتنے لوگ اس کے دھوئیں کی زد میں آتے ہوں گے۔ کیا ہماری حکومت شہریوں کی صحت کی خاطر اس طرف کوئی توجہ دے گی ؟

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق کراچی یونیورسٹی کے ابراہیم جمال ادارے کیمیا میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے رفقاء ڈاکٹر عطاالرحمٰن ایسا کام کررہے ہیں جو کینسر کی بہت قیمتی دوا کو کم قیمت پر تیار کرنے میں معاون ہوگا۔

اگر آپ الکحل یا کولا مشروبات پیتے ہیں اور اس کے ساتھ سگریٹ بھی پیتے ہیں تو آپ کے مثانے میں کینسر ہوسکتا ہے یہ بات ڈاکٹر جلین کی تازہ ترین تحقیقات سے ثابت ہوئی ہے اس دریافت کی تائید نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین نے بھی کی ہے۔

ہارورڈ اسکول آف پبلک ہیلتھ کے ڈاکٹر فلپ کول نے بتایا ہے کہ مثانے کے کینسر کا کافی پینے سے بہت گہرا تعلق ہے۔ امریکہ میں ہر سال مثانے کے کینسر سے ۱۰ ہزار مریض مرتے ہیں۔

عزیز دوستو!

اب ہمارا پروگرام ختم ہوتا ہے اس پروگرام کی تیاری کے سلسلے میں میں شکر گزار ہوں اپنے کالج کے اساتذہ کرام جناب ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی اور جناب وقار احمد زبیری کا جنہوں نے ہمیں ضروری معلومات فراہم کیں

اب ظہیر خان کو اجازت دیجئے۔

خدا حافظ۔

محمد انجم سال چہارم (حیاتیات)
گورنمنٹ اردو سائنس کالج

تمباکو نوشی

دنیا میں اب تک تمباکو کی تقریباً پچاس مختلف قسمیں معلوم کی جا چکی ہیں لیکن نوبیکم (TOBACUM) سب سے زیادہ مقبول ہے اس کو ہی ورجینیا تمباکو بھی کہتے ہیں دنیا کے تقریباً ۸۰ ممالک میں اس کی کاشت ہوتی ہے جس میں مسلم دنیا کے خاص ممالک ایران، ترکی، شام، سوڈان، انڈونیشیا اور الجزائر بھی شامل ہیں لیکن پاکستان میں اسکو وسیع پیمانے پر کاشت کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں پاکستان اس فصل کی کاشت کو فروغ دینے کے لیے پاکستان تمباکو بورڈ کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اس طرح ۷۶ - ۷۵ میں ۳ کروڑ ۲۵ لاکھ پونڈ تمباکو برآمد کیا گیا جس کی مالیت ۱۶ کروڑ روپے تک بھگ تھی۔ پاکستانی تمباکو زیادہ تر مشرق وسطی اور افریقہ کے ممالک کو برآمد کیا جاتا ہے۔ جس میں سعودی عرب، قطر، کویت، دبئ اور بحرین شامل ہیں۔ اس کی کل عالمی پیداوار سالانہ ۱۱ ارب پونڈ ہے۔ یہ حقیقت بھی قابل افسوس ہے کہ پاکستان برطانیہ اور امریکہ سے تمباکو درآمد بھی کرتا ہے۔ کیونکہ تمباکو نوشی ہمارے ملک میں عام ہے صرف کچھ افراد ہی ایسے ہوں گے جو کہ تمباکو نوشی سے گریز کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں سگریٹوں کا استعمال گذشتہ سات سالوں سے سات فیصد ۷٪ بڑھ گیا ہے۔ اندازے کے مطابق پاکستان میں سگریٹوں کا استعمال ۷۰۰ فی کس سالانہ ہے۔ یہ تعداد بے شک برطانیہ، امریکہ اور جاپان کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن ہمارے ملک کیلئے بہت زیادہ ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ تمباکو نوشی کا رجحان ہمارے ملک میں جس رفتار سے بڑھ رہا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اگر یہ فروغ اسی طرح رہا تو پاکستان بہت جلد برطانیہ کا ہم پلہ ہو جائے گا۔ چونکہ برطانیہ ہی وہ ملک ہے جہاں دنیا میں سب سے زیادہ تمباکو نوشی کی جاتی ہے یعنی برطانیہ میں سالانہ ۲۳ کروڑ ۶۸ لاکھ پونڈ تمباکو استعمال کیا جاتا ہے پاکستان میں سگریٹ کا رواج صرف اسی وجہ سے بڑھ رہا ہے کہ یہاں تمباکو نوشی کے خلاف کوئی قانون نافذ نہیں کیا گیا۔ یہ اس لئے بھی حیرت انگیز ہے کہ دنیا کے بہت سے ممالک طرح طرح سے لوگوں کو سگریٹ اور تمباکو نوشی کے مضر

اثرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں قوانین بنائے جا رہے ہیں اس کے خلاف مضامین لکھے جا رہے ہیں فلمیں بن رہی ہیں۔ بورڈز لگائے جا رہے ہیں ہر طرح سے لوگوں کو سگریٹ نوشی سے دور رکھنے کی کوششیں کی جا رہی ہے۔

افغانستان، ناروے، فن لینڈ، سنگاپور اٹلی اور دوسرے بارہ ممالک میں جن میں جنوب مشرقی یورپ کے چند ممالک بھی شامل ہیں۔ سگریٹ کی ہر طرح کی تشہیر قانوناً ممنوع ہے جبکہ پاکستان میں اس قسم کا کوئی قانون نہیں ہے اسی طرح برطانیہ جہاں دنیا میں سب سے زیادہ تمباکو نوشی کی جاتی ہے اور نیوزی لینڈ سمیت دنیا کے دوسرے اٹھائیس ممالک میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سگریٹ کے اشتہارات کی ممانعت ہے قابل ذکر بات یہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ سمیت دنیا کے آٹھ ممالک ایسے ہیں جہاں کی سگریٹ ساز کمپنیوں پر یہ قانون عائد ہے کہ وہ ہر اشتہار اور سگریٹ کے ہر پیکٹ پر یہ عبارت درج کریں" سگریٹ نوشی صحت کے لئے برباد کن ہے اسی لئے یہ سگریٹ ساز کمپنیاں ہر پیکٹ اور تشہیر پر یہ عبارت درج کرنے کیلئے مجبور ہیں لیکن ۲۸ جولائی ۱۹۷۹ء سے امریکہ میں یعنی اسی سال سے تمباکو نوشی کے خلاف ایک مہم بھی چلائی گئی ہے جس پر تقریباً ۲۹ کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے۔ جس کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ سگریٹ نوشی کے دوسرے وسائل اور اجزاء پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگائے جائیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ممالک یہ چاہتے ہیں کہ ان کے لوگ خوشحال ہو جائیں صحتمند ہوں اور بیماریوں سے بچ جائیں۔ اب حکومت پاکستان نے ایک قانون جاری کیا ہے جو کہ ۱۹۸۰ء سے نافذ العمل ہوگا جس کے مطابق امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کی طرح ہر پیکٹ پر یہی عبارت درج ہوگی "سگریٹ نوشی صحت کے لئے برباد کن ہے" کیونکہ سگریٹ کے تمباکو میں پایا جانے والا زہر "نکوٹین" بہت سی بیماریوں کا بنیادی سبب ہے اور اب تو یہ بھی تقریباً طے ہے کہ گلے کا سرطان اکثر اسی کی وجہ سے ہوتا ہے

پاکستان میں دوسرے ممالک کی طرح نہ صرف یہ کہ کسی قسم کی پابندیاں نہیں ہیں بلکہ پاکستان میں تو ریڈیو اور ٹی وی سے سب سے زیادہ طویل اشتہار سگریٹوں کے ہی نشر ہوتے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ جیسے دوسرے ۸ ممالک کے برخلاف پاکستان میں سگریٹ کی کچھ اقسام کی ڈبیوں پر سگریٹ کو فروغ دینے کے لئے یہ عبارت درج ہوتی ہے

آپ کا ساتھی آپ کا دوست

پاکستان میں سگریٹ سے پیدا ہونے والی بیماریاں اپنا سکہ جما رہی ہیں جو لوگ سگریٹ پینے کے عادی ہوتے ہیں ان کے پھیپھڑے کمزور ہو جاتے ہیں اور تپ دق جیسی موذی بیماری آسانی سے اسے گھیر لیتی ہے اسی طرح سے سرطان کی بیماریوں میں خاص طور سے پھیپھڑوں اور گلے کا سرطان بھی تمباکو نوشی کی ہی وجہ

سے ہوتا ہے اور اب تک اس کا کوئی کامیاب
علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ آج کل معدے
میں زخم عام پائے جاتے ہیں۔ اور مشاہدہ ہے کہ اس
قسم کے بیشتر افراد جن کے معدے میں زخم پائے
جاتے ہیں۔ تمباکو نوشی کے عادی ہیں۔ اب یہ
ہم سب کا انفرادی فرض ہے کہ ہم تمباکو نوشی
جیسی لعنت کو ترک کر کے ان بیماریوں کو
پھیلنے سے روکیں۔ اس لعنت کو ترک کرنا
کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بلکہ اب تو تمباکو
نوشی کو ترک کرنے کے لئے سائنسی طریقے معلوم
کر لیے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک طریقہ یہ ہے
کسی دن بھی سگریٹ چھوڑنے کا تہیہ کر لیا جائے
اور چھ گھنٹے تک بالکل سگریٹ نہ پیا جائے اسی
طرح دوسرے دن سات گھنٹے کا وقت رکھیں
تیسرے دن آٹھ گھنٹے تک سگریٹ نہ پئیں
اس طرح آپ روز ایک گھنٹہ بڑھا دیں اس
طرح بڑھتے بڑھتے یہ وقفہ مہینوں تک پہنچ
جائے گا۔ اور پھر اس موذی نشے سے نجات
پالی جائے گی۔

بقیہ

اور اب تو قرآن پاک کی آیات اور سورتوں پر
ریسرچ بھی اسی علم کی مدد سے ہو رہی ہے۔
حال ہی میں سائنسدانوں نے چاند اور سیاروں
تک پہنچنے کے لئے اس علم کی بڑی مدد لی۔ تو ان
تمام باتوں کی روشنی میں ہم وثوق سے کہہ سکتے
ہیں کہ شماریات کی سائنس، سائنس کی دنیا
میں ترقی کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اور
آج کل طلباء بڑے وقار کے ساتھ اس کو بحیثیت
مضمون کے اپناتے ہیں۔ اور پڑھتے ہوئے فخر
محسوس کرتے ہیں میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ
ایک ٹیکنیکل مضمون ہے اور اس مضمون کے
پڑھنے والوں کو شماریاتی انجینئر کہا جائے تو یہ
زیادہ بہتر ہوگا۔

حوالہ :-

(۱) اقبال بھٹی THEORY OF STATISTICS

INTRODUCTION OF STATISTICS
W'ALPALE

(۲) حنیف میاں
اطلاقی شماریات

عذرا زیدی
سالِ دوم

ملیریا سے انسانی زندگی کو نقصانات

ملیریا کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کی نشاندہی سب سے پہلے بابائے طب "بقراط" نے کی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بیماری اس نقصان دہ ہوا کے نتیجہ میں ہوتی ہے۔ جو کیچڑ اور دلدلی علاقوں سے آتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا نام ملیریا پڑ گیا۔ ARIA یعنی ہوا اور MAL یعنی بری یا بر مضر شے۔ ۱۸۸۰ء میں لیویران (LAVERAN) پہلا شخص تھا۔ جس نے مرض کی وجہ طفیلیے (PARASITES) دریافت کئے۔ ۱۸۹۷ء میں سر رونالڈ روس نے اس کو ثابت کر دیا اور فوراً بعد ہی اس کی اطالویوں نے تصدیق کی۔

یہ مرض ان علاقوں میں ہوتا ہے جہاں کی آب و ہوا معتدل ہوتی ہے اور جہاں خوش حالی صحت اور صفائی کا فقدان ہو۔ یہ مرض ان مادہ انوفیلز مچھروں کے ذریعے پھیلتا ہے۔ جس میں طفیلی موجود ہوں۔ طفیلی (PARASITE) وہ جاندار ہوتے ہیں۔ جو دوسرے جانداروں کی غذا اور خلیوں پر گزارا کرتے ہیں۔ یہ خود تو بڑی تیزی سے پھلتے پھولتے ہیں لیکن اپنے میزبان (HOST) کو کمزور اور بیمار کر دیتے ہیں۔ ان کی زندگی کا انحصار میزبان پر ہوتا ہے۔ اور اس کے بغیر یہ زندہ نہیں رہ سکتے ملیریائی طفیلی ایک خلیے کے ہوتے ہیں۔ انہیں سائنسی زبان میں پلازموڈیم (PLASMODIUM) کہا جاتا ہے۔ بہت سے دوسرے طفیلیوں کی طرح ان کی زندگی دو میزبانوں میں مکمل ہوتی ہے۔ یعنی مچھر اور انسان۔

پلازموڈیم چونکہ ایک خلیے کا حیوان ہے اس لیے اس میں زندگی کا وہ تصور نہیں جو بڑے جانداروں میں ہوتا ہے۔ یہ خلیہ زندگی کے مختلف مراحل کے ساتھ شکل اور حجم بدلتا رہتا ہے۔ اور آخرکار واپس اسی حالت میں آ جاتا ہے۔ جہاں سے اس کی زندگی شروع ہوئی تھی اس دوران یہ مستقل تقسیم کے عمل سے اپنی نسل بڑھاتا رہتا ہے۔ یہ زندگی کا چکر کہلاتا ہے۔ اسے مکمل کرنے کے لیے لازمی طور پر مچھر اور انسان دونوں کے جسموں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر ان کو مناسب حالات اور میزبان ملتے رہیں۔ تو ان کی زندگی کا چکر چلتا رہتا ہے۔ ایک چکر کا اختتام دوسرے چکر کا آغاز ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ یہاں پر ہمارا مقصد طفیلی کی زندگی کا چکر بیان کرنا نہیں لیکن بہر حال اسے نظر انداز نہیں

کیا جا سکتا۔ مختصراً یہ کہ مادہ انوفیلیز کے کاٹنے کے ساتھ نہایت چھوٹے چھوٹے طفیلی لعاب کے ساتھ انسان کے خون میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انوفیلیز میں پلازموڈیم موجود ہو یہ خون میں بہتے ہوئے جگر تک پہنچ جاتے ہیں اور اس کے خلیوں پر اپنی نشوونما کرتے ہیں۔ اور تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اور تقریباً دو مرتبہ ایسا کرنے کے بعد وہ دوبارہ خون میں شامل ہو جاتے ہیں۔ خون میں بہتے ہوئے یہ سرخ جسیموں (R.B.C) میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ اپنی شکلیں بدلتے رہتے ہیں پہلے گول پھر انگوٹھی نما اور پھر امیبا کی شکل کے اور پھر پھیل کر تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اس دوران یہ سرخ جسیموں کو کھوکھلا کر دیتے ہیں کمزور ہونے کی وجہ سے وہ پھٹ جاتے ہیں۔ اور طفیلیوں کے ساتھ دوسرے فاضل مادے خون میں آزاد ہو جاتے ہیں طفیلی نئے سرخ جسیموں کو شکار بناتے ہیں اور تقریباً پانچ ایسے چکروں کے بعد مریض علامات مرض محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کا درمیانی وقفہ (INCUBATION PERIOD) کہلاتا ہے۔

یہ پلازموڈیم کی زندگی کا پہلا حصہ ہے جو غیر صنفی (ASEXUAL) کہلاتا ہے۔ آخر کار یہ اپنی زندگی کے دوسرے حصے یعنی صنفی (SEXUAL) کے آغاز کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔ اس موقع پر کچھ طفیلی دوبارہ جگر کے خلیوں تک پہنچ کر زندگی کا چکر دوبارہ غیر صنفی حصے سے شروع کر دیتے ہیں۔

صنفی چکر میں خلیے تقسیم نہیں ہوتے بلکہ دو گروپوں یا قسموں میں بٹ جاتے ہیں یعنی نر اور مادہ انسان کے خون میں دوڑتے ہوئے یہ طفیلی جلد کی خون نالیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور اس موقع پر اگر کوئی مادہ انوفیلیز کاٹ لے تو خون کے ساتھ ساتھ یہ طفیلی انوفیلیز کے معدہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مادہ اور نر طفیلیوں میں مختلف قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ نر خلیہ مادہ میں داخل ہو جاتا ہے دونوں کے ملاپ سے جو خلیہ بنتا ہے وہ زائیگوٹ (ZYGOTE) کہلاتا ہے۔ یہ اب معدے کی دیواروں کے ذریعے اپنا راستہ بناتا ہے۔ اور دیوار کی سب سے بیرونی پرت کے نیچے مقیم ہو جاتا ہے۔ یہ اپنے گرد چادر (آدی سی) قائم کر لیتا ہے۔ اور پوری شدت سے تقسیم ہوتا ہے دیواریں پھٹ جاتی ہیں۔ اور طفیلی مچھر کے جسم سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لعاب کے غدود (SALIVARY GLAND) میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی زندگی کا نیا چکر شروع کر دیتے ہیں

پلازموڈیم کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ Plasmodium vivax
۲۔ P. ovale
۳۔ P. Falciparam
۴۔ P. Malarie

یہ اقسام شدت کے لحاظ سے مختلف انداز میں اثر کرتی ہیں۔ INCUBATION کا وقفہ اور بخار کے درمیان کا عرصہ مختلف ہوتا ہے۔ P. Falciparum سب سے زیادہ خطرناک قسم ہے جبکہ بقیہ تین زیادہ خطرناک ثابت نہیں ہوتیں۔

Falciparum کافی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ خون کی نالیوں کی تبدیلی سے دماغ، گردہ اور

آنت متاثر ہو ۔ اور بے ہوشی اور موت کا اندیشہ بھی ہوتا ہے ۔ اس کے نقصان دہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بہت تیزی سے تقسیم ہوتے ہیں چنانچہ زیادہ تعداد میں سرخ جسیموں کا شکار کرتے ہیں ۔ اسی طرح انیمیا اور خون کی پتلی نالیوں کے بند ہونے کی شدت اور امکان زیادہ ہوتا ہے ۔

Falciparum ملیریا اگر زیادہ دن تک رہے تو " کالے پانی کا بخار " ہو سکتا ہے ۔ اس میں سرخ جسیمے بڑی تیزی سے ضائع ہونے لگتے ہیں اور اس کا نتیجہ ٹھنڈا بخار رقے اور سرخ یا کالے رنگ کا یوریا آنے کی صورت میں نکلتا ہے ۔ اور شدید قسم کے انیمیا کے ساتھ خون کا بہاؤ رکنے یا گردے کا فعل بند ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے ۔ مندرجہ بالا سطور میں ہم نے ملیریا کے نقصانات کے بارے میں اور خطرناک اندیشوں کے بارے میں لکھا ہے ۔ اس سے بچنے کے لئے ہمیں کون کون سی احتیاطی تدابیر کرنی چاہئیں وہ درج ذیل ہیں ۔

یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ یہ بیماری مچھروں کے ذریعے پھیلتی ہے ۔ کیونکہ طفیلی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی آدھی زندگی مچھر میں گزارے چنانچہ اگر مچھر کے وجود کو ختم کر دیا جائے تو یہ بیماری خود بخود ختم ہو جاتی ہے ۔ مچھر چونکہ ساکت پانی میں نشو و نما پاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ سڑکوں اور گلیوں میں پانی کھڑا نہ ہونے دیا جائے ۔

ہم ذاتی طور پر بھی مچھروں سے بچنے کے لئے تدابیر کر سکتے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ اسپرے کر کے کوائل جلا کر ، مچھر کا تیل لگا کر ، یا مچھر دانی لگا کر سونا وغیرہ جس علاقے میں خدانخواستہ اگر ملیریا پھیل گیا ہو وہاں کے لوگوں کو وبا کے دوران اور بعد تک احتیاطی دوائیں کھانا چاہیئں ،

سید مظفر احمد
ایم۔ ایس سی (سال اول)

کیڑوں کی معاشی اہمیت

انسان اور حشرات الارض کے مابین کشمکش برائے حیات شاید اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب نوعِ انسانی وجود میں آئی اور یہ کشمکش غالباً اس وقت تک جاری رہے گی جب تک نسل انسانی فنا نہ ہو جائے یا انسان اس کشمکش میں مکمل بالادستی نہ حاصل کر لے۔ اس کشمکش کی بڑی وجہ حشرات اور نوعِ انسانی کی ایک جیسی ضروریات زندگی ہیں مثلاً جو اناج یا غذائیں انسان کھاتے ہیں، کم و بیش وہی بہت سے کیڑوں کی بھی مرغوب غذا ہے۔ کیڑے پودوں اور فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ انسان، مویشیوں اور دوسرے جانوروں کو تنگ کرتے ہیں۔ اور خوراک کے ذخائر کو برباد کرتے ہیں۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ یہاں اس بات کا ذکر بھی کر دیا جائے کہ بعض کیڑے مثلاً شہد کی مکھی اور ریشم کا کیڑا وغیرہ انسان کے لئے بہت فائدہ مند بھی ہے۔ اس طرح ۔۔۔ کی معاشی زندگی پر کیڑوں کا نہایت گہرا اثر ہے۔ اس مضمون میں اسی مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

انسان کے دشمن کیڑے

پودوں کو بلا واسطہ نقصان پہنچانے والے کیڑے پودوں اور فصلوں کو کیڑے مختلف طریقوں سے نقصان پہنچاتے ہیں۔ پھل دار پودوں اور اناج کے پودوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑے یا تو ان کے پتوں، پھلوں اور ان کی چھال کو کتر دیتے ہیں۔ یا پھولوں اور پتوں میں موجود لعاب چوس لیتے ہیں۔ اسی طرح اپنی خوراک کی تلاش اور حصول میں کیڑے لاشعوری طور پر انسان کے دشمن کا روپ دھار لیتے ہیں۔ کترنے والے کیڑوں میں مختلف قسم کے گھاس کے ٹڈے مختلف قسم کے بھونرے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بعض دفعہ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ یہ آناً فاناً کھڑی فصلوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ گھاس کے ٹڈوں کے دَل مختلف وقتوں میں امریکہ میں آتے رہے ہیں۔ اور کھڑی فصلوں کو تباہ کر کے لاکھوں ڈالروں کا نقصان کرتے رہے ہیں۔ اس طرح وہاں پر مختلف اوقات میں Gypsy moth اتنی زیادہ تعداد میں ہو گئے تھے کہ انہوں نے ہزاروں مربع میل جنگلات کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ پاکستان، ہندوستان اور دوسرے عرب ممالک میں ٹڈی دَل Locust مختلف وقفوں میں آتے رہے ہیں۔ یہ دَل جو کروڑوں ٹڈیوں پر مشتمل ہوتے ہیں، آن کی آن میں ہری بھری فصلوں کو چٹ کر جاتے ہیں۔ درختوں کو ٹنڈ منڈ کر دیتے ہیں اور تھوڑے سے وقت میں مکمل طور پر علاقے کا کل سبزہ کھا کر تمام کر دیتے

ہیں اور درختوں پر سبزہ نام کی کوئی چیز نہیں چھوڑتے حتیٰ کہ چھال تک کھا جاتے ہیں۔ کچھ ہی پودے ایسے ہیں جنکو ٹڈی نہیں کھاتی۔ غرض کہ ہر طرف تباہی و بربادی کا وہ سماں ہوتا ہے کہ الاماں! عام لوگوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ جب کسی قوم پر خداوند کریم کا عذاب نازل ہوتا ہے تو وہ ٹڈی دَل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

جو کیڑے درختوں، پتوں اور پھلوں کا رس چوس کر اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ وہ اپنے باریک اعضائے دھن سے ان میں بہت باریک باریک سوراخ کر دیتے ہیں، جہاں سے ان کا رس نکلنا شروع ہو جاتا ہے جسے یہ چوس جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی سطح پر بے شمار ایسے زخم ہو جاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے پھلوں اور پتوں کی شکل خراب ہو جاتی ہے۔ پودا سوکھنا شروع ہو جاتا ہے اور مرجھا جاتا ہے۔ اس قسم کے کیڑوں کی ایک اہم مثال جوں (APHID) ہے۔ اس قسم کے کیڑے لاکھوں کی تعداد میں پودوں پر موجود ہوتے ہیں۔ ان کی سوئی جیسی تیز زبانیں ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ اور وہ پودوں میں سے رس نکال کر چوستے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پودے کمزور ہو کر بالآخر سوکھ جاتے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں ریاست وسکانسن Wisconsin میں پچاس ہزار ایکڑ مٹر کی فصل ان کیڑوں نے آدھی سے زیادہ تباہ کر دی تھی۔ اسی طرح سیب اور دوسرے پھل دار درختوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑے Sanjore Scale نے بھی ہزاروں ایکڑ باغات کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ پاکستان میں بھی ہر سال ہزاروں روپے کے پھل اس کیڑے کی بدولت خراب ہو جاتے ہیں۔ ان کیڑوں کے علاوہ کپاس کا پتہ لپیٹ سنڈی، گنے اور چاول کی سنڈیاں بھی ہر سال ہزاروں روپے کی فصل خراب کر دیتی ہیں۔

مندرجہ بالا مثالیں ایسے کیڑوں کی ہیں جن کا دائرہ عمل پودوں کی سطح تک محدود ہے۔ ان کو کیمیاوی ادویات کے ذریعے تلف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جو کیڑے پودوں اور پھلوں کے اندر تک چلے جاتے ہیں، وہ نسبتاً زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور ان کا کنٹرول کرنا نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ کبھی کبھار اپنی آماجگاہ سے باہر آتے ہیں ان کی مختلف قسمیں ہیں۔

(۱) سوراخ کرنے والے Borers
(۲) سونڈ رکھنے والے Weevils
(۳) پتوں کے اندر چلے جانے والے Leaf Miners
(۴) خول بنانے والے Gall Insects

سوراخ کرنے والے کیڑے Borers: پھلوں اور پودوں میں مختلف گہرائی تک سوراخ کر کے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً ناشپاتی کے درخت کو نقصان پہنچانے والا کیڑا Peach Borer درخت کے تنے کی لوزا پرت combium تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اس طرح پودے کو خشک کر دیتا ہے۔ اسی طرح Weevils بھی پھلوں میں سوراخ کر کے ان میں داخل ہو جاتے ہیں، ہمارے ملک میں کپاس کی فصل کو تباہ کرنے والے کیڑوں میں ایک اہم کیڑا کپاس کے پھل کی سونڈی colton weevils ہے جو کپاس کے ڈوڈے میں سوراخ کر کے اس میں موجود کپاس کے ریشوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ان میں روئی نہیں بنتی۔ امریکہ میں بھی ہر سال یہ کیڑا لاکھوں ڈالر کی فصل تباہ کر دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ اب اس پر کنٹرول کیا جا چکا ہے۔ پتوں میں گھس جانے والے کیڑے پتے کی اوپر اور نیچے

کی سطح میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ جھول بنانے والے کیڑے Gall Insects پودے کے مختلف حصوں کو زخمی کر دیتے ہیں۔ اور زخمی سطح کو اس طرح بڑھنے دیتے ہیں کہ یہ ایک خول کی صورت بن جاتی ہے۔ اور اس میں داخل ہو کر اسے اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ گندم اور انگور کی فصل کو اس قسم کے کیڑے بہت زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں ہزاروں ایکڑ انگور کی فصل ایسے ہی خول بنانے والے کیڑے Gall Insects کی بدولت تباہ ہو جاتی ہے۔

پودے کی سطح اور اس کے اندر رہنے والے کیڑوں کے علاوہ اس قسم کے کیڑے بھی بے شمار ہیں جو زیر زمین ایسے ہی کاموں میں مشغول ہوتے ہیں۔ اور پودوں کی جڑوں کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان میں Root Borers یا Sabnck وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا کنٹرول کرنا بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔

پودوں کو بالواسطہ نقصان پہنچانے والے کیڑے

چیونٹیاں اور بعض اس قسم کے کیڑے بعض دوسرے کیڑوں مثلاً Aphids یا Meal bug وغیرہ کو پکڑ کر لے آتے ہیں اور ان کے جسم سے شہد حاصل کرنے کی خاطر ان کو پالتے اور ان کی حفاظت کرتے ہیں ان کے بچوں کو مختلف پودوں کی جڑوں یا ان کے پتوں پر رکھ دیتے ہیں۔ تاکہ یہ وہاں سے خوراک حاصل کر سکیں اس طرح یہ ان پودوں کو بالواسطہ نقصان پہنچاتے ہیں۔

پودوں میں بیماریاں پھیلانے والے کیڑے

کیڑے جب ایک بیمار پودے سے دوسرے پودے پر جاتے ہیں۔ تو وہاں سے بیماری کے جراثیم اپنے ساتھ لیتے ہیں۔ اور جب یہ پودے کا رس چوسنے کے لئے اسے زخمی کر دیتے ہیں۔ اس وقت یہ جراثیم اس میں داخل ہو کر انہیں بیمار کر دیتے ہیں۔ پودوں کی مختلف بیماریاں پیدا کرنے والی پھپھوندیوں Fungi کے بیج بھی انہیں کیڑوں کی بدولت ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ایک بیمار پودے کی بدولت سارے کھیت کو نقصان پہنچتا ہے۔

جانداروں کو تنگ کرنے والے کیڑے

بعض کیڑے مختلف طریقوں سے جانداروں اور انسانوں کو تنگ کرتے ہیں۔ ایسے کیڑوں سے خواہ مخواہ نفرت سی ہو جاتی ہے۔ بعض اپنی مکروہ قسم کی بو کی وجہ سے حقیر لگتے ہیں مثلاً کاکروچ بعض کی آوازیں نہایت بے سری ہوتی ہیں اور کانوں کو بہت بری معلوم ہوتی ہیں۔ بودار کیڑے اگر کسی پکے پھل پر سے گزر جائیں تو اپنے پیچھے ایسی بو چھوڑ جاتے ہیں کہ پھل کا ذائقہ ہی خراب ہو جاتا ہے۔

آپ آرام سے سوئے ہوئے ہوں۔ اچانک کوئی کیڑا آپ کی ناک یا کان میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور آپ کا سکون تباہ کر دیتا ہے۔ آپ سائیکل یا اسکوٹر پر جا رہے ہیں۔ اچانک کوئی چھوٹا سا کیڑا Thrips آپ کی آنکھ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں خدانخواستہ آپ کے حواس اگر درست نہیں تو آپ کی ٹکر یقینی ہے۔

بعض کیڑے جانداروں کے جسموں میں سوراخ کر کے انڈے دے دیتے ہیں۔ لاروے بننے پر یہ جسم پر رینگنے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں جاندار بے چارہ آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ اچھلتا ہے۔ کودتا ہے۔ خدانخواستہ اگر آپ کوچوان ہیں۔ تو بے چارے گھوڑے کی شامت آجائے گی کہ ٹھیک

نہیں چلتا ہنٹروں کی بوچھاڑ ہوگی۔ لیکن بھلا اس بیچارے کا اس میں کیا قصور! آپ کو بھی تو اصل حقیقت کا علم نہیں اگر آپ کو کسی بھڑ نے کبھی کاٹا ہو اور اگر خدانخواستہ وہ بھی بڑے سائز کی Black wasp ہو تو آپ اس درد کو تا عمر نہیں بھول سکیں گے اور اس کے نتیجے میں جتنے دن آپ کو بستر پر لیٹنا پڑا ہوگا، وہ بھی یاد ہونگے۔ اسی طرح اگر کبھی شہد کی تلاش کا بھوت آپ پر سوار ہوا ہو اور آپ شہد کی بڑی مکھی Apis mallipica کے چھتے کو چھیڑ بیٹھے ہوں۔ اور ہاتھ منہ کان پر ڈنک مارنے کے علاوہ کوئی مکھی خدانخواستہ آپ کی قمیص یا پتلون میں داخل ہوگئی ہو۔ تو جو حالت آپ کی اس وقت ہوئی ہوگی قابل دید ہوگی۔

ایسے زہریلے کیڑوں میں ڈنک جسم کے پچھلے حصہ میں ایک خاص تھیلی میں موجود ہوتا ہے۔ جس میں زہر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اور بوقت ضرورت یہ زہر ڈنک کے ذریعہ جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔ بعض کیڑوں کے لاروے کے جسم پر خاص قسم کے بال ہوتے ہیں۔ جن سے ایک عجیب طرح کا لعاب خارج ہوتا ہے۔ اگر یہ ایک دفعہ انسانی جسم پر سے گزر جائیں۔ تو وہاں پر سوجن اور تکلیف پیدا ہو جاتی ہے۔ ڈنک مارنے والے کیڑوں کی تمام مثالیں یہ ہیں۔ مچھر، گھوڑے کی مکھی Horse fly اصطبل کی مکھی Stable fly افریقی جنگلات کی مکھی Tsetse fly چیچڑ Mites Ticks وغیرہ ان متذکرہ کیڑوں کے علاوہ کھٹمل Bed Bug سے بھی تقریباً سب ہی لوگ واقف ہیں۔ جو لوگ سال میں ایک مرتبہ صرف عید کے موقع پر غسل پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ جوئیں Body Louse کا جم غفیر بھی لئے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی پہچان کچھ مشکل نہیں ہوتی۔ اس لئے ان سے بچنا چاہیئے۔ متذکرہ کیڑے ڈنک مارنے کے علاوہ بہت سی بیماریوں مثلاً ملیریا، ٹائیفائڈ، طاعون وغیرہ کے جراثیم جسم میں داخل کر دیتے ہیں۔ جو ان بیماریوں کو پھیلاتے ہیں۔

طفیلی کیڑے

Parasitic Insects.

حیوانوں اور انسانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے کیڑے وہ ہوتے ہیں جو ان کے جسموں کے باہر یا اندر طفیلی حیثیت سے رہتے ہیں۔ مثلاً پسو، کھٹمل، چیچڑیاں اور پرندوں کی جوئیں وغیرہ خون چوسنے کے علاوہ یہ کیڑے ان جانداروں کے جسم پر متواتر رینگتے رہتے ہیں اور اس طرح انہیں بے چین کئے رکھتے ہیں۔ ان کی بعض حالتیں مثلاً لاروے میگٹ Maggot وغیرہ جسم کے اندر چلے جاتے ہیں۔ اور وہاں مختلف قسموں کے پھوڑے بنالیتے ہیں۔

خوراک کے ذخیروں کو تباہ کرنے والے کیڑے

یہ کیڑے ہر قسم کی نامیاتی غذا کو ہضم کر سکتے ہیں۔ انسان کی ضروریات کی غذا مثلاً اناج، پھل، سبزیاں اور اس کے علاوہ فرنیچر اور گوداموں میں موجود دوسری چیزوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں۔ خوراک کے ذخیروں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ بعض کے اعضائے دہن تو اتنے تیز ہوتے ہیں کہ زیر زمین ٹیلی فون کے تاروں کے جستی غلاف تک میں سوراخ کر کے ان کو خراب کر دیتے ہیں۔ پاؤڈر پوسٹ بیٹل Powder Post Beetle اس کے بارے میں مشہور ہیں۔ دیمک بھی زیر زمین پانی کے نلوں اور بجلی کے تاروں کو ڈھانپنے والی لکڑی کی پیٹیوں میں سوراخ کر کے ان کو ناکارہ کر دیتی ہے۔

خوراک کے ذخیروں کو تباہ کرنے والے کیڑے ہمیں سب سے زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں. کیونکہ یہ ایسی چیزوں کو خراب کرتے ہیں. جو بڑی جانفشانی اور محنت سے حاصل کی ہوئی ہوتی ہیں۔ پاکستان اور دوسرے ممالک میں ہر سال لاکھوں روپے کا اناج اور غلہ ان کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے. کھیتوں میں یہ کیڑے اناج کے بیجوں میں سوراخ کرکے ان میں انڈے دے دیتے ہیں. اور گوداموں میں جب یہ اناج پہنچتا ہے تو یہ انڈے پھر ان کیڑوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں. جو کہ پھر تیزی سے بڑھتے ہیں. اس کے علاوہ گوداموں کے ذخیروں کی باریک درزوں میں سے بھی یہ کیڑے ان میں داخل ہو جاتے ہیں. ان کی قوت تولید اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ چند ماہ میں لاکھوں کے حساب سے بچے پیدا ہوتے ہیں. اور اگر بروقت احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو پورے گودام کو تباہ کرکے رکھ دیتے ہیں،

کیڑوں کے دو گروہوں کولی اوپ ٹیرا Coleopt (era ـ اور لیپی ڈوپ ٹیرا (Lepidoptera) اس ضمن میں سب سے آگے ہیں. ہمارے ہاں غلے کے گودام کو تباہ کرنے میں سسری — Rhizoper tha ڈھورا Bruchus اور کھپرا Trochod erma ـ پیش پیش ہیں لاکھ احتیاط کریں لیکن یہ کسی نہ کسی طرح گودام تک پہنچ ہی جاتے ہیں،

فرنیچر اور لکڑی کی بنی ہوئی دوسری چیزوں کو خراب کرنے میں دیمک سب سے پیش پیش ہے. وجہ یہ ہے کہ یہ آسانی سے لکڑی cellulose کو ہضم کر سکتی ہے یہ کیڑے لائبریریوں، لکڑی کی عمارتوں، فرنیچر، لکڑی کے صندوق، الماریوں اور لکڑی کے بنے ہوئے دوسرے سامان کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں. دیمک کے علاوہ کرم کتابی Silver Fish بھی کتابوں کو بہت نقصان پہنچاتا ہے. کیونکہ اسے نشاستہ لگی چیزوں سے بڑی رغبت ہوتی ہے. اس لئے یہ کتابوں کی جلدوں، فوٹو فریموں، وغیرہ کو بڑی رغبت سے کھاتا ہے.

مفید کیڑے

بعض کیڑے ہمارے لئے نہایت مفید ثابت ہوتے ہیں. اگرچہ ہم ان کی عادات اور فوائد کو اتنی اہمیت نہیں دیتے لیکن ہماری معیشت ایسے کیڑوں کی مرہون منت ہے. ان کی خاص عادات کی وجہ سے ہمیں بے شمار ایسے فوائد حاصل ہو رہے ہیں. جو ان کے بغیر حاصل کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہیں. ان کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں.

کیڑوں سے حاصل شدہ مفید اشیاء :ـ

ریشم :ـ ریشم کے کیڑے کو کون نہیں جانتا. زمانہ قدیم سے ریشم کے کیڑے ریشم حاصل کرنے کے لئے پالے جاتے رہے ہیں. ریشم کا کیڑا Silk Moth ہلکے پیلے رنگ کا ہوتا ہے جس کے دونوں پروں کی لمبائی تقریباً دو انچ ہوتی ہے. ہر کیڑا ۳۰۰ سے ۵۰۰ انڈے دیتا ہے. ان انڈوں سے لاروے نکلتے ہیں. جو کہ عموماً شہتوت کے پتوں پر پالے جاتے ہیں تین چار ہفتے کے بعد یہ لاروے اپنے گرد باریک باریک تاریں لپیٹنی شروع کر دیتے ہیں. یہ تاریں ان کے جسم میں موجود ایک خاص غدود Silk Glands کے جو کہ دراصل تھوک کے غدود کی بدلی ہوئی شکل ہے. لعاب سے بنتی ہے. یہ لعاب ہوا لگتے ہی خشک ہو کر تار کی شکل میں بدل جاتا ہے. اس طرح ہر لاروا اپنے گرد ایک ریشم کی کوٹھی یا خول

بن لیتا ہے۔ جس پر سے یہ تاریں بڑی احتیاط سے علیحدہ کرلی جاتی ہیں یہی ریشم ہے جس سے قیمتی ریشمی پارچہ جات تیار ہوتے ہیں۔ بہت سے ممالک میں ہزاروں غریب لوگ ریشم کے کیڑے پال کر اپنا گزر اوقات کرتے ہیں۔ چین، جاپان، اٹلی، اسپین دوسرے ممالک کی بہ نسبت اس صنعت میں بہت آگے ہیں۔

شہد اور موم :۔ ریشم کے کیڑوں کی طرح شہد کی مکھیاں بھی بہ آسانی پالی جا سکتی ہیں۔ یہ مکھیاں اپنی چھتوں میں موجود چھوٹی چھوٹی بے شمار بوتلیں شہد سے بھر لیتی ہیں۔ جو کہ مختلف پھولوں سے اکٹھا کرتی ہیں۔ یہ شہد مکھیوں اور ان کے بچوں کے لئے غذا کا کام دیتا ہے اور سخت سردی کے دنوں میں یہ اپنی خوراک اسی جمع شدہ ذخیرے سے لیتی ہے۔ پھولوں سے شہد یہ مکھیاں اپنے خاص قسم کے اعضائے دہن کے ذریعے اکٹھا کرتی ہیں اس میں اپنا لعاب دہن ملا کر اپنے جسم میں داخل کر لیتی ہیں۔ چھتہ میں پہنچ کر اسے بوتلوں میں اگل دیتی ہیں ۔ بوتلیں بھی ایک خاص قسم کی موم کی بنی ہوتی ہیں جو کہ ان کے جسم کے نچلے حصہ میں موجود خاص قسم کے غدود سے نکلتا ہے۔ چھتے کا موم بھی تجارتی لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے موم بتیاں، پالش، شیونگ کریم، کاربن پیپر، مختلف قسم کے ماڈل اور دوسری بہت سی چیزیں بنتی ہیں۔

لاکھ :۔ عام لوگ اس بات سے بے خبر ہیں کہ فرنیچر کے پالش، چھاپہ خانہ کی سیاہی، گراموفون ریکارڈ، مختلف کھلونوں میں کام آنے والی لاکھ ایک خاص قسم کے کیڑے Laccifer lacca کے جسم سے نکلا ہوا لعاب ہے یہ کیڑا ہندوستان اور پاکستان کے جنگلات میں پایا جاتا ہے۔ یہ لعاب جسم سے نکلتے ہی خشک ہو جاتا ہے۔ کیڑا اسی کے اندر محفوظ رہتا ہے۔ درختوں کی ٹہنیوں پر جہاں کیڑے زیادہ تعداد میں ہوں۔ یہ لعاب سرخ رنگ کی سخت موٹی تہہ بناتا ہے۔ جو کہ کھرچنے اور صاف کرنے پر لاکھ بن جاتی ہے۔ پاکستان میں بیری کے درختوں پر اس کیڑے کو پال کر لاکھ حاصل کرنے کے مختلف فارم قائم ہیں۔ جہاں سے کافی مقدار میں لاکھ پیدا ہوتی ہے

کیڑے اور عمل زیرگی

Pollination

پودوں میں بیج کے بننے میں کیڑے نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ زیادہ تر پودوں میں عمل زیرگی کیڑوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کیڑے نر پھول سے زردانے مادہ پھول تک لے جاتے ہیں۔ اور اس طرح پھل اور بیج بنانے میں مدد کرتے ہیں گندم، تمباکو، ٹماٹر، مٹر بہت سی سبزیوں اور پھلوں کے درختوں میں عمل زیرگی ان کیڑوں ہی کی بدولت ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کیڑوں کی اہمیت مسلمہ ہے۔ ان کی غیر موجودگی میں ان پودوں میں نہ تو بیج بن سکتا ہے۔ اور نہ پھل بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کا وجود نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے

کیڑے بطور خوراک :۔ کیڑوں کی کرۂ ارض پر تعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے تمام جانداروں کا مجموعی وزن دنیا کے تمام کیڑوں کے مجموعی وزن سے کم ہوگا۔ کیڑے دوسرے جانداروں کے لئے خوراک کا کام دیتے ہیں۔ کرۂ ارض پر موجود ۲/۳ پرندوں کی خوراک کیڑے ہیں۔ اس کے علاوہ مچھلیوں کی خوراک کا ۲/۵ حصہ بھی کیڑے یا ان کے بچے ہوتے ہیں۔ پرندے اور مچھلیاں انسانی خوراک کا بھی ایک

این اے کا مرکب نکالا اور اسے دوسرے جانوروں کے دماغوں میں انجکشن کے ذریعے پہنچا دیا گیا۔ یہ جانور دوسرے جانوروں کی نسبت صرف چند منٹوں کے اندر اندر تیار ہو گئے۔ حالانکہ پہلے جانوروں پر کئی دن مشقت کرنی پڑی تھی۔ اس ضمن میں ایک اور تجربہ جیمز وی میکانیل نے مشی گن یونیورسٹی میں کیا۔ اس نے ڈیڑھ انچ لمبے کچھ کیچوے لئے (کیچوے کا دماغ سب سے زیادہ سادہ ہوتا ہے) کئی ہفتوں تک کیچوؤں کو ایک خاص قسم کی تربیت دی گئی وہ اسطرح کہ سب سے پہلے بجلی کا بلب روشن کیا جاتا۔ اور ساتھ ہی میکانیل کیچوؤں کو بجلی کا ہلکا سا جھٹکا بھی دیتے۔ رفتہ رفتہ کیچوے اتنے سدھ گئے کہ صرف بجلی روشن کر دینے سے اپنے جسم کو اسطرح سکیڑ لیتے جیسے انہیں بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ میکانیل نے یہ کیچوے دوسرے کیچوؤں کو کھلا دیتے جو نا تجربہ کار تھے۔ جب ان پر وہی عمل دہرایا گیا تو دو تین دن کے اندر وہ کیچوے سدھ گئے۔

سائنس داں تجربات کر چکے ہیں کہ خوبصورت جانوروں کے ڈی این اے بدصورت جانوروں میں منتقل کر دینے سے بدصورت جانور خوبصورت بن سکتے ہیں۔ گو کہ یہ تجربات زیادہ کامیاب نہیں ہوئے لیکن سائنس داں پُر امید ہیں۔

حال ہی میں امریکی سائنس ترقی کی انجمن نے ڈلاس میں ایک قومی کانفرنس بلائی جس میں تقریباً ۱۵۰۰ سائنس داں شریک ہوئے۔ اسمیں اس بات پر تفصیلی بحث ہوئی کہ ایک انسان دوسرے انسان کے تعاون کے بغیر صرف ڈی، این، اے کے عمل سے بچہ پیدا کر سکتا ہے یا نہیں؟ ننوے فی صد سائنسدانوں کا جواب مثبت میں تھا۔ یہ ایک تصوراتی نظریہ نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت ہے جو تجربات سے ثابت ہو چکی ہے۔

کچھ عرصے قبل حیاتیات کی ایک مشہور تجربہ گاہ میں سائنس دانوں نے نوجوان مینڈک کی کھال کا خلیہ لیا۔ ڈی، این، اے کا مرکب خاص تعداد میں موجود تھا۔ مینڈک کے ایک انڈے میں سے اسکا مرکزی حصہ نکال دیا گیا تجربے کے بعد ایسے مینڈک کی شکل میں تبدیل ہو گیا جو ظاہری شکل اور نسل کے اعتبار سے اسی مینڈک سے مشابہ تھا جسکی کھال کے ایک خلیے سے اس کی تخلیق ہوئی تھی۔

اس قسم کے تجربات سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا گیا کہ ایک مینڈک کے کروڑہا خلیات میں سے ہر خلیے میں اتنا ڈی این مرکب ہوتا ہے کہ اسمیں سے کروڑہا مینڈک پیدا کئے جا سکتے ہیں اب مسئلہ یہ درپیش ہے کہ کیا ڈی این اے کی مدد سے نئے انسان بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس ضمن میں کارنیل یونیورسٹی کے ماہر حیاتیات ڈاکٹر انتھونی بلیکر کا دعویٰ ہے کہ وہ اس منصوبے پر خاص تحقیق کر چکا ہے کہ جب ایک مینڈک سے کئی مینڈک پیدا ہو سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان پر یہ تجربہ کامیاب نہ ہو۔

بعض سائنسدانوں نے ایسے بھی تجربات کئے ہیں جن کے تحت احمق، بے وقوف اور جنگجو جانداروں میں سے ڈی این اے نکال کر صلح پسند جانوروں میں منتقل کی گئی تو ان میں جنگجو جانوروں جیسی عادتیں پیدا ہونے لگیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر ڈی، این اے کی مدد سے ایک شخص مجرم بن سکتا ہے اور ایک مجرم جرم کرنے سے بچ سکتا ہے۔ ڈی، این اے انسانی کروموسوم کو جس ترتیب سے کنٹرول کرتا ہے اس سے ماہرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس ترتیب میں تھوڑی سی تبدیلی کرنے سے انسان مجرم ہو سکتا ہے ایسا بچہ جسمیں ڈی، این اے کے ذریعے کروموسوم تبدیل کر دیئے گئے ہوں بڑا ہو کر لازمی طور پر مجرم بنے گا۔ خواہ اسے کتنے ہی اچھے ماحول میں کیوں نہ رکھا جائے۔

مندرجہ بالا تحقیقات کے علاوہ بھی دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں تجربہ گاہیں انسانی کروموسوم اور ڈی این اے پر شب وروز کام کررہی ہیں اور اب تک مندرجہ ذیل حقائق سے پردہ اٹھ چکا ہے۔

(۱) یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انسان میں سے ڈی، این اے نکال کر دوسرے انسان میں منتقل کر دیا جائے تو دوسرے انسان میں پہلے انسان کی سی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس حقیقت کے تحت ایک انسان تیار کیا جا سکتا ہے۔ جس میں ریل کی دانائی، آئین اسٹائن کی حکمت، پارلی میلین کا مزاح اور پا ہو لیکا سو کی سی گہرائی موجود ہو، بشرطیکہ ہمیں ان خصوصیات کے انسانوں کے جسم میں ڈی، این اے نکالنے کے مواقع میسر آجائیں۔ مستقبل میں سائنسدانوں اس بات کی کوشش کریں گے کہ جو بھی کوئی بڑا آدمی مرے اس کے جسم میں سے ڈی، این، اے نکال کو محفوظ کر لی جائے۔

(۲) ڈی، این اے دماغی اور جسمانی صلاحیتوں کو بھی تبدیل کر سکتا ہے چنانچہ مستقبل میں فاتح قومیں، مفتوحین کو اپنے مخصوص اغراض و مقاصد کے لئے بہتر طور پر استعمال کر سکیں گی۔

(۳) موجودہ دور کے بہت سے لوگوں کو جو قد، رنگ اور جسمانی اعتبار سے تمام اقوام سے مختلف ہیں مثلاً رنگ کے اعتبار سے حبشی، قد کے اعتبار سے چینی وغیرہ۔ ڈی، این اے کی مدد سے سائنس دان چاہیں تو انہیں عام انسانوں کے برابر یا مشابہ بنایا جا سکتا ہے۔

(۴) جب سے ڈی، این اے پر تحقیقات کرتے ہوئے یہ معلوم ہوا کہ ایک انسان کے خلیات میں سے ڈی این اے نکال کر ایک خلیہ کی مدد سے نیا انسان پیدا کیا جا سکتا ہے تو اس وقت سے مردوں میں نسل بڑھانے کی قوت کی اہمیت پہلے کی سی نہیں رہی ہے

(۵) ڈی، این اے کی دریافت سے انسانی جسم پر مختلف اثرات کے تجربات سامنے آتے تو مغربی عورتوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اب وہ حسب منشا اپنی شکل وصورت تبدیل کر سکیں گی اور زیادہ سے زیادہ خوبصورت بننے کا شوق پورا ہو جائے گا۔

محمد یوسف رضوی ایم۔ایس سی
سال چہارم "حیاتیات"

ٹیسٹ ٹیوب بے بی

۲۶ رجولائی ۱۹۷۸ء کو دنیا نے یہ حیرت انگیز خبر سنی ہے کہ گذشتہ شب گیارہ بجکر ۴۷ منٹ پر غیر طبعی طور پر سائنسی عمل کے ذریعے ٹیسٹ ٹیوب سے پیدا ہونے والا دنیا کا پہلا بچہ" عالم وجود میں آیا۔ پانچ پونڈ ۱۲ اونس وزن کی یہ بچی جس کا نام لوئی براؤن رکھا گیا ہے۔ شمالی انگلستان کے شہر اولڈہم کے سرخ اینٹوں والے عام اسپتال میں وقت مقررہ سے نو روز قبل پیدا ہوئی اس خبر نے جہاں اہل علم کے حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ وہیں طالبان علم کو حیرت میں ڈال دیا کہ آیا یہ سچ ہے یا.......؟ اور یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ کیا انسان خالق کائنات کا شریک بن گیا (نعوذ باللہ) کہ اتفاقی (ٹیسٹ ٹیوب) کے ذریعہ آدمی کا بچہ تخلیق کرنے لگا۔ آیئے ہم پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ یہ "کارنامہ" آخر کس طرح انجام پایا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں، دیگر جانداروں کیطرح انسانوں میں بھی نر اور مادہ دو طرح کے افراد پائے جاتے ہیں۔ ہر صنف کے افراد میں وہ مخصوص اعضاء پائے جاتے ہیں جنہیں صنفی اعضاء کہا جاتا ہے۔ یہی وہ اعضاء ہیں جو دو قسم کے افراد کو ایک دوسرے سے ممیز و ممتاز کرتے ہیں۔ نیز یہی وہ اعضاء ہیں جو عمل تولید میں حصّہ لیتے ہیں اور افزائش نسل کے ذمہ دار حیوانات کے نر تولیدی اعضاء انثئے کہلاتے ہیں جب کہ مادہ تولیدی اعضاء کو بیضدان کہا جاتا ہے۔ نر تولیدی عضوی یعنی انثئے میں منویے SPEAMS پائے جاتے ہیں جبکہ مادہ تولیدی عضو یعنی بیضدان میں بیضے۔

رحم مادر میں کسی نوزائیدہ فرد کی نشو و نما اس وقت شروع ہوتی ہے جب مادہ کا بیضہ رحم سے نکل کر" بار آور نلی" میں پہنچتا ہے اور نر کے منویے اس میں داخل ہوجاتے ہیں تو کوئی ایک منویہ بیضے کو بار آور کرتا ہے۔ اب اس بیضہ کو جگت ZYGOTE یا بار آور بیضہ کہتے ہیں۔ بیضے اور منویے کے ملاپ سے ہونے والا جگت متعدد خلیاتی تقسیمی عمل کے مراحل سے گذر کر کثیر خلوی ہوجاتا ہے۔ اور متعدد خانوں (خلیوں) پر مشتمل ایک ننھا سا گولہ بن جاتا ہے۔ جو بعد ازاں رحم مادر میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ رحم کی دیواروں میں پیوست ہوکر

ولادت تک کے عرصے میں نمو پاتا رہتا ہے خلیات سے بافتیں TISSUES اور بافتوں سے اعضاء بنتے ہیں بالآخر ایک مکمل جاندار جسم وجود میں آتا ہے۔ جو اپنے والدین سے شکل وفعل کے اعتبار سے بڑی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔

اگر رحم مادر کی بارآور نلی کسی نقص کی وجہ سے باروری FERTILIZATION کے قابل نہ رہے تو جگنہ نہیں بن پاتا۔ اور ایسی خواتین اولاد جیسی نعمت سے محروم رہتی ہیں۔ اور معاشرے میں بانجھ کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ اگرچہ بارآور نلی کی خرابی دور کئے جانے کے طریقے دریافت کئے جا چکے ہیں۔ لیکن بارآور نلی کی ناقابل درستگی کی صورت میں بانجھ خواتین کی گود ہری ہونے کی صورت صرف ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ بارآور نلی سے باہر بیضے کو بارآور کرایا جائے۔

بارآور نلی سے باہر بیضے کو بارآور کرنے کے لئے تجربات شروع کئے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۹ء میں اسٹیپ ٹو اور ایڈورڈس نامی سائنسداں پہلی مرتبہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ انسانی جسم سے باہر بارور شدہ بیضے کو رحم مادر میں کس طرح منتقل کیا جائے کہ رحم مادر اسے قبول کرلے۔ مگر سائنسداں اس میں کامیاب نہ ہو سکے اگرچہ بعض سائنسدانوں نے اس بات کا دعویٰ بھی کیا کہ ان کے بارور شدہ بیضے کو رحم مادر نے قبول کرلیا ہے مگر وہ اپنی اس بات کی صداقت میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہ کرسکے اور لڈھم عام اسپتال کے چھیاسٹھ سالہ گائناکالوجسٹ ڈاکٹر اسٹیپ ٹو اور ان کے ساتھی کیمبرج یونیورسٹی کے ماہر علم الابدان رابرٹ ایڈورڈ ہی وہ پہلے سائنسداں ہیں۔ جن کے ہاتھوں انسانی جسم سے باہر بارور کرائے ہوئے بیضے کو مسز براؤن کے رحم نے قبول کیا۔ انہوں نے مسز براؤن کے رحم سے بیضہ میکانیکی طریقے سے نکال کر اسے تجربہ گاہ کی طشتری میں رکھا اور اس کو مسٹر براؤن کے مادہ تولید سے ملا دیا۔ اس آمیزہ میں کیمیائی تعامل کے ساتھ ہی جب نمو DEVELOPMENT شروع ہو گئی یعنی بارور شدہ بیضے میں تقسیمی عمل شروع ہو گیا اور اس بات کی امید نظر آنے لگی کہ اب یہ بیضہ نمو پاکر نیا انسان بنائے گا تو اسے مسز براؤن کے رحم میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں وہ مضبوطی سے جم گیا اور قدرتی بالیدگی حاصل کرنے لگا یہاں تک کہ نمو کی متعینہ مدت کی تکمیل کے قریب پہونچ کر مسز براؤن کے بطن سے بچہ بخیر وخوبی تولد ہو گیا۔ یہاں یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے کہ لوئس براؤن کی نشو و نما امتحانی نلی میں ہوئی ہے بلکہ اس کے برخلاف اس کی پیدائش بالکل عام بچوں کی طرح ہوئی ہے۔

اور آج لیزلی براؤن دنیا کی وہ واحد خاتون ہیں جنہوں نے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کو جنم دیا۔ اور اولاد جیسی نعمت سے محروم خواتین کو یہ امید دلائی کہ اب ان کی گود ہری ہو سکے گی۔ مگر انسانوں کی اس کامیابی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انسان تخلیق کے قابل ہو گیا ہے۔ سراسر غلط ہے انسان تو

محض خالق کائنات کی عطا کی ہوئی عقل و دانش کے تحت تخلیق کے ثانوی مراحل سے آگاہ ہوا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسے ابھی تک "حیات کے بارے میں بھی صحیح علم نہیں کہ یہ کیا ہے؟ اور اس کی ابتداء کیوں کر ہوئی؟

جہاں تک انسانوں کی اس تازہ ترین کامیابی سے انسانی معاشرے میں پیدا ہونے والے اثرات کا تعلق ہے تو بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طریقۂ تولید سے پیدا ہونے والے نتائج کے ضرر رساں اثرات کے مقابلے میں اس کی افادیت بہت کم ہے۔ اولاد کی نعمت سے محروم جوڑے اس مصنوعی طریقۂ تولید کے ذریعے حاصل ہونے والی اولاد کے مقابلے میں لاوارث اور یتیم بچوں کو اپنا کر بھی اپنے جذبۂ مادری و پدری کی تسکین کر سکتے ہیں۔ جبکہ اس طریقۂ تولید کے عام ہونے کی صورت میں پیدا ہونے والی معاشرتی خرابیوں کا کوئی توڑ نہیں۔ اس بات کی کیا ضمانت دی جا سکتی ہے کہ ایسے بچوں کو بھرپور ماں کی ممتا اور باپ کا پیار ملے گا۔ اور وہ معاشرے میں ایک عجوبہ نہیں بنے گا۔ ٹیسٹ ٹیوب بچی لوئیس براؤن کی ماں لیزلی براؤن نے تو ابھی سے اس خدشے کا اظہار کر دیا ہے کہ اس کی بچی برسوں تک عوام کے تجسس اور دلچسپی کے لیے تختۂ مشق بنی رہے گی۔ اور اس کی بچی کو بھرپور مادرانہ توجہ نہیں مل سکے گی۔

نیز اس بات کے امکان کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں خواتین اس بوجھ کو اٹھانے سے ہی انکار کر دیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں پیدا ہونے والے بچے ہر قسم کی شفقت سے محروم رہیں گے۔ اور ان کی شفقت پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے گی۔ جب نامکمل شخصیت کے حامل افراد معاشرے میں اپنے قدم جمائیں گے۔ تو یہ معاشرہ پستی و ذلت کی جس گہرائی میں گرے گا۔ اس کا اندازہ مغربی ممالک کی موجودہ اخلاقی و معاشرتی پستی سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جہاں اس وقت بھی بچے ماں باپ کی محبت کے نتیجے میں جنم لیتے ہیں اور شکم مادر میں نو ماہ رہنے کے بعد آیاؤں کی گود میں آتے ہیں۔

نوشاد میاں
بی ایس سی (فائنل)

موتی بھی کیا شے ہے؟

جی ہاں! صاحب موتی بھی کیا شے ہے۔ سیپی کے خول میں پرورش پانے والا یہ موتی کبھی کسی ملکہ کے حسن کی زینت بنتا ہے۔ تو کبھی کسی ملک کی تجارت کا ذریعہ! لیکن آپ نے کبھی یہ سوچا کہ موتی آخر ہے کیا چیز؟ عربوں کا خیال ہے کہ موتی دراصل شبنم کا وہ قطرہ ہے جو چاند کی روشنی لے کر سمندر میں گرتا ہے۔ شبنم کے اس قطرہ کو "اسٹورا مچھلی" (OYSTER FISH) نگل لیتی ہے جس کے بعد یہ قطرہ مائع سے ٹھوس شکل اختیار کر لیتا ہے۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ انسانوں کو جو سب سے پہلا قیمتی "پتھر" ملا وہ موتی ہی تھا۔ موتیوں کی نقل بنانے کی بہت سی کوششیں کی جا چکی ہیں شیشے کے موتیوں پر موتی نما مادہ PEARL SUBSTANCE لگا کر اسے اصلی موتی کا روپ دینا اب ایک عام بات ہے۔ آج سے صدیوں پہلے چینی یہ جانتے تھے کہ اگر شیشے کے موتیوں کو صدفی جلوان کے خول میں رکھ دیا جائے تو جلوان فوراً اسے ایک مخصوص قسم کے مادے سے ڈھانپنا شروع کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک خاص عرصہ میں موتی تیار ہو جاتا ہے اس قسم کے موتی ثقافتی موتی کہلاتے ہیں۔

ثقافتی موتی بنانا اتنا آسان کام نہیں جتنا کہ یہ نظر آتا ہے۔ جاپان کے ثقافتی موتی بنانے والی صنعت کے سربراہ کے ایک اندازے کے مطابق اس کام میں ۴۵ فیصد صدفی جلوان مر جاتے ہیں ثقافتی موتی اور قدرتی موتی میں اس قدر مشابہت ہوتی ہے کہ جدید سائنسی آلات کے استعمال کے بغیر ان میں کسی فرق کو واضح نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ثقافتی موتی کی آب و تاب بھی اصلی موتی جیسی ہی ہوتی ہے۔

قدرتی موتی صدفی حیوانات مثلاً اوسٹر اور لوبیو وغیرہ کے خول کے اندر پائے جاتے ہیں۔ یہ موتی خلیج فارس، بحر احمر، بحر الکاہل، اور کیلیفورنیا کے ساحل کے قریب گرم پانی میں افزائش پاتے ہیں۔ سب سے زیادہ قیمتی موتی خلیج فارس کے گرم پانی میں ملتا ہے۔ غوطہ خور سطح سمندر سے پچاس تا ڈیڑھ سو فٹ نیچے غوطہ لگا کر اوسٹر جمع کرتے ہیں۔ بیشتر غوطہ خوروں کو ایسے اوسٹر مل جاتے ہیں جن میں

موتی مل جاتے ہیں۔ ان میں سے چند اوسطر میں زیادہ قیمتی موتی بھی ہوتے ہیں۔

آپ نے سمندری خول ضرور دیکھے ہوں گے جن پر چمکدار لکیریں ہوتی ہیں۔ یہ لکیریں نیکریس کی تہہ سے بنتی ہے نیکریس بنانے کیلئے صدفی حیوان جو کیمیائی مادہ استعمال کرتا ہے' وہ دراصل کیلشیم کاربونیٹ کی شکل ہوتی ہے جسے ارگونائیٹ کہتے ہیں۔ موتی بننے کی ابتدا اسی وقت ہوتی ہے جب ریت کا کوئی ذرہ یا کوئی طفیلی کسی مولسکا کے خول میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور خول کے اندر رہنے والے حیوان کے MANTLE میں پھنس جاتا ہے۔ اور اس پر ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس ہیجانی کیفیت کو دور کرنے کے لئے مولسکا داخل ہونے والے کو نیکریس کی پتلی سی تہہ میں گھسا لیتا ہے۔ ماہ و سال کے گزرنے کے ساتھ ساتھ نیکریس کی مقدار میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ موتی اچھا خاصہ بڑا ہو جاتا ہے حیوان کے عضلات اسی چیز سے نجات حاصل کرنے کے لئے سکڑتے اور پھیلتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے نیکریس کی تہہ چکنی ہو جاتی ہے۔ اور یہ گول ہو جاتا ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے خوبصورت گول شکل کا موتی وجود میں آتا ہے۔

سارے موتی شکل میں گول نہیں ہوتے بعض موتیوں کی شکل بے قاعدہ بھی ہوتی ہے۔ جنہیں BEROQUE PEARL کہتے ہیں۔ اس قسم کے موتیوں میں ناشپاتی نما موتی سب سے خوبصورت ہوتے ہیں بعض اوقات طفیلی خول میں سوراخ کر لیتے ہیں۔ اور مولسکا حفاظتی اقدامات کے طور پر اس طفیلی کو نیکریس مادے سے گھیر لیتا ہے۔ اس طرح سے بلسٹر موتی BLISTER PEARL بنتا ہے۔ یہ گول لیکن نسبتاً چپٹا ہوتا ہے ان بے قاعدہ شکل کے موتیوں کو مختلف زیورات میں استعمال کیا جاتا ہے تاہم یہ گول موتی سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتے۔

موتی مختلف رنگوں میں پایا جاتا ہے جن میں گلابی، سفید، سیاہ اور مکھن رنگ کے موتی قابل ذکر ہیں۔ موتی کے رنگ کا تعین مختلف چیزیں کرتی ہیں جن میں مولسکا کی صحت' پانی کا درجۂ حرارت، پانی میں پائے جانے والے معدنیات و کیمیائی مرکبات شامل ہیں جب روشنی کی شعاعیں نیکریس میں داخل ہوتی ہیں۔ تو انتشارِ نور کے تحت یہ مختلف رنگوں میں منتشر ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موتی سے مختلف قسم کی شعاعیں نکلتی دکھائی دیتی ہیں۔

سب سے عمدہ قسم کے موتی بحرین کے قریب خلیج فارس سے دستیاب ہوتے ہیں۔ یہاں موتیوں کی تلاش کا مہینہ مئی میں شروع ہوتا ہے حکومت جب اس موسم کا اعلان کرتی ہے تو سینکڑوں کشتیوں کا بیڑا جسے DHOWS کہتے ہیں بندرگاہ پر جمع ہو جاتا ہے یہ لوگ خلیج فارس میں مختلف مقامات سے اپنی مہم کا آغاز کرتے ہیں غوطہ خور جوڑوں کی شکل میں کام کرتے ہیں ایک شخص غوطہ لگاتا ہے تو دوسرا کشتی میں اسے سطح

محمد عارف صدیقی

ایم۔ایس سی طبیعات سال اول

آئن اسٹائن

واشنگٹن (امریکا) کی ایک خوبصورت شام کا ذکر ہے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی رکی درمیانہ ڈبے سے ایک خمیدہ پشت بوڑھا جس کے بال روئی کے گالوں کی مانند سفید تھے۔ اترا، چند لوگوں نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور پھر وہ ہلکے ہلکے قدموں سے ایک جانب بڑھنے لگا پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ایک شخص نے اپنے بچے کی توجہ اس بوڑھے شخص کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا "بیٹا دیکھو اور اس عظیم لمحے کو اپنی آنکھوں میں سمولو" بچے نے نہ سمجھنے والے انداز میں باپ کی طرف دیکھا اور پھر اس بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ کون ہے؟ اس شخص نے کہا" بیٹا تم دنیا کے ان خوش نصیبوں میں سے ہو جنہوں نے صدی کے عظیم سائنسدان آئن اسٹائن کو دیکھا ہے وہ آئن اسٹائن ہے"

البرٹ آئن اسٹائن اس صدی کا یقیناً سب سے عظیم سائنسدان ہے جس نے طبیعات کی دنیا میں تہلکہ مچادیا اور ایسے نظریات پیش کیے جنہوں نے نیوٹن کے بہت سے قوانین کو یا تو بالکل تبدیل کردیا یا ان میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کیں۔ آئن اسٹائن جتنا عظیم سائنسدان تھا بچپن کے واقعات کو دیکھتے ہوئے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنی شہرت حاصل کرے گا۔ وہ ۱۴ مارچ ۱۸۷۹ کو جرمنی میں پیدا ہوا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو والدین نے اسے اسکول میں داخل کرادیا۔ لیکن اسکول کے اساتذہ نے اسے کند ذہن اور غبی جیسے خطابات سے نوازا۔ اسکول میں وہ کلاس میں سب سے الگ بیٹھتا اور اپنی سوچوں میں گم رہتا۔ استاد اگر کوئی سوال کرتے تو وہ ان کے الٹے سیدھے جواب دیتا۔ استادوں کے خیال میں وہ اس قابل بالکل نہیں تھا کہ مزید تعلیم حاصل کرے۔ پندرہ سال کی عمر میں اس کے والد کو کاروبار میں نقصان ہوا۔ اور وہ جرمنی سے اٹلی منتقل ہوگئے۔

آئن اسٹائن نے سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورچ میں ایک ٹیکنیکل اسکول میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۰۰ میں اس نے اپنی تعلیم مکمل کرلی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کسی اسکول میں پڑھانا شروع کرے گا لیکن اسے کسی اسکول میں نوکری تو نہ مل سکی

البتہ ایک دفتر میں کلرک کی جگہ مل گئی۔ کلرکی اسے پسند تو نہ تھی۔ لیکن اس نے اسی پر قناعت کی تاکہ وہ اس سے کم از کم ضروریات زندگی تو پوری کر سکے اس نے اپنے بیشتر نظریات اسی دور میں لکھے۔ ۱۹۰۵ء میں جبکہ اس کی عمر صرف ۲۶ سال تھی۔ اس نے روشنی کی رفتار، کشش ثقل، زمین کی حرکت اور تابکاری پر اپنے نظریات پیش کئے۔

اس وقت تک علم طبیعیات کا ڈھانچہ اس بنیاد پر کھڑا تھا کہ "مادہ اور توانائی دو الگ الگ چیزیں ہیں جو نہ پیدا کی جا سکتی ہیں اور نہ ہی تباہ کی جا سکتی ہیں۔ روشنی غیر مادی شے ہے اور وہ خلا میں سفر نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس پر کشش ثقل کا اثر ہو سکتا ہے تابکاری اور تابکار عناصر پر مادام کیوری نے تحقیقات کی تھی لیکن یہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا تھا کہ ان عناصر سے توانائی کی لہریں کیوں نکلتی ہیں اور یہ توانائی آتی کہاں سے ہے
آئن اسٹائن نے ان تمام مسائل کا حل ریاضی کی مدد سے نکالا۔ اس نے بتایا کہ زمین سورج کے مقابلے میں جو حرکت کرتی ہے وہ ایک خاص وضع کی ہے اور مریخ کے مقابلے میں جو حرکت کرتی ہے وہ ایک دوسرے کی وضع کی ہے اس طرح تمام اجرام فلکی کے مقابلے میں زمین جو حرکت کرتی ہے اس کا جو مقام ہے، اس کی جو رفتار ہے، وہ مختلف وضع کی ہوگی آئن اسٹائن نے یہ حیرت انگیز نظریہ بھی پیش کیا کہ مادہ اور توانائی درحقیقت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی چیز کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ مادہ اور توانائی کا رشتہ اس نے اپنے مشہور فارمولے $E = mc^2$ سے ظاہر کیا۔

آئن اسٹائن کے ان نظریوں نے اسے عظیم سائنسدان بنا دیا۔ اور اس شہرت کی بناء پر اسے پراگ یونیورسٹی میں نوکری مل گئی اور اسے ایک تحقیقاتی ادارے "قیصر ولہلم فزکس انسٹی ٹیوٹ" کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں آئن اسٹائن نے اپنے نظریات پر مشتمل ایک کتابچہ شائع کیا جس میں اس نے بتایا کہ نیوٹن کے کشش ثقل کے قوانین میں چند خرابیاں ہیں جو بڑے جسامتوں والے اجسام مثلاً سورج میں زیادہ ظاہر ہیں۔ اپنے نظریات میں آئن اسٹائن نے یہ بھی کہا کہ جب روشنی کی لہریں سورج کے قریب سے گزرتی ہیں تو اسکی کشش کی وجہ سے ایک طرف جھک جاتی ہے۔ اور اپنا راستہ تبدیل کر دیتی ہیں۔ ۲۹ مارچ ۱۹۱۹ء کو ایک سورج گہن ہونے والا تھا۔ یہ سورج گہن طبیعات والوں اور ریاضی والوں کے لئے بہت اہم تھا۔ انگلستان کے ایک مشہور فلکیاتی ادارے "رائل ایسٹرونومیکل سوسائٹی" کے ماہر فلکیات اس سورج گہن کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اس سورج گہن سے انہیں آئن اسٹائن کے اس انقلابی نظریہ کو جانچنے کا موقع مل رہا تھا۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ سورج گہن کے وقت ستارے اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے نظر آئیں گے۔ کیونکہ جب ستاروں کی روشنی سورج کے قریب سے گزرے گی تو اس کی کشش کی وجہ سے اپنا راستہ تبدیل کر دے گی۔ اور اگر یہ نظریہ صحیح ثابت ہو گیا

لو دو گھبرس بیشتر نیوٹن نے کائنات کی جو تصویر پیش کی تھی وہ غلط ثابت ہو جاتی۔ ماہرین کی ایک جماعت برازیل میں اور دوسری جماعت مغربی افریقہ کے ایک جزیرے میں متعین تھی۔ یہ انتظامات سورج گہن کی وجہ سے اندھیرا چھانے کے بعد ستاروں کی تصویریں اتارنے کیلئے کئے گئے تھے سورج گہن کا دن آیا۔ ماہرین نے تصویریں اتاریں اور ان تصاویر کا موازنہ ان تصاویر سے کیا جو رات کے وقت اتاری تھیں۔ جس وقت سورج کا نام ونشان بھی وہاں نہیں تھا۔ اور ماہرین نے یہ حیرت انگیز نتائج دیکھ کر واقعی دن کے وقت روشنی کی لہروں نے اپنا راستہ تبدیل کردیا تھا۔ اس طرح آئن اسٹائن کا نظریہ صحیح ثابت ہوا اور اس کے بعد سے آئن اسٹائن کو نیوٹن کے بعد دنیا کا سب سے بڑا سائنسی مفکر تسلیم کرلیا گیا۔

اس کے بعد آئن اسٹائن نے دو نظریات اور پیش کیے ایک تو یہ کہ چند دھاتوں پر مخصوص روشنی ڈالنے سے الیکٹران باہر کیوں نکلتے ہیں ضیا برقی اثر (PHOTO ELECTRIC EFFECT) کا نظریہ اور اس کی منطقی توجیہ پیش کرنے پر اسے ۱۹۲۱ء میں نوبل انعام بھی دیا گیا۔ دوسرا نظریہ مائعات اور گیسوں میں آزاد الیکٹران کی حرکت براؤنی حرکت (BRO-WIAN MOTION) کی تحقیقات پر بھی اسے اعزاز ملا تھا۔ یہ وہ مسئلہ تھا جس کے لئے سائنسدان تقریباً اسی سال سے پریشان تھے۔

یہ وہ دور تھا جب آئن اسٹائن مسلسل اپنی تحقیقات میں مشغول تھا۔ ادھر جرمنی میں نازی پارٹی یہودیوں کے خلاف زبردست مہم چلا رہی تھی۔ آخرکار ۱۹۳۳ء میں جرمنی میں نازی پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی۔ ان دنوں آئن اسٹائن امریکہ میں مقیم تھا۔ لہذا اس نے جرمنی جانا مناسب نہ سمجھا امریکی صدر روزویلٹ نے ۱۹۴۰ء میں سینٹ کا ہنگامی اجلاس بلایا اور ایک بل فوری طور پر پاس کیا گیا جس کے تحت آئن اسٹائن کو امریکہ کی شہریت دیدی گئی ادھر جرمنی میں نازی پارٹی کے ارکان نے اس کی تمام تصنیفات کو آگ لگا دی تھی۔

۱۹۳۸-۳۹ء میں چند سائنسدانوں نے امریکہ میں چند کامیاب تجربات کیے اور آئن اسٹائن نے ان تجربات کی روشنی میں چند خاص نتائج اخذ کیے جس کے ذریعے جوہر کو توڑنا ممکن ہوا جس کے نتیجے میں زبردست توانائی حاصل ہوئی۔

۱۹۳۹ء میں آئن اسٹائن نے امریکی صدر روزویلٹ کو ایک خط لکھا۔ جس میں یہ بتایا کہ ایٹم بم یا جوہری بم بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے فوراً ہی بجٹ کی منظوری دے دی گئی۔ یہی وہ ایٹم بم تھے جو اگست ۱۹۴۵ء میں جاپان پر گرائے جس سے لاکھوں انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ آئن اسٹائن نے اپنی تحقیقات انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کردی تھیں۔ لیکن اس نے بہرحال ایسا فارمولا دے دیا جو انسان اور انسانیت کو تباہی کے راستے کی طرف لے جاتا ہے اگر یہی جوہری توانائی زرعی اور صنعتی ترقی کے لئے استعمال کی جائے تو اس سے سینکڑوں مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اور حل ہو رہے ہیں۔ لیکن مقصد تبدیل ہوتے ہی یہ فارمولا

(بقیہ صفحہ ۴۷۵)

قمر الحسن
ایم۔ ایس سی
سال اول طبیعات

بجلی

انسان کی سب سے اہم بنیادی ضرورت

۱۷ جون ۱۹۷۹ء کا دن کراچی کے شہریوں کے نہایت قیامت خیز ثابت ہوا۔ اتنی شدید گرمی پڑی کہ گزشتہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ پچھلے ۲۶ سال کے دوران اتنی شدید گرمی نہیں پڑی تھی جتنی اس دن پڑی صبح ہونے کے بعد جوں جوں سورج بلند ہوتا گیا ویسے ویسے اسکی تمازت میں اضافہ ہوتا گیا۔ دوپہر تک گرمی اپنے شباب پر تھی ساتھ ہی ساتھ لو بھی چل رہی تھی۔ اتنی شدید گرمی کہ کسی پل چین بھی نہیں مل رہا تھا۔ بقول میر انیس ؎

گرمی وہ لو وہ آفتاب کی حدت وتاب وتب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن مثال شب

اچانک بجلی فیل ہوگئی پنکھے جو چل رہے تھے رک گئے اور ان کی وجہ سے جو ہوا مل رہی تھی بند ہوگئی۔ گھر جہنم کا نمونہ بن گئے معلوم ہوتا تھا جیسے بھٹیوں کے منہ کھل گئے ہوں صحیح معنوں میں اسوقت احساس ہوا کہ بجلی انسان کے لئے کتنی ضروری ہے۔ انسان نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اور آسائشوں کا اتنا عادی ہوگیا کہ اب یہ چیزیں ضروریات زندگی میں شامل ہوگئی ہیں اور انسان اپنی ہی بنائی ہوئی چیزوں کا غلام بن گیا ہے اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ انسان کی ضروریات میں سب سے اہم چیز بجلی ہے۔ جس کے بغیر زندگی کا نظام معطل ہوجاتا ہے۔

برقی رو کا علم تو انسان کو صدیوں پہلے ہوگیا تھا۔ اور وہ اسے استعمال کرنے کے نت نئے طریقے بھی وقتاً فوقتاً دریافت کرتا رہا تھا لیکن برقی رو کی جتنی ضرورت آج کے دور میں ہے شاید پہلے کبھی اتنی نہ تھی عام آدمی کو بجلی کی ضرورت زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں محسوس ہوتی ہے لیکن برقی رو کے بارے میں تمام باتیں ہر شخص کو معلوم نہیں ہوتیں۔ زیر نظر مضمون میں ہم بجلی گھر اور برقی رو کی بجلی گھر سے عام آدمی تک ترسیل کے تمام مراحل کا جائزہ لیں گے۔

برقی رو کا نظریہ یہ ہے کہ جب مقناطیسی نفاذ (MAGNETIC LINE OF FLUX) کو کوئی موصل (Conductor) کاٹتا ہے۔ تو اس میں آزاد الیکٹران بہنے لگتے ہیں۔ آزاد الیکٹرانوں کا یہ بہاؤ برقی رو کہلاتا ہے اور اسی اصول پر بڑے بڑے برقی جنک (جنریٹر) بنائے

جاتے ہیں۔

بجلی گھر کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

جوشدان	چرخاب	جنک
بوائلر	ٹربائین	جنریٹر

جوشدان میں پانی کو بھاپ میں تبدیل کیا جاتا ہے اس مقصد کے لئے لوہے کا ایک بہت بڑا حوض (جسکی اپنی مخصوص شکل ہوتی ہے) استعمال کرتے ہیں۔ جس کے نیچے ایک بہت بڑی بھٹی ہوتی ہے۔ جسکا درجۂ حرارت کئی سو ڈگری ہوتا ہے جوشدان میں پانی بھاپ میں تبدیل ہو کر ایک طاقت کے ساتھ چرخاب پر پڑتی ہے۔ اور اس کے پنکھے کو گھماتی ہے جس سے چرخاب گھومتا ہے یہ چرخاب جنک کے گردشیہ (ROALER) کو گھماتی ہے جو ایک بہت طاقتور مقناطیس ہوتا ہے اور اس کے گھومنے سے جنک کے سکونیہ (STATOR) میں رو پیدا ہوتی ہے۔ جو حاصل کر لیا جاتا ہے بجلی گھروں میں چرخاب کو مختلف طریقوں سے گھمایا جا سکتا ہے۔

پن بجلی گھر :۔ اس میں چرخاب دریاؤں پر بند باندھ کر اور اوپر سے پانی گرا کر چلائے جاتے ہیں۔ پانی اوپر سے طاقت کے ساتھ چرخاب کے پنکھوں پر گرتا ہے جس سے وہ چلتے ہیں۔

حرکی (تھرمل) بجلی گھر :۔ ایسے بجلی گھروں میں چرخاب بھاپ کی مدد سے چلائے جاتے ہیں جبکہ میں ایندھن کے طور پر گیس یا تیل استعمال کیا جاتا ہے۔ گیس سے چلنے والے چرخاب گیس چرخاب کہلاتے ہیں۔

جوہری (ایٹمی) بجلی گھر :۔ جوہری بجلی گھر میں بھی چرخاب بھاپ سے چلتے ہیں صرف پانی کو بھاپ میں تبدیل کرنے کے لئے جو حرارت کی ضرورت ہوتی ہے اسمیں جوہری توانائی استعمال کی جاتی ہے۔

بجلی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جب یہ کسی موصل میں سے گذرتی ہے تو اس میں مقناطیسی قوت پیدا کر دیتی ہے۔ اور یہ قوت قدرتی مقناطیس کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی ہے لہذا بڑے جنکوں میں قدرتی مقناطیس کے بجائے برقی مقناطیس استعمال کرتے ہیں جنک کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا جنک اور منسلک ہوتا ہے جسے رہنما جنک کہتے ہیں یا برق انگیز (EXCITOR) کہتے ہیں اس میں قدرتی مقناطیس لگا ہوتا ہے۔ جب چرخاب گھومتا ہے۔ تو برق انگیز (EXCITOR) میں رو پیدا ہوتی ہے جسے حاصل کر کے صدر جنک (MAIN GENERATOR) کے گھومنے والے حصے کو دیتے ہیں جسکی وجہ سے برقی مقناطیس (ELECTRO MAGNET) بن جاتا ہے اور چونکہ وہ چرخاب کے ساتھ پہلے ہی گھوم رہا ہوتا ہے اس لئے سکونیہ میں رو پیدا ہوتی ہے۔ یہ رو جو کہ بہت زیادہ ہوتی ہے حاصل کر لی جاتی ہے۔

قوت (وولٹیج) اور رو دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ وولٹیج وہ قوت ہے جو آزاد الیکٹران کو بہنے پر مجبور کرتی ہے جب کہ رو الیکٹرانوں کے بہاؤ کو کہتے ہیں وولٹیج اور رو آپس میں بالعکس متناسب (INVERSELY PROPOTIONAL) ہیں یعنی :۔ ($V \propto \frac{1}{I}$ یا مستقل = VI) رو کی بڑی مقدار کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے موٹے موصل استعمال کرنے پڑتے ہیں جبکہ زیادہ وولٹیج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے موٹے موصل استعمال نہیں کرنے پڑتے، اگر ہم بجلی کی طاقت میں رو کو کم کر دیں تو وولٹیج کی مقدار

بندھ جاتی ہے یہی قانون ہم بجلی کی طاقت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ برقی رو بجلی گھر سے ایک عام آدمی جنہیں صارف (CONSUMER) کہا جاتا ہے۔ تک پہنچنے میں مندرجہ ذیل مراحل سے گزرتی ہے

(۱) بجلی گھر

(۲) ٹرانسمیشن لائن یا ترسیلی تار

(۳) گرڈ اسٹیشن یا گرڈ مرکز

(۴) پرائمری لائن۔ اولی تار یا ابتدائی تار

(۵) سب اسٹیشن یا ذیلی مرکز

(۶) ڈسٹری بیوشن لائن یا تقسیمی تار

جنک سے بجلی حاصل کرنے کے بعد اسے ایک بدل گر یا ٹرانسفارمر تک لے جایا جاتا ہے جہاں رو کو کم اور وولٹیج بہت زیادہ کیے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک جنک ۱۲۵ میگا واٹ بجلی پیدا کرتا ہے تو اس سے تقریباً ۱۸ کلو وولٹ (18 KV) حاصل ہوتے ہیں۔ اور رو تقریباً (۶ کلو ایمپیئر) حاصل ہوتی ہے۔ اس 18KV کو بدل گر کے ذریعے ایک لاکھ بتیس ہزار وولٹ 132 KV میں تبدیل کرتے ہیں اس سے رو کم ہو کر تقریباً آٹھ سو ایمپیئر رہ جاتی ہے۔ برقی رو کو 132 KV کے بڑے بڑے مینار پر موصل باندھ کر یا زمین دوز طناب CABLE ڈال کر دور تک لے جایا جا سکتا ہے۔ یہ مینار ترسیلی مینار ٹرانسمیشن ٹاور کہلاتے ہیں جبکہ ترسیل کے اس نظام کو ترسیلی نظام ٹرانسمیشن سسٹم یا گرڈ GRID یا زائد بلند قوۃ (EXTRA HIGH TENTION) کہتے ہیں۔ ترسیلی تار، ترانسمیشن لائن کے ذریعے برقی رو گرڈ مرکز (GRID STN) تک لے جائی جاتی ہے یہاں 132 KV کو گیارہ ہزار وولٹ 11 KV میں تبدیل

کیا جاتا ہے۔ ترسیلی نظام 132 KV کے علاوہ 66 KV کا بھی ہوتا ہے۔ گرڈ مرکز (گرڈ اسٹیشن) تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

(۱) 132 KV دور شکن (سرکٹ بریکرز)

(۲) بدل گر (ٹرانسفارمر)

(۳) 11 KV دور شکن (سرکٹ بریکرز)

ترسیلی مینار سے برقی رو دور شکن CIRCUIT 132 KV (BREAKERS میں داخل ہوتی ہے۔ جہاں سے یہ نزدلی بدل گر STEP DOWN TRANSF ORMER) میں جاتی ہے یہاں یہ بدل گر 132 KV کو 11 KV میں تبدیل کرتا ہے گیارہ ہزار وولٹ بلند قوت HIGH TENTION کہلاتے ہیں بدل گر کے بعد برقی رو بلند قوت دور شکن HIGH BREAKERS میں آتی ہے اور یہاں سے یہ رو مختلف علاقوں اور جگہوں تک پہنچائی جاتی ہے۔

کسی شہر میں کتنے گرڈ مراکز ہیں یہ اس علاقے کی آبادی، رقبہ، بجلی کی ضرورت اور اس کی پیداوار پر منحصر ہے۔ گرڈ مراکز باہم منسلک INTER CO NNECTED) ہوتے ہیں۔ تاکہ وقت ضرورت اگر ایک طرف سے برقی رو کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو دوسری جانب سے سلسلہ بحال کیا جا سکے۔

ہمارے ملک میں تمام گرڈ مراکز باہم متصل (Inter connected) ہیں یہ سلسلہ قومی گرڈ نیشنل گرڈ کہلاتا ہے

گرڈ مراکز آپس میں تین طریقے سے منسلک ہو سکتے ہیں

(۱) نیم قطری نظام، ریڈیل سسٹم

(۲) حلقوی نظام یا رنگ سسٹم
(۳) جالی دار نظام یا نیٹ سسٹم

گرڈ مرکز سے برقی رو KV 11 کے ذریعے مختلف علاقوں تک پہنچائی جاتی ہے گیارہ ہزار وولٹ ابتدائی صدر/پرائمری MAIN PRIMARY یا فیڈر (FEEDER) کہلاتے ہیں اس تار کے ذریعے برقی رو ذیلی مرکز تک آتی ہے۔ جو تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

(۱) بلند قوت بٹن گیرہ (H.T. SWITCH GEAR

یہاں سے برقی رو نزولی بدل گر STEP DOWN (TRANSFORMER تک آتی ہے جہاں یہ KV 11 کو ۴۴۰ وولٹ میں تبدیل کرتا ہے پھر یہاں سے برقی رو پست قوۃ لوح (LOW TENTION PANEL) تک آتی ہے یہاں گداز ہ (فیوز) لگے ہوئے ہوتے ہیں اس لوح الات گیر (PANEL) کے ذریعے برقی رو مختلف جگہوں تک لے جائی جاتی ہے۔ شہری آبادی والے علاقوں میں برقی رو کھمبوں پر تانبے کے تار باندھ کر مختلف علاقوں میں پھیلائی جاتی ہے گنجان آباد علاقوں میں جہاں ذیلی مرکز بنانے کی جگہ نہیں ہوتی وہاں پر کھمبا لگا کر بدل گر لگائے جاتے ہیں جو گیارہ ہزار وولٹ کو ۴۴۰ وولٹ میں تبدیل کرتے ہیں۔ یہ بدل گر پی۔ ایم۔ٹی (POLE MOUNTED TRANSFO کھمبے پر نصب کردہ بدل گر کہلاتا ہے۔

دو ہیتوں (فیزوں) کے درمیان ۴۴۰ وولٹ ہوتے ہیں جبکہ ہیت (فیز) اور ٹھنڈے تار (نیوٹرل) کے درمیان ۲۲۰ وولٹ ہوتے ہیں جو عام طور پر گھروں میں روشنی، ٹی وی، فریج وغیرہ کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

بجلی اتنے مرحلے سے گزر کر ایک صارف تک پہنچتی ہے اور ان مراحل میں ہر جگہ کسی وقت بھی کسی خرابی کے امکانات موجود رہتے ہیں۔ خواہ جنک خراب ہو جائے، تار ٹوٹ جائیں، زمین دوز طناب پھٹ جائے، بٹن خراب ہو جائے۔ یا بدل گر کام کرنا چھوڑ دیں۔ ان تمام صورتوں میں بجلی کا سلسلہ منقطع ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ان تمام آلات کی مناسب دیکھ بھال اور تسلی بخش مرمت ہوتی رہے۔ تو خرابی کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں باوجود اس کے اب تک برقی صناعیات (الیکٹریکل ٹیکنالوجی) نے بہت ترقی کر لی ہے لیکن بجلی کی فراہمی منقطع ہونے اور کسی خرابی کے پیدا ہونے کے امکانات مسلسل موجود ہیں۔

شعیب حسن خان
ایم ایس سی
(سال اول) طبیعات

ہوائیہ

پیرس (فرانس) میں جو میز بین الاقوامی کپ مقابلے کا فائنل پاکستان اور مغربی جرمنی کے درمیان ہونے والا تھا۔ وقت کم تھا۔ بھاگم بھاگ گھر پہنچا ریڈیو کھولا آنکھوں دیکھا حال بتایا جا رہا تھا۔ پاکستان نے جرمنی پر ایک گول کی سبقت حاصل کر لی تھی۔ یہ سن کر اطمینان ہوا۔ کپڑے وغیرہ بدل کر آرام سے بیٹھا آنکھوں دیکھا حال سنتا رہا اور جب پاکستان نے میچ جیت لیا تو نہایت اطمینان و سکون سے ریڈیو بند کیا اور لیٹ گیا اسی وقت ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر ریڈیو ایجاد نہ ہوتا تو اس وقت کیا ہوتا خیالات کی دنیا میں کھو گیا اور جب ابھرا تو سارا نظام ذہن میں تازہ ہو چکا تھا سوچا اسے کالج مخزن کے لئے کیوں نہ قلمبند کر دوں۔

مرسل (ٹرانسمیٹر) ایک ایسی (ELECTRONIC) مشین ہے جس کا کام آواز یا کسی اشارہ کو نشر کرنا ہوتا ہے۔ یہ نشریات دور دور تک ریڈیو پر سنی جا سکتی ہیں ورنہ عام طور پر آواز کو زیادہ دور تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ مرسل سے جو ریڈیائی لہریں نشر ہوتی ہیں وہ ہوا، بارش اور موسمیاتی تبدیلیوں وغیرہ سے زیادہ متاثر نہیں اس لئے ان کا سفر بہت طویل یعنی ہزاروں لاکھوں میل تک ہو سکتا ہے۔

مرسل (ٹرانسمیٹر) کے شروع میں ایک سلیکون (SILICAN) کا قلم (X - TAL) ریڈیو سسٹم کے حلقہ میں لگا دیا جاتا ہے اس میں اسطرح ایک خاص تعدد (FREQ - UENCY) کی ریڈیائی لہریں بننی شروع ہو جاتی ہیں اس پہلے مرحلے کو ارتعاش شندہ (OSCILL - ATOR) کہتے ہیں۔ پھر ان ریڈیائی لہروں کو جو کہ بہت کمزور ہوتی ہیں اگلے ریڈیو سسٹم کے مرحلہ سے وابستہ کر دیا جاتا ہے جس کو حاجب مرحلہ (BUFFER STAGE) کہتے ہیں۔ اس مرحلہ میں ان کمزور ارتعاشوں (OSCILLATIONS) کو برائے نام افزوں (AMPLIFY) کیا جاتا ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ حاجب لگنے کی وجہ سے ارتعاش قائم ہو جاتا ہے یعنی جو تعدد پہلے بنی تھیں وہ تبدیل نہیں ہوتی۔ اس کے بعد تیسرے مرحلہ

میں ان ارتعاشوں کو افزوں کر کے قدرے طاقتور بنایا جاتا ہے جتنے مرحلے میں قلم کے تعدد کو دو گنا یا تین گنا (اگر ضرورت ہو تو) کیا جاتا ہے اس مرحلہ کو افزائندہ یا حنارب مرحلہ کہا جاتا ہے اسی طرح چار یا پانچ یا چھ مرحلوں میں مطلوبہ تعدد اور مطلوبہ طاقت حاصل کر کے اس کو فیڈر لائنوں کے ذریعے ہوائیہ میں پہنچایا جاتا ہے یہ ہوائیہ تانبے کے کئی گز تار ہوتے ہیں جن کو مختلف ڈیزائنوں میں تیار کیا جاتا ہے یہ ریڈیائی لہریں ہوائیہ کے تاروں میں پہنچ کر برق مقناطیسی لہریں (ELECTRO MAGNATIC WAVES) بن جاتی ہیں اور یہ لہریں ہوا، خلا یا بادل ہر جگہ سے گزر کر ہزاروں، لاکھوں میل میں پھیل جاتی ہیں۔

اشیاء کی تفصیل

گلو گرام 10 R_1 = 10 K Ω   گلو وزڈ 30 C_1 = 304 F

R_2 = 560 Ω C_2 = 1000 MMF

R_3 = 50 K Ω   30x3 C_3 = 3650 Variable

R_4 = 560 Ω   متغیر گنجائش دار Capacitor

L_1 20 Number C_4, C_5 = 4700 MMF

onbe 17 rounds   . C_6 150 MMF گلو وزڈ

لمبائی $\frac{3}{16}$ قطر $\frac{5}{8}$ C_7 140 MMF

1 BH ہوا والوں کا کار لگا ہوا   RFC$_1$, RFC$_2$ 2.5 Mile

L_2 ۲۲ نمبر کے تار کے   henry

ملی دو ایکڑ (کرسٹل ڈائی ہوڈ) L_1 CR$_1$ چھ چکر قطر $\frac{5}{8}$ اور $\frac{3}{16}$ لمبائی

ڈبل ڈایوڈ، ڈاپول SB ISA   X-tal 21 Mega cycle

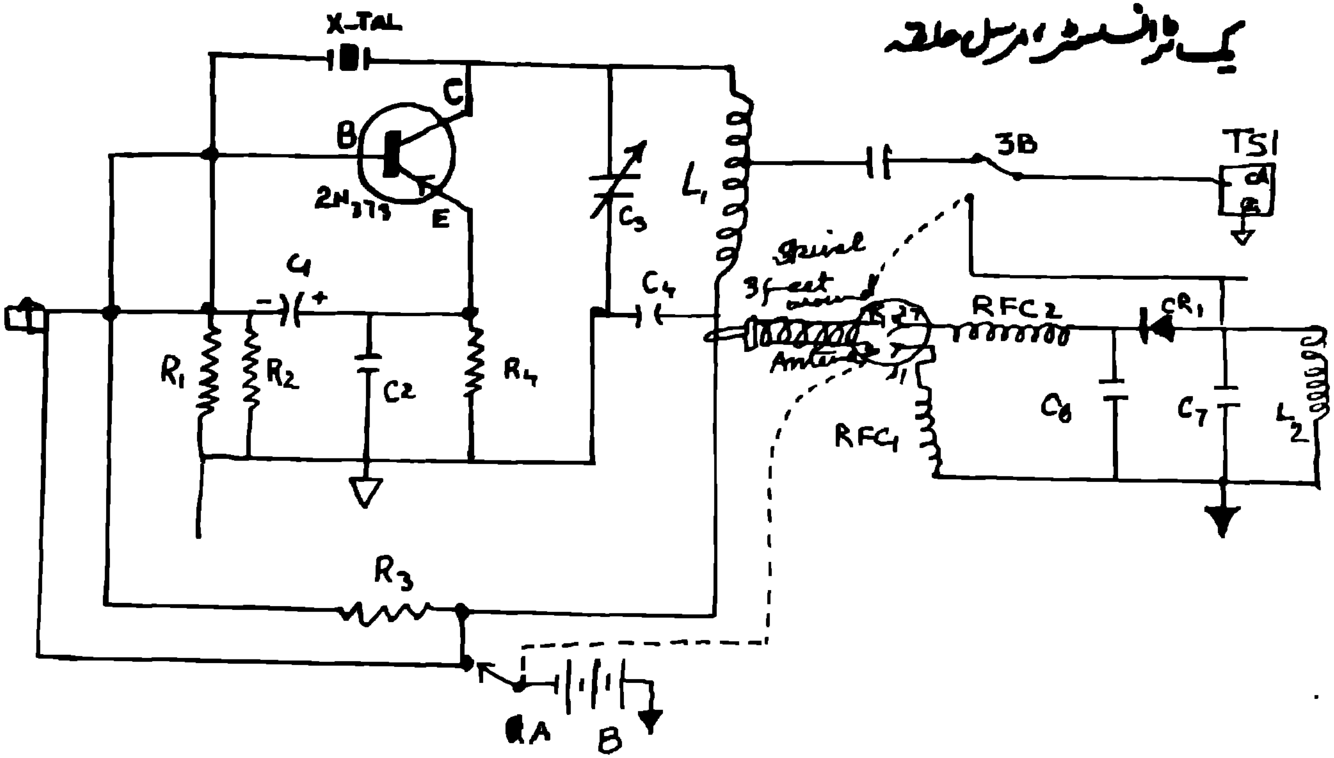
کاربن مائیکرو فون Mic

سلائیڈ سوئچ   B = 9 volt Battery

دو سلائیں مورچہ

دئے ہوئے حلقہ کو جوڑیے اور بیٹری جوڑنے کے بعد مکثف نمبر ۳ گھمائیے حتیٰ کہ مرسل کی آواز سنائی دے۔ اگر نہ سنائی دے تو مکثف نمبر ۲ کو گھمائیے جونہی یہ ایک ہی تعدد پر منطبق جائے گی فوراً ہی آواز آنی شروع ہو جائے گی

اڑتک ایئر فون سے جیک تک جانے والے تار پر اندازاً ۳ فٹ لمبا تار لپیٹ دیجئے یہ آپ کے لئے ہوائیہ کا کام دے گی۔ اس کا ایک سرا خالی چھوڑ دیجئے اور دوسرے سرے کو جس پر نقشہ میں U کا نشان لگا ہوا ہے TSI کے نشان A والے پیچ میں پھنسا دیجئے اگر آپ فاصلہ زیادہ کرنا چاہتے ہوں تو اس کو A کے بجائے G والے پیچ میں پھنسا دیجئے، بولتے وقت بٹن کو T کی حالت میں رکھئے اور سننے کے لئے اسکو R کی حالت میں لے آئیے زیر بحث مرسل آواز کو زیادہ سے زیادہ 100 گز تک پہنچا سکتا ہے آواز کو دور تک پہنچانا مقصود ہو تو بڑا ہوائیہ استعمال کیا جائے۔ اسی حساب سے جتنی دور تک آواز پہنچانا مقصود ہو تو انتظامات کیے جا سکتے ہیں دنیا میں آواز کی لہروں کو اسی طریقے سے قابو میں لا کر دور دراز علاقوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ یہ مرسل کا کمال ہے جلد دنیا کے مختلف ممالک ایک دوسرے سے اس طرح قریب آگئے ہیں جیسے ایک ہی گھر میں رہنے والے افراد ہوں۔ ... میں رہتے ہوئے بھی جب چاہتے ہیں آواز کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں



ONE TRASISTOR TRASMITTER CIRCUT

سیما ناز صدیقی
سالِ دوم (پری میڈیکل)

معجزاتِ ایکسرے

قدرت کے سربستہ رازوں کو معلوم کرنے کا جذبہ ابتدا ہی سے انسان کے اندر موجود ہے۔ انسان زندگی کے بنیادی تقاضوں کی تکمیل کے لئے مظاہرِ فطرت کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ فضاؤں کا بیکراں خلا، سیاروں کی گردش و سورج کا طلوع و غروب ہونا، برق و باراں کے مناظر اور دیگر زمینی مظاہر اس کے فطری ذوق و جستجو کو ابھارتے ہیں وہ ان مادی عناصر کی حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے شب و روز فکر کی گہرائیوں میں ڈوبا رہتا ہے۔ انسان کے اسی جذبۂ تجسس کو زندگی کے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے کا نام سائنس ہے۔

اور آج یہی سائنس ہے جس کی محیر العقول ایجادات کی بدولت انسان کی زندگی امن و آسائش کا گہوارہ بن چکی ہے۔ آج اگر کوئی انیسویں صدی کا انسان اتفاقاً موجودہ دنیا میں آجائے تو وہ دورِ حاضر کی معجز نما ایجادات کو دیکھ کر یقیناً حواس کھو بیٹھے گا۔ ایسی ایجادات میں سے ایک حیرت انگیز معجزہ لاشعاعوں (X - RAYS) کی دریافت ہے۔

انسانی جسم کے اندرونی حصوں کی تصاویر لینے میں لاشعاعوں کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ تاریخ انسانیت میں بے انتہا اہمیت کی حامل ہے۔ ولیم کنراڈ رونٹگن ایک جرمن نے گزشتہ صدی عیسوی کے آخر میں یہ ایجاد کی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں رد و بدل اور اصلاح و ترامیم ہوتی رہی ہیں بنی نوعِ انسان کے لئے جس قدر سود مند ہوئیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جتنی انسانی جانیں ایکسریز کی مدد سے بچائی گئیں ہیں ان کی تعداد ان انسانی جانوں سے کہیں زیادہ ہے جو دنیا میں لڑی جانے والی جنگوں میں ضائع ہوئیں۔ اگر آج خود رونٹگن زندہ ہوتا تو وہ ۱۸۹۵ والی اپنی اس ایجاد کی بنیاد پر ہونے والی اصلاحی تبدیلیوں اور ترامیم کی بدولت حاصل ہونے والے فوائد کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتا۔ اس نوبل انعام یافتہ سائنسدان حقیقی طور پر ایکسریز کو مستقبل کی ترقیوں کا پیش رو بنا کر پیش کیا اور آج نہ صرف طب میں اس کا استعمال ہو رہا ہے بلکہ آثارِ قدیمہ کے ماہرین اور دیگر ریسرچ کے شعبوں کو

یہ ایجاد ۔ بے انتہا فائدہ پہنچا رہی ہے۔ حال ہی میں ہوائی سفر کے دوران سامان کی تلاشی کا جو طریقہ دریافت ہوا ہے۔ وہ بھی ایکسریز کا مرہون منت ہے۔ بند سندوقوں اور پیٹیوں میں سے ایکسرے گزار کر کھولے بغیر دیکھا جا سکتا ہے۔ کہ بندوق یا بکس میں کیا کیا موجود ہے۔ تاہم ان ایکس ریز کا سب سے زیادہ استعمال میڈیکل سائنس میں ہو رہا ہے۔ آج ان ایکس ریز و جدید الیکٹرانکس کے ساتھ ملا کر پہلے سے کہیں زیادہ فوائد حاصل کئے گئے ہیں۔ یہ جدید ٹیکنالوجی کی بدولت آج بہت سی مشکلات پر قابو پالیا گیا ہے۔ اب تو شارٹ ایکسپوزر ٹائم اور ریڈی ایشن کم مقدار سے تصاویر حاصل کی جا سکتی ہیں اس سے مریض پر بہت کم دباؤ پڑتا ہے۔ اور جسم کے اندرونی اعضاء کی تمام حرکات متحرک تصاویر اسکرین پر لا کر سلو موشن کے ساتھ ڈاکٹر کے علم میں لائی جاتی ہیں۔ یہ ریڈیو ٹیپ پر لائی مسلسل یا ساکن تصاویر کی صورت میں معائنے کے لیے دستیاب ہوتی ہیں۔ پھر اس ریڈیو ٹیپ میں ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر کا تبصرہ اور مشورے بھی ریکارڈ ہو جاتے ہیں۔ اور بوقت ضرورت ان کو پلے کیا جا سکتا ہے۔ گویا مریض کا ایک مستقل ریکارڈ تیار ہو جاتا ہے۔ آج الیکٹرانکس اور ایکس ریز کے تعاون کی بدولت یہ بھی نتیجہ نکلا ہے کہ آپریشن کے دوران ڈاکٹر ماہر فن مسلسل نگرانی اور رہنمائی بھی کر سکتے ہیں کیونکہ وہ ٹی وی اسکرین پر تمام مراحل دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ الیکٹرانکس کی ایکسرے ٹیپ ریکارڈنگ سے غذا کی تحریر لیے غذا کے ہضم ہونے کے عمل اور دل کی دھڑکنوں کے اسلوب کو بھی واضح کرتی ہے۔ نہ خون کی گردش اور تمام راستوں پر اس کے گزرنے بول براز سے اور فضلات تک بننے کے اعمال کو خوبی تفصیل سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور ریکارڈ کئے جا سکتے ہیں۔ گویا صحت و صفائی کے لئے بیش بہا خدمات جدید الیکٹرانکس اور ایکسریز مل کر سرانجام دیتے رہی ہیں۔ پھر جس مخصوص چیز کو بطور خاص نوٹ کرنا ہو یا اس کی تصویر SUBTRAGTI ON JECHNIQUEF کی مدد سے واضح اور بیک گراؤنڈ کی اشیاء کو غائب یا مدہم بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور مطلوبہ تفاصیل کو خاصہ بڑا کر کے اسکرین پر تصویر لے لیا جاتا ہے۔ اس طرح سے یہ ممکن ہو گیا کہ ہڈیوں کے اندر ریشوں یا اعصاب کے اندر بھی کوئی خرابی جنم لے رہی ہو تو اسے معلوم کر لیا جائے اس بات کی اہمیت مگر آج بھی تو یہ ہے کہ ڈاکٹر جدید الیکٹرانی ایکس ریز سے حاصل کی جانے والی معلومات سے کیا فائدہ اٹھاتا ہے۔ سب کچھ طبیب کے تجربے محنت اور اخلاص پر منحصر ہے کہ وہ آلات سے حاصل کی جانے والی ان معلومات کو انسانی زندگی کو بچانے کے لیے کس نہج پر کس مہارت اور چابک دستی سے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(نوٹ:۔ اس مضمون کی تیاری میں دی گریٹ انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی ۱٦ فیروز پور روڈ لاہور کی کتاب گریٹ ٹیکنو سائنس کے مضمون ایکس ریز سے مدد لی گئی ہے۔)

محمد تنویر وقار
بی ایس سی سال آخر

علم ریاضی اور مسلمان

گذشتہ ڈیڑھ دو صدیوں میں عالم اسلام پر ابتلاء اور تنزل کا دور آیا تو ترقی یافتہ اقوام نے بڑی شد و مد سے یہ تشہیر کی کہ جملہ علوم سائنس سے عموماً اور ریاضی سے خصوصاً مسلمانوں کا کوئی سروکار نہیں ہے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اور وہ اوہام باطلہ کے پرستار ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ برصغیر پاک و ہند نے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، علامہ عنایت اللہ خان مشرقی، اور ڈاکٹر رضی الدین وغیرہ جیسے نامور اور مشہور زمانہ ریاضی داں پیدا کئے۔

غیر مسلم اقوام فی الحقیقت اسلام کے انقلاب آفریں پیغام اور سحر انگیز تعلیمات سے خائف ہیں کیونکہ ماضی قریب و بعید میں انہیں مسلمانوں کے مقابلے میں پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ اسلام دنیا بھر کا مقبول نظریہ حیات بن جائے گا۔ اور مسلمان ایک غالب و حاکم قوم کی حیثیت سے صفحۂ ہستی پر چھا جائیں گے۔ صلیبی جنگوں کے بعد سے یورپ کی عیسائی حکومتوں نے اسلام کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کر لیا۔ اور یہ گمراہ کن تاثر پھیلانا شروع کیا کہ اسلام میں آفاقیت نام کو بھی نہیں ہے۔ اور یہ مذہب ایک محدود زمانے کے لئے ایک مخصوص خطۂ ارض کے باشندوں کی خستہ حالت کو سدھارنے کے لئے آیا تھا۔ اور بس اسکی تعلیمات علوم عقلیہ سے سراسر برسر پیکار ہیں۔

یوں تو اسلام کا نقطۂ آغاز حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ہے اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ازلی و ابدی پیغام کو مکمل طور سے دنیا والوں کی تا قیامت رہنمائی کے لئے پیش کیا اور قرآن کریم ان تعلیمات کا نچوڑ ہے ہمیں معلوم ہے کہ حضرت جبرئیل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سب سے پہلے کہلوایا "اقراء" یعنی پڑھیئے! پھر جا بجا اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو حصول علم کے لئے تن من دھن کی بازی لگانے کا حکم صادر فرمایا "قرآن ناطق" یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ علم و فنون کو مسلمانوں کی میراث قرار دیا ہے ان حالات میں کوئی عقل کا اندھا ہی یہ باور کر سکتا ہے کہ اسلام علوم دینی و دنیوی کی اشاعت نہیں چاہتا تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ شاندار اور تابناک اسلامی دور میں ابن فرناس، ابو الہیثم، جابر بن حیان، ابو علی سینا، رازی، یعقوب کندی، البیرونی، عمر خیام اور نصیر الدین محقق طوسی جیسے سائنسداں اور ریاضی داں پیدا ہوئے ہیں آیئے اس وقت ہم ریاضی کے میدان میں مسلمانوں کی کارکردگی اور کارگزاریوں کا جائزہ لیں حقیقت تو

یہ ہے کہ ہماری ریاضی کی کتابوں میں بے شمار ایسے کلیئے اور ضابطے ہیں جو مسلم ریاضی دانوں کی کاوش اور تحقیق کا نتیجہ ہیں مگر چونکہ وہ مغربی اور انگریزی انداز اور طرز تحریر میں ہمارے سامنے آتے ہیں لہذا ہم میں سے اکثر انہیں ان ترقی یافتہ اقوام کی جد وجہد اور محنت کا ثمرہ سمجھتے ہیں۔
مسلمانانِ عالم فلسفہ، منطق، ہیئت اور طب وغیرہ سے خصوصی رغبت رکھتے تھے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ ان سب کا تعلق استدلال یا پیمائشوں سے ہے اور ریاضی ہی ایک ایسا علم ہے جو استدلال کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ قوت فیصلہ کو بڑھاتا اور باریک بینی کی عادت پیدا کرتا ہے جدید دور میں امریکہ کے عظیم رہنما ابراہام لنکن نے چالیس سال کی عمر میں علم ریاضی کی جانب محض استدلال کی تربیت کی خاطر توجہ دی تھی تو عرب کے علماء و فضلاء کے لئے ریاضی سے دور رہنا کیونکر ممکن تھا۔

۷۸۰ء کے لگ بھگ وسط ایشیا کے مشہور شہر خوارزم میں ایک ریاضی داں محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے آنکھ کھولی۔ بعدہ اس کے جوانی کے ایام تھے جب عباسی خلیفہ مامون الرشید نے بغداد میں بیت الحکمت کے نام سے سائنس کی مشہور اکادمی قائم کی جس کا شہرہ سن کر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے بھی بغداد کا رخ کیا۔ اور یہاں اس نے 'حساب' اور جبر و مقابلہ جیسی عظیم الشان کتابیں تصنیف کیں جو تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔
حساب دراصل وہ کتاب تھی جس سے اہل مغرب نے گنتی کے عربی طریقے کو اپنایا اور قدیم تکلیف دہ اور ناقص رومن طریقے کو عربی علامتوں میں تبدیل کر کے رائج کر لیا۔ چونکہ یورپ میں ریاضی کی ترقی کا آغاز جس پر سائنس کی دوسری شاخوں کی ترقی کا انحصار ہے اسی عہد سے ہوا جب اہل یورپ نے اعداد کے رومن طریقے کو ترک کر کے عربی طریقے کو اختیار کیا۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یورپ کے لوگ کس حد تک خوارزمی کے احسان مند ہیں۔ ایک عرصہ دراز تک یورپ والے گنتی کے موجودہ طریقے کو عربی طریقہ اور اس طریقے میں لکھے جانے والے ہندسوں کو عربی ہندسے کہتے رہے مگر بعد میں صلیبی جنگوں کی شکست نے ان کے دلوں میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکا دی تو انہوں نے یہ فرضی نظریہ وضع کیا کہ گنتی کا یہ مروجہ طریقہ اگرچہ عرب سے یورپ میں آیا ہے مگر یہ عربوں کا اپنا نہیں ہے بلکہ عربوں نے اس طریقے کو اہل ہند سے سیکھا تھا۔ اس لئے اس گنتی کے اصل موجد اہل ہند ہیں۔ لیکن اگر ذرا سی توجہ اور گہری نظر سے دیکھا جائے۔ تو یہ طریقہ خود زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ اسکی اصل عربی ہے ہندی نہیں۔ اسی طرح الجبرے کے موضوع پر خوارزمی کی تصنیف اوّل نوعیت کی ہے آج سے تقریباً بارہ صدی پیشتر لکھی ہوئی اس کتاب میں دوسرے درجے کی مساواتوں کا استعمال اور ان کا حل بتایا گیا ہے۔ یہ چیز ریاضی میں خوارزمی کی اعلیٰ مہارت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے اور اس کا یہ کارنامہ اس کے زمانے کو دیکھتے ہوئے اسے دنیا کے عظیم ریاضی دانوں کی صف میں بٹھا دینے کے لئے کافی ہے۔

خوارزمی کے الجبرے کی ایک دلچسپ اور کارآمد خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں الجبرے کے متعدد سوالات کو جیومیٹری کی اشکال سے بھی حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ خوارزمی کی خاص اختراع ہے جس کا اتباع مغرب کے ریاضی دانوں نے کیا ہے۔
دوسرا قابل ذکر ریاضی داں محمد بن جابر بن حیان

عراق کے شہر حران کا رہنے والا تھا جو ۸۵۸ء میں پیدا ہوا تھا۔ اصل میں تو یہ ماہر ہیئت تھا لیکن علم مثلث میں اسے خصوصی دلچسپی تھی اور اس سلسلے میں اس نے اعلیٰ درجے کا تحقیقاتی کام کیا تھا مثلاً اسنے زاویوں کی جیوب SINES کا نقشہ بنایا اور دیگر نسبتوں کے ساتھ اس کے تعلق کے سلسلے میں بعض اہم مساواتیں معلوم کیں۔ زاویوں کے ظل "TANGENTS" کے نقشے تو اس سے پہلے بن کر رائج ہو چکے تھے۔ لیکن زاویوں کے ظل التمام "COTANGENTS" کے نقشے سب سے پہلے اس نے تیار کئے۔ اور ان کے استعمال کو رواج دیا۔ وہ ان تین مسلم ریاضی دانوں میں سے ایک ہے جس نے کروی مثلث "SPHERICAL TRIANGLES" کے ضلعوں اور زاویوں میں یہ تعلق ظاہر کیا جسے انگریزی طرز تحریر میں مندرجہ ذیل طریقے سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

$$\cos a = \cos b \cdot \cos c + \sin b \cdot \cos c \cdot \cos A$$

دسویں صدی عیسوی میں مصر میں ایک ماہر ریاضی داں ابوکامل شجاع حاسب پیدا ہوا اس نے الجبرا کے علم کو بڑی وسعت دی شجاع حاسب مصری نے اپنی کتاب میں جمع، ضرب، تفریق اور تقسیم کے عام قاعدے بیان کرنے کے بعد اس ضمن میں ایک اور قدم آگے بڑھایا۔ اور جذری رقوم RADICALS کی جمع تفریق وغیرہ کی بعض صورتیں وضع کیں۔ مثال کے طور پر دو جذری رقوم $\sqrt{\text{ا}}$ اور $\sqrt{\text{ب}}$ کی جمع کے بارے میں وہ یہ کلیہ بیان کرتا ہے:۔

$$\sqrt{\text{ا}} + \sqrt{\text{ب}} = \sqrt{\text{ا} + \text{ب} + 2\sqrt{\text{اب}}}$$

علاوہ ازیں شجاع حاسب نے علم ہندسہ کی دو مشہور اشکال مخمس اور معشر کے بعض مسائل الجبرا کی مدد سے حل کیئے تھے۔

ابوالسحق ابراہیم بن سنان بن ثابت نامی ریاضی داں ۹۰۸ء میں عراق میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے قطع مکافی یعنی PARABOLA پر قابل قدر کام کیا تھا۔ اور بعض ایسے مسائل دریافت کیئے جو موجودہ دور میں صرف تکمیلی احصاء (INTEGRAL CALCULUS) کی مدد سے حل کیئے جاتے ہیں اسی طرح سے ایک گمنام عالم اور ریاضی داں ابوجعفر خازن نے جو ایران کے مشرقی صوبے خراسان میں ۹۰۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا۔ تیسرے درجے کی مساوات CUBIC EQUATIONS کو حل کرنے کا نادر طریقہ نکالا جو اس سے پہلے معلوم نہ تھا۔

اب ہم ایک عظیم المرتبت ریاضی داں ابوالوفا محمد بن احمد یحییٰ بوزجانی کا ذکر کریں گے جو خراسان کے ایک مشہور شہر بوزجان میں، جو ہرات اور نیشاپور کے درمیان واقع ہے۔ ۹۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے الجبرا اور علم ہندسہ میں بہت سے ایسے مسائل اور قاعدے نکالے جو اس سے پیشتر معلوم نہیں کئے جا سکے تھے۔ مثلاً عرصہ دراز سے ریاضی داں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ دائرے کے اندر ایک منتظم مسبع یعنی سات ضلعوں والی کثیر الاضلاع شکل کیونکر بنائی جائے۔ ابوالوفا نے ایک سادہ طریقہ نکال کر اس مشکل مسئلے کو حل کیا جو یہ تھا کہ دائرے کے اندر ایک مثلث مساوی الاضلاع کی شکل بناؤ اس کے ایک ضلع کو تنصیف کرو۔ مثلث کا یہ نصف ضلع مطلوبہ مسبع کے ایک ضلع کے برابر ہوگا اس لیئے پرکار میں یہ لمبائی لے

کرواشیے کے محیط کو سات مساوی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اس نے زاویوں کی جیوب SINES معلوم کرنے کا ایک نیا کلیہ معلوم کیا۔ اور اس کی مدد سے ایک درجے سے لے کر ۹۰ درجے تک تمام زاویوں کی جیوب کی صحیح صحیح قیمتیں آٹھ درجہ اعشاریہ تک نکالیں اس سے پہلے جیوب کے نقشے Sine Tables اگرچہ تیار ہو چکے تھے۔ مگر ان کی قیمتیں اتنے درجہ اعشاریہ تک نہیں ہوتی تھیں۔ مندرجہ ذیل دو مساواتیں بھی ابوالوفا بوزجانی کی دریافت ہیں۔

$$\sin(A+B) = \sin A \cos B + \cos A \sin B$$

$$\sin(A-B) = \sin A \cos B - \cos A \sin B$$

یہاں ایک اور حقیقت کا تذکرہ مناسب ہوگا کہ علم مثلث میں TANGENT, SINE, COSINE اور COTANGENT یہ چار نسبتیں ابوالوفا بوزجانی سے پہلے شامل ہو چکی تھیں لیکن SECANT اور COSECANT کے تصور کو سب سے پہلے ابوالوفا نے علم مثلث میں شامل کیا

اسی طرح ۹۵۳ء میں فاطمی خلیفہ المعز کے زمانے میں (اس خلیفہ نے آج کے مشہور شہر اور مصر کے دارالحکومت قاہرہ کی بنیاد رکھی) ایک اور دارالحکومت کی بنیاد رکھی گئی تو اس میں ایک مشہور ہیئت داں اور ماہر ریاضی ابن یونس نے تحقیقات کی دنیا میں ہلچل مچادی اور اس کی مندرجہ ذیل مساوات تو آج بھی علم مثلث کا ایک بیش بہا سرمایا ہے:

$$\cos A \cos B = \frac{1}{2}[\cos(A-B)+\cos(A+B)]$$

آخر میں ہم ایک مشہور ماہر فلکیات و ریاضی داں کا تذکرہ کریں گے جس نے محددی جیومیٹری COORDINATE GEOMETRY میں انقلاب آفریں کارنامے انجام دیے دسویں صدی عیسوی میں ایک مسلم سائنسداں ابوسعید احمد بن محمد بن عبدالجلیل سجستانی نے ریاضی کی ایک شاخ قطع مخروطی CORIC SECTION پر زبردست تحقیقات کیں اس نے قطعی مکافی (PARABOLA) قطع ناقص ELLIPSE اور دائرہ CIRCLE اور قطع زائد HYPERBOLA کے بارے میں بتایا کہ یہ سب مخروط کو مختلف طریقوں سے کاٹ کر پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ اور پھر اس سے پیدا ہونے والے بہت سے مسائل کے حل دریافت کیے۔ اس کا ایک اور قابل قدر اور عظیم النظیر کارنامہ زاویے کی تین مساوی حصوں میں تقسیم کا طریقہ دریافت کرنا ہے۔

مندرجہ بالا تذکروں سے آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ علم و حکمت مسلمانوں کی متاع گم گشتہ ہے۔ مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں گلشن علم میں حکمت و معانی کے ایسے گل کھلائے ہیں۔ کہ ان کی خوشبو سے سارا زمانہ مہک رہا ہے اور اگر آج مسلمان پھر علم و عمل کے جذبے سے سرشار ہو جائیں تو ہماری یہ ستم رسیدہ دنیا ایک خوشگوار اور حیات بخش انقلاب کے حقیقی تصور سے آشنا ہو جائے، شرط صرف اتحاد، ایمان اور تنظیم و ضبط پیدا کرنے کی ہے۔

آنسہ رعنا کوثر
سال چہارم

لحمیات

غذا انسانی زندگی کی اہم ترین ضرورت ہے۔ غذا میں بہت سی چیزیں شامل ہوتی ہیں جن میں "LIPID"، کاربوہائیڈریٹ، روغنیات، لحمیات، اور حیاتین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں لحمیات لحمیات اور کاربوہائیڈریٹ کثیر مقدار میں استعمال زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ جب کہ ان کے مقابلے میں حیاتین کی بہت کم مقدار ضرورت زندگی کو پورا کرلیتی ہے۔ لیکن اس کی کمی سے مختلف قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ حیاتین کی وہ مقدار جس کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے۔ ہمہ گیر اکائی بہت کم ہوتی ہے۔ اور یہ ۳ر۰ یونیورسل اکائی (ہمہ گیر اکائی) کے برابر ہوتی ہے حیاتین، روغنیات اور کاربوہائیڈریٹ کی طرح تکسید ہو کر توانائی نہیں دیتی۔ ان میں کسی قسم کا کوئی کیمیائی تعمل بھی نہیں ہوتا حیاتین کو اس کی حل پزیری کی بنیاد پر اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) روغن میں حل پزیر حیاتین
(۲) پانی میں حل پزیر حیاتین

روغن میں حل پزیر حیاتین ایسے حیاتین ہوتے ہیں جو طبیعت کے لحاظ سے روغن سے ملتے ہیں۔ اور پانی میں حل نہیں ہوتے ہیں مثال کے طور پر حیاتین A و K و E و D جب کہ پانی میں حل پزیر حیاتین ایسے حیاتین ہوتے ہیں جو پانی میں حل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بی کمپلیکس اور حیاتین سی۔

۔ روغن میں حل ہونے والے حیاتین ——

حیاتین "اے"

اسے پودوں کی بی کیروٹین سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کی کمی سے جسم خطرناک قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جسم کی کھال چھلکوں کی شکل میں اترنے لگتی ہے جسم کے افراز میں کمی ہو جاتی ہے اور آنکھیں رات میں کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔ راتوں میں آنکھوں کی بینائی کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ ان مہلک بیماریوں سے بچاؤ کے لئے دن بھر میں ایک ہزار یونٹ حیاتین اے کی ضرورت ہے۔ اس مقدار کو انڈا دودھ، مکھن، اور سپلی دالوں کے استعمال سے پورا کیا جاسکتا ہے۔

حیاتین "کے"

اس حیاتین کا انسانی جسم میں ہونا بے حد ضروری ہے۔ اگر جسم کسی جگہ سے کٹ جاتے۔ تو حیاتین "کے" خون کو زیادہ مقدار میں بہنے سے روکتا ہے۔ اسکی کمی سے خون بہت زیادہ مقدار میں بہتا ہے۔ یہ عام طور پر سبزی اناج اور ٹماٹر وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

حیاتین "ای"

اس کی کمی کی وجہ سے جسم کا روغنی ترشہ تکسید پاکر PREOXIDISEDS بناتا ہے۔ جو جسم کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اگر حیاتین ای جسم میں موجود ہو تو ANTIOXIDENT کا کام کرتا ہے۔ اور روغنی ترشے کو تکسید ہونے سے بچاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کمی سے MUSCULAR DISTROPH7. ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً عضلات پھول جاتے ہیں۔ اس کی کمی سے بچنے کے لئے ساگ، سبزی، انڈے وغیرہ کھانے چاہئیے۔ ۱۲ تا ۱۰ یونٹ یومیہ اس حیاتین کا بدن میں موجود ہونا ضروری ہے۔

— پانی میں حل پذیر حیاتین —

اس قسم کے حیاتین جو پانی میں حل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بی کمپلیکس اور حیاتین سی۔ حیاتین بی مرکب میں مندرجہ ذیل حیاتین شامل ہیں۔

THIAMINE B_1

RIBOFLAVIN B_2

NIACIN B_3

PANTOTHENIC ACID B_5

PYRIDOXIN B_6

BIOTIN B_7

FOLIC ACID B_c

CYANO COBAL AMINE B_{12}.

حیاتین بی "۱"

اس کی کمی کی وجہ سے Beri, Beri نامی بیماری ہو جاتی ہے۔ بھوک نہیں لگتی۔ وزن کم ہو جاتا ہے۔ اور بہت زیادہ کمی سے متلی ہونے لگتی ہے۔ ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خون میں PYRUOIC ACID کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے۔ جس سے جسم کی توانائی گھٹ جاتی ہے یہ عام طور پر پھلوں یعنی مٹر اناج اور گیہوں کے علاوہ غیر صاف شدہ چاول میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ خمیر میں اس کی بہت بڑی مقدار پائی جاتی ہے۔ اس کا ۶ تا ۸ ملی گرام یومیہ استعمال ضروری ہے۔

حیاتین بی "۲"

اس کی کمی کی وجہ سے ہونٹ چھلنے لگتے ہیں۔ (یعنی بیماری CHELOSIS ہو جاتی ہے) زبان جلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ خمیر، گوشت اور سبزی کے علاوہ تھوڑی بہت مقدار میں اناج وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے ہمیں ۲ ملی گرام یومیہ کے قریب ضرورت پڑتی ہے۔

حیاتین بی "۳"

اس کی کمی کی وجہ سے PELLAGRA ہو جاتا ہے اس کے علاوہ CHELOSIS متلی NAUSIA اور GLOSSITIS کا بھی امکان ہوتا ہے۔ اس کی زیادہ مقدار خمیر میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ گوشت سبزی اور ٹماٹر وغیرہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ ایک عام آدمی کی خوراک میں ۱۸ ر ۱۲ ملی گرام حیاتین بی ۳ کا ہونا ضروری ہے۔

حیاتین بی "۵"

اس کی کمی سے نشوونما کم ہو جاتی ہے۔ اور تھکن ہوتی ہے۔ یہ عام طور پر جگر، خمیر، جگر گوشت اور آلو میں موجود ہوتی ہے۔ دن بھر میں اس کی ۲۰ ر ۱۲ ملی گرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

حیاتین بی "۶"

اس کی کمی کی وجہ سے کھال چھلنے لگتی ہے۔

اور خون کے سفید جسیموں کی تعداد کم ہو جاتی ہے
یہ عام طور پر خمیر، دودھ، گردے، جگر اور سبزی
وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ اس حیاتین کی ۵ را تا ۱۰
ملی گرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

حیاتین بی "ایچ"

اس کی کمی کی وجہ سے بال گرنے لگتے ہیں۔
بے آرامی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ انڈے کی زردی میں
بڑی مقدار میں موجود ہوتی ہے۔ انڈے کی زردی کھانے
سے اس کی کمی کسی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔ اس
کے علاوہ یہ عام طور پر خشک میوے اور سبزی وغیرہ میں بھی
کافی مقدار میں موجود ہوتی ہے۔ ایک عام آدمی کو دن
بھر میں ۱۵۰ سے ۳۰۰ ملی گرام تک کی ضرورت ہوتی ہے

حیاتین بی "سی"

اس کی کمی کی وجہ سے کھال چھلنے لگتی ہے۔ جو عموماً
منہ کے کناروں اور سر کے حصے میں ہوتی ہے۔ اس کے
علاوہ پیروں میں تلووں کی کھال بھی اترنے لگتی ہے۔
ان کی کمی کی وجہ سے امائنو
ترشے اور ڈی ان اے (D,N,A) کی METABOL
ISM بھی متاثر ہوتی ہے۔ جس کی کمی کی وجہ سے
نشوونما کم ہو جاتی ہے۔ ان کا ایک خاص کام یہ ہوتا
ہے کہ یہ آنت میں SYNTHESIS کا عمل کرتے ہیں
صحت مند آدمی کو دن بھر میں ۱۰۰ سے ۵۰۰
ملی گرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عام طور پر گردے
اور خمیر وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

بقیہ

پر آنے میں مدد دیتا ہے ہر غوطہ خور کلپ جیسا
جالی دار کپڑا اپنی ناک میں لگاتا ہے تاکہ ناک
میں پانی داخل نہ ہونے پائے۔ غوطہ خور سمندر
کے اندر ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہتا۔ اور وہ
ایک دن میں تیس مرتبہ غوطہ لگا سکتا ہے۔
خلیج فارس اور بحر ہند سے نکلنے والے موتیوں
کو بھارت بھیج دیا جاتا ہے کیونکہ موتیوں کی
سب سے بڑی منڈی وہیں ہے یہیں پر انہیں
دھویا اور پالش کیا جاتا ہے اور انہیں ایک
خاص شکل دی جاتی ہے۔ ایک ایسا نیکلس
جو اصلی موتی کا ہو، ہزاروں اور بعض اوقات
لاکھوں ڈالر کا ہوتا ہے جنگ عظیم دوئم سے
پہلے آسٹریلیا کے شمالی ساحلی علاقہ میں
موتی کی صنعت کو کافی عروج حاصل تھا
اس علاقے میں موتی نکالنے والوں کا ایک اہم
مقصد خوبصورت خول کا حصول بھی ہوتا ہے
اور اب تو یہ موتی تجارت کا ایک اہم حصہ
بن گئے ہیں۔

بقیہ

انسانیت کی فلاح وبہبود کے بجائے نہایت تباہ کن
اور خطرناک ہتھیار ثابت ہوا۔
۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء کو آئن اسٹائن کا
انتقال ہوا۔ اس نے آخر وقت تک کوشش کی کہ
بڑی طاقتیں ایٹمی جنگ ختم کرنے پر باہمی رضامندی
ظاہر کردیں۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا
اور اس کے بعد سے ایٹمی جنگ کے امکانات روز
بروز بڑھتے جارہے ہیں۔ ایٹمی ہتھیاروں کی اب
ایک ایسی دوڑ بڑی طاقتوں کے درمیان شروع
ہو گئی ہے [illegible]


رئیس الاحرار مولانا محمد علی

محمد علی جوہر

؎ مارا دیار غیر میں ہم کو وطن سے دور

حضرت مولانا محمد علی جوہر زندۂ جاوید کی یہ آواز شمال سے جنوب تک، مشرق سے مغرب تک پہنچی' ہمالیہ کی بلندیوں نے سنی، گنگا جمنا نے سنی، پڑھے لکھے لوگوں نے سنی جاہلوں نے سنی، عالموں نے سنی عاملوں نے سنی، بڑوں نے سنی چھوٹوں نے سنی، سرداروں نے خاکساروں نے سنی، وقت کے مہذبوں نے دیہاتیوں نے گنواروں نے سنی، جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں نے سنی، راجہ مہاراجاؤں نے سنی، راج بھون میں گونجی، نوابوں نے سنی، رئیسوں نے سنی، شیش محلوں میں آرام کرسیوں صوفہ نشینوں نے سنی، فاقہ کش فقیروں نے سنی گھاس پھوس کی جھونپڑیوں نے سنی، اور بغور سنی بلکہ ہمہ تن سنی ملک کو ملت کے سچے سپاہی' دین و مذہب کے پرستاروں نے سنی، بوڑھوں نے سنی بچوں نے سنی، جوانوں نوجوانوں نے سنی، پردہ نشین مستورات نے سنی، اور دلیوانہ وار لبیک جوہر لبیک جوہر لگ لبیک جوہر کے نعروں کے ساتھ والدہ محمد علی جوہر کا یہ شعر گنگناتی ہے سر و ساماں سڑکوں پر آگئیں ؎

بولیں اماں کا کچھ غم نہ کرنا!
جان بیٹا خلافت پہ دیدینا

یہ حقیقت ہے کہ جو خدا کا ہو گیا اس کی خدائی ہو گئی۔ جو سرکار دو عالمؐ محبوب خداؐ محمدؐ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو گیا وہ محترم المقام ہو گیا۔ مولانا محمد علی جوہر کا یہ عالم تھا

کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

یہ مثل نہیں اصل ہے۔ یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے۔ دنیائے اسلام میں کہیں بھی کسی مسلمان کے پھانس لگتی تو دہلی شہر میں مولانا محمد علی جوہر کے دل میں کھٹکتی یہ ہے۔ مسلمان کی شان دنیا کے کسی حصے میں مسلمان پر کوئی مصیبت آتی مولانا محمد علی جوہر کے دل میں درد ہوتا۔ ایسے انسان کی زندگی کائنات میں سمجھنے اور سمجھانے کی ہے ایسے شخص کے کسی بھی پہلو پر لکھنا وقت کی پوری تاریخ مرتب کرنا ہے۔ ایسے شخص کے کس کس پہلو کو نظر انداز کیا جائے۔ یہاں ایک شعر بے ساختہ زباں پر آرہا ہے ؎

حقیقتیں نہ چھپاؤ جو زندگی چاہو!
قلم کی تیغ اٹھاؤ جو زندگی چاہو

مولانا محمد علی جوہر نے اٹھارویں صدی کے اس یادگار گروہ میں وہ محترم مقام پایا کہ زندہ جاوید ہو گئے۔ رومولے جمہوریہ ہندوستان کا ایک ریاست میں جنم لے کر ریاست کو زندہ و پائندہ کر دیا!

ابھی محمد علی جوہر نے بچپن کی دنیا میں قدم رکھا ہی تھا کہ والد محترم کا سایۂ شفقت سر سے اٹھ گیا۔ بیوہ ماں نے قدم بہ قدم بلکہ نفس نفس پر مولانا کو برطانوی ظلم و ستم جبر و تشدد کی نشاں دہی کرائی کبھی غلامی کی لعنت سے شرمندہ کیا۔ رات کو سوتے وقت برطانیہ کے قیامت خیز حالات و واقعات کی داستانیں سنائیں۔ کبھی بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ پر جو ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ ان سے روشناس کرایا۔ صبح جب بیدار ہوتے تو انہیں ان کے فرائض اور مذہب و ملت کے تقاضوں سے آشنا کرایا جاتا تھا اب آپ ہی سوچیں کہ ایسے ماحول میں پرورش پانے والے چاند سورج کو کب تک وقت کی گرد سے دھول چھپا سکتی ہے۔ بقولِ عام پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کی ظاہری اور باطنی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ ہمارے مذہب و ملت پر کیا گذر رہی ہے۔ جو کہنا چاہتے ہیں کہہ نہیں سکتے۔ جو کرنا چاہتے ہیں کر نہیں سکتے۔ بی اماں نے جو کہانیاں ہم کو سنائی ہیں جو ہمارے بزرگوں کے حالات و کمالات فن سپاہ گری شجاعت و صداقت، دیانت و امانت کے چراغ دکھائے ہیں۔ وہ کہاں ہیں۔ وہ افسانے تو ہو نہیں سکتے۔ ہم اگر آدمی ہیں تو کیا نہیں کر سکتے۔ کیوں نہیں کر سکتے مولانا نے کھیل کھیلے تو ایسے ہی چاند تاروں میں تعلیم پائی تو ایسی ہی بہاروں میں۔ اب مولانا کے ساتھ عزم و ہمت ہے۔ اب مولانا جوہر قلمکار ہیں۔ اور قلم بھی وہ، جس نے پتھروں کو محترم بنا دیا۔ اب مولانا صاحب تحریر ہیں۔ اور تحریر وہ جس میں آزادی کھیل رہی ہے۔ تقریر و تحریر وہ جس میں مذہب و ملت کے دکھ ہیں۔ درد ہیں اور بزرگوں کے بنائے ہوئے بتائے ہوئے راستے ہیں مولانا جوہر نثار ہی نہیں بلکہ مایہ ناز شاعر بھی ہیں۔ موصوف کے اشعار میں گل و بلبل بھی ہیں۔ حسن و عشق بھی ذکر عاشق و معشوق بھی ہے۔ مگر غزل جس کا نام ہے۔ اس میں مولانا حالی کی طرح حالات و واقعات بھی ہیں۔ ماضی حال و مستقبل بھی ہے۔ جیسے ایک غزل میں فرماتے ہیں۔

ے ہے مہر و وفا لطف و کرم غیر کے حق میں
اور ظلم و ستم جور و جفا میرے لئے ہے

ایک اور غزل میں کیا خوب فرماتے ہیں۔

ے خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اسقدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

اب جلسے اور جلوسوں کے بعد جیل کی صعوبتوں نے جنم لیا۔ آپ کئی بار جیل گئے مگر صداقت و شجاعت عزم و ہمت اور استقلال کا دامن نہ چھوڑا۔ کاش ان کے اصولوں کو اپنا لیا جاتا ان کے بنائے ہوئے راستے اختیار کئے جاتے۔ جو باعزت زندگی اور موت کے آئینہ دار ہیں۔

اب ترکستان جو مسلمانوں کی خلافت کا آخری چراغ تھا۔ اسی شمع خلافت کو بجھانے کے لئے اس دنیا کے بڑے بڑے خداؤں نے خدا کو بھول کر آپس میں اتحاد کیا۔ جس میں برطانیہ، روسی، جرمنی، اٹلی اور بلغاریہ وغیرہ شامل ہیں انہوں نے جارحانہ حملہ کر دیا۔ اور مظلوم ترکستان کو شکست کے کنارے لا کھڑا کیا۔ اور ساتھ ہی اپنی اپنی خدائی میں اعلان کر دیا کہ ترکستان کی حمایت میں کوئی نہ قدم اٹھائے اور نہ قلم۔ اپنے اپنے اخبارات کی مزید ضمانتیں طلب کر لیں مگر ترکستان سے

ہزاروں میل دور ہندوستان کے مشہور شہر دہلی میں رہنے والے ایک مسلمان سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ چلا اٹھا۔ اٹھو غیرت مند مسلمانوں ترکستان میں مظلوم مسلمانوں پر مغرور حکومتوں نے جارحانہ حملہ کر دیا ہے۔ بھائیو تمہارے بھائیوں کے بازو کٹ رہے ہیں۔ بہنو! بہنوں سے بھائیوں کی حمایت چھینی جا رہی ہے۔ ماؤں کی گود خالی کی جا رہی ہے کسی کو بیوہ کیا جا رہا ہے کسی کو یتیم کسی کو بے سر کیا جا رہا ہے۔ اگر تم نے ذرا غفلت کی تو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں حاضر ہو کر جواب دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تمہارے پاس ہاتھ پیر تھے تم نے کس کس کی مدد کی تمہارے پاس طاقت ہے دولت ہے۔ زبان ہے مگر کس کے لئے ہے۔ آج ترکستان کے عوام کو تمہاری طرح غلام بنایا جا رہا ہے۔ تمہیں منظور ہے؟ خدا کے واسطے اٹھو۔ اور ہر مشکل کا مقابلہ کرو اگر دہلی میں گرفتاریاں ہو رہی ہیں ظلم و ستم ہو رہے ہیں لالچ دے کر آواز بند کی جا رہی ہے۔ مگر پرواہ نہ کرو آگے بڑھو آگے بڑھو! مولانا محمد علی جوہر کی یہ آواز۔ آواز صور تھی۔ مسجدوں کے اماموں نے نمازیوں کو سنائی خانقاہ کے سجادہ نشینوں نے اپنے معتقدین کو شیخ الشیوخ نے مریدین کو پہنچائی۔ کارخانے داروں نے کاریگروں کو سنائی۔ شیخ الاسلام نے مفتیان شرع متین نے علمائے اکرام نے۔ مادر و پدر کی محبت و شفقت نے بچوں تک پہنچائی۔ اسکول کے معلموں نے طلبا کے گھٹ میں بٹھائی۔ دیکھو اگر تم نے ذرا سستی سے کام لیا تو تمہاری طرح ترکستانی قوم بھی غلام ہو جائے گی۔

بس اب کیا تھا باپ اپنے دل بند کی انگلی پکڑے، بھائی اپنے چھوٹے بھائی بندوں کے ساتھ بوڑھے لکڑی ٹیکتے میدان عمل میں آ گئے اب میدان میں نعرہ تکبیر اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے شاہی جامع مسجد دہلی کے زیر سایہ جمع ہو گئے۔

ادھر حکومت وقت ظالم برطانیہ نے اندھا دھند گرفتاریاں شروع کر دیں جہاں حکومت کی گاڑی پہنچتی پبلک زبردستی اس میں گھس جاتی۔ اسی قلیل سے وقت میں جو عصر سے مغرب تک تمام رہبران قوم اندر، مولوی اندر، مفتی اندر، دکاندار اندر، دستکار راہگیر اندر، مولانا شوکت علی اندر، مولانا محمد علی جوہر اندر، مولوی احمد سعید، مفتی مولانا کفایت اللہ اندر، مولانا حسین احمد مدنی اندر، شیخ الاسلام مولانا محمود اندر، المختصر جیل خانے بھر گئے تھانوں میں حوالات بھر گئیں۔ جذبہ حق کو جتنا دبایا اتنا ہی ابھرا۔ آواز حق کو ظلم بھی دبا سکا نہ ستم جیلیں دبا سکیں نہ لالچ، اب شارع عام جامع مسجد کے مقابل اردو بازار پریڈ گراؤنڈ سنگھاڑہ عوام کے پرخلوص عطیات سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی بھی آنے والا خالی ہاتھ نہ تھا مردوں نے اپنی جیب خالی کر دی عورتوں نے اپنے زیورات طلائی ہوں یا نقرئی اگر کسی کے پاس یہ بھی نہیں تو اپنے سر سے دوپٹہ اتار کر ڈال دیا۔ بچوں نے کھانے کے پیسے ڈال دئے۔ مختصر یہ کہ جو جس کے پاس تھا پیش کر دیا۔ کہیں کمبل جمع ہیں کہیں قمیض تو کہیں پاجامے یہ عطیات مجاہدین ترکستان کو روانہ کیے جا رہے تھے۔ کہ عشاء سے قبل جامع مسجد سے اعلان ہوا کہ آج بعد نماز عشاء اہل دہلی جمع ہو جائیں۔ مسجدوں سے اعلان ہوئے گلیوں اور بازاروں میں پابندی کے باوجود اعلان ہوئے کفار نے ترکستان پر آخری زوردار حملہ کیا ہے۔ آؤ ہم بذریعہ دعا

اس جہاد میں شریک ہو جائیں دیکھتے ہی دیکھتے جامع مسجد کے دالان در دالان بھر گئے صحن بھرے چھتیں پٹ گئیں مینار پر چڑھ گئے سیڑھیاں سب بھر گئیں۔ سڑکوں پر لوگ بیٹھے ہیں۔ پریڈ گراؤنڈ میں تل رکھنے کی جگہ نہیں بلکہ راجہ وارڈ پارک تک میں تل رکھنے کی جگہ نہیں رہی جہاں جہاں روشنی کی ضرورت تھی۔ ڈیکوریشن والوں نے مفت انتظام کیا۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ رات کے بارہ بج چکے ہیں مگر پبلک چلی آ رہی ہے۔ اب رات کے دو بجنے کا عمل ہے۔ اب اعلان ہوا کہ اللہ تبارک تعالیٰ سمیع و بصیر ہے آخری شب ہے اللہ منتظر ہے کہ کون ہم سے عافیت مانگتا ہے۔ کس کو رزق کی ضرورت ہے۔ یہ وقت وہ ہے کہ ہر حاجت مند کی حاجت پوری ہوتی ہے۔ اب تمام حاضرین دو زانو ہو کر بیٹھ جائیں۔ جیسے ہی روشنی ختم کی جائے۔ آپ سب اللہ کے حضور سر بسجود ہو جائیں اور اللہ سے دعا کریں۔ اے اللہ تو مظلوموں کی مدد کرنا اس وقت ترکستان کے مجاہدوں کی مدد فرما۔ تجھ کو تیری رحمت کی قسم، اے رحمان و رحیم تجھ کو اپنے محبوب کا صدقہ اس شکست کو فتح میں تبدیل کر دے۔ ہر طرف سے آہ و بکا۔ اور رونے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ادھر انور بے اور مصطفیٰ کمال ترکستان کے نواح سے تازہ دم فوج لے کر آئے۔ نعرہ اللہ اکبر کے ساتھ ایسا حملہ کیا کہ مٹھی بھر ترکستانی فوج نے ظالموں کے چھکے چھڑا دیے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کفار مورچے چھوڑ کر بھاگ لیے اب بفضل تعالیٰ شکست فتح سے بدل گئی دعا میں دوا سے زیادہ اثر ہے سچ ہے۔ یکایک رحمت الٰہی جوش میں آئی۔ اور صبح صادق کی کرن خوشخبری لے کر آئی۔ ترکی سے فون وصول ہوا۔ کفار بری طرح پسپا ہو کر ترکستان کی سرحد سے جا چکے ہیں اب بفضل تعالیٰ کوئی خطرہ نہیں رہا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے کہ ہم مظلوموں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہم دلوں کا حال جانتے ہیں ہم میں وہ قدرت ہے کہ نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا سے چاند کو دو ٹکڑے کر سکتے ہیں یہ ہم جناب رسالت مآب کی دعا سے سورج کو واپس لوٹا سکتے ہیں۔ ہم نبی آخر الزماں سرکار دو عالم ﷺ کے دست مبارک میں کنکروں کو زبان دے سکتے ہیں۔

سچ ہے دوستوں جو اللہ کا ہو جاتا ہے۔ اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ اللہ کا فرمانبردار بندہ جو کہتا ہے اللہ تبارک تعالیٰ وہی کرتا ہے۔ جو خدا کا ہو جاتا ہے اس کی خدائی ہو جاتی ہے۔

آج تک جس کی دلیری کے ہیں چرچے گھر گھر
بازوئے قوت مسلم میں وہ کشہ پر نکلا!

محمد علی جوہر
حیات و شاعری

عربی کا ایک مشہور شعر ہے ؎

لیس علے اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

(اس ذاتِ باری کے لئے یہ امر چنداں دشوار نہیں کہ وہ دنیا کی بیشتر خصوصیات ایک فردِ واحد میں جمع کر دے)

اگر ہم اس شعر کو کسی کی ذات کے ساتھ منسوب کر سکتے ہیں تو وہ محمد علی جوہر کی ذاتِ گرامی ہوگی۔ اس کائنات میں خدا تعالیٰ نے ہر انسان کو کچھ مقاصدِ جلیلہ کے حصول اور انسانیت کے ارتقائی سفر میں بطورِ نشانِ منزل پیدا کیا ہے۔ ہر فرد اپنی ذہنی ساخت، فکر و نظر و مشاہدہ و مطالعہ کے لحاظ سے زندگی کے بے شمار نظاہا سے بسیط دنیا میں اپنے لئے کچھ مخصوص منازل و مقامات متعین کر لیتا ہے اور تمام عمر ان ہی مقامات کے حصول میں صرف کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ صرف ایسے مقاصد کے لئے کام کرتے اور عمر کا زیاں کرتے ہیں کہ جن سے صرف ان کی ذاتی آسائشات و ناموری فراہم ہو سکے، کچھ لوگوں کا طریقۂ کار کسی مخصوص گروہ کے مفادات تک ہوتا ہے اور چند ایک ایسے انسان بھی ہوتے ہیں کہ جن کی زندگی کا ہر ہر لمحہ انسانیت کی فلاح و فلاحِ خیر اور بھلائی کے حصول کے لئے صرف ہوتا ہے جن کی راتیں تفکر میں اور جن کے دن تدبر میں صرف ہوتے ہیں جن کے انفاس کی حرارت اپنی قوم کی مردہ رگوں میں حرارت پیدا کرنے میں ختم ہو جاتی ہے، جن کی نگاہوں کی چمک اپنی قوم کو دیدۂ بینا اور قوتِ مشاہدہ اور امتیازِ حق و باطل میں صرف ہو جاتی ہے، جن کے جسم کی ہر حرکت قوم کے تنِ مردہ کو آزادی کی تڑپ عطا کر دینے میں ختم ہو جاتی ہے اور جن کی حیات اپنے اہتمام کے لئے ایک غلام ملک کی سرزمین تک بھی پسند نہیں کرتی۔ ایسی ہی عظمتوں اور رفعتوں کے ایک درخشندہ ستارے کا نام محمد علی جوہر ہے۔

محمد علی جوہر نے کل ۵۳ برس کی قلیل عمر پائی (۱۸۷۸ء تا ۱۹۳۱ء) بچپن رامپور اور بریلی میں گذارا، بریلی سے ہائی اسکول اور بعد ازاں علی گڑھ سے ۱۸۹۶ء میں انٹرنس اور ۱۸۹۸ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا، علیگڑھ میں اپنی مقررانہ صلاحیتوں کا لوہا ہر ایک سے منوایا، کرکٹ کے نامور کھلاڑی رہے دیگر علمی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں دل کھول کر حصہ لیا۔ بی اے کے بعد کچھ تو مقتضیات زمانہ کا لحاظ اور کچھ اپنی ذاتی پسند کا جذبہ سوچا کیوں نہ آئی سی ایس کر کے ڈپٹی کمشنر یا اور کسی اعلیٰ سرکاری عہدہ پر فائز ہوں صلاح یہ ٹھہری کہ آئی سی ایس آکسفورڈ سے پاس کیا جائے اب معاملہ اخراجات کا درپیش ہوا پاس پلے کچھ نہ تھا بڑے بھائی نے اپنی ساری تنخواہ نذر کی، ایک غریب بھائی کی بے نظیر اور حیرت انگیز ہمت کی بدولت یکایک آکسفورڈ جانے کا انتظام ہوا اس وقت محمد علی کو سول سروس کے امتحان میں کامیابی کی شدید آرزو تھی۔ جب وہ ولایت روانہ ہوئے تو اُن کے دماغ پر عقلِ مآل اندیش کا قبضہ تھا مگر ان کے دل پر مصلحت ناشناس کا غلبہ تھا۔ اور اُن کے مستقبل کی تشکیل میں دونوں کی رقابت و منافرت کارفرما تھی، عقل کی رائے تھی کہ وہ مسٹر ایم علی آئی سی ایس بنائے جائیں مگر عشق کی صلاح تھی کہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی بنیں؛ عقل کی مرضی تھی کہ وہ انصاف کی کرسی پر بٹھائے جائیں، مگر عشق کی کوشش تھی کہ الزام کے کٹہرے میں کھڑے ہوں، عقل نے انہیں سزا دینے کا طریقہ بتایا، مگر عشق نے انہیں سزا پانے کا سلیقہ سکھانا چاہا۔ عقل نے ان کیلئے جج جیف اور وزارت کا خلعت، مگر عشق نے جیل کا کرتا اور ٹوپی کا احرام پہنانا چاہا۔ عقل کا مشورہ تھا کہ وہ بریلی اور انگلستان کے

زمرہ کی شاگردی میں، مگر عشق کا حکم کہ اویس ؓ و بلال ؓ کے حلقۂ غلامی میں آئیں۔ عرض عقل کا فیصلہ تھا کہ وہ یزید نہیں مگر عشق کا فتویٰ تھا کہ شہید ہوں اس کشاکش میں پا یان کار عشق ہی کامیاب ہوا یعنی محمد علی سول سروس کے امتحان میں ناکامیاب ہوئے یہ اس میدان کی پہلی فتح اور اس حکمت کا پہلا سبق تھا۔ اپنے ایک خط مورخہ ۶ / جون ۱۹۲۵ء میں رقمطراز ہیں۔

"دوسرا سفر ۱۹۰۲ء میں ہوا تھا جب کہ سول سروس میں ناکام رہ چکا تھا، شوکت صاحب بھی ناکامی کی خبر پا یونیر میں پڑھ کر زرد پڑ گئے تھے مگر ایک بڑھیا نے دیکھتے ہی تاڑ لیا تھا کہ کیا ہوا؟ اور پوچھا کہ محمد علی کی امتحان میں ناکامی پر اسقدر مایوس ہوتے ہو، اگر اس نے چوری کی ہوتی یا مرتد ہو گیا ہوتا تب تمہاری کیا حالت ہوتی محمد علی کو لکھو کہ میرا اُسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے، اس کی منگیتر بھی ساڑھے تین برس سے بیٹھی ہے اب اُسے بلا لو اور اس کی شادی کر دو" میں بلایا گیا تھا اور شادی بھی ہوئی تھی رام پور میں محکمہ تعلیم کا افسر بھی مقرر ہو چکا تھا اور اب صرف آکسفورڈ کا بی اے کا امتحان دینے جا رہا تھا۔

مولانا نے بڑے امتیازی نمبروں سے بی اے پاس کیا، ہندوستان واپس آئے اور آتے ہی ریاست بڑودہ میں محکمۂ افیون میں افسر لگ گئے لیکن اپنے ایک اعلیٰ افسر سے اک علمی مسئلہ پر بحث ہو گئی جو کہ تلخی پر منتج ہوئی (وہ افسر اورنگ زیب کے افعال عالیہ کو ان کی چیرہ دستیوں پر محمول کرتے تھے) ادھر حق گوئی اور اصل فارسی تواریخ تک دسترس نے دلائل و براہین کے انبار لگا دیئے، فی الوقت تو وہ افسر سپر ڈال گئے لیکن دل میں کدورت بیٹھ گئی جب مولانا کی ان سے نباہ کی کوئی صورت نہ رہی تو استعفا دے کر مستغنی الی اللہ ہو گئے۔ ۱۹۱۱ء میں انگریزی میں کلکتہ سے کامریڈ اور ۱۹۱۳ء میں دہلی سے اردو میں ہمدرد نکالا اور مولانا نے ان دونوں اخباروں کے ذریعے ہندوستان میں حق گوئی، بے باکی، جرأت، انشاء پردازی اور نکتہ رسی کا جو معیار قائم کیا اس کا مبتدی تک کوئی نہ ہو سکا۔ اسلام کی نصرت کا جذبہ مرحوم کی طبیعت میں پہلے شوق بنا پھر ولولہ اور آخر میں جنون، یہی جنون تھا جو کامریڈ کے مضمون پر اور جامع مسجد کے منبر پر قلم اور زبان سے اہلِ احتساب کو دعوت گیر و دار دیتا تھا ؎

طفلان شہر بے خبر انداز جنوں ما

با ایں جنوں ہنوز سزاوار سنگ نیست

جنوں کی سرکار سے سب سے بڑا انعام خلعت سرِ بارجہ عطا ہوا یعنی ادب میں پہاڑ کا سا استقلال، طبیعت میں دریا، کا سا بہاؤ، اور جذبات میں طوفان کا جوش، اسی کی بدولت تو تھا، کہ خدمت ملک و مذہب کے لئے جو ذہن میں آیا اس کو بجا آوری پورے التفات، استقلال نہایت تیزی، روانی اور شدید جوش و انہماک سے کی نتیجۃً کامریڈ اولاً سرکاری مقراض زنی کی زد میں آیا اور بعد میں بند کر دیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں علی برادران کو قطب صاحب میں نظر بند کر دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد لینڈاون (یوپی) بھیج دیئے گئے وہاں اوائل ۱۹۱۹ء تک رہے بعد میں کچھ دنوں کے لئے رامپور جانے کی اجازت مل گئی رامپور سے واپسی میں بیتول بھیج دیا گیا دسمبر ۱۹۱۹ء میں بیتول سے رہائی کا پروانہ عطا ہوا، اس تمام قید و بند کی مجموعی مدت پورے پانچ سال تھی۔ مولانا کو قید و بند کی جو جو سختیاں جھیلنی پڑیں وہ نہ تو کسی دوسرے شخص کے اعمال و افعال کی پاداش تھی، نہ ناگہاں و انعقاد میں کہ بلا علم و اطلاع شمشیر آفات سر پر آ پڑی ہو، بلکہ خود اُن کی اپنی ہی تقریروں اور تحریروں کے جرائم کی سزائیں تھیں اور یہ جرم وہ تھے کہ جن کا

ارتکاب انہوں نے کسی قدر جوش یا وقتی انفعال کی حالت میں نہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح سمجھ بوجھ کر کیا تھا چنانچہ سزا بھگتنے اور ہر کڑی جھیلنے کے بعد ان کا رونگٹا رونگٹا بھی پکارتا تھا ؎

آں قدر زخمے دل من داشت در پیکاں نہ بود

۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی تشکیل دی، اگلے سال خلافت کمیٹی کے وفد کی قیادت کرتے ہوئے یورپ کا دورہ کیا۔ ایک عرصہ دراز سے علی گڑھ میں انگریز پرنسپل مسٹر بیک، مسٹر موریسن نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ ٹرسٹیوں کی توہین اور حکم عدولی آئے دن کا معمول بن گئی تھی۔ چونکہ پرنسپل حکمران قوم کا فرد تھا لہٰذا علی گڑھ کالج اپنا انفرادی کردار سرانجام دینے کے بجائے ایک طرح کا سرکاری ادارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ مولانا نے ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کا دورہ کیا اور وہاں کے ارباب حل وعقد کو حکومت سے ترک تعلق کر کے کالج کو اک قومی ادارہ بنانے کا مشورہ دیا اس کے نتیجے میں کالج کے افسران اور سیکرٹری سے مولانا کی باقاعدہ ٹھن گئی اور مولانا کو کالج ہاسٹل سے نکال دیا گیا انہوں نے جواباً اپنے احباب کے مشورے سے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ اولڈ بوائز لاج میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان کیا جسے بعد ازاں دہلی منتقل کر دیا گیا اور وہ آج ہندوستان کی مایہ ناز یونیورسٹیوں میں شمار کی جاتی ہے۔

۱۹۲۱ء میں کراچی میں خلافت کانفرنس کا انعقاد ہوا اور بعد میں یہیں خالقدینا ہال میں علی برادران پر بغاوت کا مقدمہ چلا جس میں دونوں کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا ہوئی مارچ ۱۹۲۴ء میں مولانا کی صاحبزادی آمنہ کا انتقال ہوا اسی سال بی اماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ ۱۹۲۶ء میں موتمر عالم اسلامی کا اجلاس مکہ میں ہوا مولانا نے اس میں شرکت کی اور ساتھ ہی فریضہ حج کی ادائیگی سے بھی سرفراز ہوئے۔ اس وقت میں ان کی پریشانیاں، بیماریاں اور مخالفین برابر بڑھتی رہیں یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جس میں رب غیور نے اس جوہر گراں مایہ کو واپس لے لینا تھا لیا تھا کہ جس کے متعلق مشہور انگریزی ادیب ایچ جی ویلز نے کہا کہ "محمد علی نے برک کی زبان میکالے کا قلم اور نپولین کا دل پایا ہے" شدید علالت، بے انتہا افطار اور دیدۂ ظاہر کی بے نوری کے باوجود

انقلابات سپید و سیاہ عالم سے
دل تو روشن تھا مگر دیدۂ ظاہر بے نور

وہ ۱۹۳۰ء کے اواخر میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت فرمانے لندن تشریف لے گئے، اس کے اجتماعوں اور کمیٹیوں میں جس انداز سے وہ ہندوستان کے لئے مردانہ وار لڑے ہیں جس ہمت مجاہدانہ کے ثبوت دیئے اور اپنے تدبر، عالی دماغی اور نکتہ رسی کے جو باعظمت اور غیر فانی مظاہرے فرمائے وہ بڑے سے بڑے ہندوستانی کے مقدر میں نہیں تھے۔ یہ تو انہی کا ظرف، انہی کی روشن ضمیری اُن ہی کی ہمت اُن ہی کے دل کی لگن تھی کہ وہ یہ فرما دیں "میں اب غلام ہندوستان میں واپس نہیں جاؤں گا۔ یا تو ہندوستان کو آزادی دیجئے یا پھر مجھے قبر کے لئے ڈھائی گز زمین" اس عظیم ارادے کے انسان نے اپنی بات کو سچ کر دکھایا وہ غلام ہندوستان میں واپس نہیں آیا اور اس نے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

"مولانا صبغت اللہ شہید فرنگی محلی نے مولانا محمد علی جوہر کا نقشہ ان الفاظوں میں کھینچا ہے۔ حافظ قرآن، قرآن پاک پر گہری نظر اس کا برمحل استعمال اور اس سے صحیح استشہاد حاجی

زار، مولانا مجاہد، مبلغ، کلمۂ حق بزبان جاری، ملکۂ فولت، آکسفورڈ کے لئے مایۂ نازش، بہترین اخبار نویس، پرتاثیر خطیب، دلیا تہ اسلام، فدائی رسول صلعم، نغمہ گو شاعر، ذہین وحاضر جواب نکتہ سنج ونکتہ رس عالی دماغ مفکر، مہمان نواز اور متوکل علی اللہ"

مولانا کے نام کے تین اجزاء ہیں اور تینوں اسم با مسمیٰ نام محمد کی برکت نام علی کی شجاعت اور جوہر کی چمک آخر عمر تک قائم رہی۔ علیٔ اللہ کا بھی نام ہے۔ اور سیدنا اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کا اسم مبارک بھی ہے کسی شاعر نے کیا خوب بات کہی ہے ؎

جز وِ عظم کہ شجاعت ز فضہ آئل باشد
بر علی آمدہ از فضلِ عمیم رحماں ؎

یہی وہ فضل عمیم بشکل شجاعت وجرأت تھا کہ جس میں سوائے خدا کے خوف کے انسان کا خوف برائے نام بھی نہ تھا اس کی شہادت ان کی زندگی پیش کرتی ہے۔ اور مہرِ دوام ثبت کر گئی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما،

مولانا کی حیات کے بعد اگر ہم ان کی شاعری، عہد اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ دہلی اور لکھنو کے تہذیبی زوال کے بعد رامپور بیشتر شعرائے ہند کا مسکن بنا اسطرح اس کو بھی اک باقاعدہ تہذیبی روایت اور شاعرانہ مزاج پیدا ہو چکا تھا جو ہر کے عہد طفلی میں رامپور کے آسمانِ ادب پر داغ، امیر، تسلیم جلال، عروج وغیرہ ضوفشانیاں کر رہے تھے خصوصا داغ تو ایسا طوطی بول رہا تھا کہ اس عہد کے جید اساتذہ کو بھی ان کے رنگ کا اتباع

کرتے ہی بنی۔ جوہر کے بڑے بھائی ذوالفقار علی گوہر کو داغ سے شرف تلمذ حاصل تھا اور ان ہی کے توسط سے جوہر کی رسائی داغ تک ہوئی۔ چونکہ جوہر فطرت ہی سے ذہانت وطباعی کا ملکہ لے کر آئے تھے لہذا داغ کی طبیعت کو جوہر کے یہ فطری جوہر بھلے گئے اور انہوں نے جوہر پر خصوصی توجہ دینا شروع کی بعد میں تو داغ کی طبیعت اس درجہ مانوس ہو گئی تھی کہ اگر کسی دن جوہر حضرت داغ کی خدمت میں حاضر نہ ہو پاتے تو داغ انہیں بالا صرار بلواتے۔ داغ کی صحبت نے جوہر کی بہت سی خفتہ صلاحیتوں کو اجاگر کر دیا بعد ازاں جب جوہر علی گڑھ کالج گئے تو شبلی سے ملاقات ہوئی، (شبلی جیسا جوہر شناس جس نے لاتعداد ذروں کو آفتاب بنا دیا) شبلی نے جب جوہر کی موزونئ طبع اور جودت فکر وفہم کو پرکھا تو بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اس نوجوان کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ ان کی صلاحیتوں کی نشوونما میں بھی مدد کی۔ دوران کالج محمد علی کی دوستی حسرت اور یلدرم سے ہو گئی ان دونوں حضرات کی صحبت میں جوہر نے محافل شعر وسخن میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اُس وقت تک ان کے خیالات میں پختگی اور متانت پیدا نہیں ہوئی تھی اُن کو اصل شاعری اُس وقت نکھری جب کہ انہوں نے "ہمدرد" جاری کیا۔ ہمدرد کے اجراء کے بعد انہوں نے سیاسی خیالات وافکار کو غزل کی زبان میں بڑی کامیابی سے ادا کیا، آخر عمر میں عشق حقیقی رنگ لایا اور تغزل کا زور ہوا مگر افسوس عدیم الفرستی کے باعث مولانا اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ کلام جوہر کے مطالعہ سے مولانا کی شاعری کے حقیقی جوہر ضرور کھلتے ہیں ایک طرف تو اُن کا کلام اکثر وبیشتر آپ بیتی ہونے کی وجہ سے تری الفاظ تراشی وقافیہ بندی کی منزل سے بہت آگے ہے اس پر مستزاد یہ کہ مولانا موصوف صاحب دل ہونے کے ساتھ صاحب زبان بھی تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری بڑی شستہ وشیریں ہے،

ان کا تغزّل شوخیٔ بیان، لطفِ زبان حسنِ ادا، رنگین خیالی اور عاشقانہ مضمون آفرینی کی تمام خصوصیات سے مالامال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا کی فطری سنجیدگی اور متانت کی وجہ سے غزلیات میں وہ شگفتگی تو نہیں ہے جو ایک مشّاق اور پختہ کار شاعر کا خاصہ ہوتی ہے لیکن درد واثر کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے اور جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان اشعار میں اپنا دردِ دل بیان کیا گیا ہے تو اشعار کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے۔ شاعری اکتسابی شے نہیں ہے مولانا کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا ملکہ روزِ اوّل سے ودیعت کیا گیا تھا ورنہ آپ کی زبان سے ہرگز ایسے عمدہ اشعار نہ نکلتے۔

گو کہ مولانا کی سیاسی و قومی مصروفیات کی بنا پر اُن کی شاعری عدم توجہی کا شکار رہی مگر اس کے باوجود اُن کا کلام بلحاظِ کیفیت و کمیت ساقط المعیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قومی شاعری حالاتِ زمانہ اور مقتضیاتِ عہد کو جیسا انہوں نے نظم کیا ویسا پھر کسی سے نہ ہو سکا بالخصوص سیاسی افکار میں جیسا جوش و خروش ارادے کی پختگی، اخلاص، ایثار، لگن، جدوجہد کی تڑپ اور کربِ ذات کا اظہار اُن کی شاعری میں موجود ہے اُس عہد کے تمام شعرا میں معدوم ہے۔

شاعری کی معراج یہ ہے کہ وہ "جزو ایست پیغمبری" کے مرتبہ تک پہنچ جائے یہ مرتبہ بہت کم شاعروں کو حاصل ہوتا ہے ان کی الہامی پیشن گوئی اُن کی آرزوئے مدفن تھی فرماتے ہیں۔

چودہ برس جو قبلہ رہا ہے رسول کا
قسمت ہے اپنا خون اسی کی زمین کا

اسی موقعہ کے لئے اقبال نے فرمایا تھا۔

خاکِ قدس اورا بآغوشِ تمنّا در گرفت
سوئے جنّت رفت از راہے کہ پیغمبر گرفت

ان کا یہ شعر الہامی پیشن گوئی کا درجہ حاصل کر گیا ہے۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مدینۃ الانبیاء میں دفن ہونے کا اعزاز جوہر کے علاوہ کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔

مولانا نے تمام عمر قیدِ فرنگ بھگتی طرح طرح کی تکالیف اٹھائیں لیکن راہِ حق سے سرگردانی نہیں کی اور صراطِ مستقیم سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے چنانچہ اپنی پہلی نظربندی کے موقعہ پر کہتے ہیں۔

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے
جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہرؔ آپ کے جوہر کھلے

کسی بھی فعل کی کامیابی و ناکامی کا انحصار طبائع انسانی کے عزائم کے راسخ ہونے اور سعی و استقلال پر ہوتا ہے جب تک ارادہ میں استقامت، اخلاص، لگن اور کسک نہ ہوگی وہ مہتم بالشان طریقے سے سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ جوہر چونکہ بے حد عملی اور فعال انسان تھے لہٰذا وہ ان تمام صفاتِ عالیہ سے متصف تھے۔ قوم کے لئے جو سوز و گداز اور تڑپ اُن کی شاعری میں پائی جاتی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے خاص طور پر اُن کے ایامِ اسیری میں اُن پر جن مصائب کے پہاڑ ٹوٹے طبعِ ذاتی اور قومی حزن نے اُن کو زیر بار کیا اسی قدر اُن کا آئینۂ قلب جلا پاتا چلا گیا اور اُن کے دل میں قدرتِ خداوندی کی کارفرمائیاں احکامِ خداوندی کی طرح راسخ۔

ہوتی چلی گئی۔ مولانا اسیر تھے کہ خبر ملی ان کی لاڈلی بیٹی شدید علیل ہے ایسے میں ان کے قلب کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ کیا کیا نہ تڑپے ہوں گے لیکن اس پیکر تسلیم و رضا کی زبان سے بے اختیار نکلتا ہے۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

امتحان سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

اس درجہ ثبات و استقلال پر کون پورا اتر سکتا ہے۔

ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلا،
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

بڑی ہمت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اس نظم کو امید و رجا، استقامت و استقلال، عزم و ہمت، تسلیم و رضا، عشق الٰہی اور سوز و دروں کی بہترین مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ مولانا کی شاعرانہ حیثیت، کیفیت اور معیار کا اندازہ اُن کے مندرجہ ذیل منتخب اشعار سے کیا جا سکتا ہے کیونکہ ؎

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

یہ ستانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب
ظلم کا نام ستمگر نے حیا رکھا ہے

ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس طرح کے جینے میں بھی مرنے کا مزا ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ

ہو حسنِ طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدقِ طلب پھر اثرِ آہ رسا دیکھ

تم یونہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

ہے ظلم ترا عام مگر پھر بھی ستمگر
مخصوص یہ اندازِ جفا میرے لئے ہے

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

پھر ہو رہا ہے شورِ صلائے نبردِ عشق
ہاں اے دہانِ زخم جواب الاماں نہ ہو

ہمت نہ ہار دے کوئی منزل کے سامنے
پروردگاریوں کبھی کوئی ناتواں نہ ہو

اس دردِ لاعلاج کی کیوں کر کروں دوا
وہ حالِ دل سنیں بھی تو مجھ سے بیاں نہ ہو

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو
مگر اے ہم نفس دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے

یقین آنے کو تو آجاتے تیرے عہد و پیماں پر
تری آنکھ اے بتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

قیدِ گیسو سے بھلا کون رہے گا آزاد
تیری زلفوں پہ بکھرنا ہے یہی

اور کس وضع کی جویاں ہیں عروسانِ بہشت
ہیں کفن سرخ، شہیدوں کا سنورنا ہے یہی

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانے
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی

سوزِ دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو
ہے دردِ دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو

بے خوف غیر دل کی اگر ترجماں نہ ہو
بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو

اک تو جو مہرباں ہو تو ہر اک ہو مہرباں
اور یوں نہ ہو تو ہائے کوئی مہرباں نہ ہو

ہم کو تو ایک تجھ سے دو عالم میں ہے غرض
سب بدگماں ہوا کریں تو بدگماں نہ ہو

شہد و شراب خلد میں یہ چاشنی کہاں
کچھ خونِ دل سے بڑھ کے مزا ہو تو جانئے

کتابیات

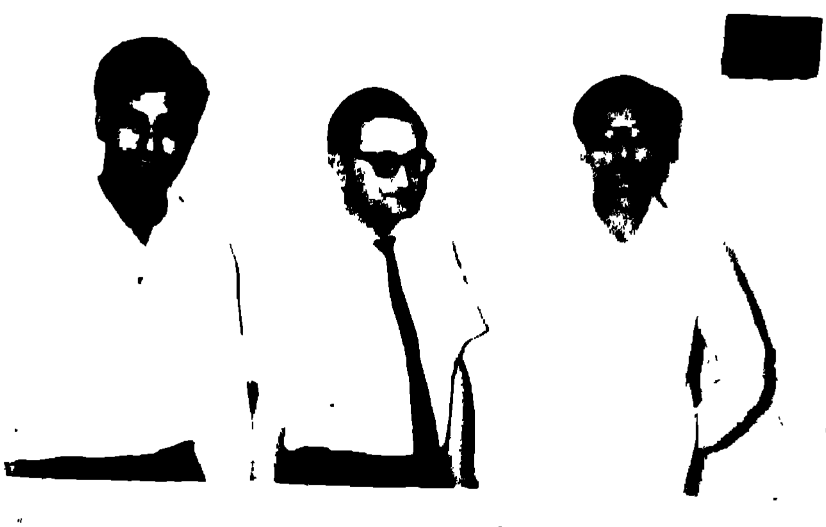
(۱) محمد علی جوہر، حیات اور تعلیمی خدمات
(۲) علی برادران (۳) اوراقِ گم گشتہ
(۴) محمد علی کے یورپ کے سفر (۵) سیرت محمد علی
(۶) محمد علی کی ڈائری (۷) شاعر نامہ
(۸) جدید شعرائے اردو (۹) مراۃ الشعراء
(۱۰) بیاضِ سخن (۱۱) خطبات جوہر
(۱۲) خطبۂ صدارت (۱۳) چند اہم خطوط



بلیک کے استاد کا الوداعیہ



ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی



ڈاکٹر اظہار الدین بقائی، ڈاکٹر وقار احمد زبیری اور محمد اظہر خان کے ہمراہ

ملاقات

امین فاروق

ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی

صدر شعبہ حیوانیات

ملک میں تعلیمی اصلاحات نئے سرے سے نافذ کرنے کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں اساتذۂ کرام اور طلبہ و طالبات کی پوری پوری توجہ اس طرف مبذول تھی۔ ان کے اذہان ایسی اصلاحات کے متعلق غور و فکر کر رہے تھے۔ جو آگے چل کر ملک و ملت کے لئے سودمند ثابت ہو سکیں۔ خیالات کی یورش تھی۔ لیکن انہیں صفحہ پر منتقل کرنے کی صلاحیت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ اس لئے قلم کے بجائے زبان کا استعمال عام تھا۔ خاص و عام محفلوں میں تعلیمی اصلاحات پر بحث و مباحثے جاری تھے۔ لکھنے لکھانے والوں نے قلم کا سہارا لیا۔ اور اس طرح اخبارات میں تعلیم کے موضوع پر مضامین کا آغاز ہوا۔ مختلف مضامین اخبارات میں چھپے لیکن کسی نے ایک پہلو کا جائزہ لیا۔ اور کسی نے سرسری انداز میں چند تجاویز پیش کر کے یہ سمجھ لیا کہ ان کا فرض ادا ہو گیا ایسے میں روزنامہ جنگ میں ایک سلسلہ کا آغاز ہوا۔ شروع میں پڑھنے والوں نے دوسرے مضامین کی طرح اس میں بھی نیم دلی سے دلچسپی لی۔ جوں جوں بڑھنے لگی اور یہ خیال پروان چڑھنے لگا کہ مضمون نگار اپنے خیالات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر رہا ہے۔ جن خیالات کو دوسرے الفاظ کی لگام نہ دے سکے تھے۔ دوسرے مضمون نگار نے نہایت خوبی و کمال کے ساتھ زبان دی بلکہ اس کی رفتار میں توازن اور باقاعدگی بھی پیدا کی۔ ہر شخص یہ سمجھنے لگا کہ اگر ماہرین نے صاحب مضمون کے خیالات کو اہمیت دی تو تعلیم کے مسائل بڑی حد تک حل ہو جائیں گے۔ اور مضبوط بنیاد استوار کرنا آسان ہو جائے گا۔

گیرائی اور گہرائی کے ساتھ ساتھ دلچسپ انداز بیان، جذبات اور احساسات کا خوبصورت عکس، قوم کے لئے تڑپ، الفاظ کا تناسب اور ٹھہرا ٹھہرا سوالیہ انداز، مسائل کو الجھاؤ اور پھر اسے سلجھانے کی کامیاب کوشش۔ ان خوبیوں نے جنگ کے سلسلہ وار مضمون سے میری دلچسپی کو اور بھی بڑھا دیا۔ میں اس کا منتظر رہنے لگا۔ سلسلۂ مضمون اپنے انجام کو پہنچا۔ بات آئی گئی ہو گئی لیکن ذہن پر ایک شخصیت

اپنے اچھے اثرات مرتب کرکے تخیل کی گہرائیوں
میں جا سوئی۔ مئی ۱۹۷۳ء میں میرا تقرر بحیثیت
استاد اردو سائنس کالج میں ہوا۔ اساتذہ سے
تعارف حاصل کرنے کے لئے مختلف شعبوں میں
جانا ہوا۔ ایک مرتبہ شعبۂ حیوانیات کے صدر سے ملاقات
ہوئی۔ رسمی تعارف کے بعد بات چیت کا آغاز ہوا تو
میں نے اپنے آپ کو الجھا الجھا سا محسوس کیا۔ اور
جب الجھن کے اسباب پر غور کیا۔ تو تخیل کی گہرائی
میں ہلچل محسوس ہوئی اور پھر جلد ہی سطح ذہن
پر اب سے کئی سال پہلے پڑھے ہوئے تعلیمی مضمون
کے خالق کی وہ تصویر ابھری جو مضمون کی اقساط
کے ساتھ چھپتی رہی تھی اور جلد ہی تصویر تخیل سے
آہستگی سے رینگتی ہوئی سامنے کرسی پر آ بیٹھی۔
اور نہایت توجہ اور دلچسپی کے ساتھ گفتگو کرنے
لگی تو نہایت مسرت ہوئی یہ شخصیت تھی۔
پروفیسر حفیظ الرحمن کی جو اپنے مضامین کی
طرح ٹھیرے ٹھیرے نرم اور دلکش انداز میں محو
گفتگو تھے۔

حفیظ الرحمن صاحب ۲ دسمبر ۱۹۳۶ء میں
مونگیر صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تعلیم گارڈن
کے اسکول میں اور ثانوی تعلیم ابوالکلام آزاد ہائی
اسکول رانچی میں حاصل کی۔ اعلیٰ ثانوی تعلیم کا
پہلا سال جگن ناتھ کالج ڈھاکہ میں جبکہ دوسرا
سال سندھ مسلم کالج کراچی میں مکمل کیا۔ بی
ایس سی۔ ڈی جے کالج کراچی سے ایم ایس سی۔
اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری جامعہ کراچی سے حاصل کی۔
۹ نومبر ۱۹۵۸ء کو بحیثیت ڈیمانسٹریٹر
اردو کالج میں تقرر ہوا۔ بتدریج ترقی کی منازل طے
کرتے ہوئے آج کالج کے نیک نام اور ہر دل عزیز پروفیسر
کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی نہایت ذمہ داری
اور ہوشیاری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اسی
اثنا میں تحقیقی مقالے کے سلسلے میں یکم جولائی
۱۹۶۸ء سے ۲ جون ۱۹۷۰ء تک شعبہ حیوانیات جامعہ
کراچی میں بحیثیت افسر تحقیق کام کرتے رہے۔ اردو
کالج میں اپنے فرائض منصبی نہایت خلوص و دیانت
داری سے انجام دینے کے دوران عام سے لگاؤ اور دلچسپی
انہیں اکسانی رہی کہ اس میدان میں مزید کچھ کیا جائے۔
اس دوران ڈاکٹر نعیم الحسن نقوی صاحب جو کہ اس سے
پیشتر شعبہ حیوانیات اردو سائنس کالج کے صدر تھے۔
اور ڈاکٹریٹ کے بعد مجلس تحقیق صنعت و سائنس
پاکستان کی مرکزی تجربہ گاہ واقعہ کراچی کے افسر
تحقیق ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی ترغیب دی کہ ڈاکٹریٹ
کی جائے۔ حفیظ صاحب نے ان کی تجربہ گاہ میں ان ہی
کی زیر نگرانی ٹڈی کی ایک خاص قسم کی غذائی
نالی میں فاسفیٹ خامروں پر تحقیقی کام شروع کیا
اور توقع سے بہت کم عرصے میں اتنا کام کر لیا کہ
دو تحقیقی مقالے تیار ہو گئے۔ جنہیں شائع بھی کروا
دیا گیا۔ ڈاکٹر نعیم صاحب نے اس کام کو پی ایچ ڈی
کے مقالے کے سلسلے میں ایک تہائی قرار دیا۔ ان ہی
دنوں بیرون ملک چند مضامین لکھے گئے۔ جن کے مطالعے
سے مزید یہ کہ چند دوست و احباب کے خطوط سے
معلوم ہوا کہ تحقیق کے جس طریقے پر عمل کیا جا رہا ہے
وہ فرسودہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ طریقہ کار
کی فرسودگی کی بنا پر مقالہ نامنظور ہو جائے چنانچہ

مزید کام روک دیا گیا۔

حفیظ الرحمٰن صاحب ان دنوں بڑے الجھے الجھے رہتے تھے ۔ اچھا خاصا کام رک گیا تھا۔ بددلی کی بات تو تھی۔ ایسے موقع پر اچھے اچھے ہمت ہار کر مایوسی کا اظہار کرنے لگتے ہیں لیکن موصوف میں استقامت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے آہستہ روی پائی جاتی ہے لیکن استقلال کا عنصر غالب آتا ہے ۔ اسی زمانے میں امریکی محکمہ زراعت نے پی۔ ایل ۴۸۰ کے تحت تحقیق کی ایک اسکیم شعبہ حیوانیات جامعہ کراچی کے ڈاکٹر امتیاز احمد کے سپرد کی اس منصوبے کے تحت اس امر کی تحقیق کرنی تھی کہ جنین ترائی منٹرس کی جو خاندان نبری ٹائی نیڈی کا ایک رکن ہے انواع کی نظامیات پر نظر ثانی کریں۔ حفیظ الرحمٰن صاحب نے اس میں دلچسپی کا اظہار کیا ڈاکٹر امتیاز احمد نے بھی ان کے ذمہ یہ کام کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اور جب ڈاکٹر وقار احمد زبیری مددگار پروفیسر شعبہ حیوانیات اردو کالج نے بھی اس کام کو کرنے کا مشورہ دیا تو انہوں نے اس ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ تحقیق کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ ہمہ وقت ذہن کو ایک ہی سمت مصروف رکھنا ضروری تھا۔ اس مسئلے کو جناب جمیل الدین عالی صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ موصوف اس وقت اردو کالج کے اعزازی سکریٹری تھے ۔ انہوں نے کام کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے تین سال کی رخصت منظور فرما دی۔ اس طرح یکسوئی اور پوری توجہ کے ساتھ حفیظ صاحب نے تحقیق کا آغاز کیا اس زمانے میں بحیثیت افسر تحقیق ان کا تقرر شعبہ حیوانیات جامعہ کراچی میں تحقیق کی عین نوعیت کے مطابق کر دیا۔

"پاکستان، آزاد کشمیر اور بنگلہ دیش میں خاندان نبری سینیڈی میں پائے جانے والے جنینوں کی شکلیات، نظامیات، تاریخ اجداد اور جغرافیائی تقسیم" یہ نام ہے حفیظ الرحمٰن صاحب کے اس مقالے کا جس کی تکمیل پر انہیں پی ایچ ڈی کی سند عطا کی گئی اور اس طرح حفیظ الرحمٰن صاحب ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن کہلانے لگے اس مقالے کے سلسلہ میں انہوں نے جہد مسلسل کی مدد سے اپنا تجرباتی کام دو سال میں مکمل کر لیا۔ ایک سال کی رخصت منسوخ کروا کر واپس کالج آ گئے اس وقت ان کا خیال یہی تھا کہ تحقیقاتی مقالہ قلمبند کرنے کے لئے اپنے فرائض درس و تدریس سے لاتعلق مناسب نہیں رہے گی۔ کالج آنے کے بعد درس و تدریس کے ساتھ ساتھ گھریلو و ذاتی مصروفیات نے انہیں دم نہ لینے دیا اس طرح مقالہ قلم بند کرنے کا کام التوا میں پڑ گیا اور پھر جیسے ہی حالات نے اجازت دی ۱۹۷۸ء کے نصف آخر میں انہوں نے مقالے کی تصنیف کا کام شروع کر دیا اس طرح تقریباً پورے دو سال میں کام مکمل ہوا۔

جہاں تک مقالے کا تعلق ہے اس کی اہمیت عمومی نوعیت کی نہیں ہے بلکہ خالصتاً علمی ہے لہٰذا وہی لوگ اس میں دلچسپی لینا پسند کریں گے جو حشرات اور نظامیات کی تحقیق سے منسلک ہیں کیونکہ جن حیوانات پر انہوں نے کام کیا ہے۔ ان کا تعلق حشرات سے ہے۔ جن کی مختلف اقسام دنیا بھر میں پائی جاتی ہیں ان کی جنینوں کی کل تعداد ۳۰۰ بتائی جاتی ہے اب تک صرف ایک جنین پر امریکا میں کام کیا گیا ہے جبکہ حفیظ الرحمٰن نے "۱۰" جنینوں کی شکلیات پر کام کیا ہے ۔ مقالے کے ممتحن امریکہ کے پروفیسر ڈاکٹر شلیفرڈ اور جرمنی کے پروفیسر

ڈاکٹر وانڈنر رہے دونوں نے مقالے کے بارے میں بڑی اچھی رائے کا اظہار کیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ پروفیسر شیفر نے اسے فوری طور پر اپنی زیر نگرانی چھپوانے کی پیشکش بھی کی ہے۔ جرمنی کے پروفیسر وانڈنر نے اس مقالے کی بنیاد پر اس تحقیقی ادارے کو بھی اعلیٰ و افضل قرار دیا ہے جہاں یہ کام کیا گیا۔

پروفیسر وانڈنر نے جو کچھ کہا وہ مناسب ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ادارے کی عظمت، بلندی اور نیک نامی کا زیادہ تر سبب وہ افراد بنتے ہیں جو اس سے متعلق ہوتے ہیں۔ اب حفیظ صاحب ہی کو لیجئے کل تحقیقی مقالے کو مکمل کر کے جامعہ کراچی کی عظمت کا سبب بنے تو آج اپنے خلوص محنت اور علم دوستی کی بنا پر وفاقی حکومت اردو سائنس کالج کی سربلندی کا سبب بن رہے ہیں۔ دیگر اساتذہ کی طرح صرف کمرۂ جماعت تک اپنی دلچسپی کو فرائض منصبی نہیں سمجھتے بلکہ شاگردوں کی مدد کے لئے ہمہ وقت چاق و چوبند رہتے ہیں جب طالبعلم اپنی ضرورت کیلئے ان سے رابطہ قائم کرتا ہے تو تمام استادوں کی طرح وہ ایسا رویہ اختیار نہیں کرتے جس سے طالب علم کو یہ تاثر ملے کہ استاد احسان کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس ان کا رویہ نہایت گرم جوشی، خلوص اور دلچسپی لیے ہوئے ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طالب علم نے ان سے اپنے مسئلہ کو حل کرنے کا کہہ کر ان پر احسان کیا ہے یہی وجہ ہے کہ طالب علم ان کا بے انتہا احترام کرتے ہیں بعض مرتبہ احترام عقیدت کو چھوتا ہوا ملتا ہے۔

مدلل انداز بیاں، دل نشیں نرم انداز میں گفتگو، وسیع معلومات کا خزانہ، گفتار کے ساتھ ساتھ قلم کا بھی غازی، دیانت دار پُر خلوص اپنے کام سے کام رکھنے والا، یہ ہے ایک آئیڈیل استاد کا خاکہ اس کی چوکھٹ میں حفیظ الرحمٰن صاحب کی شخصیت پوری طرح سج جاتی ہے۔

موجودہ دور کے اساتذہ کی اکثریت گفتار کی غازی تو ہوتی ہے لیکن قلم کی غازی نہیں بن پاتی۔ حفیظ صاحب کے متعلق یہ کہا جائے تو بہتر ہے کہ دونوں میں پوری طرح طاق ہیں دونوں میں یکساں دلچسپی لیتے ہیں اور دونوں کو ایک استاد کے لئے لازم سمجھتے ہیں ان کی تخلیقات میں علمی، ادبی، سائنسی اور اصلاحی مضامین کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔ ۱۹۵۲ء سے مختلف اخبارات اور جرائد میں مضامین لکھ رہے ہیں۔ ایسے اخبارات جرائد کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے ان میں کوثر اور تسنیم "لاہور" پاسبان اور انقلاب ڈھاکہ، حریت، جنگ اور جسارت کراچی نوائے وقت اور جسارت ملتان کے علاوہ ہفت روزہ زندگی جدید سائنس، کاروان سائنس، اسٹوڈنٹس وائس، اور ریاض شامل ہیں مطبوعہ مضامین کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے۔ تعلیم کے موضوع پر انہوں نے جنوری ۱۹۶۶ء سے فروری ۱۹۷۰ء تک نہایت باقاعدگی سے ہفتہ وار مضامین کا سلسلہ روزنامہ جنگ میں لکھا ایسے کل مضامین کی تعداد ۱۸۰ سے زیادہ ہے جہاں تک دوسری تصانیف کا تعلق ہے دو عدد درسی کتابیں، دو تحقیقی مقالے، دو درسی پارے "مونوگراف" شامل ہیں اس کے علاوہ جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف و

تالیف کی مجلس اصطلاحات برائے حیاتیات کے معتمد کی حیثیت سے ۱۲ سال تک فرائض انجام دیئے اصطلاحات فرہنگ کی تکمیل کے بعد اس کی ادارت میں بھی معاونت کی جو دو جلدوں میں طبع ہو چکی ہے ایم ایس سی کے درجے کی دو درسی کتابوں میں شریک مترجم کی حیثیت سے بھی ہاتھ بٹایا۔

علم پر ان کی وسعت نظر ملک و قوم اور قومی زبان اردو سے محبت کی بنا پر ہم نے چند سوالات کیے۔ خاص طور پر مقالہ اردو میں تحریر نہ کرنے کے اسباب جاننا چاہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی دو وجوہ ہیں۔ پہلی یہ کہ ہمارے ممتحن بیرون ملک کے ماہرین تھے جو اردو میں لکھے ہوئے مقالے کو جانچنے سے قاصر رہتے۔ دوئم یہ کہ مجھ سے پہلے ڈاکٹر نعیم الحسن صاحب حشرات کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ اردو میں بھی پیش کر چکے ہیں اور ان کا یہ عمل اس چیلنج کا بہت شافی جواب تھا کہ اردو میں اعلیٰ سائنسی مضامین قلمبند نہیں کیے جا سکتے۔ اردو زبان میں سائنسی تعلیم کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے فرمایا: "اردو میں سائنسی تعلیم کی افادیت بہت زیادہ ہے وجہ یہ ہے کہ انگریزی کے مقابلے میں اردو ہماری قومی و مادری زبان ہے۔ جسے ہم ابتداء سے جانتے ہیں سمجھتے ہیں۔ لہذا اس میں نہ صرف اظہار خیال میں سہولت ہو جاتی ہے۔ بلکہ بات کو سمجھنے میں بھی بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ یعنی بات بخوبی اور جلد سمجھ میں آجاتی ہے" جہاں تک انگریزی اصطلاحات کے استعمال کا تعلق ہے انہوں نے فرمایا: "ہم انگریزی اصطلاحات کو بھی یکساں اہمیت دیتے ہیں وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر سائنسی لٹریچر انگریزی زبان میں ملتا ہے معیار تعلیم کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ گر رہا ہے اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے فرمایا" بڑی وجہ یہ ہے کہ اساتذہ کرام کا رابطہ طلباء سے کمزور ہے اپنے فرائض کی بجا آوری میں ہمارے دلوں میں وہ لگن نہیں جو ہونی چاہئے۔ لہذا کمرۂ تدریس سے باہر طلباء میں یہ حوصلہ نہیں کہ وہ اساتذہ سے استفادہ کر سکیں۔ اور اپنی مشکلات کے لئے ان سے رجوع کر سکیں کالجوں کو قومیانے کی پالیسی کے بعد سے اساتذہ میں تغافل اور لاپرواہی پہلے کے مقابلے میں بڑھ گئی دوسری وجہ یہ ہے کہ نقل کرنے کی آزادی صد درجہ بڑھ گئی ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ طالب علم کو اس امر کی یقین دہانی حاصل نہیں ہوتی کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد انہیں باآسانی اور لازماً روزگار مل جائے گا۔ بے یقینی کی اس کیفیت کی وجہ سے حصول تعلیم میں ان کا دل نہیں لگتا۔ حالانکہ میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں کے طالب علم پوری لگن اور دلچسپی کے ساتھ علم کی تکمیل کرتے ہیں کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اگر تعلیم مکمل ہو گئی تو روزگار حاصل ہو جائے گا۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ تعلیم پر انتظامیہ کی گرفت بہت ڈھیلی ہے۔ وہ درس گاہوں کا سختی سے محاسبہ نہیں کرتی۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ کالجوں کے نتائج کالج دار ہوں تو بہتر ہے اس طرح رو بہ زوال کالج کے نتائج پر انتظامیہ کی نظر رہے گی۔ اور آئندہ اس کی دیکھ بھال بخوبی ہو سکے گی۔"

جہاں تک اردو زبان کی ملک گیر افادیت کا تعلق ہے۔ حفیظ الرحمٰن صاحب کا خیال ہے کہ اردو دیگر صوبوں کے درمیان رابطہ کی زبان ہے اور یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ علمی حیثیت سے اردو کی ترقی کے متعلق ان کا یقین ہے کہ یہ مشروط ہے اس کے سرکاری

زبان بنانے پر اگر اسے سرکاری زبان بنا دیا جائے۔ تو بہت جلد ذریعہ تعلیم کی واحد زبان بن سکتی ہے۔ جبکہ سرکاری زبان بننے کے بعد وہ لوگ بھی اسکی سربلندی اور بہتری کے لئے کوشاں ہو جائیں گے جو آج انگریزی کو صرف اس لئے اپنائے ہوئے ہیں کہ یہ سرکاری زبان ہے ان کا یقین ہے کہ روزگار کے لئے مستعمل زبان ہی ذریعہ تعلیم بن کر ترقی کر سکتی ہے "ہمارے ملک میں سائنسی تعلیم تو عام ہو گئی لیکن عظیم سائنسداں بہت کم کیوں پیدا ہوئے"؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا "سائنس کی تعلیم کے لئے ہمارے یہاں درسگاہیں کھولی ہی نہیں گئیں درسگاہوں میں سائنس کا جو شعبہ ہے اس کا مقصد سائنسداں بنانا نہیں ہے بلکہ انجینیرنگ اور میڈیکل میں داخلہ کی تیاری کروانا ہے۔ جو طلباء و طالبات میڈیکل اور انجینیرنگ میں داخلہ لینے سے محروم رہتے ہیں وہی ناچار احساس محرومی کے ساتھ بی۔ ایس سی میں داخلہ لیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ شکست خوردہ طلباء اپنے دل میں وہ لگن کہاں سے لائیں گے۔ جو سائنسداں بننے والی تعلیم کے لئے ضروری ہوتی ہے"۔

اردو کالج ایک تحریک ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا" اردو کالج کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ اردو کو ملک کی تمام درسگاہوں کے لئے ذریعہ تعلیم بنانے کی غرض سے ہراول کا کام دے۔ اساتذہ اردو میں نہ صرف پڑھائیں بلکہ اردو کی اصطلاحیں تیار کریں۔ اور اردو میں کتابیں لکھیں"۔ اس تحریک میں اپنے کردار کے متعلق انہوں نے فرمایا "خدا کا شکر ہے کہ اردو کالج کی تحریک کے مقاصد کی تکمیل کے لئے میں برابر کوشاں ہوں۔ حتی المقدور اردو میں پڑھا کر اور کتابیں لکھ کر اپنا فرض پورا کر رہا ہوں

آخر میں ہم نے حفیظ الرحمٰن صاحب سے ان کے مقالے کی تکمیل کے دوران پیش آنے والی مشکلات پر روشنی ڈالنے کو کہا انہوں نے فرمایا خدا کا شکر ہے میں نے اپنے مددگاروں کی مدد سے بخوبی اور آسانی سے ان پر قابو پالیا۔ دراصل مقصد نیک اور لگن مستحکم ہو تو دشواریاں خود بخود سمٹتی چلی جاتی ہیں۔ مسائل پر قابو پانے کے سلسلے میں وہ جامعہ کراچی میں اپنے ہم کاروں کے مشکور ہیں اور ان کے تعاون کو سراہتے ہیں۔ ان میں علی خان اور محمد اسلم مددگار تجربہ گاہ کے علاوہ افسر تحقیق کمال الدین، پروفیسر پرویز اختر صدیقی صاحب، مددگار پروفیسر شعبہ حیوانیات جامعہ کراچی اور محترمہ مہر افشاں عثمانی صاحبہ جو اب ہمارے کالج کے شعبہ حیوانیات میں لیکچرار ہیں، کے نام نامی شامل ہیں

مستقل مزاجی اور قوت ارادی کی مدد سے علم کے سمندر کی گہرائی سے چند مزید موتی حاصل کر کے حفیظ الرحمٰن صاحب سطح علم پر نمودار ہوئے تو ڈاکٹر کہلانے کے مستحق قرار دے گئے۔

پروفیسر حفیظ الرحمٰن صاحب کے پروفیسر سے ڈاکٹر بننے پر مجلس ادارت "کائنات" اپنے سرپرست اعلیٰ پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب پرنسپل کالج کی رہنمائی میں انہیں اپنی بے مثال کامیابی پر پرخلوص "مبارک باد" پیش کرتی ہے اور توقع کرتی ہے کہ ملک و ملت اور علم کی ترقی و تعمیر کے لئے ان کی کاوشیں شب و روز جاری رہے گی کیونکہ

بقیہ صفحہ ۵۰۱

[redacted]

ڈاکٹر وقار احمد زبیری
مددگار پروفیسر شعبۂ حیوانیات

دیوانۂ آدابِ وفا

دو سال ادھر کی بات ہے جب جامعہ کے قبرستان میں مٹی کے ایک ڈھیر کا اضافہ ہو گیا۔ یوں تو اس قبرستان میں جس قبر پر نظر پڑے یادوں کی ایک برات سامنے آجاتی ہے مگر میرے لیے ایک قبر ایسی بھی ہے جس پر ڈاکٹر اظہار الدین بقائیؒ کے نام کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ میں جب اس کتبے کو پڑھتا ہوں تو ذہن میں ماضی کے واقعات کے جھماکے ہونے لگتے ہیں۔

مجھے یاد آیا ہے کہ برسوں پہلے جب ڈاکٹر صاحب اظہار الدین بقائیؒ اور اپنے دوستوں کے لیے صرف بھائی جان ہوتے تھے۔ میں ایک بے نوا طالب علم کی حیثیت سے اردو کالج کے شعبۂ سائنس کی سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل پر شعبۂ حیوانیات میں داخل ہوا۔ بقائیؒ صاحب نے چشمے کے پیچھے سے اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے بغور دیکھا اور پھر دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "آپ کے ساتھی کہاں ہیں؟"

میں تو خود ہی اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈ رہا تھا ان کو سمجھانا چاہتا تھا ان کو کیا بتاتا کہ وہ کہاں ہیں۔ انہوں نے ساتھیوں کے انتظار میں مجھے اپنے کمرے میں ہی بیٹھنے کی اجازت دیدی جو دراصل کمرہ نہیں تھا بلکہ الماریوں کو کھڑا کر کے ایک الگ سا گوشہ بنا لیا گیا تھا اس اثناء میں میں ان کو مصروف دیکھتا رہا وہ کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے۔ سگریٹ ان کے ہونٹوں میں دبا ہوا سلگ رہا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کی بوشرٹ ان کے سرخ و سفید چہرے اور تندرست بدن پر خوب کھِل رہی تھی۔ اپنی بے حد مصروفیت کے دوران وہ مجھ سے کچھ پوچھ لیتے تھے۔ کہاں سے انٹر کیا ہے، کب کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

کچھ عرصہ بعد تدریس شروع ہوئی۔ بہت سے لوگ باہر سے بھی پڑھانے آئے تھے مگر بقائیؒ صاحب کا اپنا منفرد انداز تھا۔ ان کا شمار ایسے اساتذہ میں نہیں کیا جا سکتا جو بقول کسے طلباء کو مسحور کر دیتے تھے مگر اس کا صاف اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے پڑھانے کے لیے محنت کی ہے۔ تیاری کی ہے اور جو کچھ فرما رہے ہیں وہ ان کے ذہن میں بالکل صاف کوئی ابہام کوئی الجھن نہیں ہے۔ مناسب اشکال بناتے تھے۔ ان کی ڈرائنگ

بہت اچھی نہیں تھی مگر بہت خراب بھی نہیں تھی۔ وہ نہ بہت زور سے بولتے تھے نہ بہت آہستہ۔ مگر بات واضح لہجہ صاف۔ نہ ضرورت سے زیادہ گفتگو کرتے تھے اور نہ ہی ضرورت کے وقت خاموش رہتے تھے۔ یونیورسٹی ان دنوں اردو کالج سے بہت قریب تھی اس لیے اکثر ان کے احباب کالج آجایا کرتے تھے۔ چائے۔ کھانا۔ گپ شپ سب ہی کچھ ہوتا تھا جو بے تکلف دوستوں کی محفل میں ہوتا ہے۔ مگر بقائی صاحب کی ہر ادا میں ایک ٹھہراؤ ہوتا تھا۔ ان کے قہقہے بلند نہیں ہوتے تھے ان کا سارا چہرہ ہنستا تھا اور ان کے خوبصورت چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کئی قہقہوں پر بھاری ہوتی تھی۔ کم و بیش ۲۲ سال کی نیازمندی کے عرصہ میں مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے ان کو کبھی بہت زور سے ہنستا ہوا دیکھا ہو۔ بہت تکلیف دہ اور پریشان کن حالات میں بھی وہ اپنی پریشانی کو چھپا لینے کا فن جانتے تھے۔ انہوں نے اپنے غم کو کبھی غم زمانہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ میانہ روی اور ٹھہراؤ ان کے کردار کا سب سے روشن پہلو تھا۔ اور نہ جانے کیسے انہوں نے تمام عمر اس کو نبھایا۔

میرا امتحان بھی نہیں ہوا تھا کہ خبریں آنے لگیں کہ بقائی صاحب تحقیق کرنے امریکہ جا رہے ہیں۔ پھر ایک دن انہوں نے خود تصدیق کی۔ شعبہ کے طلبا نے ان کے اعزاز میں ایک الوداعی تقریب کا اہتمام کیا۔ بقائی صاحب ہر چند کہ استاد تھے تقریر کرنے سے کتراتے تھے لیکن تقریر تو بہرحال کرنا تھی۔ یہ تقریر ان کے تجربات کا نچوڑ اور ان کے کردار کی غماز تھی۔ انہوں نے کہا۔

"بادِ مخالف کی تندی سے کبھی نہ گھبرانا۔ کتابوں سے رشتہ کبھی نہ توڑنا اور اپنی انفرادیت کو لوگوں کے ہجوم میں گم نہ کر دینا"

ان کے شاگردوں کو آج بھی ان کے یہ الفاظ ازبر ہیں کیونکہ وہ ان کا عملی پیکر تھے۔ لاریب وہ کبھی نہ ڈرے نہ گھبرائے۔ کتابیں ان کے ساتھ رہیں اور واقعی انہوں نے اپنی انفرادیت کو بہرحال، ہر حال میں اس طرح قائم رکھا کہ ان کے مخالفین بھی ان کی شرافت، دیانت اور راست گوئی کو تسلیم کرتے تھے اور ان کے بزرگ بھی ان کو بھائی جان کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میں نے کئی بار پروفیسر قادری مرحوم کو بھی انہیں بھائی جان کہتے سنا تھا۔

پھر ایک عرصے کے بعد سنا کہ بھائی جان ڈاکٹر بقائی ہو گئے ہیں اور جامعہ کراچی تشریف لے آئے ہیں۔ میں اردو کالج میں ہی پڑھانے لگا تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے مجھے نام سے پکارا بلکہ میرے تمام ساتھیوں کے بارے میں فرداً فرداً پوچھتے رہے کہ کہاں ہیں کیا کر رہے ہیں۔ پھر کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب سے نیاز حاصل ہونے لگا۔ وہ بھی اپنے دوستوں سے ملنے کالج آجایا کرتے تھے۔ مجھ سے ہمیشہ اسی شفقت سے پیش آتے جو ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

ایک دن اطلاع ملی کہ ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ سندھ کی جھیلوں پر تحقیق کا کام کروں۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کام

کی تفصیل بتائی کہ کیا کرنا ہے کس طرح کرنا ہے۔ کئی بار ہمارے ساتھ کلر کیے گئے نمونے دیکھتے رہے اور ان نمونوں کو محفوظ کرنے کے طریقے بتاتے تھے۔ مگر ان کی انفرادیت ہر جگہ قائم رہتی تھی۔ اسی تحقیق کے دوران جب میں نے ایک قطعی سائنسی معاملے پر ان سے اختلاف کیا تو انہوں نے گھنٹوں صرف کئے۔ سلائیڈ دیکھے، خود بنائے۔ کتابیں دیکھیں تازہ ترین پرچوں سے استفادہ کیا۔ امریکہ اپنے دوستوں کو خطوط لکھے اور پھر پورے وثوق سے تسلیم کیا اور جو تحقیق کی نئی راہ کھلی اس سلسلے میں ہر ممکن مدد کی۔

انہوں نے ہم پر اعتماد کیا۔ دنوں کیا ہفتوں نہیں پوچھتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وہ ہمارے تجربے خانے میں تشریف لائے اور دیکھا کہ میں اور اطہر کسی کام میں مصروف نہیں ہیں بلکہ کچھ احباب جمع ہیں۔ گپ شپ ہو رہی ہے، چائے پی جا رہی ہے تو بدمزہ ہونے کے بجائے خود بھی اس میں شامل ہو جاتے تھے۔ وہ کہا کرتے کہ تحقیق کرنے والا وقت کا نہیں موڈ کا پابند ہوتا ہے دل چاہے تو ہرگز کوئی کام نہ کریں۔ ہاں جب ان کو معلوم ہوتا کہ گذشتہ رات ہم لوگ گھر نہیں گئے تھے تو ان کے چہرے پر طمانیت کا رنگ صاف دیکھا جا سکتا تھا جب وہ کچھ عرصے کے لیے عراق تشریف لے گئے تو وہاں سے بھی برابر ہدایات بھیجتے رہے، متعلقہ پرچے روانہ کرتے تھے اور کبھی کبھی کام کی رفتار سست ہونے پر برہمی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد جب واپس آئے تو میں نے مقالہ لکھ لیا تھا۔ پہلا مسودہ پیش کیا تو انہوں نے اپنے عظیم ہونے کا بڑا واضح ثبوت دیا

انہوں نے مناسب ترمیم کے بعد مجھ سے کہا۔

"میری انگریزی بہت اچھی نہیں ہے۔ آپ جس کو چاہیں دکھالیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا"

میں نے حیوانیات کے معتبر اساتذہ کو دکھایا اور انہوں نے جو ترامیم کیں ڈاکٹر صاحب نے انکو خندہ پیشانی سے قبول کیا بلکہ تعریف کی۔

حکومتِ پاکستان نے ملک کے شمالی علاقوں کا جائزہ لینے کے لیے سائنس دانوں اور طلباء کی ایک بڑی ٹیم بھیجی اس میں آبی حیوانیات اور پرندوں کا جائزہ لینے والی ٹیم کے سربراہ ڈاکٹر لقانی صاحب تھے اور مجھے ان کی نیابت کا شرف حاصل تھا۔ ہم لوگ کم وبیش ڈیڑھ ماہ ایک ساتھ رہے۔ حضرت عمر فاروق اعظمؓ سے ایک قول منسوب کیا جاتا ہے کہ سفر کے دوران کسی شخص کی خوبیاں اور خامیاں زیادہ اجاگر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس پوری مہم کے دوران ڈاکٹر صاحب کے کردار کے ایسے تابناک پہلو سامنے آئے کہ آنکھیں چکاچوند ہو گئیں منگورہ سے جب ہمارا قافلہ سڑک کے راستے گلگت کے لیے روانہ ہوا تو ڈاکٹر صاحب، میں، وارث صاحب اور پیر دینہ صاحب ایک ہی گاڑی میں تھے اور اس گاڑی میں کچھ دوسرے لوگوں کے علاوہ چپراسی بھی تھے۔ یہ سفر منگورہ سے تقریباً گلگت تک مسلسل جاری رہا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ پہاڑی راستوں پر رات کے وقت اور بغیر کچھ کھائے پئے سفر خطرناک ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جوڑوں کی تکلیف کے پرانے مریض تھے اس لیے ہمیشہ اپنے بیگ میں دوائیں

اور کچھ کھانے کے لیے رکھا کرتے تھے۔ اس سفر میں بھی شدید بھوک میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے بسکٹ بار بار پیش کئے۔ ہم نے اس خیال سے نہ لیے کہ نہ جانے کب ڈاکٹر صاحب کو ان کی ضرورت پڑ جائے جبکہ کراچی سے روانہ ہوتے وقت بھی ان کی طبیعت خراب تھی۔ ہم کوشش کرتے رہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ بسکٹ کھالیں مگر انہوں نے اس وقت تک ایک بسکٹ بھی نہ کھایا جب تک گاڑی میں موجود ہر شخص نے بسکٹ نہ لے لیے۔ ہماری ٹیم خاصی بڑی تھی اس لیے ہمیں ہوٹل کے کمرہ طعام میں ٹھہرایا گیا اور دو یا تین پلنگوں کی پیش کش بھی کی گئی مگر ڈاکٹر صاحب نے قبول نہ کی اور سب کے ساتھ زمین پر ہی بستر لگا دیا۔ اس سفر اور مہم میں بدانتظامی کی کوئی حد نہ تھی۔ بدمزہ تو ڈاکٹر صاحب بھی ہوتے تھے مگر ہم لوگوں پر اس کا اظہار بہت کم ہونے دیتے تھے بلکہ کبھی پرویز صاحب یا میں منتظمین سے لڑ جھگڑ کر آتے تھے تو ہم کو سمجھاتے تھے۔ ان کی مشکلات کا اندازہ کرنے کی تلقین کرتے تھے اور ہنس ہنس کر اپنی چادریں اور تکیہ کھو جانے کا تذکرہ کرتے تھے۔ ہم لوگوں کو تاش کے نئے نئے کھیل سکھاتے اور امریکہ کے قصے سنا کر ہماری دلجوئی کرتے تھے۔

اس مہم میں ایک ہفتہ ایسا بھی گذرا جب کھانے کے لیے سوائے چنے کی دال کے اور کچھ میسر نہ تھا۔ شرافت جیسی بھی پکا دیتے تھے ڈاکٹر صاحب لطیف فقرے کہہ کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کہتے کہ یہ دال کھا کر ہم میں ہارس پاور آ رہی ہے۔ کبھی اس کا نام ہی گھوڑا دال رکھ دیتے۔ شرافت ان کا بہت خیال رکھتے تھے مگر بار ہا ایسا ہوا کہ جب انہوں نے اپنے کپڑے خود دھو لیے یا سگریٹ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کے لہجہ کی نرمی اور مسکرا کر بات کرنے کا انداز بڑا منفرد تھا اور کبھی کبھی لوگ ان کو انکی کمزوری پر محمول کر جاتے تھے مگر سچی بات یہ تھی کہ ناانصافی کسی بھی زیادتی یا کم ظرفی کو وہ کسی طور پر بھی قبول نہ کرتے تھے۔ پنڈی سے گلگت تک کا سفر سخت تکلیف دہ تھا اور اس میں سالار قافلہ کی حماقتوں کا بہت دخل تھا۔ راستے بھر ہم لوگ سخت برہم مگر ڈاکٹر صاحب خاصے خوشگوار موڈ میں رہے مگر گلگت پہنچ کر انہوں نے این۔ ڈی۔ وی۔ پی کے ڈائریکٹر جنرل کو پکڑا اور جب تک سالار قافلہ کے پنڈی واپسی کے احکامات جاری نہیں ہو گئے نہ ڈاکٹر صاحب کمرے میں آئے نہ انہوں نے کپڑے بدلے اور نہ ہی کھانا کھایا۔

بعض اہم معاملات میں انہوں نے زبردست قوت ارادی اور استقامت کا ثبوت دیا اور بہت کوششوں کے باوجود اپنی رائے میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ اس ضمن میں واضح طور پر ان کی شادی کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کیا تھا۔ اس کے تمام کے تمام پہلوؤں پر خوب غور کر لیا تھا اور جب طے کر لیا تو کوئی دلیل کوئی توجیہہ اور کوئی طاقت انہیں ہلا نہ سکی اس استقامت کا اظہار اور بھی کئی مواقع پر ہوا۔

اخراجات کے معاملے میں ڈاکٹر صاحب بہت محتاط تھے۔ میانہ روی ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو تھا

سگریٹ کے شوقین تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کو ولز ہی
پیتے دیکھا۔ نہ کبھی اس سے بہتر نہ کمتر۔ کپڑے اوسط
درجے کے مگر ہمیشہ صاف ستھرے پہنا کرتے تھے۔ گاڑی بھی
ہمیشہ ان کے پاس عمدہ رہی اور اس کو بہت سلیقے
سے استعمال کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ان کو ایک جیپ
بھی مل گئی تھی مگر وہ ہمیشہ پروجیکٹ کے کاموں کے لیے
استعمال کی جاتی تھی۔ ذاتی کام کے لیے ہمیشہ اپنی ہی گاڑی
استعمال کرتے تھے۔

ان کو انگریزی یا اردو ادب سے کوئی خاص لگاؤ
نہیں تھا مگر ہلکا پھلکا ادب پڑھا لیتے تھے۔ میرا
خیال ہے ان کو شعر سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی مگر بد ذوق
نہیں تھے۔ اچھے شعر کی تحسین کرتے تھے۔ انگریزی کے
ہفت روزہ "ٹائمز" سے ان کی دلچسپی آخر وقت تک قائم
رہی۔

امتحانات کے زمانے میں وہ کبھی کبھی سخت دباؤ
کا شکار ہوتے تھے۔ بہت سے لوگ امتحانی مراکز اور
ممتحنوں کی فہرست میں تبدیلیوں کی کوشش کرتے تھے۔
ڈاکٹر صاحب اس ضمن میں پوری دیانت داری برتتے تھے
کوئی غلطی ہو جاتی تو اس کا ازالہ فوراً کر دیتے تھے مگر کسی
کے دباؤ میں آکر کوئی تبدیلی نہیں کرتے تھے۔ نامناسب
مطالبہ پر احتجاج بھی اس قدر نرمی اور شائستگی سے کرتے
تھے کہ لوگوں کو اپنے لہجے پر شرم آنے لگتی تھی۔ اگر کوئی
ہٹ دھرمی سے اڑ جائے تو وہ بھی ڈٹ جاتے تھے۔ اور محض
کسی کے عہدے یا شخصیت سے کبھی ان کو مرعوب ہوتے
ہوئے نہیں دیکھا نہ ان کا لہجہ افراد کو دیکھ کر بدلتا تھا
حکومت کے افسران ہوں چاہے شعبے کے دیگر اساتذہ
طلبا ہوں یا چپراسی وہ ہمیشہ ایک ہی مہذب اور شائستہ
لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب برج کے بڑے شوقین تھے۔ وہ
بہت نامور کھلاڑی بھی تھے۔ اچھے اچھے کھلاڑی ان کی
مہارت کے معترف تھے۔ گلگت میں تین اناڑیوں یعنی
میں، پرویز صاحب اور وارث صاحب کے ساتھ کھیلا
کرتے تھے اور ہماری حماقتوں سے خوب لطف لیتے تھے
جن دنوں اتوار کی چھٹی ہوتی تھی ان دنوں سنیچر کی شام
اور جب جمعہ کی چھٹی ہونے لگی تو جمعرات کی شام برج
کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ ہر ایک کی خواہش ہوتی تھی کہ
ڈاکٹر صاحب کے ساتھ برج کھیلا جائے مگر ان کا ایک
مخصوص حلقہ تھا اور وہ اسی میں کھیلنا پسند کرتے تھے
مگر کبھی کبھی نئے لوگوں کو بھی نبھا لیتے تھے۔

اردو کالج سے ان کی وابستگی ہمیشہ قائم رہی۔ جو
کچھ ممکن ہوا کرتے رہے اور وہاں کے افراد سے ان کا
تعلق خاطر ہمیشہ قائم رہا۔ یونیورسٹی میں اردو کالج کے
طلباء کے نمبر خراب آتے یا گریڈ کمتر آتا تو ان کو تکلیف
ہوتی۔ وہ اردو ذریعۂ تعلیم کے ہمیشہ پرجوش حامی رہے
اور اس ضمن میں جو کچھ ہو سکا عملی طور پر کرتے رہے۔ وہ
برسوں اصطلاحات کی اس کمیٹی کے رکن رہے جو حیاتیات
کی اصطلاحات وضع کرتی تھی۔ جب "فوایکٹ" کا ترجمہ ہو
رہا تھا تو انہوں نے بھی ایک باب کا رواں اور سلیس ترجمہ
کیا تھا جو اس کتاب میں شامل ہے۔ جب پروفیسر قادری
مرحوم نے ان سے مرکزی اردو بورڈ لاہور کے لیے "سلیکٹ ریٹ"

ایک کتاب تالیف کرنے کو کہا تو انہوں نے نہ صرف فوراً قبول کرلیا بلکہ اس پر خاصا کام بھی کیا۔ بعد میں نہ جانے کیا ہوا کہ وہ مسل انکی زندگی میں ہی ایسی گم ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب خود میں اور پرویز صاحب مل کر بھی اس کو تلاش نہ کرسکے۔

جب وہ امریکہ سے لوٹے تو پروفیسر قادری مرحوم نے انکی دلچسپی کے پیش نظر "آبی ماحولیات" ان کے سپرد کی جو بعد میں حیاتیات کی تخصیص کی شکل اختیار کرگئی اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب شعبۂ حیوانیات میں طلبا کی سب سے زیادہ تعداد اسی شاخ میں ہوتی تھی اور وہ کبھی بداخلاقی برت کر قریبی دوستوں سے معذرت کرکے اور لڑکیوں کو کلاس آنے جانے کی صعوبتوں سے خوفزدہ کرکے تعداد کم کرتے تھے۔ پھر آبی کا لفظ انہوں نے ہٹا دیا۔ اور ماحولیات میں انہوں نے خود کو مرتکز کردیا تھا جنگلی حیوانات اور پرندوں پر تو وہ آخر وقت تک کام کرتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ پشاور میں سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان کی سالانہ کانفرنس ہو رہی تھی جس میں ڈاکٹر صاحب نے ان حیوانات کے بارے میں ایک عام فہم تقریر کی جو ناپید ہو رہے ہیں۔ اس تقریر میں اس قدر دلچسپی لی گئی کہ بیٹھنے کی جگہ تو درکنار کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ تھی۔ آفتاب حسن صاحب جو سوسائٹی کے معتمد تھے بمشکل ہال میں داخل ہوئے اور میں داخل نہ ہوسکا۔

ڈاکٹر صاحب جذباتی آدمی نہیں تھے انہیں واضح طور پر اس کا اندازہ تھا کہ کون ان کا بہی خواہ ہے اور کون نہیں ہے۔ موخرالذکر لوگوں سے کوئی تکلیف پہنچتی ہو تو ہنس ہنس کر اس کا تذکرہ کرتے تھے اور مناسب سدباب بھی۔ لیکن جب اول الذکر قسم کے افراد سے کوئی ٹھیس لگتی تو بمشکل برداشت کرتے تھے۔ چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا اضطراب کا اظہار اس طرح ہوتا تھا کہ سگریٹ جلدی جلدی پینے لگتے تھے۔ اور معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ میرے ساتھی اطہر خاں کے بارے میں جب ان کو معلوم ہوا کہ فوج میں ان کا انتخاب ہوگیا ہے اور وہ عنقریب جانے والے ہیں تو وہ کسی قدر بدمزہ ہوئے مگر اطہر خاں کی وضاحت کے بعد بالکل مطمئن ہوگئے اور آخر وقت تک اطہر خاں سے ان کے تعلقات قریبی رہے۔ اسی طرح اطہر صاحب کا ابتدائی تحقیقی کام ایک اور صاحب کے سپرد کردیا گیا تھا اور جب یہ کام آگے نہ بڑھا تو برہم ہوئے تھے اور دو تین بار کہنے کے بعد جب ان کو یہ اندازہ ہوگیا کہ ان صاحب کو اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو خاموش ہوگئے اور پھر کبھی اس طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا

اپنے شاگردوں کی کامیابی پر مسرور ہوتے تھے کسی کا پرچہ چھپ جاتا تو بہت خوش ہوتے اور سب کو دکھاتے تھے۔ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو بار بار اس طرف توجہ دلاتے تھے کہ یہاں پرچوں کی تعداد بہت اہم ہے اس لیے کام بھی کرو اور اس کو چھپانے کا اہتمام بھی کرو۔ ضروری مواد فراہم کرتے تھے۔ خود صحیح کرتے اشکال کے بارے میں اپنی رائے دیتے تھے اور یہ بھی طے کرتے تھے کہ کہاں بھیجنا چاہیے۔ ان کے قریب کے لوگوں کا تو ان پر انحصار اس حد تک تھا

گیا تھا کہ جب تک وہ نہ دیکھ لیں کوئی تحریر کسی کو بھیجنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، خود اعتمادی نہ آتی تھی
سوچ رہا ہوں وہ لوگ اب کیا کرتے ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے کسی کام میں جلد بازی نہ ہوتی تھی۔ وہ ہر کام سکون و اطمینان سے کرتے تھے مگر نہ جانے دنیا سے جانے میں انہوں نے اپنے کردار کے سب سے اہم پہلو کو اس بیدردی سے نظر انداز کیوں کر دیا۔ انکی ذات سب کے لیے باعثِ رحمت تھی اور باعثِ زحمت کسی کے لیے نہ تھی۔ آخری وقت میں بھی انہوں نے نہ کسی کو تیمارداری کی زحمت دی اور نہ عیادت کی۔

میں سوچتا ہوں کہ ابھی تو انہوں نے اپنے سفر کا آغاز ہی کیا تھا۔ ابھی تو لوگ ان کے مقام سے آشنا بھی نہ ہوئے تھے۔ ابھی تو ان کے سبق کی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ انہوں نے اپنا دامن سمیٹ لیا۔

نہ لوگ جو دیوانہ ادب وفا تھے
اس دور میں تو انکی کیا بات کرے ہے

بقیہ صفحہ نمبر ۴۹۴

ے ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اور دیگر اساتذہ کرام سے تقلید کی توقع یہ کہتے ہوئے کرتی ہے کہ

ے اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
اک تم جمے ہوئے ہو جمادات کی طرح
اک وہ کہ جیسے تیر کمان سے نکل گیا

طالبعلموں کی سرگرمیاں

ایم۔ایس سی ریاضی کے پہلے گروپ کے کامیاب طلباء نے اپنے معزز اساتذہ کرام کی اعزاز میں ایک الوداعی تقریب کا اہتمام کیا جس میں پروفیسر ناظم حسین زیدی بحیثیت مہمانِ خصوصی شریک ہوئے ان کے علاوہ کالج کے پرنسپل پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن، صدر شعبۂ ریاضی جامعہ کراچی ڈاکٹر انصار الدین سید، صدر شعبۂ ریاضی کالج ھذا پروفیسر رشید خان لودھی، لیاقت علی تیمی کے علاوہ دیگر اساتذہ کرام نے طلباء سے خطاب کیا اس تقریب میں طلباء کی رہنمائی لیاقت علی تیمی نے کی۔ یاد رہے کہ ایم۔ایس سی کا یہ پہلا گروپ ہے جسے اردو زبان میں تعلیم دی گئی۔



ایم۔ایس سی ریاضی" کے پہلے گروپ کی الوداعی تقریب میں پرنسپل کالج و دیگر اساتذہ خطاب کر رہے ہیں



ایم-ایس سی "ریاضی" کا پہلا گروپ اپنے پرنسپل اور دیگر اساتذہ کرام کے ہمراہ



سید ھاشم رضا یومِ حسین کے جلسے سے خطاب فرما رہے ہیں۔



جناب حسین امام صاحب
یوم حسین کے جلسے کی
صدارت فرما رہے ہیں



۷۷ - ۱۹۷۸ء فاطمہ ثریا بجیا محترمہ عشرت انصاری اور دیگر خواتین ہفتہ طلبا میں

۴۷- ۱۹۷۳ء کی انجمن اتحاد طلبہ









۱۹۷۵-۱۹۷۴ کی انجمن اتحاد طلبہ

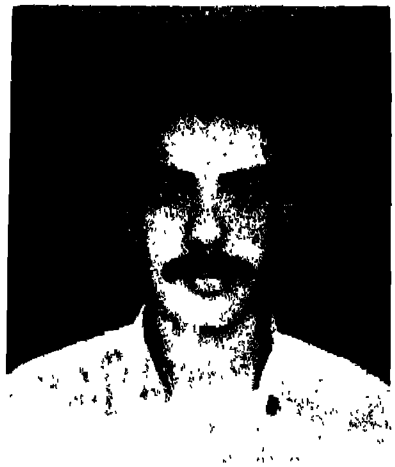


محمد ظہیر خان

ریڈیائی پروگرام کینسر کے شرکاء



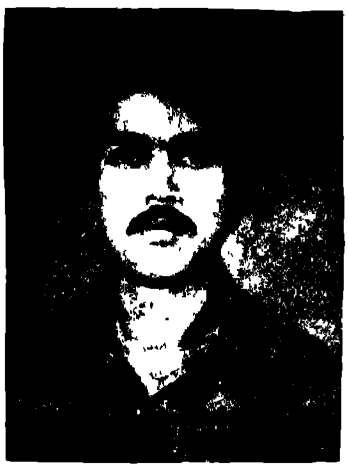
محمد محسن صدیقی



رزاق اجمل کالج کے طالبعلم جنہوں نے کاغذ کی
لوگدی سے قائدِ اعظم کی تصویر بنائی



عرفان شاہ



محمد آصف

ٹیلی وژن کے پروگرام "نیلام گھر" کے اوّل انعام یافتگان



کالج کے ہونہار طالبعلم
اور نامور مصور جنگ
فاروق کی کی تصاویر
قابل اشاعت
ہیں



سید محمود رضوی
معتمد جمخانہ

جمخانہ
سالانہ رپورٹ
برائے ۷۹-۱۹۷۸ء

عزیز طلباء و طالبات سا تھیو!

میں نے اس کالج میں ۷۸-۱۹۷۷ء میں قدم رکھا ابتدا میں کرکٹ ٹیم کا ممبر منتخب ہوا۔ اور لگا تار تین سال تک منتخب ہونے کے بعد ۱۹۷۸ء میں تمام کپتانوں کی متفقہ رائے سے معتمد جمخانہ مقرر ہوا۔ اور اس طرح ایک بڑی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر ڈال دی گئی۔ جس کو نبھانے کی مقدور بھر کوشش کی۔

طبعیات کے مددگار پروفیسر ادریس احمد ہاشمی صاحب نگران امور کھیل کے فرائض گزشتہ دو سال سے انجام دے رہے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی سے میں اس قابل ہوا کہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکوں۔ ہمارے پاس کھیل کا میدان تو موجود ہے۔ لیکن اندرون خانہ کھیلوں کے لئے جمنازیم کی ضرورت ہے۔ جس میں طلبہ و طالبات درونِ خانہ کھیلوں کے لئے مشق کر سکیں۔ ہمارے پرنسپل صاحب اور نگراں کوشاں ہیں کہ طلبہ و طالبات کے لئے کھیل کود کی تمام تر سہولتیں بہم پہنچا سکیں۔

کرکٹ

:۔ اس سال کرکٹ کے ٹرائلز مکمل ہونے کے بعد بورڈ اور ڈگری کی ٹیموں کے ناموں کا اعلان کیا گیا افتخار کو بورڈ اور سید علی حسن رضوی کو ڈگری کا کپتان مقرر کیا گیا۔ بورڈ کی ٹیم سے ہمیں بہت امیدیں وابستہ تھیں لیکن ہماری ٹیم کوارٹر فائنل تک ہی پہنچ سکی۔

ڈگری کی ٹیم نے بھی بہت محنت و مشق کی۔ لیکن اس کے مثبت نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ اور کوارٹر فائنل میں ایس ایم کالج سے پندرہ رنز سے ہار گئی۔ دوستانہ میچوں میں ڈگری کی ٹیم نے ۹ میں سے ۷ میچ جیتے اور دو ہارے ان میچوں میں رؤف، علی حسن، طاہر، سلیم الدین اور وسیم علوی نے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔ صفدر شیرازی نے کراچی کالج آف ٹیکنالوجی کے خلاف ۸۵ رنز ناٹ آؤٹ بنائے۔ بورڈ کی طرف سے دوستانہ میچوں میں عارفین اختر، اکبر جمیل، افتخار، محمود عالم اور غلام ابراہیم نے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اکبر جمیل نے کراچی بورڈ کی ٹیم میں کالج کی نمائندگی بھی کی۔



ادریس احمد ہاشمی نگران جیمخانہ



اراکینِ جیمخانہ

ہاکی :۔ ہاکی ہمارا قومی کھیل ہے۔ اس وجہ سے یہ کھیل ہمارے ملک میں بہت مقبول ہے۔ اور لڑکے اس کھیل میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ اس وجہ سے طلباء نے ہاکی کے ٹرائلز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور لگاتار تین مرتبہ ٹرائلز کے بعد ہم بورڈ اور ڈگری کی ٹیم بنانے میں کامیاب ہوئے۔

اس سال ارشد صدیق کو ڈگری کا اور عبدالرزاق کو بورڈ کا کپتان مقرر کیا گیا۔ بورڈ کی ٹیم سیمی فائنل میں نیشنل کالج سے ایک گول سے ہار گئی۔ اس نے پورے ٹورنامنٹ میں عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔ ڈگری ہاکی ٹیم سیمی فائنل میں اردو آرٹس کالج سے ہار گئی۔ جب کہ دوستانہ میچوں میں عمدہ کھیل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۱۱ میں سے ۹ میچ جیتے اور دو ہارے ڈگری کی طرف سے محمد ناصر، ارشد صدیق، آفتاب احمد، احمد مصطفیٰ، بشارت اللہ جنید، شاہد جعفری نے اور بورڈ کی طرف سے حسن ناصر، ظفر، رزاق اور پرویز عالم نے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔ ڈگری کے آفتاب احمد نے کراچی یونیورسٹی اور پاکستان یونیورسٹیز میں نمائندگی کی۔ اور بورڈ کے پرویز عالم بھی کراچی کی جونیئر کی ٹیم میں شامل کیا گیا۔ ڈگری کے کپتان ارشد صدیق مسلم کمرشل بینک کی ٹیم کے لئے منتخب ہوئے۔

فٹ بال :۔ فٹ بال کی ٹیم کے لئے امیدوار کھلاڑیوں کے کھیل کا جائزہ لینے کے بعد بورڈ اور ڈگری کی ٹیموں کا اعلان کر دیا گیا۔ شکیل احمد کو بورڈ کا اور سید محمد ناصر کو ڈگری کا کپتان مقرر کیا گیا۔ اس ٹیم کی کامیابی کا سبب کھلاڑیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور جناب اسماعیل آدم صاحب کی محنت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ جن کی نگرانی میں ٹیم نے پے در پے کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن بدقسمتی سے انٹر کالجیٹ کے مقابلے میں کراچی یونیورسٹی کی ٹیم سے ایک گول سے ہار گئی۔ دوستانہ میچوں میں ناصر، آغا، اور شریف نے ڈگری اور سہیل یاسین، شکیل، شوکت اور ایس ایم رحیم اللہ نے بورڈ کی طرف سے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔

بیڈمنٹن :۔ بیڈمنٹن کے لئے ابتدائی مقابلے نیشنل کوچنگ سینٹر میں منعقد کئے گئے طلباء کی بڑی تعداد نے اس میں شرکت کی۔ ٹیم کا کپتان سال دوئم کے عارفین اختر کو مقرر کیا گیا۔ ہماری ٹیم کوارٹر فائنل میں ایس ایم کالج سے ہار گئی۔ دوستانہ میچوں میں عارفین، عمر، جاوید اور جمیل نے عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔

ہماری اور نگران امور کھیل ادریس ہاشمی صاحب کی یہ کوشش رہی ہے کہ طالبات بھی کھیلوں میں حصہ لیں۔ لیکن ہم اپنی ان کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔

سالانہ کھیلوں کے مقابلے :۔ تمام ٹورنامنٹ مکمل ہونے کے بعد یونین کے اشتراک سے سالانہ کھیلوں کا اہتمام کیا گیا جس کا افتتاح نگران امور کھیل جناب ادریس احمد ہاشمی صاحب نے کیا۔ جس میں طلباء و طالبات کے علاوہ اساتذہ کی بھی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس کے لئے سب سے پہلے ایک انتظامی کمیٹی کا اعلان کیا


محمد افتخار شبیر، کپتان کرکٹ (ڈگری)


امتیاز علی، کپتان فٹبال (ڈگری)


انصار علی خان، کپتان جوڈو و کراٹے (ڈگری)


جاوید احمد صدیقی، کپتان بیڈمنٹن (ڈگری)

کیا گیا جو مندرجہ ذیل طلباء پر مشتمل تھی۔

(۱) اسرار الدین علوی منتظم اعلیٰ سالانہ کھیل (۲) محمد ناصر نائب منتظم اعلیٰ سالانہ کھیل

(۳) رؤف احمد نائب منتظم اعلیٰ سالانہ کھیل

انتظامی کمیٹی کے ممبران مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) علی حسن رضوی (سال چہارم) (۲) صفدر شیرازی (سال چہارم)

(۳) خلیل نیازی (۴) وسیم علوی سال سوئم (۵) سلیم الدین (سال سوئم)

(۶) محمد بابر (سال سوئم) (۷) ایس ایم رحیم اللہ (سال دوئم)

اس کے لئے سب سے پہلے نیشنل کوچنگ سینٹر کے ایتھلیٹک کوچ سے رابطہ قائم کیا گیا۔ جنہوں نے اپنے ماہرین اور انتظامی کمیٹی کی مدد سے کالج کے میدان میں TRACK بنوایا۔ تاکہ مقابلے منعقد ہو سکیں۔

پہلے روز ابتدائی مقابلے اور دوسرے دن فائنل مقابلے منعقد ہوئے۔ محمد شاہین سال سوئم کو اس سال کا بہترین کھلاڑی قرار دیا گیا۔ سب سے آخر میں اساتذہ کرام کی، دو سو میٹر کی ریس ہوئی۔ جو سب سے دلچسپ تھی۔ اس طرح سالانہ کھیلوں کے مقابلے اختتام پذیر ہوئے۔ اور صدر انجمن اتحاد طلبہ طالب مہدی نے کھیلوں کے باضابطہ اختتام کا اعلان کیا۔ تمام جیتنے والے کھلاڑیوں کو سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں انعامات تقسیم کئے گئے۔

رپورٹ کے آخر میں پرنسپل صاحب اور امور نگراں جیم خانہ کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے ہر ہر قدم پر ان کے تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور انہوں نے بھی نہایت خلوص و مہربانی کے ساتھ مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میں زندگی بھر ان کے خلوص، مہربانی کو فراموش نہ کر سکوں گا۔



ابصار علی خان گرینڈ ماسٹر اشرف طائی کے ہمراہ بلیک بیلٹ ملنے کے موقع پر

اس سال ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۰ء کرکٹ، ہاکی، فٹبال، ٹیبل ٹینس و بیڈمنٹن کے نگراں بالترتیب جناب امین فاروقی صاحب شعبۂ اردو، جناب اصغر علی شعبۂ کیمیا جناب اسماعیل آدم شعبۂ سندھی اور جناب وقارالحق صاحب شعبہ نباتیات کو مقرر کیا گیا۔

اس وقت ہمارا کالج کراچی کے چند بڑے کالجوں میں سے ایک ہے۔ بیرونی کھیلوں کے لئے تو اللہ کے فضل و کرم سے ہمارے پاس ایک بڑا میدان موجود ہے۔ مگر ٹیبل ٹینس، ٹینس اور دیگر چھوٹے کھیلوں کے لئے جمنازیم کی ضرورت ہے جس کیلئے ہمارے پرنسپل صاحب کوشاں ہیں۔ انشاءاللہ جلد ہی جمنازیم بھی بنالیا جائیگا مختلف کھیلوں کی کارکردگی درج ذیل ہے۔

۱۹۷۹ء ۱۹۷۸ء میں کرکٹ کے ٹرائیلز ہونے کے بعد بورڈ اور ڈگری کی ٹیموں کا اعلان کیا گیا سید محمود عالم رضوی کو بورڈ کا کپتان مقرر کیا۔ ڈگری کے ٹورنامنٹ یونیورسٹی نے ملتوی کر دیئے جس کی وجہ سے ٹیم نہ بن سکی۔ بورڈ کی ٹیم سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ ہماری ٹیم میں چند بہت اچھے کھلاڑی تھے لیکن سائنس کالج کے طالب علم ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ وقت نہیں دے سکتے پھر بھی کوارٹر فائنل میں انہوں نے ڈی جے سائنس کالج کو شکست دی اور سیمی فائنل تک پہنچ گئے۔

اس سال ہم نے ۶ میچ کھیلے جن میں اللہ کے فضل وکرم سے تمام جیت لئے۔ بولنگ میں سرفہرست بائیں ہاتھ سے گیند کرنے والے اکبر جمیل رہے۔ انہوں نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ مجموعی طور پر ۳۶ وکٹیں لیں جو کہ صرف چھ میچوں میں بورڈ کی ٹیم کا ریکارڈ ہے۔ بیٹنگ میں سرفہرست محمود رضوی رہے انہوں نے ایک مرتبہ سو رنز اور ۳ مرتبہ ۵۰ سے زائد اسکور کئے اس کے علاوہ اسماعیل بیگ، محمد علی، خورشید، ناصر اور کامران نے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔ ۱۹۷۹ء میں ندیم بلقی کو کپتان مقرر کیا گیا۔ ٹیم نے دس میچ کھیلے جن میں سے ۹ میں کامیابی حاصل کیں اور واحد میچ نیشنل کالج سے ہار گئے۔ اس سال محمد ناصر، حیدر، وسیم رضا، رضا محمد



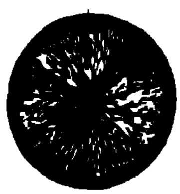
بورڈ کرکٹ ٹیم نگراں عمیر خان کے ہمراہ



غوث محمد خان "کپتان کرکٹ" (بورڈ)



سیّد محمد علی "بیڈمنٹن"





غضنفر قریشی "کپتان ہاکی" بورڈ



[illegible] کپتان بیڈمنٹن" بورڈ

اور ندیم کرمانی نے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔

۱۹۸۰ء میں غلام غوث کو بورڈ کا کپتان مقرر کیا گیا۔ انٹر کالجیٹ میں وہ اپنے پچھلے معیار کو بھی برقرار نہ رکھ سکے ہماری کرکٹ ٹیم وہ کھیل نہ دکھا سکی جس کی ہمیں توقع تھی۔ بہرحال ہماری ٹیم نے پانچ میچ کھیلے جن میں سے ایک میچ کے سوائے باقی جیت لئے۔ کچھ لڑکے نمایاں رہے۔ جن میں سے امیر عالم اچھے آل راؤنڈر ہیں جنھوں نے انٹر کالجیٹ میں خوبصورت کھیل کا مظاہرہ کیا۔

۱۹۷۸ء میں بورڈ کا کپتان محمد طاہر وفاقانی کو بنایا گیا۔ اس سال ہماری ٹیم کوارٹر فائنل میں پہنچ گئی تھی جس میں ہم نیشنل کالج سے پینلٹی اسٹروک کی بنیاد پر ہار گئے۔ پی، ای، سی، ایچ، ایس فاؤنڈیشن کالج سے ہم جیت گئے تھے جس میں طاہر نے دونوں گول اسکور کئے۔ دوسرے کھلاڑیوں میں بھٹی، اسلم، عباس اور اختر علی نمایاں رہے۔

۱۹۷۹ء میں بورڈ کا کپتان بھٹی کو منتخب کیا گیا لیکن حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے پہلے راؤنڈ میں ہار گئے۔ دوسرے کھلاڑیوں میں اسلم عباس اور ساجد علی نمایاں رہے۔

۱۹۸۰ء یعنی امسال ساجد علی کو کپتان مقرر کیا گیا تمام دوستانہ میچز جیت لئے مگر راؤنڈ کے میچ میں پینلٹی اسٹروک کی بنیاد پر ہار گئے

فٹبال: ۱۹۷۸ء میں بورڈ کا کپتان رؤف کو بنا دیا گیا۔ ہم نے دو راؤنڈ کھیلے لیکن تیسرے میں اردو کالج سے ہار گئے۔ لیاقت کالج کے خلاف رؤف اور سہیل کا کھیل نمایاں رہا۔ جبکہ سراج الدولہ کے خلاف امتیاز نے شاندار ہیٹ ٹرک کی۔

۱۹۷۹ء میں امتیاز کو کپتان مقرر کیا گیا اور عائشہ باوانی سے پہلا میچ جیتا۔ دوسرا میچ آدمجی کالج سے جیتا جبکہ تیسرے میچ میں جامعہ ملیہ کالج سے ہار گئے اس سال رئیس، شفیق۔ اور امتیاز کا کھیل نمایاں رہا۔

۱۹۸۰ء میں شفیق کو کپتان نامزد کیا گیا۔ پہلا میچ عائشہ باوانی سے کھیلا جو دو گول سے جیت لیا۔ پہلا گول اشرف اور دوسرا اکرم نے کیا۔ دوسرا میچ جامعہ ملیہ کالج سے جیتا جس میں رئیس اور شفیق نے گول کئے۔ سیمی فائنل میں ہم چند ناگزیر وجوہات کی وجہ سے نہ کھیل سکے۔

بیڈمنٹن: بیڈمنٹن ہمارے کالج کے طالب علموں میں زیادہ مقبول نہیں ہے۔ پھر بھی اس کھیل میں ہمارے طالب علموں نے بڑے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا ۱۹۷۸ء تا ۱۹۷۹ء میں انٹر کالجیٹ میں ٹیم سیمی فائنل میں پہنچ گئی تھی۔ ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۰ء ہماری ٹیم نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا لیکن بدقسمتی سے گورنمنٹ کالج ناظم آباد سے ہار گئے۔ البتہ اس ٹورنامنٹ کے دوران جاوید احمد صدیقی بحیثیت کھلاڑی ابھر کر سامنے آئے جنھوں نے اپنے خوبصورت کھیل اور بروقت حملوں کی مدد سے کراچی یونیورسٹی کے سلیکٹر صاحبان کو بے انتہا متاثر کیا اور ۵۲ انٹر یونیورسٹی کے لئے چن لئے گئے۔ انہوں نے بہاولپور میں کراچی یونیورسٹی کی نمائندگی کی۔ بعد ازاں یہ کھلاڑی

سندھ کی ٹیم کے لئے چن لیا گیا اور اس نے سندھ کے لئے بھی اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ کالج نے ان کے اچھے کھیل کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی اور انہیں کالج کی ٹیم کا کپتان بھی بنا دیا۔

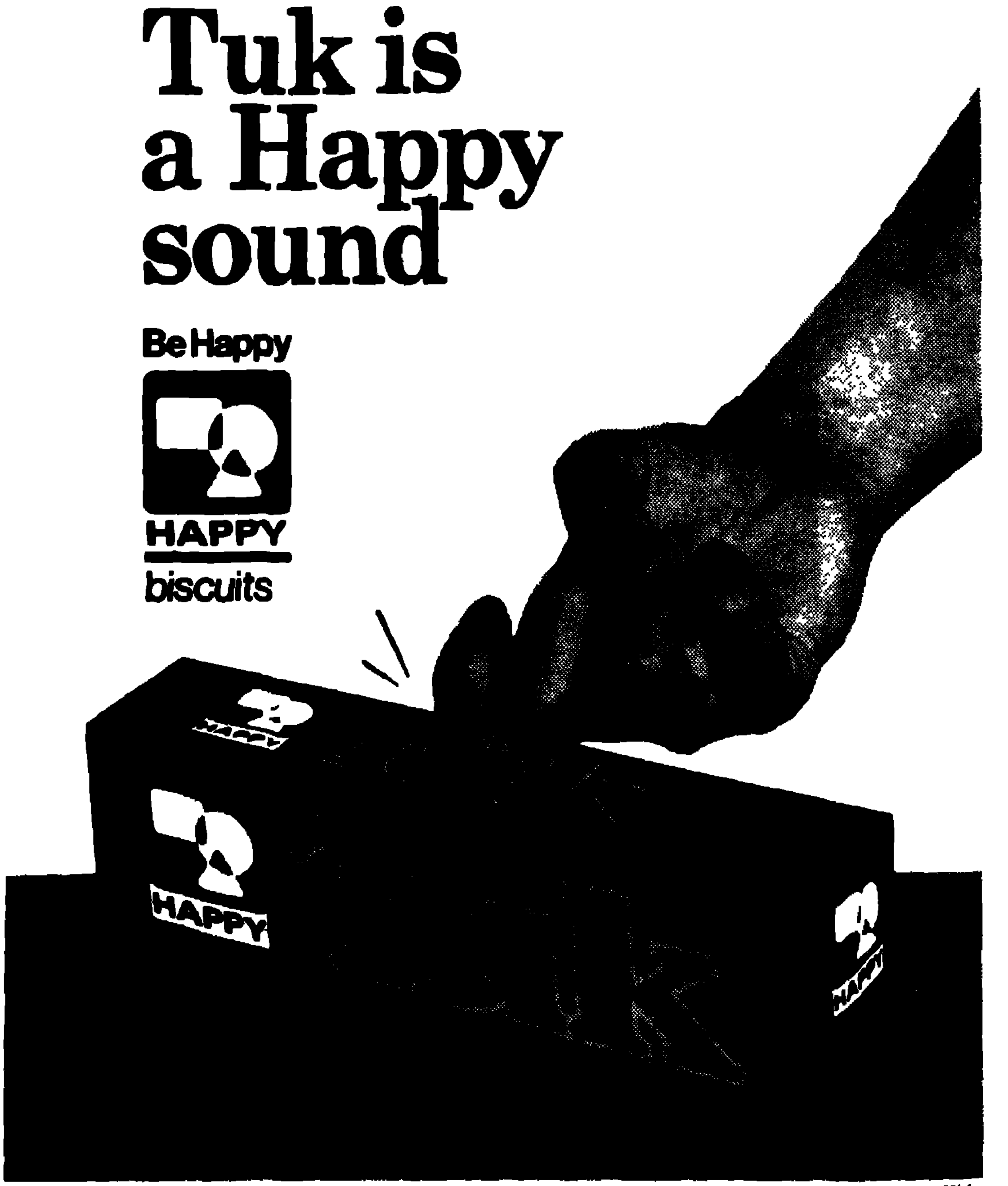
امسال ہمارے کالج میں جوڈو کراٹے کی ٹیم بھی بنائی گئی۔ اس کے روحِ رواں سید ایصار حسین سالِ سوئم کے طالب علم ہیں جو جوڈو کراٹے کے بہترین کھلاڑی ہیں کل پاکستان بنیاد پر پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے ۷۳ سے جوڈو کراٹے کا آغاز کیا۔ اپنی چابکدستی، ہوشیاری اور بروقت فائدہ اٹھانے کی بے پناہ صلاحیت کی وجہ سے بتدریج ترقی کرتے ہوئے اور ۱۹۸۰ء میں ہندوستان میں ہونے والے بین الاقوامی مقابلوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ ۱۹۸۱ء میں کالج کی طرف سے جامعہ کراچی کی ٹیم میں منتخب ہوئے اور سندھ کی تمام جامعات کے درمیان ہونے والے مقابلوں میں حصّہ لیا۔ یہ مقابلے جامعہ این ای ڈی میں منعقد ہوئے جہاں انہوں نے جوڈو میں اوّل رہ کر سب کو شکست دی۔ اسی طرح سے کراٹے میں "ٹیم کاتا" میں دوسرے نمبر میں کامیابی حاصل کی۔ محمد اشرف طائی جو ہمارے ملک کے جوڈو کراٹے کے صفِ اوّل کے ماہر اور استاد ہیں اور بے شمار بین الاقوامی مقابلوں میں شرکت کر چکے ہیں انہوں نے اپنے سینٹر میں اس نوجوان کا ٹیسٹ لیا اور انہیں بلیک بلیٹ کا مستحق قرار دیا۔ جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ ہمارے کالج کے لئے بھی ایک اعزاز ہے۔

مجموعی طور پر کالج جیم خانہ کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارا کالج کھیل کی دنیا میں بتدریج اپنا مقام بنا رہا ہے۔ ہمارے ساتھ چند مسائل ہیں۔ ان کے حل ہونے کے بعد یقیناً ہم قومی سطح پر اپنے فرائض پوری تندہی سے انجام دیں گے۔

انشا اللہ۔



کالج ھاکی ٹیم میدان میں


Tuk is
a Happy
sound
Be Happy
HAPPY
biscuits
HAPPY
HAPPY
HAPPY

MNJ

سائنٹفک سوسائٹی سوسائٹی

کی

بیسویں قومی سالانہ کانفرنس



خطبہ استقبالیہ



محمد اکرام الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عالی جناب مہمان معظم ، محترم صدر سائینٹفک سوسائٹی ، معزز مندوبین اور مہمانانِ گرامی قدر !

میرے لئے یہ امر باعثِ صد افتخار و شادمانی ہے کہ آج حدودِ اردو سائنس کالج میں ممتاز و مایہ ناز سائنسدان و ماہرینِ علم و فن ، مختلف جامعات کے وائس چانسلر صاحبان ، اعلیٰ حکام اور شہر کے اہلِ دانش مجتمع ہیں میں سائینٹفک سوسائٹی پاکستان اور اردو سائنس کالج کی جانب سے اپنے محترم مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہوں ۔ اس سے پیشتر قومی سائنس کانفرنسوں کے انعقاد کے لئے ایسی یکتائے روزگار شخصیتوں کی میزبانی کا جو شرف ملک کی جامعات کو حاصل ہوا کرتا تھا وہ اس سال اسی قومی ادارے کو حاصل ہوا ہے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ حضرات کی میزبانی کا فریضہ خوش اسلوبی کے ساتھ جامعات انجام دیتی رہی ہیں ۔ لیکن اپنے محدود وسائل کے باوجود ہم اور ہمارے رفقائے کار اپنے معزز مہمانوں کی پذیرائی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے ۔ ہم نے بیسویں قومی سائنس کانفرنس کے انعقاد کی پیش کش اپنی تنگ دامانی کے باوجود اللہ ربّ العزت کے بھروسہ اور اپنے رفقائے کار کے عزم و استقلال کے پیشِ نظر قبول کی ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو سائنس کالج اور سائینٹفک سوسائٹی دونوں کے مقاصد یکساں ہیں ۔ اردو سائنس کالج ملک میں قومی زبان اردو کے ذریعہ تعلیم و تدریس کی تحریک کی علم بردار ہے اور سائینٹفک سوسائٹی بھی قومی زبان کے ذریعے سائنسی علوم کی تفہیم کی داعی ہے ۔ ہمارے کالج میں بھی ایم ایس سی تک کی تعلیم قومی زبان اردو میں دی جاتی ہے اور سائینٹفک سوسائٹی کی کانفرنسوں اور علمی مجالس کی تمام کارروائیاں اردو میں انجام دی جاتی ہیں ۔ علاوہ ازیں ابتدا سے ہم دونوں قدم بہ قدم ایک دوسرے کے ساتھ ہر مشترک کام میں

تعاون کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں ۔ ہمارے اساتذہ سائینٹفک سوسائٹی کے رسالوں کی ادارت واشاعت اور سوسائٹی کے امور انتظامی کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروفِ کار رہتے ہیں اور سائینٹفک سوسائٹی کے عہدیداران ہمارے یہاں کے انتظامی اور تدریسی امور میں فیاضانہ طور پر شریکِ کار رہتے ہیں ۔ اس طرح یہ دونوں ادارے برسہا برس سے ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اردو سائنس کالج کے اساتذہ کا یہ عہد ہے کہ وہ سائینٹفک سوسائٹی کی ترویج و ترقی میں پیش پیش رہیں گے ۔ بیسویں قومی سائنس کانفرنس کے اس موقع پر میں سب سے پہلے سائینٹفک سوسائٹی کے تاریخی پس منظر اور اس کے بعد پاکستان میں اردو سائنس کالج کے قیام کے متعلق عرض کرنا چاہوں گا ۔

مہمانانِ مکرم !

برصغیر پاک و ہند مسلمانوں کے علم و حکمت اور تہذیب و ثقافت کا وہ عظیم گہوارہ رہا ہے کہ جس کے نقوش آج بھی پاک و ہند کی تاریخ میں نمایاں ہیں ۔ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب ، مغلوں سے انگریزوں کے عہد تک اگر وسعتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو کوئی علاقہ اور کوئی دور ایسا نظر نہیں آئے گا جہاں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے نقش ثبت نہ ہوں ۔ دور جانے کی بات نہیں انیسویں صدی کو سامنے رکھیں تو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے نقش پورے برصغیر میں واضح نظر آئیں گے ۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے بعد سر سید احمد خان کا نام تاریخ کے اوراق پر بحرفِ جلی نظر آتا ہے اور یہی وہ مقدس و محترم ہستیاں ہیں جنہوں نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی نگہبانی کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ خوابیدہ مسلم قوم کی بیداری کے لئے اپنی عمریں نثار کر دیں ۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کی زندگی پر مایوسی کے بادل چھا گئے تھے اور قوم بلندی سے پستی کی جانب مائل تھی ۔ ایسے میں ایک مردِ مجاہد سر سید احمد خان سامنے آئے اور انہوں نے مسلمانوں کو ایک نیا رخ دیا ۔ ان میں زندگی کی حرارت پیدا کی اور اپنے رفقائے کار کے ساتھ مل کر علم و عمل کا ایک ایسا عظیم پیکر بن گئے جس نے زندگی کے ہر شعبے کو منور کر دیا اور وہ مسلمان جو اپنی تباہی و بربادی پر ماتم کناں تھے

دو بارہ اس قابل ہو سکے کہ اپنی جدوجہد سے اپنی کھوئی ہوئی منزل کی مراد پا سکیں اور یہ سب کچھ سرسید کی حکمت عملی بدولت ہی ممکن ہو سکا۔

یوں تو سرسید احمد خان نے بہت سے اہم کارنامے انجام دئے مگر ہم یہاں ان کے تعلیمی کارنامے پر طائرانہ نظر ڈالیں گے جس کی بدولت سائینٹفک سوسائٹی کی بنیاد پڑی کیونکہ قومی مرض کی تشخیص میں سرسید نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس بیمار قوم کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ علاج یہ ہے کہ قوم میں علم کی روح پھونک دی جائے اور اس میں تعلیم سے رغبت پیدا کی جائے اور یہ تعلیم محض رسمی نہ ہو بلکہ ایسی تعلیم ہو جو دل پر اثر کرکے روح کی گہرائیوں میں اتر جانے کی قوت رکھتی ہو۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ انگریزی زبان بھی سیکھی جائے تاکہ وہ علوم جو مغرب سے مشرق میں لائے جائیں، ان سے استفادہ کیا جا سکے۔ اور انہیں اپنی زبان میں منتقل کر کے اپنی قوم کو نئے معروضات سے واقفیت بہم پہنچانے کا موقعہ فراہم کیا جائے، خصوصاً وہ سائنسی علوم جو مغرب کی ترقی کی بنیاد تھے۔ چناں چہ اس سلسلہ میں ۱۸۶۳ء میں سائینٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ مغربی علوم کا اردو میں ترجمہ کرکے اسے مقبول بنایا جائے کیونکہ سرسید اور ان کے رفقائے کار کو یہ یقین تھا کہ جب تک مغربی علوم لوگوں کو اپنی قومی زبان میں حاصل نہ ہوں گے۔ اس وقت تک ملک و قوم کی ترقی ممکن نہیں۔ چنانچہ سوسائٹی نے تصنیف و تالیف و ترجمہ کے ذریعے مسلمانوں کی جو خدمت انجام دی ہیں وہ ڈھکی چھپی نہیں ہیں اور اسی کی بدولت مسلمان قوم احساس کمتری کے حصار کو توڑنے میں کامیاب ہو سکی جو اس دور میں مسلمانوں کی ناکامی کا ایک اہم سبب تھی۔ اس اعتبار سے سرسیّد کی سائینٹفک سوسائٹی نے مسلمانان پاک و ہند کی جو عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے جس کے اثرات آج بھی نمایاں نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے نو سال بعد ۱۹۵۶ء میں سوسائٹی کو پھر زندہ کیا گیا اور اس کا نام سائینٹفک سوسائٹی پاکستان رکھا گیا۔

سرسید نے جس کام کا آغاز ہندوستان میں کیا تھا۔ اس مشن کو پاکستان میں سرسید کے تعلیمی ادارہ ہی کے فارغ التحصیل چند ہونہار فرزندوں نے اپنی ذاتی کاوشوں سے بڑے شوق و ولولہ کے ساتھ "حیاتِ نو" بخشی۔

یہ طے پایا کہ اس سوسائٹی کی کوششیں فی الحال سائنسی علوم تک محدود رکھی جائیں کیونکہ عہدِ جدید میں سائنس کی حیثیت بنیادی ہے اور اگر سائنسی علوم میں دسترس حاصل ہوگئی تو خود بخود دوسرے علوم کے لئے بھی کامیابی کے دروازے کھل جائیں گے۔

سائینٹفک سوسائٹی پاکستان کے قیام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ سائنسی علوم کو آسان اور عام فہم زبان کے ذریعہ پاکستان میں پھیلایا جائے۔ اور مقبول و معروف بنایا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے تحریر و تقریر دونوں طریقے استعمال کئے جائیں۔

اس جذبے کی تکمیل کا متحرک مظہر اردو سائنس کالج، کراچی ہے۔ جہاں سائنسی علوم کے فروغ کے لئے بھرپور کوششیں کی جارہی ہیں اور یہ قومی ادارہ اس ضمن میں ایک مرکزی کردار ادا کررہا ہے۔

پاکستان کا قیام برصغیر کے مسلمانوں کی ملی زندگی کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ مسلمانوں نے یہ قطعہ زمین اس لئے حاصل کیا تھا۔ کہ یہاں اپنی ملی، تہذیبی اور تمدنی روایات کو پھر سے زندہ کریں۔ لہٰذا نئے ملک کے حصول کے ساتھ ملتِ اسلامیہ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اردو سائنس کالج کا قیام انہی ذمہ داریوں کو اپنے وسائل کے مطابق قبول کرنے کی ایک درخشاں مثال ہے۔ یہ کالج پاکستان کا واحد ادارہ ہے جہاں اعلیٰ جماعتوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ اس طرح ہمارے طلبہ کو اپنی صلاحیت اور شخصیت کے اظہار کا موقعہ ملتا ہے۔ اس درسگاہ میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم نہایت کامیابی سے دی جاتی ہے۔ اس نظام کی ستائش مرکزی حکومت کے تحقیقاتی کمیشن نے بھی کی ہے۔

وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج، کراچی ملک کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے جہاں قومی زبان میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس ادارہ میں اس وقت تقریباً ۲۶۰۰ طلبہ زیرِ تعلیم جن میں ۳۸۵ طالبات بھی شامل ہیں۔ اس قومی درسگاہ میں دورِ جدید کے تمام بنیادی و اطلاقی سائنسی مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور ایم ایس سی کی سطح تک تدریس کا انتظام ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قومی زبان اردو میں سائنس اور فنیات کے تمام مضامین کی تدریس کی پوری صلاحیت موجود

ہے۔ اردو سائنس کالج ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسی فعال تحریک کا نام ہے جس کا بنیادی مقصد سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک گیر راہیں استوار کرنا ہے تاکہ ہم دیگر ترقی یافتہ ممالک سے قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں اپنی قومی زبان کو ترجیح دیتی ہے قومی زبان سائنس کی تفہیم و تعلیم کی علم بردار ہوتی ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے بدیسی زبان کے ذریعہ ترقی حاصل کی ہو۔ ہر قوم کی ترقی خود اپنی زبان کی مرہون منت ہوتی ہے۔ پاکستانی قوم اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل ہے لیکن ہم سائنس کے میدان میں اسی صورت میں ترقی کر سکتے ہیں جب ہم حقیقی معنوں میں بدیسی زبان کو ترک کر دیں اور اپنی قومی زبان کو تعلیمی و سرکاری دائرہ کار میں اس کا جائز مقام متعین کریں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمارا ملک ہر امکانی دخفیہ ذخائر و وسائل سے مالامال ہے۔ دنیا کی زرخیز ترین زمینوں کے ہم مالک ہیں۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ان وسائل کو بروئے کار لا کر ملک و قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں۔ عزم و ہمت، عمل پیہم، جد و جہد ہماری قوم کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ ہمارے ملک میں افرادی قوت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہمارا قومی جذبہ ان کاوشوں میں معاون ہے۔ محدود وسائل کے باوجود ہماری ملکی معیشت ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ لیکن ہمارا ترقی پذیر ملک اس وقت تک ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ سائنس و ٹیکنالوجی میں بھی ترقی نہ کرلے۔ اور اس ترقی کا راز قومی زبان ہی کو ذریعہ تعلیم بنانے میں مضمر ہے۔ حصول پاکستان کی تحریک میں دو ہی جذبے کارفرما تھے، ایک اسلام، دوسرا اردو کا فروغ اور سربلندی۔ وقت کا اہم تقاضہ یہ ہے کہ ملی وحدت فکر و نظر کو بیدار کیا جائے اور قومی زبان اردو کو پورے ملک میں ہر سطح پر اپنایا جائے۔ پاکستان میں اردو سائنس کالج بحیثیت ایک قومی ادارہ اس مقصد کا علمبردار ہے۔

خداوند کریم کے فضل و کرم سے وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج اس وقت روشن مستقبل کی دہلیز تک پہنچ چکا ہے اور اردو یونیورسٹی کا قیام جو گزشتہ تیس سالوں سے محض خواب نظر آتا تھا۔ اب ایک جیتی جاگتی حقیقت کی صورت میں متشکل ہوتا نظر آرہا ہے۔ اس قومی درسگاہ میں کئی مضامین

میں ایم ایس سی کی تدریس پہلے ہی بطریق احسن جاری ہے۔ صرف اسے وسعت دینے اور رسمی طور پر یونیورسٹی کا نام دینے کی ضرورت ہے۔

اس اردو یونیورسٹی کے قیام کا نظریہ محض ایک خواہش نہیں بلکہ ملّی ضرورت ہے۔ ملّی ضرورت اس وجہ سے کہ وطن عزیز کی ملّتِ اسلامیہ کو مربوط و منضبط رکھنے کے دو ہی ذریعے ہیں۔ ایک "اسلام" اور دوسرا قومی زبان "اردو"۔ اسلام ایک نظریہ حیات بن کر ملت کو جوڑتا ہے اور اردو رابطہ کا ذریعہ بن کر درّۂ خیبر سے ساحلِ مکران تک برادرانِ وطن کو منسلک رکھتی ہے۔ مشرقی پاکستان بھی پچیس سال تک ان ہی دونوں ذرائع کی مدد سے مربوط رہا۔ اگر یہ دونوں ذریعے کمزور نہ کر دئے گئے ہوتے تو مشرقی خطہ ہم سے کبھی جدا نہ ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری موجودہ حکومت ان دونوں عوامل کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہے۔ اور اس نے اسلام کے نام پر قائم ہونے والی اس سب سے بڑی مملکت کے اتحاد و استحکام کی خاطر بے شمار عملی اقدامات کئے ہیں۔ ملّتِ اسلامیہ کو متحد کرنے کے لئے اسلام آباد میں اسلامی یونیورسٹی کا قیام مستحسن شگون ہے۔ وطن عزیز میں باہمی روابط، یک جہتی اور یگانگت کے فروغ کے لئے قومی زبان اردو کی ہر شعبہ حیات اور ہر سطح پر ترویج و ترقی کے لئے بھرپور کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ایسے وقت میں اردو یونیورسٹی کا قیام بلا شبہ ایک ایسا مثبت قدم ہوگا جس کے نتیجہ میں قومی وحدتِ فکر اجاگر ہوگی۔

موجودہ تعلیمی سال میں اردو سائنس کالج اور اردو کالج کو ملا کر سات ہزار سے زائد طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں۔ مستقبل قریب میں ان دونوں اداروں میں طلبہ کی تعداد دس ہزار سے تجاوز کر جائے گی۔ یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد اس کی مرکزی حیثیت ہوگی جس میں علاقے، رنگ اور نسل کی تفریق سے بالاتر ہر شخص وطن عزیز کا یکساں طالب علم ہوگا۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ساتھ جب بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق یادگاری کتب خانہ کی تین منزلہ پرشکوہ عمارت، کالج کی مرکزی سہ منزلہ عمارت، طالبات سیکشن، اقامت گاہیں، کالج ہال، جامع مسجد اور جمنازیم وغیرہ کی تعمیرات مکمل ہو جائیں گی تو اردو یونیورسٹی

کیمپس اس عظیم تر کراچی میں ایک جدید اور نادر طرزِ تعمیر کا نمونہ ہوگا جسے دیکھ کر ہر پاکستانی کو نہ صرف اپنے قومی تشخص کا احساس ہوگا بلکہ جذبۂ مسرت کے ساتھ وہ اپنا سر فخر سے بلند کر سکے گا۔

مہمانانِ محترم!

بیسویں قومی سائنس کانفرنس کے انعقاد کے سلسلہ میں صرف یہ کالج ہی میزبانی کے فرائض انجام نہیں دے رہا ہے بلکہ پورے اہلِ شہر کے جذبات اس میزبانی میں یکساں طور پر شریک ہیں اور اس میزبانی میں عملی طور پر کراچی کے اہم ادارے، مقتدر شخصیتیں اور علم دوست حضرات پہلو بہ پہلو شریک کار ہیں۔ بالخصوص ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن ٹرسٹ پاکستان اور اس کے صدر نشین جناب حکیم حافظ محمد سعید صاحب، کراچی پورٹ ٹرسٹ اور اس کے چیرمین جناب ایم آئی ارشد صاحب پاکستان اسٹیل ملز اور اس کے چیرمین جناب این اے اختر صاحب، اعظم انسٹرومنٹس لمیٹڈ اور اس کے منیجنگ ڈائریکٹر جناب غزالی صاحب، پاکستان چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری اور اس کے صدر جناب یوسف ضیاء صاحب، ادارہ ترقیات کراچی اور اس کے ڈائریکٹر جنرل جناب زیڈ اے نظامی صاحب، کراچی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے صدور و عہدیداران، کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پروفیسر سید معصوم علی ترمذی صاحب، شہر کے کالجوں کے پرنسپل صاحبان، کراچی ضلع کی انتظامیہ، بلدیۂ عظمیٰ کراچی اور رئیس بلدیہ جناب عبدالستار افغانی صاحب اور جناب کمشنر صاحب، کراچی، صوبائی حکومت اور اس کے وزرا کرام، مقتدرہ قومی زبان، اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ، کراچی، آئی۔بی۔اے اور اس کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب، جناب خواجہ محمد یعقوب صاحب، جنرل ٹریڈرز لمیٹڈ، این ای ڈی یونیورسٹی اور اس کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر اے۔ ٹی خان صاحب، انیس ٹائر کارپوریشن، کوئیک کنسٹرکشن کمپنی، ساسی لمیٹڈ، انگلش بسکٹ فیکٹری، نیپا اور نیلاٹ اس میزبانی میں پیش پیش ہیں۔ میں سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان اور مجلس استقبالیہ کی جانب سے پاکستان سائنس فاؤنڈیشن اور اس کے

صدر نشیں جناب ڈاکٹر ایم ڈی شامی صاحب، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور اس کے چیرمین جناب ڈاکٹر محمد افضل صاحب کا بے حد ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے اس ادارے کو اپنے گراں قدر عطیات سے نوازا۔

اللہ تعالٰے کی بارگاہ میں دعاگو ہوں کہ وہ اس قومی سائنس کانفرنس کو کامیابی سے ہمکنار کرے اور یہ کانفرنس ملک کی سائنسی ترقی کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہو۔ سائینٹفک سوسائٹی کے رفقار کار اور اردو سائنس کالج کے تمام اساتذہ کرام کا ممنون ہوں۔ جنہوں نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں شب و روز کام کیا۔ آخر میں سائینٹفک سوسائٹی پاکستان اور اردو سائنس کالج کی جانب سے آپ تمام حضرات کی کرمفرمائی اور تشریف آوری کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پاکستان پائندہ باد



حکومت سندھ کے سینئر وزیر میر رسول بخش تالپور
خطبۂ افتتاحیہ ارشاد فرما رہے ہیں

خطبہ افتتاحیہ

جناب پرنسپل صاحب، جناب ڈاکٹر اسلم الزماں صدیقی صاحب، جناب میجر آفتاب حسن صاحب، جناب صدر مندوبین، خواتین و حضرات

السلام علیکم!

حکومت سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی و ترویج کے لئے تمام ممکن ذرائع کو بروئے کار لانے کی کوشش کر رہی ہے اس ضمن میں اردو زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں قدرت نے جو غیرت، حب الوطنی اور عظمت ماں کی گود کی زبان میں رکھی ہے وہ کسی اور زبان میں نہیں آ سکتی۔ دنیا بھر کے سائنسدانوں نے اپنی مادری زبان کو وسیلۂ اظہار بنا کر شہرت حاصل کی۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سائنسی اصطلاحات کا قومی زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکتا اگر ایسا ہوتا تو روس، فرانس، چین، جاپان ترقی کی دوڑ میں سب سے آگے نہ ہوتے۔ ہمارا ملک قدرتی عطیوں اور وسائل سے مالا مال ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے سائنسدان اپنی کوششوں اور تحقیقات سے ان وسائل کو ملک و قوم کے استفادے کے قابل بنائیں۔ اسلام عقل و تدبر کے استعمال پر زور دیتا ہے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کے بارے میں غور و فکر کریں۔ میرے خیال میں اردو یونیورسٹی ضرور قائم ہونی چاہیئے۔ دنیا کی اقوام نے اپنی قومی زبان کو اپنا کر ترقی کی ہے۔ اردو یونیورسٹی کے قیام میں جتنی تاخیر ہوگی ترقی کی دوڑ میں ہم اتنا ہی پیچھے ہوتے چلے جائیں گے۔ حکومت کو یہ کام اولین فرصت میں کرنا چاہیئے۔ انگریزی کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن اسکو صرف بطور مضمون کے پڑھایا جانا چاہیئے جہاں تک تعلیم کا سوال ہے وہ اگر فنی ہو تو بہتر ہے ورنہ موجودہ تعلیم صرف بے روزگاروں کی تعداد میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔ آخر میں میں سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس تاریخی سائنس کانفرنس کا افتتاح کرنے کا موقعہ عطا کیا۔ میں اس کانفرنس کا افتتاح کرتا ہوں۔

خطبۂ صدارت



شیخ الجامعہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی و صدر سائینٹفک سوسائٹی
جناب ڈاکٹر احمد محی الدین خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے ہوئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

پاکستان کے سائنسی مسائل

جناب محترم مہمان خصوصی، ڈاکٹر اسلم خان صاحب، مندوبین گرامی و معزز خواتین و حضرات
السلام علیکم!

سب سے پہلے میں مہمانِ خصوصی کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی انتہائی مصروفیات اور عظیم سرکاری ذمہ داریوں کے باوجود اس کانفرنس کے افتتاح کے لئے بہ نفسِ نفیس تشریف لائے۔ جنابِ والا! آپکی یہاں تشریف آوری آپ کی علم پروری اور خصوصاً سائنس کی ترقی و ترویج اور سائنس و ٹیکنالوجی کے استعمال سے ملک کی معاشی و معاشرتی بہبود سے گہری دلچسپی اور وابستگی کی دلیل ہے اور یہ ہم سب کے لئے باعث فخر و مسرت بھی ہے اور باعث طمانیت بھی۔ باعث طمانیت یوں کہ اگر حکومت کی راست سرپرستی نصیب ہو جائے تو یہ نہ صرف ملک میں سائنس و فنیات کی ترقی کی ضمانت دیتی ہے اور سائنسدانوں اور انجینئروں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے بلکہ سائنس و فنیات کے استعمال سے ملک کی ترقی کی راہیں استوار کرنے کا جذبہ اور عزم بھی مہیا کرتی ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ آپکی یہ دلچسپی اور سرپرستی ہمیں ہر لمحہ حاصل رہے گی۔ مشاہدہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں جہاں بھی سائنس و فنیات نے نسبتاً زیادہ ترقی کی ہے وہاں اس کو حکومت کی مکمل سرپرستی حاصل رہی ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے بھی یہ ایک فالِ نیک ہے۔ میں سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کی منتظمہ اور اراکین کا نہایت ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے سوسائٹی کے جشن سیمیں کے موقع پر منعقد کردہ اس سالانہ کانفرنس کا صدر عمومی منتخب فرمایا اور یہ اعزاز بخشا کہ اس موقع پر آپکی خدمت میں اپنے چند خیالات و احساسات پیش کر سکوں۔ میں اس سوسائٹی کا ابتدائی ایام سے رکن چلا آرہا ہوں اور اس بات سے بخوبی واقف ہوں کہ اس کے منتظمین کس خلوص، تندہی اور جانفشانی کے ساتھ ایک چوتھائی صدی کے طویل عرصے سے قومی زبان اور سائنس دونوں کی خدمت بجا لا رہے ہیں۔ ۱۹۵۸ء کی پہلی کانفرنس سے لیکر آج تک کٹھن سے کٹھن دور میں بھی کوئی سال ایسا نہیں گزرا کہ اس سوسائٹی کی سالانہ کانفرنس منعقد نہ ہوئی ہو۔ اس کے علاوہ ملک کے ہر علاقے میں کانفرنس کا انعقاد کرکے اور مستند ماہرینِ سائنس سے تحقیقی مضامین لکھوا کر سوسائٹی نے

اس امر کا عملی مظاہرہ کیا ہے کہ قومی زبان اردو میں جدید سے جدید اور مشکل سے مشکل علوم و فنون کو بیان کرنے کی صلاحیت موجود ہے ۔ چنانچہ آج کل اربابِ اقتدار کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو چلا ہے کہ قومی تشخص اور ملکی وقار کی حفاظت کی خاطر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں تمام کاروبار غیر ملکی زبان کی بجائے اپنی زبان میں چلایا جائے اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس فیصلے کا نفاذ کر دیا جائے کہ مدرسوں، کالجوں، دفتروں اور عدالتوں میں ساری کاروائی قومی زبان میں ہو۔ اکثر حاضرینِ جلسہ اس بات سے واقف ہیں کہ آزادی سے قبل حکومت کے مختلف محکموں میں قصبے، تحصیل اور ضلع کی سطح پر دفاتر کے اکثر کام پنجاب، سرحد، بلوچستان اور کشمیر میں اردو میں اور سندھ میں سندھی میں انجام پاتے تھے ۔ اور انگریزی صرف اوپر کی سطح پر ہی استعمال کی جاتی تھی اور آج بھی تقریباً یہی صورتحال ہے۔

قومی زبان اور اعلےٰ تعلیم

صدرِ محترم ! قومی زبان کے استعمال کے سلسلے میں آپ کی ہدایات بے حد واضح ہیں کہ جہاں تک ہو سکے ہر جگہ اردو بولی جائے اور خط و کتابت بھی اسی میں کی جائے ۔ آپ کی ہدایات نے کافی اثر کیا ہے اور اب بتدریج اُردو کے استعمال میں اضافہ ہو رہا ہے اور جو احساس ندامت و کمتری اُردو کے استعمال سے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتا تھا وہ اب کم ہوتا جا رہا ہے ۔ اس سلسلے میں خود آپ کا قومی زبان کا استعمال خواہ ملک کے اندر ہو یا باہر، ہر پاکستانی کے لئے نہ صرف باعثِ فخر و مسرت ہے بلکہ ایک قابلِ تقلید سبق ہے ۔ اُمید ہے کہ آپ کا یہ عمل ہم سب کے لئے مہمیز کا کام دے گا اور پاکستانی قوم جب قومی زبان کو اپنے دفاتر، تعلیمی اداروں اور اپنے کاروبار میں استعمال کرنا شروع کر دے گی تو قوم کا مزاج بھی صحیح معنوں میں " پاکستانی " ہوتا جائے گا اور اس کی جھلک اس قوم کے افراد میں ان کی زبان ہی سے نہیں بلکہ لباس، بود و باش، اندازِ فکر و عمل غرض کہ ہر شعبۂ زندگی میں نظر آنے لگے گی اور قومی تشخص کی تلاش میں یہ قوم جو عرصے سے بھٹکتی نظر آ رہی ہے اس کو اپنی منزل مل جائے گی ۔

جنابِ صدر ! اگر اجازت دیں تو میں یہ برملا کہہ سکوں کہ خود آپ کی ذات، زبان، لباس سوچ اس تشخص کی بہترین آئینہ دار ہے ۔

جنابِ والا ! مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اب بھی ملک میں ایک طبقہ ایسے اصحاب کا موجود ہے جو خلوصِ دل کے ساتھ یہ باور کرتا ہے کہ اپنی قومی زبان سائنس اور فنیات کے موجودہ دَور کے جدید تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی ۔ میں ان اصحاب سے معذرت کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ انہوں نے یہ فیصلہ بغیر ذاتی واقفیت اور تجربے کے کیا ہے اور کسی نتیجہ تک پہنچنے کا یہ کوئی سائنسی طریقہ نہیں ہے ؛ واقعہ یہ ہے کہ

آزادی سے قبل میں نے ایک ایسی جامعہ سے تعلیم حاصل کی جہاں اعلیٰ ترین سائنسی و فنی تعلیم اُردو کے ذریعے دی جاتی تھی ۔ نہ صرف یہ بلکہ اس پوری ریاست کا سارا کاروبار اردو زبان میں انجام پاتا تھا اور اس میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی ۔ نہ صرف میں نے بلکہ میرے بہت سے پیش رو اور ہم عصروں نے اسی اُردو زبان کے ذریعہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد یورپ اور امریکہ کی بڑی سے بڑی مشہور یونیورسٹیوں سے ویسے ہی امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی جیسے انگریزی کے ذریعہ تعلیم پانے والے طلباء حاصل کرتے تھے ۔ اسی طرح خداداد پاکستان میں بلکہ اغلباً خود آج کی اسی محفل میں ایسے سائنسدان اصحاب بفضلِ خدا موجود ہیں جنہوں نے اپنے اپنے مضمون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اسی زبان کے ذریعہ تدریس و تحقیق کے فرائض انجام دیئے ۔ خود اسی شہر کراچی میں ایسے کالج موجود ہیں جو تقریباً تیس برس سے نہ صرف بی۔اے ، بی۔ایس سی بلکہ ایم ۔ اے ، ایم۔ایس سی تک بھی تمام علوم و فنون کی تعلیم اردو زبان کے ذریعے دے رہے ہیں ۔ ان تمام تجربات و مشاہدات کے باوجود یہ کہنا کہ اس زبان میں ذریعہ تعلیم بننے کی اہلیت نہیں ہے سوائے ذہنی اور عملی جمود کے اور کیا ہو سکتا ہے ۔ دراصل یہ مسئلہ محض نظریاتی یا آئینی نہیں ہے بلکہ اس کا عملی اور افادی پہلو بھی قابلِ توجہ ہے ۔ سائنس کے اس دور میں سانس لینے والی پاکستانی قوم کو جس کا بیشتر حصہ ناخواندہ ہے اور انگریزی زبان سے یکسر ناواقف ہے ، سائنس کا احساس دلانے ، اُس کا شعور پیدا کرنے اور سائنس کو گھر گھر پہنچانے کے لئے صرف اپنی ہی زبانیں استعمال ہو سکتی ہیں ، غیر ملکی زبان نہیں ۔ اور پھر یہ امر بدیہی ہے کہ غیر زبان کو اس حد تک سیکھنا کہ اس میں جدید علوم و فنون کے پیچیدہ مضامین کو کما حقہٗ سمجھا اور سمجھایا جا سکے ، ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ۔ ہم میں سے ہر استاد اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر اس امر کی تصدیق کر سکتا ہے کہ ہمارے طلباء اور طالبات کی ایک کثیر تعداد سال بہ سال کسی مضمون میں اچھی استعداد رکھنے کے باوجود محض انگریزی زبان پر کافی دسترس نہ رکھنے کے باعث پوری طرح اظہارِ خیال نہیں کر سکتی اور اپنا زیادہ وقت مضمون میں مہارت پیدا کرنے کے بجائے ذریعہ اظہار پر عبور حاصل کرنے پر صرف کر دیتی ہے ۔ اور وہ کتنا عبور حاصل کرتی ہے وہ آج کل کے طلباء و طالبات کی انگریزی زبان کے معیار سے واضح ہے ۔ زمانۂ غلامی میں انگریزی زبان پر عبور ہی علم اور صلاحیت کی دلیل تھی ۔ لیکن زبردست سائنسی اور فنی ترقی کے اس دور میں ہمارے لئے علم و فن میں مہارت حاصل کرنا بہت زیادہ ضروری ہے ۔ انگریزی زبان کی بین الاقوامی حیثیت مسلّم ہے ۔ لہٰذا انگریزی ہمارے لئے بھی مفید بلکہ ضروری ہے لیکن بحیثیت لازمی ثانوی زبان کے ۔ انگریزی کو بی۔اے ، بی۔ایس سی کی ڈگری تک بحیثیت لازمی زبان ضرور پڑھائیے لیکن انگریزی ادب کو پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ زبان پر زور دیجئے تاکہ بین الاقوامی رابطہ قائم رہے ۔ جب بھی اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی

بات ہوتی ہے تو معترضین شور مچاتے ہیں کہ انگریزی کو نکال باہر کیا جا رہا ہے جو غلط ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ انگریزی زبان کو تاریخ و جغرافیہ کے ذریعہ نہ پڑھائیے بلکہ انگریزی زبان کے ذریعے پڑھائیے۔ اور پھر ایک آزاد اور خود مختار ملک کے لئے یہ بات نہایت معیوب اور باعثِ ندامت ہے کہ وہ اغیار کی اس قدر محتاج ہو جائے کہ اپنے افکار و خیالات کا اپنی زبان میں اظہار بھی نہ کر سکے۔ ابنائے ملک کے لئے یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ وہ کب تک اس آئینی اور نظریاتی حقیقت کو نظر انداز ہوتے ہوئے دیکھتے رہیں گے۔

سائنس و ٹیکنالوجی کا نظام

صدرِ گرامی! علم کے اضافے کی رفتار کا یہ حال ہے کہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس زبردست اضافے کی شرح کے باعث علم کی مقدار اب صرف ایک عشرہ ہی میں دگنی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ آج سائنسدانوں کی کل تعداد جو اس دنیا میں زندہ و سلامت ہے اور تحقیقی کاموں میں مصروف ہے وہ اس کرۂ ارض پر اب تک جتنے سائنسدان گذرے ہیں ان سب کی مجموعی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ سائنس و فنیات کی حیرت انگیز ترقی نے اس دنیا کی سوچ، رہن سہن کے طریقوں، سفر کے ذرائع، اقدار کے معیارات، غرض کہ ہر شعبۂ زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ رب العزت نے سوچنے، فکر کرنے اور زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اس کو تسخیر کرنے کی ہدایت فرمائی ہے، جو مسلمانوں کو کرنا تھا۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ وہ زیادہ تر غیر مسلموں نے کر دکھایا۔ یقیناً آٹھویں اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان مسلمانوں نے سائنس اور دیگر علوم کے میدان میں شاندار کارنامے سرانجام دیئے اور بلاشبہ سائنس میں مسلمانوں کی کامیابیاں اور ترقی یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بنی جو خود صنعتی انقلاب اور پھر سائنسی انقلاب کا باعث ہوئی اور موجودہ فنیاتی تہذیب پر منتج ہوئی۔ لیکن مسلمانوں میں اس ترقی و کامرانی نے انہیں "سہل" زندگی کا عادی بنا دیا اور علم کے معاملہ میں بتدریج غفلت اور تنگ نظری نے اپنا سکہ جما یا جس کے نتیجہ میں ذہنوں پر جو جمود طاری ہوتا گیا وہ تقریباً آج تک موجود ہے۔ اس حقیقت کا اس بات سے اندازہ لگائیے کہ آج مسلمان دنیا کی آبادی کا ایک چوتھائی ہیں لیکن ان میں سائنسدان و انجینئر ایک فیصد سے بھی کم ہیں۔ مگر اب حالات بدل رہے ہیں اور انشاء اللہ پندرہویں صدی ہجری کی ابتداء مسلم اُمہ کے شاندار مستقبل کی بھی ابتداء ہوگی۔ مشہور سائنسدان آنجہانی برونوسکی سائنس کی موجودہ ترقی کو مغربی ممالک کے انسان کی تہذیب کی معراج گردانتا ہے اور شاید اس کی نجات بھی۔ بہرحال یہ حقیقت اپنی

جگہ مسلّم ہے کہ سائنس بجائے خود ایک ثقافت ہے، ذوقِ تجسس کا ایک ایسا نہ ختم ہونے والا سفر جس کی کوئی منزلِ متعین نہیں اور جہاں خوب سے خوب تر کی تلاش جاری ہے اور پھر سائنس و ٹیکنالوجی کا نظام ایک نئے معاشی نظام کی بنیاد بھی بنتا ہے۔ جن قوموں کے ہاں سائنس و ٹیکنالوجی (S&T) کا اعلیٰ نظام ہے ان کا معاشی نظام بھی مستحکم ہے اور نتیجتاً دفاعی نظام بھی مستحکم ہے۔ ان کی تمام ترقی اور طاقت کا راز اور ان کی عزت و عظمت، رعب و دبدبہ ان کے بے حد ترقی یافتہ سائنس و ٹیکنالوجی کے نظام میں مضمر ہے۔ سائنس صرف طاقت اور رعب و دبدبہ کو ہی طاری نہیں کرتی بلکہ قوموں خصوصاً ہم جیسے ترقی پذیر ممالک کی معاشی و معاشرتی حالت کو بدلنے کا ایک بے انتہا کارگر، اہم اور مؤثر ذریعہ ثابت ہو چکی ہے۔ جن قوموں نے سائنس و ٹیکنالوجی کو اپنی حالت سدھارنے کے لئے استعمال کرنے کا سلیقہ سیکھ لیا انہوں نے بے پناہ ترقی کی ہے۔ ان میں بعض ایسے ممالک شامل ہیں جن کے ہاں خام وسائل کی کمی ہے، جیسے تیل، کوئلہ اور لوہا، لیکن اس کے باوجود بہتر ٹیکنالوجی کے استعمال نے اور من حیث القوم محنت کرنے کی عادت اور ترقی کرنے کے عزم نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس سلسلے میں ایک روشن مثال جاپان کی ہے۔ اس کے برخلاف تیسری دنیا کے ممالک میں اس چیز کے فقدان نے انہیں غریب کر رکھا ہے۔ ہمارے ملک کی حد تک اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملک کی معاشی منصوبہ بندی میں ہم نے سائنس اور سائنسدانوں کو منصوبہ بندی کے مراحل میں شرکت کا موقع نہیں دیا حالانکہ آج کے مسائل کی نوعیت کے لحاظ سے کسی بھی معاشی منصوبہ بندی میں ان کا بھرپور حصہ ہونا چاہیئے۔ ١٩٧٥ء کے ایک جائزہ کے مطابق دنیا کی تین چوتھائی آبادی ترقی پذیر ممالک میں بستی ہے۔ دنیا کی جملہ آمدنی میں ان کا صرف پانچواں حصہ ہے۔ ان ترقی پذیر ممالک میں کم از کم اسی کروڑ انسان ایسے بستے ہیں جو غربت کی آخری حالت میں سسکتے زندگی گذارتے ہیں۔ مستقبل کا مورخ اس تضاد کو بتلاتے ہوئے بڑا حیران ہوگا کہ سائنس و ٹیکنالوجی کے اس سنہرے دور میں دنیا کے کافی بڑے حصہ میں قلتِ غذا، غربت، اقتصادی بدحالی اور ناخواندگی کا دور دورہ تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان اس فرق کی خلیج گھٹنے کے بجائے بڑھتی ہی چلی گئی۔

ٹیکنالوجی کی منتقلی

جنابِ والا! سائنس اس طبعی و مادی دنیا کے بارے میں ایک منظم علم کا نام ہے اور یہ اتنی قدیم نہیں۔ اس کے برخلاف ٹیکنالوجی یا فنیات سائنس سے کہیں زیادہ قدیم ہے بلکہ اتنی ہی قدیم جتنا کہ خود انسان ہے۔ البتہ سائنس پر مبنی ٹیکنالوجی یعنی سائنسی تحقیق کے نتائج کو شعوری طور پر استعمال کرکے مسائل کا

حل تلاش کرنا مزور انسان کی تاریخ میں نسبتاً ایک نئی چیز ہے اور ترقی کو جو ایک کافی پیچیدہ معاشرتی عمل ہے، حاصل کرنے کا ایک بے انتہا کامیاب نسخہ ہے۔ سائنس اپنے کردار میں بین الاقوامی ہوتی ہے۔ اس کو حاصل کرنے اور اس سے مستفید ہونے میں سب آزاد بھی ہیں اور برابر بھی۔ لیکن ٹیکنالوجی جو سائنس کا اطلاقی پہلو ہے کلیتاً قومی اور خفیہ ہوتی ہے اور ہر ملک اپنی صلاحیت سے اپنی ضروریات کے مطابق اس کی پرداخت کرتا ہے۔ اگر سائنس اور ٹیکنالوجی کی اس تعریف سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا جائے کہ سائنس غیر اہم اور ٹیکنالوجی ہی اہم ہے تو یہ صحیح نہیں ہوگا۔ سائنس علم کا سرچشمہ ہے جس سے ٹیکنالوجی کے سوتے پھوٹتے ہیں اگر فیراڈے اور میکسویل کا برق پر بنیادی کام نہ ہوتا تو آج سے تقریباً سو سال پہلے ایڈیسن بجلی کا بلب نہ بنا سکتا اور نہ موجودہ فضائی تہذیب بجلی کی قوت کے بغیر اپنے اوج کمال پر پہنچ سکتی۔ کوئی ملک اس وقت تک ٹیکنالوجی کے حصول پر قابو نہیں پا سکتا جب تک کہ اس کے اندر بنیادی سائنس کی اساس مضبوط نہ ہو اور کافی ترقی یافتہ شکل میں نہ ہو۔ یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے کہ کُل سائنسی کاوش میں اس کا کیا تناسب ہو، خصوصاً ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک میں۔ ٹیکنالوجی کی منتقلی جوں کی توں تو نہیں ہو سکتی۔ جس طرح سرد ملک کا پودا گرم آب و ہوا کے ماحول میں نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ اس کا ضروری مطالعہ نہ کیا جائے کہ کس طرح نئے ماحول کے مطابق اس کی ضروریات فراہم کی جائیں، اس طرح کوئی بیرونی ٹیکنالوجی ہمارے مختلف سماجی، معاشی و ثقافتی حالات میں اور ہمارے وسائل کے محدود کے پیش نظر پنپ نہیں سکتی۔ اور پھر کسی بھی ٹیکنالوجی کی منتقلی ایک بے انتہا مہنگا اور خطرناک سودا ہوتا ہے۔ جو ترقی یافتہ ممالک ٹیکنالوجی منتقل کرتے ہیں وہ اصل میں مشینری ہی منتقل کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے ماہرین بھیجتے ہیں جو بھاری تنخواہیں لینے کے باوجود اس ٹیکنالوجی کا علم کبھی منتقل نہیں کرتے۔ ایسی ٹیکنالوجی کا حصول ایک ایسے بند صندوق کو خریدنے کے مترادف ہے جس کے متعلق یہ نہیں معلوم ہے کہ اس کے اندر کیا ہے۔ ایسی ٹیکنالوجی کی منتقلی افقی کہلاتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی کثیر قومی کارپوریشنیں (MULTINATIONAL CORPORATIONS) اس سلسلہ میں مکمل اجارہ داری رکھتی ہیں۔ اور اپنے تمام تر مفادات کو اولین ترجیح دیتی ہیں نہ کہ اس ملک کے مفادات کو جہاں ایسی منتقلی عمل میں آتی ہو۔

WIPO (WORLD INTELLECTUAL PROPERTY ORGANIZATION) کے ۱۹۷۶ء کے ایک جائزہ کے مطابق ترقی یافتہ ممالک (جن کی کُل آبادی تو ۲۵ فیصد ہے اور پیداواری صلاحیت ۸۰ فیصد) ۹۵ سے ۹۹ فیصد پیٹنٹ سالانہ تیار کرتے ہیں جبکہ ترقی پذیر ممالک (جن کی آبادی دنیا کی ۷۵ فیصد اور پیداواری

صلاحیت ۲۰ فیصد ہے) بمشکل ایک سے پانچ فیصد سالانہ پیٹنٹ تیار کرتے ہیں۔ امریکہ، روس، جاپان بالترتیب اکیاون ہزار، پچاس ہزار اور تیس ہزار اور فرانس، برطانیہ، جرمنی وغیرہ دس دس ہزار پیٹنٹ سالانہ تیار کرتے ہیں۔ کل ترقی پذیر ممالک مل کر بھی دو سو سے زائد پیٹنٹ نہیں تیار کر سکتے۔ اور پھر اس ٹیکنالوجی کی بڑی بھاری قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ پاکستان ایسی ہی چند راست ٹیکنالوجی کی درآمد پر لائسنسوں، پیٹنٹ اور کاپی رائٹ کی فیس کے طور پر کم از کم ۱٫۵۰ ملین روپے سالانہ ادا کرتا ہے اور اندازہ ہے کہ آئندہ بیس سال میں یہ رقم دس گنی سے زائد ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ قبل UNCTAD (اقوام متحدہ کی کانفرنس برائے تجارت و ترقی) نے اس منتقلی کو کچھ سستی اور آسان بنانے کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا تھا ترقی یافتہ ملکوں نے اس کی سخت سے مخالفت کی تھی یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ چونکہ مالدار مغربی اقوام کی اب بہت کمپنیاں اس کاروبار میں حصہ دار ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کمپنیوں سے تعلق رکھنے والی اقوام ان ترقی پذیر ممالک میں اور بھی ناجائز سہولتیں حاصل کرنا چاہتی ہیں اور ان کی یہ کوششیں نہ صرف ملک کی صنعتی ترقی کی صلاحیتوں کو متاثر کر سکتی ہیں بلکہ ان غریب ممالک کی معاشی پالیسی حتیٰ کہ خارجہ پالیسی بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ اور پھر ان تمام خطرات کے باوجود ملک کبھی بھی اس ٹیکنالوجی کا مالک نہیں بن سکتا اور اس کی حالت ہمیشہ کرایہ دار ہی کی سی رہتی ہے۔ ٹیکنالوجی کا مالک بننے اور اس کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کے لئے ٹیکنالوجی کو خود آگے بڑھانا پڑتا ہے۔ اس کے لئے ملک کو اپنے سائنسدانوں اور انجینئروں سے جائز توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ ملک کی اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے اس چیلنج کو ضرور قبول کریں گے۔ اگر ان پر اس بات کی تمام تر ذمہ داری ڈالی جائے اور پھر ان پر بھروسہ بھی کیا جائے اور کام کی ضروری سہولتیں اور ماحول مہیا کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ ممکن نہ ہو سکے۔

سائنس و ٹیکنالوجی پالیسی

صدر محترم! معاشی و معاشرتی ترقی ہر ملک و قوم کے لئے ضروری ہے لیکن یہ ترقی صرف اور صرف سائنس و ٹیکنالوجی کے موزوں استعمال ہی پر مبنی ہے۔ آج کل تیسری دنیا کے ممالک کی ضروریات، ان میں بسنے والوں کی امیدیں اور تمنائیں بھی اتنی ہی اہم اور شدید ہیں جتنی ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں کی ہیں۔ صدیوں سے غربت و جہالت اور دیگر اقوام کی محکومیت میں زندگیاں گزارنے والی قوموں کے پاس اب نہ تو اتنا وقت ہے اور نہ صبر کہ وہ مزید پسماندگی کو اپنا مقدر سمجھ کر برداشت کر لیں۔ اب ان کے لئے اپنی منزل پانے کا قریب ترین راستہ سائنس و ٹیکنالوجی کا استعمال ہے۔ ہر ملک اپنی ضروریات اور وسائل کے مطابق اپنی سائنس و ٹیکنالوجی کی پالیسی بناتا ہے اور اسی کے مطابق اپنی ترجیحات متعین کرتا ہے اور اس کی تکمیل کی جانب ایک منصوبہ کے تحت

مکمل طور پر عمل پیرا ہوتا ہے ۔ ہمارے ملک میں بھی عرصہ دراز سے ایسی پالیسی کی تشکیل کی خبریں ملتی رہی ہیں لیکن شاید اب کی بار یہ قیاس بالکل صحیح ثابت ہو کہ پالیسی آ رہی ہے ۔ لہٰذا میں اس کے متعلق کچھ عرض کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ البتہ یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایسی پالیسی حقیقت پسندانہ قومی مقاصد کی حامل ہونی چاہیئے کہ آج ہماری کیا ضروریات ہیں اور آج سے دس سال بعد اور پھر دو ہزار عیسوی تک کیا ضروریات ہونگیں۔ جب تک یہ نہ ہوگا کسی مفید اور کارآمد ٹیکنالوجی کی منتقلی ممکن نہ ہوگی ۔ لہٰذا حد سے زیادہ بڑھی چڑھی تجاویز سے جو ہمارے وسائل کو سامنے رکھ کر نہ بنائی گئی ہوں اور حقیقت پسندانہ نہ ہوں اجتناب کیا جانا چاہیئے۔ جو بھی سائنس و ٹیکنالوجی کا نظام (S&T) معرض وجود میں آئے اس کو پیداواری صلاحیت کے ساتھ منسلک رہنا چاہیئے ۔ ایسا جو بھی نظام اس وقت ملک میں موجود ہے، وہ پیداواریت سے لاتعلق رہا ہے اور خالصتاً علمی و نظریاتی جھکاؤ کا حامل رہا ہے جس کی بناء پر خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو سکے ہیں۔ مشہور ناول نگار آنجہانی ای۔ ایم فارسٹر اپنی ناول 'MACHINE STOPS' میں ایسی غیر حقیقت پسندانہ اور غیر مناسب سائنس و ٹیکنالوجی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " یہ ایک خود مختار طاقت ہے جو حرکت تو کرتی ہے مگر ہمارے پٹری پر نہیں، جو آگے بڑھتی تو ہے مگر ہمارے مقاصد و منزل کی جانب نہیں "۔ جناب والا ! تحقیقی کام کی سمت OECD (۱۹۶۳ء) اور یونیسکو (۱۹۶۹ء) کے مطابق اور مسلمہ فارمولہ کے تحت یوں ہے کہ سب سے پہلے بنیادی تحقیق آتی ہے جو کسی خاص مقصد کے بغیر اور کلیتاً سائنسی علم میں مزید اضافہ کا باعث ہوتی ہے ۔ اس کے بعد اطلاقی تحقیق آتی ہے جس میں ایک خاص اور عملی مقصد ہوتا ہے جس کے بعد کہیں ترقی کی باری آتی ہے جو بنیادی و اطلاقی تحقیق کا نتیجہ ہوتی ہے اور جس کا مقصد بالکلیہ عملی ہوتا ہے تاکہ اس سے نئے یا بہتر طریقے یا نئی یا بہتر اختراعات کو معرض وجود میں لایا جائے ۔ اس جملہ کاوش کا نام "تحقیق و ترقی" (R & D) ہوتا ہے ۔ لیکن ترقی پذیر ملک میں دو اہم اضافی کام اور ہوتے ہیں ۔ ایک تو مستقل جائزہ لیتے رہنا اور صحیح ٹیکنالوجی کی نشاندہی کرنا اور دوسرے مطابقتی (ADAPTIVE) تحقیقی کام کرنا۔ اول الذکر میں ایسی معلومات کا انتخاب اور اس کی درآمد شامل ہے جو مفید اور کارآمد ہوں اور ثانی الذکر یعنی مطابقتی تحقیق میں ان درآمد شدہ معلومات کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالنا شامل ہوتا ہے ۔ اس کے نتیجہ میں پیداواری سطح پر تحقیق اور پھر پیداوار ہوتی ہے ۔ اس طرح ایسے عمل کے باعث تحقیق و ترقی کو پورے سائنسی و ٹیکنالوجی کے نظام سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جو خود ملک کے معاشرتی و معاشی نظام پر منحصر ہوتا ہے ۔ اس طرح سائنسی و ٹیکنالوجی کی پالیسی قومی ترقی کی پالیسی کے ایک جزو لاینفک کے طور پر اُبھرتی ہے ۔ اس صورتحال میں میری تجویز یہ ہے کہ ایک ترقی پذیر ملک کی حیثیت میں پاکستان کو متذکرہ بالا تحقیق کی سمت کے ان مرحلوں کو مخالف سمت میں حسب

ذیل دو طریقوں سے استعمال کرنا چاہیئے۔

۱: ہمیں بہت بڑی حد تک اطلاقی و مطابقتی تحقیق پر اپنے وسائل کو مرکوز کرنا چاہیئے اور اگر یہ نہیں تو کم از کم اسی حد تک جس حد تک ترقی یافتہ ممالک کرتے ہیں یعنی جملہ تحقیقی کام کا ۸۵ سے ۹۰ فیصد تک۔ اس طرح بنیادی تحقیقی کام تقریباً پندرہ فیصد تک رہے۔

۲: ہمیں اپنے کام کا آغاز ہی ٹیکنالوجی کی منتقلی تحقیق اور ترقی سے کرنا چاہیئے نہ کہ اطلاقی اور بنیادی تحقیق سے۔ یہ آخر الذکر اس وقت ضروری ہوں گے جب مطابقتی تحقیق اور ترقی کے نتائج سامنے آئیں گے اور جو مسائل اُٹھینگے ان کو حل کرنا ضروری ہوگا۔ اس طرح گو کہ یہ مسلّمہ تحقیقی کام کے فارمولا کا اُلٹ ہوگا، مگر ایسی ہی حکمت عملی سے ترقی پذیر ممالک کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں گے اور تحقیق سے ترقی اور ترقی سے پیداوار کی جانب قدم اُٹھایا جا سکے گا اور ملک کی صنعتوں سے راست رابطہ قائم ہو سکے گا۔ اس طرح مقامی وسائل کا استعمال کرتے ہوئے جہاں موزوں فنیات کو فروغ دیا جائے اور اس کا بھرپور فائدہ اُٹھایا جائے خصوصاً توانائی، کھاد (فرٹیلائزر) چھوٹی فارم مشینری، سیم و تھور کے مسائل وغیرہ کے حل کی جانب، وہاں ہمیں اعلیٰ فنیات یا ٹیکنالوجی کو اپنے مطابق بنانے اور اپنانے کا حق بھی پوری طرح ہونا چاہیئے۔ تیسری دنیا کے ایسے ممالک جہاں سائنس کی اساس کافی حد تک نشوونما پا چکی ہو اور جہاں اعلیٰ فنیات کو جذب کر کے اس کا صحیح استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہو، جیسا کہ ایک حد تک پاکستان میں، وہاں انہیں صرف موزوں فنیات پر قانع ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لئے توانائی کے وسائل کی کمی کے باعث جوہری فنیات کا حصول، شمسی توانائی کی فنیات کا حصول، کمپیوٹر اور خورد الکٹرانیات کی فنیات کا حصول، زمین، پانی کے جنگلات، معدنیات اور سمندر کے وسائل دریافت کرنے کے لئے خلائی فنیات کا حصول بھی بیحد ضروری ہے۔ ہماری صلاحیت کے پیش نظر یہ تمام فنیات بھی ہمارے لئے موزوں فنیات بن جاتی ہیں۔ ۱۹۷۹ء کی اقوام متحدہ کی سائنس و ٹیکنالوجی برائے ترقی کی کانفرنس میں "۷۷ ممالک کے گروپ" نے اپنے اس حق کے لئے جو آواز اٹھائی تھی وہ ترقی یافتہ ممالک کیلئے صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ وہ کس طرح ایک ایسے نئے معاشی نظام کے قیام پر راضی ہو جاتے جہاں وسائل کی بہتر تقسیم ہوتی اور جہاں دنیا میں سائنس اور معاشی طاقت دونوں پر سے ان کی اجارہ داری اگر ختم نہ ہو جاتی تو کم از کم کمزور ضرور ہو جاتی۔ پاکستان میں پُرامن مقاصد کے لئے جوہری توانائی کے پروگرام میں جس طرح باہر سے رکاوٹیں کھڑی کی گئیں ان سے اس ملک کو یہ [illegible] واقف ہے۔ اور جب وہاں وہ [illegible] اس عزم سے بھی [illegible] آگاہ ہے کہ یہ ملک جوہری توانائی کی ٹیکنالوجی انشاءاللہ حاصل کر کے رہے گا تاکہ اپنے قومی وسائل کو ترقی دے سکے اور معاشرتی و معاشی ترقی سے ایک ایسے بہتر و خوشحال معاشرہ کی تشکیل کر سکے جس میں سب کو ان کے حقوق اور

تقریباً برابر کے مواقع میسر ہوں جو اسلامی نظام کے بنیادی اصولوں میں شامل ہے ۔ ولی برانٹ (WILLY BRANDT)
رپورٹ (۱۹۷۹ء) میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ معاشی و معاشرتی ترقی کے باعث آبادی کے اضافہ
کی رفتار گھٹ جاتی ہے اور جن ممالک میں شرح پیدائش قریب کے چند سالوں میں کم ہوئی ہے وہ وہی ہیں جن میں
ایسی ترقی کے فوائد زیادہ وسیع پیمانے پر آبادی میں پہنچے ہیں ۔ چین نے جس کی آبادی ایک ارب ہے، اس نے
اپنی شرح پیدائش ۲٫۳ فیصد سے گھٹا کر ۱۹۷۰ء عشرہ میں ایک فیصد کرلی ہے ۔ اس طرح دو ہزار عیسوی
تک اس کی آبادی کے اضافے کی رفتار صفر ہو جائے گی ۔

ملک میں سائنس و ٹیکنالوجی پالیسی کے نفاذ سے ایسی پالیسی ہمیشہ کے لیے نہیں بن جاتی بلکہ وقتاً فوقتاً ان کا
جائزہ لیتے رہنا پڑے گا ، ضرورت کے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں بھی لانی ہوں گی ۔ میری رائے میں ایک خود مختار
ادارہ ایسی پالیسی پر نظر رکھنے اور اس کی حسب ضرورت تبدیلیوں کو بنانے کے لئے قائم ہونا چاہیئے جو نیشنل انسٹی ٹیوٹ
آف پالیسی اسٹڈیز کہلایا جاسکتا ہے ۔ جس میں سائنس پالیسی کے علاوہ معاشی ، صنعتی اور معاشرتی پالیسیوں
پر بھی تحقیق کام ہو سکے گا ۔ اس ادارہ کی حیثیت مشاورتی رکھی جائے ۔ ایسے انسٹی ٹیوٹ کئی بیرونی ممالک میں
کام کر رہے ہیں اور اپنے ملک کیلئے مستقبل کی ضروریات کا تعین کرتے رہتے ہیں چنانچہ آج کل تمام ترقی یافتہ ممالک
دو ہزار عیسوی تک اپنی ایسی تمام ضروریات کا اندازہ لگانے میں مصروف ہیں ۔

سائنس و ٹیکنالوجی پر خرچ

صدرِ گرامی ! سائنس و ٹیکنالوجی کے نظام [illegible] طریقہ پر منظم کرنے [illegible]
نتائج حاصل کرنے کے لئے چند لوازمات کی تکمیل ضروری ہوتی ہے ۔ ان میں سائنس و ٹیکنالوجی پر خرچ ، افرادی قوت ،
چند بنیادی سائنسی صنعتیں اور ایک اعلیٰ معلوماتی نظام شامل ہیں ۔ یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ
تحقیق و ترقی (R & D) پر خرچ ہونے والی رقم اور ملک میں تکنیکی ترقی اور اس کے نتیجہ میں معاشی ترقی میں
براہ راست تعلق ہے ۔ OECD کے ایک جائزہ کے مطابق دنیا میں تحقیق و ترقی پر کل خرچ ۹۶٫۵ بلین ڈالر
آتا ہے ۔ جس میں تیسری دنیا کے ممالک کا حصہ ۲٫۸ بلین سے بھی کم ہے ۔ ترقی یافتہ ممالک اپنی مجموعی قومی پیداوار
(G N P) کا ۲ سے ۴ فیصد تحقیق و ترقی پر خرچ کرتے ہیں اس کے برخلاف تیسری دنیا کے اکثر ممالک ایک فیصد
سے بھی کہیں کم اس مد میں خرچ کرتے ہیں ۔ ترقی یافتہ ممالک میں حکومت کے علاوہ ملک کے بڑے بڑے صنعتی ادارے
بھی خود اپنے تحقیق اور ترقیاتی ادارے بناتے اور چلاتے ہیں ۔ مگر چونکہ ہمارے ملک میں ایسے نجی تحقیقی ادارے
عام طور پر موجود نہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ کم از کم ان پر کوئی ٹیکس لگایا جائے تاکہ اس سے صنعتی پیداوار

کے مسائل کو حل کیا جا سکے ۔ پاکستان اپنی جملہ قومی پیداوار کا صرف ۱۵ر فیصد تحقیق و ترقی پر خرچ کرتا جو ناقابل بیان حد تک کم ہے ۔ یہ کہنا کہ یہ ملک غریب ہے اس لئے اس سے زیادہ خرچ نہیں کیا جا سکتا زیادہ صحیح نہیں ہے ترقی پذیر ممالک کو تو اس مد پر اور بھی زیادہ خرچ کرنا چاہیئے تاکہ غربت اور خوشحالی کے درمیان کا فرق نسبتاً کم عرصہ میں ختم ہو سکے ۔ اس مد پر خرچ جائز ہی نہیں لازمی ہے اگر ملک معاشی و معاشرتی بہتری کی جانب جانا چاہتا ہے ۔ ملک میں سادہ زندگی کی روایات کو پھر قائم کر کے اور غیر ضروری برآمدات کو بند کر کے زیادہ سے زیادہ وسائل کے ذریعے تحقیق و ترقی پہ زیادہ مدخولات (INPUTS) کی فراہمی بیحد ضروری ہے ۔ یہاں یہ یاد رہے کہ ہمارا پڑوسی ملک اپنی جملہ قومی پیداوار کا ایک فیصد تحقیق و ترقی پر خرچ کرتا ہے اور نتائج ظاہر ہیں ۔ عالمی بنک کے مطابق وہ تمام ممالک جن کی فی کس سالانہ آمدنی دو ہزار پانچ سو روپے یا اس سے کم ہے غریب ممالک تصور کئے جاتے ہیں ۔ چنانچہ ایشیا اور افریقہ کے اکثر ممالک جن میں پاکستان بھی شامل ہے اسی زمرہ میں آتے ہیں ۔ پاکستان کی فی کس سالانہ آمدنی صرف ۲۱۶۵ روپے ہے ایسے ہی غریب ممالک کیلئے اقوام متحدہ کے عملی منصوبہ ۱۹۷۱ء نے یہ سفارش کی تھی کہ یہ ممالک بھی اپنی قومی پیداوار کا کم از کم ایک فیصد ۱۹۸۰ء تک تحقیق و ترقی پر خرچ کریں ۔ اگر اس ہدف کو ہمیں آج سے ۵ سال بعد بھی یعنی ۱۹۸۵ء تک بھی حاصل کرنا ہو تو ایک فیصد کے حساب سے کل رقم ۶۵۰۰ ملین روپے درکار ہوگی اور چونکہ اس وقت اس مدت میں سالانہ رقم دو سو ملین روپے ہوتی ہے اس لئے پنج سالہ منصوبہ بندی کی تکمیل کیلئے مزید ۵۵۰۰ ملین روپے درکار ہوں گے ۔ تحقیق و ترقی پر موجودہ خرچ ہونیوالی رقم یعنی دو سو ملین روپے سالانہ ہمارے قومی ترقیاتی بجٹ کا ۷ر۱ فیصد اور کل بجٹ کا ۴ر فیصد ہوتی ہے ۔ اس طرح اس مد میں فی کس خرچ صرف تین روپے ہوتا ہے جب کہ یونیسکو نے اپنے ایک جائزہ کے مطابق ترقی پذیر ممالک کیلئے بیس روپے فی کس کی سفارش کی ہے ۔ ان اعداد و شمار کو گنوانے سے میرا یہ قطعی مقصد نہیں ہے کہ صرف ایک خاص فیصد رقم خرچ کرنے سے ہم سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کر لیں گے ۔ اس کے ساتھ اور لوازمات اور مدخولات کی بھی ضرورت ہے جن میں شاید سرفہرست سائنسدانوں اور انجینئروں کی محنت و لگن اور احساس ذمہ داری ہے ۔ لیکن ہمیں اس سے اس بات کا اندازہ ضرور ہونا چاہیئے کہ غریب ممالک کیلئے بین الاقوامی طریقہ سے قائم کی ہوئی معیارات اور مدخولات سے بھی ہم ابھی کتنی دور ہیں اور "مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی" یہاں شاید پوری طرح صادق نہ آئے ۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گذشتہ سال لاہور میں سائنس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر صدر محترم کا یہ قابل قدر اعلان کہ حکومت اپنے بجٹ کا ایک فیصد سائنس و ٹیکنالوجی پر خرچ کرے گی ملک میں سائنس اور سائنسی برادری کے لئے بڑا ہمت افزا اور باعث تقویت ہے اور اس کیلئے ہم سب تشکر گذاری کے جذبات رکھتے ہیں ۔

افرادی قوت

ان موازنات کا دوسرا اہم جز سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں افرادی قوت ہے۔ آزادی کے وقت ملک میں دو یونیورسٹیاں قائم تھیں اور آج اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اٹھارہ یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں لیکن اس کے باوجود ملک کی ضروریات کے لئے افرادی قوت مکمل طور پر موجود نہیں ہے۔ یونیسکو کے اندازے کے مطابق ترقی پذیر ممالک کی ہر دس لاکھ آبادی پر چودہ سو پیشہ ور سائنسدان اور انجینئر ہونے چاہئیں جن کا دس فیصد تحقیق و ترقی سے متعلق ہو۔ اس حساب سے ملک میں سائنس و ٹیکنالوجی کے نظام سے منسلک پیشہ ور کارکنوں کی کل تعداد موجودہ منصوبہ کے اختتام یعنی ۱۹۸۳ تک ایک لاکھ بائیس ہزار اور تحقیق و ترقی میں مصروف کارکنوں کی تعداد بارہ ہزار دو سو بنتی ہے لیکن اس وقت حقیقت حال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں افرادی قوت پانچ ہزار سے بھی کم ہے۔ اور ہماری ضروریات کا بمشکل چالیس فیصد۔ اس افرادی قوت میں وہ تمام کارکن شامل ہیں جو یونیورسٹیوں، ریسرچ کی تجربہ گاہوں اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کام کرتے ہیں۔ پاکستان کے ابتدائی ادوار میں بلکہ چند سال قبل تک افرادی قوت کی ضروریات کا اندازہ لگانے اور اس سلسلے میں منصوبہ بندی کی کبھی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ چنانچہ ابتدائی عرصہ میں تربیت یافتہ افراد کو اکثر و بیشتر ایسے فرائض کی انجام دہی پر لگایا جاتا تھا جن کا ان کی تربیت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ کیونکہ بعض اوقات تو تربیت ہی ایسے میدان میں ہوتی تھی جس کی یہاں ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی یا پھر سربراہ محکمہ نے یہی مناسب سمجھا کہ دفتر میں فائلوں سے نمٹنے کیلئے لگا دیا جائے۔ چنانچہ بیرون ملک سے فارغ التحصیل اور باصلاحیت افراد میں سے چند جو پیشہ ورانہ زندگی کو بچانا چاہتے تھے وہ BRAIN DRAIN کا اور جو یہاں رہ گئے وہ مایوسی کی زندگی گزار کر DRAIN BRAIN کا شکار ہوتے رہے۔ اب تو یقیناً حالت بہتر ہے۔ خود صدر مملکت کی اس معاملہ میں دلچسپی سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔ امریکہ اور انگلستان سے ہمارے ماہر ڈاکٹروں کی ہر سال آمد، ایک مختصر عرصہ کیلئے، ہی سہی اس قرض کو چکانے کی طرف ایک قدم ہے جو ان ماہرین نے اپنے ملک سے یہاں کی تعلیم و تربیت کی شکل میں لیا تھا۔ اسی طرح UNDP کی امداد سے TEKTON اسکیم کے تحت وزارت منصوبہ و افرادی قوت کی زیر سرپرستی بیرون ملک رہنے والے پاکستانی ماہرین سائنس و انجینئری کا مختصر قیام بھی ہمارے لئے مفید ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود صدر محترم میں یہ عرض کروں گا کہ BRAIN DRAIN کے اس مسئلے کے متعلق اونچی سطح پر غور کرنے کی فوری ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں ایک مناسب پالیسی کی تشکیل بھی ضروری ہے۔ اکثر یونیورسٹیوں میں پچیس سے چالیس فیصد تک ماہر اساتذہ اب بھی باہر کے ملکوں میں ملازمت کر رہے ہیں اور اپنی یونیورسٹیوں سے طویل چھٹیاں لئے ہوئے ہیں جس کا اثر معیار تعلیم پر پڑ رہا ہے۔ یہی صورت حال کچھ تحقیقی اداروں کے افراد اور نچلے درجے کی ٹیکنیکل افرادی قوت

کے ساتھ بھی ہے۔ ہمارا اصل سرمایہ ہماری افرادی قوت ہے جو اپنے اپنے کام میں مہارت حاصل کر چکی ہے۔ لہٰذا اہم قومی وسیلہ کو اتنی آسانی سے صرف زرمبادلہ کی خاطر بلا روک ٹوک باہر جانے کی اجازت دینا ملک کے طویل تر مفادات کیلئے مناسب نہیں ہے اور ملک میں ترقی کیلئے خودکفالت کے اُصول کے منافی ہے۔

تحقیق میں یونیورسٹیوں کا کردار

یونیورسٹیاں تحقیق و ترقی کے کام کیلئے اہم مراکز ہیں۔ ہماری تحقیقی مہارت کا بیشتر حصہ یونیورسٹیوں میں موجود ہے لیکن چند ایک یونیورسٹیوں کو چھوڑ کر عام طور پر ہمارے اِن اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تحقیق پر زور نہیں ہے اور یونیورسٹیوں نے وہ کردار صحیح طریقہ پر ادا نہیں کیا جسکی ان سے جائز توقع تھی۔ یہ بات قابلِ تسلیم ہے کہ ان کو وہ تمام تحقیق کی سہولتیں نہ مل سکیں جو انہیں میسر آنی چاہیے تھیں اور سوائے ایک یونیورسٹی کے کسی اور یونیورسٹی کے بجٹ میں تحقیق کی مد میں کوئی رقم مختص نہیں کی گئی۔ صورتحال یہ ہے کہ بجٹ کا اسّی سے پچاسی فیصد حصہ تنخواہوں پر صرف ہوتا رہا ہے۔ لیکن جہاں کام ہو سکتا تھا وہاں بھی نہ ہوا۔ اعلیٰ تعلیم اور تحقیق دونوں یونیورسٹیوں کے بنیادی فرائض میں سے ہیں اور دونوں کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بغیر تحقیقی کام کے اعلیٰ تعلیم آگے نہیں بڑھ سکتی اور وہ مہارت حاصل نہیں ہو سکتی جس کی ملک کو ضرورت ہے اگر کچھ تحقیقی کام ہوا بھی ہے تو نوعیت زیادہ تر بنیادی یا نظریاتی رہی ہے۔ یوں تو مغرب میں یونیورسٹیاں بنیادی تحقیق کے علاوہ اب اطلاقی و طلاقتی تحقیق میں بھرپور حصہ لیتی ہیں ہماری یونیورسٹیاں اب بھی یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد یونیورسٹی کے ماڈل پر کام کر رہی ہیں۔ اُنہیں ملک کی ترقی کے لئے مختلف مسائل کو حل کرنے کی معاشرتی ذمہ داری قبول کرنی چاہیئے۔ یونیورسٹیوں میں یقینی طور پر بنیادی سطح پر کام ہونا چاہیئے لیکن ترقی پذیر معاشرہ کے مسائل کو اوّلیت دی جانی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں میری گذارش ہے کہ یونیورسٹیوں میں تحقیقی صلاحیت کو بڑھانے اور ایسی سہولتوں میں اضافہ کیلئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ایک پنج سالہ پلان تیار کرے اور اس منصوبہ کی تکمیل کی جانب ضروری اقدامات کرے۔

معیارِ تعلیم و تحقیق

اب ملک میں یہ بات عام طور پر کہی جانے لگی ہے کہ تعلیم کا معیار (جس میں سائنس کی تعلیم بھی شامل ہے) روز بروز گرتا جارہا ہے۔ اس کو محض بے بنیاد یا غلط افواہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ نہ صرف ترقی یافتہ ممالک میں بلکہ بعض ترقی پذیر ممالک میں بھی ہماری ڈگریوں کو اِن ڈگریوں کے مماثل تسلیم نہیں کیا جارہا ہے اور ہمارے طلباء کو دوبارہ وہی امتحان دینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، جسکی سند وہ اپنے ملک سے لے کر جاتے ہیں۔

بعض ممالک نے ہماری طلب کی ڈگریوں کو جنہیں وہ پہلے تسلیم کرتے تھے اپنی اُس فہرست سے خارج کردیا ہے۔ ان ممالک کے ان اقدام کو محض تعصب اور رقابت پر محمول کرنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ چند سال قبل تک یہی ممالک ہمارے طلباء کو بڑے شوق سے داخل کرتے تھے اور ان کی تعریف کرتے تھے ۔ اس طرح جو کچھ تبدیلی ہوئی ہے وہ پچھلے چند سال میں رو نما ہوئی ہے اور حقیقت پسند سائنسدانوں کی طرح ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس انحطاط کے اسباب و علل کا پتہ چلائیں اور ان کو دُور کرنے کی تدبیریں اختیار کریں۔ مجھے یقین ہے کہ خود ارباب مقتدرہ بھی ہماری ان کوششوں کو پسند فرمائیں گے و [illegible] ن کی مدد کریں گے کیونکہ انہیں بھی اس صورت حال پر گہری تشویش ہے اور انہوں نے نہ صرف اس کا اظہار کیا ہے بلکہ کچھ عملی اقدام بھی کئے جارہے ہیں۔ میری تجویز ہے کہ اس کانفرنس کے دوران ہر شعبہ میں متعلقہ مضامین کے معیار تعلیم سے متعلق بھی غور و خوض کیا جائے۔ اور ایسے ٹھوس اور قابل عمل اقدامات تجویز کئے جائیں جن کے اختیار کرنے سے حالات کی اصلاح ہو سکے۔ اس وقت اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ یونیورسٹیوں میں تحقیق پر پورا زور دیا جائے اور ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگرام بامقصد بنیادی، اطلاقی اور مطابقتی تحقیق کی سطحوں پر قائم کئے جائیں۔ یہ بات شاید بڑی حیرت کیساتھ سُنی جائیگی کہ ہماری تمام یونیورسٹیوں میں اس سال پی ایچ ڈی کی سطح کے بمشکل دس مقالے مکمل ہو سکے ہیں۔

پروفیسر ڈان پرائس مشہور ماہر سائنس پالیسی نے WORLD CITATION INDEX میں مختلف ملکوں کے سائنسدانوں کے تحقیقی پرچوں کی اشاعت کو معیار مقرر کرکے یہ بتلایا ہے کہ امریکی اور یورپی ممالک تو کجا کئی ایشیائی ممالک بھی ہم سے بہتر ہیں اور ہم ایتھوپیا سے اس معاملہ میں کچھ ہی بہتر ہیں۔ تحقیقی کام آج کل انفرادی کوشش سے آگے بڑھ کر اب ایک ریسرچ ٹیم کی حیثیت اختیار کرچکا ہے لہٰذا کسی بھی اہم مضمون میں کسی ایک ادارہ میں تحقیقی کام کرنے کے لئے کم ازکم تین سے چار سائنسی کارکن ہونے چاہئیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر مضمون کے ہر مخصوص شعبہ میں تحقیق کا انتظام ہو۔ سائنسی کارکن اپنے ماحول، اپنے وسائل و تربیت اور علم کے کسی خاص شعبہ کی اہمیت یا ملک کی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر چند مخصوص شعبوں کا انتخاب کرسکتے ہیں اور ساتھ ساتھ ایسے مسائل پر بھی اپنی اجتماعی صلاحیتوں کو استعمال کرسکتے ہیں جہاں مسئلہ کے حل کے لئے مختلف شعبوں کے کارکنوں کے باہمی اشتراک کی ضرورت ہے۔ ملک میں سائنس و ٹیکنالوجی کے مستقبل اور افرادی قوت کی تیاری پر سائنس کے مضامین میں داخلہ کی تعداد بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ دیکھ کر کچھ مایوسی کا احساس ہوتا ہے کہ اب بھی ہماری یونیورسٹیوں میں غیر سائنسی مضامین میں داخلہ کا تناسب سائنسی مضامین سے کچھ زیادہ ہے ۔ مثلاً ۱۹۷۴ء - ۱۹۷۵ء میں ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں کلیہ فنون میں داخل ہونے والے شاگردوں کی تعداد ۸۰۶۱

تھی اور کلیہ سائنس کے شاگردوں کی ۷،۱۸۰ اور ۱۹۷۸ء ۔ ۱۹۷۹ء میں بھی تقریباً یہی صورت حال ہے یعنی کلیہ فنون میں ۸،۷۵۹ اور کلیہ سائنس میں ۸۰۹۱ ۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ سائنس میں داخلوں کی تعداد غیر سائنسی مضامین سے زیادہ ہوتی جاتی تاآنکہ اس کا تناسب دو اور ایک کا ہوجائے ۔ اس سلسلہ میں وزارت تعلیم حکومت پاکستان کو کوئی مناسب پالیسی وضع کرنی چاہیئے ۔ تاکہ طلباء و طالبات کیلئے سائنس کے مضامین میں داخلہ لینے کی جانب رغبت پیدا ہو۔

زیریں تکنیکی افرادی قوت

جب بھی ہم سائنس میں افرادی قوت کی بات کرتے ہیں تو سائنس و ٹیکنالوجی کے نظام کو چلانے کے لئے جو زیریں تکنیکی افرادی قوت کی ضروریات ہیں اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ چنانچہ گزشتہ ۳۲ برس سے کم و بیش ہم یہی کرتے چلے آرہے ہیں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تحقیق کرنے والے تو پھر بھی موجود ہیں ۔ لیکن اس تحقیق کیلئے جو تربیت یافتہ امدادی عملہ چاہیئے وہ ناپید ہے ۔ کچھ کام کرنے والے ضرور ہیں جو غلطیاں کرکے کچھ سیکھ لیتے ہیں اور پھر کام چلاتے ہیں ۔ یونیسکو نے جو تناسب پیشہ ور محقق اور اس کے امدادی پیشہ ور کارکنوں کا تجویز کیا ہے وہ ایک اور چار کا ہے ۔ اگر ہمیں ایک فعال اور مضبوط سائنس و ٹیکنالوجی کا نظام بنانا ہے تو امدادی پیشہ ور عملہ کی تربیت کے مراکز قائم کرنا ہوں گے اور لوگوں کو اس اہم کام کی طرف رغبت دلانے کے لئے خاطر خواہ تنخواہیں بھی دینی ہونگی ۔

سائنسی صنعتیں

ملک میں سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ کیلئے سائنسی آلات کے بنانے اور مرمت کرنے کے مراکز سائنسی شیشہ سازی کی صنعت اور بنیادی سائنسی کیمیکلز کی صنعت کا قیام بے حد ضروری ہے ۔ یہ بنیادی ضرورتیں ہیں اور ان کو مستقلاً درآمد کرکے سائنس و ٹیکنالوجی کا ایک اچھا نظام نہیں چلایا جاسکتا ۔ ملک میں اس وقت لاکھوں بلکہ کروڑوں روپوں کا سائنسی سامان مرمت کی سہولتوں کے موجود نہ ہونے کے باعث بیکار پڑا ہے اور استعمال میں نہیں لایا جاسکتا جبکہ ان کی درآمد پر غیر ملکی زر مبادلہ کی کثیر رقم لگائی گئی ہے ۔ اُمید ہے کہ ان سہولتوں کے قیام کی جانب بھی توجہ دی جائے گی ۔

سائنسی معلوماتی نظام

کسی بھی ملک کے سائنس و ٹیکنالوجی کے نظام کو ایک اچھے اور منظم معلوماتی نظام کے بغیر تیس

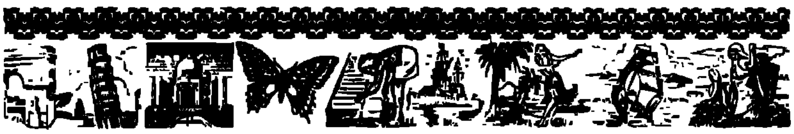
چلایا جاسکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس کے اِن لوازمات میں معلوماتی سہولتوں کی کمی پاکستان میں سب سے زیادہ شدید طریقہ پر محسوس کی جاتی ہے۔ یوں تو ملک میں وزارت سائنس و ٹیکنالوجی کے تحت ایک سائنسی معلوماتی مرکز (PASTIC) قائم ہے۔ لیکن اس نے ابھی تک کوئی خاطر خواہ ترقی نہیں کی۔ اس کی ترقی اور اس کے صحیح کردار کی ادائیگی کے لئے اس مرکز پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی شاندار ترقی کی بدولت اب سائنسی مواد دنیا کے کسی حصّہ سے بھی چند منٹوں میں حاصل کیا جاسکتا ہے اور نہ صرف ترقی یافتہ بلکہ ترقی پذیر اقوام بھی اس سے مستفید ہو رہی ہیں اُمید ہے کہ ہمارا ملک بھی اس نظام سے منسلک ہو کر جلد اس عالمی معلوماتی بازطلبی (RETRIEVAL OF WORLD INFORMATION) کی سہولتوں کو قائم کرسکے گا جس سے تحقیق کے لئے ضروری سائنسی مواد کے حصول کا مسئلہ حل ہوسکے گا۔ یہ بات تجربہ و مشاہدہ کی بنیاد پر بڑی تکلیف دہ ہے کہ یونیورسٹیوں کا کتابوں اور تحقیقی رسالوں کا بجٹ نہ صرف کم ہے بلکہ کافی برسوں سے اتنا ہی ہے جبکہ ہر کتاب اور رسالہ کی قیمت یا سالانہ چندہ پانچ گنا بڑھ گئے ہیں۔ بجٹ کی کمی کے باعث یہ مشکلات سمجھ میں آتی ہیں۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ ابھی تک یونیورسٹیوں کے درمیان بین الجامعاتی لائبریری کے تبادلے کے سلسلہ میں کوئی انتظام نہیں ہوا ہے۔ اُمید ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اس سلسلہ میں قواعد و ضوابط اور طریقۂ کار وضع کرے گی۔

بین الاسلامی اِشتراک

جنابِ والا! سائنس اپنی نوعیت میں بین الاقوامی ہے اور ملک میں اس کے فروغ کیلئے دوست ممالک کے ساتھ اشتراک فائدہ مند ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسے ممالک جن کے ساتھ پاکستان کا ذہنی، قلبی اور مذہبی لگاؤ ہے یعنی دنیا کے مسلمان ممالک۔ آج دنیا میں نوے کروڑ مسلمان بستے ہیں اور وقت کے ساتھ اب ایک دوسرے سے قریب تر آنے لگے ہیں۔ تین اسلامی سربراہ کانفرنسوں کے انعقاد اور مسلمان ممالک میں اخوت اور اِتحاد کی فضا سے اس بات کا پورا ثبوت ملتا ہے کہ اِسلامی اُمّہ اب بیدار ہوگئی ہے۔ اور پندرھویں صدی ہجری اِنشااللہ اُمّہ کیلئے خوش بختی، ترقی و خوشحالی کی صدی ثابت ہوگی۔ اپنے مشترکہ معاشی مسائل کو حل کرنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی خاطر تمام مسلم اُمّہ کو اپنے وسائل یکجا کرکے سائنس و ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کے ثمرات سے مستفید ہونا چاہیئے۔ جنابِ صدر! مسلم ممالک کے درمیان اتحاد پیدا کرنے اور اُنہیں ایک اُمّہ میں شامل ہونے کا احساس دلانے میں خود آپ کی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ مسلمان ممالک میں آج وسائل بھی بیحد اچھے ہیں اور سائنسی و تکنیکی صلاحیت بھی۔ اِن کے باہمی

اشتراک سے مسلمانوں سے غربت، بیماری اور ناخواندگی ہی نہیں دُور ہو سکتی بلکہ ایک ایسا خوشحال ترین معاشرہ تشکیل پاسکتا ہے جو ساتھ ساتھ اسلامی اقدار سے بھی مالا مال ہو۔ اس سلسلہ میں اسلامی سائنس فاؤنڈیشن کا قیام تمام مسلمان سائنسدان اور انجینئر محققین کیلئے ایک مژدۂ مسرت ہے۔ اور اُمید ہے کہ پاکستانی سائنسدان اور انجینئر اس ذریعہ دست سہولت سے پوری طرح استفادہ کریں گے اور اس طرح مسلم اُمّہ کی ترقی و خوشحالی کی جانب اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے مسلم اُمّہ کو خوشحالی اور کامیابی سے سرفراز فرمائے۔

شکریہ





معتمد سائنٹفک سوسائٹی
جناب میجر آفتاب حسن صاحب سالانہ
روداد پیش کر رہے ہیں



معتمد مقالہ مجلس انتظامیہ
جناب ہارون رشید نجمی صاحب
مہمانوں کا شکریہ ادا کر رہے ہیں

مہر افشاں عثمانی ۔

رپورٹ سائنس کانفرنس

آجکل کی ترقی یافتہ دنیا میں سائنس کی اہمیت اور افادیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ ہم جو کہ ایک ترقی پذیر ملک کے باشندے ہیں سائنس کی ترقی کی ضرورت کو کچھ زیادہ ہی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن صرف سوچ لینا یا محسوس کر لینا ہی کافی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس کی ترقی میں جو رکاوٹیں ہمارے ملک میں موجود ہیں ان کو جلد از جلد دور کیا جائے۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے جب سائنس خاص و عام میں یکساں طور پر سمجھی اور جانی جائے۔

ہماری قومی زبان اردو ہے بدقسمتی سے گزشتہ ۳۴ برس میں قومی زبان کی اہمیت ٹھیک طور سے واضح نہیں ہو سکی اور سائنس کی ترقی میں یہ ہی امر سب سے بڑی رکاوٹ بنا رہا۔ کیونکہ جب تک کسی بھی علم کو ملک کی عام فہم زبان کے ذریعے متعارف نہیں کرایا جائے یہ ناممکن ہے کہ اس ملک کی پوری قوم اس سے مستفید ہو سکے۔

سائنٹفک سوسائٹی پاکستان نے گزشتہ بیس برسوں سے یہ عظیم کام اپنے ذمے لیا ہے کہ ملک میں ہونے والی سائنسی ترقی، تحقیقات اور ایجادات کو قوم سے متعارف کرائے۔ اور اسکے لیے اس سوسائٹی کے دیگر کاموں کے علاوہ سائنس کانفرنسوں کا انعقاد شروع کیا جبکی مکمل کارروائی پاکستان کی قومی زبان اردو میں ہوتی ہے۔ ان کانفرنسوں کی غیر معمولی کامیابی اس بات کی ضامن ہے کہ ہماری قوم کے ہر فرد کو اپنی قومی زبان سے لگاؤ اور ملک کی سائنسی ترقی سے بے حد دلچسپی ہے۔

سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کی بیسویں قومی سائنس کانفرنس اس سال ۲۱ اگست تا ۲۶ اگست قائد کے شہر کراچی کے ایک منفرد تعلیمی ادارے وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج میں منعقد ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلے بیشتر کانفرنسیں جامعات میں ہوتی رہی ہیں۔ اس لیے اس بار اردو سائنس کالج کا بطور میزبان انتخاب بھی انفرادیت کا حامل تھا۔ اپنے محدود وسائل کے باوجود اس قومی ادارے نے کانفرنس بہ حسن خوبی منعقد کرائی



استقبالیہ کی تیاری



تیاری کے بعد



استقبالیہ



استقبالیہ کا انتظار



استقبالیہ کا اضطراب

جسکے لیے اس ادارے کا تدریسی، غیر تدریسی عملہ اور طلبہ وطالبات اور اہلیانِ کراچی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سائنس کانفرنسیں کیونکہ قومی سطح پر ہوتی ہیں اسلئے میزبان ادارے کی ذمہ داریوں میں ملک کے دوسرے شہروں سے آنے والے مندوبین کو ٹھہرانے اور انکو دیگر سہولتیں فراہم کرنا بھی ہوتا ہے اسطرح کانفرنس مجوزہ دن سے چار دن قبل ہی شروع ہو جاتی ہے۔ مندوبین کی آمد اس بار بھی ۱۹ اگست سے شروع ہو گئی تھی۔ کانفرنس کا باقاعدہ افتتاح ۲۱ اگست بروز جمعہ صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاالحق کو کرنا تھا۔ جو کہ اپنی مصروفیات کے باعث تشریف نہ لا سکے۔ اسلئے افتتاح سندھ کے سینیئر وزیر جناب میر رسول بخش تالپور صاحب نے کیا۔

۲۱ اگست کو شاہراہِ جامعہ کی رونق صبح سے ہی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کانفرنس کا میزبان اردو سائنس کالج وسط شاہراہِ جامعہ پر عزیز بھٹی پارک کے نزد واقع ہے۔ اس سڑک کے دونوں جانب رنگ برنگے بینروں سے سجے ہوئے تھے۔ جن پر خوش آمدید اور دوسرے استقبالیہ نعرے لکھے ہوئے تھے۔ کالج کی عمارت کی سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ گو کہ کالج کو سجانے میں انتہائی سادگی سے کام لیا گیا تھا۔ اسکے باوجود پر اثر عبارتوں کے بینر مندوبین کے لیے بے حد دلچسپی کا باعث بنے۔ کالج کے صدر دروازے پر خوش آمدید کے ساتھ ساتھ اردو کی اہمیت سے متعلق بینر آویزاں تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی کالج کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ ایک مغرب سمت، دوسری مشرقی سمت جبکہ درمیان میں میجر آفتاب حسن ہال تھا۔ دونوں سمتوں میں دو بڑے بڑے میدان ہیں۔ مغربی میدان کو افتتاحی تقریب کے لیے سجایا گیا تھا۔ تقریباً پندرہ سو (۱۵۰۰) مندوبین و مدعوئین کے لیے ایک عظیم الشان پنڈال میں نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ مہمانانِ گرامی کو اپنی مخصوص نشستوں تک رہنمائی کے لیے اساتذہ وطلبہ وطالبات کی ایک ٹیم موجود تھی۔ اسی مغربی میدان سے منسلک راہداری میں مختلف کمروں کو شعبہ جاتی جلسوں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ جن پر جلی حروف میں متعلقہ شعبے کا نام درج تھا۔

۲۱ اگست ۱۹۸۱ء کو بعد نمازِ جمعہ سائنسدانوں اور سائنس سے دلچسپی رکھنے والوں کا ایک سیلاب اردو سائنس کالج کی عظیم عمارت میں پہونچ چکا تھا۔ جس کا اظہار باہر کھڑی ہوئی کاریں لاتعداد گاڑیوں، موٹر سائیکلوں اور بسوں سے ہو جاتا تھا۔ جن کو کنٹرول کرنے کے لیے پولیس موجود تھی۔ مہمانِ خصوصی کی آمد سے قبل ہی بیشتر نشستوں پر لوگ تشریف فرما تھے۔ اور کے۔ پی۔ ٹی کے بینڈ کی مدھر دھنوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مہمانِ خصوصی کے استقبال کے لیے ایک استقبالیہ کمیٹی ترتیب دی گئی تھی جس کے ارکان قطار میں کھڑے ہو کر مہمان کے منتظر تھے۔ سندھ کے سینیئر وزیر جناب رسول بخش



ڈاکٹر اقتدار حسین ریڈر شعبہ ریاضی کا خطبہ
پڑھ رہے ہیں



شعبہ تعلیمات و عمرانیات



شعبہ زرعی



ڈاکٹر عطاء الرحمٰن اپنا خطبہ پڑھ
رہے ہیں



ڈاکٹر جی - میانہ شعبہ کیمیا کا خطبہ پڑھ رہے
ہیں

تالپور وقتِ مقررہ پر جلسے ہی کالج کی عمارت میں داخل ہوئے اردو سائنس کالج کے پرنسپل پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب کی قیادت میں استقبالیہ کمیٹی نے ان کا استقبال کیا اور اس کمیٹی کے ارکان کی ہمراہی میں مہمانِ خصوصی افتتاحی تقریب کے پنڈال میں تشریف لائے اور اسکے ساتھ ہی کانفرنس کے پہلے دن کے جلسے کی کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ معلن کے فرائض سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان کے شریک معتمد ڈاکٹر سید حامد محمود نے انجام دیئے۔ مہمانِ خصوصی اور دیگر معتدر حضرات نے اسٹیج پر اپنی نشست سنبھالی اسکے بعد تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ ملک کے مشہور قاری اور اردو کالج کے سابق طالبعلم جناب قاری شاکر قاسمی صاحب نے تلاوت کلام پاک کی۔ جس کے فوراً بعد اس موقع پر شائع ہونے والے خصوصی مجلے کی تقسیم مندوبین میں شروع ہوئی۔

پھر انیسویں کانفرنس کے صدر جناب محمد اسلم خان صاحب نے بیسویں کانفرنس کے صدر کو کرسیٔ صدارت پیش کی۔ بیسویں کانفرنس کے صدر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر احمد محی الدین ہیں۔ پھر اس کانفرنس کے میزبان اور اردو سائنس کالج کے پرنسپل پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن صاحب نے مہمانِ خصوصی کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا جس میں استقبالی کلمات کے ساتھ ساتھ اردو کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کیا۔ اور سائنسی تعلیم کے فروغ میں اردو کی حیثیت واضح کی اور یہ بھی بتایا فرمایا کہ اگر اردو کو اس کا صحیح مقام دیا جاتا ہے تو اردو یونیورسٹی کا قیام ناگزیر ہے۔ پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن نے کراچی کے مخیّر حضرات اور ان اداروں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے کانفرنس کے انعقاد میں کالج کی بھرپور مدد کی۔ اسکے بعد مہمانِ خصوصی جناب رسول بخش تالپور نے خطبۂ افتتاحیہ ارشاد فرمایا جس میں آپ نے بھی قومی زبان کو سائنسی علوم کے فروغ کا ذریعہ بنانے پر زور دیا۔ اور فرمایا یہ بات بالکل صحیح نہیں کہ اردو زبان میں سائنسی اصطلاحات کی کمی ہے۔ اردو کو ایک وسیع زبان قرار دیتے ہوئے آپ نے کہا کہ اردو کو ہر درجے پر نافذ کرنا حکومت کے ساتھ ساتھ عوام کا بھی فرض ہے۔

تالپور صاحب کے بعد جناب ڈاکٹر احمد محی الدین نے اپنے صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا۔

آپ نے فرمایا کہ ہم اگر چاہتے ہیں کہ سائنسی علوم گھر گھر پھیلیں اور ہمارے ملک کا ہر فرد ملک کی ترقی میں برابر کا حصہ دار بنے رہو تو یہ جب ہی ممکن ہے کہ سائنسی علوم کو اردو زبان میں پڑھایا جائے۔

جناب پروفیسر احمد محی الدین کے بعد سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان کے معتمد اور سائنس کانفرنس کے روحِ رواں میجر آفتاب حسن سے درخواست کی گئی کہ وہ سوسائٹی کی سالانہ رپورٹ پیش فرمائیں



کتابوں کی نمائش



سندھ کے وزیر تعلیم جسٹس غوث علی شاہ سائنسی کتابوں کی نمائش کا افتتاح فرما رہے ہیں

بخ ملیب الرحمٰن بنک کے اسٹال پر





طلبہ کا اسٹال



نمائش میں سائنس ڈائجسٹ کا اسٹال

ناسازیٔ طبیعت کے باعث جناب آفتاب حسن نے مختصر کلمات میں سامعین سے خطاب کیا اور بعد ازاں سائنس کالج کے منتظمین کو مبارکباد پیش کی جس کے بعد سوسائٹی کی سلور جوبلی کانفرنس کے شریک معتمد ڈاکٹر سید حامد محمود صاحب نے [illegible] کیونکہ اس سال سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کے قیام کو ۲۵ سال پورے ہو چکے تھے اسی لئے سوسائٹی کا جشن سیمیں بھی [illegible] کے ساتھ ہی منایا جا رہا تھا اسی لئے سوسائٹی کے سابق صدور جن میں پاکستان کے مایۂ ناز سائنسدان ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، ڈاکٹر غوث محمد خٹک، ڈاکٹر ظفر علی ہاشمی، ڈاکٹر ظفر علی ہاشمی، ڈاکٹر ایم۔ایم قریشی، اور ڈاکٹر امیر محمد شامل تھے۔ کو نشانِ سوسائٹی عطا کیا گیا۔ جو کہ مہمانِ خصوصی نے اپنے ہاتھوں سے ان حضرات کو عطا کیے۔ اسکے بعد جلسے کی کاروائی کی آخری تقریر مقامی مجلس انتظامیہ کے معتمد جناب ہارون رشید نجمی کی تھی جنہوں نے تمام مندوبین، صدرِ مجلس، مہمانِ خصوصی اور دیگر معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اسکے بعد مقامی مجلس انتظامیہ کے شریک معتمد جناب ڈاکٹر وقار احمد زبیری صاحب نے [illegible] اس افتتاحیہ تقریب کے اختتام پر راہداری میں موجود کے۔پی۔ٹی [illegible] جس پر تمام شرکاء و مندوبین احتراماً اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے۔ [illegible]

راہداری میں موجود کے۔پی۔ٹی کے بینڈ نے قومی ترانے کی دھن بجائی جس پر تمام شرکاء و مندوبین احتراماً اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے۔ ترانے کے اختتام پر اعلان کیا گیا کہ مشرقی میدان میں تمام خواتین و حضرات کے لئے پر تکلف عصرانے کا اہتمام کیا گیا ہے اور یوں پہلے دن کی کاروائی کا پہلا حصہ اختتام پذیر ہوا۔ عصرانہ کا اہتمام کراچی پورٹ ٹرسٹ کی جانب سے کیا گیا تھا۔

اسکے بعد اذان کے ساتھ ہی شرکاء کی بڑی تعداد مسجد کی جانب روانہ کی گئی۔

بعد نماز مغرب کانفرنس کے دوسرے دور کا آغاز ہوا۔ جو کہ ابنِ سینا لیکچر کے نام سے ہر کانفرنس میں ہوتا ہے اس بار اس لیکچر کے مقرر تھے جامعہ کراچی کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر سید معصوم علی ترمذی انکے لیکچر کا موضوع تھا "کم درجہ حرارت پر ٹھوس اجسام میں منتقلی کے مظاہرے" مندوبین کی ایک بڑی تعداد نے اس لیکچر میں شرکت کی۔ خاص طور پر وہ مندوبین جو دوسرے شہروں سے تشریف لائے تھے اس لیکچر میں آخر تک موجود رہے۔ لیکچر کے اختتام پر انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ نے تمام شرکاء کے اعزاز میں ایک پر تکلف عشائیہ دیا جس کے بعد کالج سے بسوں اور ویگنوں کے ذریعے مندوبین اپنی اقامت گاہوں تک پہنچے اس طرح پہلے دن کی کاروائی بخیر و خوبی انجام پذیر ہوئی۔

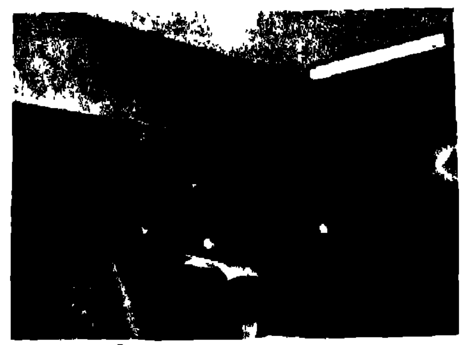
۲۳ اگست کانفرنس کا دوسرا دن تھا جس کا پہلا دور صبح نو بجے شروع ہوا اور اس میں شعبہ جاتی کارروائی کا



مذاکرہ کے سامعین



آلودگی کے مسائل پر مذاکرے کے شرکاء



ڈاکٹر رضی الدین صدیقی عام فہم تقریر کر رہے ہیں



میر خلیل الرحمٰن انعام یافتگان کے ہمراہ



عام فہم تقریر کے سامعین



ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی مذاکرے کا خطبہ صدارت ارشاد فرما رہے ہیں۔



استقبالیہ کا ایک منظر

ناز ہوا۔ سب سے پہلے چار شعبوں کے خطباتِ صدارت ایک مشترکہ مجلس میں پیش کئے گئے یہ تقریب کالج کے وسط میں واقع آفتاب احسن ہال میں ہوئی۔ سب سے پہلے شعبۂ علوم طب و دوا سازی کا خطبۂ صدارت ڈاکٹر منظور زیدی پروفیسر جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سینٹر کراچی نے پیش کیا۔ اسکے بعد علوم کیمیا کا خطبہ ڈاکٹر جی۔ اے۔ میانہ صاحب پروفیسر کیمیا گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان نے پیش کیا۔ پھر شعبۂ علوم طبعی کا خطبۂ صدارت ڈاکٹر محمد شفیع احمد صاحب ناظم اعلیٰ سپارکو نے پیش کیا۔ اور اس دن کا آخری خطبہ شعبۂ علوم انجینئری تھا۔ جسے ڈائریکٹر جنرل کے۔ ڈی۔ اے۔ جناب زیدی۔ اے۔ نظامی نے پیش کیا۔ اس کے بعد کچھ شعبہ جاتی کمروں میں شعبہ جاتی اجلاس کا آغاز کیا۔ اور نمازِ ظہر کے وقفے تک ان شعبوں میں مقالے پڑھے جاتے رہے۔ وقفۂ نماز و طعام کے بعد دن کے تین بجے کانفرنس کے دوسرے دن کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ جس میں مجموعی مذاکرے کا اہتمام اور سائنسی نمائش کا افتتاح شامل تھا۔ اس نمائش میں پاکستان کے مختلف حصوں سے سائنسی اداروں اور سائنسدانوں نے حصہ لیا۔ اسکے علاوہ طلباء کے بھی چند اسٹال لگائے گئے۔ جنکے درمیان مقابلہ کے انعامات بھی رکھے گئے تھے۔ ۲۲ اگست کو ٹھیک تین بجے عمومی مذاکرے کا آغاز ہوا۔ جسکا موضوع تھا " پاکستان میں توانائی کے وسائل و مسائل "۔ اس مذاکرے کی صدارت ہائیڈرو کاربن ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان اسلام آباد کے صدر نشین جناب ڈاکٹر شفقت حسین صدیقی نے کی۔ دوسرے شرکاء میں جناب غلام کبریا صاحب، جناب عبدالحمید چھوٹانی صاحب ڈاکٹر ایم۔ ایم۔ قریشی صاحب۔ جناب ارشد مظہر اللہ صاحب۔ جناب سیف الرحمٰن صاحب اور جناب سہیل قریشی صاحب شامل تھے اس مذاکرے کے داعی جناب عظمت علی خان نے معلن کے فرائض انجام دیئے۔

۲۲ اگست کو شام چار بجے سائنسی نمائش کا افتتاح ہونا تھا۔ جسکے مہمانِ خصوصی وزیر تعلیم سندھ جناب جسٹس غوث علی شاہ وقت مقررہ پر تشریف لے آئے تھے اور استقبالیہ کمیٹی کے ہمراہی میں آپ نے نمائش کا باقاعدہ افتتاح چار بجکر دس منٹ پر فرمایا۔ جناب غوث علی شاہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں سائنسی نمائشوں کے زیادہ سے زیادہ انعقاد پر زور دیا اور کہا کہ نمائش ہی وہ ذریعہ ہیں جس سے ہمیں اپنے ملک میں ہونے والی سائنسی و تکنیکی ترقی کے بارے میں معلومات ہوسکتی ہیں۔ اور اسکے علاوہ ان نمائشی مقابلوں کے ذریعے نوجوان طبقے میں بہتر سائنسی ایجادات کرنے اور ملک کو ترقی دینے کی امنگ بڑھتی ہے۔ آپ نے یہ بات زور دے کر کہی کہ اگر ملک کے مخیّر حضرات اس جانب توجہ دیں تو حکومت کے ساتھ ساتھ عوام بھی سائنسی میدان میں آگے قدم بڑھائیں گے۔



• مشاعرے میں موجود شعراء کرام



مشاعرے میں موجود شعراء کرام



جناب محمد رئیس غزل عطا فرما رہے ہیں



حضرت راز مرادآبادی غزل عطا فرما رہے ہیں ۔



صدرِ مشاعرہ حضرت منظور حسین شور غزل
ارشاد فرما رہے ہیں

سائنس کانفرنس میں ہونے والی سائنسی نمائش، سائنسی آلات، سائنسی کتب و اخبارات و رسائل سائنسی عملی مظاہروں پر مشتمل تھی۔ صوبائی وزیر تعلیم نے بیشتر اسٹالوں پر کافی وقت صرف کیا اس سے نمائش میں شامل اداروں کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ اسکے بعد وزیر موصوف آفتاب حسن ہال تشریف لائے جہاں عام فہم مذاکرہ جاری تھا۔ مذاکرے کے اختتام پر بلدیہ کراچی کی جانب سے ایک عصرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

وقفہ نماز کے بعد ایک اور خصوصی تقریر کا اہتمام کیا گیا تھا جو ملک کے مایہ ناز صدارتی ایوارڈ یافتہ سائنسدان ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کو کرنا تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر ساڑھے چھ بجے آفتاب حسن ہال میں شروع ہوئی جسکا موضوع تھا " قومی زبان میں ریاضی کی اعلیٰ تعلیم "۔ مندوبین و شرکاء کے لئے یہ موضوع اتنا دلچسپ ثابت ہوا کہ ہال کی گنجائش سے کہیں زیادہ لوگ اسکو سننے آئے۔ اور ہال کے دروازوں کے ساتھ لگے ڈاکٹر صاحب کی تقریر سنتے رہے۔ اس تقریر کے فوراً بعد فیڈریشن آف پاکستان چیمبرز اینڈ انڈسٹری کی جانب سے عشائیہ کالج کے میدان میں ترتیب دیا گیا۔ یوں کانفرنس کا دوسرا دن بھی اختتام پذیر ہوا۔

۲۳ اگست کو شعبہ جاتی اجلاس کا دوسرا مرحلہ ہونا تھا جس میں شعبہ علوم حیاتی، علوم تعلیمات و عمرانیات علوم ارضی و زرعی کے خطبات صدارت پیش کئے جانے تھے اس دن بھی نو بجے سے آفتاب حسن ہال میں کاروائی کا آغاز ہوا۔ اور خطبات صدارت پڑھے گئے۔ علوم حیاتی کا خطبہ جناب ڈاکٹر محمد ارسلان۔ پروفیسر حیاتیات قائد اعظم یونیورسٹی کو پڑھنا تھا۔ لیکن کیونکہ آپ اسلام آباد سے تشریف نہیں لائے تھے اس لئے مقامی معتمد نے ان کا خطبہ پڑھ کر سنایا۔ دوسرا خطبہ تعلیمات و عمرانیات کا تھا۔ جسے ڈاکٹر عبدالرؤف نے پیش کیا ان کا تعلق بھی قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے تھا۔ جامعہ کراچی کے شریک پروفیسر جغرافیہ جناب پروفیسر ڈاکٹر اقتدار زیدی نے علوم ارضی کا خطبہ دیا۔ جسکے بعد اس دن کا آخری خطبہ صدارت برائے علوم زرعی ڈاکٹر مجتبیٰ نقوی صاحب نے دیا۔ آپ ادارہ جوہری توانائی برائے زراعت و حیاتیات فیصل آباد کے ڈائریکٹر ہیں۔ ان خطبات صدارت کے بعد متعلقہ کمروں میں مقالے پڑھے گئے اور نماز ظہر و طعام کے بعد اس دن کی کاروائی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ دوپہر کے تین بجے کے قریب ایک خصوصی مذاکرہ بعنوان "پاکستان میں ماحولیات و آلودگی کے مسائل" شروع ہوا۔ اس مذاکرے کا افتتاح حکومت پاکستان کے صدارتی مشیر برائے طب جناب حکیم محمد سعید نے فرمایا جبکہ اسکی صدارت ملک کے مشہور اور مایہ ناز سائنسدان جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے کی دوسرے مقررین میں کے۔ پی۔ ٹی۔ کے چیئرمین ریئر ایڈمرل ایم۔ آئی۔ ارشد، جناب زیڈ۔ اے نظامی۔ ناظم کے۔ ڈی۔ اے، ڈاکٹر اسرار الحق، ڈاکٹر ارشد علی بیگ، جناب کوثر رشید احمد، اور احمد پرویز صاحب شامل تھے۔ جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے تعلیم کو عام کرنے پر زور دیا اور کہا کہ ماحول کی آلودگی پر قابو پانا جب ہی ممکن



اسٹیل ملز کے چیئرمین جناب حق نواز اختر مہمانوں
کا استقبال کر رہے ہیں ۔



اسٹیل ملز میں مندوبین



مہمان و میزبان



مذاکرے کے سامعین

ہے جب قوم کا ہر فرد اس سے بچاؤ کی تدابیر پر عمل کرے۔ انہوں نے ملک کے سائنسدانوں پر زور دیا کہ وہ آلودگی پر قابو کی مہم میں عملی طور پر حصہ لیں۔ جناب حکیم محمد سعید صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ فضا میں زہریلے مادوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی مقدار موجودہ دور میں انسانی صحت کے لئے خطرناک مسائل پیدا کر رہی ہے۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے پوری قوم کو سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔ دوسرے معزز مقررین نے بھی ماحول کی آلودگی سے پیدا شدہ مسائل اور انکے حل کی طرف نشاندہی کی۔

اس مذاکرے کے بعد ساسی ایک ڈیپو کی جانب سے مندوبین کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا۔ اسی دن بعد نماز مغرب ایک عام فہم تقریر جناب عطش درانی صاحب نے اسلام اور سائنس کے موضوع پر کی جو کہ تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ جسکے بعد مجلس استقبالیہ وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کی جانب سے شرکاء کے لئے ایک عشائیے کا اہتمام کیا گیا جسکے اختتام پر ۲۳ اگست کی کاروائی مکمل ہوئی۔

بیسویں قومی سائنس کانفرنس کے چوتھے روز کا آغاز صبح ۹ بجے سے ہوا اور مقالہ جات دوپہر تک جاری رہے۔ سہ پہر ۳ بجے اجلاس مجلس منتظمہ سائینٹفک سوسائٹی پاکستان (محدود برائے اراکین) منعقد ہوا جسکے اختتام پر مقتدرہ قومی زبان کی جانب سے عصرانہ دیا گیا۔

۲۴ اگست کے پروگرام کے آخری مرحلے میں جگہ کی تبدیلی کی گئی اور عام فہم تقریر اور عشائیہ کا اہتمام جامعہ کراچی میں واقع " آئی۔بی۔اے آڈیٹوریم" اور آئی۔بی۔اے۔ لان میں کیا گیا۔ جسکے لئے مندوبین کو آئی۔بی۔اے اور اسٹیل ملز کی بسوں کے ذریعے بھیجا گیا۔ کیونکہ کالج میں عشائیے کے بعد مندوبین کے لئے مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مشاعرے کی صدارت کے پی۔ٹی کے صدر نشین جناب ایم۔آئی۔ ارشد نے کی۔ مشاعرے کا انتظام صحن ہال میں کیا گیا تھا جہاں کرسیوں کی جگہ سفید چاندنیوں نے لے لی تھی۔ اس مشاعرے

کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ملک کے نامور اور ہر طبقۂ فکر کے شعراء نے شرکت کی جبکہ سامعین میں ملک کے نامور سائنسدان، محققین، اور معتدد شخصیات کے علاوہ خواتین کی بڑی تعداد نے شرکت کی جو کراچی سمیت ملک کے گوشے گوشے سے سائنس کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے۔

مشاعرے کے آغاز پر معتمد مجلس مشاعرہ حسن وقار گل نے پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب کی جانب سے شاعروں اور مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور ممتاز شاعر اور مجلس مشاعرہ کے رکن جناب سحر انصاری سے مشاعرے کی نظامت کے فرائض انجام دینے کی درخواست کی۔ جسکے بعد باقاعدہ مشاعرے کا آغاز ہوا۔

جن شعرائے کرام نے سامعین کی خدمت میں اپنا کلام پیش کیا۔ ان میں پروفیسر منظور حسین شور علیگ، جناب شان الحق حقی، جناب راز مرادآبادی، جناب راغب مرادآبادی، جناب امید فاضلی، جناب انور دہلوی، جناب محشر بدایونی، جناب شبنم رومانی، جناب عبید اللہ علیم، جناب احمد ہمدانی، جناب جمال احسانی، جناب انور



معتمد سائنٹفک سوسائٹی اساتذہ اردو سائنس
کالج کا استقبال کر رہے ہیں



پروفیسر اکرام الرحمن سائنٹفک سوسائٹی پاکستان
کے استقبالیہ میں تقریر کر رہے ہیں۔



سائنٹفک سوسائٹی کے استقبالیہ میں اساتذہ اردو
سائنس کالج اور مہمان



استقبالیہ

کیف، جناب جاذب قریشی، جناب تابش دہلوی، جناب سحر انصاری، جناب ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، جناب ظہور مہدی، جناب محسن بھوپالی، جناب عطاالرحمٰن خان عارف، جناب محمد رئیس، جناب اختر سعیدی، جناب عارف انفسال عثمانی کے علاوہ معتمد مجلس مشاعرہ حسن دتارگل شامل ہیں۔

اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ حضرات سے زیادہ خواتین نے شعرائے کرام کو داد دی۔ ہفت روزہ اخبارِ جہاں اسد جعفری کی رپورٹ کے مطابق یہ ایک ایسا مشاعرہ تھا جس کی لاج خواتین کے ہاتھ رہی۔ خواتین نے ہر خوبصورت شعر پر بڑھ چڑھ کر داد دی۔

صدرِ مشاعرہ جناب ریٹائرڈ مسلا ایم۔آئی۔ارشد صاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ بڑی اچھی روایت ہے کہ سائنس کانفرنس میں اتنے اچھے مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اور ملک کے نامور شعرائے کرام کو اس میں مدعو کیا گیا۔ لیکن اس سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ سامعین میں ہمارے ملک کے مقتدر، اعلیٰ تعلیمیافتہ اور ممتاز سائنسدان حضرات شامل ہیں۔ اور سائنسدانوں کو میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ ہمارے شعرائے کرام کے تخیلات سے بھرپور استفادہ کریں۔ ہوٹنگ کرنے والے افراد کے لیے انہوں نے آخر میں انور دہلوی کا یہ مشہور شعر بھی پڑھا۔

شعر
میری طرف نہ دیکھئے آئینہ دیکھئے
اب تک ہوا لگی ہے کوئی دیوانہ خود بخود

صدرِ مشاعرہ کی تقریر کے بعد صدرِ مجلس استقبالیہ پروفیسر اکرام الرحمٰن صاحب کی جانب سے وائس چیئرمین مجلسِ مشاعرہ پروفیسر اے۔کے۔ آفتاب زبیری صاحب نے سامعین اور شعرائے کرام کا شکریہ ادا کیا۔ جس کے بعد مہمانوں اور شعرائے کرام کی تواضع مشروبات و دیگر لوازمات سے کی گئی۔

منگل ۲۵ اگست کو کانفرنس میں شریک تمام مندوبین کے لیے اسٹیل ملز کی سیر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اسٹیل ملز کے صدر نشین نے اس سیر کے لیے اسٹیل ملز کی بسوں کا ایک ۹ بسوں کا فلیٹ فراہم کیا تھا جو کہ صبح ۹ بجے کالج سے تمام مندوبین کو لیکر اسٹیل ملز کی جانب روانہ ہوا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد تمام مندوبین اسٹیل ملز پہونچے جہاں اسٹیل ملز کے صدر نشین جناب حق نواز اختر اور ان کے دیگر رفقائے کار نے انکا استقبال کیا۔ اسکے بعد تمام خواتین و حضرات کو ایک سماعت گاہ میں لیجایا گیا جہاں حق نواز اختر صاحب نے اسٹیل ملز کے بارے میں فرمایا کہ یہ پاکستان کا سب سے بڑا منصوبہ ہے اور اس پر سولہ سو کروڑ روپے صرف کیئے جا چکے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اسٹیل ملز کا منصوبہ خالصتاً پاکستانی ہے اور اس کی کامیابی پوری پاکستانی قوم کی کامیابی ہے۔ انکے بعد اسٹیل ملز کے سینیئر منیجر پلاننگ محمد تقی صاحب نے چارٹوں اور نقشوں کی مدد سے تفصیل کے ساتھ اس منصوبے کے بارے میں بتایا۔ اسکے علاوہ مندوبین کو ملز کی ابتدا،

سے اب تک کی پوری کاروائی پر مشتمل ایک خوبصورت فلم بھی دکھائی گئی جس کے اختتام پر مندوبین کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں ویگنوں میں بٹھا کر اسٹیل ملز کا دورہ کرایا گیا۔ ہر ویگن کے ساتھ ڈو انجینئرز شامل تھے جو کہ ملز کے مختلف حصوں کی تفصیلات سے آگاہ کرتے جارہے تھے۔ اس دورے کے اختتام پر جو کہ تقریباً دو گھنٹے جاری رہا اسٹیل ملز کی جانب سے ایک انتہائی پر تکلف کھانے کا انتظام کیا گیا تھا جس کے بعد اسٹیل ملز کی بسوں کے ذریعے مندوبین کو کالج روانہ کر دیا گیا۔

اسٹیل ملز کے افسران و کارکنان کے بقول ملز کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے ایک وقت میں اسٹیل ملز کا دورہ کیا۔ بعد نماز مغرب سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان کا مجلس عام کا اجلاس ہونا تھا۔ یہی وہ موقعہ ہوتا ہے جب مختلف تجاویز و قرار دادیں پیش کی جاتی ہیں اور حکومت اور دوسرے اداروں تک سفارشات پہونچائی جاتی ہیں شام کے ساڑھے سات بجے یہ اجلاس شروع ہوا جس کے فوراً بعد تمام شرکاء کے اعزاز میں سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان نے عشائیہ دیا۔ اور یوں کانفرنس کے پانچ دن اختتام پذیر ہوئے۔

چھٹا اور آخری دن سمندر کی سیر کا تھا۔ جو خاص طور پر بیرون شہر کے مندوبین کے لئے ترتیب دی گئی تھی۔ کیونکہ اسکا انتظام کے۔ پی۔ ٹی نے کیا تھا اور ان کی طرف سے ہدایت کے مطابق صرف ڈیڑھ سو افراد کو اس سیر کے لیے جانا تھا جس کی وجہ سے بیشتر مقامی لوگوں کو مایوسی ہوئی۔

کے۔ پی۔ ٹی نے مندوبین کو لانچوں کے ذریعے سمندر کی سیر کرائی اور اسی لانچ پر ان کی ہلکی تواضع بھی کی گئی اسکے بعد تمام لوگ بس کے ذریعے سینڈز پٹ گئے جہاں پر ٹھہرانے کے بعد بھی شام چار بجے تک سیر جاری رہی اسکے بعد سب واپس ہوئے اس طرح سائنس کا بخیر و خوبی انجام ہوا۔

اردو سائنس کالج کے اساتذہ غیر تدریسی عملہ اور طلباء و طالبات قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے مشترکہ کاوشوں سے اتنی بڑی قومی کانفرنس نہ صرف منعقد کروائی بلکہ لوگوں کی توقعات اور امیدوں سے کہیں بڑھ کر کامیاب کروانے میں بھی ان حضرات کا براہ راست ہاتھ ہے کراچی کے شہری بھی اس کامیاب ترین کانفرنس کے انعقاد پر قابل ستائش ہیں۔



ایم۔ایس سی فائنل "حیوانیات" کے طلباء اپنے اساتذہ کرام کے ہمراہ



کالج کے سابق طالبعلم باقر عابدی جناب اختر حسین کو بابائے اردو کی تصویر پیش کر رہے ہیں۔



یومِ حسینؓ ۱۹۸۱ء کے میزبان و مہمانانِ گرامی ۔



یومِ حسینؓ ۱۹۸۱ء کے سامعینِ کرام

سابق اساتذہ کرام

پرنسپل صاحبان

جناب حاجی سید محی الدین صاحب
جناب میجر آفتاب حسن صاحب
جناب لیفٹیننٹ کرنل محمد عطا الرحیم صاحب
جناب امانت علی صاحب

شعبہ طبیعات

جناب سید بدر الحسن صاحب
جناب ڈاکٹر عسکری امام صاحب
جناب ادریس احمد صاحب
جناب شکیل احمد منیر صاحب
جناب عقیل احمد صاحب
جناب ڈاکٹر قطب الدین خالد صاحب
جناب ایاز احمد صاحب
جناب سید سمیع احمد صاحب

شعبہ کیمیا

جناب ضیاء الدین نصیبی صاحب
جناب عظمت علی خان صاحب
جناب شفیع البرکات صاحب مرحوم
جناب ڈاکٹر محبوب الدین صاحب
جناب مقبول احمد خان صاحب
جناب ڈاکٹر خلیل احمد قریشی صاحب
جناب ڈاکٹر شمیم النور صاحب
جناب انیس صاحب
جناب طاہر علی صاحب (مرحوم)
جناب نجم الہدیٰ صاحب
جناب ناصر احمد خان صاحب
جناب سید شوکت حسن صاحب
جناب مسعود الحسن صاحب
جناب سعید گل صاحب
جناب محمد سلیم صاحب
جناب پرویز مقبول صاحب

شعبہ جغرافیہ

جناب محمد علی سلوی صاحب مرحوم
جناب عزت اللہ خان صاحب
جناب ڈاکٹر اقتدار حسین زیدی صاحب
جناب ش ضحیٰ صاحب مرحوم
جناب عبدالرؤف خان صاحب
جناب الیاس بالیونس صاحب
جناب منیر الغفار قادری صاحب
جناب حسین احمد صاحب
آنسہ مسز رباب رضوی صاحبہ
محترمہ مسز شاہدہ ظہیر صاحبہ

شعبہ ارضیات

جناب عظمت علی خان صاحب
جناب خلیل احمد ملک صاحب
جناب سید جمیل الدین صاحب
جناب سید نجم الہدیٰ صاحب

جناب طاہر علی صاحب (مرحوم)
جناب سید محمد اجتبیٰ صاحب
جناب سید ممنون احمد صاحب
جناب ساجد حسن صاحب
جناب ناصر احمد خان صاحب

شعبہ ریاضی

جناب بہاء الدین احمد صاحب
جناب عبدالمجید خان صاحب
آنسہ بیگم فہمیدہ فاروقی صاحبہ
جناب ڈاکٹر سید حسن الدین صاحب
جناب محمد صہیب صاحب
جناب شہلا اختر صاحبہ

شعبہ حیاتی کیمیا

مسز درخشاں حلیم صاحبہ

شعبہ حیوانیات

ناب ڈاکٹر خواجہ عبدالمجیب صاحب مرحوم
جناب ڈاکٹر سید مظہر الحق صاحب

جناب ڈاکٹر سید نعیم الحسن نقوی صاحب
جناب ڈاکٹر اظہار الدین بقائی صاحب مرحوم
جناب کفیل احمد ملک صاحب
جناب سید محمد احمد صاحب
آنسہ نسیم سلطانہ صاحبہ

شعبہ نباتیات

جناب خورشید مصطفیٰ صاحب
جناب ڈاکٹر مشتاق حسین صاحب
جناب کاظم حسن خان صاحب
جناب سید طاہر رضا النقوی صاحب
آنسہ وجود حسین صاحبہ
جناب انوار اقبال صاحب
جناب فہیم احمد خان صاحب
جناب غلام اکبر صاحب
جناب ضیاء الرحمٰن صاحب
آنسہ پروین ضیاء صاحبہ
آنسہ سیدہ رئیس فاطمہ صاحبہ (مرحومہ)

موجودہ اساتذہ کرام

		ابتدائی تاریخ تقرری
جناب پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن صاحب ایم اے (علیگ) ایم ایس وسکانسن (امریکہ)		یکم جولائی ۱۹۴۸ء

شعبۂ اسلامیات

جناب شاہد حسین عثمانی صاحب ایم اے تاریخ اسلام، ایل ایل بی، ایم اے اسلامیات (کراچی)	مددگار پروفیسر	۱۵راگست ۱۹۶۳ء

شعبۂ اردو

جناب اے کے آفتاب زبیری صاحب ایم اے (علیگ)	پروفیسر	۵ردسمبر ۱۹۵۶ء
جناب امین فاروق صاحب ایم اے (سندھ)	لکچرر	۱۲رمئی ۱۹۷۳ء
جناب ظفر اقبال صاحب بی۔ایس سی، ایم اے (سندھ)	لکچرر	۲۲راپریل ۱۹۷۹ء
جناب وقار الحسن وقار گل صاحب ایم۔اے، ایل ایل بی۔ ڈی ایل ایس	لکچرر	۷رستمبر ۱۹۸۰ء

شعبہ انگریزی

جناب سید فخر الدین صاحب ایم اے (پٹنہ)	لکچرر	۱۹راپریل ۱۹۷۴ء
جناب فاروق پرویز مغل صاحب ایم اے (سندھ)	لکچرر	۲رمئی ۱۹۷۴ء
جناب اقبال الدین صاحب ایم اے (ادیاب) ایل ایل بی ڈی ایل ایس	لکچرر	۲۳رستمبر ۱۹۸۰ء

شعبۂ طبیعیات

جناب سید محمد ہارون الرشید نجمی صاحب پروفیسر ۱۲ر اگست ۱۹۶۰ء
ایم ایس سی (کراچی) ایم ایس سی (لندن)

جناب سید کاظم مہدی صاحب مددگار پروفیسر یکم نومبر ۱۹۶۲ء
ایم ایس سی (مرکزائی طبیعات) ایم ایس سی (طیف تمائی) کراچی)

جناب ادریس احمد ہاشمی صاحب مددگار پروفیسر ۱۶ر ستمبر ۱۹۶۳ء
ایم ایس سی (کراچی)

جناب محمد سعید صاحب مددگار پروفیسر ۱۵ر اکتوبر ۱۹۶۸ء
ایم. ایس سی (کراچی)

جناب سید زاہد حسین صاحب لکچرر یکم دسمبر ۱۹۶۶ء
ایم. ایس. سی (کراچی)

جناب محمد قادر حسین صاحب لکچرر ۲۷ر جولائی ۱۹۷۷ء
ایم. ایس. سی (کراچی)

جناب سید نوشاد احمد صاحب لکچرر یکم فروری ۱۹۷۹ء
بی. ایس. سی (آنرز) ایم ایس سی (کراچی)

جناب عطا الرحمٰن صاحب لکچرار ۱۷ر فروری ۱۹۷۹ء
ایم. ایس. سی. (کراچی)

محترمہ دردانہ رضی حسین صاحبہ لکچرر ۲۲ر اپریل ۱۹۷۹ء
بی ایس سی (آنرز) ایم ایس سی (کراچی)

شعبۂ کیمیا

جناب سید ضیاء الدین محمود صاحب پروفیسر ۱۳ر ستمبر ۱۹۶۱ء
ایم ایس سی (کراچی) ایم فل (لندن)

جناب سید مسعود رضا صاحب مددگار پروفیسر ۱۷ر ستمبر ۱۹۶۱ء
ایم ایس سی (کراچی) ایم فل (ساؤتھ ہمپٹن)

جناب سید اشفاق احمد ہاشمی صاحب مددگار پروفیسر ۶ر ستمبر ۱۹۶۴ء
بی ایس سی (آنرز) ایم ایس سی (کراچی)

جناب ارشد حسین صدیقی صاحب بی ایس سی (آنرز) ایم ایس سی (کراچی)	مددگار پروفیسر	۲/اپریل ۱۹۶۸ء
جناب اعجاز احمد صاحب ایم۔ ایس۔ سی۔ کراچی	مددگار پروفیسر	۴/جنوری ۱۹۷۰ء
سید امام الدین صاحب ایم۔ ایس۔ سی (کراچی)	لکچرر	۱۵/اکتوبر ۱۹۶۶ء
محترمہ عرشیہ صلاح الدین صاحبہ ایم۔ ایس۔ سی۔ (کراچی)	لکچرر	۲/جون ۱۹۷۶ء
سیدہ شمیم بانو صاحبہ بی ایس سی (آنرز) ایم ایس سی۔ بی ایڈ (کراچی)	لکچرر	۱۶/اگست ۱۹۷۶ء
جناب سید اصغر علی صاحب ایم۔ ایس۔ سی (کراچی)	لکچرر	۱۸/جنوری ۱۹۷۹ء
جناب ڈاکٹر قمر الحق صاحب ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی (سندھ)	لکچرر	۱۸/جنوری ۱۹۷۹ء
آنسہ شاہینہ نجمی صاحبہ بی۔ ایس۔ سی (آنرز) ایم ایس سی (کراچی)	لکچرار	۱۸/جنوری ۱۹۷۹ء
آنسہ ریحانہ نصیر صاحبہ بی۔ ایس۔ سی (آنرز) ایم ایس سی (کراچی)	لکچرر	۱۸/جنوری ۱۹۷۹ء

شعبہ حیوانیات

جناب ڈاکٹر حفیظ الرحمن صاحب ایم ایس سی پی ایچ ڈی (کراچی)	پروفیسر	۱۲/اگست ۱۹۶۰ء
جناب ڈاکٹر وقار احمد زبیری صاحب ایم ایس سی۔ ایم۔ اے پی ایچ ڈی (کراچی)	مددگار پروفیسر	یکم نومبر ۱۹۶۲ء
جناب محمد الیاس سبحانی صاحب ایم ایس سی (آگرہ) ایل ٹی (الہ آباد)	مددگار پروفیسر	۱۵/اکتوبر ۱۹۶۳ء
جناب سلیم احمد رزمی صاحب	مددگار پروفیسر	۲۸/فروری ۱۹۶۶ء

ایم ایس سی (کراچی)		
محترمہ عمرانہ مسعود صاحبہ	لکچرر	۱۷؍فروری ۱۹۷۷ء
ایم ایس سی (کراچی)		
آنسہ مہر افشاں عثمانی صاحبہ	لکچرر	۱۸؍جنوری ۱۹۷۹ء
بی ایس سی (آنرز) ایم ایس سی (کراچی)		
جناب کنور ابوبکر سعید خاں صاحب	لکچرار	۱۸؍جنوری ۱۹۷۹ء
ایم ایس سی (کراچی)		
آنسہ تنویر فاطمہ صاحبہ	لکچرار	۲۱؍جنوری ۱۹۷۹ء
ایم ایس سی (کراچی)		
جناب اے سلیم صدیقی صاحب	لکچرر	۷؍ستمبر ۱۹۸۰ء
ایم ایس سی (کراچی)		

شعبہ نباتیات

جناب محمد مقصود صاحب	پروفیسر	۵؍اکتوبر ۱۹۶۱ء
ایم ایس سی (کراچی)		
جناب قیصر عباس صاحب	مددگار پروفیسر	۱۳؍اکتوبر ۱۹۶۸ء
ایم ایس سی (کراچی)		
جناب محمد اسماعیل صاحب	لکچرر	۵؍فروری ۱۹۷۲ء
ایم ایس سی (کراچی)		
جناب وقار الحق صاحب	لکچرر	۱۰؍اپریل ۱۹۷۵ء
ایم ایس سی (کراچی)		
جناب اورنگ زیب شہباز صاحب	لکچرر	یکم فروری ۱۹۷۷ء
ایم ایس سی (سندھ)		
محترمہ ممتاز بیگم صاحبہ	لکچرر	۲۳؍جولائی ۱۹۷۷ء
ایم ایس سی (کراچی)		
جناب سید طارق علی رضوی صاحب	لکچرر	۷؍ستمبر ۱۹۸۰ء
بی ایس سی (آنرز) ایم ایس سی کراچی		

شعبہ جغرافیہ

جناب محمد اکرام الرحمٰن صاحب ایم اے (علیگ) ایم ایس وسکانسن (امریکہ)	پروفیسر	یکم جولائی ۱۹۴۸ء
محترمہ ڈاکٹر بلقیس جہاں صاحبہ ایم اے پی ایچ ڈی (لندن)	مددگار پروفیسر	یکم مئی ۱۹۶۰ء
جناب محمد اشفاق خان صاحب ایم اے (کراچی)	لکچرر	۲۴ر اپریل ۱۹۷۳ء
محترمہ ابو خاتون صاحبہ ایم اے کراچی	لکچرر	۱۲ر اکتوبر ۱۹۷۸ء
پروین عطا الرحمٰن صاحبہ ایم اے (پنجاب)	لکچرر	۱۸ر جنوری ۱۹۷۹ء

شعبہ ارضیات

جناب افسر علی بیگ صاحب ایم ایس سی (عثمانیہ)	مددگار پروفیسر	یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء
جناب محمد افتخار احمد صاحب ایم ایس سی (کراچی)	لکچرر	۲۴ر مارچ ۱۹۶۸ء
جناب ظفر الدین صدیقی صاحب ایم ایس سی (کراچی)	لکچرر	۱۸ر جنوری ۱۹۷۹ء
جناب محمد آفتاب عالم صاحب بی ایس سی (آنرز) ایم ایس سی (کراچی)	لکچرر	۷ر ستمبر ۱۹۸۰ء

شعبہ ریاضی

جناب شوکت علی صاحب ایم ایس سی (کراچی)	پروفیسر	۱۵ر اکتوبر ۱۹۶۱ء
جناب رشید خان لودھی صاحب بی ایس سی (آنرز) ایم ایس سی کراچی	مددگار پروفیسر	۵ مئی ۱۹۶۹ء
جناب لیاقت علی صاحب	لکچرر	۲۲ر جنوری ۱۹۷۹ء

شعبہ حیاتی کیمیا

جناب وسیم احمد صاحب بی ایس سی (آنرز) ایم ایس سی (کراچی)	لکچرر	۲۳ر جنوری ۱۹۷۹ء
آنسہ اصغری غوث صاحبہ بی ایس سی (آنرز) ایم ایس سی (کراچی)	لکچرر	۷ر ستمبر ۱۹۸۰ء

شعبہ خورد حیاتیات

جناب سید اقبال عالم صاحب بی ایس سی (آنرز) ایم ایس سی (کراچی)	لکچرر	۲۴ر جنوری ۱۹۷۹ء

شعبہ شماریات

جناب محمد اقبال صاحب ایم ایس سی (اگومس)	لکچرر	۲۱ر جنوری ۱۹۷۹ء
جناب شاہد جمال صاحب ایم ایس سی (کراچی)	لکچرر	۲۲ر اپریل ۱۹۷۹ء

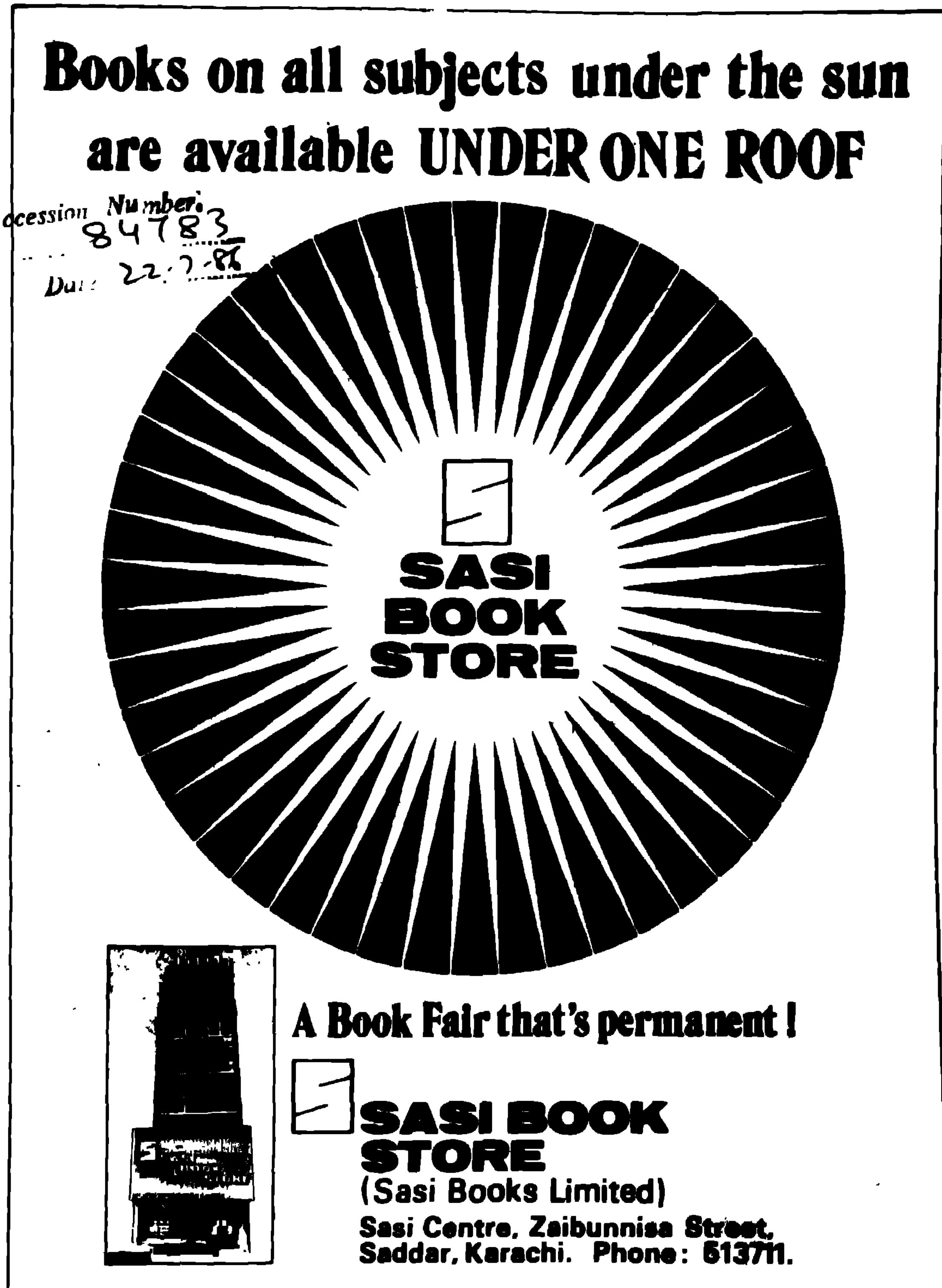
شعبہ سندھی

جناب اسمٰعیل آدم صاحب ایم اے (کراچی)	لکچرار	۱۹ر اگست ۱۹۷۴ء

کتب خانہ

جناب مختار اشرف صاحب ایم ایل ایس (کراچی)	لائبریرین	۱۵ر دسمبر ۱۹۷۳ء

جناب ڈاکٹر ظفر التوحید صاحب ایم بی بی ایس	میڈیکل آفیسر	


Books on all subjects under the sun
are available UNDER ONE ROOF
SASI
BOOK
STORE
A Book Fair that's permanent !
SASI BOOK
STORE
(Sasi Books Limited)
Sasi Centre, Zaibunnisa Street,
Saddar, Karachi. Phone: 513711.

مستقبل کا مولوی عبدالحق یادگاری کتب خانہ۔ وفاقی گورنمنٹ اُردو سائنس کالج

